فتاویٰ عثمانی

فتاویٰ عثمانی

جلد اوّل

کتاب الایمان والعقائد، کتاب السنۃ والبدعۃ، کتاب العلم والتاریخ،
کتاب التفسیر، کتاب الحدیث، کتاب الدعوۃ والتبلیغ، کتاب التصوف،
کتاب الذکر والدعاء، کتاب حقوق المعاشرۃ، کتاب السیر والمناقب،
کتاب الطہارات، کتاب الصلوٰۃ، کتاب الجنائز

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

ترتیب و تخریج

مولانا محمد زبیر حق نواز

استاذ جامعہ دار العلوم کراچی

مکتبہ معارف القرآن کراچی ۱۴

(Quranic Studies Publishers)

فہرستِ موضوعات فتاویٰ عثمانی جلد اوّل

صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿فصل فی کلمات الکفر وأفعال الکفر وما یکون کفرًا وما لا یکون کفرًا﴾ ۷۲

(کفریہ وغیرکفریہ کلمات اورافعال سے متعلق مسائل کا بیان)

موضوعات | صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿کتاب الحدیث وما یتعلق بہ﴾ ۲۲۱

(حدیث اور اس سے متعلق مسائل کا بیان)

موضوعات | صفحہ نمبر

﴿كتاب ما يتعلق بالدعوة والتبليغ﴾ ۲۳۵

(دعوت وتبلیغ کے مسائل)

﴿كتاب التصوّف والكشف والالهام والرّؤياء﴾ ۲۴۷

(تصوف، کشف، الہام اور خوابوں سے متعلق مسائل کا بیان)

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿کتاب الذکر والدعاء والتعویذات﴾ ۲۵۷

(ذکر، دُعا اور تعویذات کے بیان میں)

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿کتاب السیر والمناقب﴾ ۲۹۷

(انبیاء اور مختلف شخصیات کے حالات ومناقب)

موضوعات | صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿فصل فی المسح علی الخفین﴾ ۳۴۷

(موزوں پر مسح سے متعلق مسائل کا بیان)

﴿کتاب الصلوٰۃ﴾ ۳۴۹

(مسائلِ نماز)

﴿فصل فی مواقیت الصلوٰۃ﴾ ۳۵۱

(اوقاتِ نماز سے متعلق مسائل کا بیان)

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿فصل فی الأذان﴾ ۳۶۵

(اذان سے متعلق مسائل کا بیان)

﴿فصل فی شروط الصلوٰة وأركانها وواجباتها وسننها وآدابها﴾ ۳۶۸

(نماز کی شرائط، فرائض، ارکان، واجبات، سنن اور آداب کے بیان میں)

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿فصل فی الامامة والجماعة﴾ ۳۸۰

(امامت اور جماعت سے متعلق مسائل کا بیان)

موضوعات | صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿فصل فی التراویح﴾ ۴۵۹

(تراویح اور شبینہ سے متعلق مسائل)

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿فصل فی الوتر﴾ ۴۷۲

(وتر سے متعلق مسائل)

﴿فصل فی قضاء الفوائت﴾ ۴۷۶

(قضا نمازوں سے متعلق مسائل کا بیان)

﴿فصل فی سجود السھو﴾ ۴۸۸

(سجدۂ سہو کے مسائل کا بیان)

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ، وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ، اَمَّا بَعْدُ:

جب سے آنکھ کھلی، والدِ ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ کے فیض سے گھر میں فتویٰ اور استفتاء کا چرچا دیکھا، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ بہت سے فقہی مسائل گھر کے ان تذکروں کی بنا پر یاد ہوگئے، لیکن کسی کو مسئلہ بتانے یا لکھ کر دینے سے دِل ہمیشہ ڈرتا رہا، اور مدرسہ میں پڑھنے کے زمانے میں کبھی یہ خیال بھی نہ آیا کہ کسی وقت فتویٰ لکھنے کی کوئی ذمہ داری سر پر آنے والی ہے۔ ۱۳۷۷ھ میں جب میں دارالعلوم کراچی میں ہدایہ اَوّلین وغیرہ پڑھتا تھا اور میری عمر (قمری حساب سے) پندرہ سال تھی، شعبان و رمضان کی تعطیلات کے زمانے میں اُستاذِ مکرّم حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ روزانہ ہمارے گھر پر تشریف لاکر فتویٰ کا کام کیا کرتے تھے، میں بکثرت اُن کے پاس جا بیٹھتا، اور ان کے لکھے ہوئے فتاویٰ پڑھتا رہتا۔ ایک روز حضرتؒ نے ایک استفتاء مجھے دے کر فرمایا کہ ''بتاؤ اس سوال کا کیا جواب ہوگا؟'' مسئلہ طلاق کا تھا اور سیدھا سادا تھا، میں نے صحیح جواب دے دیا، حضرتؒ نے فرمایا ''بس اب یہی جواب اس استفتاء پر لکھ دو۔'' جب لکھنے کا نام آیا تو میرا دِل ڈرنے لگا، لیکن حضرت اُستاذؒ نے ہمت بندھائی، میں نے جواب لکھ دیا، اور دستخط کی جگہ چھوڑ دی، حضرتؒ نے اس تحریری جواب کی تصویب فرمائی اور خود دستخط فرمادیئے۔

اس کے بعد ۱۳۷۹ھ (مطابق ۱۹۵۸ء) میں حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب قدس سرہٗ کے پاس مشکوٰۃ شریف پڑھنی شروع کی تو حضرتؒ نے ترغیب دی کہ میں اور برادر مکرّم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب مدظلہم کتابوں سے مسائل کے جوابات نکالنے کی مشق کریں، چنانچہ اسی زمانے میں حضرتؒ کچھ سوالات دے دیتے تھے اور کتبِ فقہ سے ان کے جوابات نکالنے کا حکم دیتے، ہم کتابوں سے جوابات تلاش کرکے اکثر زبانی اور کبھی تحریری طور پر حضرتؒ کی خدمت میں پیش کرتے، اور وہ ان کی تصویب یا اصلاح فرمادیتے۔

اسی سال جب شعبان و رمضان کی تعطیلات میں گھر جانا ہوا تو حضرت والد صاحب قدس سرہٗ کے پاس رمضان میں جماعتِ تہجد کے جواز وعدمِ جواز سے متعلق ایک استفتاء آیا ہوا تھا، اور حضرت

والد صاحبؒ اس کا جواب تفصیل سے لکھنا چاہتے تھے، انہوں نے مجھے حکم دیا کہ اس مسئلے کے بارے میں کتبِ فقہ کی مراجعت کر کے متعلقہ عبارتیں جمع کروں۔ میں نے یہ عبارتیں جمع کیں، اور حضرتؒ سے عرض کیا کہ ''اگر اجازت ہو تو ان عبارتوں کی روشنی میں جو مسئلہ سمجھ میں آرہا ہے، اسے بطورِ تجویز قلم بند کرلوں، پھر آپ ان کی اصلاح فرمادیں۔'' حضرتؒ نے اجازت دے دی، اور میں نے اپنی بساط کے مطابق جواب لکھ کر حضرتؒ کی خدمت میں پیش کیا، جس پر حضرتؒ نے معمولی ترمیم و اصلاح کے بعد تصدیق فرمادی، یہ پہلا باقاعدہ فتویٰ تھا جو بندہ نے لکھا اور بعد میں شائع بھی ہوا۔

دورۂ حدیث کے سال میں بھی حضرت مفتی رشید احمد صاحب قدس سرہٗ کے پاس مسائل کے استخراج کی مشق جاری رہی، یہاں تک کہ دورۂ حدیث کے بعد باقاعدہ تخصص فی الافتاء میں حضرت والد صاحب قدس سرہٗ کے پاس فتویٰ نویسی کی مشق شروع کی۔ اُسی وقت یہ اندازہ بھی ہوا کہ فتویٰ کا کام صرف جزئیات یاد کرنے یا کتابوں کی مراجعت کا نام نہیں ہے، بلکہ اس میں اور بھی بہت سے اُصول مدِنظر رکھنے پڑتے ہیں، اور ان میں سے بہت سی باتیں ایسی ہیں جو لگے بندھے قواعد کے علاوہ مفتی کے اپنے ملکۂ فقہیہ اور اس کے مزاج و مذاق سے تعلق رکھتی ہیں جو صرف کتابیں پڑھ لینے سے حاصل نہیں ہوتا، بلکہ اس کے لئے کسی ماہر مفتی کی طویل صحبت کی بھی ضرورت ہے۔

تخصص کے بعد بھی دارالعلوم میں تدریسی خدمات کے ساتھ تقریباً روزانہ کچھ وقت دارالافتاء میں فتویٰ نویسی کے لئے مخصوص رہا، اور اس طرح بفضلہٖ تعالیٰ حضرت والد صاحب قدس سرہٗ کی نگرانی و سرپرستی میں ۱۳۹۶ھ تک فتویٰ کی خدمت کا سلسلہ اس طرح جاری رہا کہ دارالافتاء کی مستقل ذمہ داری تو دُوسرے مفتی حضرات کے سپرد رہی، لیکن کچھ وقت اپنا بھی لگتا رہا، اور جب کبھی ڈاک زیادہ جمع ہوجاتی یا فتویٰ لکھنے والوں کی کمی ہوتی تو حضرت والد صاحب قدس سرہٗ بندے کو کچھ عرصہ کے لئے تدریس کے علاوہ دُوسرے کام چھڑوا کر فتویٰ کی خدمت پر لگادیتے۔ حضرت والد صاحب قدس سرہٗ کی وفات کے بعد حضرت مولانا محمد عاشق الٰہی صاحبؒ مدینہ منوّرہ ہجرت فرماگئے، اور برادرِ مکرم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی مدظلہم پر دارالعلوم کے انتظامی اُمور کی ذمہ داریاں آپڑیں، اور دارالافتاء کے بعض دیگر رفقاء بھی اپنی مجبوریوں کی وجہ سے مستعفی ہوگئے، اس لئے عرصۂ دراز تک دارالافتاء اور درجۂ تخصص کی نگرانی کا کام بندہ کے سپرد رہا، اور خود فتویٰ لکھنے کے علاوہ درجۂ تخصص کے طلبہ کے لکھے ہوئے فتاویٰ پر نظرِ ثانی اور اصلاح کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

اس طرح مختلف زمانوں میں بندے کے لکھے ہوئے فتاویٰ، دارالعلوم کے نقلِ فتاویٰ کے بہت سے رجسٹروں میں بکھرے ہوئے ہیں، مجھے کبھی یہ خیال بھی نہیں ہوا تھا کہ میں فتاویٰ کا کوئی مجموعہ مرتب

کرکے شائع کروں۔ خیال یہ تھا کہ دارالعلوم کراچی سے جاری ہونے والے فتاویٰ کا جو مجموعہ زیرِ ترتیب ہے، اسی میں یہ فتاویٰ بھی آجائیں گے۔ لیکن عزیز گرامی مولانا محمد زبیر حق نواز صاحب نے - جو دارالعلوم کراچی ہی کے فاضل و متخصص اور اب ماشاء اللہ اُستاذ و رفیق دارالافتاء ہیں- اپنے طور پر میرے لکھے ہوئے فتاویٰ کو مختلف رجسٹروں سے جمع کرنا شروع کردیا، اور اس کام کا ایک معتد بہ حصہ مکمل کرنے کے بعد بندہ کو مطلع کیا، میں نے اس کو منجانب اللہ سمجھ کر کام کی تکمیل کی اجازت دیدی۔

ماشاء اللہ مولانا محمد زبیر صاحب خود ذی استعداد عالم ہیں، اور انہوں نے نہایت عرق ریزی سے دارالعلوم کراچی کے پرانے رجسٹروں سے، جن میں سے بعض بہت بوسیدہ ہوچکے تھے، فتاویٰ ڈھونڈ نکالے، اور نہ صرف ان کا انتخاب کرکے ان کو ابواب میں مرتب کیا، بلکہ ان کے حوالوں کی تخریج کا کام بھی بڑی جانفشانی اور سلیقے کے ساتھ انجام دیا، جس سے اس مجموعے کی افادیت بہت بڑھ گئی۔ دِل سے دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ عزیزِ موصوف کی اس محنت کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبول عطا فرمائیں، اور ان کی عمر، علم اور عمل میں برکت عطا فرماکر انہیں مزید علمی و دینی خدمات کے لئے موفق فرمائیں، آمین۔

مجھے اپنی موجودہ مصروفیات اور اسفار کی کثرت کی بنا پر بہت دقتِ نظر سے تو ان فتاویٰ پر نظرِ ثانی کا موقع نہیں ملا، لیکن ان کا اکثر حصہ میں نے سرسری نظر سے دیکھ لیا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اُمید رکھتا ہوں کہ ان شاء اللہ ان کی اشاعت فائدے سے خالی نہ ہوگی۔

اپنے مشائخ کی ہدایت کے مطابق فتویٰ لکھتے وقت اس ذمہ داری کی نزاکت اور سنگینی کا احساس رہتا ہے، اور اپنی بساط کے مطابق احتیاط کی بھی کوشش رہتی ہے، لیکن یہ ذمہ داری ہی ایسی ہے کہ ہر وقت ڈر بھی لگا رہتا ہے کہ کوئی غلطی قابلِ گرفت نہ ہوجائے۔ اللہ تعالیٰ ہی سے دُعا ہے کہ اس ذمہ داری کی انجام دہی میں اگر کوئی غلطی ہوئی ہے تو اپنے فضل و کرم سے معاف فرمادیں، اور اس خدمت کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبول عطا فرماکر اسے قارئین کے لئے نافع بنادیں، آمین۔

اہلِ علم سے بھی درخواست ہے کہ اگر کوئی غلطی سامنے آئے تو بندہ کو متنبہ فرمادیں، ان شاء اللہ حق واضح ہوجانے کے بعد اسے قبول کرنے میں تأمل نہ ہوگا۔ البتہ نصوصِ فقہیہ کی تعبیر و تشریح میں اختلافِ رائے دُوسری چیز ہے، جو ہر دور میں ہوتا رہا ہے، ایسے مواقع پر بھی بفضلہ تعالیٰ اپنے ذہن کو قوتِ دلیل کو قبول کرنے کے لئے ہر وقت آمادہ پاتا ہوں اور یہ دُعا کرتا رہتا ہوں کہ: "اَللّٰهُمَّ أَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَهُ وَأَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَهُ"۔

بندہ محمد تقی عثمانی عفی عنہ

جامعہ دارالعلوم کراچی

۱۱رذوالحجہ ۱۴۲۵ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ مرتب

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِهِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی، اَمَّا بَعْدُ:

اُستاذِ محترم حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ کی ذاتِ گرامی محتاجِ تعارف نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم وفضل اور تقویٰ وطہارت کے جس بلند مقام سے نوازا ہے، عصرِ حاضر میں اس کی مثال نہیں ملتی، جدید وقدیم علوم میں مہارت نے جہاں آپ کو اکابر کے لئے قابل صد رشک شخصیت بنادیا ہے، وہاں علم، تواضع اور سادگی کے حسین امتزاج نے آپ کو عوام کے لئے ہر دِل عزیز اور پُرکشش علمی و رُوحانی شخصیت بنادیا ہے۔

آپ تصوف اور دعوت وارشاد میں حکیم الاُمت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ اور عارف باللہ حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفی رحمہ اللہ کے علوم ومعارف کے ترجمان، اور علمِ فقہ، تفسیر اور علوم القرآن میں اپنے عظیم اور جلیل القدر والد ماجد مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کے جانشین اور علمِ حدیث میں محدث العصر علامہ ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ اور شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ کی علمی روایات کے حامل اور امین ہیں۔

دیگر علوم وفنون کی طرح فقہ اور فتویٰ کے میدان میں بھی اللہ تعالیٰ نے آپ سے بہت بڑا کام لیا ہے، اس سلسلے میں تکملہ فتح الملہم کی فقہی مباحث، بحوث قضایا فقہیہ معاصرہ، فقہی مقالات، اَحکام الاوراق النقدیۃ، عدالتی فیصلے، ملکیتِ زمین کی تحدید، وغیرہ فقہی میدان میں آپ کی نہایت اہم اور گراں قدر علمی وتحقیقی کتب ہیں، جدید مسائل میں آپ کی رائے کو عالمِ اسلام میں انتہائی مستند سمجھا جاتا ہے اور فقہی مجالس اور محاضرات میں آپ کی رائے کا نہ صرف پاک وہند میں بلکہ دُنیائے عرب میں بھی خصوصی وزن محسوس کیا جاتا ہے۔

معاشیات کے میدان میں آپ ان چند گنی چنی شخصیات میں سرِفہرست ہیں جن کی بدولت

آج الحمدللہ دُنیا میں اسلامی بینکنگ کا ایک بلاک وجود میں آ رہا ہے، جس میں بفضل اللہ مسلسل ترقی اور پیش رفت ہو رہی ہے۔

فقہی میدان میں آپ کی خدمات کا ایک بہت بڑا حصہ ہزاروں کی تعداد میں آپ کے لکھے ہوئے ان ''فتاویٰ'' کا ہے، جو آپ نے پچھلے تقریباً پینتالیس سالوں میں تحریر فرمائے ہیں، مگر حضرتِ والا کی یہ عظیم الشان علمی، تحقیقی اور فقہی خدمت، شائع نہ ہونے کی وجہ سے نظروں سے اوجھل رہی اور اب تک منظرِ عام پر نہیں آسکی۔

اگرچہ آپ نے اپنی اعلیٰ علمی صلاحیت کی بناء پر زمانۂ طالب علمی میں ہی فتاویٰ لکھنے شروع کردیئے تھے، (جس میں ''رمضان میں نفل کی جماعت'' سے متعلق ایک مفصل تحقیقی فتویٰ وہ ہے جو آپ نے صرف سولہ سال کی عمر میں لکھا، جبکہ آپ ابھی ضابطہ کے فارغ التحصیل بھی نہیں ہوئے تھے بلکہ موقوف علیہ میں پڑھتے تھے) مگر درجۂ تخصص اور اس سے فراغت کے بعد آپ نے اپنے والد ماجدؒ کی زیرِ نگرانی باقاعدہ فتویٰ لکھنا شروع کیا اور اس وقت سے اب تک بحمدہ تعالیٰ یہ سلسلہ چل رہا ہے۔ اس پورے عرصے کے تقریباً تمام فتاویٰ دارالافتاء دارالعلوم کراچی کے نقلِ فتاویٰ کے قدیم و جدید رجسٹروں میں محفوظ ہیں، مگر چونکہ بالکل ابتداء میں دارالافتاء میں فتاویٰ محفوظ رکھنے کا کوئی باقاعدہ اور منظم انتظام نہ تھا، اس لئے دارالافتاء کے بعض دیگر فتاویٰ کی طرح حضرتِ والا دامت برکاتہم کے شروع کے کچھ فتاویٰ بھی محفوظ نہ رہے۔

بہرحال اس کے باوجود حضرت کے ہزاروں خودنوشتہ فتاویٰ، نقلِ فتاویٰ کے مختلف رجسٹروں میں پھیلے ہوئے ہیں۔

بندہ کے دِل میں حضرت کے فتاویٰ کو جمع و ترتیب دینے کا خیال اس طرح پیدا ہوا کہ چند اہم عنوانات پر مشتمل ایسے فتاویٰ جو مفصل اور مدلل ہیں اور ان کی نشاندہی دارالافتاء کے نئے نظام کے مطابق تبویب کے رجسٹروں میں کی گئی ہے، ایک مرتبہ احقر نے ان چند فتاویٰ کو جمع کرکے حضرت کی خدمت میں پیش کیا کہ اگر انہیں شائع کردیا جائے تو مناسب رہے گا، حضرتِ والا نے ان فتاویٰ کو دیکھ کر فرمایا کہ ''اگر سب فتاویٰ جمع ہوجاتے تو اچھا تھا'' احقر نے اسی وقت حضرت کے سامنے دِل میں یہ عزم کرلیا کہ ان شاء اللہ بندہ یہ خدمت ضرور سرانجام دے گا۔ چنانچہ آج سے تقریباً چار سال قبل اللہ تعالیٰ کا نام لے کر یہ کام شروع کردیا۔

جب رجسٹروں سے یہ فتاویٰ جمع کرنا شروع کئے تو کئی مشکلات درپیش ہوئیں، مگر اس کے ساتھ ساتھ دِلچسپ بات یہ ہوئی کہ ان فتاویٰ کو جمع کرنے کا داعیہ بھی مضبوط ہوتا گیا، ابتدائی طور پر

مشکلات تو یہ پیش آئیں کہ پینتیس، چالیس سال پہلے بعض رجسٹر اب اتنے بوسیدہ ہو چکے تھے کہ ان کے ایک ایک صفحے کو پلٹنا، دیکھنا اور پھر ان سے فوٹو لینا تقریباً ناممکن معلوم ہوتا تھا۔ جلدوں کو دیمک لگ چکی تھی، بیچ سے کئی کئی صفحات پھٹے ہوئے اور بعض بالکل غائب تھے، بچا کھچا جو مواد زمانے کی دست بُرد سے محفوظ رہا وہ انتہائی بوسیدہ ہو چکا تھا۔ ایسے خستہ رجسٹر بندہ خود فوٹو اسٹیٹ والے کے پاس لے جاتا اور گھنٹوں دُکان پر کھڑے ہو کر انتہائی احتیاط سے ایک ایک صفحے کو پلٹ کر فوٹو اسٹیٹ کرواتا۔

مگر اس مشکل کے ساتھ ساتھ جو حیرت انگیز بات سامنے آئی وہ یہ کہ انہی خستہ اور بوسیدہ رجسٹروں میں حضرتِ والا دامت برکاتہم کے ایسے مفصل فتاویٰ موجود تھے جو اپنے موضوع پر جامع ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی محقق اور مدلل ہیں۔ اور چند ایسے موضوعات پر بھی حضرت کے تحقیقی فتاویٰ سامنے آئے جن پر دارالافتاء دارالعلوم کراچی کے کئی ساتھیوں کو فتاویٰ لکھتے وقت تحقیق کی ضرورت پیش آئی اور وہ ساتھی ہفتوں بلکہ مہینوں اس سلسلے میں پریشان رہے، جبکہ حضرتِ والا دامت برکاتہم کے اس ذخیرے میں ان موضوعات پر پہلے سے تیار شدہ محقق فتاویٰ موجود تھے، مگر پردۂ خفاء میں ہونے کی وجہ سے ان سے استفادہ ممکن نہ تھا۔

جب اس طرح کے کئی فتاویٰ وقتاً فوقتاً سامنے آتے رہے، تو دِل میں یہ داعیہ شدید تر ہوتا گیا کہ یہ اہم فقہی ذخیرہ فوری طور پر منظر عام پر آنا چاہئے، لہٰذا حتی المقدور جلد ہی سن ۱۳۸۲ھ سے اب تک کے فتاویٰ جمع کئے اور صرف وہی فتاویٰ جمع کئے جو حضرتِ والا دامت برکاتہم کے اپنے لکھے ہوئے ہیں، ورنہ وہ فتاویٰ جن پر حضرت کے تصدیقی دستخط ہیں وہ اس مجموعے سے کئی گنا زیادہ ہیں۔

حضرتِ والا دامت برکاتہم کے فتاویٰ کی اقسام

دراصل حضرتِ والا دامت برکاتہم کے فتاویٰ کو درج ذیل چار قسموں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے، جن میں سے پہلی تین قسم کے فتاویٰ اس مجموعے میں شامل کئے گئے ہیں:

۱:- وہ فتاویٰ جو دارالافتاء دارالعلوم کراچی سے باقاعدہ جاری کئے گئے اور دارالافتاء کے نقلِ فتاویٰ کے رجسٹروں میں ان فتاویٰ کا اندراج ہے۔

۲:- سن ۱۳۸۷ھ و ۱۳۸۸ھ کے زمانے میں ''البلاغ'' میں حضرتِ والا دامت برکاتہم کا ایک دِلچسپ علمی سلسلہ ''آپ کے سوال'' کے عنوان سے چلا تھا، جس میں بہت سے لوگ ''البلاغ'' کی معرفت آپ کے پاس سوالات بھیجتے تھے اور حضرت ''البلاغ'' میں ان کے جوابات دیا کرتے تھے، ان میں بعض انتہائی مفصل اور محقق جوابات بھی ہیں۔ ''البلاغ'' سے وہ تمام فتاویٰ بھی اس

مجموعے میں شامل کئے گئے ہیں، اور چونکہ ان فتاویٰ کا دارالافتاء کے رجسٹروں میں باقاعدہ اندراج نہیں ہوا تھا اس لئے ان فتاویٰ کا کوئی نمبر بھی موجود نہیں تھا، جو لکھا جاتا۔ تاہم حاشیہ میں ایسے فتاویٰ کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔

۳:- حسنِ اتفاق سے ان فتاویٰ کی جمع و ترتیب کے دوران حضرتِ والا دامت برکاتہم کو ایک دن اپنے گھر سے اپنے درجۂ تخصص کے زمانے کی ''تمرینِ افتاء'' کی کاپی مل گئی جو حضرت نے احقر کو عنایت فرمائی۔ اس کاپی میں حضرت کے تحریر فرمودہ تمام فتاویٰ آپ کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے تصحیح و تصدیق شدہ ہیں۔ ان میں بعض مفصل اور مدلل فتاویٰ بھی ہیں۔ مثلاً اس پہلی جلد میں ''تطہیرِ اشیاء کے طریقوں کی تعداد اور تفصیل'' کے عنوان پر جو فتویٰ ہے وہ اسی کاپی سے لیا گیا ہے۔ اسی طرح دُوسری جلد میں ''حجِ صرورہ'' سے متعلق ایک تفصیلی فتویٰ آنے والا ہے۔

اس کاپی کے تمام فتاویٰ بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں۔

۴:- حضرت نے اپنے کئی متعلقین کو ان کے خطوط کے جوابات میں بھی کئی فقہی سوالات کے جوابات عنایت فرمائے ہیں مگر حضرت کے ذاتی نوعیت کے خطوط کا چونکہ دارالافتاء میں اندراج نہیں ہوتا لہٰذا ایسے فتاویٰ اس مجموعہ میں شامل نہیں ہو سکے۔

مذکورہ چار قسموں میں سے ظاہر ہے کہ کثیر تعداد پہلی قسم کے فتاویٰ کی ہے جو دارالافتاء سے جاری کئے گئے، ان سب کو اس مجموعے میں شامل کرنے کے بعد بھی یہ سمجھنا دُرست نہ ہوگا کہ یہ حضرت والا کے تمام فتاویٰ ہیں، کیونکہ رجسٹروں سے ان فتاویٰ کو جمع کرنے کے دوران ایک افسوس ناک بات یہ سامنے آئی کہ سنہ ۱۳۸۴ھ و ۱۳۸۵ھ کا زمانہ جو حضرت کے فتاویٰ لکھنے کے عروج کا زمانہ تھا اور اس وقت دارالافتاء دارالعلوم میں فتاویٰ کے نقل کا انتظام بھی موجود تھا مگر اس کے باوجود بعض ناقلینِ فتاویٰ نے کئی ضخیم رجسٹروں میں فتاویٰ نقل کرتے وقت فتویٰ کے آخر میں مجیب کا نام ہی نہیں لکھا، عجیب بات یہ ہے کہ ہر سوال کے بعد سائل اور مستفتی کا نام تو بالالتزام لکھا ہے مگر فتویٰ کے آخر میں مجیب کا نام چھوڑ دیا۔

ایسے رجسٹر جب سامنے آئے تو بہت افسوس ہوا کہ ان رجسٹروں میں کئی طویل اور مفصل و محقق فتاویٰ موجود ہیں، مگر مجیب کی تعیین و تمیز نہ ہونے کی وجہ سے اب یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ اس میں کون سا فتویٰ کس شخصیت کا ہے؟ ادھر ان فتاویٰ کے مجیب کی تعیین و تمیز کا اب کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔ حضرتِ والا دامت برکاتہم کے لئے اپنی بے پناہ علمی مصروفیات کی بناء پر ان رجسٹروں کے ایک ایک صفحے کو جانچنا تقریباً ناممکن ہے اور فتاویٰ نقل کرنے والے حضرات میں سے بعض کا اب انتقال بھی ہو چکا ہے، وہ ہوں بھی تو اب یہ تعیین مشکل ہے کہ کون سا فتویٰ کس شخصیت کا لکھا ہوا ہے؟ ایسے فتاویٰ کی تبویب کا

کام کرنے والے متخصصین کے مقالوں کو بھی دیکھا، ان حضرات نے بھی مجیب کی تعیین کے بغیر ان پر کام کیا ہے، لہٰذا مجبوراً ایسے رجسٹروں میں موجود حضرت کے کئی نامعلوم فتاویٰ بھی اس مجموعے میں شامل نہیں کئے جاسکے۔ اب جب کبھی دارالافتاء دارالعلوم کے تمام عمومی فتاویٰ شائع ہوئے تو شاید ان میں یہ فتاویٰ بھی شائع ہوکر سامنے آسکیں۔ لہٰذا بعض فتاویٰ، شروع میں نقل کا انتظام نہ ہونے کی بناء پر، اور بعض مذکورہ صورتِ حال کی بناء پر اس مجموعہ میں شامل نہیں ہوسکے، اس لئے یہ سمجھنا دُرست نہ ہوگا کہ یہ حضرتِ والا دامت برکاتہم کے تمام فتاویٰ ہیں۔

طریقۂ کار

پہلے مرحلے میں حضرتِ والا دامت برکاتہم کے دستیاب تمام فتاویٰ کو جمع کیا گیا، اور دُوسرے مرحلے میں ان تمام فتاویٰ کو ان کے موضوعات کے اعتبار سے الگ الگ کرکے فقہی ابواب کی ترتیب کے مطابق رکھا گیا، اور اس میں جس فتویٰ میں صرف ایک سوال اور جواب ہے اسے تو متعلقہ موضوع اور باب میں رکھنا آسان تھا، مگر بہت سارے فتاویٰ ایسے ہیں کہ ان میں مستفتی نے الگ الگ موضوع سے متعلق کئی سوالات کئے ہیں اور ان میں ہر سوال، جواب کا باب اور موضوع الگ ہے، چونکہ ایک ہی کاغذ پر ہونے کی وجہ سے انہیں الگ الگ رکھنا ممکن نہ تھا، لہٰذا ایسے کئی فتاویٰ کو ہاتھ سے الگ لکھا گیا۔

جمع و ترتیب کے بعد تیسرے مرحلے میں اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ان فتاویٰ میں موجود حوالوں کی تخریج کی جائے، کیونکہ سن ۱۳۸۷ھ وغیرہ کے زمانے میں فتاویٰ شامیہ کا کوئی استنبولی نسخہ رائج تھا، جبکہ آج کل ''ایچ ایم سعید'' کا نسخہ متداول ہے، لہٰذا اسی نسخے کے مطابق شامی کی عبارات کی تخریج کی گئی ہے، چنانچہ بعض جگہوں پر ''ایچ ایم سعید'' کا پورا لفظ اور کہیں صرف ''سعید'' کا لفظ لکھا گیا ہے، جس سے یہی مراد ہے۔ اسی طرح تفسیر، حدیث اور فقہ کی دیگر کتب کا بھی یہی معاملہ ہے، لہٰذا ان کتب کے ان نسخوں کے مطابق تخریج کی گئی ہے جو نسخے ہمارے دیار میں رائج اور متداول ہیں۔ چنانچہ ہر عبارت کے شروع یا آخر میں کتاب کے نام کے ساتھ ساتھ مطبع وغیرہ کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ ساتھ ہی علمی فائدے کے پیشِ نظر اس کی تائید میں مزید حوالہ جات بھی لگائے گئے ہیں، کہیں پر عبارات اور کہیں صرف دیگر فقہی کتب کے صفحہ نمبر وغیرہ کی نشاندہی کی گئی ہے۔

چوتھے مرحلے میں یہ کام کیا گیا کہ جہاں فتویٰ میں کوئی حوالہ موجود نہیں تھا، وہاں پر حاشیے میں اس فتویٰ کے حوالے لکھ دیئے گئے ہیں، اور تخریج و تعلیق اور اضافۂ حوالہ جات کا یہ سارا کام متعلقہ فتویٰ کے نیچے حاشیے میں کیا گیا ہے، اور ترتیب یہ رکھی ہے کہ سب سے پہلے سوال، پھر جواب اور جواب میں

جہاں جہاں ضرورت تھی وہاں حاشیہ نمبر لگایا گیا ہے، پھر اسی فتویٰ کے نیچے لکیر لگا کر حاشیہ میں حوالے اور عبارات درج کی گئی ہیں۔

اور ہر فتویٰ کے آخر میں تاریخ بھی درج کردی گئی ہے، اور جس فتویٰ پر اکابر میں سے کسی کے دستخط ہیں وہاں ان حضرات کے نام ذکر کردیئے گئے ہیں، اور مصدق کے دستخط بھی چونکہ عموماً اسی تاریخ یا اس سے ایک آدھ دن بعد میں ہوا کرتے ہیں، لہٰذا مصدق کے نام کے نیچے تاریخ لکھنے کی ضرورت نہیں تھی، اس لئے صرف حضرتِ والا دامت برکاتہم کے نام کے نیچے تاریخ درج کی گئی ہے۔ تاہم چونکہ یہ سب فتاویٰ پُرانے رجسٹروں سے فوٹو اسٹیٹ کرائے گئے تھے اور فوٹو اسٹیٹ کرتے وقت اصل توجہ فتویٰ پر رہی اور تاریخ بعض اوقات صفحہ کے ایک طرف دائیں یا بائیں حصے میں درج ہوتی تھی، اس لئے بعض فتاویٰ کی فوٹو اسٹیٹ میں تاریخ آنے سے رہ گئی، لہٰذا ایسے فتاویٰ میں اندازے سے تاریخ لکھی گئی ہے، لیکن ایسے فتاویٰ کی تعداد بہت کم ہے۔

ہر فتویٰ کے آخر میں تاریخ کے نیچے ''فتویٰ نمبر'' بھی لکھا گیا ہے، اس فتویٰ نمبر سے دارالافتاء دارالعلوم کراچی کے نقلِ فتاویٰ کے رجسٹروں کا نمبر مراد ہے، اور یہ نمبر لکھنے کی غرض یہ ہے کہ اگر کبھی دارالافتاء کا کوئی ساتھی اصل کی طرف مراجعت کرنا چاہے تو بوقتِ ضرورت یہ مراجعت ممکن ہو۔ تاہم بعض فتاویٰ کی فوٹو اسٹیٹ میں ''فتویٰ نمبر'' نہ آسکنے کی بناء پر ایسے فتاویٰ کے آخر میں فتویٰ کا نمبر نہیں دیا جاسکا، مگر ایسے فتاویٰ کی تعداد بھی بہت کم ہے۔

خصوصیات

* چونکہ حضرتِ والا اپنے مزاج و مذاق کی بناء پر حکیم الاُمت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا ظفر احمد عثمانی، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہم اللہ کی علمی روایات کے امین ہیں، لہٰذا ان حضرات کی طرح حضرت کے فتاویٰ کی بھی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں الحمدللہ تحقیق اور اعتدال کا وصف نمایاں ہے۔

* اس مجموعے میں جدید مسائل پر بھی کئی فتاویٰ ہیں، پہلی جلد میں نسبتاً کم ہیں، جبکہ بعد کی جلدوں میں خصوصاً ''فقہ المعاملات'' جس پر حضرت کو خصوصی دسترس حاصل ہے، سے متعلق کئی جدید فتاویٰ ہیں۔

* ویسے تو عوام و خواص کے نزدیک حضرتِ والا کی رائے کو انتہائی محقق و مستند سمجھا جاتا ہے اور کسی فتویٰ کے مستند ہونے کے لئے حضرت کی تصدیق کو ہی کافی سمجھا جاتا ہے، مگر ان فتاویٰ کی ایک

زائد خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں سے کئی فتاویٰ پر مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ، حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب رحمہ اللہ، حضرت مولانا سحبان محمود صاحب رحمہ اللہ، حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ کے تصدیقی دستخط موجود ہیں، جس سے ان فتاویٰ کے درجۂ استناد میں مزید تقویت پیدا ہوجاتی ہے۔

* فتویٰ میں حضرتِ والا دامت برکاتہم کے تحریر فرمودہ حوالہ جات اور اس کے ساتھ ساتھ حواشی میں ذکر کردہ عبارات اور حوالوں کی بناء پر عوام کے علاوہ اہلِ علم، خصوصاً اہلِ فتویٰ کے لئے بھی اس ذخیرے سے بھرپور علمی وتحقیقی استفادہ آسان ہوگیا ہے۔

احقر کی سوچ اور اندازے کے مطابق یہ کام بہت پہلے منظرِ عام پر آجانا چاہئے تھا، اس کی ترتیب، تخریج اور اضافۂ حوالہ جات کا کام بھی بہت پہلے ہوچکا ہوتا، مگر کمپوزنگ میں اغلاط کی کثرت، اور بار بار کی تصحیح وغیرہ کی بناء پر یہ کام مؤخر ہوتا چلا گیا، بالآخر کافی عرصہ خود کمپوزر کے پاس بیٹھ کر تصحیح کرواکر پہلی جلد کا کام مکمل کیا، اس طرح یہ کام احقر کے اندازے سے تقریباً دو سال تاخیر سے منظرِ عام پر آرہا ہے۔

اس کے باوجود اس میں کہیں نفسِ مضمون کی، کہیں حوالے اور عبارت کی، اور کہیں کمپوزنگ کی غلطیوں کا امکان موجود ہے، اس طرح کی تمام تر غلطیوں کی ذمہ داری احقر پر ہے، حضرتِ والا دامت برکاتہم کی ذات اس سے بَری ہے۔ قارئین سے درخواست ہے کہ ایسی غلطیوں سے احقر کو مطلع فرمائیں تاکہ اگلے ایڈیشنوں میں ان کی تصحیح کی جاسکے۔

دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم کو ان کے مقاصدِ حسنہ میں کامیابی عطا فرمائیں اور انہیں بعافیت عمرِ دراز عطا فرماکر ان کا سایہ تادیر ہم سب پر قائم رکھیں، آمین۔

آخر میں قارئین سے احقر، اس کے والدین اور اساتذہ کے لئے بھی دُعاؤں کی درخواست ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں عافیتِ دارین عطا فرمائیں۔

اور اللہ تعالیٰ اس کتاب کو اپنے دربار میں شرفِ قبول سے نواز کر ہمارے لئے اسے ذخیرۂ آخرت بنائیں، آمین۔ انه علی ما یشاء قدیر وبالإجابة جدیر.

احقر

محمد زبیر حق نواز

اُستاذ و رفیق دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی

۲۷/۱۰/۱۴۲۵ھ

کتاب الإیمان والعقائد

(ایمان وعقائد کا بیان)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿فصل فی المتفرّقات﴾
(ایمان وعقائد سے متعلق متفرق مسائل کا بیان)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نعل مبارک کے نقش کو چومنے، اس جیسے نعل پہننے اور اس کے احترام کا حکم

سوال:- مکرّم ومحترم جناب مفتی صاحب، دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، امابعد!

۱:- جو چیز سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے جسدِ اطہر سے متصل ہوگئی، اس کی برکات کا انکار تو کوئی جاہل یا ملحد ہی کرے گا، لیکن اس شے کی مثل ہاتھ سے تیار کرلی جائے تو کیا اس میں بھی وہ برکت آجاتی ہے؟ بالفاظ دیگر متبرک شے کی تصویر بھی متبرک ہوتی ہے؟

۲:- آج کل سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے نعل مبارک کا نقشہ بہت عام ہوگیا، لوگ اس کو چومتے ہیں، برکت کے لئے سر پر رکھتے ہیں، اس کی کیا حیثیت ہے؟ اس نقشے کی یہ حیثیت مُسلّم کہ اس سے آپ صلی علیہ وسلم کے نعل مبارک کی صورت معلوم ہوگئی، روایاتِ حدیث میں مذکور نعل کا سمجھنا آسان ہوگیا۔

۳:- کیا اس نقشے کے مطابق نعل بنواکر استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر ادا ہمارے لئے نمونہ ہے، آپؐ کی پگڑی جیسی پگڑی، قمیص جیسی قمیص بنوانا، پہننا سب باعثِ سعادت اور محبت کا تقاضا ہے، کیا آپؐ کے جوتے جیسا جوتا پہننا بھی محبت کا تقاضا ہے یا نہیں؟

۴:- نیز یہ بھی قابلِ دریافت ہے کہ یہ نقشہ اس وقت عام مروّج تھا یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص تھا؟ آپؐ کا نعل مبارک صحابہ رضوان اللہ علیہم کے زمانے میں موجود تھا، دیگر مستعمل کپڑوں، برتنوں کی طرح اس کو سنبھال کر رکھا گیا۔ جن حضرات کے پاس یہ موجود نہیں تھا، کیا کسی روایت سے ثابت ہے کہ وہ لوگ کاغذ پر اس کی صورت بناکر برکت حاصل کرتے ہوں؟ اگر ثابت نہ ہو تو آج اس کو باعثِ ثواب سمجھنا، سفر میں ساتھ رکھنا، برکت کے لئے دُکانوں، مکانوں پر لگانا کیا بدعت نہیں ہوگا؟

۵:- روضۂ اقدس کی صحیح تصویر یعنی فوٹو، بیت اللہ کی صحیح تصویر بھی باعثِ برکت ہے یا نہیں؟ اب لوگ ان کپڑوں اور قالینوں پر نماز پڑھنا بے ادبی سمجھنے لگ گئے ہیں جن پر روضۂ اقدس کی تصویر ہو، اس کی کیا حیثیت ہے؟

۶:- اب نقشِ خاتم بھی شائع ہوگیا ہے، لوگ اس کے تصور کو انوار و برکات کا باعث سمجھنے لگے ہیں، اس کی کیا شرعی حیثیت ہے؟ مجھے خطرہ ہے کہ غالی لوگوں کی طرف سے جلد ہی آپؐ کی اُونٹنی اور بغل اور حمار کی مثل شائع ہوکر ان کا بھی احترام نہ شروع ہوجائے۔ میرے غیر مرتب الفاظ کو اپنے مرتب الفاظ میں منتقل کر کے سوال و جواب اپنے ماہنامہ ''البلاغ'' میں شائع فرمادیں تو میرے جیسے کئی متحیر لوگوں کی رہنمائی ہوجائے گی۔

والسلام

عبدالمجید غفرلہٗ

باب العلوم، کہروڑ پکا

بخدمتِ اقدس جناب مولانا عبدالمجید صاحب مدظلہم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اُمید ہے مزاجِ گرامی بخیر ہوں گے۔

آپ کا مفصل استفتاء نعل مبارک کے نقشے کے بارے میں کافی عرصہ پہلے مل گیا تھا، وہ برابر زیرِ غور رہا، آخر میں مشورے کے لئے حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی کی خدمتِ گرامی میں پیش کیا، ہماری خوش قسمتی ہے کہ حضرتِ والا خود جواب تحریر فرمانے کے لئے تیار ہوگئے، چنانچہ یہ جواب حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی کا لکھا ہوا ہے۔

والسلام

بندہ عبدالرؤف سکھروی

۲۰/۷/۱۴۱۶ھ

مخدومِ گرامی قدر حضرت مولانا عبدالمجید صاحب مدظلہم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آنجناب کا گرامی نامہ مولانا مفتی عبدالرؤف صاحب کے نام آیا تھا، انہوں نے احقر کو مشورے کے لئے بھیجا، احقر نے جو کچھ سمجھ میں آیا، لکھ دیا، اور آنجناب کی خدمت میں اس خیال سے ارسال کر رہا ہوں کہ اگر کوئی غلطی ہوگی تو آنجناب اس پر متنبہ فرمائیں گے۔

والسلام

احقر محمد تقی عثمانی

۲۰/۶/۱۴۱۶ھ

جواب ۱، ۲:- شاید جناب کے علم میں ہوگا کہ حکیم الاُمت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ ''زاد السعید'' میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے نعل مبارک کا نقشہ شائع فرمایا تھا اور اس کو سر پر رکھ کر دُعا کرنے کی بھی فی الجملہ ترغیب دی تھی، اور اس سلسلے میں ایک رسالہ بھی تحریر فرمایا تھا، بعد میں حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر حضرتؒ سے خط و کتابت کی جو کفایت المفتی جلد:۲ صفحہ:۶۱ تا ۶۹ (۱) اور امداد الفتاویٰ جلد:۴ صفحہ:۳۲۸ تا ۳۳۲ (۲) میں مکمل شائع ہوچکی ہے۔ اس خط و کتابت کے مطالعے سے مسئلے کی شرعی حیثیت بڑی حد تک واضح ہوجاتی ہے۔ اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جہاں تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان آثارِ متبرکہ کا تعلق ہے جو آپؐ کے زیرِ استعمال رہے ہوں یا آپؐ کے جسمِ اطہر سے مس ہوئے ہوں، ان سے تبرک یا انہیں بوسہ دینا یا سر پر رکھنا متعدّد صحابہ کرامؓ اور علمائے متقدمین سے ثابت ہے، اور جیسا کہ خود آنجناب نے ذکر فرمایا ہے وہ محلِ اشکال نہیں۔ البتہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان آثارِ متبرکہ کی کوئی تصویر بنائی جائے یا اس کا کوئی نقشہ بنایا جائے تو وہ اگرچہ اصل آثار کے مساوی نہ ہوگا، لیکن چونکہ اصل کے ساتھ مشابہت اور مشاکلت کی وجہ سے اس کو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے فی الجملہ ایک نسبت حاصل ہے، اس لئے اگر کوئی شخص اپنے شوقِ طبعی اور محبت کے داعیہ سے اس کا بھی ادب کرے اور اسی محبت کے داعیہ سے اسے بوسہ دے یا آنکھوں سے لگائے تو فی نفسہٖ اس کی ممانعت پر بھی کوئی دلیل نہیں، لہٰذا فی نفسہٖ ایسا کرنا مباح ہوگا، بلکہ جس محبت کے داعیہ سے ایسا کیا جارہا ہے وہ محبت ان شاء اللہ موجبِ اجر بھی ہوگی بشرطیکہ اس خاص عمل کو بذاتہٖ عبادت نہ سمجھا جائے، کیونکہ عبادت کے لئے ثبوتِ شرعی درکار ہے۔ البتہ جواز کے لئے کسی مستقل دلیل کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کے لئے ممانعت کی دلیل نہ ہونا بھی کافی ہے۔ اور اس تفصیل میں دونوں صورتیں شامل ہیں، خواہ نقش اصل کے بالکلیہ مطابق ہو یا بالکلیہ مطابق نہ ہو، کیونکہ مشابہت کی وجہ سے فی الجملہ نسبت دونوں کو حاصل ہے۔

یہ تو مسئلے کی اصل حقیقت تھی، لیکن چونکہ ان نازک حدود کو سمجھنا اور ان کی نزاکت کو ملحوظ رکھنا عوام کے لئے مشکل معلوم ہوتا ہے، اور اس بات کا اندیشہ ہے کہ اس میں حدود سے تجاوز نہ ہوجائے، مثلاً یہ کہ ان اعمال کو بذاتہٖ عبادت سمجھا جانے لگے یا ادب و تعظیم میں حدود سے تجاوز ہوکر مشرکانہ افعال یا اعتقادات اس کے ساتھ نہ مل جائیں۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ ان نقشوں کی عمومی تشہیر اور ان کی طرف ترغیب وغیرہ سے اجتناب ہی کیا جائے، اس لئے حضرت حکیم الاُمت قدس اللہ سرہٗ نے اپنے

---

(۱) کفایت المفتی ج:۲ ص:۹۱ تا ۹۹ (طبع جدید دار الاشاعت)

(۲) امداد الفتاویٰ ج:۴ ص:۳۷۰ تا ۳۷۹، ۵۳۳ تا ۵۳۶ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)

رسالہ "نیل الشفاء بنعل المصطفی صلی اللہ علیہ وسلم" سے بعد میں رُجوع فرمالیا تھا۔

خلاصہ یہ کہ تشہیر کی ہمت افزائی نہیں کرنی چاہئے، لیکن اگر کوئی شخص حدود میں رہ کر مذکورہ افعال کرتا ہے تو اس پر نکیر بھی دُرست نہیں۔

۳:- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نعل شریف جیسی نعل بنواکر پہننے کے جواز یا عدمِ جواز کے بارے میں فقہائے کرامؒ کی کوئی تصریح تو نہیں دیکھی، البتہ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ معاملہ ذوق کا ہے، اور مذاق مختلف ہوسکتے ہیں، ایک مذاق یہ ہے کہ جس چیز کو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے آثارِ متبرکہ میں سے کسی کے ساتھ مشابہت حاصل ہو وہ تو سر اور آنکھوں پر رکھنے کی چیز ہے، نہ یہ کہ اس کو پاؤں میں استعمال کیا جائے، لہٰذا اگر کوئی شخص اس مذاق کے تحت اسے پہننے سے احتراز کرے تو یہ اس کے مذاقِ تعظیم ومحبت کا تقاضا ہے جس پر وہ قابلِ ملامت نہیں، جیسا کہ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ کے بارے میں منقول ہے کہ سبز رنگ کا جوتا بھی اس لئے نہیں پہنتے تھے کہ گنبدِ خضراء کا رنگ سبز ہے۔ اور دُوسرا مذاق یہ ہے کہ انسان اپنے ہر عمل اور ہر ادا میں حتی الامکان حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اداؤں کی نقل اُتارنے کی کوشش کرے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لباس جیسا لباس پہنے، اور اس نقطۂ نظر سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نعل مبارک جیسا نعل بنواکر پہنے اور مقصود اِتباع ہو تو بظاہر اس پر بھی ممانعت کی کوئی دلیل نہیں، بلکہ یہ بھی محبت کا تقاضا ہے۔ چونکہ اس کا مقصود اِتباع ہے، اس لئے بظاہر اس میں اہانت کا بھی کوئی پہلو نہیں۔ چنانچہ صحابہ وتابعین رضی اللہ عنہم اجمعین سے یہ کہیں منقول نہیں کہ انہوں نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے نعل مبارک جیسے جوتے پہننے سے احتراز کا اہتمام کیا ہو، بالخصوص جبکہ اس دور میں جوتوں کی اوضاع میں اتنا تنوع بھی نہیں تھا، لہٰذا جیسا عرض کیا گیا یہ ذوق کی بات ہے اور کوئی ذوق قابلِ ملامت نہیں۔

۴:- یہ بات تلاش کے باوجود نہیں مل سکی کہ آیا یہ نقشہ عام مروّج تھا یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص تھا۔

۵،۶:- روضۂ اقدس یا بیت اللہ کی صحیح تصویر کا حکم بھی قریب قریب ایسا ہی ہے کہ ان کو اصل کے ساتھ تشابہ کی ایک نسبتِ قویہ حاصل ہے، نیز انہیں دیکھ کر اس کا استحضار قوی ہوتا ہے، لہٰذا ان کا احترام کرنا چاہئے، یعنی ان کو کسی موضعِ اہانت میں استعمال کرنا دُرست نہیں، جہاں تک ان کے باعثِ برکت ہونے کا تعلق ہے، یہ بات واضح ہے کہ کسی جگہ ان کے لگانے سے ان شعائر کا بار بار اِستحضار ہوتا ہے، اور یہ اِستحضار یقیناً باعثِ برکت ہے۔

جانمازوں پر فی نفسہٖ کسی بھی قسم کے نقش پسندیدہ نہیں، لیکن اگر کسی جائے نماز پر حرمین شریفین

میں سے کسی کی تصویر اس طرح بنی ہوئی ہے کہ وہ پاؤں کے نیچے نہیں آتی تو اس میں بھی اہانت کا کوئی پہلو نہیں، البتہ موضعِ سجود میں بیت اللہ کے سوا کسی اور چیز کی تصویر بالخصوص روضۂ اقدس کی شبیہ میں چونکہ ایہام خلافِ مقصود کا ہوسکتا ہے اس لئے اس سے احتراز مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۷:- نقشِ خاتم کے بارے میں بھی وہی تفصیل ہے جو نقشِ نعلین کے بارے میں عرض کی گئی، البتہ ظاہر ہے کہ ان غیر ذی رُوح اشیاء کے نقوش پر ذی رُوح کے نقوش کو ہرگز قیاس نہیں کیا جاسکتا، کہ ذی رُوح کا نقش یا تصویر بہر صورت ممنوع ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۱۶/۶/۲۰ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۰/۲۰۳)

الجواب صحیح

محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ

دارالافتاء دارالعلوم کراچی ۱۴

۱۴۱۶/۷/۲۱ھ

کفار کے نابالغ بچوں کا کیا حکم ہے؟

سوال:- ایک بچہ کافر کے گھر پیدا ہوا اور بچپن ہی میں مرگیا، کیا یہ بچہ جنت میں جائے گا یا نہیں؟

جواب:- کافروں کے گھر پیدا ہونے والا بچہ جس کے ماں باپ دونوں کافر ہوں، دُنیوی اَحکام کے لحاظ سے کافروں ہی کے حکم میں ہوتا ہے، لیکن آخرت کے اَحکام کے لحاظ سے اس کا کیا ہوگا؟ جنت میں جائے گا یا جہنم میں؟ اس کے بارے میں علماء کا اختلاف رہا ہے،[۱] صحیح علم اللہ ہی کو ہے، اور اس مسئلے پر دین کا کوئی عملی مسئلہ موقوف نہیں، لہٰذا اس کی کھود کرید میں پڑنا ٹھیک نہیں۔ ''من حسن اسلام المرء ترکه ما لا یعنیه''۔[۲]

واللہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۱۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۵۲۴/۲۷ و)

سوشلزم کی حمایت کرنے والے کا حکم

سوال:- سوشلزم کی حمایت کرنے والے (سوشلزم معاشرہ جو کہ اسلام کے خلاف ہے) کا شریعت کی رُو سے کیا مقام ہے؟

۲:- نظامِ مصطفیٰ پر قربان ہونے والے اور مخالفینِ نظامِ مصطفیٰ کا کیا مقام ہے؟

جواب ۱:- سوشلزم کی حمایت اگر اس بناء پر کی جائے کہ سوشلزم کا معاشی پروگرام (معاذ اللہ) اسلام کی معاشی تعلیمات سے افضل ہے، تو یہ صریح کفر ہے، اور اگر اس لحاظ سے کی جائے کہ اسلام کے

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے: فتاویٰ شامیة "مطلب فی أطفال المشرکین" ج:۲ ص:۱۹۲ (طبع ایچ ایم سعید)

(۲) جامع الترمذی ابواب الزھد عن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم ج:۲ ص:۵۵ (طبع فاروقی کتب خانه)

اَحکام صرف عبادات وغیرہ سے متعلق ہیں، اور معیشت میں اسلام کے اَحکام واجب التعمیل نہیں تو یہ بھی صریح کفر ہے۔ اور اگر اس غلط فہمی کی بناء پر کی جائے کہ اسلام کے معاشی اَحکام سوشلزم کے معاشی اَحکام کے (معاذ اللہ) موافق ہیں تو شدید گمراہی ہے، یہ تمام عقائد بہرصورت باطل اور واجب الترک ہیں، اور ان سے توبہ واجب ہے۔

۲:- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین اور اَحکام پر قربان ہونا موجبِ صد اَجر وفضیلت اور بہت بڑی سعادت ہے، اور اس کی مخالفت کفر اور بدترین شقاوت ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۷/۶/۱۳۹۷ھ

اسمائے حسنیٰ میں سے کون سے اسماء بندوں کے لئے استعمال کئے جاسکتے ہیں؟

سوال:- آج کل عموماً باری تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کے ساتھ ''عبد'' کے اضافے کے ساتھ نام رکھے جاتے ہیں، مگر عموماً غفلت کی وجہ سے مسمّٰی کو بدون ''عبد'' کے پکارا جاتا ہے، حالانکہ بعض اسماء، باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہیں، مثلاً عبدالرزاق وغیرہ، اندریں احوال اپنی جستجو کے مطابق فیض الباری ج:۴ ص:۴۲۳ سے اسمائے حسنیٰ درج کر رہا ہوں، تحقیق فرمائیں کہ کون سے اسماء، باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہیں، کہ ان کو بدون ''عبد'' کے مخلوق کے لئے استعمال کرنا گناہِ کبیرہ ہے، اگر ان کے علاوہ اور کوئی اسماء ہوں تو وہ بھی درج فرمائیں مع تحقیق کے، نیز اسماء کے شروع یا آخر میں ''محمد'' یا ''احمد'' یا ''اللہ'' کا اضافہ کیسا ہے؟ مثلاً محمد متکبر، خالق احمد، محمد اللہ، احمد رزّاق۔

اللہ، الرحمٰن، الرحیم، الملک، القدوس، السّلام، المؤمن، المھیمن، العزیز، الجبّار، المتکبر، الخالق، البارئ، المصوّر، الغفّار، القھّار، التّواب، الوھّاب، الخلّاق، الرزّاق، الفتّاح، الحلیم، العلیم، العظیم، الواسع، الحکیم، الحیّ، القیّوم، السمیع، البصیر، اللّطیف، الخبیر، العلیّ، الکبیر، المحیط، القدیر، المولٰی، النصیر، الکریم، الرقیب، القریب، المجیب، الحفیظ، المقیت، الودود، المجید، الوارث، الشھید، الولیّ، الحمید، الحقّ، المبین، الغنیّ، المالک، القویّ، المتین، الشدید، القادر، المقتدر، القاھر، الکافی، الشاکر، المستعان، الفاطر، البدیع، الفاخر، الأوّل، الأخر، الظاھر، الباطن، الکفیل، الغالب، الحکم، العالم، الرفیع، الحافظ، المنتقم، القائم، المحیی، الجامع، الملیک، المتعالی، النور، الھادی،

الغفور، الشکور، العفوّ، الرءوف، الاکرام، الأعلیٰ، البر، الخفیّ، الرّبّ، الالٰہ، الأحد، الصمد، الذی لم یلد، ولم یولد، ولم یکن لہ کفوا أحد.

جواب:- کسی کتاب میں یہ تفصیل تو نظر سے نہیں گزری کہ کون کون سے اسمائے حسنیٰ صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے مخصوص ہیں، اور کون سے اسماء کا اطلاق دُوسروں پر ہوسکتا ہے، لیکن مندرجہ ذیل عبارتوں سے اس کا ایک اُصول معلوم ہوتا ہے:-

تفسیر رُوح المعانی میں علامہ آلوسیؒ لکھتے ہیں: "وذکر غیر واحد من العلماء أن ھٰذہ الأسماء .... تنقسم قسمة أخری الی ما لا یجوز اطلاقه علی غیرہ سبحانه وتعالیٰ کاللہ والرحمٰن، وما یجوز کالرحیم، والکریم." (رُوح المعانی ج:۹ ص:۱۲۳ طبع مکتبہ رشیدیہ لاہور)

اور درمختار میں ہے: "وجاز التسمیة بعلیّ ورشید من الأسماء المشترکة، ویراد فی حقنا غیر ما یراد فی حق اللہ تعالیٰ. وفی رد المحتار: الذی فی التاتارخانیة عن السراجیة التسمیة باسم یوجد فی کتاب اللہ تعالیٰ کالعلیّ والکبیر والرشید والبدیع جائزة .... الخ." (شامی ج:۵ ص:۲۶۸)[1]۔

وفی الفتاویٰ الهندیة: التسمیة باسم لم یذکرہ اللہ تعالیٰ فی عبادہ ولا ذکرہ رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم ولا استعمله المسلمون تکلموا فیه، والأولیٰ أن لا یفعل کذا فی المحیط. (فتاوی عالمگیریة ص:۳۶۲ حظر و اباحت باب ۲۲)[2]۔

اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:-

> اسمائے حسنیٰ میں بعض نام ایسے بھی ہیں جن کو خود قرآن و حدیث میں دُوسرے لوگوں کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہے، اور بعض وہ ہیں جن کو سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کے لئے استعمال کرنا قرآن و حدیث سے ثابت نہیں۔ تو جن ناموں کا استعمال غیراللہ کے لئے قرآن و حدیث سے ثابت ہے وہ نام تو اوروں کے لئے بھی استعمال ہوسکتے ہیں جیسے رحیم، رشید، علی، کریم، عزیز وغیرہ۔ اور اسمائے حسنیٰ میں سے وہ نام جن کا غیراللہ کے لئے استعمال کرنا قرآن و حدیث سے ثابت نہیں، وہ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہیں، ان کو غیراللہ کے لئے استعمال کرنا الحاد مذکور میں داخل اور ناجائز وحرام ہے۔
>
> (معارف القرآن ج:۴ ص:۱۳۲ سورۂ اعراف:۱۸۰)

---

(۱) الدر المختار مع رد المحتار (الحظر والاباحة) ج:۶ ص:۴۱۷ (طبع سعید).
(۲) ج:۵ ص:۳۶۲ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه)

ان عبارتوں سے اس بارے میں یہ اُصول مستنبط ہوتے ہیں:-

نمبر۱:- وہ اسمائے حسنیٰ جو باری تعالیٰ کے اسمِ ذات ہوں یا صرف باری تعالیٰ کی صفاتِ مخصوصہ کے معنی ہی میں استعمال ہوتے ہوں، ان کا استعمال غیراللہ کے لئے کسی حال جائز نہیں، مثلاً: اللہ، الرحمٰن، القدوس، الجبّار، المتکبّر، الخالق، الباریٔ، المصوّر، الرزّاق، الغفّار، القهّار، التوّاب، الوهّاب، الخلّاق، الفتّاح، القيّوم، الرّبّ، المحيط، المليک، الغفور، الأحد، الصّمد، الحق، القادر المحيي.

۲:- وہ اسمائے حسنیٰ جو باری تعالیٰ کی صفاتِ خاصہ کے علاوہ دُوسرے معنی میں بھی استعمال ہوتے ہوں اور دُوسرے معنی کے لحاظ سے ان کا اطلاق غیراللہ پر کیا جاسکتا ہو، ان میں تفصیل یہ ہے کہ اگر قرآن و حدیث، تعامُلِ اُمت یا عرفِ عام میں ان اسماء سے غیراللہ کا نام رکھنا ثابت ہو تو ایسا نام رکھنے میں مضائقہ نہیں، مثلاً: عزیز، علی، کریم، رحیم، عظیم، رشید، کبیر، بدیع، کفیل، ہادی، واسع، حکیم وغیرہ، اور جن اسمائے حسنیٰ سے نام رکھنا نہ قرآن و حدیث سے ثابت ہو اور نہ مسلمانوں میں معمول رہا ہو، غیراللہ کو ایسے نام دینے سے پرہیز لازم ہے۔

۳:- مذکورہ دو اُصولوں سے یہ اُصول خودبخود نکل آیا کہ جن اسمائے حسنیٰ کے بارے میں یہ تحقیق نہ ہو کہ قرآن و حدیث، تعامُلِ اُمت یا عرف میں وہ غیراللہ کے لئے استعمال ہوئے ہیں یا نہیں؟ ایسے نام رکھنے سے بھی پرہیز لازم ہے، کیونکہ اسمائے حسنیٰ میں اصل یہ ہے کہ ان سے غیراللہ کا نام رکھنا جائز نہ ہو، جواز کے لئے دلیل کی ضرورت ہے۔

ان اُصولوں پر تمام اسمائے حسنیٰ کے بارے میں عمل کیا جائے، تاہم یہ جواب چونکہ قواعد سے لکھا ہے اور ہر ہر نام کے بارے میں اسلام کی کوئی تصریح احقر کو نہیں ملی، اس لئے اگر اس میں دُوسرے اہلِ علم سے بھی استصواب کرلیا جائے تو بہتر ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۲۷ھ

(فتویٰ نمبر ۶۶۳/۲۸ ب)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ”یا محمد“ کے الفاظ لکھنا

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع اس مسئلے میں کہ ایک مسجد جسے اب سے تقریباً پچیس سال قبل تعمیر کیا گیا تھا، اور وقتِ تعمیر جس میں ”یا اللہ“ اور ”یا محمد“ کے الفاظ بھی کندہ کرائے گئے تھے اور پچیس سال سے مسلسل موجود تھے، لیکن سوءِ اتفاق سے ایک نئے امام صاحب مسجد میں تشریف لائے اور انہوں نے لفظ ”یا“ مسمار کردیا۔ اب جواب طلب امر یہ ہے کہ کیا مسجد میں کندہ

کسی لفظ کو یا مسجد کے کسی حصے کو منہدم کیا جاسکتا ہے؟ کیا شرعاً ایسا کرنا جائز ہے؟ اگر ''یا اللہ''، ''یا محمد'' کے الفاظ کو بعینہٖ برقرار رکھا جائے تو اس میں کوئی شرعی قباحت موجود تھی؟ براہِ کرم مذکورہ بالا استفتاء کا مستند و معتبر جواب عطا فرما کر ممنون فرمایئے، ساتھ ہی ساتھ اس بارے میں یہ بھی بتائیں کہ اس نازیبا حرکت اور گستاخی کا کفارہ کیا ادا کیا جائے؟

جواب:- حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ''یا محمد'' کے الفاظ لکھنا بے ادبی ہے، اس نام سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی سوائے بعض کفار و مشرکین کے کوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ پکارتا تھا، اور کفار بھی اکثر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اس بے ادبی کو گوارا نہ کرتے تھے بلکہ کنیت سے پکارتے تھے، اس کے علاوہ اس نداء میں عقیدۂ فاسدہ کا ایہام ہے، اس لئے یہ لفظ اس طرح لکھنا دُرست نہیں۔[1] اگر کسی شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کے خیال سے اس کے ساتھ لفظ ''یا'' مٹادیا تو اس کو مسجد کی بے ادبی یا گستاخی نہیں کہا جاسکتا، بلکہ یہ تعظیمِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و محبتِ رسول کا تقاضا تھا جو اس نے کیا، البتہ اس کی وجہ سے اگر مسجد میں کوئی بدزیبی پیدا ہوگئی یا مرمت کی ضرورت پڑگئی ہو تو اسی شخص کو چاہئے کہ مسجد کی مرمت کرادے، اور اگر وہ تنگ دست ہو تو دُوسرے مسلمانوں کو اس معاملے میں اس کی مدد کرنی چاہئے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۸۸/۹/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۵۸/۳۰ د)

اگر کسی کو چھ کلمے یاد نہ ہوں تو اس کا کیا حکم ہے؟

سوال:- جب کوئی آدمی کلمۂ توحید پڑھ لے تو وہ مسلمان ہوگیا، پھر عام طور پر جو مشہور ہے اور نماز و وظائف کے چھوٹے چھوٹے رسالوں میں جو چھ کلمے لکھے ہوئے ہیں اور عام طور سے بچوں کو یاد کرائے جاتے ہیں، کیا یہ کلمے بھی اسلام کی بنیاد شمار کئے جائیں گے یا نہیں؟ اگر یہ کلمے کسی کو یاد نہ ہوں تو اس کے اسلام میں فرق ہوگا یا نہیں؟

اور پانچویں کلمے کے الفاظ میں فرق ہے، بعض رسالوں میں "أستغفر الله ربی من كل ذنب أذنبته .... الخ"، اور بعض رسالوں میں "أستغفر الله أنت ربی وأنا عبدک .... الخ" ہے، دُوسری قسم کے الفاظ عام نہیں ہیں، اس کی وجہ سے دو آدمیوں میں لڑائی ہو رہی ہے، براہِ کرم اس کی وضاحت فرمادیں۔

---

(۱) "لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا. الآية (سورة النور:۶۳) تفصیل کے لئے دیکھئے تفسیر معارف القرآن ج:۶ ص:۴۵۵۔ (محمد زبیر حق نواز)

جواب:- اسلام کی بنیاد دراصل ان عقائد پر ہے جو ایمانِ مفصل میں بیان کئے گئے ہیں، لہٰذا ان عقائد پر ایمان رکھنا تو مسلمان ہونے کے لئے ضروری ہے۔[1] اسی طرح کلمۂ توحید یا کلمۂ شہادت چونکہ اپنے عقائد کا اجمالی اعلان ہے، اس لئے یہ ہر مسلمان کو یاد ہونا چاہئے، باقی جو کلمات نماز وغیرہ کی کتابوں میں لکھے ہیں، انہیں بچوں کی تعلیم کی آسانی کے لئے لکھ دیا گیا ہے، ورنہ درحقیقت ان کا وہ مقام نہیں جو کلمۂ توحید، کلمۂ شہادت یا ایمانِ مفصل کا ہے۔ اگر یہ کلمات کسی کو یاد نہ ہوں تو اس سے ایمان میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا،[2] البتہ چونکہ ان کلمات کا پڑھنا بہت موجبِ اجر وثواب ہے اور مسلمانوں کو ان کا وِرد رکھنا چاہئے اس لئے بچوں کو یہ تمام کلمات سکھا دینے چاہئیں، اور کلمۂ استغفار میں اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ احادیث میں استغفار کے مختلف صیغے وارد ہوئے ہیں، ان میں سے جو صیغہ بھی پڑھ لیا جائے مقصود حاصل ہے، کیونکہ معنی کے لحاظ سے کوئی خاص فرق نہیں ہے، اور یہ ایسا ہی ہے جیسے دُرود شریف کے مختلف صیغے احادیث سے ثابت ہیں، لہٰذا اس مسئلے پر لڑائی جھگڑا کرنا انتہائی غلط ہے، مسلمانوں کو اس طرح کے نزاعات سے پرہیز کرنا چاہئے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۱۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۵۵۳/۲۷ و)

کلمۂ طیبہ کے ساتھ ''صلی اللہ علیہ وسلم'' پڑھنا

سوال:- کیا کلمۂ طیبہ کے ساتھ ''صلی اللہ علیہ وسلم'' پڑھنا جائز ہے یا کلمۂ طیبہ صرف ''لا اِلٰہ اِلّا اللہ محمد رسول اللہ'' ہی ہے؟ بندہ کلمہ کے ساتھ زیادتی کی بناء پر ''صلی اللہ علیہ وسلم'' پڑھنے سے روکتا ہے، صرف اس خدشے سے کہ کلمہ میں اضافہ جائز نہیں ہے، کیا میرا یہ روکنا جائز ہے یا ناجائز؟

جواب:- کلمہ تو ''لا اِلٰہ اِلّا اللہ محمد رسول اللہ'' ہی ہے، لیکن چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

(۱،۲) ایمانِ مجمل اور ایمانِ مفصل کا مأخذ قرآن کریم کی بعض آیات اور احادیث ہیں، جن میں سے ایک حدیث ترمذی ج:۲ ص:۸۵ (طبع مکتبہ فاروقی) میں موجود ہے: قال: أن تؤمن بالله وملئكته وكتبه ورسله واليوم الأخر والقدر خيره وشره، الحديث. وكذا في حديث عليٌّ في الترمذي. اور مشہور شش کلموں کا مأخذ درج ذیل کتب احادیث ہیں۔ ۱:- کلمۂ طیبہ، كنز العمال فصل الشهادتين، رقم الحديث: ۱۷۴ ج:۱ ص:۵۵ (طبع مؤسسة الرسالة بيروت) و مشكوة المصابيح كتاب الايمان، الفصل الأوّل ج:۱ ص:۱۲ حديث:۲ (طبع قديمي كتب خانه)، کلمۂ طیبہ کے الفاظ متفرق قرآنِ کریم میں بھی آئے ہیں، تفصیل کے لئے فتاویٰ محمودیہ ج:۶ ص:۴۳ دیکھئے۔ ۲:- کلمۂ شہادت، الصحيح للبخاريؒ، باب ما يتخير من الدعاء بعد التشهد ج:۱ ص:۱۱۵ (طبع قديمي كتب خانه)۔ ۳:- کلمۂ تمجید، الصحيح لمسلمؒ، باب فضل التهليل والتسليم والدعاء ج:۲ ص:۳۴۵۔ ۴:- کلمۂ توحید، جامع الترمذي ج:۲ ص:۱۸۰ (طبع مير محمد كتب خانه)۔ ۵:- سیّد الاستغفار، الصحيح للبخاريؒ، كتاب الدعوات في باب أفضل الاستغفار ج:۲ ص:۹۳۳ (طبع قديمي كتب خانه)۔ ۶:- ردِّ کفر، مسند أحمد ج:۵ ص:۴۵۱ (طبع المكتب الاسلامي بيروت)۔ اس کے علاوہ ان کلمات کے الفاظ متفرق دیگر بے شمار احادیث میں وارد ہوئے ہیں، ان کی ترتیب، اسماء، تعداد اور نمبر آسانی کے لئے ہیں، درحقیقت ان کلموں کے معانی پر ایمان لانا ضروری اور مطلوب ہے۔ (محمد زبیر)

کا اسمِ گرامی جب بھی لیا جائے تو اس پر دُرود شریف پڑھنا احادیث سے ثابت ہے، اس لئے اگر کلمہ کے بعد ''صلی اللہ علیہ وسلم'' پڑھ دیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں، البتہ اس میں یہ احتیاط کرنی چاہئے کہ ''صلی اللہ علیہ وسلم'' کہتے وقت لہجہ کچھ بدل لیا جائے تاکہ کلمہ پر اضافے کا شبہ نہ ہو۔

واللہ اعلم

۱۳/۱/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۸۰ الف)

شعراء کا اپنے کلام میں غیر اللہ کو خطاب کرنا

سوال:- ایک جگہ دو شخص آپس میں محوِ گفتگو تھے، اشخاصِ مذکورہ میں سے ایک شخص کا کہنا تھا کہ شاعری خواہ مجازی ہو یا حقیقی، ان دونوں کا اثر شاعر کے عقائد پر ہوتا ہے، جس طرح سے آج کل عامی شاعر جن کی شاعری بالکل غیر سنجیدہ اور اخلاق سے گری ہوئی ہوتی ہے یہاں تک کہ شاعر کا اپنے فرضی محبوب کو خدا کے ہم پلہ قرار دینے، یا موسم یا دُوسرے موضوعات پر مبالغانہ انداز میں اپنے تخیل کو پیش کرنے سے شاعر کے عقائد اس کے زد میں آتے ہیں اور اس پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے، یہاں تک کہ شاعر اپنے تخیل کو غلط انداز میں بیان کرنے کی وجہ سے گناہ اور بسا اوقات گناہِ عظیم کا مرتکب قرار پاتا ہے۔ یہ بات کہاں تک دُرست ہے؟

۲:- لیکن اس کے برعکس دُوسرے شخص کا کہنا یہ ہے کہ شاعری خواہ مجازی ہو یا حقیقی، محض تخیل ہے، اور تخیل کا حقیقت سے بلاواسطہ یا بالواسطہ کوئی ربط نہیں۔

مہربانی فرماکر اس سوال کا جواب دیں کہ اشخاصِ مذکورہ میں سے کون صحیح ہے اور کون غلطی پر ہے؟ سادہ، عام فہم، مدلل، جامع، مفصل اور اگر کہیں عربی کی عبارت ہو تو اس کے بعد ترجمے کے ساتھ اس طرح جلد سے جلد ارقام فرمائیں کہ حجت تام ہو، عین نوازش ہوگی۔

جواب:- محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے خط کو موصول ہوئے کئی ماہ گزر گئے، لیکن میں مسلسل سفر اور مصروفیات کی بناء پر جواب نہ دے سکا، اب بمشکل تمام اتنا وقت نکال سکا ہوں کہ جواب لکھوں۔

آپ نے خاص دو صاحبان کی گفتگو نقل کی ہے، ان میں سے کسی کی بات بھی علی الاطلاق صحیح نہیں ہے، بلکہ اس میں کچھ تفصیل ہے، اور وہ یہ کہ اگر شاعر اپنے کلام میں ایسا مجاز یا استعارہ استعمال کرتا ہے جس کی نظیریں اہلِ زبان میں معروف ومشہور ہوں اور دُوسرے قرائن وشواہد سے یہ بھی معلوم ہو کہ شاعر نے یہ بات مجاز واستعارہ کے طور پر کہی ہے، حقیقت سمجھ کر نہیں کہی، تب تو ایسا مجاز واستعارہ

جائز ہے، اور اس کی بنیاد پر انسان کو بدعقیدہ نہیں کہا جاسکتا، اس کے برخلاف اگر مجاز و استعارہ اس نوعیت کا ہے کہ اہلِ زبان میں اس کی نظیریں معروف نہیں ہیں یا پھر دوسرے قرائن و شواہد سے معلوم ہے کہ شاعر نے یہ بات مجاز کے طور پر نہیں کہی بلکہ حقیقت سمجھ کر کہی ہے تو اس کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ اس کا عقیدہ یہی ہے۔

مثلاً حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف یہ اشعار منسوب ہیں کہ:-

یا رسول اللہ! انظر حالنا. یا رسول اللہ! اسمع قالنا. حالانکہ یہ بات حضرت حاجی صاحبؒ کے حالات اور ان کی کتابوں وغیرہ سے معلوم ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرح حاضر و ناظر نہیں سمجھتے تھے، اس لئے یہاں یہ کہا جائے گا کہ ان اشعار میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو خطاب کیا گیا ہے، وہ مجازاً کیا گیا ہے، اور یہ ایک معروف شاعرانہ روایت ہے کہ شاعر بہت سی غیر موجود اشیاء کو تخیل میں موجود فرض کر کے ان سے خطاب کرتا ہے، بلکہ بعض اوقات دریاؤں، پہاڑوں اور شہروں کو بھی خطاب کرتا ہے۔ گویا حضرت حاجی صاحبؒ کا یہ مجاز ایسا ہے کہ اہلِ زبان کے کلام میں اس کی نظیریں موجود ہیں، لہٰذا اس سے فسادِ عقیدہ لازم نہیں آتا۔ ہاں! اگر کوئی ایسا شخص یہ بات کہے جس کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ وہ بطور مجاز یہ بات نہیں کہہ رہا ہے بلکہ اس کے نزدیک حقیقی عقیدہ ہی یہی ہے تو پھر فسادِ عقیدہ لازم آجائے گا۔ (۱)

اس کے برخلاف بعض مبالغے یا مجاز ایسے ہوتے ہیں کہ اہلِ زبان میں اس کی معروف نظیریں نہیں ہوتیں، مثلاً کسی مخلوق کو خالق سے تشبیہ دینا یا کسی مخلوق کے اوصاف کو بڑھا چڑھا کر اسے خالق کے ساتھ ملا دینا، اس قسم کے مبالغے اور استعارے چونکہ متعارف نہیں ہوتے اور دین و مذہب کا پاس رکھنے والے لوگ ان کو ہمیشہ بے ادبی اور غلط سمجھتے ہیں، اس لئے ایسے مبالغوں اور استعاروں سے فسادِ عقیدہ کا شبہ ہوتا ہے، اور وہ ناجائز ہیں، چونکہ اس میں مجاز و مبالغہ کا احتمال ہوتا ہے اس لئے محض اس کی بناء پر کسی کو کافر کہنے میں احتیاط کرنی چاہئے تاوقتیکہ وہ اپنے عقیدے کی خود وضاحت نہ کردے۔

هذا ما عندی واللہ سبحانہ وتعالیٰ أعلم

۱۳۸۲/۴/۱۵ھ

(فتویٰ نمبر ۳۸۹، ۲۹ الف)

---

(۱) مسئلہ مذکورہ کی تفصیل کے لئے دیکھئے فتاویٰ رشیدیہ ص:۱۰۴، وامداد الفتاویٰ ج:۵ ص:۳۸۵

کپڑے میں انبیاء علیہم السلام کی تصویر بنانا

سوال:- محترم جناب مفتی جسٹس تقی عثمانی صاحب (دارالعلوم کورنگی کراچی)

جناب عالی!

محمد فاروق ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ کورنگی کراچی میں ایک ڈیزائن کپڑے پر چھپائی/ پرنٹنگ کے لئے سپرز ٹاؤلرز پرائیویٹ لمیٹڈ کراچی کی جانب سے آیا، اور سپر ٹاؤلرز کے ڈیزائن کے عین مطابق چھاپ کر دے دیا گیا۔ عام طور پر ہم ٹیکنیکل اُمور کے علاوہ (مثلاً کلر میچنگ وغیرہ) پارٹیوں کے مطلوبہ ڈیزائنز کے دیگر اُمور سے واسطہ نہیں رکھتے، اور کسی غور و خوض کے بغیر آرڈر کی تکمیل کر دیتے ہیں۔

نادانستہ طور پر اس ڈیزائن کے چھپ جانے کے بعد شکوک وشبہات پیدا ہوئے ہیں، اس ڈیزائن میں چرند پرند، آبی جانور اور کارٹون انسانوں کے انداز میں دو انسانی شبیہیں بھی ہیں، اور اس ڈیزائن پر Noahs ark بھی لکھا ہوا ہے۔

یہ ڈیزائن آپ کے سامنے پیش کرنے کے بعد آپ اس پر فتویٰ صادر فرمادیں تا کہ اگر توہین، گستاخی سرزد ہوگئی ہو تو جو بھی کفارہ ہے، ادا کر دیا جائے۔ اور ہم اعلانیہ طور پر صدقِ دِل سے اپنی نادانستہ غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرتے ہیں، اور عہد کرتے ہیں کہ آئندہ ہر ممکن احتیاط سے کام لیں گے۔

تابعدار محمد احمد علی خان
ڈپٹی ملز منیجر

جواب:- کسی جاندار کی تصویر بنانا بذاتِ خود ایک ناجائز کام ہے، بالخصوص کسی پیغمبر کی خیالی تصویر بنانا تو انتہا درجے کی بے ادبی ہے، جس سے ہر مسلمان کو پناہ مانگنی چاہئے، اور ایسی بے ادبی پر مشتمل تصویر کو شائع کر کے لوگوں میں پھیلانا مزید وبال کا موجب ہے، لیکن اگر آپ نے واقعۃً نادانستگی میں یہ تصویریں اس طرح چھاپ دیں کہ آپ کو اندازہ نہیں ہو سکا کہ اس میں کیا ہے؟ تو آپ پر مندرجہ ذیل اُمور فوری طور پر واجب ہیں:-

۱:- سب سے پہلے صدقِ دِل سے اپنے اس عمل پر توبہ و اِستغفار کریں، اور آئندہ کے لئے اس قسم کے معاملات میں تیقظ اور بیدار مغزی سے کام کرنے کا عہد و اہتمام کریں۔

۲:- اس کپڑے کا جتنا اسٹاک موجود ہو، اس کی سپلائی روک کر ان تصاویر کو مٹائیں، اور اگر مٹ نہ سکیں تو ان کو جلادیں۔

۳:- اگر کپڑا اس کمپنی کے پاس جاچکا ہے جس نے آپ سے چھپوایا تھا تو اس کو ایسے کپڑے کی سپلائی سے روکنے کے لئے اپنا پورا اثر ورُسوخ استعمال کریں، اور اگر وہ اس کی سپلائی سے باز نہ آئیں تو آپ ان سے براءت کا اظہار و اعلان کریں۔

۴:- اس کپڑے کی چھپائی کی جو اُجرت آپ نے وصول کی ہے، وہ مکمل طور پر صدقہ کریں۔

واللہ اعلم
۱۴۱۴/۹/۶ھ

شعر میں غیراللہ کو خطاب کرنا

سوال:-

لے جلد خبر کہ ہاں ابھی تک
سینے میں اک آگ سی دبی ہے
کشتی یہ بھنور میں آپھنسی ہے
لے جلد خبر مریضِ غم کی
اب اس کا یہ سانس آخری ہے

زید کہتا ہے ایسے کلمات غیراللہ کے لئے استعمال نہ کرنے چاہئیں جن سے عقائد میں خلل پیدا ہونے کا اندیشہ ، مذکورہ اشعار ایسے ہی ہیں، لیکن عمر اپنے عقائد کی بناء پر ان اشعار کو دُرست سمجھتا ہے، کیونکہ عمر نے اپنے مرشد کی وفات کے بعد یہ اشعار کہے۔ اب ان دونوں میں سے کون حق پر ہے، باطل کے لئے شرعی کیا حکم ہے؟ برائے مہربانی جواب عنایت فرمائیں۔

جواب:- شعر میں بکثرت مجاز و استعارہ کا استعمال ہوتا ہے، اور شاعر بسا اوقات ان اشیاء کو بھی مخاطب کرتا ہے جو سننے اور جواب دینے کی اہلیت نہیں رکھتیں، مثلاً دریا، پہاڑ وغیرہ، یہ خطاب تخیلی ہوتا ہے، حقیقی نہیں۔ لہٰذا اگر کوئی شخص اس انداز سے شعر میں غیراللہ کو خطاب کرے اور مقصد حقیقۃً اس کے مشکل کشا یا فریادرس ہونے کا عقیدہ نہ ہو، بلکہ تخیلی طور پر مجازاً و استعارۃً خطاب کرنا ہو تو ایسے اشعار میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن اگر مشرکانہ عقیدے کے ساتھ ایسے اشعار ان کے حقیقی معنی پر اعتقاد رکھتے ہوئے کہے اور پڑھے جائیں تو حرام ہیں۔ پس مندرجہ بالا اشعار اگر کسی صحیح العقیدہ شخص نے کہے ہیں تو ان میں کچھ حرج نہیں، البتہ اگر فاسد عقیدے کے ساتھ کہے ہیں تو حرام ہیں، اور عوام میں ایسے

اشعار کی تشہیر بہرصورت منع ہے کہ فسادِ عقیدہ کا اندیشہ ہے۔[1]

سوال نمبر۲:-

اے رسولِ کبریا فریاد ہے
یا محمد مصطفیٰ فریاد ہے
سخت مشکل میں پھنسا ہوں آج کل
اے میرے مشکل کشا فریاد ہے

زید ان اشعار کو دُرست مانتا ہے، اور عمر اسے شرک قرار دیتا ہے، قول کس کا دُرست ہے؟ اور شعر کہنے والے کے لئے کیا حکم ہے؟

جواب:- ان اشعار میں بھی وہی تفصیل ہے جو اُوپر بیان کی گئی۔[2] واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۲۴ر رمضان ۱۴۰۰ھ
(فتویٰ نمبر ۱۲۸۶/۳۱ د)

قادیانیوں کی عبادت گاہ کو مسجد کہنے کی ممانعت

سوال:- قادیانی جماعت کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اور کیا قادیانی اپنی مسجد بنا سکتے ہیں یا نہیں؟ اور اپنی عبادت گاہ کو مسجد کہہ سکتے ہیں یا نہیں؟ قانوناً وشرعاً کیا حکم ہے؟ اور کیا ایسے فیصلوں کا قانون بنانا دُرست ہے کہ جس میں قادیانیوں کو اپنی عبادت گاہ مسجد کے نام سے بنانے کی اجازت دی گئی ہو؟

سائل: امام مسجد سبیل، نیوٹاؤن

جواب:- مرزا غلام احمد قادیانی کے پیروکار، خواہ قادیانی ہوں یا لاہوری باجماعِ اُمت دائرۂ اسلام سے خارج ہیں، اور ان کا دینِ اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ اس حقیقتِ واقعی کو ستمبر ۱۹۷۴ء میں آئینی طور پر بھی تسلیم کرلیا گیا ہے، اور اس غرض کے لئے پاکستان کے دستور میں ایسی ترمیم کردی گئی ہے جس پر ملک کے تمام مسلمان متفق ہیں۔

اس ترمیم کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہ ہے کہ مرزائیوں کو شعارِ اسلام و مسلمین کے اختیار کرنے

(۱،۲) حکیم الاُمت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں: ''بارادۂ استعانت واستغاثہ یا باعتقادِ حاضر ناظر ہونے کے منہی عنہ ہے، اور بدون اس اعتقاد کے محض شوقاً واستلذاذاً ماذون فیہ ہے، چونکہ اشعار پڑھنے کی غرض محض اظہارِ شوق واستلذاذ ہوتا ہے اس لئے نقل میں توسع کیا گیا، لیکن اگر کسی جگہ اس کے خلاف دیکھا جائے گا، منع کردیا جائے گا۔ (دیکھئے امداد الفتاویٰ ج:۵ ص:۳۸۵)

اور فتاویٰ رشیدیہ ص:۱۰۴ میں ہے: ''یا رسول اللہ کبریا فریاد ہے ..... یا محمد مصطفیٰ فریاد ہے ..... الخ'' ایسے الفاظ محبت وخلوت میں پڑھے بایں خیال کہ حق تعالیٰ آپ کی ذات کو مطلع فرمادیوے یا محض محبت سے بلا کسی خیال کے جائز ہیں، اور بعقیدۂ علم الغیب اور فریاد رَس ہونے کے شرک ہیں، اور مجامع میں منع ہیں کہ عوام کے عقیدے کو فاسد کرتے ہیں، لہٰذا مکروہ ہوں گے۔ (محمد زبیر حق نواز)

سے روکا جائے، خاص طور سے کسی بھی مذہب کی عبادت گاہ اس مذہب کا ایک امتیازی نشان ہوتی ہے، جس سے اس مذہب اور اہلِ مذہب کی شناخت میں مدد ملتی ہے۔ چنانچہ ''مسجد'' مسلمانوں کی اس عبادت گاہ کا نام ہے جو صرف اور صرف مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہو، کسی دُوسرے مذہب کے پیرووں کو یہ اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ اپنی عبادت گاہ کو ''مسجد'' کا نام دے کر لوگوں کو مغالطہ دیں اور ان کی گمراہی کا باعث ہوں، بالخصوص مرزائیوں کا معاملہ یہ ہے کہ مدّت دراز تک اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرکے ناواقف لوگوں کو فریب دیتے رہے ہیں۔ ایسے حالات میں اگر انہیں ''مسجد'' کے نام سے اپنی عبادت گاہ تعمیر کرنے یا اسے اس نام پر برقرار رکھنے کی اجازت دی جائے تو اس کا صریح نتیجہ عام مسلمانوں کے لئے سخت فریب میں مبتلا ہونے کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا، اور پاکستان جیسی اسلامی مملکت میں ایسے فریب کو گوارا نہیں کیا جاسکتا، لہٰذا احقر کی رائے میں وہ تمام فیصلے جن میں قادیانیوں یا لاہوریوں کو ''مسجد'' کے نام سے عبادت گاہ بنانے کی اجازت دی گئی ہے، قرآن وسنت، شریعتِ اسلامی اور مصالحِ مسلمین کے یکسر خلاف ہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۸/۱۰/۱۳۹۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۷۳۳/۳۰ ر)

احقر اس تحریر کی تصدیق وتائید کرتا ہے
محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ
۱۸/۱۹/۱۳۹۹ھ

حیاتِ انبیاء علیہم السلام، حیاتِ عیسیٰ علیہ السلام اور سماعِ موتیٰ سے متعلق مختلف سوالات

سوال ۱:- حیاتِ انبیاء کے بارے میں احادیثِ صحیحہ نے کیا فرمایا ہے؟ کیا انبیاء قبر میں اسی دُنیوی حیات سے زندہ ہیں اور رُوح مقامِ رفیقِ اعلیٰ میں ہے؟ یا جسد کے ساتھ انبیاء کا قبروں میں نماز پڑھنا آیا ہے؟ آیا اسی جسد کے ساتھ پڑھتے ہیں یا جسدِ مثالی کے ساتھ؟ نیز حیاتِ انبیاء کا منکر شریعت میں کیا حکم رکھتا ہے؟

جواب:- آپ کے سوالات کے مختصر جوابات[۱] درج ذیل ہیں، لیکن ان مسائل پر تدقیقات میں پڑنا دُرست نہیں، ان سوالوں کے جواب پر دین کا کوئی عملی حکم موقوف نہیں ہے، نہ ان کی تحقیق کا ہمیں مکلّف کیا گیا ہے، لہٰذا اپنے اوقات کو ان مسائل کو معلوم کرنے میں صَرف کرنا چاہئے جن کا براہِ راست تعلق عملی زندگی سے ہے، حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''من حسن اسلام

(۱) یہ مختلف سوالات اور ان کے جوابات آگے آرہے ہیں۔

المرء ترکہ ما لا یعنیہ"۔[۱] اس تمہید کے بعد مختصر جوابات لکھے جاتے ہیں، مگر ان پر بحث و تمحیص کا دروازہ نہ کھولا جائے۔

۱:- انبیاء علیہم السلام کی حیات، حیاتِ برزخی ہے،[۲] لیکن یہ حیاتِ برزخی عام مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ قوی ہے، اس میں رُوح کا رشتہ جسد کے ساتھ اتنا زیادہ قوی رہتا ہے کہ اسے حیاتِ دُنیویہ کے ساتھ بہت قرب ہے، اور اس کی بنا پر ان پر مطلقاً احیاء کا اطلاق کیا جاتا ہے، اسی لئے انبیاء علیہم السلام کی نہ میراث تقسیم ہوتی ہے، نہ ان کی ازواجِ مطہرات سے بعد میں کوئی نکاح کرسکتا ہے، اب یہ قوّت کس درجے کی ہے؟ اس کا صحیح علم اللہ ہی کو ہے اور اس کی کُنہ جاننے کی کوشش اور فضول تحقیقات کی ضرورت نہیں، اور انبیاء کا قبر میں نماز پڑھنا بظاہر اجساد کے ساتھ ہی ہے۔[۳]

س۲:- معراج کی رات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات اور تخفیفِ نماز کے بارے میں گفتگو صرف رُوح سے ہوئی تھی یا رُوح مع الجسد سے؟

ج۲:- احادیث میں اس کی تصریح نہیں ہے، لیکن اطلاقات سے ظاہر یہ ہے کہ جسد کے ساتھ ہوئی تھی۔

س۳:- شبِ معراج میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت کا معاملہ جمیع انبیاء کے لئے مسجدِ اقصیٰ میں صرف رُوحوں کے لئے ہوا تھا یا کہ رُوح مع الاجساد تھے؟

ج۳:- اس کی بھی روایات میں تصریح نہیں ہے، بظاہر اجساد کے ساتھ ہی ہے، واللہ اعلم۔

س۴:- حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو بقیدِ حیات ہیں، کیا اس نماز میں مع الجسد شریک ہوئے تھے یا صرف رُوح نے شرکت فرمائی تھی؟

---

(۱) جامع الترمذی ابواب الزهد عن رسول الله صلى الله عليه وسلم ج:۲ ص:۵۵ (طبع فاروقی کتب خانه).

(۲، ۳) وفی شفاء السقام للسبکیؒ ص:۱۸۰ (طبع مکتبه نوریه رضویه): ولحياة الأنبياء بعد موتهم شواهد من الأحاديث الصحيحة. وفی الصحيح للامام مسلمؒ ج:۲ ص:۲۶۸ (طبع قدیمی کتب خانه) عن أنس بن مالكؓ ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: اتيت -وفى رواية هداب- مررت على موسىٰ ليلة أسرى بى عند الكثيب الأحمر وهو قائم يصلى فى قبره. وفى القول البديع للسخاویؒ: السادسة، رسول الله حى على الدوام ص:۱۶۷ (طبع مکتبه علميه مدينه منوره) يؤخذ من هذه الأحاديث أنه صلى الله عليه وسلم حىٌّ على الدوام، وذلك أنه محال عادة أن يخلو الوجود كله من واحد يسلم عليه فى ليلٍ ونهارٍ ونحن نؤمن ونتصدق بأنه صلى الله عليه وسلم حىٌّ يرزق فى قبره وأن جسده الشريف لا تأكله الأرض، والاجماع على هذا .... وقد جمع البيهقى جزأً فى حياة الأنبياء عليهم السلام فى قبورهم، واستدل بغالب ما تقدم وبحديث أنس رضى الله عنه: الأنبياء أحياء فى قبورهم يصلّون .... الخ. وقال العلامة السبكیؒ فى شفاء السقام ص:۱۹۱ (طبع مکتبه نوریه رضویه) وهى ثابتة للروح بلا اشكال والجسد ... فان الصلوة تستدعى جسدًا حيًا، وكذلك الصفات المذكورة فى الأنبياء ليلة الاسراء كلها صفات الأجسام ولا يلزم من كونها حياة حقيقية ان تكون الأبدان معها كما كانت فى الدنيا من الاحتياج الى الطعام والشراب .... وغير ذلك من صفات الأجسام التى نشاهدها بل قد يكون لها حكم آخر، فليس فى العقل ما يمنع من اثبات الحياة الحقيقية لهم. وكذا فى أحكام القرآن للعلامة التهانوى رحمه الله تعالىٰ (ج:۳ ص:۱۷۰) و رد المحتار ج:۴ ص:۱۵۱.

ج۴:- حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جسد و رُوح دونوں کے ساتھ زندہ ہونا قرآنِ کریم میں مصرّح ہے،[1] اس لئے ان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات مع الجسد والروح ہوئی۔

س۵:- عام مسلمانوں کو جب قبر میں دفنایا جاتا ہے اس کے بعد ان کی قبر پر فاتحہ پڑھی جاتی ہے، کیا وہ سنتے ہیں؟ نفی کی صورت میں ان احادیث کا کیا جواب ہوگا جن میں ثبوت ہے؟

ج۵:- اصل یہ ہے کہ مردوں میں موت کے بعد سننے کی طاقت نہیں ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم میں تصریح ہے،[2] لیکن جس وقت اللہ تعالیٰ کسی مصلحت سے انہیں کوئی آواز سنانا چاہے تو سنا دیتا ہے،[3] حدیث میں جو جوتیوں کی آواز سننے کا ذکر ہے[4] وہ اسی پر محمول ہے کہ اللہ تعالیٰ عبرت کے لئے اس کو آواز سنا دیتا ہے۔

س۶:- قبر سے کیا مراد ہے؟ آیا وہی لحد یا شق جس میں میت کو دفنایا گیا ہے یا کوئی اور؟ عذابِ قبر کہاں ہوتا ہے؟ ملکین کا سوال و جواب کہاں ہوتا ہے؟

ج۶:- قبر سے وہی قبر مراد ہے جس میں مردے کو دفن کیا گیا۔ سوالِ ملکین کے وقت رُوح کو دوبارہ جسد میں داخل کیا جاتا ہے،[5] اور پوری حقیقتِ حال اللہ کے سوا کوئی نہیں جان سکتا۔

س۷:- سماعِ موتیٰ میں صحابہ کرامؓ کا اختلاف ہے، جمہور صحابہؓ کی رائے اثبات میں ہے یا نفی میں؟ امام ابوحنیفہؒ کی رائے کیا ہے؟

---

(۱) "اِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسٰٓی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ". الآیة (آل عمران:۵۵). "وَمَا قَتَلُوْہُ وَمَا صَلَبُوْہُ وَلٰکِنْ شُبِّہَ لَھُمْ." الآیة (النساء:۱۵۷). تفصیل کے لئے دیکھئے: معارف القرآن ج:۲ ص:۷۲۔

(۲) قال اللہ تعالیٰ: "فَاِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی" الآیة. (سورۃ الروم:۵۲)

(۳، ۴) "اِنَّ اللّٰہَ یُسْمِعُ مَنْ یَّشَآءُ وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِی الْقُبُوْرِ" (سورۃ فاطر:۲۲) وفی أحکام القران ج:۳ ص:۱۶۳ فانہ تعالی بقدرتہ یسمع الأموات أصوات الأحیاء اذا شاء ویھدی من یشاء ویضل من یشاء .... الخ. وفی الصحیح للبخاریؒ باب المیّت یسمع خفق النعال ج:۱ ص:۱۷۸ (طبع قدیمی کتب خانہ) عن أنس رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: العبد اذا وضع فی قبرہ وتولی وذھب أصحابہ حتی انہ لیسمع قرع نعالھم أتاہ ملکان، الحدیث. وفیہ أیضًا ج:۱ ص:۱۸۳ (طبع مذکور) قال نافع ان ابن عمرؓ أخبرہ قال: أطلع النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی أھل القلیب فقال: وجدتم ما وعد ربکم حقًّا؟ فقیل لہ: تدعو أمواتا؟ فقال: ما أنتم بأسمع منھم ولٰکن لا یجیبون. وعن عائشة رضی اللہ عنھا قالت: انما قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: انھم لیعلمون الأن ان ما کنت أقول لھم حق، وقد قال اللہ تعالٰی: "اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی". وفی أحکام القران للعلامة التھانوی رحمة اللہ علیہ (ج:۳ ص:۱۶۳) قولہ أن مسئلة سماع الموتی وعدمہ من المسائل التی وقع الخلاف فیھا .... وفیہ أیضا ج:۳ ص:۱۶۵ قال العبد الضعیف (المفتی الأعظم باکستان قدس اللہ سرہ) والذی ذکرہ فی الروح من طوائف أھل العلم وذکر ابن عبدالبر ان الأکثرین علی ذلک یعنی سماعھم فی الجملة ھو الحق الحقیق بالقبول، والیہ یرشد صیغة القران وشان النزول، وبہ تتوافق الروایات من الصحابة والرسول صلی اللہ علیہ وسلم وھو مختار مشائخنا دامت برکاتھم ما ھبت الدبور والقبول .... الخ.

(۵) وفیہ أیضًا ج:۳ ص:۱۸۱ مذھب أھل السنة والجماعة أن أرواح الموتی ترد فی بعض الأوقات من العلّیین أو من سجّین الی أجسادھم فی قبورھم عند ارادة اللہ تعالی وخصوصًا لیلة الجمعة ویجلسون ویتحدثون وینعم أھل النعیم ویعذب أھل العذاب. (محمد زبیر حق نواز)

ج ۷:- امام ابوحنیفہؒ کی رائے صحیح قول کے مطابق وہی ہے جو نمبر ۵ میں لکھی گئی۔

س ۸:- عام مسلمانوں کی قبر پر قرآن خوانی بلامعاوضہ جائز ہے یا نہیں؟ جائز ہونے کی صورت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرامؓ کا کوئی عمل، جس کا ذکر حدیث میں ہو۔

ج ۸:- ایصالِ ثواب کے لئے قبر پر قرآن خوانی جائز ہے بشرطیکہ کسی دن کی تخصیص نہ ہو اور اس پر کوئی معاوضہ طے نہ کیا جائے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۱/۲۳ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۴۹/۱۹ الف)

''اسلامی سوشلزم'' سے کیا مراد ہے؟ اور اس کی شرعی حیثیت

سوال:- اسلامی سوشلزم کیا ہے؟ اور کیا موجودہ حالات میں اس کو قبول کرنا ہمارے لئے درست ہے؟

قاضی نذیر احمد سونڈ۔ ضلع ٹھٹھہ

جواب:- کچھ عرصے سے ہمارے معاشرے میں یہ وبا چل نکلی ہے کہ مغرب سے آئے ہوئے ہر غلط یا صحیح نظریے کے ساتھ صرف ''اسلامی'' کا نام لگا کر اسے بزعم خود ''مشرف بہ اسلام'' کر لیا جاتا ہے، پھر اس کی تبلیغ شروع کردی جاتی ہے، اسلامی سوشلزم کا نعرہ بھی ایسا ہی ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام اور سوشلزم زندگی کے دو بالکل مختلف نظام ہیں، جن میں مطابقت ممکن نہیں، سوشلزم درحقیقت سرمایہ دارانہ نظام کی ہلاکت آفرینیوں کا ایک جذباتی رَدِّعمل ہے، جو بجائے خود اتنا ہی مضر اور خطرناک ہے جتنا سرمایہ دارانہ نظام، سوشلزم کی بنیاد انفرادی ملکیت کے انکار پر ہے، سرمایہ دارانہ نظام میں غریبوں کے خون چوسنے کا جو ظالمانہ کھیل کھیلا گیا، اس سے متأثر ہوکر سوشلزم کے علَم برداروں نے انفرادی ملکیت کا سرے سے انکار کردیا، حالانکہ اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوسکا کہ چھوٹے چھوٹے سرمایہ دار ختم ہوگئے، اور ان سب کی جگہ ایک بڑا سرمایہ دار وجود میں آگیا، جو پورے استبداد کے ساتھ دولت کے ایک بڑے ذخیرے سے کھیلتا ہے، رہا بیچارا مزدور سو وہ سوشلزم میں بھی اتنا ہی بے بس ہے جتنا سرمایہ داری میں تھا۔

اسلامی نقطۂ نظر سے سرمایہ داری کی خرابیوں کا علاج انفرادی ملکیت کا خاتمہ نہیں ہے، بلکہ انفرادی ملکیت کی خودغرضی اور بے لگامی کو ختم کرنا ہے، چنانچہ اسلام میں انفرادی ملکیت کو تسلیم کیا گیا ہے، لیکن سود کی حرمت اور زکوٰۃ، صدقات، نفقات، کفارات، عشر و خراج اور وراثت وغیرہ کے اَحکام کے ذریعہ اس نے اس ملکیت کو حدود کا پابند بنادیا ہے۔

اس سے واضح ہوگیا کہ سوشلزم کی بنیاد جس نظریئے پر قائم ہے، اسلام اس بنیاد ہی کو تسلیم نہیں کرتا، اس لئے دونوں میں نظریاتی مصالحت کا کوئی امکان نہیں، اسلام سوشلزم نہیں بن سکتا، اور سوشلزم اسلام نہیں کہلاسکتا، لہٰذا ''اسلامی سوشلزم'' کا نعرہ ایک مہمل نعرہ ہے، جو دونوں معاشی نظاموں یا کم از کم اسلامی نظامِ معیشت سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ پاکستان میں ہماری ضرورت ''اسلام'' ہے، ''سوشلزم'' نہیں۔

واللہ اعلم

۲۰رشوال ۱۳۸۷ھ [1]

کیا جنت میں کفار داخل ہوسکتے ہیں؟

سوال:- آج کل بعض لوگوں کا ذہن اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا کہ صرف مسلمان ہی جنت میں جائیں گے، وہ کہتے ہیں کہ کوئی شخص خواہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو، اگر اچھے کام کرتا ہے تو جنت کا مستحق ہے۔ واضح رہے کہ یہ خیالات میرے عقیدے میں شامل نہیں ہیں، میں صرف اسلام کو سچا مذہب مانتا ہوں، لیکن بہتر ہو کہ ایسے لوگوں کے شبہات کا ازالہ ''البلاغ'' کے ذریعہ کردیا جائے۔

جواب:- ان لوگوں کا یہ شبہ درحقیقت ایک بنیادی بات کو ذہن میں نہ رکھنے کا نتیجہ ہے، اور وہ یہ کہ اس کائنات میں انسان کا کیا مقام ہے؟ اور جنت وجہنم کی تخلیق کا مقصد کیا ہے؟ قرآنِ کریم کی تعلیم یہ ہے کہ یہ دُنیا ایک ''دارالامتحان'' ہے، جنت اس امتحان کی کامیابی کا صلہ ہے، دوزخ ناکامی کی سزا، اور ''ایمان'' اس امتحان میں کامیابی کی بنیادی شرط اور وہ ''لازمی سوال'' ہے، جسے حل کئے بغیر کوئی شخص کامیاب نہیں ہوسکتا، اس لئے جنت کا حصول ایمان کے بغیر ممکن نہیں۔

دُنیا میں روزمرّہ جن امتحانات سے ہمارا سابقہ رہتا ہے، ان پر ہی اگر آپ غور فرمائیں تو واضح طور سے نظر آئے گا کہ ہر امتحان میں کچھ سوالات بنیادی اہمیت رکھتے ہیں، اور ممتحن ان سوالات کو کامیابی کا مدار سمجھتا ہے، اور اس کے ساتھ ہی کچھ ایسے سوالات ہوتے ہیں جنھیں حل نہ کرنے سے کامیابی کے درجے میں تو کمی ہوجاتی ہے، مگر وہ کامیابی اور ناکامی کے لئے فیصلہ کن نہیں ہوتے، اب اگر کوئی شخص پہلی قسم کے اہم سوالات کو تو بالکل چھوڑ دے یا انہیں بالکل غلط طریقے سے حل کرے، اور دُوسری قسم کے ضمنی سوالات صحیح طریقے سے حل کردے تو آپ خود ہی سوچئے کہ وہ شخص کامیاب ہوگا یا ناکام؟ ظاہر ہے کہ کوئی معقولیت پسند انسان ایسے شخص کو کامیاب قرار نہیں دے سکتا، اس لئے کہ اس نے اصلی بنیادی سوالات کو بالکل حل نہیں کیا۔ جو شخص اسلام کے بنیادی عقائد، توحید، رسالت، آخرت

---

(۱) یہ فتویٰ ماہنامہ ''البلاغ'' کے شمارہ ذیقعدہ ۱۳۸۷ھ سے لیا گیا ہے۔ (مرتب)

وغیرہ پر ایمان نہیں رکھتا، اور ساتھ ہی کچھ اچھے کام بھی کرتا ہے، اس کی مثال بالکل ایسی ہے۔

اسی بات کو ایک دُوسرے طریقے سے بھی سمجھ لیجئے، دُنیا میں بہت سی چیزیں اپنی ذات کے اعتبار سے مفید ہوتی ہیں، لیکن کوئی دُوسری خراب چیز ان کے ساتھ مل کر ان کی تمام خوبیوں پر پانی پھیر دیتی ہے۔ دُودھ، گھی، مکھن اپنی ذات کے اعتبار سے کتنی مقوی غذائیں ہیں، لیکن اگر ان کے ساتھ سنکھیا ملادیا جائے تو یہی چیزیں مہلک بن جاتی ہیں۔ انسان کے اعمال و افعال کا بھی یہی حال ہے، کسی غریب کی روپے پیسے کے ذریعہ امداد کرنا کتنا مستحسن کام ہے، لیکن اگر اس سے مقصد محض دِکھاوا اور نام ونمود ہو تو یہ نیکی دُنیوی نقطۂ نظر سے بھی اکارت ہوجاتی ہے۔

قرآنِ کریم کا ارشاد یہی ہے کہ ''کفر'' وہ زہر ہے جو انسان کے تمام نیک اعمال کو اکارت کردیتا ہے، یہ اعمالِ خیر اگر ایمان کے ساتھ ہوں تو انسان کے درجات میں ترقی کا سبب بنتے ہیں، اور ان سے اس کی آخرت سنورتی ہے، لیکن اگر ان کے ساتھ کفر مل جائے تو وہ ان کو اسی طرح بیکار کردیتا ہے جیسے سنکھیا، دُودھ اور گھی کو، جو شخص خدا کا یا اس کی وحدانیت کا منکر ہو، اس کے رسولوں کو (معاذ اللہ) جھوٹا کہتا ہو اس کی نازل کی ہوئی کتابوں کو من گھڑت بتاتا ہو، اور اس کے بتائے ہوئے نظامِ زندگی کا سرے سے انکار کرتا ہو، اور اس قدر سنگین جرائم کے بعد وہ کوئی اچھا کام بھی کرلے تو اسے مستحقِ انعام قرار دینے میں آخر کیا معقولیت ہے؟ فرض کیجئے کہ ایک نہایت خوش اخلاق، محنتی اور ذہین شخص ہے جو اپنی مبنی برانصاف حکومت کے خلاف بغاوت کی سازش کرتا ہے، اس کے دُشمنوں سے مل کر ان کی مدد کرتا ہے، اس کے قانون کی کھلم کھلا توہین کرتا ہے، تو کیا محض اس کی خوش اخلاقی اس کو ان سنگین جرائم سے بری کرسکے گی؟ اور اگر حکومت اس کو موت کی سزا دے تو کیا کوئی انصاف پسند انسان حکومت کے اس فیصلے کو ظلم قرار دے سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں! اس کا جرم اتنا سنگین ہے کہ اس کی موجودگی میں اس کی خوش اخلاقی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

اب آپ خود سوچ لیجئے کہ جو شخص خدا کا، اس کے رسولوں کا، اس کی کتابوں کا اور اس کے قوانین کا باغی ہو، اسے محض اس کی خوش اخلاقی کی بناء پر جنت کا مستحق کیونکر قرار دیا جاسکتا ہے؟[۱]

واللہ سبحانہ اعلم

۲۲رشوال ۱۳۸۷ھ[۲]

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے تفسیر معارف القرآن ج:۴ ص:۲۳۷۔

(۲) یہ فتویٰ ماہنامہ ''البلاغ'' کے شمارہ ذیقعدہ ۱۳۸۷ھ سے لیا گیا ہے۔

وحدت الوجود کا مطلب

سوال:- وحدت الوجود کا کیا مطلب ہے؟ اور یہ عقیدہ کہاں تک دُرست ہے؟

جواب:- وحدۃ الوجود کا صحیح مطلب یہ ہے کہ اس کائنات میں حقیقی اور مکمل وجود صرف ذاتِ باری تعالیٰ کا ہے، اس کے سوا ہر وجود بے ثبات، فانی اور نامکمل ہے۔ ایک تو اس لئے کہ وہ ایک نہ ایک دن فنا ہوجائے گا، دُوسرے اس لئے کہ ہر شئ اپنے وجود میں ذاتِ باری تعالیٰ کی محتاج ہے، لہٰذا جتنی اشیاء ہمیں اس کائنات میں نظر آتی ہیں، انہیں اگرچہ وجود حاصل ہے، لیکن اللہ کے وجود کے سامنے اس وجود کی کوئی حقیقت نہیں، اس لئے وہ کالعدم ہے۔

اس کی نظیر یوں سمجھئے جیسے دن کے وقت آسمان پر سورج کے موجود ہونے کی وجہ سے ستارے نظر نہیں آتے، وہ اگرچہ موجود ہیں، لیکن سورج کا وجود ان پر اس طرح غالب ہوجاتا ہے کہ ان کا وجود نظر نہیں آتا۔

اسی طرح جس شخص کو اللہ نے حقیقت شناس نگاہ دی ہو وہ جب اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کے وجود کی معرفت حاصل کرتا ہے تو تمام وجود اسے ہیچ، ماند، بلکہ کالعدم نظر آتے ہیں، بقول حضرت مجذوبؒ:

جب مہر نمایاں ہوا سب چھپ گئے تارے
تو مجھ کو بھری بزم میں تنہا نظر آیا

''وحدت الوجود'' کا یہ مطلب صاف، واضح اور دُرست ہے، اس سے آگے اس کی جو فلسفیانہ تعبیرات کی گئی ہیں، وہ بڑی خطرناک ہیں، اور اگر اس میں غلو ہوجائے تو اس عقیدے کی سرحدیں کفر تک سے جاملتی ہیں۔ اس لئے ایک مسلمان کو بس سیدھا سادا یہ عقیدہ رکھنا چاہئے کہ کائنات میں حقیقی اور مکمل وجود اللہ تعالیٰ کا ہے، باقی ہر وجود نامکمل اور فانی ہے۔[1] واللہ سبحانہ اعلم

۲۰؍جمادی الاولیٰ ۱۳۸۷ھ[2]

مسئلہ عصمتِ انبیاء علیہم السلام

سوال ۱:- عصمت، انبیاء علیہم السلام کے لوازمِ ذات سے ہے یا نہیں؟

۲:- کیا انبیاء علیہم السلام کو نبوت سے قبل بھی وہی عصمت حاصل ہوتی ہے جو کہ نبی ہونے کے بعد ہوا کرتی ہے؟

جواب ۱:- عصمت، انبیاء علیہم السلام کے لئے لازم ہے، اور ان سے کسی وقت بھی یہ صفت

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے: شریعت وطریقت ص:۳۱۰ مؤلفہ حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ۔

(۲) یہ فتویٰ ماہنامہ ''البلاغ'' کے شمارہ جمادی الثانیہ ۱۳۸۷ھ سے لیا گیا ہے۔

جدا نہیں ہوتی،[1] ان کی جن لغزشوں کا ذکر قرآن کریم وغیرہ میں آیا ہے، وہ سب خلاف اولیٰ باتیں تھیں جو شرعاً معصیت نہیں، مگر انبیاء علیہم السلام کو ان کی جلالت قدر کی وجہ سے ان پر بھی تنبیہ کی گئی۔[2]

۲:- صحیح یہ ہے کہ نبوت سے قبل بھی انبیاء سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا۔[3]

والله اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۳۰۰ / ۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفی عنہ

بلا تحقیق مسئلہ بیان کرنا

سوال:- اگر کوئی شخص بدون تحقیق کے مسئلہ بیان کرے اور مسائل شرعیہ کو نہ مانے اور اللہ تعالیٰ نے جو حصہ وارثوں کے لئے قرآن مجید میں مقرر فرمایا ہے نہ مانے، اور کہے یہ دادی کا مسئلہ ہے، اور کسی عالم کو کافر کہے اور اس عالم کی ہر طرح آبروریزی کرے، غیبت کرے اور اس سے دشمنی وبغض رکھے اور برادری میں تفرقہ ڈالے اور قوم کے درمیان فرقہ بندی اور مسجد میں فساد کرے، فسق و فجور کرے، ایسے شخص کے لئے شریعت میں کیا حکم ہے؟ اور وہ مسجد میں داخل ہوسکتا ہے؟ اور جو کسی کی حق تلفی کرے ایسے شخص کا کیا حکم ہے؟

جواب:- ایسا شخص فاسق ہے، مسلمانوں کو چاہئے کہ اسے نرمی سے سمجھائیں اور اگر نہ مانے تو اس سے بیزاری کا اظہار کریں، فرائض کے بارے میں وہ جو یہ کہتا ہے کہ: ''دادی کا مسئلہ ہے'' تو اس کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا، اور اس کے مسجد میں داخل ہونے یا نہ ہونے کا مسئلہ اس جملے کے مطلب پر موقوف ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۲۱ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(۱ تا ۳) قال فی شرح الفقہ الاکبر ص ۲۰۱ والمختار عند جمهور اهل السنة العصمة عنها ای عن الصغائر والكبائر عن المسفرة خطأ او سهوا (الی) والحاصل ان احدا من اهل السنة [illegible] ارتكاب المنهي منهم عن قصد. ولكن بطريق السهو والنسيان ويسمى ذلك زلة. وفيه ايضا ص ۱۰۰ وفي عصمتهم عن سائر الذنوب تفصيل وهو انهم معصومون عن الكفر قبل الوحي وبعده بالاجماع وكذا عن تعمده الكبائر عند الجمهور. نیز دیکھئے معارف القرآن ج:۱ ص ۱۵۱ "مسئلہ عصمت انبیاءؑ"، امداد الفتاویٰ ج ۵ ص [illegible] (محمد زبیر)

کسی انجمن کے رُکنیت فارم میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بنانے کا حکم

سوال:- ایک انجمن کے رُکنیت فارم کی عبارت مندرجہ ذیل ہے، کیا اس میں سے کوئی شق پورا نہ ہونے پر ممبر گناہگار ہوگا یا نہیں؟ اور گناہ کیسا ہوگا؟ کبیرہ یا صغیرہ؟

میں اللہ ربّ العزّت اور اس کے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ کر کے اقرار کرتا ہوں کہ مجھے بزمِ ہٰذا کے اغراض و مقاصد سے پورا پورا اتفاق ہے، اور میں بزم کی فیس مستقل ادا کرتا رہوں گا، اور میں دُوسرے کو رُکنیت کی رغبت دیتا اور بزمِ ہٰذا کو مستحکم بنانا اپنا فرضِ عین سمجھوں گا، تبدیلیٔ رہائش سے آگاہ کروں گا۔ اللہ تعالیٰ مجھے اس عہد کی وفا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

جواب:- پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا کر کوئی عہد کرنا تو صحیح ہے، لیکن سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بنا کر عہد کرنا دُرست نہیں، کیونکہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہونا صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے،[1] اور کوئی نبی یا ولی اس کا شریک نہیں، لہٰذا معاہدے کے مذکورہ بالا الفاظ میں ترمیم کرنی ضروری ہے۔ اس کے بعد جو شخص یہ معاہدہ کر کے فارم بھر دے گا اس پر اس عہد کی پابندی اس وقت تک لازم ہوگی جب تک وہ اس عہد سے دست بردار ہونے کا واضح اعلان نہ کر دے، اس دوران وہ ان میں سے کسی بات کی خلاف ورزی کرے گا تو گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہوگا، کیونکہ عہد کر کے اس کو پورا نہ کرنا گناہِ کبیرہ ہے، لقوله تعالیٰ: "یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ"۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۰/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۳۵۴/۲۷ و)

کیا قیامت کے دن جانوروں کا بھی محاسبہ ہوگا؟ کیا جنت میں عورتوں کو رُؤیتِ باری ہوگی؟

سوال ۱:- قیامت کے دن جب انسانوں کو حساب و کتاب کے لئے اُٹھایا جائے گا تو کیا جن و انس کے علاوہ جانوروں کو بھی اُٹھایا جائے گا یا نہیں؟ حدیث میں سینگ والی بکری سے گنجی بکری کا بدلہ لینے کا ذکر آتا ہے۔ ایک صاحب کا خیال ہے کہ قیامت کے دن تمام جانوروں کو حساب وغیرہ کے

(۱) "وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَمَا كُنْتُمْ" الاية (الحدید: ۴). "مَا یَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰی ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَآ اَدْنٰی مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَیْنَ مَا كَانُوْا" (المجادلة ۷)

(۲) سورة المائدة ۱

لئے اُٹھایا جائے گا، ایک صاحب جو عالم اور فاضل ہیں کہتے ہیں کہ ''قرآن وسنت سے صرف انسان کا مکلّف ہونا معلوم ہوتا ہے، اس لئے ان کے علاوہ کسی اور مخلوق کا حساب و کتاب کے لئے اُٹھائے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور یہ حدیث قابلِ تأویل ہے۔''

جواب ۱:- جانوروں کا ایک دُوسرے سے بدلہ لینا بعض احادیث سے ثابت ہے اور یہ غیر مکلّف ہونے کے منافی نہیں ہے،[1] صرف مظالم کا حساب لے لیا جائے تو یہ بھی مستبعد نہیں، لیکن حقیقی علم اللہ ہی کو ہے، اور چونکہ اس مسئلے کا تعلق انسان کے عمل سے نہیں ہے اس لئے اس کی بحث و تدقیق میں پڑنا فضول ہے۔

س ۲:- جنت میں جیسے مردوں کو رُؤیتِ باری ہوگی، کیا اسی طرح عورتوں کو بھی ہوگی؟ اس ضمن میں ایک صاحب کی رائے یہ ہے کہ مردوں اور عورتوں کو اکٹھے رُؤیت نصیب ہوگی اور پردہ کا وہاں حکم نہ ہوگا، کیونکہ پردہ صرف دُنیا کے لئے ہے۔ دُوسرے صاحب کی رائے یہ ہے کہ جنت میں بھی پردہ ہوگا، اور عورتوں کو رُؤیتِ باری تعالیٰ نصیب نہ ہوگی، اور اگر ہوئی تو مردوں کے ساتھ نہ ہوگی۔

ج ۲:- اکثر حضراتِ علماء کا عقیدہ یہ ہے کہ رُؤیت عورتوں کو بھی ہوگی،[2] جیسے شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے تصریح فرمائی ہے۔ باقی اس کی تفصیلات اللہ ہی جانتا ہے، اس قسم کی بحثوں میں پڑنے کے بجائے عملی مسائل معلوم کرنے میں وقت صَرف کیجئے۔

فقط واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۵/۲۷ھ
(فتویٰ نمبر ۶۳۱/۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) وفي تفسير رُوح المعاني (ج:۳۰ ص:۵۱) تحت الآية: "وَإِذَا الْوُحُوشُ حُشِرَتْ" .... ولا يحشر القيامة غير الثقلين وقيل بعثت للقصاص فيحشر كل شئ حتى الذباب، وروى ذلك عن ابن عباسؓ أيضًا وعن قتادةؒ وجماعة وفي رواية عن الحبر تحشر الوحوش حتى يقتص من بعضها لبعض فيقتص للجمّا من القرنا ثم يقال لها: موتي، فتموت، وقيل اذا قضى بينها ردّت ترابا۔ وفيه أيضًا بعد أسطر ج:۳۰ ص:۵۱، ۵۲ فقد أخرج مسلم والترمذی عن أبي هريرةؓ في هذه الأية قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لتؤدن الحقوق الى أهلها يوم القيامة حتّى يقاد للشاة الجماء من الشاة القرناء۔ اور مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہٗ "وَيَقُولُ الْكَافِرُ يٰلَيْتَنِي كُنْتُ تُرَابًا" الآیۃ، کے تحت معارف القرآن ج:۸ ص:۶۵۹ میں تحریر فرماتے ہیں: ''حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ: قیامت کے دن ساری زمین ایک سطح مستوی ہوجائے گی، جس میں انسان، جنات، زمین پر چلنے والے پالتو جانور اور وحشی جانور سب جمع کردیئے جائیں گے، اور جانوروں میں سے اگر کسی نے دُوسرے پر ظلم دُنیا میں کیا تھا تو اس سے اس کا انتقام دلوایا جائے گا، یہاں تک کہ اگر کسی سینگ والی بکری نے بے سینگ بکری کو مارا تھا تو آج اس کا بھی بدلہ دلوایا جائے گا، جب اس سے فراغت ہوگی تو سب جانوروں کو حکم ہوگا کہ مٹی ہوجاؤ، وہ سب مٹی ہوجائیں گے۔ اس وقت کافر لوگ یہ تمنا کریں گے کہ کاش! ہم بھی جانور ہوتے اور اس وقت مٹی ہوجاتے، حساب و کتاب اور جہنم کی سزا سے بچ جاتے۔'' وکذا في رُوح المعاني ج:۳۰ ص:۲۲۔

(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے: اعتقاد أهل السنة والجماعة للامام ابن الحسن بن منصور الطبری اللالكائی ص:۵۰۳ تا ۵۲۸۔

عقیدۂ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم

سوال:- محترم مولانا محمد تقی عثمانی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں نے ایک خط آنجناب کو ارسال کیا تھا، لیکن جواب سے محروم رہا، اس خط میں یہ مذکور تھا کہ قرآن کے مطالعے سے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ مسلمان عام طور سے دینی معاملات میں احکامِ قرآن کے خلاف عمل کر رہے ہیں، ایسا کیوں ہے؟ یہ میں سمجھ نہیں سکا۔

قرآن میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ ہر شخص کو موت آتی ہے، اور پھر وہ قیامت کے دن اُٹھایا جائے گا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے وفات رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے موقع پر اچھی طرح اس کی وضاحت کردی تھی، لیکن عام مسلمان حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حیات اولیاء کے قائل ہیں، اور ان کے تصرفات کے عجیب وغریب واقعات بیان کرتے رہتے ہیں۔

جواب:- مکرمی محترمی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا پہلا خط مجھے ملا یا نہیں، بہرکیف! آپ کے سوال کا جواب عرض ذیل ہے:-

انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سمیت تمام مخلوقات کو موت آتی ہے، البتہ موت کے بعد ہر انسان کو برزخی زندگی سے واسطہ پڑتا ہے، برزخی زندگی کا مطلب صرف یہ ہے کہ انسان کی رُوح کا اس کے جسم سے کسی قدر تعلق رہتا ہے، یہ تعلق عام انسانوں میں بھی ہوتا ہے، مگر اتنا کم کہ اس کے اثرات محسوس نہیں ہوتے۔ شہداء کی ارواح کا تعلق ان کے جسم سے عام انسانوں کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے اس لئے قرآن کریم نے انہیں احیاء قرار دیا ہے،[1] اور انبیائے کرام کا درجہ شہداء سے بھی بلند ہے، اس لئے احادیث کے مطابق ان کی ارواح کا تعلق جسم سے سب سے زیادہ ہوتا ہے، یہاں تک کہ ان کی میراث بھی تقسیم نہیں ہوتی اور ان کے ازواج کا نکاح بھی دوسرا نہیں ہوسکتا، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے،[2] چونکہ ان کی ارواح کا تعلق سب سے زیادہ ہوتا ہے، اس لئے شہداء کی طرح انہیں بھی احیاء قرار دیا گیا ہے، مگر یہ حیات اس طرح کی نہیں ہے جیسی انہیں موت سے پہلے حاصل تھی، نیز قرآن وسنت میں اس کی بھی کوئی دلیل نہیں ہے کہ اس حالت میں انبیائے کرام علیہم السلام کو دوسروں پر تصرف کا کوئی اختیار حاصل ہے، اگر کسی نے کبھی اس قسم کا کوئی واقعہ دیکھا ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی صورت مثالی ہوسکتی ہے جس کا ان کو علم ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔

واللہ اعلم

۱۴۲۲/۹/۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰ د ۵۰۵)

(۱) "ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء ولکن لا تشعرون" (البقرۃ: ۱۵۴)

(۲) "ولا ان تنکحوا ازواجہ من بعدہ ابدا" (الاحزاب: ۵۳)

شیخ احمد کے مروّجہ وصیت نامہ کا حکم

سوال:- جو اشتہار کبھی کبھار لوگ شائع کرتے ہیں، یعنی وہ معروف وصیت نامہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اطہر کے خادم کی طرف منسوب ہوتا ہے، اس میں جو کچھ تحریر ہے وہ دُرست ہے یا نہیں؟ مثلاً جو اس کو پڑھے گا وہ اس کو شائع کرے، اگر ایسا نہیں کرے گا تو نقصان اُٹھائے گا، انکار کرنے والا سخت عذاب میں مبتلا ہوگا، جو پڑھ کر شائع نہ کرے مسلمان نہ رہے گا۔

جواب:- منسلکہ وصیت نامہ میں بنیادی طور سے جو بات کہی گئی ہے کہ مسلمان اپنے گناہوں سے توبہ کریں اور اسلامی اَحکام کے مطابق زندگی گزاریں، وہ بالکل صحیح اور دُرست ہے۔ اس کی جتنی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے بہتر ہے، لیکن پڑھنے والے کے ذمہ خاص تعداد میں بعینہٖ اسی وصیت نامہ کو شائع کرنے کو لازمی قرار دینا، اور جو نہ کرسکے اس کو نقصان کی دھمکی دینا شرعاً اس کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۹۰/۱۸ الف)

یہ وصیت نامہ سالہا سال سے شائع ہوتا ہے، جس کو تقریباً ۸۰ سال گزر چکے ہیں، کسی شخص نے خود ہی بنالیا ہے، روضۂ اطہر کا کوئی خادم شیخ احمد نہ اب ہے، نہ اُس وقت تھا جب یہ وصیت نامہ نیا نیا شائع ہوا تھا، اُس وقت علماء نے تحقیق کی تھی۔ لہٰذا نقصان کی دھمکی کی کوئی پروا نہ کریں۔

محمد عاشق الٰہی بلندشہری عفی عنہ

جب جنت میں شیطان نہیں جاسکتا تو اس نے حضرت آدم علیہ السلام کو دھوکا کیسے دیا؟

سوال:- جنت کے اندر تو شیطان نہیں جاسکتا، حضرت آدم علیہ السلام کو دھوکا پھر کیسے دیا؟ اور دھوکا صرف آدم علیہ السلام کو دیا یا آدم وحوا علیہما السلام دونوں کو دیا؟ اور پہلے کس کو دیا؟

جواب:- قرآنِ کریم میں صراحت ہے کہ شیطان نے وسوسہ ڈالا،[1] اور اس کام کے لئے جنت میں جانا کیا ضروری تھا؟

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۶۰۳/۲۸ ب)

---

(۱) "فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ" الآية. (سورة الأعراف: ۲۰).

﴿فصل فی کلمات الکفر وأفعال الکفر وما یکون کفرًا وما لا یکون کفرًا﴾

(کفریہ وغیر کفریہ کلمات اور افعال سے متعلق مسائل کا بیان)

موسیقی سننے والے کو کافر کہنا

سوال ۱:- کیا میراسی، گانا گانے والے کافر ہیں؟

۲:- اگر نہیں تو ہمارے ہاں ایک صاحب انہیں کافر کہتے ہیں، کیا یہ دُرست ہے؟

جواب ۱:- آلاتِ موسیقی میں مشغولیت سخت گناہ ہے، احادیث میں اس پر شدید وعید آئی ہے، لہٰذا ہر مسلمان کو اس سے بچنا لازم ہے،(۱) لیکن اس گناہِ کبیرہ کا مرتکب کافر نہیں ہوتا تاوقتیکہ اس کے عقائد کفریہ نہ ہوں۔

۲:- جن صاحب نے میراسیوں کو کافر کہا ہے، انہوں نے سخت غلطی کی، انہیں توبہ و استغفار کرنا چاہئے۔(۲)

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۳۰ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

کسی کافر ملک کا ویزا حاصل کرنے کے لئے ویزا فارم میں اپنے آپ کو قادیانی لکھنے کا حکم

سوال:- خدا کرے حضرت بعافیتِ کاملہ ہوں، ان دنوں یہ مسئلہ زیرِ غور ہے کہ بعض مسلمان کسی کافر ملک کا ویزا سہولت سے حاصل کرنے کے لئے یا کسی اور دُنیاوی مصلحت کے لئے پاسپورٹ اور ویزا کے فارم میں اپنے آپ کو قادیانی لکھ دیتے ہیں۔ اتنی بات تو طے شدہ ہے کہ یہ انتہائی قبیح حرکت اور بڑا گناہ ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایسے شخص کی تکفیر کی جائے گی یا نہیں؟ یہاں دارالافتاء میں

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ کی کتاب ''اسلام اور موسیقی''۔

(۲) وفی مشکٰوۃ المصابیح باب حفظ اللسان والغیبة والشتم ج:۲ ص:۴۱۱ رقم الحدیث:۴۸۱۴ (طبع قدیمی کتب خانه) سباب المسلم فسوق وقتاله کفر. وفی جامع الترمذی ج:۲ ص:۸۸ (طبع فاروقی کتب خانه) عن ابن عمرؓ عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: أیما رجل قال لأخیه کافر، فقد باء بها أحدهما. هذا حدیث صحیح.

اس سلسلے میں استفتاء بھی آیا ہوا ہے، اس سلسلے میں غور کرنے سے جو نقطۂ نظر سامنے آیا ہے اس کا خلاصہ پیشِ خدمت ہے۔ آخر میں چند متعلقہ عبارات بھی ذکر کردی گئی ہیں، جناب سے درخواست ہے کہ اپنی رائے گرامی سے مطلع فرمائیں۔

۱:- کسی کلمے کے موجبِ کفر ہونے، نہ ہونے میں اختلاف ہو تو احتیاط عدمِ تکفیر میں ہوتی ہے۔

۲:- جو کلمہ فی نفسہٖ موجبِ کفر ہو اس کے تلفظ و تکلم کی کئی صورتیں ہیں۔

۱:- ناسیاً یا خاطئاً تکلم ہو، اس صورت میں بالاتفاق تکفیر نہیں کی جائے گی۔

۲:- عامداً تکلم ہو، معلوم ہوتا ہے کہ عمد سے مراد یہ ہے کہ تکلم کا قصد بھی ہو، اس کلمے کے موجبِ کفر ہونے کا علم بھی ہو اور کفر کا ارادہ بھی ہو، اس صورت میں بالاتفاق تکفیر کی جائے گی۔

۳:- جاہلاً تکلم ہو، یعنی تکلم تو ارادے سے ہو، مگر یہ معلوم نہ ہو کہ اس سے آدمی کافر ہو جاتا ہے، اس صورت میں اختلاف ہے، تکفیر و عدمِ تکفیر دونوں قول ہیں۔

۴:- ہازلاً تکلم ہو، یعنی تکلم تو ارادے سے ہو اور اس کے موجبِ کفر ہونے کا علم بھی تھا، مگر ایقاعِ حکم یعنی کفر کا ارادہ نہیں تھا، اس صورت میں تکفیر کی جاتی ہے۔

۵:- لاعباً تکلم ہو، یعنی بطور استہزاء کے کلمۂ کفر کہا جائے، یہ استخفافِ ایمان ہے اور اس کی بھی تکفیر کی جاتی ہے۔

اس تفصیل کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے آپ کو قادیانی لکھتے ہوئے اگر علم ہو کہ یہ باعثِ کفر ہے، لیکن اعتقادِ کفر نہ ہو تو یہ لاعباً یا ہازلاً تکلم قرار پائے گا اور اس صورت میں تکفیر ہوگی، اور اگر موجبِ کفر ہونے کا علم نہ ہوتے ہوئے لکھا گیا ہے تو اختلاف کی بناء پر احتیاط اس میں ہے کہ تکفیر نہ کی جائے۔

چند عبارات یہ ہیں:-

فی البحر: وفی فتح القدیر: ومن هزل بلفظ کفر ارتد وان لم یعتقده للاستخفاف، فهو ککفر العناد والألفاظ التی یکفر بها تعرف فی الفتاویٰ اهـ. (ج:۵ ص:۱۲۰ طبع ایچ ایم سعید).

وفی الفتاویٰ الخیریة: وفی الفتاویٰ اذا أطلق الرجل کلمة الکفر عمدًا لکنه لم یعتقد الکفر قال بعض أصحابنا: لا یکفر لأن الکفر یتعلق بالضمیر ولم یعقد الضمیر علی الکفر وقال بعضهم: یکفر، وهو الصحیح عندی، لأنه استخف بدنیه اهـ. وفی الخلاصة: اذا کان فی المسئلة وجوه توجب التکفیر ووجه واحد یمنع التکفیر، فعلی المفتی أن یمیل الی الوجه الذی یمنع التکفیر تحسینًا للظن بالمسلم. زاد فی البزازیة الا اذا خرج بارادته موجب الکفر فلا ینفعه التأویل حینئذ. وفی التاترخانیة. لا یکفر بالمحتمل، لأن الکفر نهایة فی

العقوبة، فيستدعي نهاية في الجناية، ومع الاحتمال لا نهاية اهـ. قال في البحر: والحاصل أن من تكلم بكلمة الكفر هازلًا أو لاعبًا كفر عند الكل، ولا اعتبار باعتقاده كما صرح به قاضي خان في فتاواه. ومن تكلم بها خطأً أو مكرهًا لا يكفر عند الكل، ومن تكلم بها عامدًا عالمًا كفر بها عند الكل، ومن تكلم بها اختيارًا جاهلًا بأنها كفر ففيه اختلاف، والذي تحرر أنه لا يفتي بتكفير مسلم أمكن حمل كلامه على محمل حسن أو كان في كفره اختلاف ولو رواية ضعيفة، فعلى هذا فأكثر ألفاظ التكفير المذكورة لا يفتي بالتكفير بها، ولقد ألزمت نفسي أن لا أفتي بشيء منها، والله أعلم. (الخيرية على هامش الفتاوى تنقيح الحامدية ج:۱ ص:۱۷۷).[۱]

وفي أحكام القرآن للجصاص: ولأن الفرق بين الجد والهزل أن الجاد قاصد الى اللفظ والى ايقاع حكمه، والهازل قاصد الى اللفظ غير مريد لايقاع حكمه. (ج:۳ ص:۱۹۳).[۲]

وفي التفسيرات الأحمدية: وكذا غير المكره اذا أجرى على لسانه كلمة الكفر استهزاء أو جهلًا يكون كافرًا، فيكون الاية دليلًا على أن ركن الايمان التصديق والاقرار جميعًا، ولكن التصديق لا يحتمل السقوط بحال، والاقرار يحتمله في حالة الاكراه. (ص:۵۰۱).[۳]

پھر دو باتیں اور قابلِ غور ہیں، ایک یہ کہ عام لوگوں کی دینی گرفت اس قدر ڈھیلی ہوچکی ہے کہ تکفیر کا فتویٰ معلوم ہونے کے باوجود بھی بہت سے دُنیاوی مفاد کو ترجیح دیں گے اور یہ حرکت نہیں چھوڑیں گے، اور تکفیر کے فتویٰ کا علم ہوجانے کے بعد یہ حرکت بہرحال کفر ہوگی، تو تکفیر کا فتویٰ دینے کی صورت میں بظاہر یہ مضائقہ ہے کہ کفر سے بچنے کا جو ایک راستہ تھا وہ بھی بند ہوجائے گا..... دُوسری بات یہ کہ اگر تکفیر نہ کی جائے تو خطرہ ہے کہ تکفیر نہ کرنا اس حرکت کی حوصلہ افزائی کا باعث ہوگا۔ ان دونوں باتوں پر غور کرتے ہوئے تقاضائے مصلحت یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ بتاتے یا لکھتے ہوئے صاف تکفیر تو نہ کی جائے تاکہ پہلا حرج لازم نہ آئے، البتہ مذمت و وعید کے الفاظ سخت بتائے جائیں، لیکن یہ بھی تب دُرست ہوگا کہ فقہی طور پر اس کی گنجائش ہو۔

جواب:- کسی کافر ملک کا ویزہ حاصل کرنے کے لئے یا کسی اور دُنیوی مصلحت کے لئے پاسپورٹ اور ویزا فارم پر مذہب کے خانے میں کسی مسلمان کا دیدہ دانستہ اپنے آپ کو قادیانی لکھنا، صراحۃً کافر مذہب کی طرف اپنی نسبت کرنا ہے، جو سراسر موجبِ کفر ہے، اگر کوئی ایسا کرلے تو ایسے شخص پر واجب ہے کہ فوراً صدقِ دل سے توبہ کرلے اور تجدیدِ ایمان کرے، اور آئندہ ایسا کرنے سے مکمل پرہیز کرے۔

---

(۱) طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ۔　(۲) طبع سہیل اکیڈمی لاہور۔　(۳) مطبع کریمی بمبئی۔

آپ نے خط میں جو عباراتِ فقہاء تحریر کی ہیں، ان کا مذکورہ مسئلہ سے تعلق نہیں، اور کسی دُنیاوی غرض سے اپنے آپ کو غیر مسلم ظاہر کرنے کے بارے میں تلاشِ بسیار کے باوجود کوئی واضح تصریح بھی نہیں ملی، البتہ درج ذیل جزئیات سے بیان کردہ حکم کی تائید ہوتی ہے:-

في الهندية: مسلم قال: أنا ملحد، يكفر، ولو قال: ما علمت أنه كفر، لا يعزر بهذا.....

وفي اليتيمة: سألت والدي عن رجل قال: أنا فرعون أو ابليس، فحينئذ يكفر كذا في التاتارخانية.[1]

في الهندية: مسلم رأى نصرانية سمينة فتمنى أن يكون هو نصرانيًا حتّى يتزوجها يكفر، كذا في المحيط. (ج:۲ ص:۲۷۷)۔[2]

واللہ اعلم
بندہ عبدالرؤف سکھروی
۱۴۱۴/۶/۲۱ھ

یہ جواب احقر کی ہدایت پر لکھا گیا ہے، دراصل کوئی کلمۂ کفر کہنا اور بات ہے، اور اپنے آپ کو کسی معروف کافر مذہب کی طرف منسوب کرنا اور بات ہے۔ جو عبارات تحریر کی گئی ہیں وہ اوّل الذکر صورت سے متعلق ہیں، ثانی الذکر سے نہیں۔ لہٰذا ایسی صورت میں احقر کا رُجحان اسی طرف ہے کہ پاسپورٹ پر مذہب کے خانے میں اپنے آپ کو ''مسلمان'' کے بجائے قادیانی یا کسی اور مذہب کا پیرو لکھوانا جو ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے، موجبِ کفر ہے، جس سے توبہ اور تجدیدِ ایمان ضروری ہے۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۴۱۴/۶/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۱۲۳/۲۵)

قادیانیت سے براءت اور کسی مسلمان کو قادیانی کہنے کا حکم

سوال:- السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

من مسمّی بشیر احمد شاہ ولد سید محمد اسماعیل شاہ سکنہ سمارو شہر ضلع نوپا کر سندھ مندرجہ ذیل عقیدہ رکھتا ہوں۔ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے سب فرشتوں اور اس کی سب کتابوں پر اور اس کے سب رسولوں پر اور قیامت کے دن پر اور تقدیر کی بھلائی اور بُرائی پر اور مرنے کے بعد دوبارہ اُٹھائے جانے پر ایمان رکھتا ہوں، ایمانِ مجمل اور مفصل پر پورا یقین رکھتا ہوں۔ میں حلفیہ اقرار کرتا ہوں کہ میں خاتم النبیین

---

(۱) الفتاویٰ الهندية ج:۲ ص:۲۷۹ (طبع مكتبه رشيديه).
(۲) الفتاوىٰ الهندية ج:۲ ص:۲۸۰ (طبع مكتبه رشيديه).

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ختمِ نبوّت پر مکمل اور غیر مشروط طور پر ایمان رکھتا ہوں، اور یہ کہ میں کسی ایسے شخص کا پیروکار نہیں ہوں جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس لفظ کے کسی بھی مفہوم یا کسی بھی تشریح کے لحاظ سے پیغمبر ہونے کا دعوے دار ہو، اور نہ ہی ایسے دعویدار کو پیغمبر یا مذہبی مصلح مانتا ہوں، نہ قادیانی گروپ یا لاہوری گروپ سے تعلق رکھتا ہوں یا خود کو احمدی کہتا ہوں۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی شخص کسی معنی کے لحاظ یا اعتبار سے نبی یا مذہبی مصلح ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کو اور اس کے ماننے والوں کو مرتد و کافر جانتا ہوں۔ اسی طرح مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے ماننے والے احمدی اور لاہوری گروپ سب کو غیر مسلم اور اسلام سے خارج ہونے پر ایمان رکھتا ہوں۔ میرا یہ بیان حلفیہ ہے اور میں کلمۂ طیبہ لا اِلٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھ کر اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر بالکل صحیح اور دُرست تحریر کرتا ہوں۔ آپ سے درخواست ہے کہ میرے مندرجہ بالا عقیدے کو مدِنظر رکھتے ہوئے فتویٰ صادر فرمائیں کہ:-

۱:- عقیدے کے اعتبار سے میں شریعتِ محمدیہ کے مطابق مسلمان ہوں یا نہیں؟

۲:- کیا مجھے قادیانی کہا جانا دُرست ہے؟

۳:- اگر کوئی شخص مجھے قادیانی کہتا ہے تو شریعتِ محمدیہ میں اس کے لئے کیا حکم ہے؟

جواب ۱:- اگر آپ کے وہی عقائد ہیں جو سوال میں مذکور ہیں، اور ان کے علاوہ کوئی فاسد عقیدہ بھی نہیں رکھتے، تو آپ بلاشبہ مسلمان ہیں۔

۲:- مندرجۂ سوال عقائد کا حامل شخص قادیانی نہیں ہوسکتا، اس کو قادیانی کہنا ہرگز دُرست نہیں۔

۳:- کسی مسلمان کو بلاوجہ قادیانی کہنا سخت گناہ ہے،[1] اگر ناواقفیت یا بے احتیاطی سے کہا ہے تو اسے فوراً توبہ کرنی چاہئے، اور اگر کسی غلط فہمی کی بناء پر کہا ہے تو اس کی غلط فہمی دُور کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۳/۸/۷ھ

(فتویٰ نمبر ۳۴/۱۴۴۴ ج)

علماء کو بُرا بھلا کہنے والے کا حکم

سوال:- ایک شخص علمائے دین کو لوطی کہتا ہے، اور کہتا ہے کہ دین فروشی ان کا پیشہ ہے، اور علمِ دین پڑھا کر لوگوں کو گمراہ کر رہے ہیں، علمائے دین بدمعاش ہیں، مدارسِ عربیہ گمراہی کے اڈّے

(۱) وفی مشکوٰة المصابیح "باب حفظ اللسان والغیبة والشتم" ج:۲ ص:۴۱۱ رقم الحدیث:۴۸۱۴ سباب المسلم فسوق وقتاله كفر. وفی الهدایة ج:۲ ص:۵۳۵ (طبع مکتبه شرکت علمیه) وكذا اذا قذف مسلما بغير الزنا، فقال: يا فاسق أو يا كافر، فوجب التعذير.

ہیں، اور مسجدوں کو اصطبل خانہ قرار دے اور مزید لغویات و بیہودہ باتوں کا کہنا اس وقت مذکورہ شخص کا پیشہ بن گیا ہے، اور موصوف عاقل، بالغ و ذی فہم آدمی ہے۔ اب شرعاً اس شخص کا کیا حکم ہے؟

جواب:- مذکورہ کلمات سخت گستاخانہ ہیں، اور تحقیق کے بغیر علماء کی پوری جماعت کو اس قسم کے قبیح و شنیع کلمات کہنا نہ صرف بدترین فسق اور گمراہی ہے، بلکہ ان کلمات کے کلماتِ کفریہ ہونے کا اندیشہ ہے۔[1] مذکورہ شخص پر واجب ہے کہ فوراً ان کلمات سے صدقِ دل کے ساتھ اعلانیہ توبہ کرے بلکہ اسے احتیاطاً تجدید ایمان اور تجدید نکاح بھی کر لینی چاہئے، اور جب تک وہ اپنے اس عمل سے توبہ نہ کر لے اس کے ساتھ دوستانہ تعلقات نہ رکھیں۔[2] واللہ اعلم

۱۴۰۰/۳/۲۳ھ

(فتویٰ نمبر ۴۰۵/۳۱ ب)

حدیث کے ناقابلِ اعتبار ہونے اور جہنم کے دائمی نہ ہونے کا عقیدہ رکھنا

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اور مفتیانِ شرع مندرجہ ذیل مسئلے میں کہ:-

۱:- ہمارے علاقے کے بعض حضرات کا یہ عقیدہ ہے کہ موجودہ وقت میں حدیث کا جو ذخیرہ ہے وہ غیر معتبر اور جلانے کے قابل ہے۔ (معاذ اللہ)

۲:- ایک اور عقیدہ یہ رکھتے ہیں کہ جنت دائمی اور غیر فانی ہے، مگر جہنم دائمی و ابدی نہیں ہے، یعنی جہنم ایک مدت کے بعد فانی اور غیر ابدی ہے، اور کہتے ہیں کہ اس کی انتہاء ہونے کے بعد انسان سارے کے سارے یعنی مشرک و کافر رحمت (جنت) میں جائیں گے اور اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں "ان رحمتی سبقت علیٰ غضبی" اور ساتھ ساتھ مولانا شبلی نعمانی کی کتاب سیرت النبی چہارم میں دوزخ کی انتہاء کے مبحث لوگوں کو دِکھا دِکھا کر لوگوں کے ذہنوں کو خراب کرتے جا رہے ہیں، اب آپ بتائیں کہ ان لوگوں کا عقیدہ شریعتِ محمدی کے مطابق ہے یا نہیں؟

جواب:- مذکورہ عقائد سخت گمراہانہ عقائد ہیں۔ پہلا عقیدہ کہ سارا ذخیرۂ حدیث (معاذ اللہ)

---

(۱) وفی خلاصة الفتاویٰ ج:۴ ص:۳۸۸ (مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ) (ألفاظ الکفر) من أبغض عالمًا بغیر سبب ظاهر خیف علیه الکفر. وراجع أیضًا شرح الفقه الأکبر لمُلّا علی القاري ص:۲۷۰ (طبع دار الاشاعت الاسلامیہ بیروت).

(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے: فتاویٰ رشیدیہ ص:۲۸ و امداد الفتاویٰ ج:۴ ص:۳۹۳ و امداد الأحکام ج:۱ ص:۱۲۵.

ناقابلِ اعتبار ہے، کفریہ عقیدہ ہے، جس کے بعد انسان دائرۂ اسلام سے خارج ہوجاتا ہے،[۱] اور دوسرے عقیدے پر بھی کفر کا اندیشہ ہے۔ ایسے عقائد کے شخص سے جب تک وہ توبہ نہ کرے دوستانہ خصوصی تعلقات نہ رکھنا چاہئے۔

واللہ اعلم

۲۴/۹/۱۴۰۰ھ

(فتویٰ نمبر ۱۲۷۲/۳۱ د)

مسلمان کو کافر کہنے والے کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین کہ مسمّی مولانا ذاکراللہ سواتی حال ساکن لوندخوڑ ضلع مردان(؟) نے اس بارے میں فتویٰ جاری کیا ہے کہ انجمن اشاعت التوحید والسنّت کے افراد سب کافر اور ان کی عورتوں سے نکاح ناجائز ہے، اور محمد بن عبدالوہاب نجدیؒ اور ابن تیمیہؒ اور اسماعیل شہیدؒ اور دیوبندیوں کو بھی کافر کہتے ہیں، کیا مولانا موصوف اس فتویٰ کی رُو سے کافر ہے یا نہیں؟

جواب:- کسی مسلمان کا کافر کہنا سخت گناہ ہے، اور جو شخص ایسا کہے وہ فاسق ہے،[۲] لیکن اس غلطی کی بناء پر اسے مطلقاً کافر بھی نہیں کہا جاسکتا،[۳] تاوقتیکہ اس کے دُوسرے بنیادی عقائد خراب نہ ہوں، البتہ خطرۂ کفر سے خالی نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۵/۷/۱۳۹۱ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) وفي البزازية علىٰ هامش الهندية ج:۶ ص:۳۲۸ (طبع مكتبه حقانيه پشاور) اذا استخف بسنة أو حديث من أحاديثه عليه السلام كفر. وفي الهندية ج ۲ ص ۲۶۵ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه) (الباب التاسع، أحكام المرتدين) من أنكر المتواتر فقد كفر، ومن أنكر المشهور يكفر عند البعض. وقال عيسى ابن ابان: يضلل ولا يكفر وهو الصحيح، ومن أنكر خبر الواحد لا يكفر غير أنه يأثم بترك القبول. وفي شرح الفقه الأكبر ص:۴۷۳ (طبع دار البشائر الاسلامية بيروت. فصل في العلم والعلماء) من قال لفقيه يذكر شيئًا من العلم أو يروى حديثًا صحيحًا أى ثابتًا لا موضوعًا: هذا ليس بشيء، كفر .... الخ.

(۲) وفي مشكوة المصابيح باب حفظ اللسان والغيبة والشتم ج:۲ ص:۴۱۱، رقم الحديث: ۴۸۱۴ (طبع قديمى كتب خانه) سباب المسلم فسوق وقتاله كفر.

(۳) عن ابن عمرؓ عن النبى صلى الله عليه وسلم قال: أيما رجل قال لأخيه: كافر، فقد باء بها أحدهما. هذا حديث صحيح، جامع الترمذى ج:۲ ص:۸۸ (طبع فاروقي كتب خانه) وفي اللمعات والطيبى: انه محمول على المستحل لذلك ... أو لأنه فعل مثل فعل الكافر. (حواله مذكوره) وفي الدر المختار ج ۴ ص:۲۲۹، ۲۳۰ واعلم أنه لا يفتى بكفر مسلم أمكن حمل كلامه على محمل حسن أو كان في كفره خلاف، ولو كان ذلك رواية ضعيفة. وقال الشامي تحت مطلب في حكم من شتم دين مسلم (ج:۴ ص:۲۳۰): ثم ان مقتضى كلامهم أيضا أنه لا يكفر بشتم دين مسلم أى لا يحكم بكفره لامكان التأويل، ثم رأيته في جامع الفصولين حيث قال بعد كلام أقول: وعلى هذا ينبغي أن يكفر من شتم دين مسلم ولكن يمكن التأويل بأن مراده أخلاقه الرديئة ومعاملته القبيحة لا حقيقة دين الاسلام فينبغي أن لا يكفر حينئذ. والله تعالى أعلم.

''اگر فلاں کام کروں تو کافر ہوجاؤں'' کہنے کا حکم

سوال:- اگر بیوی نے کئی مرتبہ کہا: اب بھی نماز نہیں پڑھی تو ''من ترک الصلاۃ متعمدًا فقد کفر''، یا اگر بیوی نے کہہ دیا کہ: ''فلاں کام کروں تو کافر ہوجاؤں'' اور وہ کام کر دیا یا بھول کر کوئی کفریہ فقرہ کہہ دیا (کفر حاصل کرنے کی غرض سے نہیں) تو کیا ان صورتوں میں وہ کافر ہوجائے گی یا طلاق ہوجائے گی؟

جواب:- جان بوجھ کر نماز چھوڑنا انتہائی شدید گناہ ہے، لیکن اس سے انسان کافر نہیں ہوتا،[1] اسی طرح اگر کوئی شخص یہ کہہ دے کہ ''میں اگر فلاں کام کروں تو کافر ہوجاؤں'' تو اتنا کہنے سے بھی کافر نہیں ہوتا، اور اگر وہ کام کرلے تب بھی کافر نہیں ہوتا، اِلّا یہ کہ وہ سمجھتا ہو کہ یہ کام کرنے سے میں واقعی کافر ہوجاؤں گا اور پھر بھی کفر پر راضی ہوکر وہ کام کرلے۔

لما فی الدر المختار: وان فعل کذا فھو کافر، والأصح أن الحالف لم یکفر علقه بماض أو آت ان کان عنده فی اعتقاده أنه یمین، وان کان عنده أنه یکفر فی الحلف یکفر فیھما. (شامی ج:۳ ص:۵۵)۔[2]

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۲۰۹/۲۸ ب)

''میں ہندو ہوں'' کہنے کا حکم

سوال:- اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے کہ جس سے کہا جائے کہ رمضان کا مہینہ ہے، قرآن پاک کی تلاوت کیوں نہیں کرتا؟ تو مسلمان نہیں ہے؟ تو اس کا جواب یہ دے: ''ہاں! میں مسلمان نہیں ہوں بلکہ ہندو یا سکھ ہوں۔'' کیا وہ مسلمان رہتا ہے اور اس کا نکاح باقی رہتا ہے؟

جواب:- یہ کلمہ کہ ''ہاں میں مسلمان نہیں ہوں، ہندو یا سکھ ہوں'' کلمۂ کفر ہے، اور اگر اس کا

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۲۳۵ وتارکھا عمدًا مجانةً أی تکاسلاً فاسق .... الخ. وکذا فی شرح المسلم للنووی ج:۱ ص:۶۱.

(۲) الدر المختار ج:۳ ص:۷۱۷، ۷۱۸. وفی البزازیة علی ھامش الھندیة ج:۶ ص:۳۲۶ (طبع رشیدیه کوئٹه) ان فعل کذا فھو یھودی ثم أتی بالشرط ان کان عنده من أتی بھذا الشرط لا یکفر کانت علیه کفارة الحلف، وان حلف بھذه أعنی بقوله ھو یھودی أو نصرانی أو مجوسی ان کان فعل کذا وقد کان فعله ھو عالم بفعله لا یلزم الکفارة لأنه غموس وقد اختلفت الأجوبة فی کفره والمختار ما قال السرخسی وبکر انه ان کان کفرا عنده الحلف بھذا فھو کافر لأنه رضی بکفر نفسه، والرضا بکفر نفسه کفر بلا نزاع .... الخ.

وہی مطلب مراد تھا جو الفاظ سے سمجھ میں آتا ہے تو انسان ان کلمات کے کہنے سے کافر ہو جاتا ہے[1]، ایسے شخص کو توبہ کے بعد ایمان کی تجدید اور نکاح کی تجدید کرنی لازم ہے، اور اگر مقصد کچھ اور تھا تو وہ لکھ کر دوبارہ سوال کرلیں۔ تجدید ایمان اور تجدید نکاح ہر صورت میں کرلینی چاہئے، کیونکہ یہ بڑا خطرناک اور سنگین جملہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو ایسی بات کہنے سے محفوظ رکھیں، آمین۔ واللہ اعلم

۱۴۰۱/۱۰/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۱۲/۳۲ ج)

اذان کی گستاخی کا حکم

سوال:- ایک شخص نے مؤذّن کے متعلق جو کہ پانچ وقت جامع مسجد میں اذان دیتا ہے، ۵-۶ دفعہ میرے سامنے کہا کہ: ''یہ مؤذّن صبح کے وقت زیادہ بکواس کرتا ہے، جس سے میری نیند میں خلل آتا ہے، اس کو منع کردو کہ صبح کے وقت اذان نہ دیا کرے۔'' ایک شخص نے اس شخص کو کسی بیمار کو انجکشن لگانے کا کہا تو اس نے کہا کہ: ''جب تک مؤذّن سے اذان بند نہیں کرائیں گے، بیمار کو انجکشن نہیں لگاؤں گا۔'' اس شخص کا شرعی حکم کیا ہے؟

جواب:- جس شخص نے اذانِ فجر کے بارے میں ایسے گستاخانہ کلمات کہے ہوں وہ انتہائی بدعقیدہ معلوم ہوتا ہے، یہ کلمات کفر کے ہیں[2]، اس شخص کو چاہئے کہ فوراً اپنے ان کلمات سے توبہ کرکے ایمان کی تجدید کرے، اور جب تک وہ ایسا نہ کرے مسلمانوں کو اس سے خصوصی تعلقات نہ رکھنے چاہئیں۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۹۷۲/۲۸ ج)

''میں کافر ہو جاؤں گا، پتھروں کی پوجا کروں گا، اللہ تعالیٰ سے لڑائی کروں گا'' وغیرہ الفاظ کہنے کا حکم

سوال:- ایک شخص نے چند آدمیوں کے درمیان یہ الفاظ کہے ہیں کہ: ''میں کافر ہو جاؤں

---

(۱) وفي الهندية ج:۲ ص:۲۷۹ مسلم قال: أنا ملحد، يكفر. ولو قال: ما علمت انه كفر، لا يعزر بهذا .... وفي اليتيمة: سألت والدي عن رجل قال: أنا فرعون أو ابليس فحينئذ يكفر، كذا في التاتارخانية. وفي جامع الفصولين ج:۲ ص:۳۰۱ (طبع اسلامي كتب خانه) قال: هو يهودي أو نصراني .... كفر .... لأنه رضاء بالكفر، وهو كفر، وعليه الفتوىٰ. وفي الهندية ج:۲ ص:۲۵۷ (أحكام المرتدين) ومن يرضى بكفر نفسه فقد كفر، وكذا في التاتارخانية ج:۵ ص:۴۶۰.

(۲) وفي الهندية ج:۲ ص:۲۶۹ (مكتبه رشيديه كوئٹه) في النخيير مؤذّن أذّن فقال رجل: أين بانگ غوغا است، يكفر ان قال على وجه الانكار، وفي الفصول ولو سمع الأذان فقال: هذا صوت الجرس، يكفر كذا في التاتارخانية، وراجع أيضًا البحر الرائق ج:۵ ص:۱۲۲ أحكام المرتدين. (محمد زبیر عفی عنہ)

گا، پتھروں کی پوجا کروں گا، اور اللہ تعالیٰ سے لڑائی کروں گا، داڑھی کٹوادوں گا'' جب لوگوں نے گرفت کی تو اس نے چند آدمیوں کے سامنے کلمہ پڑھ کر جھوٹ بولا کہ میں نے ایسا نہیں کہا ہے، جبکہ اس کے اس قول کے پورے محلہ والے گواہ ہیں، اور بغیر تصدیق کئے اس نے الزام تراشی بھی کی ہے، تصدیق کرنے پر محلّہ کے چند آدمیوں کے سامنے یہ اقرار کیا کہ مجھ سے غلطی ہوگئی ہے، اب وہ معافی مانگ رہا ہے۔ اس کا شرعی فتویٰ کیا ہے اور وہ اب اپنے ''کافر ہوجاؤں گا.....الخ'' الفاظ سے توبہ کررہا ہے تو اس توبہ کی کیا صورت اختیار کی جائے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں مذکورہ شخص نے یہ الفاظ کہہ کر سنگین گناہ کا ارتکاب کیا، اسے فوراً صدقِ دِل کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے توبہ و اِستغفار کرنا چاہئے، توبہ کی صورت یہ ہے کہ صدقِ دِل سے اللہ تعالیٰ سے عرض کرے کہ: ''یا اللہ! میں نے مذکورہ کلمات کہہ کر سخت گمراہی کا ارتکاب کیا، میں اس پر بے حد نادم وشرمسار ہوں، آئندہ کے لئے ایسے کلمات سے اور ہر طرح کے کفریہ کلمات و اعمال سے براءت کا اظہار کرتا ہوں، یا اللہ! مجھے اپنے فضل سے معاف فرمادیجئے'' اس کے ساتھ ہی احتیاطاً ایمانِ مفصل کی شہادت اور اسلام کے سوا ہر دین سے اپنی مکمل براءت کا بھی لوگوں کے سامنے اظہار و اعلان کرے۔

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۲/۲۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۶۴/۲۸ الف)

قرآنِ کریم میں لفظی تحریف کا عقیدہ رکھنا اور استدلال میں حضرت کشمیریؒ کی عبارت پیش کرنا

سوال:- باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

حضراتِ علمائے کرام ومفتیانِ عظام مسئلۂ ذیل کے بارے میں کیا فرماتے ہیں:-

۱:- ہمارے علاقے میں ایک مولوی صاحب اپنے بیان میں کہا کرتا ہے کہ قرآن میں لفظی و معنوی دونوں قسم کی تحریفیں موجود ہیں۔ اور وہ مولوی صاحب اپنے قول کی تائید کے لئے درج ذیل عبارت نقل کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ بات علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے اپنی ایک کتاب میں لکھی ہے، کتاب کا نام نہیں بتایا ہے۔ عبارت درج ذیل ہے:-

''واعلم أن في التحريف ثلاثة مذاهب، ذهب جماعة الى أن التحريف في الكتب السماوية قد وقع بكل نحو في اللفظ والمعنى جميعًا، وهو الذي مال اليه ابن حزم، ....

وذهب جماعة انکار التحریف اللفظی رأسا فالتحریف عندهم کله معنوی، قلت یلزم علی هذا المذهب أن یکون القرآن أیضًا محرفًا، فان التحریف المعنوی غیر قلیل فیه أیضًا، والذی تحقق عندی أن التحریف فیه لفظی أیضًا، أما أنه عن عمد منهم أو لمغلطة.“

اس عبارت کا کیا مطلب ہے؟

۲:- بیان کرنے والے مولوی صاحب کا شرعی حکم کیا ہے، آیا قابلِ امامت ہے یا نہیں؟ اور اس کا یہ عقیدہ، قرآن مجید کی آیت: ”اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ“ الآیة، کا مخالف ہے یا نہیں؟ نیز جس مصنف کی کتاب کا حوالہ پیش کر رہا ہے اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ مسلمان ہے یا مرتد؟ مدلل جواب عنایت فرما کر ممنون فرمائیں۔

نوٹ:- شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم! ہمارے علاقے کے علماء و عوام آپ ہی کے فتویٰ پر اعتبار کرتے ہیں، لہٰذا آپ اپنے دست مبارک سے جواب تحریر فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔ بینوا توجروا

فضل جاوید حنفی باجوڑی

جواب:- قرآنِ کریم میں تحریفِ لفظی کا عقیدہ رکھنا کفر ہے، حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے مذکورہ عبارت میں یہ فرمایا ہے کہ پچھلی کتبِ سماویہ کے بارے میں (یعنی تورات، انجیل، زبور کے بارے میں) جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ان میں صرف تحریفِ معنوی ہوئی ہے، وہ غلط کہتے ہیں، کیونکہ کرنے والوں نے تو قرآنِ کریم میں بھی تحریفِ معنوی کی کوشش کی ہے۔ لہٰذا حضرت رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک پچھلی کتبِ سماویہ میں تحریفِ لفظی بھی ہوئی ہے۔ حضرتؒ کی یہ عبارت[1] پچھلی کتبِ سماویہ سے متعلق ہے،[2] لہٰذا اس عبارت سے قرآنِ کریم کی تحریفِ لفظی کا عقیدہ

(۱،۲) حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ کی مذکورہ عبارت ”فیض الباری“ ج:۳ ص:۳۹۵ کی ہے۔ حضرت کشمیریؒ نے یہ عبارت حضرت ابن عباسؓ سے منقول بخاری شریف ”باب لا یسأل أهل الشرک عن الشهادة وغیرها“ ج:۱ ص:۳۶۹ (طبع قدیمی کتب خانہ) کی اس روایت کی تشریح میں ذکر فرمائی ہے: ”عن عبدالله بن عباس قال: یا معشر المسلمین! کیف تسألون أهل الکتب وکتابکم الذی أنزل علی نبیه احدث الأخبار بالله تقرؤنه، لم یشب وقد حدثکم الله أن أهل الکتب بدلوا ما کتب الله وغیروا بأیدیهم الکتب، فقالوا: هو من عند الله لیشتروا به ثمنًا قلیلًا، أفلا ینهاکم ما جاءکم من العلم عن مسألتهم ولا والله ما رأینا منهم رجلًا قط یسألکم عن الذی أنزل علیکم.“ اس روایت میں اہلِ کتاب کی تحریف کا ذکر ہے، اور حضرت کشمیریؒ نے بھی اپنی مذکورہ عبارت میں پچھلی کتبِ سماویہ میں اہلِ کتاب کی تحریف کا ذکر فرمایا ہے، جیسا کہ اس عبارت میں ”ان التحریف فی الکتب السماویة“ کے الفاظ سے واضح ہے۔ اس کے بعد آخر میں ”ان التحریف فیه لفظی“ میں ”فیه“ کی ضمیر حدیث ابن عباسؓ میں ”ما کتب الله“ کی طرف راجع ہے، قرآن کی طرف نہیں کیونکہ حضرت شاہ صاحبؒ پچھلی کتبِ سماویہ میں ہی اختلافی مذاہب بیان کر رہے ہیں، اور پھر ”والذی تحقق عندی“ سے پچھلی کتب کی تحریف میں اختلافی مذاہب میں قولِ محقق ذکر فرما رہے ہیں، نیز اس سے اگلی عبارت ”اما انه عن عمد منهم“ میں ”منهم“ کی ضمیر غائب کا مرجع بھی حدیث ابن عباسؓ میں ”اهل الکتاب“ ہونا واضح ہے۔ (محمد زبیر حق نواز)

نکالنا قطعی گمراہی کی بات ہے، اور جو شخص قرآنِ کریم میں تحریفِ لفظی کا قائل ہو وہ مسلمان نہیں، کافر ہے۔ ایسے شخص کے پیچھے نماز بھی نہیں ہوگی۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۲۱/۳/۳ھ

(فتویٰ نمبر ۷۲۳/۴۱۸)

ایک طنزیہ مضمون میں اللہ تعالیٰ کی شان میں نامناسب الفاظ استعمال کرنے کا حکم

سوال:- فتویٰ حاصل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ایک مصنف نے اپنے مضمون میں خدا کی شان میں گستاخی کی ہے، اس کے خلاف مقدمہ چلانا ہے۔ مندرجہ ذیل عبارات رسالہ ''الف لیلیٰ'' ڈائجسٹ کے صفحات: ۹۰ تا ۹۳ پر لکھی ہوئی ہیں، جس کا خلاصہ یہ ہے: ''چند دن ہوئے میں نے خواب میں دیکھا، مجھے ایسا لگا جیسے کوئی سوتے میں جگا رہا ہے، سر اُٹھایا تو ایک فرشتہ تھا، کہنے لگا: اچھے جرنلسٹ ہو، خدا کے دربار میں ہنگامہ ہے اور تم یہاں پڑے ہو۔ میں نے کہا: ''میرا ڈیڑ تو کہتا ہے کہ صرف وزیروں اور زراعتی ناخداؤں کے ہاں جایا کرو، مگر تم کہتے ہو تو آج خدا کو بھی دیکھ لیتے ہیں، پتہ نہیں اس کی اسٹوری اخبار والے قبول کرتے ہیں یا نہیں؟ کیونکہ وہ ہماری پارٹی کا نہیں، ابلیس ہوتا تو دُوسری بات تھی۔

بہرحال میں نے اپنی ڈائری اور کیمرہ اُٹھایا اور چل پڑا، وہاں پہنچے تو دیکھا کہ واقعی ہنگامہ ہے، اللہ میاں تخت پر بیٹھے ہیں، نور کی رُوح پرور روشنی ہے، چاروں طرف فرشتے سجدے میں پڑے ہیں، پسِ منظر میں حمد و ثنا کی موسیقی ہے، دھیمی دھیمی خوشبو کی لہریں اُٹھ رہی ہیں، مگر درمیان میں چند مغربی سائنسدان کھڑے گستاخانہ طریقے سے شور کر رہے ہیں۔

اس فرشتے نے کان میں کہا کہ: خدا سے بغاوت کر کے اپنی خودمختاری کا نوٹس دینے آئے ہیں، میں نے غور سے سنا تو ایک بڈھا سائنسدان چیخ رہا تھا۔

ہم کیوں مانیں تیری خدائی؟ کیا ہے تیرے پاس جو ہمارے پاس نہیں؟ تیری خدائی کی بنیاد صرف دو چیزوں پر ہے، ایک تخریب جو قہر اور عذاب بن کر آتی ہے اور دُوسری تخلیق۔ ہمارے پاس بھی یہ دونوں چیزیں موجود ہیں۔

ہمارے ایٹم بم آج تیری دُنیا کا ایسے انداز میں خاتمہ کر سکتے ہیں کہ اتنے بڑے پیمانے پر تو نے بھی آج تک تخریب نہ کی ہوگی، تو نے دُنیا کو قیامت کے دن حشر برپا کرنے کی دھمکی دے کر زیر کیا اور انہیں

مذہب کی زنجیروں میں جکڑا، وہی حشر ہم اپنے بموں سے برپا کرسکتے ہیں“ .....(الخ تا ص:۹۳- از ناقل)

تمام صفحات کی عبارات سے اللہ تعالیٰ کی تحقیر، توہین وتذلیل ہوتی ہے یا نہیں؟ مسلمانوں کے عقیدے میں خلل پڑتا ہے یا نہیں؟

نمبر۲، ۳:- کیا اس عبارت سے کفر لازم آتا ہے یا نہیں جو اُوپر (قوسین) میں نقل کی گئی ہے؟

نمبر۴:- ”کیا میں غلط کہہ رہا تھا اے خدا! میں نے جرأت کرکے پوچھ لیا، اللہ میاں نے میری طرف دیکھا اور پھر اپنی تخلیق پر شرم سے سر جھکالیا، تو عرفی میاں، مغرب کے سائنسدان اپنی صدیوں کی سائنسی ترقی سے خدا کا سر نہ جھا سکے اور ہم نے اس ملک کی بیس برس کی زندگی میں خدا کا سر جھکادیا ہے، ہم آگے ہیں یا نہیں؟“

نمبر۵، ۶:- کیا ایسے مسلمانوں کو جو پاکستان میں رعایا کی حیثیت سے مقیم ہیں ان کی، عام مسلمانوں کی دِل آزاری اور باری تعالیٰ سے اس درجہ گستاخی کی بناء پر اگر ملکِ پاکستان کے دستور کی بنیاد پر ضربِ کاری لگ رہی ہو تو اس کو دستورِ اساسی کا منکر تصوّر کرنا چاہئے یا نہیں؟ اور ملک کا اور خدا کا دُشمن اور ملک کا باغی سمجھنا چاہئے یا نہیں؟

جواب:- اگرچہ منسلکہ مضمون ایک طنزیہ مضمون ہے، جس میں الفاظ کی حقیقت مراد نہیں ہوتی، لیکن طنزیہ انداز میں بھی اللہ تعالیٰ کی شان میں ایسی باتیں کرنا، اور اس کی طرف ایسی فرضی باتیں منسوب کرنا سنگین گستاخی ہے، جس پر کفر کا بھی خوف ہے۔ لہٰذا ایسے مضمون لکھنے والے کو فوراً صدقِ دِل سے توبہ کرنی چاہئے۔ ایسے مضامین کی نشر واشاعت بالکل ناجائز ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی تخلیق اور اس کے کارخانۂ قدرت کو طنز ومزاح کا موضوع بنانا انتہائی خطرناک گناہ ہے۔ اگر کوئی شخص ایسے الفاظ کو حقیقت سمجھتا ہو تو اس کے کفر میں کوئی شبہ نہیں۔

لما فی العالمگیریة: یکفر اذا وصف اللہ تعالٰی بما لا یلیق به أو سخر باسم من أسمائه أو بأمر من أوامره أو أنکر وعده ووعیده أو جعل له شریکًا أو ولدًا أو زوجة أو نسبه الی الجهل أو العجز أو النقص، ویکفر بقوله: یجوز أن یفعل اللہ تعالٰی فعلًا لا حکمة فیه. (عالمگیریة ج:۲ ص:۲۵۸)[۱]۔ اور اگر الفاظ کی حقیقت مقصود نہ ہو بلکہ صرف موجودہ دور کے انسانوں پر طنز مقصود ہو تو چونکہ تکفیرِ مسلم ایک سنگین معاملہ ہے، اس لئے تکفیر سے تو کفِ لسان کیا جائے گا،[۲] لیکن اس کے سنگین گستاخی اور سخت گناہ ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اس مضمون کے مصنف اور ناشر دونوں کو

---

(۱) الباب التاسع فی أحکام المرتدین (طبع مکتبه حقانیه پشاور).

(۲) وفی الدر المختار ج:۴ ص:۲۲۹ (طبع ایچ ایم سعید) واعلم أنه لا یفتی بکفر مسلم أمکن حمل کلامه علی محمل حسن.

آخرت کے مؤاخذے کی فکر کر کے فوراً اس پر توبہ کرنی چاہئے، اور حکومت کو ایسے مضامین کی اشاعت کی اجازت ہرگز نہ دینی چاہئے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۲/۶ھ

قادیانیوں کے ''لاہوری گروپ'' سے تعلق رکھنے والے شخص کے چند کفریہ عقائد کا حکم

سوال:- ایک شخص کئی سال تک لاہوری، احمدیوں کے ایک تبلیغی رسالے کا ایڈیٹر رہتا ہے، اور اس کے عقائد یہ ہیں:-

الف:- ایک غیر عرب مسلمان کو (جو عربی نہیں جانتا) نماز میں اپنی مادری زبان میں قرآن کا ترجمہ جو لفظاً ہو پڑھنے کی اجازت دی گئی ہے۔

ب:- امام ابوحنیفہؒ نے یہ فتویٰ دیا تھا کہ ایک غیر عرب مسلمان جو عربی زبان نہیں جانتا نماز میں قرآن کا فارسی ترجمہ پڑھ سکتا ہے۔

ج:- محنت کش طبقہ (کسان اور مزدور) کے لئے روزہ رکھنا ضروری نہیں، اور یہ کہ رمضان کے روزوں کے لئے وقت اور مہینے کی پابندی بھی لازم نہیں ہے۔ کیا ایسے شخص کو مسلمان شمار کیا جانا چاہئے؟ اور کیا اسے کسی اسلامی ادارے کی نگرانی اور ذمہ داری سونپی جاسکتی ہے جبکہ وہ اپنے عقائد کا تحریری وتقریری اظہار کرتا ہے؟

جواب:- اگر یہ صاحب اب بھی لاہوری، مرزائیوں کے عقائد سے متفق ہیں تب تو ان کے کفر میں کوئی شبہ نہیں ہے، اور اگر ان عقائد سے تائب ہو چکے ہیں تب بھی ان کا یہ عقیدہ کہ روزوں کے لئے وقت اور مہینے کی پابندی لازم نہیں ہے، کفریہ عقیدہ ہے،[2] اور غیر عرب کے لئے اپنی مادری زبان میں نماز کی اجازت بھی گمراہی ہے، امام ابوحنیفہؒ کی طرف جو بات انہوں نے منسوب کی ہے وہ بھی اس اطلاق کے ساتھ دُرست نہیں، امام صاحبؒ کا مطلب کچھ اور تھا،[3] اور ایسے شخص کو کسی اسلامی ادارے کی ذمہ داری سونپنا ہرگز دُرست نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۰۸/۲۸ ج)

---

(۱) نیز دیکھئے امداد الفتاویٰ ج:۵ ص:۳۹۳۔
(۲) "اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ" (البقرۃ:۱۸۴)، "فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ" الآیۃ (البقرۃ:۱۸۵)۔
(۳) تفصیل کے لئے دیکھئے: رد المحتار مطلب فی حکم القرائۃ بالفارسیۃ ج:۱ ص:۴۸۵ (طبع سعید)۔

﴿فصل فی الفِرَق والأحزاب الإسلامیة والباطلة والأشخاص المتعلقین بھا﴾

(مختلف اسلامی وغیر اسلامی فرقوں اور ان سے متعلق شخصیات کے بیان میں)

''الہدیٰ انٹرنیشنل'' کے افکار وعقائد کا حکم

سوال:- حضرت جناب مفتی صاحب، زیدت معالیہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

سائلہ نے اسلام آباد کے ایک ادارے ''الہدیٰ انٹرنیشنل'' سے ایک سالہ ڈپلومہ کورس ان اسلامک اسٹڈیز (One Year Diploma Course in I.S) کیا ہے۔ سائلہ اس ادارے میں طلبِ علم کی جستجو میں گئی تھی اور ان کے خفیہ عقائد سے ناواقف تھی، ایک سالہ کورس کے بعد ان کے عقائد کچھ صحیح معلوم نہ ہوئے تو سوچا کہ علمائے کرام سے فتویٰ طلب کیا جائے، تاکہ اُمتِ مسلمہ کی بیٹیوں تک عقائدِ صحیحہ کو پہنچا کر ان کو گمراہی سے بچایا جاسکے۔ ہماری اُستاد اور ''الہدیٰ انٹرنیشنل'' کی نگران محترمہ ڈاکٹر فرحت ہاشمی صاحبہ کے نظریات کا نچوڑ پیشِ خدمت ہے۔

۱:- اِجماعِ اُمت سے ہٹ کر ایک نئی راہ اختیار کرنا۔

۲:- غیر مسلم اور اسلام بیزار طاقتوں کے نظریات کی ہم نوائی۔

۳:- تلبیسِ حق و باطل۔

۴:- فقہی اختلافات کے ذریعے دین میں شکوک وشبہات پیدا کرنا۔

۵:- آسان دین۔

۶:- آداب ومستحبات کو نظر انداز کرنا۔

اب ان بنیادی نکات کی کچھ تفصیل درج ذیل ہے:-

۱:- اِجماعِ اُمت سے ہٹ کر نئی راہ اختیار کرنا:

۱:- قضائے عمری سنت سے ثابت نہیں، صرف توبہ کرلی جائے، قضا ادا کرنے کی ضرورت

نہیں ہے۔

۲:۔۳ طلاقوں کو ایک شمار کرنا۔

۳:۔نفلی نمازوں، صلوٰۃ التسبیح، رمضان میں طاق راتوں خصوصاً ۲۷ویں شب میں اجتماعی عبادت کا اہتمام اور خواتین کے جمع ہونے پر زور دینا۔

۲:۔ غیر مسلم، اسلام بیزار طاقتوں کے خیالات کی ہم نوائی:

۱:۔مولوی (عالم)، مدارس اور عربی زبان سے دُور رہیں۔

۲:۔ علماء، دین کو مشکل بناتے ہیں، آپس میں لڑتے ہیں، عوام کو فقہی بحثوں میں اُلجھاتے ہیں۔ بلکہ ایک موقع پر تو فرمایا کہ: اگر آپ کو کسی مسئلے میں صحیح حدیث نہ ملے تو ضعیف سے لیں، لیکن علماء کی بات نہ لیں۔

۳:۔ مدارس میں گرامر، زبان سکھانے، فقہی نظریات پڑھانے میں بہت وقت ضائع کیا جاتا ہے، قوم کو عربی زبان سیکھنے کی ضرورت نہیں، بلکہ لوگوں کو قرآن صرف ترجمے سے پڑھایا جائے۔

ایک موقع پر کہا (ان مدارس میں جو ۷، ۸، ۸ سال کے کورس کرائے جاتے ہیں، یہ دین کی رُوح کو پیدا نہیں کرتے، اپنی فقہ کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں) اشارہ درسِ نظامی کی طرف ہے۔

۴:۔ وحیدالدین خان کی کتابیں طالب علموں کی تربیت کے لئے بہترین ہیں، نصاب میں بھی شامل ہیں اور اسٹالز پر بھی رکھی جاتی ہیں، کسی نے احساس دِلایا کہ ان کے بارے میں علماء کی رائے کیا ہے؟ تو کہا کہ: ''حکمت، مؤمن کی گمشدہ میراث ہے''۔

۳:۔تلبیسِ حق و باطل:

۱:۔تقلید شرک ہے، (لیکن کون سی برحق ہے اور کس وقت غلط ہے؟ یہ کبھی نہیں بتایا)۔

۲:۔ضعیف حدیث پر عمل کرنا تقریباً ایک جرم بنا کر پیش کیا جاتا ہے (جب بخاری میں صحیح ترین احادیث کا مجموعہ ہے تو ضعیف کیوں قبول کی جائے؟)۔

۴:۔فقہی اختلافات کے ذریعے دین میں شکوک وشبہات پیدا کرنا:

۱:۔ اپنا پیغام، مقصد اور متفق علیہ باتوں سے زیادہ زور دُوسرے مدارس اور علماء پر طعن وتشنیع۔

۲:۔ ایمان، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج کے بنیادی فرائض، سنتیں، مستحبات، مکروہات سکھانے سے زیادہ اختلافی مسائل میں اُلجھا دیا گیا، (پروپیگنڈا ہے کہ ہم کسی تعصب کا شکار نہیں اور صحیح حدیث کو پھیلا

رہے ہیں)۔

۳:- نماز کے اختلافی مسائل رفعِ یدین، فاتحہ خلف الامام، ایک وتر، عورتوں کو مسجد جانے کی ترغیب، عورتوں کی جماعت، ان سب پر صحیح حدیث کے حوالے سے زور دیا جاتا ہے۔

۴:- زکوۃ میں غلط مسائل بیان کیے جاتے ہیں، خواتین کو تملیک کا کچھ علم نہیں۔

۵:- آسان دین:

۱:- دین مشکل نہیں، مولویوں نے مشکل بنادیا ہے، دین کا کوئی مسئلہ کسی بھی امام سے لے لیں، اس طرح بھی ہم دین کے دائرے میں ہی رہتے ہیں۔

۲:- حدیث میں آتا ہے کہ آسانی پیدا کرو، تنگی نہ کرو، لہٰذا جس امام کی رائے آسان معلوم ہو وہ لے لیں۔

۳:- روزانہ یٰسین پڑھنا صحیح حدیث سے ثابت نہیں، نوافل میں اصل صرف چاشت اور تہجد ہے، اِشراق اور اَوّابین کی کوئی حیثیت نہیں۔

۴:- دین آسان ہے، بال کٹوانے کی کوئی ممانعت نہیں، اُمہات المؤمنین میں سے ایک کے بال کٹے ہوئے تھے۔

۵:- دین کی تعلیم کے ساتھ ساتھ پکنک، پارٹیاں، اچھا لباس، زیورات کا شوق، محبت، مَنْ حَرَّمَ زِیْنَۃَ اللہِ۔

۶:- خواتین دین کو پھیلانے کے لئے گھر سے ضرور نکلیں۔

۷:- محترم کا اپنا عمل طالب علموں کے لئے حجت ہے، محرَم کے بغیر تبلیغی دوروں پر جانا، قیام اللیل کے لئے راتوں کو نکلنا، میڈیا کے ذریعے تبلیغ (ریڈیو، ٹی وی، آڈیو)۔

۸:- آداب و مستحبات کی رعایت نہیں، خواتین ناپاکی کی حالت میں بھی قرآن چھوتی ہیں، آیات پڑھتی ہیں، قرآن کی کلاس میں قرآن کے اُوپر نیچے ہونے کا احساس نہیں۔

۶:- متفرقات:

۱:- قرآن کا ترجمہ پڑھا کر ہر معاملے میں خود اجتہاد کی ترغیب دینا۔

۲:- قرآن و حدیث کے فہم کے لئے جو اکابر علمائے کرام نے علوم سیکھنے کی شرائط رکھی ہیں، ان کو بیکار، جاہلانہ باتیں اور سازش قرار دینا۔

۳:- کسی فارغ التحصیل طالبہ کے سامنے دین کا کوئی حکم یا مسئلہ رکھا جائے تو اس کا سوال یہ

ہوتا ہے کہ یہ صحیح حدیث سے ثابت ہے یا نہیں؟ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ گلی گلی، محلے محلے "الہدیٰ" کی برانچز کھلی ہوئی ہیں، اور ہر قسم کی طالبہ خواہ ابھی اس کی تجوید ہی دُرست نہ ہوئی ہو آگے پڑھا رہی ہے، اور لوگوں کو مسائل میں بھی اُلجھایا جارہا ہے۔

گھر کے مردوں کا تعلق عموماً مسجد سے ہے (جہاں نماز کا طریقہ فقہِ حنفی کے مطابق ہے)، گھر کی عورتیں مردوں سے اُلجھتی ہیں کہ ہمیں مساجد کے مولویوں پر اعتماد نہیں۔

مطلوبہ سوالات:

۱:- مذکورہ بالا تمام مسائل کی شرعی نقطۂ نظر سے وضاحت فرماکر مشکور فرمائیں۔

۲:- محترمہ ڈاکٹر فرحت ہاشمی کے اس طریقۂ کار کی شرعی حیثیت، نیز محترمہ کی گلاسگو یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

۳:- ان کے اس کورس میں شرکت کرنا، لوگوں کو اس کی دعوت دینا، اور ان سے تعاون کرنے کی شرعی نقطۂ نظر سے وضاحت فرمادیجئے، جزاکم اللہ خیر الاحسن الجزاء۔

مستفتیہ مسز سیما افتخار
One Year Diploma Holder from
Al-Huda International
Islamabad

جواب:- سوال میں جن نظریات کا ذکر کیا گیا ہے، خواہ وہ کسی کے بھی نظریات ہوں، ان میں سے اکثر غلط ہیں، بعض واضح طور پر گمراہانہ ہیں، مثلاً: اِجماعِ اُمت کو اہمیت نہ دینا، تقلید کو علی الاطلاق شرک قرار دینا، جس کا مطلب یہ ہے کہ چودہ سو سال کی تاریخ میں اُمتِ مسلمہ کی اکثریت جو ائمۂ مجتہدین میں سے کسی کی تقلید کرتی رہی ہے، وہ مشرک تھی، یا یہ کہنا کہ قضائے عمری فوت شدہ نمازوں کو قضا کرنے کی ضرورت نہیں،[1] صرف توبہ کافی ہے۔ بعض نظریات جمہور اُمت کے خلاف ہیں، مثلاً: تین طلاقوں کو ایک قرار دینا۔ بعض بدعت ہیں، مثلاً: صلوٰۃ التسبیح کی جماعت یا قیام اللیل کے لئے راتوں کو اہتمام کے ساتھ لوگوں کو نکالنا یا خواتین کو جماعت سے نماز پڑھنے کی ترغیب۔ بعض انتہائی گمراہ کن ہیں، مثلاً: قرآنِ کریم کو صرف ترجمے سے پڑھ کر پڑھنے والوں کو اجتہاد کی دعوت، یا اس بات پر لوگوں کو آمادہ کرنا کہ وہ جس مذہب میں آسانی پائیں، اپنی خواہشات کے مطابق اسے اختیار کرلیں، یا کسی کا اپنے عمل کو حجت قرار دینا۔ اور ان میں سے بعض نظریات فتنہ انگیز ہیں، مثلاً: علماء و فقہاء سے بدظن کرنا، دینی تعلیم کے جو ادارے اسلامی علوم کی وسیع و عمیق تعلیم کا فریضہ انجام دے رہے ہیں ان کی

(۱) قضائے عمری سے متعلق حضرتِ والا دامت برکاتہم کا تفصیلی فتویٰ آگے "کتاب الصلوٰۃ، باب قضاء الفوائت" میں ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر عفی عنہ)

اہمیت ذہنوں سے کم کر کے مختصر کورس کو علمِ دین کے لئے کافی سمجھنا، نیز جو مسائل کسی امامِ مجتہد نے قرآن و حدیث سے اپنے گہرے علم کی بنیاد پر مستنبط کئے ہیں، ان کو باطل قرار دے کر اسے قرآن و حدیث کے خلاف قرار دینا اور اس پر اصرار کرنا۔

جو شخصیت یا ادارہ مذکورہ بالا نظریات رکھتا ہو، اور اس کی تعلیم و تبلیغ کرتا ہو، وہ نہ صرف یہ کہ بہت سے گمراہانہ، گمراہ کن یا فتنہ انگیز نظریات کا حامل ہے، بلکہ اس سے مسلمانوں کے درمیان افتراق و انتشار پیدا ہونے کا قوی اندیشہ ہے، اور اگر کوئی شخص سہولتوں کی لالچ میں اس قسم کی کوششوں سے دین کے قریب آئے گا بھی، تو مذکورہ بالا فاسد نظریات کے نتیجے میں وہ گمراہی کا شکار ہوگا، لہٰذا جو ادارہ یا شخصیت ان نظریات کی حامل اور مبلغ ہو، اور اپنے دُروس میں اس قسم کی ذہن سازی کرتی ہو، اس کے درس میں شرکت کرنا اور اس کی دعوت دینا، ان نظریات کی تائید ہے جو کسی طرح جائز نہیں، خواہ اس کے پاس کسی قسم کی ڈگری ہو، اور گلاسگو یونیورسٹی کی ڈگری بذاتِ خود اسلامی علوم کے لحاظ سے کوئی قیمت نہیں رکھتی، بلکہ غیر مسلم ممالک کی یونیورسٹیوں میں مستشرقین نے اسلامی تحقیق کے نام پر اسلامی اَحکام میں شکوک و شبہات پیدا کرنے اور دین کی تحریف کا ایک سلسلہ عرصۂ دراز سے شروع کیا ہوا ہے۔

ان غیر مسلم مستشرقین نے، جنھیں ایمان تک کی توفیق نہیں ہوئی، اس قسم کے اکثر ادارے درحقیقت اسلام میں تحریف کرنے والے افراد تیار کرنے کے لئے قائم کئے ہیں، اور ان کے نصاب و نظام کو اس انداز سے مرتب کیا ہے کہ اس کے تحت تعلیم حاصل کرنے والے - اِلَّا ما شاء اللہ - اکثر و بیشتر دجل و فریب کا شکار ہو کر عالمِ اسلام میں فتنے برپا کرتے ہیں۔ لہٰذا گلاسگو یونیورسٹی سے اسلامی علوم کی کوئی ڈگری نہ صرف یہ کہ کسی شخص کے مستند عالم ہونے کی کوئی دلیل نہیں، بلکہ اس سے اس کے دینی فہم کے بارے میں شکوک پیدا ہونا بھی بے جا نہیں۔

دُوسری طرف بعض اللہ کے بندے ایسے بھی ہیں جنھوں نے ان یونیورسٹیوں سے ڈگریاں حاصل کیں، اور عقائدِ فاسدہ کے زہر سے محفوظ رہے، اگرچہ ان کی تعداد کم ہے، لہٰذا یہ ڈگری نہ کسی کے مستند عالم ہونے کی علامت ہے، اور نہ محض اس ڈگری کی وجہ سے کسی کو مطعون کیا جاسکتا ہے، بشرطیکہ اس کے عقائد و اعمال دُرست ہوں۔

مذکورہ بالا جواب ان نظریات پر مبنی ہے جو سائلہ نے اپنے استفتاء میں ذکر کئے ہیں، اب کون شخص ان نظریات کا کس حد تک قائل ہے؟ اس کی ذمہ داری جواب دہندہ پر نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۲۲/۴/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۴۸۶/۱)

بریلوی فرقے کا تعارف اور حکم

(عربی فتویٰ)

السؤال:-

الحمد لله رب العالمين، والصلوٰة السلام على رسول الله واله وصحبه أجمعين.

شيخى الكريم العلامة محمد تقى العثمانى حفظه الله

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته

كل عام وأنتم بخير، وتقبل الله منكم الطاعات، وأعاد الله هذا العيد عليكم وعلينا وعلى المسلمين باليمن والبركات. أرجو أن تكون وأسرتک وجميع أحبابک فى خير وعافية، كما أرجو المعذرة فى تأخر المراسلة، فقد انشغلت بالدراسة وأمور الأسرة والله المستعان.

أرسلت اليک رسالة وبطاقة معايدة فى عيد الفطر، فهل وصلاک؟

فهمت اشارتک وأرجو التوفيق، وهو شرف أن أقوم بترجمة كتاب لک، لكننى مشغول بالاعداد للدكتوراه فى حقوق التأليف، ومن أهم مراجعى كتابک (قضايا فقهية معاصرة) وسأقوم ان شاء الله بترجمة بعض كلامک، وأرسل اليک ما ترجمته فى حينه.

ما يقول الشيخ أيده الله فى الطريقة البريلوية، اذ لا توجد هذه الطريقة فى بلادنا، ولم أجد كتابا بالعربية يتحدث عنها سوى كتاب لأحد علماء نجد، وقد رأيته غير منصف مع غير البريلوية، فلم أثق فى حكمه أو نقله، فالرجاء بيان حالهم، فالناس بين محب غال أو مبغض قال، والله الهادى للصواب. والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته

محمد على محمد احداش

الجواب:-

الى فضيلة الأخ الكريم العلامة محمد على محمد احداش، حفظه الله تعالىٰ ورعاه

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته، وبعد:

فقد تسلمت بسرور رسالتک الكريمة، ودعوت لک بالتوفيق والنجاح، وأن يوفقک الله تعالىٰ لاتمام عملک كما يحبه ويرضاه، وقد سألتنى عن أمرين:-[1]

الأوّل: بالنسبة للطريقة البريلوية وان هؤلاء يتميزون عن جمهور المسلمين فى

(۱) والسؤال الثانى يتعلق بعقد الاجارة، وسيجئ فى بابه ان شاء الله. (محمد زبير)

بعض العقائد والأعمال المبتدعة، فمن عقائدهم أن رسول الله صلى الله عليه وسلم عالم للغيب، ومطلع علىٰ جميع ما كان وما يكون، وأن روحه الشريفة متصرفة في الناس بالنفع والضرر، وأن امامهم الشيخ أحمد رضا خان البريلوي نشر فتوى التكفير ضد علماء ديوبند، حتى قال: من لم يكفرهم فهو كافر. وذٰلك لأنهم نقدوا هٰذه العقائد، وقالوا: ان علم الغيب صفة الله سبحانه وتعالىٰ لا يشاركه أحد فيها، ولٰكنه سبحانه وتعالىٰ يطلع رسله علىٰ ما يشاء من أنباء الغيب. ومن أعمالهم المبتدعة أنهم يحتفلون بأعياد لم تثبت من القرآن والسنّة، ومع ذٰلك يعتقدونها مستحبة، بل قد يعاملونها معاملة الواجبات من النكير الشديد علىٰ من لا يشاركهم فيها، وكذٰلك اخترعوا تقاليد عند موت أحد، مثل أن يقوم أهل الميّت بدعوة الناس في اليوم الثالث والعاشر والأربعين بعد وفاة مورثهم، وأن يصنع لهم طعاما ومن لم يفعل ذٰلك، فانه يلام أشد الملامة، وما الىٰ ذٰلك من البدعات الكثيرة.

والحديث عن هٰذه الطريقة يطول، ولٰكن ما ذكرته هو تصور جملي عن عقائدهم وأعمالهم، ويوجد فيهم من يفرط فيها ويلغو ويتعصب، ومن هو معتدل بالنسبة للآخرين.

والله سبحانه أعلم

محمد تقي العثماني عفي عنه

١٤٢٦/١/٥هـ

غلام احمد پرویز کے پیروکار کا حکم

سوال:- استفتاء از علمائے شریعتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم اس مسئلے میں کہ مشہور منکرِ حدیث غلام احمد پرویز جس کو جمہور علمائے اُمت نے کافر قرار دیا ہے، اس کا ایک پیروکار، ہم عقیدہ، ہم مسلک بلکہ مسلکِ پرویز کا مبلغ مرگیا ہے، جبکہ جمہور علمائے اُمت نے پرویز کے متبعین کو بھی خارج از اسلام قرار دیا ہے۔ اس پرویزی پر اہلِ سنت والجماعت مسلمانوں کے ایک پیش امام نے نمازِ جنازہ پڑھائی، امامِ مذکور کا کیا حکم ہے؟ غلام احمد پرویز کا کیا حکم ہے؟ اور کس بناء پر اس پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا ہے؟ اور کیا اس امام کی اقتداء دُرست ہے؟

جواب:- غلام احمد پرویز پر کفر کا فتویٰ ان کے عقائد ونظریات کی بنیاد پر لگایا گیا ہے[1]، لہٰذا جو شخص ان کے عقائد ونظریات سے متفق ہو، وہ بھی انہی کے حکم میں ہے۔ اور کافر ہونے کی بناء پر اس

(۱) تفصیل کے لئے رسالہ ''علمائے اُمت کا متفقہ فتویٰ پرویز کافر ہے'' ملاحظہ فرمائیں۔

پر نمازِ جنازہ پڑھنا جائز نہیں، اگر کسی امام صاحب نے غلط فہمی یا ناواقفیت کی وجہ سے اس کی نمازِ جنازہ پڑھائی ہے تو انہیں چاہئے کہ وہ اِستغفار کریں۔ ایسی صورت میں دُوسرے مسلمان اپنی عام نمازوں میں ان کی اقتداء کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر وہ میّت کو پرویزی تسلیم کرنے کے باوجود اس عمل کی صحت پر اصرار کرتے ہیں تو ان کے پیچھے نماز پڑھنا دُرست نہیں۔

فقط واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۳۰ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۶۳/۱۸ الف)

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

فکرِ ولی اللّٰہی تحریک کا حکم

بعد از سلام عرض ہے کہ ہم خیریت سے ہیں، اور خداوند کریم سے آپ کی خیریت نیک مطلوب چاہتے ہیں۔

بعد از سلام عرض ہے کہ میں نے ایک عرض نامہ پہلے بھی بھیجا ہے، لیکن اس خط کا جواب ابھی تک نہیں ملا۔ عرض یہ ہے کہ ہم تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہیں کہ اس فتویٰ کی حقیقت کیا ہے جو اس خط کے نیچے ہے، اور ہم نے مولانا شیخ الحدیث معزالحق کو عریضہ لکھا، انہوں نے یہ باتیں ہمیں لکھ کر دی ہیں۔ ہم نے یہاں کے مفتی رشید احمد صاحب کو کہا، انہوں نے کہا کہ علمائے کرام مشاورت عظمیٰ اور مفتیان صاحبان کے مشورے کے بعد بتائیں گے۔ یہ پُوچھنا چاہتے ہیں کہ چونکہ اس تنظیم کا گڑھ ہمارے نوشہرہ میں مسجد درزیاں ہے اور اس کا امام بھی یہاں مقرّر ہوگیا ہے، ہمیں بتائیں کہ ان کے پیچھے نماز ہوتی ہے یا نہیں؟ اور یہ کیسے لوگ ہیں؟ اور ان سے کیسا برتاؤ کرنا چاہئے؟

شکریہ

اہل مسجد درزیاں

مزاجِ گرامی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عرض یہ ہے کہ گزشتہ زمانے میں ہمارے مدرسے میں ایک عالم مسمّٰی مولوی خالد محمود، جو اپنے آپ کو تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی کی طرف منسوب کرتا ہے، شاہ ولی اللہؒ کا ترجمان بتلاتا ہے، حسبِ ذیل نوعیت کی باتیں کرتا رہتا ہے:-

۱:- مقصودِ اصلی قیامِ خلافت ہے، جب تک خلافت کا قیام نہ ہو اس وقت تک ایمان، اعمال، عبادات سب کچھ بیکار ہیں۔

۲:- مقصودِ اصلی اتباعِ رسالت میں مقصدِ بعثت خصوصاً "هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ وَلَوْ کَرِهَ الْمُشْرِکُوْنَ" کے بموجب سپر پاورز کے خاتمے کو سمجھنا ہے۔ باقی انفرادی عادات واطوار، وضع قطع، نشست و برخاست میں اتباعِ رسالت بے کار ہے، اس کا چنداں فائدہ نہیں۔

۳:- اعمال، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ سے مقصود ہمہ جہتی تربیت فرد و معاشرہ ہے، لیکن زیادہ زور اجتماعی، سیاسی اور حکومتی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کی تربیت پر ہے۔ اگر ان اعمال کا صرف رُوحانی حلقۂ اثر تسلیم کیا جائے تو باقی مذاہب کی عبادات سے اسلامی عبادات کا تفوّق کیسے ثابت کیا جائے؟ کیونکہ رُوحانی اثرات تو یوگ (Mysticism) اور تصوّف و احسان وسلوک کے ایک جیسے ہیں۔

۴:- جزاء وسزا کا یہ تصوّر صرف متوسط اذہان کے لئے قابلِ قبول ہے، اعلیٰ اذہان کے لئے قابلِ فہم اور لائقِ قبول نہیں۔

۵:- قرآن، مولویوں کے سلوک کے نتیجے میں بازیچۂ اطفال بن گیا ہے، ماسوائے تعلیم الفاظ ومعانی، آگے کوئی تعلیم وتربیت نہیں، ذہن سازی نہیں۔ جب نظامِ قرآنی نہ ہو تو صرف الفاظ کے رٹنے کا کیا فائدہ؟ چنانچہ حفظِ قرآن ضیاعِ وقت ہے۔

۶:- علمائے عصر چونکہ عصرِ حاضر کے تقاضوں سے ناواقف ہیں، لہٰذا بقول امام محمدؒ (من لم یعرف أحوال زمانه فهو جاهل) جاہل ہیں۔ مدارس کے اندر تو ان کا حلقۂ اثر وارادت بڑا وسیع ہے، لیکن مدرسہ سے باہر بینک کے چوکیدار اور بس کے ایک معمولی سے ڈرائیور پر بھی ان کا بس نہیں چلتا۔ چنانچہ ان علماء کا معاشرے میں کوئی قابلِ قدر کردار نہیں، یہ علماء معاشرے کا عضوِ معطل ہیں۔

۷:- جنت کا عام ومعروف تصوّر کم فہمی کا نتیجہ ہے، اصل میں جنت دُنیا کا مستقبل ہے، دُنیا اس کی اساس ہے۔ چنانچہ جس پودے کا بیج کمزور ہو وہ پودا طاقت ور نہیں بن سکتا، جو دُنیا میں دُکھ درد، تکالیف ومصائب اور غربت وکسمپرسی میں گھرا ہوا ہو وہ آخرت میں کامیاب وخوشحال کیسے کہلا سکتا ہے؟

۸:- جنت سے متعلق عام احادیث محض خوش فہمی ہیں، جب بندہ کچھ نہ کر سکے تو پھر لازماً اسے جنت کا انتظار کرنا ہی پڑے گا۔ ''کافر کو ملے حور وقصور اور مؤمن کو فقط وعدۂ حور''۔

۹:- امام مہدی کا تصوّر وعقیدہ بھی محض مردہ قوموں کا تخیل ہے۔

۱۰:- یاجوج وماجوج چینی اور رُوسی عوام ہیں، ان سے متعلق معروف تصوّر ٹھیک نہیں۔

۱۱:- داڑھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک بشری عادت ہی تو تھی، اتنی اہمیت کیوں دی جاتی ہے؟

۱۲:- علمائے عصر کی پاکستانی تنظیمیں امریکی مفادات کے تحفظ کے لئے استعمال ہو رہی ہیں۔

۱۳:- تبلیغی جماعت کی محنت کے نتیجے میں جو اسلام دُنیا میں آئے گا، اس پر چھاپ امریکی اور یورپی ہوگی، اور یوں مغربی دُنیا اس کا سہارا لے کر اپنے معاشی، سیاسی، سامراجی اہداف حاصل کرے گی۔

۱۴:- جہادِ افغانستان میں امریکہ نے غریب اور سادہ لوح مولویوں کو جہاد کا پُرفریب اور خوش کن جھانسہ دے کر اسلام کو اپنے مفادات کے لئے استعمال کیا ہے۔

۱۵:- موجودہ اسلامی تصوّر امریکی خواہش کے زیرِ اثر پنپ چکا ہے، حالانکہ اگر مسلمان رُوس کا ساتھ دیتے تو رُوس ان کے لئے نسبتاً زیادہ دور رہتا، لیکن مسلمان ہمیشہ جذباتی رہا، مسلم جماعتوں کا جھکاؤ امریکہ کی جانب ہی رہا۔

۱۶:- تقدیر کا موجودہ اور معروف تصوّر بھی غلط ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسے پُرانی و سابقہ حالت پر رکھے چھوڑا، کیونکہ ابتدائی اسلامیوں (صحابہؓ) میں اسے سمجھنے کی استعداد نہ تھی، لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسئلے کو نہ چھیڑ کر عمل کی طاقت کی بناء پر انقلاب کی راہیں ہموار کیں۔

۱۷:- تھانوی لائن کے علماء ہمیشہ حکومتی خواہشات کے لئے استعمال ہوتے رہے، نتیجتاً انہیں سرکار کی جانب سے نوازا جاتا رہا، اور مدنی لائن کے علماء کو اپنے حریت پسند جذبات کی بناء پر ہمیشہ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔

۱۸:- "اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا" (الآیۃ) اور "من الذنوب ذنوب لا یکفرھا الا الھم فی المعیشۃ" (الحدیث) جیسے استدلالات سے عموماً یہ باور کرایا جاتا ہے کہ جب تک معاشی مساوات نہ ہو معاشرے کی اصلاح نہیں ہوسکتی، قبض و بسط کی تشریح بھی مختلف انداز سے کرتا ہے۔

۱۹:- ذاتی ملکیت کا ایک حد تک جواز ہے، لیکن انقلاب کی راہیں ہموار کرتے وقت ذاتی ملکیت ثابت نہیں ہوسکتی، کیونکہ ابتداءً حضرت عثمانؓ اور عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا مال و اسباب اپنی ذات سے زیادہ راہِ انقلاب میں خرچ ہوتا رہا۔

۲۰:- خمینی انقلاب اُمتِ مسلمہ کے لئے خوش آئند ہے۔

۲۱:- طالبانِ افغانستان سادہ لوح لوگ ہیں، یہ حکومتی مزاج سے ناواقف ہیں، حکومت چلانا ان کے بس کی بات نہیں۔ مسائلِ حاضرہ اور موجودہ تعلیم سے یہ ناواقف ہیں۔ فرمایئے ان عقائد کی حامل "تحریکِ فکرِ ولی اللّٰہی" کا کیا حکم ہے؟

جواب:- فکرِ ولی اللّٰہی محض ایک دھوکا ہے، عام طور سے یہ لوگ حضرت شاہ صاحبؒ کے

نام کی آڑ میں اشتراکی نظریات کا پرچار کر رہے ہیں۔

واللہ اعلم
۱۴۱۹/۳/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۳۱۹/۲۵)

''گروپ آف لبرل مسلمز تحریک'' کے قیام پر حضرتِ والا دامت برکاتہم کی رائے

سوال:- السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دُعائے صحت، درازیٔ عمر اور بلندیٔ ایمان کے ساتھ جنابِ والا کی خدمتِ عالیہ میں مؤدبانہ عرض ہے کہ قیامِ وطنِ عزیز کے مقاصد کی تکمیل باون سالوں میں بھی نہ ہونے کا اصل سبب ہماری تعلیماتِ قرآنِ کریم سے عدم توجہی، غفلت اور کوتاہی ہے۔ اگرچہ ہر سابق حکومت نے اسلام کے نام پر قوم کو فریب دیا، لیکن قرآنی تعلیمات سے ناآشنائی اور عدم توجہی ہمارے مذہبی راہنماؤں کی کوتاہی اور غفلت بھی ہے، جو بنیادی حقیقت ہے، یہی ہماری باہمی نفرتوں اور اختلافات کا اصل سبب بھی ہے۔ الحمدللہ نوجوان نسل میں پیار اور اُنسیت اُجاگر کرنے، نفرتوں کو مٹانے، نیز وحدتِ اسلامی کے نیک مقاصد کی تکمیل کے لئے ''گروپ آف لبرل مسلمز'' کا قیام وجود میں آیا ہے۔

ہمارا مقصد سوائے اصلاح کے کچھ نہیں، ایک معتدل معاشرہ اور اُخوتِ اسلامی کو اُجاگر کرنے اور فہمِ قرآنِ کریم نوجوان نسل خاص کر حفاظ مسلمان بنات اور شبان کو معانیٔ قرآنِ کریم سیکھنے کی دعوت اور اس پر عمل کی ترغیب ہمارا مقصد ہے، کیونکہ ذہنی انقلاب اور اسلامی تعلیمات سے آگاہی کے بغیر نفاذِ اسلام کی عملی صورت نظر نہیں آتی۔ مشن کی کامیابی کے لئے دُعا کی درخواست ہے۔ عقیدت و احترام کے ساتھ! جواب کا انتظار رہے گا۔

جواب:- جس مقصد کے لئے آپ نے یہ تنظیم قائم کی ہے، وہ بڑا مبارک ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی رضا کے مطابق ملک وملت کی خدمت کی توفیق عطا فرمائیں، آمین۔

البتہ ایک گزارش یہ ہے کہ آپ نے اپنے نام میں ''لبرل'' (Liberal) کا جو اضافہ کیا ہے، اس کے بارے میں یہ طے کرلینا چاہئے کہ اس کا کیا مقصد ہے؟ اور کن لوگوں کو اس لفظ کے ذریعہ Exclude (خارج) کرنا مقصود ہے، اس سوال کا صحیح جواب متعین کرنے سے پہلے یورپ کے لبرلزم کی تاریخ کا مطالعہ بھی مفید ہوگا کہ اس لبرلزم کی تحریک وجود میں آنے کے کیا اسباب تھے؟ کیا وہ اسباب ہمارے یہاں موجود ہیں؟ دُوسرے اس لبرلزم کے کیا نتائج نکلے؟ اور کیا وہ نتائج ہمیں بھی مطلوب ہیں؟

اُمید ہے کہ ان سوالات پر معروضی مطالعے کے ذریعہ غور وفکر فرمائیں گے۔ والسلام

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
از طیارہ براہ لاہور
۱۴۲۰/۱۱/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۲۹/۴۰۰)

(یہ جواب طیارے سے لکھ رہا ہوں، اس لئے الگ کاغذ پر نہیں لکھ سکا، معذرت خواہ ہوں)

روافض کو علی الاطلاق کافر نہ قرار دینے کی وجہ

سوال:- مسئلہ یہ ہے کہ ''بینات'' والوں نے دو نمبر روافض کے بارے میں شائع کئے ہیں، ٹائٹل پر لکھا ہے کہ ''علماء کا متفقہ فیصلہ یعنی شیعہ کافر ہے''۔ اس میں ہند و پاک کے بڑے بڑے علماء کے دستخط موجود ہیں۔ آپ کے دستخط نظر سے نہیں گزرے، اور ہمارے ایک دوست کا کہنا یہ ہے کہ مولانا محمد رفیع صاحب کو شیعہ روافض کی تکفیر کے بارے میں تردّد ہے۔ برائے مہربانی آپ اپنی رائے کا اظہار فرمائیں کہ کیا واقع ایسا ہے کہ آپ شیعوں کو کافر نہیں سمجھتے؟

فقط والسلام
آپ کا مخلص

احقر حافظ مشتاق احمد

جواب:- جو شیعہ کفریہ عقائد رکھتے ہوں، مثلاً قرآنِ کریم میں تحریف کے قائل ہوں یا یہ عقیدہ رکھتے ہوں کہ حضرت جبریل علیہ السلام سے وحی لانے میں غلطی ہوئی، یا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگاتے ہوں، ان کے کفر میں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن یہ بات کہ تمام شیعہ یہ یا اس قسم کے کافرانہ عقائد رکھتے ہیں، تحقیق سے ثابت نہیں ہوئی۔ اور کئی شیعہ یہ کہتے ہیں کہ الکافی یا اُصول الکافی وغیرہ میں جتنی باتیں لکھی ہیں، ہم ان سب کو دُرست نہیں سمجھتے۔ دُوسری طرف کسی کو کافر قرار دینا چونکہ نہایت سنگین معاملہ ہے، اس لئے اس میں بے حد احتیاط ضروری ہے۔ اگر بالفرض کوئی تقیہ بھی کرے تو وہ اپنے باطنی عقائد کی وجہ سے عنداللہ کافر ہوگا، لیکن فتویٰ اس کے ظاہری اقوال پر ہی دیا جائے گا۔ اسی لئے چودہ سو سال میں علمائے اہلِ سنت کی اکثریت شیعوں کو علی الاطلاق کافر کہنے کے بجائے یہ کہتی آئی ہے کہ جو شیعہ ایسے کافرانہ عقائد رکھے، کافر ہے۔ اور یہی طریقہ بیشتر اکابر علمائے دیوبند کا رہا ہے، اور چونکہ جمہور علماء کے اس طریقے میں کوئی تبدیلی لانے کے لئے کافی دلائل محقق نہیں ہوئے، اس لئے دارالعلوم کراچی، حضرت مفتیٔ اعظم مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ کے وقت سے اکابر کے اسی طریقے کے مطابق فتویٰ دیتا آیا ہے کہ جو شیعہ ان کافرانہ عقائد کا قائل ہو، وہ کافر ہے، مگر علی الاطلاق ہر شیعہ کو خواہ اس کے عقائد کیسے بھی ہوں، کافر قرار دینے سے جمہور علمائے اُمت کے مسلک کے مطابق

احتیاط کی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ شیعوں کی گمراہی میں کوئی شبہ ہے، جن شیعوں کو کافر قرار دینے سے احتیاط کی گئی ہے، بلاشبہ وہ بھی سخت ضلالت اور گمراہی میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان گمراہیوں سے ہر مسلمان کی حفاظت فرمائیں، آمین۔ والسلام

۱۴۱۲/۱/۱۴ھ

سرسیّد احمد خان کے نظریات اور تبلیغی جماعت کے بارے میں حکم

سوال:- زید اکثر دوستوں یا عام مجالس میں سرسیّد کی تعریف کرتا ہے، اور یہ کہتا ہے کہ سرسیّد نے قوم کو بیدار کیا، مسلمانوں کو آزادی ان کی تعلیمات ہی کی بناء پر ہوئی۔ بکر کہتا ہے کہ شعور اور بیداری مسلمانوں کو قرآن و سنتِ نبوی ہی سے ہوسکتی ہے، اور آزادی کی خالص وجہ علمائے حق کی قربانیاں ہیں۔ نیز بکر یہ بھی کہتا ہے کہ سرسیّد نے فرشتوں اور جنات کے وجود کا انکار کیا ہے، اور یہ فعل صریح کفر ہے، سرسیّد کے بجائے علمائے حق کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

مسلمانوں کا زوال اور پستی انگریزی تعلیم سے محروم رہنا ہے، وہ یہ بھی کہتا ہے۔ مگر بکر اس کا قائل نہیں، زوال کی وجہ حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل نہ کرنا ہے۔

نیز زید تبلیغی جماعت کو نہایت سست کہتا ہے، اور کہتا ہے کہ ان کا طریقہ سنت کے خلاف ہے، جبکہ بکر کہتا ہے کہ تبلیغی جماعت صحیح راستے پر گامزن ہے، ان کا ہر قول و فعل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں کے مطابق ہے، یہی وجہ ہے کہ کثرت سے غیر مسلم مشرف بہ اسلام ہوئے ہیں۔ نیز زید ظاہری شکل و صورت کا بھی بالکل قائل نہیں، مسلم داڑھی اور لباس وغیرہ فراڈ ہے، لازمی نہیں۔ آپ ہم کثیر پاکستانیوں کی رہنمائی فرمائیں۔ طالب الحق، ریاض، سعودی عرب

جواب:- بکر کی باتیں دُرست ہیں، سرسیّد احمد خان صاحب کے دینی نظریات جو انہوں نے اپنی تفسیر میں بیان کئے ہیں، انتہائی گمراہانہ ہیں[1]، اور تبلیغی جماعت ماشاء اللہ اچھی دینی خدمت انجام دے رہی ہے۔ اس کے افراد کے کسی عمل یا کام پر تنقید کی جاسکتی ہے، لیکن بحیثیت مجموعی جماعت کو بُرا بھلا کہنا بہت بُرا کام ہے۔[2] واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۱/۱۰/۲۸ھ

(فتویٰ نمبر ۱۶۳۷/۳۲ ج)

---

(۱) سرسیّد اور ان کے نظریات سے متعلق تفصیلی حکم کے لئے امداد الفتاویٰ ج:۶ ص:۱۶۶ تا ۱۸۵ ملاحظہ فرمائیں۔
(۲) تبلیغی جماعت سے متعلق حضرت والا دامت برکاتہم کا تفصیلی فتویٰ اسی جلد کی "فصل في الدعوة والتبليغ" میں ملاحظہ فرمائیں۔
(محمد زبیر عفی عنہ)

﴿کتاب السُّنَّة والبدعة﴾

(سنت اور بدعت سے متعلق مسائل کا بیان)

فرض نماز کے بعد "اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ" پڑھنا

سوال:- اگر فرض نماز کے بعد "اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ .... الخ" والی آیت پڑھے تو شریعت میں کیا حکم ہے؟ اور کیا بدعت، حسنہ بھی ہوسکتی ہے؟

جواب:- آج کل جس طرح اس آیت کو پڑھنے کا التزام کیا جاتا ہے کہ اس کے تارک پر ایسی نکیر کی جاتی ہے جیسے فرائض کے تارک پر کی جاتی ہے، تو یہ بدعتِ سیئہ ہے، اور "بدعت" اصطلاحی معنوں میں صرف سیئہ ہی ہوتی ہے، حسنہ نہیں ہوتی، لقولہ علیہ السلام: "کل بدعة ضلالة"۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۶۵۴/۲۸ ب)

نیاز فاتحہ کا حکم

سوال:- اگر کسی نے کچھ پکا کر نیاز فاتحہ دیا تو کیا جب تک نیاز فاتحہ نہ دیا جائے، تقسیم کرنا ممکن نہیں؟

جواب:- نیاز فاتحہ کا مروّجہ طریقہ ہی شریعت کی رُو سے دُرست نہیں ہے۔ ہاں! اگر کسی بزرگ کی رُوح کو ایصالِ ثواب کرنا ہے تو کھانا پکا کر کسی کو صدقہ کردیا جائے، اور یہ دُعا کرلی جائے کہ اللہ تعالیٰ اس صدقے کا ثواب فلاں کو پہنچادے، یہ جائز ہے، اور اس نیت سے کرنے کے لئے نیاز فاتحہ کی ضرورت نہیں ہے۔

واللہ اعلم
۱۳۸۸/۵/۲ھ

(۱) رواہ أحمد وأبوداوٗد والترمذی وابن ماجة، راجع الی مشکوٰة المصابیح باب الاعتصام بالکتاب والسُّنة ج:۱ ص:۳۰ (طبع قدیمی کتب خانہ) وفی مرعاة المفاتیح لابی الحسن المبارکفوری الهندی ج:۱ ص:۲۶۴ (طبع بنارس هند) والمراد بالبدعة ما أحدث فی الدین ما لا أصل له فی الشریعة یدل علیه واما ما کان له أصل من الشرع یدل علیه فلیس ببدعة شرعًا وان کان بدعة لغة واما ما وقع فی کلام السلف من استحسان بعض البدع فانما ذٰلک فی البدع اللغویة لا الشرعیة .... فالبدع الشرعیة کلها مذمومة لأنها موجبة للضلال والغوایة. وفی التعلیق الصبیح علیٰ مشکوٰة المصابیح للشیخ محمد ادریس الکاندهلوی ج:۱ ص:۸۸ (طبع دار احیاء التراث العربی بیروت) فالبدعة فی عرف الشرع مذمومة بخلاف اللغة فان کل شئ أحدث علیٰ غیر مثال یسمّی بدعة سواء کان محمودًا أو مذمومًا .... الخ. نیز دیکھئے فتاویٰ رشیدیہ ص:۱۳۷ (طبع ادارہ اسلامیات)۔ (محمد زبیر حق نواز)

کسی بزرگ کے مزار پر اجتماعی قرآن خوانی کرنا

سوال:- کسی بزرگ کے مزار شریف پر اجتماعی حیثیت سے بہ نیتِ ایصالِ ثواب قرآن خوانی کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

جواب:- ایصالِ ثواب جائز ہے اور وہ ہر جگہ، ہر وقت ہوسکتا ہے، مگر کسی کی قبر پر اجتماعی طور سے قرآن خوانی کر کے ایصالِ ثواب کرنے کا صحابہ کرامؓ سے کوئی ثبوت نہیں ہے، لہٰذا اس طریقے سے اجتناب بہتر ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۱۳۸۸/۲/۲ھ

ختمِ قرآن کے موقع پر مسجد میں چراغاں کرنا اور مٹھائی تقسیم کرنا

سوال:- ماہِ رمضان میں ختمِ قرآن پر مسجد کو سجانا، روشنی کرنا اور قراءت کا مقابلہ وغیرہ کرنے کے بعد مٹھائی تقسیم کرنا جائز ہے یا ناجائز؟

جواب:- مسجد میں چراغاں کرنا اسراف ہے، اور کسی حال جائز نہیں[1]، قراءت کا مقابلہ اگر بچوں میں قرآنِ کریم کی ترغیب کی غرض سے ہو تو اس کی گنجائش ہے، لیکن آج کل اس طرح نام و نمود اور تفاخر کی غرض سے جو مقابلے منعقد کئے جاتے ہیں، ان سے احتراز لازم ہے۔ جہاں تک مٹھائی تقسیم کرنے کا تعلق ہے، اس کا مسئلہ یہ ہے کہ مسجد کی رقم سے مٹھائی تقسیم کرنا جائز نہیں، ہاں! اگر کوئی شخص اپنی خوشی سے مٹھائی تقسیم کرے اور اسے مسنون اور لازم بھی نہ سمجھے تو اس کی گنجائش ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۱/۱۱/۲۵ھ

(فتویٰ نمبر ۳۲/۱۶۰۰ ج)

سفر کر کے بزرگ کے مزار کی زیارت کرنا

سوال:- زید کبھی کبھار اسّی نوّے میل سفر کر کے کسی بزرگ کی قبر پر چلا جاتا ہے، خیال یہ ہوتا ہے کہ اس مقام پر اللہ تعالیٰ دُعا قبول فرماتے ہیں، اس مقبرے پر بعض مشرکانہ افعال بھی کئے جاتے

---

(۱) وقال العلامة الشاطبیؒ فی الاعتصام ج:۲ ص:۲۷۳ (طبع دار المعرفة بیروت) ان النار لیس ایقادها فی المساجد من شأن السلف الصالح ولا کانت مما تزین بها المساجد ألبتة، ثم أحدث التزین بها حتی صارت من جملة ما یعظم به رمضان واعتقد العامة هذا، .... وبعد اسطر .... ومثله ایقاد الشمع بعرفة لیلة الثامن ذکر النوویؒ انها من البدع القبیحة وانها ضلالة فاحشة جمع فیها أنواع من القبائح، منها اضاعة المال فی غیر وجهه، ومنها اظهار شعائر المجوس .... وقد ذکر الطرطوسیؒ فی ایقاد المساجد فی رمضان بعض هذه الأمور، وذکر أیضا فی قبائح سواها. (مرتب عفی عنہ)

ہیں، کیا اس طرح جانا جائز ہے؟

جواب:- اگر زید شرک و بدعات کے مسائل سے اچھی طرح واقف ہو، اور اسے اعتماد ہو کہ وہاں شرک و بدعات میں مبتلا نہیں ہوگا، تو اس کے لئے جانا جائز ہوگا ورنہ نہیں۔

قال ابن حجر في فتاويه: ولا تترک (أي الزيارة) لما يحصل عندها من منكرات ومفاسد .... لأن القربات لا تترک لمثل ذلک بل على الانسان فعلها وانكار البدع بل وازالتها ان أمكن. اهـ (شامی ج:۱ ص:۸۴۳)۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۸۷/۱۰/۲۰ھ[2]

فرض نماز اور عیدین کے بعد مصافحہ ومعانقہ کا حکم

سوال:- عموماً عیدین (عید الفطر وعید الاضحیٰ) کی نماز کے بعد نمازی مسجد کے اندر ہی خطبے اور دُعا کے بعد ایک دُوسرے کو عید مبارکباد کہتے ہوئے مصافحہ اور معانقہ کرتے ہیں۔ کچھ لوگ اس کو ضروری سمجھتے ہیں، کچھ رسم پوری کرنے کی غرض سے، اور کچھ سنت کی غرض سے مصافحہ اور معانقہ کرتے ہیں۔ نمازیوں میں کچھ حضرات بزرگ ہوتے ہیں، ان کے متعلق اللہ والا ہونے کا حسنِ ظن لوگ رکھتے ہیں کہ ان کے ساتھ ایسا کرنے سے فیض حاصل ہوگا اور نیکیوں پر مدد ملے گی، وہ نہ اس کو رسم سمجھ کر کرتے ہیں اور نہ ضروری سمجھ کر بلکہ نیک لوگوں کی عقیدت سے معانقہ کرتے ہیں، آیا یہ فعل سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم، آثارِ صحابہؓ یا فتاویٰ ائمۂ اربعہ سے ثابت ہے یا نہیں؟

جواب:- دو مسلمانوں کی ملاقات کے وقت مصافحہ مسنون ہے، نیز کوئی شخص سفر سے آئے تو اس سے معانقہ کرنا بھی سنت سے ثابت ہے، ان دونوں مواقع کے علاوہ سنت نہیں، لیکن اگر سنت سمجھے بغیر اتفاقاً کبھی کرلے تو گناہ بھی نہیں، اور سنت سمجھ کر کرے تو بدعت ہے۔ ہمارے زمانے میں چونکہ فرض نمازوں کے بعد مصافحہ اور عیدین کے بعد معانقہ کو سنت سمجھا جانے لگا ہے حالانکہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں، اس لئے علماء نے اس کو بدعت قرار دیا ہے اور اس سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے، لیکن کہیں اعتقادِ سنت کی یہ علت نہ ہو تو مباح ہے۔

فی ردّ المحتار قد يقال: ان المواظبة عليها بعد الصلوات خاصة قد يؤدي الجهلة الى اعتقاد سنيتها في خصوص هذه المواضع، وان لها خصوصية زائدة على غيرها مع أن ظاهر كلامهم أنه لم يفعلها أحد من السلف في هذه المواضع .... ونقل في تبيين المحارم عن

(۱) شامی ج:۲ ص:۲۴۲ (طبع ایچ ایم سعید)۔
(۲) یہ فتویٰ ''البلاغ'' کے شمارہ ذیقعدہ ۱۳۸۷ھ سے لیا گیا ہے۔ (مرتب)

الملتقط أنه تکره المصافحة بعد اداء الصلوٰة .... ولأنها من سنن الروافض اهـ. ثم نقل عن ابن حجر عن الشافعية أنها بدعة مکروهة، لا أصل لها في الشرع،[1] وأنه ينبه فاعلها أوّلًا ويعزر ثانيًا .... الخ. (رد المحتار، باب الاستبراء وغيره من کتاب الحظر والاباحة، ومثله في عزيز الفتاویٰ)[2]۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۱/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۷۰/۲۸ الف)

نماز کے بعد یا مہمان سے ملاقات کے وقت مصافحہ کرنا

سوال ۱:- فرض نماز کے بعد خصوصاً اور عصر کی نماز کے بعد دُعا سے فارغ ہوکر مصافحہ کرنا، آپس میں ہاتھ ملانا اور امام صاحب کا مصلے پر کھڑے ہوکر ہاتھ ملانا لازمی ہے یا نہیں؟

۲:- اگر کوئی مہمان مسجد میں نماز کے بعد مصافحہ کرنا چاہے تو اس سے مصافحہ کرنا دُرست ہے یا نہیں؟

جواب ۱:- ہرگز لازم نہیں، بلکہ لازم یا ثواب وسنت سمجھ کر مصافحہ کرنا بدعت ہے، اور اس کا ترک واجب ہے۔[3]

۲:- مہمان سے پہلی ملاقات میں مصافحہ مسنون ہے،[4] اس نیت سے مصافحہ دُرست ہے۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۸/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۸۸۴/۲۸ ج)

میّت کے سرہانے بیٹھ کر یا قبرستان لے جاتے وقت کلمہ پڑھنا

سوال:- میت کی چارپائی کے پاس بیٹھ کر یا کھڑے ہوکر کلمۂ طیبہ بلند آواز سے پڑھنا یا میّت کو قبرستان کی طرف لے جاتے وقت کلمۂ طیبہ پڑھنا کیسا ہے؟

جواب:- دونوں حالتوں میں کلمۂ طیبہ پڑھنا دُرست ہے، مگر اس کو لازم اور ضروری نہ سمجھا

---

(۱) فتاوی شامية ج:۶ ص:۳۸۱. نیز دیکھئے امداد الفتاویٰ ج:۵ ص:۲۶۰، امداد الاحکام ج:۱ ص:۱۹۵۔

(۲) عزیز الفتاویٰ ص:۱۲۸۔

(۳) وفي الشامية ج:۶ ص:۳۸۱ (طبع سعيد) ونقل في تبيين المحارم عن الملتقط أنه تکره المصافحة بعد أداء الصلوٰة بکل حال لأن الصحابة رضي الله عنهم ما صافحوا بعد أداء الصلوٰة ولأنها من سنن الروافض (الى ان قال) فيزجر فاعله لما أتى به من خلاف السنة. نیز دیکھئے امداد الفتاویٰ ج:۵ ص:۲۶۰، عزیز الفتاویٰ ص:۱۲۸، امداد الاحکام ج:۱ ص:۱۹۵۔

(۴) وفي الشامية أيضًا وموضع المصافحة في الشرع انما هو عند لقاء المسلم لأخيه لا في ادبار الصلوٰة.

جائے، اور بلند آواز سے نہ پڑھا جائے۔[۱]

والله سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۲۴۸/۱۸ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

کفن پر کلمۂ طیبہ لکھنا

سوال:- کفن پر کلمۂ طیبہ لکھنا آپ کے خیال میں کیسا ہے؟

جواب:- جائز تو ہے، لیکن چونکہ صحابہ کرامؓ، سلف صالحینؒ سے منقول نہیں اس لئے نہ لکھنا ہی بہتر ہے۔[۲]

فقط واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۲۴۸/۱۸ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

جشنِ میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شرعی حیثیت

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین کہ ایک جمعہ، مسجد میں یہ اعلان کردیا جائے کہ فلاں تاریخ کو جلسہ جشنِ عید میلاد ہوگا، اور بعد میں ایک آدمی کے کہنے پر فلاں مولوی اس مسجد میں تقریر کرنے نہ آئے، کیونکہ وہ میرے ساتھ ناراض ہے، پھر چند آدمی اس کا ساتھ دے کر جلسہ ملتوی کردینے کا اعلان کردیں، باقی عوام کا خیال نہ رکھیں۔ شریعت کی رُو سے مسئلہ حل کرکے ارسال کریں، والسلام۔

جواب:- جشنِ عید میلا کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے،[۳] البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

(۱) فی الدرّ المختار ج:۲ ص:۲۳۳ کرہ فیھا رفع صوت بذکر أو قراءۃ فتح وفی الشامیۃ (قولہ کما کرہ) قیل تحریما وقیل تنزیھا کما فی البحر عن الغایۃ، وفیہ عنھا وینبغی لمن تبع الجنازۃ أن یطیل الصمت، وفیہ عن الظھیریۃ فان أراد أن یذکر اللہ تعالٰی یذکرہ فی نفسہ لقولہ تعالٰی: "اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ" أی الجاھرین بالدعاء، وعن ابراھیم أنہ کان یکرہ أن یقول الرجل وھو یمشی معھا: استغفروا لہ غفر اللہ لکم. قلت: واذا کان ھذا فی الدعاء والذکر فما ظنک بالغناء الحادث فی ھذا الزمان. وفی الفتاوی الخانیۃ علی ھامش الھندیۃ ج:۱ ص:۱۹۰ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ) ویکرہ رفع الصوت بالذکر فان أراد أن یذکر اللہ یذکرہ فی نفسہ وعن ابراھیم کانوا یکرھون أن یقول الرجل وھو یمشی معھا: استغفروا لہ غفر اللہ لکم .... الخ.

(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے عزیز الفتاویٰ ص:۹۹۔

(۳) وفی الابداع فی مضار الابتداع ص:۱۲۲ (طبع مکتبۃ علمیۃ مدینۃ المنورۃ) قیل أوّل من أحدثھا بالقاھرۃ الخلفاء الفاطمیون فی القرن الرابع فابتدعوا ستۃ موالد .... ثم اعیدت فی خلافۃ الحاکم بأمر اللہ فی سنۃ أربع وعشرین وخمسمائۃ بعد ما کاد الناس ینسونھا وأول من احدث المولد النبی بمدینۃ اربل الملک المظفر أبو سعید فی القرن السابع وقد استمر العمل بالموالد الی یومنا ھذا وتوسع الناس فیھا وابتدعوا بکل ما تھواہ أنفسھم ویوحیہ الیھم الشیطان.

جشن میلاد النبیؐ کی تاریخی وشرعی حیثیت سے متعلق مکمل تفصیلات کے لئے درج ذیل کتب ملاحظہ فرمائیں:............ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

کے ذکرِ مبارک اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کو سننے اور سنانے کے لئے کوئی مجلس کسی خاص دن یا تاریخ کی قید کے بغیر منعقد کی جائے تو دُرست ہے، بشرطیکہ اس کا مقصد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکرِ مبارک سے برکت حاصل کرنا اور سیرتِ طیبہ پر عمل کا جذبہ پیدا کرنا ہو، نام و نمود مقصود نہ ہو۔

صورتِ مسئولہ میں اگر محفل اسی غرض کے لئے منعقد کی گئی تھی تو ٹھیک تھی، لیکن اگر کسی مصلحت سے اسے ملتوی کردیا گیا تو اس میں بھی کوئی شرعی قباحت نہیں، مثلاً: یہ کہ کوئی عالم سیرت بیان کرنے کے لئے موجود نہ ہو یا کسی فتنے فساد کا اندیشہ ہو۔ ہاں! اگر کسی عذر کے بغیر جلسہ ملتوی کردیا گیا تو اس میں حاضرین کو خواہ مخواہ تکلیف پہنچانے کا گناہ ہوگا۔

واللہ اعلم

۱۴۰۰/۶/۱۳ھ

(فتویٰ نمبر ۶۳۶/۳۱ ج)

شادی کے موقع پر لوگوں کو سفید پگڑیاں دینا
ختنہ کے موقع پر لوگوں کو جمع کرنا

سوال ۱:- ہمارے ہاں شادی کے گھر سے جب لوگوں کو رُخصت کیا جاتا ہے تو سفید پگڑیاں عطا کی جاتی ہیں، یہ لوگ یہ پگڑیاں باندھ کر یا ہاتھ میں لے کر اپنے گھروں کو جاتے ہیں اور یہ ایک بڑی عزت کی بات سمجھی جاتی ہے، آیا یہ طریقہ جائز ہے یا رسم ہے؟

۲:- اور ختنے کے موقع پر لوگوں کو جمع کرنا سنت ہے یا بدعت؟

جواب ۱:- یہ رسم اگر سنت سمجھ کر کی جاتی ہے تو بدعت اور واجب الترک ہے، اور اگر سنت نہیں سمجھا جاتا لیکن اس کی ایسی پابندی کی جاتی ہے جیسے فرائض و واجبات کی، کی جاتی ہے، اور اگر نہ کرے تو اسے بُرا سمجھا جاتا ہے تب بھی یہ ناجائز ہے، اور اگر ان باتوں سے پرہیز کرتے ہوئے محض خوش دلی سے کسی دباؤ کے بغیر دیا جاتا ہے اور بدلے کی توقع بھی نہیں ہوتی تو جائز ہے۔

۲:- سنت سمجھ کر جمع کرنا یا اس کی سنتوں کی طرح پابندی کرنا اور نہ کرنے والے کو بُرا سمجھنا

(گزشتہ سے پیوستہ)......

۱:- فتاویٰ میلاد شریف — مجموعہ افاضات حضرت مولانا احمد علی سہارنپوری، حضرت گنگوہی، حضرت تھانوی رحمہم اللہ

۲:- فیصلہ ہفت مسئلہ — حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ

۳:- التحذیر من البدع — عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز رحمہ اللہ

۴:- الانصاف فیما قیل فی المولد — ابوبکر جابر الجزائری

۵:- جواہر الفقہ (ج:۱ ص:۲۰۵) — مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ

۶:- راہِ سنت (ص:۱۲۵) — حضرت مولانا سرفراز خان صاحب صفدر دامت برکاتہم

۷:- تاریخ میلاد — حکیم مولانا عبدالشکور صاحب مرزاپوری

(محمد زبیر حق نواز)

بدعت اور واجب الترک ہے۔[1]

والله سبحانہ اعلم
۱۸/۱/۱۴۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۵۸/۷۴۲)

نماز کے بعد مصافحہ کرنے کا حکم

سوال:- نماز کے بعد لوگ جو مصافحہ کرتے ہیں، یہ جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- نماز کے بعد مصافحہ کو جس طرح لازم اور نماز کا جزء سمجھ لیا گیا ہے، وہ بدعت اور واجب الترک ہے۔[2] ہاں! کسی آدمی سے اسی وقت ملاقات ہوئی تو ملاقات کے مصافحہ کی نیت سے مصافحہ کرلیں،[3] نماز کے بعد کی نیت سے نہیں۔

والله سبحانہ اعلم
۱/۱۰/۱۳۹۹ھ
(فتویٰ نمبر ۳۰/۱۲۸۰)

بزرگ یا پیر کی نیاز اور میّت کی مختلف رُسومات کا حکم

سوال ۱:- اکثر لوگ کہتے ہیں کہ آج فلاں پیر یا بزرگ کی نیاز ہے، اس کا کیا مطلب ہے؟ اور یہ جائز ہے یا نہیں؟

۲:- میّت اور اس سے متعلق مختلف رُسومات ہمارے یہاں رائج ہیں، اس سلسلے میں شرعی اَحکام کیا ہیں؟

جواب ۱:- آج کل نیاز کے نام سے جو رسمیں رائج ہیں، قرآن وسنت اور شریعتِ مطہرہ میں ان کا کوئی ثبوت نہیں، ان بدعات کو ترک کرنا واجب ہے،[4] البتہ کسی بزرگ کے ایصالِ ثواب کا طریقہ یہ ہے کہ جتنی توفیق ہو نقد روپیہ یا کھانا، کپڑا صدقہ کرکے اس کا ثواب خاموشی سے ان بزرگ کو پہنچادیا جائے، اس غرض کے لئے یہ دعوتیں اور اجتماعات کرنا شرعاً ناجائز اور بدعت ہے۔

---

(۱) وفی مسند أحمد ج:۴ ص:۲۱۷ (طبع مؤسسة قرطبة مصر) عن الحسن قال: دعی عثمان بن أبی العاص الی ختان فأبی أن یجیب، فقیل له فقال: انا کنا لا نأتی الختان علی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم ولا ندعی له. وکذا فی المعجم الکبیر للطبرانی رحمه الله، رقم الحدیث: ۸۳۸۲ ج:۹ ص:۵۷ (طبع مکتبة العلوم، موصل). نیز دیکھئے: امداد المفتین ص:۲۰۱

(۲) وفی الشامیة ج:۶ ص:۳۸۱ (طبع سعید): ونقل فی تبیین المحارم عن الملتقط أنه تکره المصافحة بعد أداء الصلٰوة بکل حال، لأن الصحابة رضی الله عنهم ما صافحوا بعد أداء الصلٰوة ولأنها من سنن الروافض (الٰی أن قال) ویزجر فاعله لما أتی به من خلاف السّنة. تفصیل کے لئے امداد الفتاویٰ ص:۲۶۰، عزیز الفتاویٰ ص:۱۲۸، امداد الاحکام ج:۱ ص:۱۹۵ دیکھئے۔

(۳) وفی الشامیة ج:۶ ص:۳۸۱ (طبع سعید) وموضع المصافحة فی الشرع انما هو عند لقاء المسلم لأخیه لا فی ادبار الصلوات.

(۴) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۴۳۹ (طبع سعید) واعلم أن النذر یقع للأموات ومن أکثر العوام وما یؤخذ من الدراهم والشمع والزیت ونحوها الی ضرائح الأولیاء الکرام تقربًا الیهم فهو بالاجماع باطل و حرام ما لم یقصدوا صرفها للفقراء الأنام وقد ابتلی الناس بذلک وکذا فی البحر الرائق ج:۳ ص:۲۹۸ (طبع سعید) (محمد زبیر حق نواز)

۲:- بہشتی زیور اور بہشتی گوہر میں جنازے اور میت کے احکام تفصیل سے موجود ہیں، اس کا مطالعہ فرمائیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۰/۱۲/۱۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۵۶/۳۸ ہ)

عرس اور برسی کی شرعی حیثیت

سوال:- عرس و برسی کی شریعت میں کیا حیثیت ہے؟

جواب:- عرس اور برسی کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے، یہ سب انسانوں کی ایجادکردہ بدعات ہیں جن سے پرہیز لازم ہے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۱/۱۱/۱۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۷/۱۲ /۳۲ ج)

نمازِ جنازہ کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگنا

سوال:- حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی بھی صحابی کی نمازِ جنازہ پڑھنے کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگی یا نہیں؟ نمازِ جنازہ کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگنا کیسا ہے؟

جواب:- نمازِ جنازہ کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگنا نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، نہ دُوسرے صحابہ کرامؓ سے۔ لہٰذا آج کل جو رواج چل پڑا ہے اور اس طرح ضروری سمجھتے اور اس کے ترک پر نکیر کرتے ہیں، وہ بدعت اور واجب الترک ہے۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۹۵۷/۲۸ ج)

---

(۱) فی التفسیر المظهری سورة ال عمران ج:۲ ص:۶۵ (طبع بلوچستان بک دپو) لا یجوز ما یفعله الجهال بقبور الأولياء والشهداء من السجود والطواف حولها، واتخاذ السرج والمساجد عليها، ومن الاجتماع بعد الحول كالأعياد، ويسمونه "عرسا". نیز دیکھئے: فتاویٰ رشیدیہ ص:۱۲۵، ۱۲۸۔

(۲) وفی مرقاة المفاتيح شرح مشكوة ج:۴ ص:۲۴ (طبع مکتبہ امدادیہ ملتان) ولا يدعو للميّت بعد صلوة الجنازة، لأنه يشبه الزيادة في صلوة الجنازة. وفي البزازية (على الهندية ج:۴ ص:۸۰) لا يقوم بالدعاء بعد صلوة الجنائز، لأنه دعا مرة لأن أكثرها دعاء. وفي خلاصة الفتاوى ج:۱ ص:۲۲۵ (طبع امجد اکیدمی لاهور) ولا يقوم بالدعاء ففي قراءة القرآن لأجل الميّت بعد صلوة الجنازة وقبلها، وفي البحر الرائق ج:۲ ص:۱۸۳ (طبع سعید): لا يدعو بعد التسليم. وفي فتاوى السراجية على قاضي خان ج:۱ ص:۱۴۵: اذا فرغ من الصلوة لا يقوم داعيا له. وفي جامع الرموز فصل في الجنائز ج:۱ ص:۲۸۳ (طبع ایچ ایم سعید): لا يقوم داعيا له. وفي نفع المفتي والسائل ص:۱۴۳ (طبع کتب خانہ رحیمیہ دیوبند یوپی): الدعاء بعد الجنازة مكروه. نیز مزید دیکھئے امداد الاحکام ج:۱ ص:۱۹۴، و امداد المفتین ص:۱۷۶۔ (محمد زبیر)

نکاح کے وقت دُولہا کا سہرا باندھنا

سوال:- نکاح سے پہلے دُولہا کے سر پر سہرا باندھنا کسی روایت سے ثابت ہے؟

جواب:- سہرا باندھنا ہندوانہ رسم ہے، مسلمانوں کو اس سے پرہیز کرنا چاہئے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۹۵۷/۲۸ ج)

کھانا سامنے رکھ کر فاتحہ پڑھنا

سوال:- کھانا سامنے رکھ کر ہاتھ اُٹھا کر فاتحہ پڑھنا کسی حدیث یا روایت سے ثابت ہے یا نہیں؟ اور فاتحہ کو لازمی سمجھنا کیسا ہے؟ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، مرحوم کی رُوح کو ایصالِ ثواب کس طرح کیا کرتے تھے؟

جواب:- کسی روایت یا حدیث سے ثابت نہیں، اور اس کو لازمی سمجھنا بدعتِ شنیعہ ہے۔ ایصالِ ثواب کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ کوئی بھی نیک عمل صدق و اِخلاص کے ساتھ نام ونمود سے بچتے ہوئے یہ دُعا کرلی جائے کہ یا اللہ! اس کا ثواب فلاں کو عطا فرما۔ اور اس غرض کے لئے لوگوں کو جمع کرنا یا خاص خاص دنوں میں جمع ہوکر اجتماعی طور پر تلاوت کرنا، کھانا پکانا وغیرہ یہ سب اُمور بدعت ہیں اور ان سے پرہیز کرنا چاہئے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۹۵۷/۲۸ ج)

عہد نامہ قبر میں رکھنے کا حکم

سوال:- عہدنامہ کا قبر میں رکھنا کیسا ہے؟

جواب:- میت کے ساتھ قبر میں کسی قسم کا عہدنامہ رکھنے کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۸۸/۶/۱ھ
(فتویٰ نمبر ۲۳۶/۱۹ الف)

---

(۱) دیکھئے فتاویٰ دار العلوم دیوبند (عزیز الفتاویٰ) ص:۹۹۔

قبر پر تلقین کا حکم

سوال:- قبر پر تلقین کی کیا کیفیت ہے؟

جواب:- قبر پر تلقین کی شریعت میں کوئی اصل نہیں۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱/۱/۱۳۹۷ھ

مسجد میں بلند آواز سے دُرود وسلام، نعت اور میلاد منعقد کرنا

سوال:- مسجد میں بلند آواز سے دُرود وسلام اور نعت پڑھنا چاہئے یا نہیں؟ مسجد میں میلاد شریف ہونی چاہئے یا نہیں؟

جواب:- نماز کے اوقات میں جب لوگ فرض یا سنن ونوافل پڑھ رہے ہوں، مسجد میں بلند آواز سے ذکر یا وعظ وخطبہ دینا دُرست نہیں،[2] البتہ جب نماز میں مشغول نہ ہوں تو ذکرِ جہر یا وعظ کہنا جائز ہے، البتہ دُرودشریف کو آج کل جس طرح کھڑے ہوکر اجتماعی شکل میں بلند آواز سے پڑھنا لازم سمجھ لیا گیا ہے وہ بدعت ہے، نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کا بیان انتہائی سعادت اور موجبِ خیر و برکت ہے، لیکن اس کو کسی خاص دن کے ساتھ مخصوص کرنا دُرست نہیں، نیز اس میں حاضری کا مقصد اتباعِ سنت کا جذبہ ہونا چاہئے، نمود ونمائش نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۶/۶/۱۳۹۸ھ
(فتویٰ نمبر ۶۱۹/۲۹ ب)

قبر پر اذان دینے کا حکم

سوال:- ایک شخص مرگیا، اس کی میّت کو دفنانے کے لئے قبرستان لے جاتے ہیں اور دفنانے کے بعد اس کی قبر پر ایک شخص اذان دیتا ہے، قبر پر اذان دینا دُرست ہے؟

جواب:- قبر پر مذکورہ طریقے سے اذان دینا بالکل بے اصل ہے۔ قرآن وحدیث میں اس

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے: امداد الاحکام ج:۱ ص:۲۱۱، و فتاویٰ رشیدیہ ص:۲۳۳۔

(۲) وفی الفتاویٰ البزازیة علی الهندیة ج:۶ ص:۳۷۸ وقد صح عن ابن مسعود رضی الله عنه أنه سمع قوما اجتمعوا فی مسجد یهللون ویصلون علیه، علیه الصلوٰة والسلام جهرًا، فراح الیهم فقال: ما عهدنا ذٰلک علی عهده علیه السلام وما أراکم الا مبتدعین، فما زال یذکر ذٰلک حتّی أخرجهم عن المسجد. کذا فی ردّ المحتار ج:۶ ص:۳۹۸ وفی الشامیة ج:۶ ص:۳۴۹ (طبع سعید) وفی الملتقی وعن النبی صلی الله علیه وسلم أنه کره رفع الصوت عند قراءة القرآن والجنازة والزحف والتذکیر، فما ظنک به عند الغناء الذی یسمّونه وجدا ومحبة فانه مکروه لا أصل له فی الدین. وفیها ص:۳۹۸ .... فالاسرار أفضل حیث خیف الریاء أو تأذی المصلین .... الخ.

کا کوئی ثبوت نہیں، اس عمل سے اجتناب لازم ہے۔[۱]

واللہ سبحانہ اعلم
۷/۱۲/۱۳۹۶ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷۷۶/۲۷ و)

اذان سے پہلے صلوٰۃ وسلام پڑھنے کا حکم

سوال:- اذان سے پہلے صلوٰۃ وسلام پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ جن مسجدوں میں عرصہ تیس سال سے اذان سے قبل صلوٰۃ وسلام نہیں پڑھا جاتا تھا وہاں اب پڑھنے، نہ پڑھنے پر نمازیوں میں شدید اختلاف پیدا ہو رہا ہے۔ حدیث وفقہ کی روشنی میں دلائل کے ساتھ تحریر فرمائیں۔

جواب:- دُرود شریف پڑھنا بے حد فضیلت کا عمل ہے، جس مسلمان کو اللہ تعالیٰ جتنی توفیق دے، دُرود شریف پڑھ کر اپنے نامۂ اعمال کو نیکیوں سے بھرنا چاہئے، اس کا کوئی خاص وقت شریعت کی طرف سے مقرّر نہیں، انسان جس وقت چاہے اِخلاص کے ساتھ، نمود ونمائش کے بغیر دُرود شریف پڑھ سکتا ہے۔ لیکن ہمارے زمانے میں بعض مقامات پر اذان سے پہلے جس طرح اجتماعی ہیئت میں بلند آواز سے صلوٰۃ وسلام پڑھنے کا رواج ہوگیا ہے اور جس طرح اس کو فرض و واجب یا اذان کا لازمی جزء سمجھا جانے لگا ہے، یہ دُرود شریف نہیں، بلکہ اس کی نمائش ہے، جس کا کوئی ثبوت قرآن وسنت یا صحابہؓ و تابعینؒ کے عہدِ مبارک میں نہیں ملتا، اس بناء پر یہ بدعت ہے۔[۲] مسلمانوں کو چاہئے کہ اس طریقے کے

---

(۱) وفی رد المحتار ج:۲ ص:۲۳۵ تنبیه فی الاقتصار علی ما ذکر من الوارد اشارة الی أنه لا یسن الأذان عند ادخال المیّت فی قبره کما هو المعتاد الآن: وقد صرح ابن حجرؒ فی فتاویه بأنه بدعة، وقال: ومن ظن أنه سنة قیاسا علی ندبهما للمولود الحاقا لخاتمة الأمر بابتدائه فلم یصب. وفی حاشیة البحر الرائق باب الأذان ج:۱ ص:۲۵۶ (طبع مکتبه ماجدیه کوئٹه) قیل: وعند انزال المیّت القبر قیاسا علی أول خروجه للدنیا لکن رده ابن حجر فی شرح العباب .... الخ. وفی در البحار: من البدع التی شاعت فی بلاد الهند الأذان علی القبر بعد الدفن. بحوالہ فتاویٰ رشیدیہ ص:۱۳۶، مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۵ ص:۳۰۱، وعزیز الفتاویٰ ص:۱۰۰ و۱۰۲۔

(۲) وفی الفتاویٰ الکبریٰ لابن حجر الهیتمیؒ ج:۱ ص:۱۲۹، ۱۳۰ (طبع مکتبه اسلامیه) (وسئل) هل الصلوٰة علی النبی صلی الله علیه وسلم مسنونة قبل الأذان کما هی بعده؟ .... وهل ینهی عنه، وعن الصلوٰة علی النبی صلی الله علیه وسلم قبل الأذان أو لا؟ (فأجاب) .... بعد اسطر .... أما الصلوٰة والسلام علی النبی صلی الله علیه وسلم بعد الأذان والاقامة، فانهما مندوبان کما صرح به أصحابنا وما جاء به ذلک خبر مسلم والأربعة الا ابن ماجة. وفیه أیضًا ج:۱ ص:۱۳۱ فمن أتی .... معتقدا سنیته فی ذلک المحل المخصوص نهی عنه ومنع منه لأنه تشریع بغیر دلیل ومن شرع بلا دلیل یزجر عن ذلک وینهی عنه. فائدة:- قد أحدث المؤذنون الصلوٰة والسلام علی رسول الله صلی الله علیه وسلم عقب الأذان، .... وکان ابتداء جدوث ذلک فی أیام السلطان الناصر صلاح الدین ابن أیوب، وبأمره فی مصر وأعمالها .... ولقد استفتی مشائخنا وغیرهم فی الصلوٰة والسلام علیه صلی الله علیه وسلم .... بعد الأذان علی الکیفیة التی یفعلها المؤذنون، فأفتوا بأن الأصل سنة والکیفیة بدعة. .... (بقیہ اگلے صفحے پر)

بجائے مسنون طریقے پر اخلاص اور ادب کے ساتھ دُرود شریف پڑھنے کا طریقہ اختیار کریں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۲/۲۷ھ
(فتویٰ نمبر ۸۵۸/۲۹ ب)

نماز کے بعد بلند آواز سے صلوٰۃ وسلام پڑھنے کا حکم

سوال:- نمازوں کے بعد الصلوٰۃ والسلام بلند آواز سے بہ ہیئتِ اجتماعی پڑھنا فرض، واجب یا سنت یا مستحب یا بدعت ہے؟

جواب:- دُرود پڑھنا بہت ثواب ہے، لیکن اس کا جو طریقہ آج کل چل پڑا ہے کہ کھڑے ہوکر اجتماعی طور سے پڑھنے کو ضروری سمجھا جاتا ہے، اور جو ایسا نہ کرے اسے بُرا سمجھا جاتا ہے، یہ بدعت ہے۔[1]

واللہ اعلم

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۸ھ
(فتویٰ نمبر ۲۲۳/۱۹ الف)

نماز اور درس کے بعد مصافحہ کرنا

سوال:- ہماری مسجد میں روزانہ بعد نمازِ فجر درسِ قرآن ہوتا ہے، درسِ قرآن کے بعد جب مولوی صاحب کھڑے ہوجاتے ہیں تو مصافحہ کے لئے لوگ کھڑے ہوجاتے ہیں، اس میں کبھی ناغہ نہیں ہوتا، کیا اس طرح پابندی بدعت نہیں ہے؟

جواب:- نماز خواہ فجر کی ہو یا ظہر کی، اس کے بعد یا درسِ قرآن کے بعد ثواب سمجھ کر مصافحہ کرنا بدعت ہے، اور اگر اس پر اس طرح پابندی کی جائے کہ جو مصافحہ نہ کرے اسے بُرا سمجھا

(گزشتہ سے پیوستہ)......وفي الابداع في مضار الابتداع ص:۷۷، ۷۸ (طبع مكتبة علمية مدينة المنورة) لا كلام في أن الصلوة والسلام على النبي صلى الله عليه وسلم عقب الأذان مطلوبان شرعا لورود الأحاديث الصحيحة .... انما الخلاف في الجهر بهما على الكيفية المعروفة، والصواب أنها بدعة مذمومة بهذه الكيفية التي جرت بها عادة المؤذنين من رفع الصوت بهما كالأذان والتمطيط والتغني. فان ذلك احداث شعار ديني على خلاف ما عهد عن رسول الله صلى الله عليه وسلم وأصحابه والسلف الصالح من أئمة المسلمين، وليس لأحد بعدهم ذلك. ...

ومن ثم قال العلامة ابن حجر في فتاويه الكبرى: من صلى على النبي صلى الله عليه وسلم قبل الأذان أو قال: محمد رسول الله بعده معتقدا سنيته في ذلك المحل ينهى ويمنع منه. لأنه تشريع بغير دليل ومن شرع بغير دليل يزجر ويمنع انتهى. وهذا العلامة ابن حجر حكم على من صلّى على النبي صلى الله عليه وسلم قبل الأذان أو قال: محمد رسول الله بعده بأنه شرع في دين الله تعالى وانه يمنع من ذلك ويزجر، وما ذاك الا لقبح ما فعل .... الخ.

(۱) دیکھئے ص ۱۱۰ کا حاشیہ نمبر ۱۔

جائے تو بھی بدعت ہے،[۱] لیکن اگر اسے ثواب سمجھے بغیر، اور جو مصافحہ نہ کرے اسے بُرا سمجھے بغیر مصافحہ کرلیا جائے تو مضائقہ نہیں۔

واللہ اعلم
۱۳۸۸/۲/۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹۰/۱۹ الف)

امام صاحب کا نمازِ جنازہ کے بعد دُعا نہ مانگنا

سوال:- نمازِ جنازہ میں چار تکبیروں کے بعد سلام پھیر کر امام بطریقِ مروّجہ دُعا نہ مانگتے ہوئے چلا گیا، کچھ لوگوں نے اعتراض کیا کہ بدون دُعا مانگے نماز مکمل نہیں ہوئی، کچھ لوگوں نے کہا کہ نمازِ جنازہ خود میّت کے حق میں دُعا ہے، نماز مکمل ہوگئی۔ کون سا عمل دُرست ہے؟

جواب:- نمازِ جنازہ خود دُعا ہے، اور اس کے بعد الگ سے ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگنا سنت سے ثابت نہیں،[۲] لہٰذا امام صاحب کا عمل دُرست ہے۔ جو لوگ ان کے اس عمل پر اعتراض کر رہے ہیں ان کا اعتراض صحیح نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۰/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۴۲۲/۲۷ د)

دفن کے بعد قبر پر اذان دینے کا حکم

سوال:- دفن کرنے کے بعد قبر پر کھڑے ہوکر جو اذان دی جاتی ہے، شریعت میں اس کی کوئی اصل ہے یا نہیں؟

جواب:- دفن کے بعد اذان دینے کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں، اس سے احتراز کرنا لازم ہے، کیونکہ یہ بدعت ہے۔[۳]

واللہ اعلم

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۹/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۳۰/۱۹ الف)

---

(۱) وفی الشامیۃ ج:۶ ص:۳۸۱ (طبع سعید) ونقل فی تبیین المحارم عن الملتقط أنہ تکرہ المصافحۃ بعد أداء الصلٰوۃ بکل حال لأن الصحابۃ ما صافحوا بعد أداء الصلٰوۃ ولأنہا من سنن الروافض .... قال ابن الحاج من المالکیۃ فی المدخل: انہا من البدع، وموضع المصافحۃ فی الشرع انما ہو عند لقاء المسلم لأخیہ لا فی ادبار الصلوات، فحیث وضعہا الشارع یضعہا، فینہی عن ذٰلک ویزجر فاعلہ لما أتی بہ من خلاف السنۃ، وکذا فی فتاوی رشیدیۃ ص:۲۶۴۔ نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۵ ص:۲۶۰، عزیز الفتاویٰ ص:۱۲۸، امداد الاحکام ج:۱ ص:۱۹۵۔

(۲) دیکھئے ص:۱۰۸ کا حاشیہ نمبر۲۔

(۳) دیکھئے ص:۱۱۱ کا حاشیہ نمبر۱۔

دُعا کے آخر میں "صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا" پڑھ کر بلند آواز سے دُرود شریف پڑھنے کا حکم

سوال:- آج کل بعض مساجد میں دُعا کے آخر میں "صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا" پڑھ کر امام اور مقتدی زور سے دُرود شریف پڑھتے ہیں، اگر امام منع کرے تو فساد ہوتا ہے، کیا حکم ہے؟

جواب:- مذکورہ عمل جس التزام و اہتمام کے ساتھ کیا جارہا ہے، اور جس طرح اس کے تارک پر نکیر کی جاتی ہے، وہ بدعت ہے،(۱) اس سے پرہیز لازم ہے۔ جو لوگ اس پر عمل پیرا ہوں ان کو اہلِ علم کے فتاویٰ دِکھا کر نرمی سے سمجھانا چاہئے، لیکن اس کی وجہ سے فتنہ و فساد برپا کرنا واقعۃً دُرست نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۱/۱۰/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۶۱/۲۸ ج)

ما حكم قراءة الصلوٰة والسلام جهرًا بعد صلوٰة الجمعة؟

(جمعہ کے بعد بلند آواز سے صلوٰۃ وسلام پڑھنے پر عربی میں مفصل فتویٰ)

الاستفتاء:-

هل يجوز بكلام الله وسنة الرسول صلى الله عليه وسلم أن تؤدى الصلوٰة والسلام جهرا بعد صلوٰة الجمعة أمام المنصة والمحراب للجامع اهتماما والتزاما؟ شرّفونا بالجواب الصائب، مأجورين عند الله، مشكورين عند الناس.

الجواب:-

ليعلم أولا أن الصحابة رضوان الله عليهم فمن بعدهم من التابعين وأتباعهم كانوا سباقين الى الخير حريصين فى كل ما هو خير فى نظر الشريعة الغراء اذ عملوا بكلما رأوه سنة نبيهم الكريم صلى الله عليه وسلم، وبكلما كان حسنا شرعيا، فدل على أنه لم يبق بعدهم شئ

---

(۱) وفى الفتاوى البزازية على الهندية ج:٦ ص:٣٧٨ (طبع رشيديه كوئٹه) وقد صح عن ابن مسعود رضى الله عنه أنه سمع قوما اجتمعوا فى مسجد يهللون ويصلون عليه، عليه الصلوٰة والسلام جهرا فراح اليهم فقال ما عهدنا ذلك على عهده عليه الصلوٰة والسلام وما أراكم الا مبتدعين، فما زال يذكر ذلك حتى أخرجهم عن المسجد. (كذا فى رد المحتار ج:٦ ص:٣٩٨) وفى الشامية ج:٦ ص:٣٤٩ وفى الملتقى وعن النبى صلى الله عليه وسلم انه كره رفع الصوت عند قراءة القرآن والجنازة والزحف والتذكير، فما ظنك به عند الغناء الذى يسمونه وجدا ومحبة فانه مكروه لا أصل له فى الدين وفيها ج:٦ ص ٣٩٨ فالاسرار أفضل حيث خيف الرياء أو تأذى المصلين ... الخ. وفى المرقاة شرح مشكوة ج:٢ ص:٣٥٧ قوله تعالى: "ولا تجهر بصلاتك ... الخ" ويسن الاسرار فى سائر الأذكار أيضا الا فى التلبية، وراجع أيضا الدر المختار ج:١ ص:٥١٠، ٥٢٣.

واجب ولا مندوب الا ما أوجبه القران الكريم وأحاديث رسول الله صلى الله عليه أحسن الصلوٰة والتسليم، وان اخترع بعدهم فكر أحد شيئا، يمكن أن يكون مباحا ولٰكنه لا يجوز أن يهتم به اهتماما بليغا ويدعى اليه الناس، ويلام علىٰ من يتركه.

فاذا بحثنا عن فعل الصحابة وأتباعهم في مسئلتنا هٰذه، رأينا أنهم كانوا يباشرون الصلوٰة على النبى صلى الله عليه وسلم ويعتبرونه عملا مهمّا مثابا عليه، غير أن طريق مباشرتها عندهم غير الطريق المذكور في السؤال، اذ كانوا يصلون منفردين خاشعين ولم يكونوا يؤدونها زرافات مجتمعين عند المناص والمحاريب، ولم يثبت في شئ من الروايات اجتماعهم لهٰذا المقصد واعلامهم به كما يُعلمون الأذان.

فظهر أن الصلوٰة على النبى صلى الله عليه وسلم حسن مثاب عليه، والطريق المذكور غير مستحسن، اذ لو كان ذٰلک حسنا لفعله الصحابة بوجه أحسن واهتمام بليغ.

ثم في هٰذا الفعل مفاسد أخرىٰ عديدة:

۱:- ان الصلوٰة دعاء في حضرة الحق جل وعلا مجده، وقد تقرر في موضعه أن الدعاء بالسر أولىٰ، قال الله تبارک و تعالىٰ: "اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً".[۱]

۲:- انه يشبه الرياء، ولا ينبغي دخول مواضع التهم.[۲]

۳:- غاية ما في الباب أنه مباح، وسفهاء زماننا يلتزمون التزاما ولا كالتزامهم الجماعة، ويهتمون به ويلومون علىٰ تاركيه، حتّى أن بعضهم يزعمه فرضا، وقد تقرر في الفقه أن التزام ما لا يلزم لا يجوز، فانه خلاف للاٰية الشريفة: "اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ" الاٰية.[۳]

٤:- بعضهم يباشره قائما ويعتقد أن الرسول صلى الله عليه وسلم "حاضر في كل مكان، ناظر الى كل شئ"، وهٰذه العقيدة نخشى عليها الكفر كما لا يخفى علىٰ مسلم، فان احاطة الأشياء كلها بالعلم ووجوده في كل مكان من أخص صفات الله سبحانه واشراک أحد فيه شرک بالله تعالىٰ، نعوذ بالله منه.

---

(۱) سورة الاعراف: ۵۵.

(۲) وفي كشف الخفاء للعجلونى ج:۱ ص:۳۵ رقم:۸۸ (طبع مؤسسة الرسالة بيروت) قول عمر من سلک مسالک الظن اتهم، ورواه الخرائطى في مكارم الاخلاق مرفوعًا بلفظ من أقام نفسه مقام التهم فلا يلومن من اساء الظن به. وراجع أيضا سنن الكبرىٰ للبيهقى ج:۴ ص:۳۲۴ (طبع مكتبة دار الباز مكة المكرمة) وفتح البارى اجتناب مواضع التهم وكراهة .... الخ. ج:۲ ص:۳۳۶ (طبع دار المعرفة بيروت).

(۳) سورة المائدة: ۳.

وبالجملة فهٰذا الطريق لم يثبت في القرون المشهود لها بالخير، لا سيما اذا ضمت معها مفاسد ذكرناها كان فعلا قبيحا، وحق علىٰ كل مسلم أن لا يفعله ويمنع فاعله مهما استطاع.[1] والله سبحانه وتعالىٰ أعلم

الجواب صحيح
العبد محمد شفيع عفا الله عنه

الأحقر محمد تقي العثماني
۱۳۷۹/۶/۱۲ھ[2]

نماز کے بعد دُرود شریف پڑھنے کا حکم

سوال:- نماز کے بعد دُرود شریف اُونچی آواز سے پڑھنا چاہئے یا نہیں؟ یا آہستہ پڑھنا چاہئے؟

جواب:- آہستہ ہی پڑھنا چاہئے۔ ہمارے زمانے میں بلند آواز سے دُرود شریف پڑھنے کا جو رواج ہوگیا ہے، اور اس کی جس طرح فرائض کی سی پابندی کی جاتی ہے اور جس طرح اس کے خلاف پر ملامت و نکیر کی جاتی ہے، وہ بدعت ہے۔[3] واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۰/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۲۳۴۲/۲۷ و)

نمازِ جنازہ کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگنا

سوال:- نمازِ جنازہ کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- نمازِ جنازہ خود دُعا ہے، اور اس کے بعد دُعا کے لئے اجتماعی اہتمام جیسا کہ آج کل بعض حلقوں میں مروّج ہے، اس کا قرآن و سنت اور بزرگانِ سلف کے تعامل سے کوئی ثبوت نہیں ہے، اور اس طرح کا اہتمام و اصرار بدعت ہے، لہٰذا واجب الترک ہے۔[4] واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۱/۲۰ھ
(فتویٰ نمبر ۱۲۵/۲۸ الف)

حیلۂ اسقاط کا حکم

سوال:- حیلۂ اسقاط کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب:- حیلۂ اسقاط کا مروّجہ طریقہ شرعاً بے اصل ہے، اس بارے میں اصل حکمِ شرعی یہ

---

(۱) مزید حوالہ جات سابقہ ص:۱۱۴ کے حاشیہ نمبر۱ میں ملاحظہ فرمائیں۔
(۲) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم کی تمرینِ افتاء کی کاپی سے لیا گیا ہے۔
(۳) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۱۱۴ حاشیہ نمبر۱۔
(۴) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۱۰۸ حاشیہ نمبر۲۔

ہے کہ نماز، روزے جو میّت کے ذمے رہ گئے ہوں، ان کا فدیہ ادا کیا جائے اگر میّت نے وصیت کی ہو، اور اس کے لئے مال بھی چھوڑا ہو تو ورثاء کے لئے ایسا کرنا واجب ہے، ورنہ واجب نہیں بہتر ہے، کذا فی عزیز الفتاویٰ (ج:۱ ص:۳۷۰)۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱/۲۰ھ
(فتویٰ نمبر ۱۲۵/ ۲۸ الف)

میّت کے ساتھ قبرستان تک قرآن مجید لے جانا

سوال:- میّت کے ساتھ قبرستان تک قرآن مجید لے جانا کیسا ہے؟

جواب:- اس کی کوئی اصل نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱/۲۰ھ
(فتویٰ نمبر ۱۲۵/ ۲۸ الف)

نمازِ جنازہ کے بعد دُعا مانگنا

سوال:- نمازِ جنازہ کے بعد دُعا مانگنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- نمازِ جنازہ خود دُعا ہے، اور اس کے بعد دُعا کا اہتمام کسی حدیث یا صحابہؓ و تابعینؒ کے عمل سے ثابت نہیں، لہٰذا آج کل بعض حلقوں میں جس اہتمام اور اصرار کے ساتھ یہ عمل کیا جاتا ہے وہ بدعت ہے۔ (کذا فی عزیز الفتاویٰ ج:۱ ص:۳۸۹)۔[2]

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۱/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۱۵۶/ ۲۸ الف)

میّت کو دفن کرنے کے بعد قبر پر اذان دینا

سوال:- اذان القبر، میّت کو دفن کرنے کے بعد اس کے سر کی جانب کھڑے ہو کر اذان دینا جائز ہے یا نہیں؟

---

(۱) عزیز الفتاویٰ ص:۱۲۲، وفی الشامیة ج:۲ ص:۷۳ وبه ظهر حال وصایا أهل زماننا، فان الواحد منهم یکون فی ذمته صلوات کثیرة وغیرها من زکاة واضاح وأیمان ویوصی لذلک بدراهم یسیرة ویجعل معظم وصیته لقراءة الختمات والتهالیل التی نص علماؤنا علی عدم صحة الوصیة بها. وراجع أیضًا الی الرسالة الثامنة منة الجلیل ص:۲۲۵ من رسائل ابن عابدین رحمه الله، وامداد الأحکام ج:۱ ص:۱۸۳.

(۲) فتاوی دار العلوم دیوبند ج:۱ ص:۲۸۹، مرقاة المفاتیح ج:۴ ص:۶۴ (مکتبه امدادیه ملتان)، بزازیة مع الهندیة ج:۴ ص:۸۰ (رشیدیه کوئٹه)، خلاصة الفتاویٰ ج:۱ ص:۲۲۵ (امجد اکیڈمی لاهور)، البحر الرائق ج:۲ ص:۱۸۳، جامع الرموز ج:۱ ص:۲۸۳ (طبع سعید)، نفع المفتی والسائل ص:۱۴۳ (طبع کتب خانه رحیمیه دیوبند یوپی)، امداد الأحکام ج:۱ ص:۱۹۴، امداد المفتین ص:۱۷۶. عبارات سابقہ ص:۱۰۸ حاشیہ نمبر۲ میں ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر)

جواب:- اس کا صحیح بہ ذوتِ بعینہٖ سے کوئی ثبوت نہیں ہے، لہٰذا یہ بدعت ہے۔[۱]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۸۸/۲/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۸۴/۱۹ الف)

مروّجہ حیلۂ اِسقاط کا حکم

سوال:- حیلۂ اسقاط جو آج کل مشہور ہے اور لوگ کیا کرتے ہیں، شریعت میں کیا اس کا ثبوت ہے یا نہیں؟

جواب:- اسقاطِ مروّجہ کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے،[۲] میّت کے گناہ معاف کرانے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس کے لئے مغفرت کی دُعا کی جائے اور جو نماز، روزے رہ گئے ہیں اس کا فدیہ ادا کیا جائے اور میّت کو ایصالِ ثواب کیا جائے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۸۴/۱۹ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد عاشق الٰہی بلندشہری

رمضان کی ۲۳ تاریخ کو بعد از تراویح سورۂ عنکبوت اور سورۂ رُوم پڑھنا

سوال:- رمضان کی ۲۳ تاریخ کو امامِ مسجد بعد از تراویح سورۂ عنکبوت و سورۂ رُوم پڑھتے ہیں، لوگ سنتے ہیں اور نذرانے پیش کرتے ہیں، یہ طریقہ کیسا ہے؟ فضائلِ قرآن کی روایت کا حوالہ دیتے ہیں، یہ کیسا ہے؟

سائل: (مولانا) محمد افضل خان

شاہ پور کانا، سوات، صوبہ سرحد

جواب:- قرآنِ کریم کی تلاوت باعثِ اجر وثواب ہے، لیکن اس التزام کے ساتھ پڑھنا ہمارے علم میں بے اصل ہے، جس روایت کا وہ صاحب ذکر کرتے ہیں، اس کا مفصل حوالہ لکھ کر بھیجیں تو

---

(۱) تنبیہ فی الاقتصار علی ما ذکر من الوارد اشارۃ الی أنہ لا یسن الأذان عند ادخال المیّت فی قبرہ کما ہو المعتاد الاٰن، وقد صرح ابن حجر فی فتاویہ بأنہ بدعۃ، وقال من ظن انہ سنۃ قیاسا علی ندبہما للمولود الحاقا لخاتمۃ الأمر بابتدائہ فلم یصب، (ردّ المحتار ج:۲ ص:۲۳۵، کتاب الجنائز)۔ وفی در البحار: من البدع التی شاعت فی بلاد الھند الأذان علی القبر بعد الدفن. بحوالہ: فتاویٰ رشیدیہ ص:۱۳۶، وامداد الفتاویٰ ج:۵ ص:۳۰۱، عزیز الفتاویٰ ص:۱۰۰، ۱۰۶۔

(۲) وفی الشامیۃ ج:۲ ص:۷۳ وبہ ظھر حال وصایا أھل زماننا، فان الواحد منھم یکون فی ذمتہ صلوات کثیرۃ وغیرھا من زکاۃ واضاح وأیمان، ویوصی لذلک بدراھم یسیرۃ ویجعل معظم وصیتہ لقراءۃ الختمات والتھالیل التی نص علماؤنا علی عدم صحۃ الوصیۃ بھا.

اس کے بارے میں کچھ کہا جاسکتا ہے۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۱/۶ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۶۷ الف)

حیلۂ اسقاط اور میّت کے لئے تین دن خیرات کرنے کا حکم

سوال ا:- مردے کے فدیہ میں پیسے اور قرآن کا دورِ اسقاط پھراتے ہیں، یہ کیسا ہے؟

۲:- مردے کے لئے اوّل تین رات خیرات کرتے ہیں اور تین صبح تلاوتِ قرآن قبر پر جاکر کرتے ہیں، اس کو پیسے اور روٹی دیتے ہیں، یہ کیسا ہے؟

سائل: مولانا افضل خان
شاہ پور کانا، ضلع سوات، صوبہ سرحد

جواب ا:- حیلۂ اسقاط کی شریعت میں کوئی اصل نہیں، اس کے بجائے مشروع طریقہ یہ ہے کہ جتنی نمازیں یا روزے مردے کے قضا ہیں، اتنی نمازوں اور روزوں کا فدیہ غرباء کو دے دیا جائے، اور جتنا ہوسکے مشروع طریقے سے اس کو ایصالِ ثواب کیا جائے۔ (۱)

۲:- اس قسم کی پابندیاں بدعت ہیں اور ان سے اجتناب لازم ہے۔ ہاں! ان پابندیوں سے بچ کر مردے کو جتنا ایصالِ ثواب اِخلاص کے ساتھ کیا جائے باعثِ خیر و برکت ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱/۶ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۶۷ الف)

قبرستان میں قرآن مجید لے جاکر پڑھنا

سوال:- قبرستان میں قرآن مجید لے جاکر پڑھنا جائز ہے؟ اور کیا جواز پر اس حدیث سے استدلال کرنا "نوروا قبور موتاکم بالقران" دُرست ہے یا نہیں؟

عبدالسلام چاٹگامی
جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن

جواب:- قبرستان میں قرآن مجید لے کر پڑھنا جائز ہے، لیکن "نوروا قبور موتاکم بالقران" کے الفاظ کی کوئی روایت ہمیں نہیں ملی، موضوعات کے مجموعے میں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں ملا۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹/۵۶ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۱۱۷ کا حاشیہ نمبرا۔

اہلِ قبور سے توسل پکڑنا

سوال:- کیا اہلِ قبور سے توسل پکڑنا جائز ہے؟ اور اس کے جواز کے لئے یہ حدیث: "اذا تحیرتم في الأمور فاستعینوا بأهل القبور" استدلال میں پیش کرنا کیسا ہے؟ والسلام

(مفتی) عبدالسلام چاٹگامی
سابق مفتی جامعۃ العلوم
الاسلامیہ بنوری ٹاؤن

جواب:- توسل کیا جاسکتا ہے، لیکن خود ان سے حاجت طلب کرنا حرام ہے، "استعینوا بأهل القبور" کے الفاظ کی کوئی حدیث نہیں ملی۔ (۱) واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۱۴ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۵۶ الف)

جماعت کے بعد امام سے مصافحہ کرنا

سوال:- جماعت کے بعد دُعا مانگ کر امام سے مصافحہ کرنا چاہئے یا نہیں؟

جواب:- نماز کے بعد امام سے مصافحہ کرنے کو جو بعض لوگ مسنون سمجھتے ہیں، اس کی شریعت میں کوئی اصل نہیں، خاص طور سے نماز کے بعد مصافحے کو سنت سمجھنا دُرست نہیں، ہاں! واقعۃً امام صاحب سے ملاقات مقصود ہو تو مصافحے میں مضائقہ نہیں۔ (۲) واللہ اعلم

۱۳۹۶/۱۰/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۲۴۴۸/۲۷ و)

---

(۱) سوال میں سائل موصوف مفتی عبدالسلام چاٹگامی صاحب زید مجدہٗ نے "فاستعینوا بأهل القبور" کے الفاظ لکھے ہیں جبکہ مجموعۃ الفتاویٰ علامہ لکھنویؒ کے ایک سوال میں "فاستفتوا بأهل القبور" کے الفاظ لکھے ہیں، جس کے جواب میں علامہ عبدالحی لکھنویؒ نے فرمایا: یہ حدیث نہیں کسی کا مقولہ ہے۔ آگے علامہ لکھنویؒ نے "فاستفتوا" کے الفاظ کے ساتھ اس کا مفہوم یہ لکھا ہے کہ: "جب تمہیں کسی چیز کے حلال یا حرام ہونے میں شبہ ہو تو اپنے اجتہاد پر عمل کرنے کے بجائے ان قدماء کی تقلید کرو جو اس وقت قبروں میں سو رہے ہیں۔" یا یہ معنی ہے کہ: "جب تم دُنیاوی اُمور میں پریشان ہو تو اصحابِ قبور پر نظر کرو جنھوں نے دُنیا کو چھوڑ کر آخرت کا سفر اختیار کرلیا اور تمہیں بھی یہ سفر کرنا ہے۔" اور "استعینوا" کے الفاظ ہوں تو پھر مفہوم یہ ہے کہ: "اصحابِ قبور کے وسیلے سے اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگو، نہ یہ کہ ان کو مستقل طور سے حلِ مشکلات اور تدابیرِ عالم میں اللہ کا شریک جانو، یہ کھلا ہوا شرک ہے۔" دیکھئے علامہ عبدالحی لکھنویؒ کی کتاب مجموعۃ الفتاویٰ اُردو، کتاب العلم والعلماء ج:۱ ص:۱۵۹ (طبع میر محمد کتب خانہ)۔ (محمد زبیر حق نواز)

(۲) دیکھئے سابقہ ص:۱۰۷ کا حاشیہ نمبر ۲،۳۔

درسِ قرآن کے شروع میں دُرود شریف پڑھوانا

سوال:- درسِ قرآن یا حدیث شروع کرنے سے قبل دُرود شریف پڑھوانا کیا بدعت ہے؟

جواب:- اگر اس کو لازم وضروری نہ سمجھا جائے اور واجبات کی طرح التزام نہ کیا جائے تو بدعت نہیں ہے۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۴ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۹۶/۱۸ الف)

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

مسجد میں چراغاں کا حکم

سوال:- ہماری مسجد عزّت الاسلام میں رمضان کے شروع ہونے سے دو روز پہلے محلے کے دو تین آدمی آئے اور کہا کہ ہمارا ارادہ ہے کہ رمضان میں ہم اپنے خرچ سے ایک مہینے تک اپنی جیب سے مسجد کو بجلی کے قمقموں سے سجائیں گے، تقریباً پورے مہینے میں دو ہزار روپے خرچ ہوں گے۔ زید کہتا ہے کہ یہ فضول خرچی ہے جو اللہ کو ناپسند ہے، اس کا شرعی حکم بتائیں کہ کیا ہے؟

جواب:- مسجد کے چندے سے زائد از ضرورت روشنی کرنا بالکل ناجائز ہے ہی، لیکن اگر کوئی ایک شخص اپنے پاس سے خرچ کر کے روشنی کرے تب بھی اس میں ایک تو اِسراف کا گناہ ہے، دُوسرے تشبہ بالکفار ہے، تیسرے اس کو زیادہ ثواب کا کام سمجھ کر کرنا بدعت ہے۔ اس لئے جو لوگ چراغاں کر رہے ہیں انہیں اس سے اجتناب لازم ہے۔[1]

واللہ تعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۹/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۹۹۵/۲۸ ج)

شہدائے کربلا کے مزارات کی شبیہ بنانا

سوال:- ذکرِ شہادت کے دوران ایک مولانا نے فرمایا کہ: رائج الوقت تمام تعزیئے ناجائز ہیں، البتہ اگر سیّد الشہداء کے روضۂ مبارک کی شکل اور نقل بنائی جائے تو جائز ہے، کیا یہ کہنا دُرست ہے یا نہیں؟

---

(۱) دیکھئے ص:۱۰۲ کا حاشیہ نمبر۱۔

جواب:- تعزیہ داری کی ہر صورت جو رائج ہے، بدعت ہے، اور اس کا بنانا جائز نہیں[1]، شہدائے کربلا کے مزارات کی شبیہ اگر ثواب سمجھ کر بنائی جائے گی تو بدعت ہوگی۔ واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۶ھ

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۰۰/۱۹ الف)

تعزیہ سازی، سبیل لگانا، تعزیہ کو جلانا وغیرہ کا حکم

سوال:- کیا تعزیہ بنانا جائز ہے؟ اس کی کیا وعیدیں ہیں؟

جواب:- تعزیہ بنانا بدعت ہے، اور اس میں کئی قسم کے گناہ ہیں۔[2]

سوال:- سبیل کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے؟

جواب:- لوگوں کے لئے پانی کا انتظام کرنے کے واسطے راستوں پر سبیل لگانا بڑے ثواب کا کام ہے، لیکن اس ثواب کے کام کو صرف محرّم کے مہینے کے ساتھ خاص کرنا اور اس مہینے کے اندر سبیل لگانے کو زیادہ اَجر و ثواب کا موجب سمجھنا بدعت اور ناجائز ہے۔

سوال:- لوگ عام طور پر یہ کہتے ہیں کہ امام حسینؓ کو سات محرّم کے بعد پانی نہیں ملا تھا، کیا یہ صحیح ہے، یا انہیں آخر تک پانی میسر تھا؟

جواب:- سات تاریخ کے بعد حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو دریائے فرات سے پانی لانے سے روک دیا گیا تھا، یہ بات تاریخی روایات سے ثابت ہے۔[3]

سوال:- ایک صاحب نے زیرِ تعمیر تعزیہ کو موقع پاکر جلادیا، اس فعل پر آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب:- کسی شخص کو بُرائی سے روکنے کا یہ طریقہ دُرست نہیں، نرمی سے سمجھانا چاہئے، اگر وہ نہ مانیں تو ان کے حق میں دُعا کریں۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۱۷ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۹۷/۱۹ الف)

(۱،۲) تعزیہ سازی وغیرہ بدعاتِ محرّم سے متعلق مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: فتاویٰ رشیدیہ ص:۵۷، امداد الفتاویٰ ج:۵ ص:۲۸۶، ۲۸۷، امداد الاحکام ج:۱ ص:۱۸۱، ۱۸۹، فتاویٰ دارالعلوم دیوبند امداد المفتین ص:۱۵۴۔

(۳) تفصیل کے لئے دیکھئے: مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا رسالہ "شہیدِ کربلا" ص:۶۸۔ (محمد زبیر)

بعد نمازِ عشاء حلقہ بنا کر دُرود شریف پڑھنا اور مسجد میں چراغاں کرنے کا حکم

سوال ۱:- کچھ لوگ مسجد میں بعد نمازِ عشاء حلقہ بنا کر دُرود شریف پڑھتے ہیں، اور جمعرات کو شیرینی بھی تقسیم کرتے ہیں، مجوّزین کا اصرار ہے کہ حلقہ بنا کر دُرود شریف بآوازِ بلند پڑھنے کی اجازت ہونی چاہئے، اور وہ لوگ یہ بھی چاہتے ہیں کہ تہواروں کے ایام میں مسجد میں چراغاں بھی کرنا چاہئے۔ کیا یہ مذکورہ بالا مسائل ایسے ہیں جیسے مجوّزین کا خیال ہے؟

جواب ۱:- سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر دُرود و سلام بھیجنا بہت اجر و فضیلت کی چیز ہے، لیکن دُرود و سلام کو کسی ہیئت کے ساتھ مخصوص کر دینا یا کسی ایسی ہیئت کو زیادہ ثواب کا موجب سمجھنا جو صحابہ کرامؓ سے منقول نہیں اور جو شخص اس ہیئت کو اختیار نہ کرے اسے بُرا سمجھنا بدعت ہے، جس سے احتراز کرنا چاہئے، کبھی کبھی اجتماعی طور سے حلقہ بنا کر دُرود شریف پڑھنا اصلاً مباح ہے، لیکن چونکہ صحابہ کرامؓ سے یہ طریقہ منقول نہیں اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس میں ثواب زیادہ ہے، اور جو شخص اس طریقے سے دُرود شریف نہ پڑھے وہ قابلِ نکیر نہیں ہے۔ لہٰذا اگر اس اجتماعی صورت کو زیادہ ثواب سمجھ کر اختیار کیا جائے اور جو شخص اس ہیئت کو اختیار نہ کرے اسے بُرا سمجھا جائے تو یہ بدعت ہوگا، اور چونکہ آج کل اس اجتماعی ہیئت کو اسی نیت سے اختیار کیا جاتا ہے، اور سوال میں بھی اسی کی تصریح ہے، اس لئے اس طریقے کو ترک کرنا چاہئے۔[1]

شیرینی تقسیم کرنے کا بھی یہی حال ہے کہ اصلاً مباح ہے، لیکن اس کو کسی دن کے ساتھ مخصوص کر کے ثواب سمجھنا اور تارک پر نکیر کرنا بدعت ہے۔

سوال ۲:- بعد نمازِ عشاء حلقہ بنا کر دُرود شریف پڑھنا اور مسجد میں چراغاں کرنا کیسا ہے؟

جواب ۲:- مسجد میں چراغاں کرنا بلاشبہ اِسراف ہے، فقہاء نے صراحۃً اس سے منع فرمایا ہے۔[2]

فقط واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۱۴ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۵۱/۱۹ الف)

---

(۱) دیکھئے سابقہ ص:۱۱۴ کا حاشیہ نمبر۱۔ (۲) دیکھئے ص:۱۰۲ کا حاشیہ نمبر۱۔

۱:-تعزیہ کے بوسے کو حجرِ اسود کے بوسے پر قیاس کرنا

۲:-مختلف مقامات میں قمری تقویم مختلف ہونے کی بناء پر لیلۃ القدر ہر مقام پر اپنے مطلع کے لحاظ سے ہوتی ہے

سوال:- ابھی ابھی لکھنؤ سے آئے ہوئے ایک شیعہ عالم جناب ڈاکٹر کلبِ صادق صاحب کا خطاب سننے کا اتفاق ہوا، دورانِ خطاب انہوں نے تعزیہ، علَم، مزار اور اسی طرح دیگر مراسم کے جواز کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ:-

نماز اگر چہار دیواری والے کعبہ کی سمت منہ کر کے پڑھی جائے تو یہ بھی غیر خدا کی تعظیم ہوگئی؟ حجرِ اسود کو اگر بوسہ دیا جائے، قرآن مجید کی تعظیم وتوقیر ہو تو یہ بھی عینِ خدا نہیں ہیں، مگر ان کا ادب و احترام، بوسہ وتعظیم عین عبادت اور دین کا حصہ ہے، صرف اس لئے کہ ان کی نسبت خدا کے ساتھ ہے۔ اسی طرح اگر تعزیہ، علَم، ضریح اور اسی قبیل کی دُوسری چیزوں کا ادب و احترام کیا جاتا ہے تو یہ بھی اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت اور ان کے تعلق سے کیا جاتا ہے، تو پھر یہ شرک اور گناہ کیونکر ہوسکتا ہے؟ یہ بھی عینِ دین ہے اور عبادت ہے۔

ان کی اس توجیہ نے دین میں ایک اِشکال پیدا کردیا ہے، اس سلسلے میں آپ رہنمائی فرمائیں۔

دُوسری گزارش لیلۃ القدر کے حوالے سے ہے۔ پاکستان میں قمری تقویم کی رُو سے لیلۃ القدر کی رات دُوسری ہوگی، سعودی عرب میں دُوسری ہوگی اور یورپ وامریکہ میں یہ رات مختلف ہوگی، تو کیا سال میں مختلف لیلۃ القدر ہوسکتی ہیں؟ اس حوالے سے بھی اپنا نقطۂ نظر بیان فرمائیں۔

جواب:-

محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط ملا، لفافے پر میرا پتہ اور نام تھا، لیکن اندر خط جاوید الغامدی صاحب کے نام تھا، شاید آپ نے سوال دونوں کو بھیجا اور خطوط بدل گئے۔

بہرصورت! جواب درج ذیل ہے:-

تعزیہ، علَم اور ضریح کو بیت اللہ اور حجرِ اسود پر قیاس کرنا اس لئے بداہۃً غلط ہے کہ بیت اللہ کی طرف رُخ کرنے اور حجرِ اسود کی تقبیل کا حکم اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحۃً عطا فرمایا ہے، یہی وجہ ہے کہ کعبہ کے کسی اور پتھر کو چومنا جائز نہیں۔ تعزیہ، علَم اور ضریح کے بارے میں

کون سی نص ہے؟

بالفاظِ دیگر نماز میں رُخ کرنا یا بوسہ دینا اور کوئی تعظیمی عمل جو عبادت کے مشابہ ہو، انجام دینا اصلاً غیراللہ کے لئے حرام ہے، البتہ جہاں نصوص سے کسی غیراللہ کے لئے ثابت ہو، صرف اسی حد تک اجازت ہوگی۔ جہاں نص نہیں وہاں اصل حرمت کا حکم لوٹ آئے گا۔

لیلۃ القدر کی فضیلت ہر مقام پر اس کے اپنے مطلع کے لحاظ سے حاصل ہوتی ہے، لہٰذا الگ الگ راتوں میں اس فضیلت کا حصول ممکن ہے۔[1]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۲۰؍رمضان المبارک ۱۴۱۹ھ

(فتویٰ نمبر ۳۱/۳۴۶)

غیراللہ کے نام کی نذر و نیاز کا حکم

سوال:- قرآن میں اس بات کی صراحت ہے کہ اگر کسی چیز پر اللہ کے علاوہ کسی کا نام لے لیا جائے تو وہ حرام ہوجائے گی، لیکن مسلمان نذر و نیاز کی مٹھائیاں اور کھانے متبرک سمجھ کر استعمال کرتے ہیں، کیا یہ خلافِ قرآن نہیں؟

جواب:- وہ نذر و نیاز جو غیراللہ کے نام پر ہو، واقعتاً قرآنِ کریم کے خلاف ہے۔[2]

واللہ اعلم

۱۴۲۲/۸/۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰/۵۰۵)

پندرہ شعبان یا معراج کے موقع پر مسجد میں چراغاں کا حکم

سوال ۱:- پندرہ شعبان کے دوران یا معراج کے موقع پر مساجد پر چراغاں کرنے کا کیا حکم ہے؟

۲:- بعض مساجد میں پندرہ شعبان یا معراج کے موقع پر کمیٹی چراغاں نہیں کرتی ہے، بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ کوئی شخص اگر انفرادی طور پر چراغاں کردے تو ہمیں اعتراض نہیں ہے، کیا ایسا چراغاں کرنا جائز ہے؟

جواب ۱:- جتنی روشنی کی مسجد میں فی الواقعہ ضرورت ہے، اس سے زائد چراغاں کرنا دُرست نہیں۔

۲:- کوئی شخص اگر اپنے مال سے چراغاں کرادے تو اس سے مسجد کا مال غیر مصرف میں خرچ

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے امداد الفتاویٰ ج:۶ ص:۱۲۹ (طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی)۔ تفسیر معارف القرآن ج:۸ ص:۷۹۴ (سورۃ القدر)۔

(۲) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۱۰۷ حاشیہ نمبر۴۔

کرنے کا گناہ تو نہ ہوگا، لیکن اِسراف اور تشبہ بالکفار کا گناہ پھر بھی ہوگا، لہٰذا یہ ناجائز ہے۔[1]

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۸/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۸۸۶ ج)

ختمِ گیارھویں اور کونڈے کا حکم

سوال:- ختمِ گیارھویں اور کونڈے کا کیا حکم ہے؟ اور مُردوں کو ایصالِ ثواب کے لئے کیا کیا جائے؟

جواب:- گیارھویں اور کونڈے وغیرہ کا شرعاً کوئی ثبوت نہیں، یہ بدعتیں ہیں جن کا اصل شرع میں وجود نہیں، ان میں شرکت نہیں کرنی چاہئے۔ مُردوں کو ایصالِ ثواب کی نیت سے صدقہ، خیرات ہر وقت کیا جاسکتا ہے۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۲/۲۵ھ

الجواب صحیح
محمد رفیع عثمانی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۹۳/۲۲ الف)

***

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۱۰۲ حاشیہ نمبر۱۔

﴿کتاب العلم والتاریخ والطب﴾

(علم، تاریخ اور طب کے متفرق مسائل کا بیان)

﴿فصل فی المتفرقات﴾

(علم، تاریخ اور طب کے متعلق متفرق مسائل کا بیان)

کیا کنعان حضرت نوح علیہ السلام کا حقیقی بیٹا تھا؟

سوال:- کنعان نام فرزند حقیقی حضرت نوح بود یا غیر حقیقی؟

جواب:- پسر حضرت نوح کہ در طوفان غرق شدہ بود اسم او بعض مؤرخین کنعان گفتہ اند۔ حافظ ابنِ کثیرؒ در تاریخ خود می نویسد: وهٰذا الابن هو يام أخو سام وحام ويافث، وقيل: اسمه كنعان، وكان كافرا عمل عملاً غير صالح. (البداية والنهاية جلد اوّل ص:۱۱۳)۔[1] وایں پسر بود چنانکہ ظاہر آیت دلالت می کند "وَنَادٰى نُوْحُ ابْنَهٗ"[2] البتہ کنعانے دیگر پسر حام پسر نوح علیہ السلام بود، ومسکنِ او در شام باسم کنعان مشہور گشت۔ (کما فی الکامل لابن اثیرؒ، ج:۱ ص:۲۸)۔[3]

واللہ اعلم

۱۳۸۸/۲/۲۸ھ

(فتویٰ نمبر ۳۲۶/۱۹ الف)

"اجماع اور بابِ اجتہاد" نامی کتاب کا حکم، نیز اجماع کی حقیقت کیا ہے؟

سوال:- اسلام میں اجتہاد کا "دستوری ضابطہ" اور ائمۂ اربعہ کے اجتہاد کی "دستوری پوزیشن" محترم مفتی محمد شفیع صاحبؒ قرآنی آیت النساء (۱۱۵:۴) اور حدیث: "لا تجتمع ...." کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اجماع کا حق بحیثیت مجموعی ساری اُمتِ مسلمہ کو حاصل ہے نہ کہ اُمت کے کسی خاص طبقے یا گروہ کو۔

---

(۱) البداية والنهاية قصة نوح عليه السلام ج:۱ ص:۱۲۰ (طبع دار الفكر بيروت).

(۲) سورة هود: ۴۲

(۳) وفي التاريخ الكامل لابن اثيرؒ ج:۱ ص:۲۸ (طبع قديم) واما الحام فولد له كوش ومصرايم وقوط وكنعان .... واما الكنعانيون فلحق بعضهم بالشام .... الخ.

استدلال کے طور پر اس اَمر کو تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ خواہ مسئلہ زیرِ بحث کوئی بھی ہو، اگر اُمت کا سوادِ اعظم فقہاء کے اجماع کا مخالف ہو تو کوئی اجماع اصطلاحی معنوں میں پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا، لیکن یہ امکان ساری اسلامی تاریخ میں کبھی وقوع پذیر نہیں ہوا، بلکہ عملاً اس کا وقوع ناممکن بھی ہے، کیونکہ اجماع ایک اسلامی فن اور فقہی عمل ہے جس کے لئے اُمتِ مسلمہ کو ہمیشہ ان اہلِ علم پر اعتماد کرنا ہوگا جو اس شعبے میں ضروری قابلیت اور اختصاصی مہارت رکھتے ہیں۔

''اجماع اور بابِ اجتہاد'' (مصنف کمال فاروقی، ترجمہ مظہر الدین صدیقی صفحہ:۱۵) اس تفسیر کے تجزیے سے مندرجہ ذیل نتائج نکلتے ہیں:-

۱:- اُصولی طور پر اجماع کا حق تمام اُمتِ مسلمہ کو حاصل ہے، نہ کسی خاص طبقہ یا گروہ کو۔

۲:- لیکن چونکہ اجماع ایک فنی (Technical) اور فقہی عمل ہے۔ لہٰذا اس عمل کو مسلم معاشرے کا صرف فقہی اور عالم طبقہ ہی انجام دے سکتا ہے جو قرآن وسنت اور دیگر مآخذ سے فقہی اور قانونی تعبیرات اخذ کرنے کا ماہر ہے۔

۳:- چونکہ مسلم معاشرہ بحیثیت مجموعی نہ اس فن کا ماہر ہے، نہ یہ عمل انجام دے سکتا ہے، لہٰذا اُمتِ مسلمہ نے قانون سازی کا یہ حق وفرض طبقۂ علماء وفقہاء کو ''تفویض'' کردیا ہے۔

اس ''طبقۂ ماہرین'' کے انتخاب یا نامزدگی کا کوئی خصوصی طریقہ مسلم معاشرے میں متعین اور مروّج نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ خلافتِ راشدہ کے دور کے نظائر ایک مثال ضرور بن سکتے ہیں، لیکن حجت نہیں۔

۴:- لہٰذا طبقۂ علماء وفقہاء کی تعبیرات اور اجماع پر مسلم معاشرے کا اجماع ناگزیر (منطقی طور پر) اور واجب ہے۔

۵:- لیکن اس کے باوجود بھی اگر بالفرض اُمت کا سوادِ اعظم، فقہاء کے اجماع کا مخالف ہو تو کوئی اجماع اصطلاحی معنوں میں پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔

۶:- اسی طرح بالفرض اُمت کا سوادِ اعظم طبقۂ علماء وفقہاء کے برخلاف (یعنی علماء کے اجماع کے برخلاف) کسی تعبیر یا فیصلے پر متفق ہوجاتا ہے جسے علماء فقہاء کی تائید حاصل نہ ہو تو یہ اجماع بھی منعقد اور مکمل نہیں ہوگا، اور دونوں صورتوں میں نمبر ۵ اور ۶ میں چونکہ اجماع منعقد یا مکمل نہیں ہوگا، لہٰذا حجت نہیں ہوگا۔

۷:- لہٰذا نمبر ۵ اور ۶ کے تجزیے سے یہ ظاہر ہوا کہ طبقۂ علماء وفقہاء اور اُمتِ مسلمہ دونوں کو ''قوتِ تنفیذ'' حاصل ہے، یعنی انہیں اپنے فیصلے کے نفاذ کا حق بھی حاصل ہونا ضروری ہے۔

(اگر چہ یہ حق صرف اسی صورت میں حاصل ہوسکتا ہے جبکہ دونوں طبقے علماء اور سوادِ اعظم متفق ہوں)۔

اور دونوں طبقوں کی حیثیت مشاورتی کونسل کی ہرگز نہیں ہے جس کے فیصلے کو قبول یا مسترد کرنے کا اختیار ایک تیسرے اور حکمران طبقے کو حاصل ہو، جسے نہ اُمت نے منتخب کیا ہو، اور نہ نامزد کیا ہو، بلکہ صرف اس کے سیاسی غلبے کی وجہ سے مجبوراً قبول کیا ہو۔

۸:- لہٰذا قرآن وسنت کی دستوری تعبیر اور دستوری اجماع وہ ہوا جو اس وقت منعقد ہو جبکہ:-

۱:- اُمتِ مسلمہ کا منتخب یا نامزد طبقۂ علماء وفقہاء موجود ہو جس کی تعبیر اور رائے کو اُمت کی تائید سے قوتِ نافذہ بھی حاصل ہو (جیسی کہ موجودہ لیجسلیٹو کو حاصل ہوتی ہے)۔

۲:- اُمتِ مسلمہ کو طبقۂ علماء وفقہاء کے اجماع کو قبول یا مسترد کرنے اور قبول کرنے کی صورت میں اس قبول شدہ اجماع کو نافذ کرنے کی قوت بھی حاصل ہو۔

۳:- یعنی کسی حکمران کو یہ حق حاصل نہیں کہ اپنی یا کسی فردِ واحد کی (خواہ وہ امام ہی کیوں نہ ہو) یا کسی گروہِ فقہ کی رائے اور تعبیر کو اُمت کی مرضی کے خلاف اس پر نافذ کردے۔

۴:- لہٰذا دستوری اجماع وہی ہوگا جس میں مندرجہ بالا دونوں شرائط (نمبر۱،۲) پائی جائیں، جس کی بہترین مثال خلافتِ راشدہ کے دور کے فیصلوں اور تعبیرات کی ہیں جن میں مندرجہ بالا دونوں شرائط پائی جاتی ہیں، اب ایک ایسے دور میں (مثلاً بنی اُمیہ اور بنی عباس کا دور اور پاکستان کا موجودہ دور بھی اس سے مختلف نہیں) جبکہ:-

الف ۱:- اُمت کی مرضی کے خلاف اور اسلام کے سیاسی نظام کے قطعی طور پر خلاف، محض غلبہ اور طاقت کی بناء پر ایک فرد، خاندان یا جماعت، ملک کے سیاسی نظام پر مکمل طور پر مسلط ہوچکی ہو۔ (یہاں مستفتی نے ایک حاشیہ بھی تحریر کیا ہے جو نیچے ملاحظہ فرمائیں۔ محمد زبیر عفی عنہ)۔[1]

---

(۱) جیسا کہ امام مالکؒ نے خلیفہ منصور کی اس رائے کو مسترد کردیا تھا کہ تمام عالم اسلام کو امام کی کتاب پر جمع کردیا جائے، کیونکہ ظاہر ہے کہ یہ جمع کرنا خلیفہ کی سیاسی قوت کی بناء پر ہوتا جو اُمت کے حق میں قبول ومسترد کو سلب کرتا ہوتا جسے امامؒ نے پسند نہیں کیا۔ امام صاحبؒ نے علماء وفقہاء کی ایک جماعت کے تعاون سے اور دیگر ائمہ نے انفرادی اجتہاد سے قرآن وسنت کی جو فقہی تعبیرات اور فیصلے کئے ہیں ان کی پوزیشن یہی ہے کہ یہ ایک جماعت کا یا فردِ واحد کا ذاتی اجتہاد ہے، اُمت کے منتخب شدہ یا نامزد شدہ طبقۂ علماء کا اجتہاد نہیں اس پر پوری اُمتِ مسلمہ نے بلکہ اُمت کے ایک بڑے گروپ اہلِ سنت والجماعت نے بلکہ اہلِ سنت کے مختصر گروہوں نے اجماع کیا ہے، اس سلسلے میں اہلِ سنت میں حنفی اکثریت میں ہیں اور مالکی، شافعی، حنبلی اقلیت میں۔

(۲) واضح رہے کہ یہاں سوال غلط یا صحیح اجتہاد کا قطعی نہیں ہے، دستوری وغیر دستوری کا ہے۔ یہ اجتہادات وتعبیرات قرآن وسنت اور دیگر اُصولِ فقہیہ کے عین مطابق اور بالکل صحیح ہیں، اور اگر اسلام کا سیاسی نظام قائم ہوتا تب بھی اسی اجتہاد اور اسی تعبیر کو اُمت اسی طرح قبول کرتی جس طرح اب ہے، لیکن کسی چیز کا صحیح یا غلط ہونا اور چیز ہے، اور دستوری وغیر دستوری ہونا دوسری چیز۔ یہاں بھی سوال دستوری وغیر دستوری کا ہے۔

۲:- طبقۂ فقہاء وعلماء موجود ہی نہ ہو یا اگر موجود ہو بھی تو:-

۱:- امامت کا منتخب شدہ یا نامزد شدہ نہ ہو۔

۲:- اگر اپنی علمی حیثیت اور سیرت وکردار کی بناء پر اُمت میں ایک مقام بھی رکھتا ہو تب بھی اس کے فیصلوں اور تعبیرات کو نفاذ کی قوت حاصل نہ ہو۔

۳:- یا حکمران جماعت و خاندان کی حیثیت زیادہ ہو اور اس کی حیثیت صرف مشاورتی کونسل کی ہو، جس کے فیصلوں اور تعبیرات کو قبول اور مسترد کرنے کا اختیار حکمران، فرد یا خاندان کو حاصل ہو۔

۴:- اور اُمتِ مسلمہ کو کسی فیصلے یا اجماع کے قبول و مسترد کرنے اور نافذ کرنے کی قوت حاصل نہ ہو۔

ب:- مندرجہ بالا صورت میں علماء وفقہاء کی ایک جماعت (جس کی علمی حیثیت اور سیرت و کردار کی بلندی مُسلّم ہونے کے باوجود اُمت کے، غیر منتخب شدہ یا غیر نامزد شدہ ہے) یا فردِ واحد، ذاتی طور پر اجتہاد کرتا ہے اور اس کے اجتہاد پر سوادِ اعظم یا سوادِ اعظم کا مختصر گروہ جمع ہو جاتا ہے۔

ج:- تو کیا یہ اجماع، اسلام کے سیاسی نظام کے دستوری ضابطے کے لحاظ سے (جس کی مثال خلافت علیٰ منہاج النبوۃ یعنی خلافتِ راشدہ ہے) دستوری ہے؟ (یعنی اس میں نکتہ نمبر ۸ کی دونوں شرائط نمبر ۱ و ۲ پائی جاتی ہیں؟)

د:- اگر یہ دستوری نہیں تو اس کی حیثیت عبوری ہے، اور جب اسلام کا سیاسی نظام خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کی بنیاد پر قائم ہوگا (جس میں وہ دونوں شرائط پائی جاتی ہیں جو نکتہ نمبر ۸ میں بیان ہوئے ہیں) تو اس تعبیر اور اجتہاد کو اُمتِ مسلمہ اور طبقۂ علماء وفقہاء باضابطہ طور پر اختیار کرے گا تو ان کی حیثیت دستوری لحاظ سے مُسلّم ہو جائے گی۔ ان شاء اللہ

ر:- لیکن اگر نکات الف، ب، ج، د، اور نکتہ نمبر ۸ کے تمام نکات غلط ہیں یا اسلام کے سیاسی نظام کے لئے ضروری نہیں ہیں تو:-

۱:- گویا اسلام میں اجماع اور اجتہاد کا کوئی دستوری ضابطہ متعین نہیں ہے، اور

۲:- ہر وہ اجتہاد، اجماع حاصل کر لیتا ہے جس پر اُمت کا کوئی گروہ جمع ہو جائے۔

۳:- اجماع اور اجتہاد کے لئے علماء فقہاء اور اُمت کی قوتِ تنفیذ ضروری نہیں ہے۔

۴:- مسلم معاشرے میں اجماع اور اجتہاد کی تاریخ اور قرآن وسنت کی فقہی تعبیرات کی تاریخ یہ ہے کہ ہر اجتہاد اور تعبیر علماء وفقہاء کا ذاتی اجتہاد ہے، جس پر بعد میں اُمت کا ایک گروہ یا طبقہ جمع

ہوجاتا ہے۔ کیا مندرجہ بالا تجزیہ دُرست ہے؟

جواب:- السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سب سے پہلے تو میں اس مکتوب کے جواب پر تاخیر کے لئے آپ سے تہِ دِل سے معذرت خواہ ہوں، لیکن میں جن مصروفیات میں ہمہ وقت گرفتار رہتا ہوں اگر آپ انہیں بچشمِ خود دیکھتے تو یقیناً معذور قرار دیتے۔

آپ نے جو سوالات اُٹھائے ہیں وہ تشریح کے لئے کافی تفصیل چاہتے ہیں، تاہم چند نکات عرض کرتا ہوں، خدا کرے کہ وہ آپ کے کسی کام آسکیں۔

۱:- ''اجماع اور بابِ اجتہاد'' نامی کتاب جو کمال فاروقی صاحب کی تصنیف ہے، کوئی معتبر کتاب نہیں ہے، اور اس کتاب میں احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نقطۂ نظر بیان کرنے میں بھی احتیاط سے کام نہیں لیا گیا، لہٰذا حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کوئی بات نقل کرنے کے لئے اس کا حوالہ مستند نہیں ہے۔

۲:- ''اجماع'' کے بارے میں اکثر مستند فقہاء کا موقف یہ ہے کہ وہ صرف ''کسی زمانے کے تمام اہلِ اجتہاد علماء کے کسی شرعی مسئلے پر متفق ہوجانے'' کو کہتے ہیں، یعنی اجماع دراصل صرف اہلِ اجتہاد علماء کے اتفاق کا نام ہے، عوام کا اختلاف واتفاق اس میں معتبر نہیں، چنانچہ صدرالشریعہؒ اور علامہ تفتازانیؒ لکھتے ہیں:-

وفی الاصطلاح اتفاق المجتھدین من أمة محمد علیه الصلوٰة والسلام فی عصر علٰی حکم شرعی .... وقید بالمجتھدین، اذ لا عبرة باتفاق العوام ۔ (ملاحظہ ہو: التلویح مع التوضیح ج:۲ ص:۴۱ طبع مصر)۔[1] ''اجماع اصطلاحی طور پر اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا السلام کے مجتہدین کے کسی ایک زمانے میں کسی شرعی حکم پر متفق ہوجانے کا نام ہے۔ اور اس تعریف میں مجتہدین کی قید اس لئے لگائی گئی ہے کہ عوام کے متفق ہوجانے کا کوئی اعتبار نہیں۔''

البتہ جن حضرات نے اجماع کی تعریف میں ''اہلِ اجتہاد'' کی قید نہیں لگائی جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ عام مسلمانوں کی رائے بھی اجماع میں مؤثر ہے، سو درحقیقت اس کی وجہ یہ ہے کہ عوام کا فریضہ بھی یہ ہے کہ وہ مجتہدینِ اُمت کی پیروی کریں، اور عملاً ہوتا بھی یہ ہے کہ جب مجتہدین کا کسی مسئلے پر اتفاق ہوجاتا ہے تو وہ انہی کے قول پر عمل کرتے ہیں۔ چنانچہ تاریخِ اسلام میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ عام مسلمانوں نے مجتہدینِ اُمت کے کسی فیصلے سے اختلاف کیا ہو، لہٰذا جب مجتہدین کسی مسئلے پر

---

(۱) توضیح تلویح ص:۴۹۴ (طبع نور محمد کتب خانہ کراچی)۔

اتفاق کرتے ہیں تو اُمت کے تمام افراد کا اتفاق خود بخود ہی ہوجاتا ہے۔ لہٰذا عملی اعتبار سے اسے ”تمام مسلمانوں کا اجماع“ بھی کہہ سکتے ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ غیر اہلِ اجتہاد کو مجتہدین کے اجماع کے خلاف کوئی راستہ اختیار کرنے کا حق حاصل ہے۔

۳:- ”مجتہدینِ اُمت“ کی تعیین تاریخِ اسلام میں کبھی بھی یہاں تک کہ خلافتِ راشدہ کے دور میں بھی ”انتخاب“ اور ”نامزدگی“ کے مروّجہ طریقوں سے نہیں ہوئی، بلکہ قبولیتِ عام سے اس کا فیصلہ ہوا ہے، جس طرح قدیم زمانے میں طبیب کے طبیب ہونے کے لئے کسی انتخاب یا نامزدگی کی ضرورت نہ تھی بلکہ قبولِ عام کی بنیاد پر اس کا فیصلہ ہوتا تھا، اسی طرح کسی کے مجتہد ہونے کا فیصلہ بھی اسی بنیاد پر کیا جاتا تھا اور اس میں کوئی عملی دُشواری نہ تھی۔ چنانچہ اگر کسی مسئلے میں کسی بھی عالم کا کوئی اختلاف نہیں تب تو اجماع کا تحقق ثابت ہوگیا، اور اگر کسی کا اختلاف ہے تو صرف اس کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا ہوتا تھا کہ یہ شخص اہلِ اجتہاد ہے یا نہیں؟ اور دُوسرے مجتہدین کی اکثریت کا فیصلہ اس بارے میں کافی تھا۔

مندرجہ بالا نکات ذہن میں آجائیں تو اس سے آپ کے بیشتر سوالات کا جواب خود بخود نکل آتا ہے، کیونکہ وہ اس تصوّر پر مبنی ہیں کہ اہلِ اجتہاد کے اجماع کے خلاف عام مسلمانوں کی رائے بھی مؤثر اور معتبر ہے، جس کی تردید نکتہ نمبر۲ میں احقر کرچکا ہے۔ ان تین نکات کی بنیاد پر اگر کوئی خلش باقی ہو تو وہ دوبارہ لکھ کر معلوم فرمالیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۱۷ھ

(فتویٰ نمبر ۶۴۵/۲۸ ب)

کیا روزے کی حکمت وہی ہے جو نماز کی ہے؟

سوال:- مندرجہ ذیل الفاظ ایک مضمون کے ہیں جو ”سیرت و کردار کے سانچے“ کے عنوان سے روزنامہ حریت مؤرخہ ۲ر دسمبر ۱۹۶۷ء کے صفحہ نمبر۳ پر شائع ہوا ہے:-

”زکوٰۃ اور حج کی طرح روزہ ایک مستقل جداگانہ نوعیت رکھنے والا ”رُکن“ نہیں ہے بلکہ دراصل اس کا مزاج قریب قریب وہی ہے جو رُکن صلوٰۃ کا ہے، اور اسے رُکن صلوٰۃ کے مددگار اور معاون ہی کی حیثیت سے لگایا گیا ہے، اس کا کام انہی اثرات کو زیادہ تیز اور زیادہ مستحکم کرنا ہے جو نماز سے انسانی زندگی پر مرتب ہوتے ہیں۔ نماز، روزہ کا معمول ”نظامِ تربیت“ ہے، نماز کا معمول تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے آدمی کو اپنے اثر میں لیتا ہے اور تعلیم و تربیت کی ہلکی خوراکیں دے کر چھوڑ دیتا ہے،

اور روزہ سال بھر میں ایک مہینے کا غیر معمولی نظامِ تربیت ہے جو آدمی کو تقریباً ۷۲ گھنٹے تک اپنے مضبوط ڈسپلن کے شکنجے میں کسا ہوا رکھتا ہے تاکہ روزانہ کی معمولی تربیت میں جو اثرات تھے وہ شدید ہو جائیں۔''

اس کے بعد ''روزے کے اثرات'' کے عنوان سے نیا پیراگراف شروع ہوتا ہے۔

اپنی طرف سے کچھ مفہوم کے متعلق تحریر کرنا بددیانتی سمجھتا ہوں، لیکن چونکہ جواب میں تحریر فرمایا گیا ہے کہ عبارت کا مفہوم مجمل ہے، لہٰذا کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ عبارت کا ابتدائی جملہ ''نہیں ہے'' کے ساتھ ختم ہوکر روزہ کے مستقل جداگانہ نوعیت کے رُکن کی نفی مطلق کرتا ہے۔ پھر معلوم ہوتا ہے کہ عوام کی اس غلط فہمی کا سبب بیان کیا جارہا ہے کہ مستقل رُکن روزہ کو اس لئے سمجھا گیا ہے کہ اس کا مزاج ایک مستقل رُکن کا سا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اسے رُکن صلوٰۃ کے مددگار اور معاون ہی کی حیثیت سے لگادیا گیا ہے۔ لفظ ''ہی'' روزہ کی حیثیت کو محدود ومعین کرتا ہے۔ عبارت کا باقی حصہ اس ''محدود حیثیت'' کے ثبوت میں پیش کیا گیا ہے۔ بہرحال ابتداء میں نفی قطعی اور اس کے بعد وضاحت میں ''ہی'' کا لفظ کم از کم یہی ظاہر کرتا ہے۔

جواب:- مذکورہ عبارت میں نماز اور روزے کی حکمت بیان کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ روزے کی حکمت قریب قریب وہی ہے جو نماز کی تھی، اس کے ذریعہ بھی انسان کو تربیت دینا مقصود ہے، یہ بات اگرچہ فی نفسہٖ محلِ نظر ہے کہ روزے کو حکمت کے لحاظ سے نماز کا تتمہ قرار دیا جائے، حقیقت یہی ہے کہ روزہ بالکل مستقل حیثیت رکھتا ہے اور اس کی حکمتیں بھی مستقل ہیں۔[1] اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ نماز اور روزہ دونوں بندگی کے مظاہر ہیں، سو اس اعتبار سے تمام عبادات ایک جیسی ہیں، اس لئے اس عبارت میں کوئی معقولیت نظر نہیں آتی، لیکن چونکہ اس میں تشریحی طور پر روزے کے مستقل رُکن ہونے کا انکار نہیں کیا گیا اس لئے اس پر وہ اَحکام جاری نہ ہوں گے جو مستقل رُکن کے انکار سے جاری ہوسکتے ہیں۔

فقط واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۱۴ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی بلندشہری

(فتویٰ نمبر ۱۴۲۲/۱۱۸ الف)

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے: حکیم الاُمت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانویؒ کی کتاب ''احکام اسلام عقل کی نظر میں'' ص:۱۴۳ (طبع کتب خانہ جمیلی لاہور)۔

بعض شرعی اَحکام کی مصلحتیں

(غیر مسلموں کی جانب سے چند اعتراضات کا جواب درکار ہے، اُمید ہے کہ آپ جواب ارسال فرماکر عنداللہ ماجور ہوں گے)

سوال ۱:- اسلام میں کثیر الازدواجی (Poly Gamy) کی اجازت کیوں ہے؟ اور Poly Andry کیوں ممنوع ہے؟ اگر اولاد کی شناخت کا مسئلہ ہے تو یہ خون کے ایک سادہ سے ٹیسٹ سے حل ہوجاتا ہے۔ عورتیں چار شادی کا مطالبہ کریں تو کیا دلائل ہیں؟

۲:- اسلام میں خنزیر کیوں حرام ہے؟ اس کی اخلاقی وطبّی وجوہ ارشاد فرمائیں، اور یہ ثابت فرمایئے کہ اس کا گوشت کیوں مضر ہے؟

۳:- اسلام سے پہلے شراب پی جاتی تھی، یہ کیوں ممنوع نہ تھی؟

۴:- اگر کوئی اپنی بیوی کو غصّے، غلط فہمی یا شدید مجبوری کی حالت میں طلاق دے دے اور دوبارہ اس سے شادی کرنا چاہے تو مرد کی اس غلطی کی سزا اس بیچاری بے گناہ مظلومہ عورت کو حلالہ کی صورت میں کیوں دی جاتی ہے؟ کرے کوئی، بھرے کوئی!

۵:- اسلام میں (معاذ اللہ) عورت کو کم تر مخلوق کیوں تصوّر کیا جاتا ہے؟ مثلاً: جائیداد میں آدھا حصہ، آدھی گواہی، عقیقے میں آدھی قربانی، طلاق کا حق نہ ہونا، اگر خلع لینا ہو تو اپنے حق مہر سے دستبردار ہونا پڑے، وغیرہ وغیرہ۔

جواب:- آپ کے سوالات کے جواب سے پہلے دو اُصولی باتیں عرض کرتا ہوں۔

غیر مسلموں سے گفتگو

۱:- غیر مسلموں سے جب کبھی اسلام کے بارے میں گفتگو کی نوبت آئے تو گفتگو ہمیشہ اُصولِ اسلام پر ہونی چاہئے، جزوی اَحکام پر نہیں، کیونکہ تمام جزوی اَحکام دراصل اُصولوں پر مبنی ہیں۔ جب تک انسان ان اُصولوں کا قائل نہ ہو، جزوی اَحکام کی حکمتیں ٹھیک ٹھیک سمجھ میں نہیں آسکتیں، اور ایک کے بعد دُوسرے حکم پر اعتراض کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔

ہر حکم کی مصلحت سمجھ میں آنا ضروری نہیں

۲:- اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم حکمتوں سے خالی نہیں ہے، لیکن ضروری نہیں ہے کہ ہر حکم کی مصلحت کلی طور انسان کی سمجھ میں آجائے۔ اگر ہر حکم کی مصلحت انسان کی سمجھ میں آجاتی تو اللہ تعالیٰ کو وحی کے

ذریعے اَحکام عطا فرمانے کی ضرورت نہ تھی، صرف اتنا کہہ دیا جاتا کہ مصلحت اور حکمت کے مطابق عقل سے کام لے کر عمل کرو۔ شریعت کے اَحکام تو آتے ہی عموماً اس جگہ پر ہیں جہاں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر اس معاملے کو صرف انسانی عقل کے حوالے کیا گیا تو وہاں ٹھوکر کھائے گا۔ لہٰذا اگر کسی حکم کی پوری مصلحت سمجھ میں نہ آئے تو اس حکم سے انکار نہیں کیا جائے گا۔ دیکھئے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ اپنے بیٹے کو ذبح کردو، بظاہر اس حکم میں کوئی مصلحت نہ تھی، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مصلحت نہیں پوچھی، فوراً عمل کرنے پر تیار ہوگئے۔ جب اللہ تعالیٰ کو حکیمِ مطلق اور اپنا پروردگار مان لیا تو اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اس کے ہر حکم کو بجالائے اور حکمت و مصلحت کا مطالبہ نہ کیا جائے۔

اگر آپ ایک ملازم رکھیں اور جب آپ اسے کسی کام کا حکم دیں تو وہ پہلے آپ سے اس کی مصلحت بتانے کا مطالبہ کرے، تو کیا وہ ملازم وفادار سمجھا جائے گا یا برطرف کرنے کا مستحق ہوگا؟ جب ایک ملازم کا یہ حال ہے تو بندے کا معاملہ اپنے مالک کے ساتھ خود سوچ لیجئے۔

لہٰذا اصل تو یہ ہے کہ شرعی اَحکام کی مصلحتوں کے زیادہ درپے ہونا نہیں چاہئے، تاہم بہت سے شرعی اَحکام کی کچھ مصلحتیں انسان کو سمجھ میں آجاتی ہیں۔ حضرت مولانا تھانویؒ کی کتاب ''اَحکامِ اسلام عقل کی نظر میں'' انہی مصلحتوں کو بیان کرنے کے لئے لکھی گئی ہے، کبھی اس کا مطالعہ فرمالیں۔

اس تمہید کے بعد آپ کے سوالات کا مختصر جواب حاضر ہے۔

۱:- مردوں کو چار شادیوں کی اجازت کیوں؟

یہ ایک حیاتیاتی حقیقت ہے کہ اگر ایک مرد چار عورتوں کے پاس جائے تو چاروں کو حاملہ بناسکتا ہے، لیکن ایک عورت چار مردوں کے پاس جائے تو وہ ایک ہی سے حاملہ ہوگی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ فطرت کے لحاظ سے عورت یک زوجی کے لئے پیدا کی گئی ہے نہ کہ مرد، اس کے علاوہ مرد پر ایسا کوئی زمانہ معمولاً نہیں آتا جب وہ جنسی تعلق کے قابل نہ ہو، لیکن عورت پر حیض و نفاس اور حمل کے ایام میں ایسے دور باقاعدہ آتے ہیں جب وہ جنسی تعلق کے قابل نہیں ہوتی، لہٰذا مرد کو جنسی تسکین کے لئے زیادہ کی ضرورت ہوسکتی ہے، عورت کو اس کی ضرورت نہیں۔

۲:- خنزیر کیوں حرام ہے؟

خنزیر کے طبی نقصانات سینکڑوں اطباء اور ڈاکٹروں نے بیان کئے ہیں، اور اخلاقی نقصان یہ ہے کہ اس سے قوتِ بہیمیہ میں اضافہ ہوتا ہے، جس کا مشاہدہ آپ دن رات مغرب میں کرتے ہیں۔

۳:- شراب ایک دم سے کیوں حرام نہیں ہوئی؟

اسلام کے اَحکام بتدریج آئے ہیں، ایک دم سارے اَحکام آجاتے تو عمل مشکل ہوتا، اس لئے رفتہ رفتہ کر کے بُری عادتیں چھڑائی گئیں۔

۴:- حلالہ کیوں؟

یہ خیال غلط ہے کہ "حلالہ" کوئی تدبیر ہے جس پر عورت کو مجبور کیا جارہا ہے۔ اصل یہ ہے کہ جس شخص نے اللہ کی مقرّر کی ہوئی تمام حدود کو پامال کر کے تینوں طلاقیں دے دیں، وہ اب اس لائق نہیں کہ ایک شریف عورت اس کے پاس رہے۔ لہٰذا حکم یہ ہے کہ اب اس سے نکاح نہ کرو، کوئی اور شوہر تلاش کرو۔ ہاں! اگر اس شوہر سے بھی نباہ نہ ہو اور وہ ازخود طلاق دیدے تو اس صورت میں اُمید ہے کہ پہلا شوہر کچھ سبق حاصل کر چکا ہوگا۔ اس لئے اگر اب اس سے نکاح کرنے پر بیوی رضامند ہو تو اس کی اجازت دے دی گئی ہے۔ اور یہ جو محض حیلے کے طور پر حلالہ کیا جاتا ہے، وہ شریعت کے منشاء کے خلاف ہے۔

۵:- کیا عورت کم تر مخلوق ہے؟

عورت ہرگز کم تر مخلوق نہیں، البتہ مرد کے مقابلے میں کمزور ضرور ہے جیسا کہ مشاہدہ ہے، اس لئے کسبِ معاش کی ذمہ داری اس پر نہیں ڈالی گئی۔ اس کی کمزوری اور بعض دُوسری نفسیات کے پیشِ نظر مرد کو اس کے کسبِ معاش کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے، اور جب وہ کسبِ معاش کی ذمہ دار نہیں تو جائیداد میں بھی اس کا حصہ آدھا اور کسبِ معاش کے ذمہ دار کا حصہ پورا ہے، (اسلام کے سوا کسی مذہب میں تو آدھا حصہ بھی نہیں ہے)۔

یہ تمام موضوعات تفصیل طلب ہیں اور ایک خط میں ساری بات کو سمیٹنا ممکن نہیں ہے، اس لئے آپ "مسلمان عورت" از مولانا ابوالکلام آزادؒ کا مطالعہ فرمالیں۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴۱۲/۵/۵ھ (۱)

اللہ تعالیٰ کے لئے لفظ "شخص" استعمال کرنے کا حکم اور کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلات طاہر تھے؟

سوال ۱:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین اس مسئلے کے بارے میں کہ خدا

(۱) یہ فتویٰ "البلاغ" کے شمارہ جمادی الثانیہ ۱۴۱۲ھ سے لیا گیا ہے۔ (از مرتب)

تعالیٰ کی ذات کو لفظ ''شخص'' سے پکارا جاسکتا ہے؟ کیونکہ پندرہ پارے کی ابتدائی آیات کا ترجمہ چند مترجم حضرات نے اس طرح کیا ہے کہ: ''پاک ہے اس شخص کو جو لے گیا اپنے بندے کو'' اس جگہ خدا کی پاک ذات کو ''شخص'' کہہ کر مخاطب فرمایا گیا ہے۔ برائے کرم صرفی ونحوی قاعدے کی رُو سے اور شرعی اعتبار سے اُجاگر فرمائیں کہ لفظ ''شخص'' صرف بنی آدم کے لئے ہی ہے یا خدا کی ذات اور ملائکہ وغیرہ کو بھی کہا جاسکتا ہے؟ نیز ''شخص'' کا لغوی اور اصطلاحی معنی بھی تحریر فرماکر ہماری رہنمائی فرمائیں۔ ایسی تحریر کا قرآنِ پاک ہمارے پاس موجود ہے، اگر لفظ ''شخص'' حضرت جبریلؑ کی طرف منسوب کیا جائے تو پھر اس میں قابلِ اعتراض بات یہ ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جبریلؑ کے بندے تو نہیں ہیں؟

۲:- زید، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلاتِ مبارکہ کے بارے میں کہتا ہے کہ یہ پاک نہیں ہیں، نیز یہ بھی کہتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پیشابِ مبارک آپ کی کسی خادمہ یا خادم نے نہیں پیا۔ وہ کہتا ہے کہ اگر یہ سچ ہے تو صحاحِ ستہ کی حدیث پیش کی جائے۔ برائے مہربانی تحریر کریں کہ زید کا قول صحیح ہے یا غلط ہے اور زید کے لئے کیا حکم ہے؟ کیا صحاحِ ستہ کے علاوہ باقی احادیثِ مبارکہ قابلِ اعتبار نہیں ہیں؟

جواب ا:- لفظ ''شخص'' کے لغوی معنی خواہ کچھ ہوں، لیکن عرفاً اس کا اطلاق انسانوں پر ہی ہوتا ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کے لئے اس لفظ کا استعمال دُرست نہیں، اس کے بجائے لفظ ''ذات'' استعمال کرنا چاہئے۔

۲:- اس مسئلے میں فقہاء ومحدثین میں اختلاف رہا ہے۔ ایک بڑی جماعت کے نزدیک راجح یہی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلات طاہر تھے، جس کے دلائل ان کے پاس موجود ہیں،(۱) لیکن اس مسئلے کی تحقیق پر نہ ایمان کا کوئی حصہ موقوف ہے اور نہ عملِ صالح کا، اس قسم کی بحثوں میں فضول پڑنا نہیں چاہئے، اس کے بجائے ایسے مسائل معلوم کیجئے جن کا تعلق عمل اور آخرت کی بھلائی سے ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۹/۹/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۱۸/۱۷/۳۰ د)

---

(۱) اس بارے میں تفصیلی بحث کے لئے درج ذیل کتب ملاحظہ فرمائیں:

۱:- الشفاء فی حقوق المصطفٰی صلی اللہ علیہ وسلم ج:۱ ص:۱۲۱ (علامہ قاضی عیاض مالکی رحمۃ اللہ علیہ).

۲:- شرح الشفاء مُلّا علی قاری رحمہ اللہ ج:۱ ص:۱۵۹. ۳:- الدر المختار ج:۱ ص:۳۱۸ مطلب فی طھارۃ بولہ صلی اللہ علیہ وسلم.

حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اب تک کتنا عرصہ گزر چکا ہے؟

سوال:- گزارش یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اب تک کتنا عرصہ گزر چکا ہے؟ اور یہ جو آثارِ قدیمہ والے بحث کرتے ہیں اور اس کے ثبوت کے طور پر وہ معلوم شدہ ڈھانچے سامنے لاتے ہیں، اس بارے میں آپ کی کیا تحقیق ہے؟ نیز جنات کب سے دُنیا میں قیام پذیر ہیں؟ احادیثِ مبارکہ میں ان کا کوئی ذکر ہے؟

جواب:- محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

قرآنِ کریم یا کسی صحیح حدیث سے یہ ثابت نہیں ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے اب تک کتنی مدت گزر چکی ہے؟ لہٰذا اس کی تحقیق میں پڑنا دینی اعتبار سے نہ ضروری ہے، نہ مفید۔ سائنسی نظریات جو مختلف جمادات و نباتات کی عمر کے بارے میں سامنے آتے رہتے ہیں، ان کی حیثیت محض اندازے کی ہے، یقین کی نہیں، اور جو ڈھانچے پُرانے ملے ہیں ان کی حقیقت اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں۔ اتنی بات بہرحال قرآنِ کریم سے ثابت ہے کہ اس زمین پر انسان سے پہلے جنات آباد تھے۔ بہرحال! ان تحقیقات پر کوئی دینی مسئلہ موقوف نہیں ہے، لہٰذا زیادہ فکر عملی مسائل کی کرنی چاہئے۔ [1]

واللہ اعلم

۱۴۰۹/۵/۲۳ھ

(فتویٰ نمبر ۴۰/۸۹۴ ج)

اُحد اور حراء سے متعلق دو واقعات کے زمانے کی تعیین اور کیا علامہ ابنِ تیمیہؒ حافظ مزیؒ کے شاگرد تھے؟

سوال:- اس خط سے پہلے میری آپ سے اگرچہ تحریری یا بالمشافہ ملاقات نہیں، لیکن آپ کی علمی تصانیف اور خصوصاً تکملۃ فتح الملہم اور درسِ ترمذی سے حدِ درجہ استفادہ کرنے کی بناء پر پہلے ہی سے ذہنی اور فکری طور پر آپ سے بہت قریب رہا ہوں، اگر میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ انہی بلند پایہ کتابوں کا مطالعہ کر کے میرے اندر حدیث شریف کا وہ ذوق پیدا ہوا جو آج میری اُمنگوں کو مہمیز لگا کر

---

(۱) یہاں فتاویٰ دارالعلوم دیوبند (امداد المفتین) سے ایک سوال اور اس کا جواب بعینہٖ نقل کیا جاتا ہے:-

سوال (۱۳۶):- حضرت آدمؑ کی پیدائش سے اب تک کتنے برس ہوئے؟ ان کی پوری تاریخ؟

جواب:- حافظ حدیث ابن عساکرؒ نے اس بارے میں مختلف اقوال نقل کئے ہیں، بعض مؤرخین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت اور حضرت آدم علیہ السلام کے درمیان چھ ہزار ایک سو چھپن سال کا فاصلہ لکھا ہے۔ (امداد المفتین ص:۲۶۱)۔ مزید تحقیق، تفصیل کے لئے دیکھئے: المعارف لابن قتیبۃ "مبداء الخلق" ص:۳۲،۳۳ (طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت)۔ (محمد زبیر حق نواز)

مجھے ابنِ ماجہ پر تحقیقی کام کرنے کا حوصلہ دے چکا ہے۔ اگر مولائے کریم کی توفیق شامل رہی تو ابنِ ماجہ کی یہ شرح وقت کی اہم ضرورت پوری کرے گی۔

۱:- اس وقت جس مقصد کے لئے آپ کو زحمت دے رہا ہوں، وہ ایک حدیث کے سلسلے میں استفسار کرنا ہے جس میں، میں بُری طرح اُلجھ گیا ہوں۔ بخاری و مسلم، ترمذی، ابنِ ماجہ، مسندِ احمد اور تقریباً تمام ہی کتبِ حدیث میں یہ واقعہ موجود ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُحد پر چڑھے تو وہ ہلنے لگا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اُحد! ٹھہر جا، "لیس علیک الا نبی أو صدیق أو شہید" آگے راوی تصریح کرتے ہیں کہ فلاں فلاں صحابہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ یہاں دو گتھیاں حل طلب ہیں۔ (الف) پہلی تو یہ کہ بخاری و مسلم میں اُحد کے الفاظ ہیں، جبکہ دُوسری کسی حدیث میں غارِ حراء کی تصریح ہے۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ ایک واقعہ ہے یا الگ الگ دو واقعے ہیں؟ اس سلسلے میں اپنے موقف سے آگاہ فرمائیں۔ (ب) دُوسرے یہ کہ ابنِ ماجہ کی روایت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ سفینہ بن زید اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا بھی تذکرہ ہے، حالانکہ وہ بالاتفاق شہید نہیں، تو اب اس کی کیا تأویل کی جائے؟ یہاں یہ بھی عرض کردوں کہ اس ذیل میں تمام محدثین کی تصریحات میری نظر سے گزر چکی ہیں، اور اَب میری رائے یہ ہے کہ یہ ایک ہی واقعہ ہے جو اُحد سے متعلق ہے، کیونکہ مکہ میں نبوّت کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حراء جانے کا تذکرہ غالباً نہیں ملتا، یہ محض رائے ہے جس کی میرے پاس کوئی دلیل نہیں، صرف ذوق و وجدان کی بناء پر ایسا کہہ رہا ہوں، یقینی فیصلہ تو آپ ہی فرمائیں گے۔

۲:- دُوسری بات یہ ہے کہ ابھی ایک ماہ قبل میں نے "جہانِ دیدہ" پڑھا، اس میں آپ نے علامہ مزیؒ مصنف تہذیب الکمال کے تعارف میں لکھا ہے کہ علامہ ابنِ تیمیہؒ ان کے شاگرد ہیں۔

تہذیب الکمال ایک سال پہلے میری نظر سے گزری تھی، اس میں مزی کے ترجمے میں، میں نے پڑھا تھا کہ وہ ابنِ تیمیہؒ سے اگرچہ چھ سال بڑے ہیں اور ان کے بعد بھی چودہ سال تک زندہ رہے ہیں، لیکن وہ شیخ الاسلام کے شاگرد ہیں، اُستاذ نہیں۔

یہ ایک سال قبل کا اجمالی خاکہ ہے، اس وقت نہ میرے پاس تہذیب الکمال ہے اور نہ ہی دُوسری اُمہات الکتب موجود ہیں جن کی طرف مراجعت کرکے میں یقینی طور سے کچھ کہہ سکوں۔ ہوسکتا ہے کہ میرا حافظہ خطا کر رہا ہو، اس لئے آپ تحقیق کرلیجئے۔ مجھے بہرحال ایسا ہی یاد پڑتا ہے کہ شیخ الاسلام، علامہ مزیؒ کے اُستاذ ہیں، شاگرد نہیں۔

آپ کے پاس اگرچہ مشاغل کا ہجوم ہے، لیکن مجھے آپ کی شفقت و عنایت سے اُمید ہے کہ

آپ اس حدیث کو حل کرنے کے ساتھ ساتھ مجھے یہ بھی بتانے کی زحمت فرمائیں گے کہ کن کتابوں کے ذریعہ میں اپنے ذوقِ حدیث کو ترقی دُوں۔ خصوصی دُعاؤں کی درخواست ہے۔

جواب ۱:- (الف):- شراحِ حدیث کی تصریحات وترجیحات کی بناء پر دُرست موقف یہی ہے کہ اُحد اور حراء سے متعلقہ یہ دونوں الگ الگ واقعے ہیں، جو مختلف اوقات میں پیش آئے ہیں، اور وہ تصریحات درج ذیل ہیں:-

فی فتح الباری ج:۷ ص:۳۲[۱] وأخرج مسلم من حديث أبي هريرةؓ ما يؤيد تعدد القصة، فذكر أنه كان على حراء ومعه المذكورون، وزاد معهم غيرهم .... الخ.

وفی عمدة القاری ج:۱۶ ص:۱۹۰[۲] ولكن لا شك في تعدد القصة، فان أحمد رواه من طريق بريدة بلفظ "حراء" واسناده صحيح، وأبا يعلى رواه من حديث سهل بن سعد بلفظ "أحد" واسناده صحيح، وأخرجه مسلم من حديث أبي هريرةؓ، فذكر أنه كان على حراء ومعه أبوبكر وعمر وعثمان وغيرهم، فهٰذا كله يدل على تعدد القصة .... الخ.

وفی المرقاة ج:۱۱ ص:۳۳۲ (طبع مکتبة امدادية ملتان) فاختلاف الروايات محمول على تعدد القضية في الأوقات اهـ.

ب:- اس بارے میں دو قسم کی تأویل کی گئی ہے۔ ایک یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی تغلیب پر محمول ہے، چنانچہ ان حضرات میں سے اکثر شہادت کے مرتبہ پر فائز ہوگئے ہیں، اور دُوسری یہ کہ شہادت عام ہے، یعنی شہادتِ حقیقیہ اور حکمیہ دونوں کو شامل ہے۔ لہٰذا بعض حضرات تو حقیقی شہادت پاگئے اور بعض کو حکمی شہادت ملی، بایں طور کہ انتقال ایسی بیماری سے ہوا جو شہادت کے حکم میں ہے۔

فی حاشية ابن ماجة ص:۱۳[۳] قال القاری رحمه الله: وفي سعد بن أبي وقاص مشكل، لأن سعدا مات في قصره بالعقيق، فتوجيه هٰذا أن يكون بالتغليب، أو يقال: كان موته بمرض يكون في حكم الشهادة اهـ. وأقول: ومثله في سعيد بن زيد فانه مات بالعقيق أيضًا فحمل الى المدينة سنة احدى وخمسين. (اكمال في أسماء الرجال)

وفی المرقاة فی هذه القصة ج:۱۱ ص:۳۳۲[۴] واثبات الشهادة لبعضهم حقيقة وللباقين حكمًا، والله أعلم.

---

(۱) فتح الباری کتاب فضائل الصحابة ج:۷ ص:۳۸ (طبع دار نشر الکتب الاسلامیہ لاہور)
(۲) عمدة القاری ج:۱۶ ص:۱۹۱ (طبع دار الفکر بیروت).
(۳) (طبع ایچ ایم سعید). (۴) (طبع مکتبہ امدادیہ ملتان).

۲:- صحیح بات وہی ہے جو ''جہانِ دیدہ'' میں ہے، یعنی علامہ ابنِ تیمیہؒ، حافظ مزیؒ صاحبِ تہذیب الکمال کے شاگرد ہیں، اُستاذ نہیں۔ چنانچہ خود کتاب ''تہذیب الکمال'' کی فصلِ اوّل میں تصریح ہے:

وقرأ الثلاثة (أي ابن تيمية وغيره) على المزي، واعترفوا بأستاذيته وافتخروا بها. (ج:۱ ص:۱۸)۔[1]

واللہ اعلم

عصمت اللہ عصمہ اللہ

۱۴۱۵/۲/۱۳ھ

محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ موصول ہوا تھا، احقر نے اسفار واشغال کی وجہ سے اپنے ایک عزیز دوست کو مأمور کیا تھا کہ وہ ان اُمور کی تحقیق کریں۔ انہوں نے اُوپر جو جواب لکھا ہے، احقر کی رائے میں درست ہے۔ اگر اُحد اور حراء کی احادیث ایک ہی صحابی سے مروی ہوتیں تو تعدّدِ قصہ بعید ہوتا، لیکن یہ مختلف اصحاب سے مروی ہیں، کما حققه الحافظ في الفتح ۔ لہٰذا متعدّد واقعات پر محمول کرنے کے سوا چارہ نظر نہیں آتا۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۱۵/۲/۱۶ھ

(فتویٰ نمبر ۴۲/۱۴۵)

خواتین کے لئے میڈیکل اور ہوم اکنامکس کی تعلیم حاصل کرنا کیسا ہے؟

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے کے بارے میں کہ لڑکیوں کو قرآن اور معمولی خط وکتابت کی تعلیم دینے کے سوا مزید تعلیم دِلانا حرام ہے یا جائز؟ اور اگر حرام ہے تو میڈیکل، حکمت اور ہوم اکنامکس کی تعلیم مسلمان خواتین کے لئے کس زُمرے میں آئے گی؟

جواب:- خواتین اگر میڈیکل سائنس، حکمت یا ہوم اکنامکس کی تعلیم اس غرض سے حاصل کریں کہ ان علوم کو مشروع طریقے پر عورتوں کی خدمت کے لئے استعمال کریں گی تو ان علوم کی تحصیل میں بذاتہٖ کوئی حرمت وکراہت نہیں، بشرطیکہ ان علوم کی تحصیل میں اور تحصیل کے بعد ان کے استعمال میں پردے اور دیگر اَحکامِ شریعت کی پوری رعایت رکھی جائے۔ اگر کوئی خاتون ان تمام اَحکام کی

(۱) (طبع مؤسسة الرسالة بيروت).

رعایت رکھتے ہوئے یہ علوم حاصل کرے تو کوئی کراہت نہیں[1]، لیکن چونکہ آج کل ان میں سے بیشتر علوم کی تحصیل اور استعمال میں اَحکامِ شریعت کی پابندی عنقاء جیسی ہے، اس لئے اس کا عام مشورہ نہیں دیا جاسکتا۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۰ر رمضان المبارک ۱۴۰۰ھ

(فتویٰ نمبر ۳۱/۱۲۱۳ د)

خطوط میں بسم اللہ، ابجد اور ہندسوں میں لکھنے کی شرعی حیثیت اور اس طریقے کی ایجاد کی تاریخ

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین درج ذیل مسئلے میں کہ خطوط میں جو ابجد سے بسم اللہ لکھی ہوتی ہے، یہ کس کی ایجاد ہے؟ اور ایسا کب ہوا؟ اور عدد سے پورے بسم اللہ کا ثواب و برکت حاصل ہوگی یا نہیں؟

جواب:- خطوط کی ابتداء میں ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' لکھنا مسنون ہے[2]، اور یہ خود قرآنِ کریم سے ثابت ہے کہ اس میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط بسم اللہ سے شروع ہوتا ہے۔ یہ بات کسی مستند کتاب میں نظر نہیں آئی کہ بسم اللہ کی جگہ ۷۸۶ کا عدد کب سے لکھا جانا شروع ہوا، لیکن اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ بسم اللہ لکھا ہوا کاغذ کسی بے حرمتی کی جگہ استعمال ہوگا تو اس لئے بے ادبی ہوگی، لہٰذا اگر کوئی شخص اس خیال سے زبان سے بسم اللہ پڑھ کر یہ عدد لکھ دے تو سنت تو ادا ہو جائے گی لیکن افضل یہی معلوم ہوتا ہے کہ بسم اللہ صراحۃً لکھی جائے، اس لئے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط بھی کفار کے پاس گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کافر بادشاہوں کو جو خطوط روانہ فرمائے، ان میں بھی بسم اللہ درج تھی۔ ظاہر ہے کہ کفار کے پاس بے حرمتی کا احتمال مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ تھا، مگر اس کی وجہ سے بسم اللہ کو ترک نہیں کیا گیا۔

واللہ اعلم بالصواب

محمد تقی عثمانی غفرلہٗ

۱۳۹۱/۵/۱۰ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲/۲۰۳ ب)

---

(۱) فی البحر ج:۸ ص:۱۹۲ والطبیب انما یجوز له ذلک اذا لم یوجد امرأة طبیبة، فلو وجدت فلا یجوز له أن ینظر، لأن نظر الجنس الی الجنس أخف، وینبغی للطبیب أن یعلم امرأة ان أمکن. وفی الشامیة ج:۶ ص:۳۷۱ (قوله وینبغی) کذا أطلقه فی الهدایة والخانیة، وقال فی الجوهرة: اذا کان المرض فی سائر بدنها غیر الفرج یجوز النظر الیه عند الدواء، لأنه موضع ضرورة، وان کان فی موضع الفرج فینبغی أن یعلم امرأة تداویها، فان لم توجد وخافوا علیها أن تهلک .... والظاهر أن ینبغی هنا للوجوب. وکذا فی الهندیة ج:۵ ص:۳۳۰، وفی البدائع ج:۵ ص:۱۲۴.

(۲) دیکھئے تفسیر معارف القرآن ج:۶ ص:۵۷۸، ۵۷۹۔

جوابِ صحیح ہے، مگر اس کی شرط یہ ہے کہ ظنِ غالب اس کا ہو کہ اس خط کی بے ادبی نہ کی جائے گی، جہاں یہ شرط نہ ہو جیسے عموماً خطوط میں یہی حال ہے، وہاں بسم اللہ لکھنے سے پرہیز کرنا بہتر ہے، صرف زبان سے کہنے پر اکتفا کرے یا ۷۸۶ کو ایک علامت بسم اللہ کی ہونے کی حیثیت سے لکھ دے۔ مکاتیبِ نبوی اور مکتوبِ سلیمانؑ میں یہ شرط موجود تھی، کیونکہ عام دُنیا میں سلاطین اور بڑوں کے خطوط احتیاط سے محفوظ رکھے جاتے ہیں۔ جن خطوط کے متعلق آج بھی یہ گمان غالب ہو ان میں بسم اللہ لکھنا چاہئے۔

بندہ محمد شفیع

حدیث "کنت کنزًا مخفیًا" کی تحقیق اور تخلیقِ عالَم کے سلسلے میں کئی وساوس اور شبہات کے جوابات

بعد سلام مسنون عرض ہے کہ بندہ آپ کے تبحرِ علمی، ذکاوتِ فہم اور اعلیٰ استعدادِ فقہ کا قدردان اور دِل سے معترف ہے، اور آپ کے لئے دست بدعا رہتا ہے، اسلام کو آپ جیسے علماء کی سخت ضرورت ہے، آپ کی بہت سی کتابوں سے بندہ نے استفادہ کیا ہے، اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ، اللہ کرے نورِ فہم اور زیادہ۔

بندہ آج کل چند وسوسوں کی وجہ سے سخت پریشان ہے، ان میں سے تین اِشکال ہر وقت ذہن میں گھومتے ہیں، اور میرے اور خدا کے درمیان ایک قسم کا حجاب بنتے ہیں، کیونکہ نماز و اذکار وغیرہ کے درمیان یہ وسوسے آکر بدمزگی کا سبب بنتے ہیں۔ براہِ کرم فی سبیل اللہ میری مدد فرمائیں، میں سمجھتا ہوں حضرت تھانویؒ کے فہم و فراست سے جناب کو کافی حصہ ملا ہے، ایسے سوالات کے جوابات مولانا تھانویؒ کی خصوصیات میں شامل ہیں۔

مجھے معلوم ہے کہ خدمتِ دین کے سلسلے میں آپ کی مصروفیات ملک و بیرونِ ملک، تصنیف و تألیف، دارالعلوم کے انتظامی اُمور اور دیگر شعبہ جات میں آپ کا انہماک اتنا زیادہ ہے کہ شاید اپنی ذات کے لئے بھی آپ کو وقت کم ملتا ہوگا، مگر آپ جیسے عالم سے پوشیدہ نہیں ہوگا کہ تزکیۂ نفس کا کام بھی کتنا عظیم الشان کام ہے کہ پیغمبر اس کے لئے مبعوث کئے گئے، اور وسوسوں کا ازالہ اور شبہات و اِشکال کا مدلل جواب بھی اسی ذیل میں آتا ہے۔

آپ کی مصروفیت کی بناء پر آپ اس میں آزاد ہیں کہ جواب ایک دن میں، یا ایک مہینے میں دیں، یا ہر اِشکال کا ایک ساتھ دیں، یا الگ الگ دیں، جس طرح آپ کو سہولت ہو، مگر براہِ کرم جواب ضرور دیں، حق تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائیں۔

سوال ۱:- الف:- "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ" مفسرین حضرات نے "لِيَعْبُدُوْنِ" کی تفسیر "لِيَعْرِفُوْنِ" سے کی ہے، یعنی مقصدِ تخلیق یہ ہے کہ خدا کو پہچانا جائے، اور ایک حدیث بھی ہے: "کنت کنزًا مخفیًا" یعنی میں چھپا ہوا خزانہ تھا، میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں "فخلقت الخلق" چنانچہ میں نے خلق کو پیدا کردیا۔

وسوسہ یہ آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کی صفات الرحمٰن الرحیم بھی ہے، نے محض اپنی شناخت اور تعارف کے لئے کروڑوں، اربوں انسانوں کو پیدا کر کے ایک بلائے عظیم میں مبتلا کردیا۔ ابتدائے آفرینش سے آج تک کروڑوں، اربوں ذی رُوح انسان جن کے جثّے ایسے بنائے گئے کہ اگر ایک سوئی بھی بدن میں لگ جائے تو تکلیف ہوتی ہے۔ سسک سسک کر ظالموں کے جبر و بربریت اور اذیت ناک تشدّد کے سبب مرگئے۔ ہزاروں، لاکھوں جنگلی جانوروں، شیر، سانپ، بچھو کی غذا کے لئے، لاکھوں افراد سمندری طوفان، برف باری اور موسم کی خنکی کی نذر ہوگئے۔ لاکھوں لوگ آفاتِ سماوی ارضی، طاعون، چیچک اور دُوسری اذیت ناک بیماریوں کے لقمہ بن گئے۔ لاکھوں بے کس انسان قحط میں بھوک سے مرگئے، آج بھی لاکھوں انسان قلتِ غذائیت کے شکار ہیں۔ ایک وقت کی روٹی بھی مشکل سے ملتی ہے۔

دو وقت کی روٹی نہ ملے تو کیسی اذیت ہوتی ہے، کوئی زخم لگ جائے، کوئی بیماری ہوجائے، کسی کی عزّتِ نفس مجروح ہو، کسی بے گناہ کو قید کردیا جائے، کسی کو بے عزّت کردیا جائے، کسی کا گھر لوٹ لیا جائے، کسی کو اغواء کرلیا جائے، یہ اذیتیں برابر جاری ہیں اور زیادہ تر ان کے شکار غریب اور بے وسیلہ لوگ ہوتے ہیں، اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔

بنی نوعِ انسان پر ایسی ایسی مصیبتوں اور تکالیف کے پہاڑ ٹوٹے ہیں جن کو سن کر پتھر دِل بھی موم ہوجائیں۔ نوعِ انسانی کا ابتدائی دور دیکھئے، سردی کی شدّت، گرمی کا عذاب، ہواؤں کی تیزی ایسی ہی تھی جیسی آج ہے، مگر انسان کے پاس نہ لحاف، نہ گدّے تھے، بدن پیڑ کی چھالوں اور جانوروں کی کھالوں سے چھپایا جاتا تھا۔ پتھر کا دور، لوہے کا دور، زندہ رہنے کے لئے کیسی جدوجہد کرنی پڑتی ہوگی؟

ب:- پھر جس پہچان اور شناخت کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو "لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ" کی حالت میں پیدا کیا۔ اس شناخت کو بھی ستر ہزار پردوں میں ایسا چھپایا کہ پوری زندگی ریاضت اور مجاہدات کرو، تب بھی کچھ ہاتھ نہیں آتا، اِلَّا ماشاء اللہ۔ سلوک کی کتابیں اور صالحین کے حالات اس پر شاہد ہیں۔

ج:- پھر چلو اگر دُنیا کی زندگی جیسے تیسے گزر گئی، فاقوں میں، بیماری میں، موسم کی سختی میں، مظلومی کی حالت میں تو اَب آخرت کی زندگی کا خوف اس سے بڑھ کر، وہاں کا عذاب دُنیا کے عذاب

سے ہزاروں گنا بڑا ہے، تو گویا ایک رُوح کو جسم دے کر ابدالآباد اور ہمیشہ کی تکلیف میں مبتلا کردیا اور شناخت کو اتنا مشکل بنادیا کہ کوئی کہتا ہے اللہ کا وجود ہی نہیں، کوئی کہتا ہے سب اللہ ہی اللہ ہے، کوئی کہتا ہے کہ اس کے اولاد ہے، کوئی کہتا ہے وہ فلاں جسم میں حلول کرگیا۔

۳:- تو پھر ایک ایسی چیز یعنی شناخت (عرفانِ الٰہی) جو اتنی مشکل اور نایاب ہو اس کے لئے اربوں گوشت پوست کے انسانوں کو ایسی بلائے عظیم میں مبتلا کرنا بظاہر خدا کی صفت الرحمٰن الرحیم سے متضاد معلوم ہوتی ہے۔

د:- اگر جواب میں کوئی کہے کہ اسلام نے اللہ کی شناخت کا طریقہ بتادیا ہے تو بے شک یہ صحیح ہے، مگر اس سے شناخت کہاں ہوتی ہے؟ اس سے تو صرف علم حاصل ہوتا ہے، یعنی جاننا اور پہچاننا اور چیز ہے۔

یا کوئی کہے کہ ہم سب اللہ کی مملوک ہیں اور مالک کو اپنی مملوک میں ہر قسم کے تصرف کا حق حاصل ہے، اس سے کوئی سوال نہیں کرسکتا، تو بے شک یہ بھی صحیح ہے مگر خدا نے انسانوں کو منع کیا ہے کہ اپنی مملوک میں بے جا تصرف نہ کرو، اولاد کو بھوکا مارنا، اپنے جانوروں کو بھوکا رکھنا، اپنی دولت کا بیجا اِسراف، یہ سب باتیں خدا نے منع کی ہیں۔ تو جس اَمر کو خدا اپنے بندوں سے پسند نہیں کرتا وہ خود کیونکر کرگیا؟

محترم! یہ سوال میں پوری انسانیت کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے کر رہا ہوں جس میں ابتدائے خلق سے آج تک کے سارے انسان، کافر، مؤمن سب شامل ہیں۔ لہٰذا جواب میں اس حیثیت کو مدِنظر رکھئے گا۔ بندے کا علم بہت محدود ہے اور یہ معاملات تکوینی اُمور سے تعلق رکھتے ہیں جن کی حکمت کا احاطہ محال ہے اور آخرت میں بھی پورا پورا ہوگا۔ پس جناب سے استدعا ہے کہ ایسا معقول جواب عنایت فرمائیں کہ کسی طرح یہ کانٹا نکل جائے جو آج کل مجھے بہت پریشان کئے ہوئے ہے۔ عقیدہ تو الحمدللہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی شئ باطل پیدا نہیں کی مگر بعض اُمور میں قلب ساتھ نہیں دیتا، خدا مجھے اس منافقت سے محفوظ رکھے۔

اِشکال نمبر۲:- ساری دُنیا میں کروڑوں لوگ انتہائی افلاس اور غربت کا شکار ہیں، افریقہ میں تو ہزاروں لوگ بھوک سے مرجاتے ہیں۔ ہم اپنے صوبہ سرحد کو دیکھیں، چھوٹے چھوٹے بچے کچرا چنتے ہوئے نکل آتے ہیں جن کو مشکل سے دس بیس روپے روز مزدوری ملتی ہے۔ دُوسری طرف وہ لوگ جن کے یہاں رزق کی اتنی وسعت ہے کہ ان کے کتے بھی وہ غذا کھاتے ہیں جو غریبوں کو میسر نہیں، اگر اس تفاوت کو اَمرِ خدا سمجھا جائے تو یہ قرآن اور خدا کے قول "وَمَا اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ" کے خلاف جاتا ہے۔ غور و فکر کے بعد یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ "وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللهِ رِزْقُهَا" مشروط ہے اپنے زمانے کے اسبابِ معیشت اختیار کرنے پر۔ مشاہدہ ہے کہ ایک بھائی نے اس زمانے

کے اسبابِ معیشت اختیار کئے، پڑھ لکھ گیا، اعلیٰ عہدے کا مالک ہوگیا، خوب رزق میں وسعت ہوئی، دُوسرا بھائی جاہل رہ کر ہر طرح محتاج رہا۔ اس کے خلاف بھی ہے، مگر حکم اکثریت پر لگایا جاتا ہے۔ خدا کو کسی سے دُشمنی نہیں کہ اس کو محتاج رکھے، قرآن کی آیت "اِنَّ اللهَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ ...." بھی اس کی تائید کرتی ہے۔ آپ فرمائیں کہ یہ بات صحیح ہے اور یہ عقیدہ حق ہے یا نہیں؟

اِشکال نمبر۳:- ہمارا عقیدہ ہے کسب بندے کی طرف سے ہے اور خلق اللہ کی طرف سے۔

بندے نے کسی نیک کام کا ارادہ کیا، اللہ نے اس عمل کی تخلیق کردی، یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے، لیکن بندے نے کسی بُرائی مثلاً ڈاکا یا قتل کا ارادہ کیا تو اللہ کی طرف سے اس عمل کی تخلیق سے دو اِشکال پیدا ہوتے ہیں، پہلا تو یہ کہ اللہ کی تخلیق کا عمل بندے کے ارادے کے تابع ہے، گو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تخلیقِ عمل نہیں ہوتا مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے اور حکم اکثریت پر لگتا ہے۔

دُوسرا اشکال یہ کہ بدعمل کی تخلیق بظاہر "وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ" کے خلاف معلوم ہوتی ہے۔ بندوں کو حکم ہے "لَا تَعَاوَنُوْا ...." کسی نے کسی بے گناہ کو قتل کر کے اس پر ظلم کیا، اللہ تعالیٰ نے اس عمل کی تخلیق کر کے ظالم سے تعاون کیا (نعوذ باللہ)۔ دُنیا کی عدالتیں اعانتِ جرم کو بھی جرم سمجھتی ہیں، تو اللہ تعالیٰ کے اس بدعمل کی تخلیق کی کیا توجیہ کریں گے؟ دُوسرے یہ کہ ایمانِ مفصل میں "وَالْقَدْرِ خَیْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللهِ تَعَالٰی" سے مراد یہی تخلیقِ فعل ہے یا کچھ اور؟ کیونکہ شرِمحض کا صدور تو حق تعالیٰ سے محال ہے۔

جواب:- محترمی و مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا مفصل خط ملا، آپ نے احقر کو جو دُعائیں دی ہیں، ان پر تہِ دِل سے شکرگزار ہوں (جزاکم اللہ تعالیٰ)۔ آپ کے اصل سوال کے بارے میں پہلی بات تو یہ عرض کرنی ہے کہ "کنت کنزًا مخفیًا .... الخ" کا جو فقرہ حدیثِ قدسی کے عنوان سے مشہور ہے، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی بھی سند سے ثابت نہیں ہے، علامہ سخاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

"کنت کنزًا لا أعرف فأحببت أن أعرف .... قال ابن تیمیۃ: انه لیس من کلام النبی صلی اللہ علیه وسلم، ولا یعرف له سند صحیح ولا ضعیف، وتبعه الزرکشی وشیخنا."

(المقاصد الحسنة للسخاویؒ ص:۳۲۷)

نیز علامہ عجلونی نے بتایا ہے کہ صرف علامہ ابنِ تیمیہؒ ہی نہیں، حافظ ابنِ حجرؒ، علامہ زرکشیؒ اور علامہ سیوطیؒ نے بھی یہی کہا ہے کہ اس روایت کی کوئی بھی سند نہیں ہے، نہ صحیح، نہ ضعیف۔

(کشف الخفاء للعجلونیؒ ج:۲ ص:۱۷۳)

اور اسنی المطالب میں لکھا ہے کہ: اس حدیث کو بعض صوفیاء تساہلاً حدیثِ قدسی کے طور پر ذکر کرتے ہیں (ص:۲۴۳) اور بس۔

البتہ آیتِ کریمہ میں ضرور وارد ہوا ہے کہ "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ"[1] یعنی جن و انس کی تخلیق کا مقصد یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں۔ اس سے آگے آپ نے تخلیقِ عالم کے سلسلے میں جن وساوس وشبہات کا ذکر فرمایا ہے، ان کا اجمالی جواب یہ ہے کہ یہ وساوس وشبہات درحقیقت اس دائرے میں قدم رکھنے سے پیدا ہوئے ہیں جو عقلِ انسانی سے ماورا ہے۔ تخلیقِ کائنات کی کیا حکمتیں ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کا کیسا نظام بنایا ہے؟ اور یہاں ہر چیز اور ہر واقعے کے پیچھے کیا کیا مقاصد کارفرما ہیں؟ اگر یہ سب باتیں انسان کی عقل اور علم میں آجائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انسان انسان نہ رہا، عالم الغیب ہوگیا۔ یہ بات طے شدہ ہے جس میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں کہ انسان کی عقل محدود ہے، اور وہ کائنات کی تخلیق تو کجا، خود اپنے وجود کے ہر حصے کی حکمتِ تخلیق معلوم کرنے پر بھی قادر نہیں، یہاں تک کہ وہ دماغ جس سے انسان سوچتا ہے، اس کا بھی بڑا حصہ ابھی تک انسان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کا عمل کیا ہے؟ جو واقعات انسان کسی کی تکلیف یا صدمے کے دیکھتا ہے، وہ صرف ان کا ظاہری رُخ ہے، ان واقعات کے پیچھے کے حقائق اس کے علم میں نہیں ہوتے۔ ہماری زندگی ہی میں بہت سے حالات و واقعات ایسے پیش آتے ہیں کہ ایک عرصے تک ہم ان پر افسوس کرتے رہتے ہیں، لیکن کسی وقت ان کی حقیقت کھلتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ افسوسناک واقعات عین حکمت کے مطابق تھے۔ اگر یہ حقیقت نہ کھلتی تو ہم اسے ظلم ہی سمجھتے۔ اب کسی کسی موقع پر یہ حکمت ظاہر ہوجاتی ہے، لیکن اکثر مواقع پر ظاہر نہیں ہوتی۔ لہٰذا ان معاملات کی کھوج میں پڑنا جو انسان کے دائرۂ ادراک سے باہر ہیں، خواہ مخواہ اپنے آپ کو پریشانی میں ڈالنا ہے۔

دُوسری طرف اگر اللہ تعالیٰ کے وجود پر ایمان ہے تو اس کے رحمٰن و رحیم ہونے پر بھی ایمان ہونا لازمی ہے۔ اگر کسی مخلوق کی کوئی تکلیف دیکھ کر آپ کو ترس آرہا ہے تو کیا رحمٰن و رحیم کو نہیں آئے گا؟ اگر اس نے آپ سے کہیں زیادہ رحیم ہونے کے باوجود اسے اس حالت میں چھوڑا ہے تو یقیناً اس کی کوئی وجہ ہے جو آپ کے دائرۂ علم و ادراک سے باہر ہے۔ آپ ایک شخص کو پھانسی پر لٹکا تو دیکھ رہے ہیں لیکن آپ کو یہ معلوم نہیں کہ اس نے کتنے انسانوں کی جان لی ہے؟ آپ ایک ڈاکٹر کو کوئی عضو کاٹتے ہوئے دیکھ کر ترس کھا رہے ہیں، لیکن یہ معلوم نہیں کہ یہ آپریشن نہ ہوتا تو سب اعضاء کا کیا بنتا؟ یہ تو معمولی مثالیں ہیں، پوری کائنات کے نظام میں کسی شخص کے حق میں کیا بہتر

---

(۱) سورۃ الذّٰریٰت:۵۶۔

ہے؟ اس کا علم سوائے خالقِ کائنات کے کسی کو نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا اس کھوج میں پڑنا ہی خلافِ عقل ہے۔ اگر یہ اجمالی حقیقت ذہن نشین ہوجائے تو ان شاء اللہ اس قسم کے وساوس وشبہات زیادہ پریشان نہیں کریں گے، اور اگر کبھی غیر اختیاری طور پر آئیں تو اپنے آپ کو کسی کام میں لگالیں، اور ان کی طرف التفات نہ کریں۔

والسلام

واللہ سبحانہ اعلم

۲۷/۱۲/۱۴۲۰ھ

(فتویٰ کے حوالوں کی تخریج از مولانا محمد عبداللہ میمن زید مجدہٗ)

۱:- کنت کنزا لا أعرف فأحببت أن أعرف، فخلقت خلقا فعرفتهم بی، فعرفونی. قال ابن تیمیةؒ: انه لیس من کلام النبی صلی اللہ علیه وسلم ولا یعرف له سند صحیح ولا ضعیف، وتبعه الزرکشی وشیخنا. (المقاصد الحسنة للسخاوی ص:۳۲۷)

۲:- وفی کشف الخفاء بعد هٰذه العبارة:-

وتبعه الزرکشی والحافظ ابن حجرؒ فی اللآلی والسیوطیؒ وغیرهم، وقال القاری: ولٰکن معناه صحیح مستفاد من قوله تعالٰی: "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ" أی لیعرفونی کما فسره ابن عباسؓ، والمشهور علی الألسنة کنت کنزًا مخفیًا، فأحببتُ ان أعرف، فخلقت خلقا فبی عرفونی. وهو واقع کثیر فی کلام الصوفیة، واعتمدوه، وبنوا علیه أصولا لهم. کشف الخفاء للعجلونی ج:۲ ص:۱۷۳.

۳:- وفی الموضوعات الکبیر مثل ذٰلک الٰی: کما فسره ابن عباس رضی اللہ عنهما. (ص:۹۳)

۴:- وفی "أسنی المطالب": .... وتبعه الزرکشی، وابن حجر، وهٰذا یذکره المتصوفة فی الأحادیث القدسیة تساهلًا منهم. (ص:۲۴۳)

قومِ لوطؑ کی جس بستی کو اُلٹا گیا تھا اس کی تعیین میں رائے کا اختلاف

سوال:- معارف القرآن جلد سوم سورۂ انعام ص:۳۲۰ پر مرقوم ہے:

قومِ لوط کی پوری بستی کو اُلٹ دیا گیا جو آج تک اُردن کے علاقے میں ایک عجیب قسم کے پانی کی صورت میں موجود ہے، جس میں کوئی جانور، مینڈک، مچھلی وغیرہ زندہ نہیں رہ سکتی، اسی لئے اس کو بحرِ میّت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور بحرِ لوط کے نام سے بھی۔

پوری بستی کو اُلٹ جانے کا واقعہ جس جگہ پیش آیا ہے وہ بالکل صاف میدان ہے، عذاب والی جگہ کو پانی سے تعبیر کرنا اور یہ کہنا کہ کوئی جانور زندہ نہیں رہ سکتا، تاریخ کے خلاف ہے۔ آج کل لوگ اس جگہ کا مشاہدہ کرتے ہیں، عذابِ الٰہی کی جگہ کو بحرِ میّت کہنا جھوٹ ہے۔

جواب:- حضرت لوط علیہ السلام کی جن بستیوں کو اُلٹا کیا گیا تھا، ان کی تعیین میں رائیں مختلف ہوسکتی ہیں۔ احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ اُردن تشریف لے گئے تو وہاں کے اہلِ علم نے بحرِ میّت کی جگہ کے بارے میں یہی بتایا کہ یہ لوط علیہ السلام کی بستیوں کی جگہ ہے، اور والد صاحبؒ کو وہاں لے بھی گئے، اس کی بنیاد پر انہوں نے یہ بات لکھی ہے۔ اگر کسی صاحبِ علم کی تحقیق اس کے خلاف ہو، تو ہوسکتی ہے، یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس پر شریعت کا دار و مدار ہو، ایک تاریخی یا جغرافیائی مسئلہ ہے، اور بہت سے تاریخی جغرافی مسائل میں اہلِ علم کی رائے یا مشاہدات مختلف ہوتے ہیں، ان میں سے کسی کو راجح، کسی مرجوح تو کہہ سکتے ہیں، مگر کسی کو جھوٹ کہنا بڑی زیادتی کی بات ہے، والسلام۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۹/۶/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۴۴/۳۰ ج)

نبوّت اور وحی کی کیا حقیقت ہے؟

سوال:- برائے کرم عقلی اعتبار سے یہ سمجھا دیجئے کہ نبوّت اور وحی کیا چیز ہیں؟ اور نبی اور خدا کے مابین جو رشتہ ہوتا ہے اس کا ہم کس طرح ادراک کر سکتے ہیں؟

جواب:- یہ ایک مفصل اور طویل بحث ہے جو مختصر طور سے سمجھ میں آنا مشکل ہے۔ اس موضوع پر احقر کی کتاب ''علوم القرآن'' میں مفصل بحث موجود ہے۔ یہ کتاب مکتبۂ دار العلوم کراچی ۱۴ نے شائع کی ہے، اس کا مطالعہ فرمالیں، پھر بھی کوئی شبہ رہ جائے تو پوچھ لیں۔ واللہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۳ھ
(فتویٰ نمبر ۲۵۰۹/۲۷ و)

کیا موجودہ سائنسی تحقیقات قرآن وحدیث سے متعارض ہیں؟

سوال:- چاند، سورج اور سیاروں کے بارے میں موجودہ سائنس کی جو تحقیق ہے، کیا وہ قرآنِ کریم کی رُو سے دُرست ہے؟ یہاں بعض حضرات کہتے ہیں کہ سائنس اور قرآن وحدیث میں کوئی تعارض نہیں ہے، لہٰذا اس کی ہر بات دُرست ہے۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ سائنس کے نظریات قرآن سے ٹکراتے ہیں، براہِ کرم اس معاملے میں اپنی جامع و مانع رائے سے مطلع فرمائیے۔

جواب:- آپ کا سوال اپنے جواب کے لئے درحقیقت ایک مبسوط مقالے کی وسعت چاہتا ہے، تاہم اُصولی طور پر چند ضروری باتیں پیشِ خدمت ہیں۔ اُمید ہے کہ وہ آپ کی اُلجھن دُور کرنے میں مددگار ثابت ہوں گی۔

۱:- سب سے پہلے یہ بات سمجھ لیجئے کہ سائنس کا بنیادی مقصد ان قوتوں کا دریافت کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں ودیعت فرمائی ہیں۔ اگر ان قوتوں کو انسانیت کی فلاح و بہبود میں استعمال کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ اسلام کی نظر میں نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہے۔ اسلام ان کوششوں کے راستے میں کوئی رُکاوٹ کھڑی کرنے کے بجائے ان کی ہمت افزائی کرتا ہے، اس سلسلے میں اسلام کا مطالبہ صرف اتنا ہے کہ ان قوتوں کو ان مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے جو اسلام کی نظر میں جائز اور مفید ہیں۔ دُوسرے الفاظ میں سائنس کا کام یہ ہے کہ وہ کائنات کی پوشیدہ قوتوں کو دریافت کرے، لیکن ان قوتوں کا صحیح مصرف مذہب بتاتا ہے، وہی ان اکتشافی کوششوں کے لئے صحیح رُخ اور بہتر فضا مہیا کرتا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی اسی وقت انسانیت کے لئے مفید ہوسکتی ہے جب اسے اسلام کے بتائے ہوئے اُصولوں کے مطابق استعمال کیا جائے، ورنہ شاید اس سے کسی کو انکار نہیں ہوگا کہ سائنس جس طرح انسانیت کے لئے مادّی فلاح و بہبود کا باعث بن سکتی ہے، اسی طرح اگر اس کا غلط استعمال کیا جائے تو وہ ہمارے لئے تباہ کن بھی ثابت ہوسکتی ہے۔ مثال ہمارے سامنے ہے کہ ماضی میں سائنس نے جہاں انسانیت کو راحت و آسائش کے اسباب مہیا کئے ہیں، وہاں اس کے غلط استعمال نے پوری دُنیا کو بدامنی اور بےچینی کا جہنم بھی بنادیا ہے۔ سائنس ہی نے سفر کے تیز رفتار ذرائع بھی ایجاد کئے اور اسی نے ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم بھی بنائے، لہٰذا سائنس کا صحیح فائدہ اسی وقت حاصل کیا جاسکتا ہے جب اسے اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے اُصولوں کے مطابق استعمال کیا جائے۔

۲:- دُوسری بات یہ سمجھنے کی ہے کہ سائنس کی تحقیقات دو طرح کی ہیں۔ ایک وہ جو صریح مشاہدے پر مبنی ہیں، ایسی تحقیقات نہ کبھی قرآن و سنت سے متصادم ہوئی ہیں اور نہ ہوسکتی ہیں، بلکہ مشاہدہ تو یہ ہے کہ ایسی تحقیقات نے ہمیشہ قرآن و سنت کی تصدیق ہی کی ہے، اور قرآن و سنت کی بہت سی وہ باتیں جو کچھ عرصہ پہلے لوگوں کی سمجھ میں ذرا مشکل سے آتی تھیں، سائنس کی ان تحقیقات نے ان کا سمجھنا آسان بنادیا ہے، مثلاً معراج کے موقع پر بُراق کی جس تیز رفتاری کا ذکر صحیح احادیث میں آیا ہے، قدیم زمانے کے نام نہاد عقل پرست اسے بعید از قیاس سمجھتے تھے، لیکن کیا آج سائنس نے یہ ثابت نہیں کردیا کہ تیز رفتاری ایک ایسی صفت ہے جس کو کسی حد میں محدود نہیں کیا جاسکتا۔

دُوسری قسم کے سائنٹفک نظریات وہ ہیں جو مشاہدہ اور یقین کے بجائے ظن و تخمین پر یا کم علمی

پر مبنی ہیں، اور اس سلسلے میں سائنس داں کسی یقینی نتیجے پر ابھی تک نہیں پہنچ سکے ہیں، ایسی تحقیقات بعض اوقات قرآن وسنت کی تصریحات سے ٹکراتی ہیں، ایسے مواقع پر سیدھا اور صاف راستہ یہ ہے کہ قرآن وسنت کی تصریحات میں کوئی تأویل کئے بغیر ان پر ایمان رکھا جائے، اور سائنس کی جو تحقیقات ان سے ٹکراتی ہیں ان کے بارے میں یہ یقین رکھا جائے کہ سائنس ابھی اپنی کم علمی کی بناء پر اصل حقیقت تک نہیں پہنچی، جوں جوں انسان کی سائنسی معلومات میں اضافہ ہوگا قرآن وسنت کے بیان کئے ہوئے حقائق واضح ہوتے جائیں گے۔

مثلاً بعض سائنسدانوں کا یہ خیال ہے کہ آسمان کا کوئی وجود نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کا یہ خیال اس بناء پر قائم نہیں ہوا کہ انہیں آسمان کے موجود نہ ہونے پر کوئی دلیلِ قطعی مل گئی ہے، بلکہ ان کے استدلال کا حاصل صرف یہ ہے کہ ہمیں آسمان کے وجود کا علم نہیں ہوسکا، اس لئے ہم اس کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔ دُوسرے الفاظ میں یہ خیال ''علمِ عدم'' کے بجائے ''عدمِ علم'' پر مبنی ہے ...... لہٰذا ہم جو قرآن وسنت کی قطعیت پر ایمان رکھتے ہیں، پورے وثوق اور اعتماد کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ ان سائنسدانوں کی یہ رائے قطعی غلط ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ قرآن وسنت کی تصریح کے مطابق آسمان موجود ہے، مگر سائنس اپنی کم علمی کی بناء پر اسے دریافت نہیں کرسکی، اور اگر انسان کی سائنسی معلومات میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا تو عین ممکن ہے کہ سائنس دانوں کو اپنی اس غلطی کا احساس ہوجائے اور وہ اسی طرح آسمان کے وجود کو تسلیم کرلیں جس طرح بہت سی ان چیزوں کو تسلیم کیا ہے جن کا پہلے انکار کیا جاتا تھا۔

مشکل یہ ہے کہ ہمارے یہاں ہر چیز کو اس کے مقام پر رکھنے کی ذہنیت ختم ہوتی جارہی ہے، جب کسی چیز کی اہمیت ذہن پر سوار ہوتی ہے تو بسا اوقات اس میں حدود سے تجاوز ہونے لگتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی نہایت مفید اور ضروری فنون ہیں، اور دورِ حاضر میں تو مسلمانوں کے لئے از حد ضروری ہے کہ ان فنون کی طرف بطورِ خاص توجہ دے کر ان میں ترقی کی انتھک کوشش کریں، اس کے بغیر موجودہ دُنیا میں ان کے لئے اپنا جائز مقام حاصل کرنا ممکن نہیں رہا، لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ کوئی سائنسدان اپنے ظن وتخمین سے جس کسی نظریئے کا اعلان کردے اسے وحی کی طرح دُرست تسلیم کرلیا جائے، اور اس کی بناء پر قرآن وسنت میں تأویل وترمیم کا دروازہ کھول دیا جائے، یا اس کی بناء پر قرآن وسنت میں شکوک وشبہات پیدا ہونے لگیں، خاص طور پر جب یہ شب و روز کا مشاہدہ ہے کہ سائنس کے اس قسم کے نظریات آئے دن بدلتے رہتے ہیں۔

۳:- یاد رکھئے کہ اسلام کا معاملہ عیسائیت سے بہت مختلف ہے۔ عیسائی مذہب میں اتنی جان نہیں تھی کہ وہ زمانے کی نت نئی ضروریات اور انسان کی بڑھتی ہوئی سائنٹفک معلومات کا مقابلہ کرسکتی،

لہٰذا سائنس اس کے لئے ایک عظیم خطرہ بن کر سامنے آئی۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ کلیسا کے وقار کو سلامت رکھنے کے لئے یا تو سائنس کی مخالفت کرے یا اپنے مذہب میں ردّ و بدل کرے۔ شروع میں رومن کیتھولک چرچ نے پہلے راستے کو اختیار کیا، اور چونکہ عوام پر اس کا اقتدار قائم تھا، اس لئے گلیلیو جیسے سائنسدانوں کو بے شمار رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا، لیکن جب کلیسا کا اقتدار ڈھیلا پڑا تو اب اس کے لئے سوائے اس کے کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ اپنے مذہب میں ترمیم کر کے اس کی نئی تشریح و تعبیر کریں۔ چنانچہ اہلِ تجدّد (Modernism) کے مکتبِ فکر نے یہ راستہ اختیار کرلیا۔

لیکن یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ عیسائی مذہب کو انتہائی غیر فطری اور غیر معقول بنیادوں پر کھڑا کیا گیا تھا۔ اسلام کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے، وہ دینِ فطرت ہے، اور عقل و خرد کی کوئی دلیل اسے چیلنج نہیں کرسکتی۔ اس میں زمانے کی ہر ضرورت کو پورا کرنے اور ہر دور کی تحقیقات کے ساتھ آنکھیں ملانے کی پوری صلاحیت ہے۔ لہٰذا ہمیں اسلام کے وقار کو سلامت رکھنے کے لئے سائنس کی مخالفت کی ضرورت ہے، نہ اسلام کو بدلنے کی، اس لئے کہ ہمارا ایمان یہ ہے کہ سائنس جس قدر ترقی کرے گی اور انسان کی سائنسی معلومات میں جتنا اضافہ ہوگا اسلام کی حقانیت اور واضح ہوتی چلی جائے گی، بشرطیکہ انسان کا نقطۂ نظر صحیح معنوں میں سائنٹفک رہے، اور وہ محض قیاس و تخمین کو یقین اور مشاہدے کا درجہ نہ دے بیٹھے۔

بس یہ ہے وہ بات جو علمائے دین کہتے ہیں، اس کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہر چیز کو اس کے صحیح مقام پر رکھنا چاہئے، جذباتی نعروں کی رو میں آکر حدود سے تجاوز کر جانا دانشمندی کا تقاضا نہیں ہے۔

حیرت ہے کہ اس معتدل اور سو فیصد معقول بات کی وجہ سے بعض حضرات مسلسل یہ تشہیر کر رہے ہیں کہ علماء، سائنس اور ٹیکنالوجی کے مخالف ہیں، اور اس میدان میں ترقی کرنا ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ اس الزام کے جواب میں ہم یہ دُعا کرنے کے سوا کیا کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان حضرات کو فکرِ سلیم عطا کرے۔

واللہ سبحانہ اعلم

آخر جمادی الاولیٰ ۱۳۸۷ھ (۱)

اہرام کے فوائد اور اثرات کی شرعی حیثیت

سوال:- اہرام کے اندر کھانے پینے کی اشیاء رکھنے سے وہ سڑتی نہیں بلکہ ٹھوس اور سکڑ جاتی ہیں، مثلاً:-

---

(۱) یہ فتویٰ ''البلاغ'' کے شمارہ جمادی الثانی ۱۳۸۷ھ سے لیا گیا ہے۔ (مرتب عفی عنہ)

دُودھ رکھا جائے تو وہ دہی یا پنیر میں تبدیل ہوجاتا ہے۔
گوشت رکھا جائے تو وہ سڑتا نہیں بلکہ خشک ہوجاتا ہے۔
چائے یا تمباکو رکھنے سے ان کی تلخی یا کڑواہٹ ختم ہوجاتی ہے۔
اہرام کے اندر اگر پانی رکھا جائے تو بعد میں وہ اہرامی پانی اگر:-
پودوں میں ڈالا جائے تو ان کی نشو ونما اور جسامت میں اضافہ ہوجاتا ہے۔
سر کے بالوں میں لگایا جائے تو بال گرنے بند ہوجاتے ہیں اور پیدائش میں اضافہ ہوتا ہے۔
سردیوں میں جلد پر لگایا جائے تو پھٹی ہوئی جلد ٹھیک ہوجاتی ہے، اور چہرے پر لگایا جائے تو جھرّیاں ختم ہوجاتی ہیں۔
عادی شرابی کو پلایا جائے تو شراب کی طلب ختم ہوجاتی ہے۔
مچھلی گھر میں ڈالا جائے تو مچھلیوں کی افزائش میں اضافہ ہوجاتا ہے۔
جانوروں کے آگے اگر اہرامی پانی اور عام پانی رکھا جائے تو وہ اہرامی پانی پیتے ہیں۔
اہرام کے اندر اگر دوا رکھی جائے تو اس کی تاثیر بڑھ جاتی ہے۔
اہرام کے اندر اگر پھلوں اور ترکاریوں کے بیج رکھے جائیں تو ان بیجوں سے طاقت ور پھل زیادہ پھل پھول والے درخت اور سبزیاں پیدا ہوں گی۔
اگر گلاب اور دُوسرے درختوں کی قلمیں پانی میں ڈبو کر اہرام کے اندر رکھی جائیں تو ان قلموں سے جڑیں بہت جلد نکلتی ہیں۔
اگر استعمال شدہ بلیڈ اہرام کے اندر رکھا جائے تو اس کی دھار دوبارہ تیز ہوجاتی ہے۔
زخموں اور چوٹوں کے اُوپر جب اہرام رکھا گیا تو وہ بہت جلد اچھے ہوگئے۔
سائنس دانوں نے بیماریوں کے جراثیم اہرام میں رکھے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ جراثیم یا تو مکمل طور پر ختم ہوگئے یا ان کی پیدائش وافزائش میں حیرت انگیز کمی ہوئی۔
مختلف بیماروں کو اہرام کے اندر بٹھانے سے پہلے اور بٹھانے کے بعد ان کے خون کا تجزیہ کیا گیا، ڈاکٹر حیران رہ گئے کہ اہرامی قوت نے آدھے گھنٹے کے اندر خون کے اجزاء میں کافی تبدیلیاں کردیں۔ اب آپ فرمایئے کہ:-

۱:- اہرام جسے انگریزی میں پائی رامڈ (Pyramid) کہتے ہیں، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

۲:- دُنیا کے مختلف علاقوں میں بسے ہوئے اہرام خصوصاً مصر جن میں سے ایک کے اندر فرعون کی لاش موجود ہے، چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے بھی پہلے کے ہیں، اس لئے کیا

اہرام کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ملتی ہیں یا نہیں؟ نیز یہ کہ قرآن کے اندر بھی اہرام کے متعلق کچھ مضمون بیان کیا گیا ہے یا نہیں؟

۳:- حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دور میں کیا اہرام استعمال کرنے یا اہرامی شکل کے مکانات بنانے کا رواج موجود تھا یا نہیں؟

۴:- ''اہرام کے فوائد'' جو پچھلے صفحے پر بیان کئے گئے ہیں، ان کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اگر ان کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے تو پھر اہرام کی پُراسرار قوت کا راز کیا ہے؟ کیا ان فوائد کا حاصل ہونا کسی جادو وغیرہ سے تعلق رکھتا ہے یا یہ کسی دُنیاوی علوم کا نتیجہ ہیں؟

۵:- کیا یہ فوائد حاصل کرنے کے لئے اہرام سے استفادہ کرنا شرعاً جائز ہے؟

۶:- چونکہ اہرام سے دو چیزوں کا خاص تعلق ہے، جن میں سے شمال اور جنوب کا تعین کرنا، کیا ان کی بھی کوئی شرعی حیثیت ہے یا ان کا تعلق کسی دُنیاوی علوم سے ہے؟

۷:- کہا جاتا ہے کہ اکثر اہرام خیالات وخواہشات کو مادّی شکل دیتا ہے، کچھ لوگوں نے قابلِ عمل خواہشات کو لکھ کر اہرام کے اندر رکھا، کچھ عرصے کے بعد ان کی خواہشات خود بخود پوری ہوگئیں، کیا ایسا ہونا شرعاً ممکن ہے؟

۸:- تجربات اور مشاہدات سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ مکمل چاند اور بعض اوقات سیاروں اور زمین کی گردش کی وجہ سے اہرام کے بعض اثرات میں زیادتی اور بعض میں کمی واقع ہوجاتی ہے۔ موجودہ مغربی طب نے بڑی حد تک سیاروں کے اثرات کے بارے میں واضح ثبوت فراہم کئے ہیں، مثلاً پورے چاند پر، جنون، پاگل پن، مراقی کیفیت، خودکشی، قتل اور جرائم کی واردات میں اضافہ ہوتا ہے، یہاں تک کہ عورتوں کے ایامِ حیض بھی چاند کی گردش سے متأثر ہوتے ہیں، اور اس بات کا بھی لوگوں کو عملی تجربہ ہے کہ پورے چاند پر سمندر چڑھا ہوا ہوتا ہے۔

کیا چاند اور سیاروں کے اثرات کی کوئی شرعی حیثیت ہے یا نہیں؟ اگر ان کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے تو پھر ان تمام باتوں کے ظہور ہونے کی کیا وجوہات ہیں؟ اور ان پر یقین رکھنا شرعاً جائز ہوگا یا نہیں؟

جواب:- ''اہرام'' کی حقیقت اور خواص وآثار کے بارے میں قرآن وسنت نے کوئی بات ارشاد نہیں فرمائی، اس کا تعلق خالصۃً تجربے اور مشاہدے سے ہے۔ تجربے اور مشاہدے سے اگر ''اہرام'' کی شکل کے کچھ خواص یا فوائد ثابت ہوجائیں تو ان کو شریعت کے خلاف نہیں کہا جاسکتا، نہ ان خواص کو ظاہری اسباب کے درجے میں تسلیم کرنے سے کسی اسلامی عقیدے میں نقص واقع ہوتا ہے،

بشرطیکہ ان کو ظاہری سبب ہی کے درجے میں رکھا جائے، مؤثرِ حقیقی ہر چیز میں اللہ تعالیٰ کو سمجھا جائے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۱۲/۱/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۹۱/۵۷)

اجتہاد کی شرائط اور موجودہ دور میں کسی کو مجتہد قرار دینا

سوال:- پندرہ روزہ ''قافلہ'' میں ایک مضمون ''دیوبندی بریلوی اختلاف کا پسِ منظر، اصلاحی تحریک (از صاحبزادہ خورشید احمد گیلانی)'' نظر سے گزرا۔ کچھ اُمور جو حضرت سیّد احمد بریلویؒ اور ان کے رفقاء کی طرف منسوب کئے گئے ہیں وہ صحیح اور غلط کا ملغوبہ محسوس ہوتے ہیں، اور ذہنی پریشانی کا باعث بنتے ہیں۔ چونکہ یہ ناچیز دیوبند مسلک، تھانوی مشرب کا حامل ہے، اس لئے ان میں سے چند تحریروں کی نشاندہی کر کے حقیقتِ حال سے نقاب کشائی کا طالب ہے۔ اس مضمون کی یہ پہلی قسط رسالے میں شائع ہوئی ہے، لہٰذا مضمون ابھی جاری ہے، اس لئے مجھے اجازت دی جائے اس سوال اور آپ کے جواب کو بھی پندرہ روزہ ''قافلہ'' میں برائے اشاعت پیش کردوں تاکہ عامۃ المسلمین غلط فہمی سے غلط عقائد کو علمائے حق کی طرف منسوب سمجھ کر اہلِ حق سے مستفید ہونے سے محروم نہ رہیں بفضلہ تعالیٰ ان میں سے ایک بات یہ لکھی ہے کہ:-

''اجتہاد'' یہ ایک ایسا حق ہے جو ہر صاحبِ علم و بصیرت مسلمان کو حاصل ہے۔ یہ اجتہاد کسی خاص شخصیت اور خاص زمانے تک محدود نہیں بلکہ تاقیامت جاری رہے گا۔ وہابی تحریک کے ہم نوا اندھی تقلید کے حامیوں پر نکتہ چینی کرتے تھے، اس کا مطلب قطعاً یہ نہیں کہ وہ ائمہ اربعہ امام اعظمؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام مالکؒ کا احترام نہیں کرتے تھے، اور ان کے اجتہاد پر انہیں اعتماد نہیں تھا، کیونکہ اصل وہابی تحریک کے مؤسسِ اوّل شیخ محمد بن عبدالوہاب خود حنبلی مسلک رکھتے تھے اور مقلد تھے۔

جواب:- ''اجتہاد'' کی حقیقت یہ ہے کہ وہ بے شک اس لحاظ سے کسی زمانے کے ساتھ خاص نہیں ہے کہ اس کے بعد کسی زمانے میں پایا جانا عقلاً ناممکن ہو بلکہ وہ ایک ملکہ ہے جس کے پائے جانے کے لئے علم کی کچھ خاص شرائط ہیں، جو اُصولِ فقہ کی کتابوں میں مفصل مذکور ہیں۔ یہ شرائط پہلے زمانوں میں بکثرت پائی جاتی تھیں، اب عام طور سے ان شرائط کا آدمی نہیں ملتا، اس لئے اس دور میں کسی کو مجتہدِ مطلق قرار نہیں دیا گیا، البتہ اجتہاد کی کچھ خاص اقسام مثلاً اجتہاد فی المسائل کے لئے شرائط نسبۃً نرم ہیں اور آخری زمانوں میں اس کے حامل علماء ہوتے ہیں۔ مسئلہ تفصیل طلب ہے، ضرورت ہو تو حکیم الاُمت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا رسالہ ''الاقتصاد فی التقلید والاجتہاد'' اور احقر کا

رسالہ "تقلید کی شرعی حیثیت" ملاحظہ فرمائیں۔ واللہ اعلم

۱۳۹۹/۱۰/۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱۶۸۱/۳۰ د)

جنگِ جمل اور جنگِ صفین کے واقعہ کا انکار کرنا

سوال:- مسئلہ مشاجرات میں جو حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کے درمیان ہوا، جنگِ صفین و جمل میں آپس میں صحابہ کرامؓ مقتول ہوئے۔ زید اس واقعے کی سخت تردید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ "رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ" صحابہؓ کی صفت ہے، یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ آپس میں قتل وقتال کریں؟ (نعوذ باللہ) یہ صحابہ کرامؓ پر بہتانِ عظیم ہے۔ زید کا یہ انکار دُرست ہے یا نہیں؟

جواب:- اگر جنگِ جمل اور جنگِ صفین کا وقوع صرف کسی ایک تاریخی روایت سے ثابت ہوتا تو زید کا استدلال صحیح ہوتا، لیکن ان جنگوں کا وقوع تواتر سے ثابت ہے۔[1] اس لئے اس کا انکار دُرست نہیں۔ "رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ"[2] کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کبھی ایک دُوسرے سے کوئی اختلاف یا رنجش پیدا نہیں ہوتی تھی، لہٰذا اگر اجتہادی اختلافِ رائے کی بناء پر کوئی مشاجرہ پیدا ہو تو اس کے منافی نہیں ہوگا۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۱۱ھ

(فتویٰ نمبر ۹۲۳/۲۸ ج)

بقدرِ ضرورت علمِ دین سیکھنے کے لئے ایک مطالعاتی نصاب کا خاکہ

سوال:- گزارش ہے کہ حضراتِ علمائے کرام سے سنتے رہتے ہیں کہ دین کی بنیادی اور ضروری باتوں کا علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد وعورت پر فرض ہے، جیسا کہ حدیثِ پاک میں ہے: "طلب العلم فریضة علی کل مسلم ومسلمة" لیکن دین کی بنیادی اور ضروری باتوں کی تعیین ہم جیسے عامی مسلمانوں کو معلوم نہیں۔

دُوسری بات یہ ہے کہ جس طرح آپ نے دینی مدارس میں پڑھنے والے علمائے کرام کے لئے ایک نصاب مقرّر کر رکھا ہے، اس طرح عام مسلمانوں کے لئے بقدرِ ضرورت دین کا علم سیکھنے کے لئے کوئی نصاب مقرّر نہیں۔ اگرچہ حضراتِ علمائے کرام نے دینِ اسلام کی تعلیمات کو عام کرنے کے لئے اُردو زبان میں بہت سی کتابیں اور رسالے تحریر فرمائے ہیں۔

(۱) دیکھئے: تاریخ الطبری ج:۳ ص:۵۴ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت)، الاستیعاب ج:۳ ص:۱۳۷۵ (طبع دار الجیل بیروت)، الإصابة ج:۲ ص:۲۸۔

(۲) سورة الفتح:۲۹۔

آپ سے درخواست یہ ہے کہ آپ اُردو زبان میں لکھی ہوئی کتابوں کا ایسا مجموعہ تجویز فرمادیں جو عام مسلمانوں کے لئے علمِ دین سیکھنے کے لئے نصاب کا درجہ رکھتا ہو، اس نصاب کو پڑھ لینے کے بعد آدمی کو دین کی بنیادی اور ضروری باتوں کا علم حاصل ہوجائے، اور حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی محولہ بالا حدیثِ پاک کا منشا بھی پورا ہوجائے، بینوا توجروا۔

جواب:- گرامی نامہ ملا، آپ نے بہت اہم سوال پوچھا ہے۔ بقدرِ ضرورت دین کا علم حاصل کرنا واقعۃً ہر مسلمان پر فرض ہے۔ احقر کی رائے میں اس مطالعے کے دو حصے کرنے چاہئیں۔ پہلا حصہ ابتدائی ضروری معلومات پر مشتمل ہو جن کے بغیر ایک سچے مسلمان کی طرح زندگی گزارنا ممکن نہیں، اور دُوسرا حصہ پہلے حصے کی تکمیل کے بعد ایسے مطالعے پر مشتمل ہو جس سے دینی معلومات میں اتنی وسعت اور استحکام پیدا ہوجائے کہ انسان گمراہ کرنے والوں سے گمراہ نہ ہو، پہلے حصے میں احقر کی نظر میں مندرجہ ذیل کتب کا مطالعہ ضروری ہے:-

۱:- حیاۃ المسلمین　از　حکیم الاُمت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ
۲:- فروع الایمان　از　حکیم الاُمت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ
۳:- تعلیم الدین　از　حکیم الاُمت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ
۴:- مردوں کے لئے ''بہشتی گوہر'' اور عورتوں کے لئے ''بہشتی زیور'' از حکیم الاُمتؒ
۵:- جزاء الاعمال　از　حکیم الاُمت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ
۶:- سیرتِ خاتم الانبیاء　از　حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ
۷:- حکایاتِ صحابہؓ　از　شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب سہارنپوری مدظلہم
۸:- تاریخِ اسلام کامل　از　حضرت مولانا محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ
۹:- اُسوۂ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم از　حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی رحمۃ اللہ علیہ

دُوسرے حصے میں مندرجہ ذیل کتب شامل ہونی چاہئیں:-

۱:- معارف القرآن　از　حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ
یا　تفسیرِ عثمانی　از　شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ
۲:- معارف الحدیث کامل از　حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب مدظلہم
۳:- بہشتی زیور کے مسائل از　حکیم الاُمت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ
یا　علم الفقہ　از　حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ
۴:- عقائدِ اسلام　از　حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ
۵:- شریعت وطریقت　از　حکیم الاُمت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

ان شاء اللہ ان کتابوں کے مطالعے سے دین کی اتنی ضروری معلومات حاصل ہو جائیں گی کہ ان کے بعد اپنی زندگی بھی سنور جائے اور انسان کسی باطل نظریئے سے گمراہ بھی نہ ہو۔ والسلام

آخر جمادی الثانیہ ۱۴۰۲ھ[1]

کلمۂ طیبہ میں لفظ ''محمدؐ'' پر رفع، اور اذان میں اس پر نصب کی وجہ

سوال:- کلمۂ طیبہ میں لفظ ''محمد'' میں لفظ ''د'' ضمہ کے ساتھ اور اذان میں فتحہ کے ساتھ کیوں ہے؟ دونوں میں کیا فرق ہے؟

جواب:- یہ عربی زبان کے قواعد کی وجہ سے ہے۔ واللہ اعلم

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۸ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲۳/۱۹ الف)

میڈیکل کالج میں ڈاکٹری کی مخلوط تعلیم اور پوشیدہ انسانی اعضاء کے معائنے سے متعلق متعدد مسائل

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ دینِ متین مندرجہ ذیل مسائل کی بابت:-

(برائے مہربانی جواب لکھنے سے پہلے ایک بار تمام مسائل پڑھ لئے جائیں تاکہ تمام نکات سامنے آجائیں، اس کے بعد فرداً فرداً جواب تحریر فرمائیں، خصوصاً مندرجہ ذیل پیرا پڑھ لیں)

ہم میڈیکل کالج میں پڑھتے ہیں، ہماری تعلیم مکمل ہونے میں تقریباً ایک سال باقی ہے، مندرجہ ذیل تمام مسائل پڑھ لیں اور بعد از مکمل تحقیق، مفصل و مدلل جواب تحریر فرمائیں، ہر ایک کے لئے لکھیں کہ ۱:- جواز کی آخری حد کیا ہے؟ ۲:- جواز کی آخری حد کن شرائط پر ہے؟ ۳:- افضل کیا ہے؟ جزاک اللہ۔ پہلے یہ پڑھ لیں: یہاں میڈیکل کالج میں جتنے بھی داڑھی والے طلباء ہیں ان کو مولوی کہا جاتا ہے، تمام ''مولویوں'' کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ یہ انتہائی درجے کے نالائق ہوتے ہیں، اور ہمیں طعنے سننے پڑتے ہیں، اگر کبھی کوئی ''مولوی'' کسی سوال کا جواب دیدے تو اُستاد صاحب فرماتے ہیں: ''آج تو کمال ہی ہوگیا، کوئی معجزہ ہوگیا کہ مولوی صاحب نے جواب دے دیا۔'' اساتذہ اور دوست وغیرہ اکثر ہمیں ان الفاظ سے سمجھاتے ہیں: ''مولویوں کو زیادہ پڑھنا چاہئے کیونکہ اسی میں دین

---

(۱) یہ فتویٰ ''البلاغ'' کے شمارہ رجب المرجب ۱۴۰۲ھ سے لیا گیا ہے۔ (مرتب عفی عنہ)

کی عزّت ہے، نہ پڑھ کر مولوی دین کو بدنام کرتے ہیں، اور تمام لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ جو دین پر چلتا ہے وہ کسی کام کا نہیں رہتا، لہٰذا تمہاری وجہ سے دین بدنام ہورہا ہے۔'' ہم مولوی قطعاً نالائق نہیں ہیں بلکہ شرعی مجبوریوں کی وجہ سے پڑھائی اور معائنہ وغیرہ کی طرف کم سے کم توجہ دیتے ہیں، لوگ اور اساتذہ ہمیں طعنے دیتے ہیں کہ: ''نہ تم کسی پارٹی وغیرہ میں آتے ہو، نہ تم پڑھتے ہو، آخر تم لوگ کرتے کیا ہو؟'' ایک طرف دین کا حکم بھی ہے کہ اپنے آپ سے لوگوں کو غلط فہمی نہ ہونے دو، نیز دین کی اور اپنی عزّت کا خیال رکھو، بعض اوقات تو اساتذہ ایسی بات بھی کہہ دیتے ہیں جو صریح کفر ہوتی ہے۔

اب تک چار سال گزر چکے ہیں اور ہمیں کچھ بھی نہیں آتا، جس طرح ہم یہاں آنے سے پہلے کورے تھے، ویسے ہی اب بھی کورے ہیں، یقیناً کچھ نہیں آتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم لوگ شرعی مجبوریوں وغیرہ کی وجہ سے پڑھائی اور معائنہ وغیرہ پر توجہ نہیں دیتے۔

یہ بات بھی ہمارے سامنے کی ہے کہ ہم سے بڑے مولوی یعنی وہ مولوی صاحبان جو ہم سے پہلے یہاں سے تعلیم مکمل کرکے فارغ ہوئے ہیں، کوئی ان کے پاس جانا پسند نہیں کرتا، نہ ان کا کلینک چلتا ہے، وجہ وہی کہ انہوں نے معائنہ وغیرہ میں تجربہ حاصل نہیں کیا، لہٰذا ان کی تشخیص صحیح نہیں ہوتی، مریض کا حق ادا نہ کرنے کا گناہ علیحدہ ہے، اور یہ حدیث علیحدہ ہے کہ نااہل قاضی اور نااہل طبیب کا ٹھکانا جہنم کے سوا کچھ نہیں۔

وجہ یہی ہے کہ انہوں نے مریضوں پر پڑھا نہیں، اپنے ہاتھ سے کرکے نہیں دیکھا، معائنہ کرکے نہیں دیکھا، ان تمام باتوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل مسائل کا جواب عنایت فرمائیں۔

میڈیکل کالج میں مخلوط نظامِ تعلیم ہے، لڑکے لڑکیاں اکٹھے پڑھتے ہیں، پڑھانے والے اکثر مرد ہیں، بعض اوقات خواتین اساتذہ بھی پڑھانے آجاتی ہیں اور بے پردہ ہوتی ہیں، ہماری معلومات کے مطابق پورے پاکستان میں مردوں کے لئے علیحدہ کوئی میڈیکل کالج نہیں ہے، لاہور میں لڑکیوں کے لئے فاطمہ جناح کالج ہے، جہاں مخلوط نظامِ تعلیم نہیں ہے، مگر وہاں اساتذہ میں خواتین کے ساتھ مرد بھی شامل ہوتے ہیں، بہرحال ہمارے میڈیکل کالج میں مکمل بے پردگی ہے، بعض لڑکیاں ایسے کپڑے پہنتی ہیں کہ حدیث کے مطابق کپڑے پہن کر بھی ننگی رہتی ہیں، اور کپڑوں کے اندر جلد کا رنگ صاف نظر آتا ہے، اگر کپڑا باریک نہ ہو تو بھی بعض لڑکیاں تنگ لباس پہنتی ہیں جس سے جسم کے اُبھار واضح ہوجاتے ہیں، تمام لڑکیاں ایسی نہیں ہیں، بعض لڑکیاں چادر سے چہرہ ڈھانپے رکھتی ہیں مگر آنکھیں اور آس پاس کی جلد نظر آتی ہے، لڑکے اکثر تنگ پتلون پہنتے ہیں، جس سے ان کے سرین واضح رہتے ہیں، جو لڑکے شلوار قمیص استعمال کرتے ہیں ان میں سے بھی بعض کالر اور کف استعمال کرتے ہیں، ۹۹ فیصد لڑکوں کے ٹخنے

ڈھکے ہوتے ہیں، جبکہ لڑکیوں میں سے اکثر کے ٹخنے ننگے ہوتے ہیں، لڑکیوں کی آواز بھی سنائی دیتی ہے، بعض لڑکے لڑکیاں آپس میں کھلم کھلا باتیں کرتے ہیں، ہنسی مذاق کرتے ہیں۔ اساتذہ، خواتین ہوں یا مرد، وہ بھی ہنسی مذاق کرتے ہیں، یہاں مردوں کی کوئی تمیز نہیں، خصوصاً بعض اساتذہ تو یہ تک کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے لئے کوئی لڑکا یا لڑکی نہیں ہے، ہمارے لئے سب طالبِ علم ہیں اور بس۔

خواتین اساتذہ کی آواز بھی سننی پڑتی ہے، مکمل طور پر احتیاط کے باوجود بھی غیر محرَم کے چہرے پر نظر پڑ جاتی ہے، ورنہ کم از کم ان کی آواز تو مکمل طور پر سنائی دیتی ہے۔ یہ تمام تفصیل بتانے کا مقصد یہ ہے کہ یہاں مکمل بے دینی اور بُرائی کا ماحول ہے، آپ جانتے ہیں کہ قاعدہ یہ ہے کہ اگر کسی جگہ جانے سے پہلے معلوم ہو کہ وہاں گناہ کا کام ہوگا تو وہاں جانا حرام ہے، اور اگر وہاں جاکر پتہ چلے تو اُٹھ آنا واجب ہے، نیز گناہ کی طرف چل کر جانا بھی گناہ ہے، جو کام حرام میں ابتلاء کا سبب بنے وہ بھی حرام ہے اور اُوپر کی تفصیل میں تقریباً سب کے سب کبیرہ گناہ ہیں، اس تمام تفصیل کو ملحوظ رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل مسائل کا جواب عنایت فرمائیں۔

مسئلہ نمبر۱

۱/۱:- اس نظامِ تعلیم میں علم حاصل کرنا عورتوں کے لئے کیسا ہے؟

۱/۲:- اس نظامِ تعلیم میں علم حاصل کرنا مردوں کے لئے کیسا ہے؟

۱/۳:- لاہور کے فاطمہ جناح میڈیکل کالج میں عورتوں کا علم حاصل کرنا کیسا ہے؟ (وہاں اساتذہ مرد وخواتین دونوں ہوتے ہیں، مگر پڑھنے والی صرف لڑکیاں ہوتی ہیں)۔

۱/۴:- اگر یہ نظامِ تعلیم صحیح نہیں تو کیا مرد وعورت کسی کے لئے علم حاصل کرنا جائز نہیں ہے؟

۱/۵:- حکومت کا کام ہے کہ وہ لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے علیحدہ کالج بنائے اور وہ اس کے تمام اختیارات اور سہولیات رکھتی ہے، مگر جب تک حکومت یہ کام نہ کرے تو کیا اس وقت تک کوئی جواز نہیں کہ ہم لوگ علم حاصل کرسکیں؟ آپ جانتے ہیں کہ باقی علومِ دُنیا کے مقابلے میں علمِ طب افضل ہے اور اس کے بغیر چارہ نہیں، اگر ہم علم حاصل نہیں کرتے تو مردوں اور عورتوں کا علاج کون کرے گا؟ آخر اس صورت میں کوئی نہ کوئی متبادل صورت تو ہوگی؟

۱/۶:- خواتین اساتذہ پڑھانے کے لئے آئیں تو مردوں کے لئے کیا حکم ہے؟

۱/۷:- مرد اساتذہ پڑھانے کے لئے آئیں تو عورتوں کے لئے کیا حکم ہے؟

مسئلہ نمبر۲

ہمارے ہاں جتنی کتب پڑھنے کا کہا جاتا ہے تمام کی تمام دُوسرے ممالک کی ہوتی ہیں، ان

کتب میں انسانی تصاویر کثرت سے ہوتی ہیں اور اکثر تصاویر عریاں ہوتی ہیں، عریاں صرف وہ حصہ نہیں ہوتا جو دِکھانا مقصود ہے بلکہ پورے پورے انسان کی ننگی تصاویر ہوتی ہیں اور اس میں مردوں کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا، ان کے بارے میں قاعدہ تو یہ ہوا کہ ''بوقت بقدرِ ضرورت'' دیکھنا جائز ہے، یعنی جب تصویر کے بغیر سمجھنے کی کوئی صورت نہ ہو تو صرف وہی تصویر دیکھ لے اور صرف اتنی ہی دیکھے جتنا ضروری ہے، مگر اس بات کا فیصلہ کون کرے کہ بوقتِ ضرورت اور بقدرِ ضرورت دیکھ رہا ہے یا نہیں؟ ہم یہاں پر جوان ہیں بلکہ جوانی کی بلندیوں کو چھو رہے ہیں، اس صورت میں بوقتِ ضرورت کا تعین اور بھی زیادہ مشکل ہے، اگر تصویر دیکھنے کی بجائے صرف پڑھنے کی غرض سے کتاب کھولی تو بھی تصاویر پر نظر پڑتی ہی ہے، ننگی تصاویر دیکھ کر شہوت آمیز خیالات بھی آتے ہیں، بعض مضامین کتاب میں ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو پڑھنے سے شہوت آتی ہے، اگرچہ یہ علم حاصل کرنے کے لئے کیا جاتا ہے لیکن پوچھنا یہ ہے کہ ایسے مضامین یا ایسی کتاب کا پڑھنا، پڑھانا، سیکھنا، دیکھنا اور دُوسرے دوستوں کی غرض سے دِکھانا وغیرہ جائز ہے یا نہیں؟ اس میں بھی لکھ دیں کہ افضل کیا ہے؟ جواز کی آخری حد کیا ہے؟ اور جواز کی آخری حد کن شرائط پر ہے؟

میڈیکل کالج میں پڑھائی کے پانچ سال ہوتے ہیں، سالِ اوّل و دوم میں مردہ انسانی جسم کی چیر پھاڑ کروائی جاتی ہے، اس کا متبادل تو موجود ہے کہ پلاسٹک کے بنے اعضاء سے سیکھا جائے، سالِ سوم سے سالِ پنجم تک ہمیں ہسپتال اور وارڈوں میں بھیجا جاتا ہے، خصوصاً سالِ پنجم میں تو رات کو بھی جانا پڑتا ہے، وہاں پر ہمیں مریضوں پر پڑھایا جاتا ہے، پڑھنے کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اُستاد ایک مریض کے بارے میں کہہ دیتا ہے کہ اس سے پوچھو کہ اسے کیا تکلیف ہے؟ اور اس کے بعد اس کا معائنہ کرو، نظامِ تعلیم مخلوط ہے، لہٰذا لڑکے، لڑکیاں اکٹھے ہوتے ہیں، جب طالبِ علم اپنا کام پورا کرلیتے ہیں تو اُستاد صاحب تشریف لاتے ہیں طلباء و طالبات میں سے کوئی ایک تفصیل کے ساتھ مریض کی تکلیف اور معائنے کے بارے میں بتادیتا ہے، اُستاد صاحب اس میں سے غلطیاں نکالتے ہیں، سمجھاتے ہیں، وغیرہ۔

یہاں یہ بات یاد رہے کہ ہر بیماری مرد و عورت دونوں میں نہیں ہوتی، بعض بیماریاں صرف مردوں، اور بعض بیماریاں صرف عورتوں میں پائی جاتی ہیں، نیز کوئی جانور ایسا نہیں جو مکمل طور پر انسان کے مشابہ ہو، نیز معائنے کے دوران مختلف پٹھوں کی حرکت، دِل کی دھڑکن کی مختلف آوازیں، مختلف بیماریوں میں سانس کی مختلف آوازیں وغیرہ صرف انسان کے جسم میں دیکھی جاسکتی ہیں نہ کہ پلاسٹک کے اعضاء میں، اگرچہ بعض چیزیں کمپیوٹر پر ایسی آگئی ہیں کہ ان پر آواز سنی جاسکتی ہے، مگر ہر چیز پاکستان میں نہیں ملتی اور ہر طالبِ علم کمپیوٹر بھی نہیں خرید سکتا، نیز میڈیکل کالج میں بھی یہ سہولت نہیں

ہے۔ سب سے پہلے مریض سے اجازت لی جاتی ہے، اگر مریض (مرد وعورت) اجازت نہ دے تو اس کا معائنہ وغیرہ طالبِ علم کو کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

معائنہ کرنے کے چار حصے ہوتے ہیں، ۱:- دیکھنا، ۲:- ہاتھوں سے دبا کر ٹٹول کر چیک کرنا، ۳:- اُنگلی سے ٹھونک کر دیکھنا، ۴:- کانوں کے آلے (Stethoscope) سے اس حصے کی آواز سننا۔

۱:- دیکھنا

اس کے لئے ضروری ہے کہ جو حصہ دیکھنا ہو وہ حصہ اور اس کے آس پاس کا کافی حصہ ننگا کیا جائے، مثلاً قاعدہ یہ ہے کہ اگر سینہ دیکھنا ہو تو کم از کم ناف تک قمیص اُتروالی جائے، اور اگر پیٹ دیکھنا ہے تو سینے سے لے کر گھٹنوں تک بشمول شرم گاہ ننگا کیا جائے، اگرچہ کتب کے مطابق صحیح طریقہ یہی ہے، مگر پاکستان میں شرم گاہ سب کے سامنے نہیں کھولی جاتی بلکہ علیحدہ کمرے میں پردے کے ساتھ کھولی جاتی ہے، اس میں مرد کی شرم گاہ کا زیادہ خیال نہیں رکھا جاتا، البتہ عورت کی شرم گاہ کو عورت ہی کھولتی اور دیکھتی ہے، مردوں کو اجازت نہیں، بہرحال مریض مرد ہو یا عورت یہ کرنا پڑتا ہے، مرد میں تو خاص شرم گاہ کے حصے کے علاوہ باقی جسم کو ننگا کرنا بشمول ران گھٹنوں وغیرہ کے کچھ بُرا نہیں سمجھا جاتا، عورت مریض کی صورت میں دوپٹہ اُتروالیا جاتا ہے اور پیٹ کمر وغیرہ سے قمیص بھی ہٹالی جاتی ہے، عام طور پر اس سے زیادہ نہیں کیا جاتا۔

۲:- دبا کر، ہاتھ لگا کر دیکھنا

اس میں مریض کو جس حصے کی تکلیف ہو اس کو ہاتھ لگا کر اور دبا کر دیکھا جاتا ہے، تاکہ معلوم ہو کہ اس کی جلد اور جلد کے نیچے دُوسرے اعضاء اور پٹھے عام صحت مند آدمی کی طرح ہیں یا سخت ہیں یا نرم ہیں یا یہ کہ ہاتھ لگانے سے مریض کو درد ہوتا ہے یا نہیں، وغیرہ۔ یہاں بھی مرد وعورت (مریض ہو یا طالبِ علم) کی کوئی تخصیص نہیں۔

۳:- ٹھونک کر دیکھنا

اس میں ہاتھ اور اُنگلی کی مدد سے مریض کے جسم کے مختلف حصوں خصوصاً سینہ اور پیٹ کو ٹھونک کر دیکھتے ہیں، اور آواز کا موازنہ عام صحت مند انسان سے کیا جاتا ہے۔

۴:- کانوں والے آلے سے سننا

اس میں اگرچہ عموماً مریض کو ہاتھ نہیں لگتا، مگر جس جگہ آلہ لگایا جاتا ہے وہاں سے اکثر کپڑا ہٹالیا جاتا ہے۔

آپریشن تھیٹر

شعبۂ جراحت کی پڑھائی کے دوران طلباء و طالبات کو عملِ جراحی (آپریشن) دِکھایا جاتا ہے، اس میں طالبِ علم کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں ہوتی، مگر اسے دِکھایا جاتا ہے، یہاں پر بھی اُستاد، شاگرد اور مریض میں مرد و عورت کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا۔

آؤٹ ڈور O.P.D

اس میں مریضوں کا معائنہ اُستاد کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اس میں فلاں بیماری کی فلاں فلاں علامتیں ظاہر ہیں، چنانچہ طلباء و طالبات بیماری کی وہ علامتیں اس میں فرداً فرداً دیکھتے ہیں اور معائنہ کرتے ہیں۔

تمام میڈیکل کالجوں میں یہی طریقۂ تعلیم ہے اور اسی کا امتحان لیا جاتا ہے، اس تمام تفصیل کے بعد جواب طلب اُمور مندرجہ ذیل ہیں، اس میں لکھ دیں کہ افضل کیا ہے؟ جواز کی آخری حد کیا ہے؟ اور جواز کی حد کن شرائط کے ساتھ ہے؟ یاد رہے کہ سب سے پہلے مریض سے اجازت لی جاتی ہے، اگر مریض (مرد و عورت) اجازت نہ دے تو اس کا معائنہ وغیرہ طالبِ علم کو کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر۳

۳/۱:- مرد طالبِ علم کو مریض (مرد و عورت) سے بات کرنے کا کیا حکم ہے؟

۳/۲:- عورت طالبِ علم کو مریض (مرد و عورت) سے بات کرنے کا حکم کیا ہے؟

۳/۳:- مرد طالبِ علم کو مریض (مرد و عورت) کا معائنہ کرنے کا کیا حکم ہے؟

۳/۴:- عورت طالبِ علم کو مریض (مرد و عورت) کا معائنہ کرنے کا کیا حکم ہے؟

۳/۵:- اگر جواز نہیں تو اُستاد کے کہنے یا حکم کرنے کے بعد جواز کا کیا حکم ہے؟ جبکہ یہ فتنے کا دور ہے، اور طالبِ علم کے انکار پر اسے سالانہ امتحان میں فیل بھی کیا جاسکتا ہے۔

۳/۶:- آپ جانتے ہیں کہ عملِ جراحی مہارت کا کام ہے، اور مہارت ہاتھ سے کام کرنے سے آتی ہے، کالج میں عموماً ہاتھ سے کام تو نہیں کرنے دیا جاتا مگر عملِ جراحی دِکھایا جاتا ہے، اس کا کیا حکم ہے؟

۳/۷:- اگر ہر طرف سے بچ جائے تو دورانِ امتحان تو ہر طالبِ علم کا علیحدہ علیحدہ امتحان لیا جاتا ہے، پس دورانِ امتحان کیا حکم ہے؟ (افضل اور جواز مع شرائط)۔

۸/۳:- دورانِ تعلیم مرد و عورت طلباء و طالبات کو کہا جاتا ہے کہ مریض یا مریضہ کے مقعد یا اندامِ نہانی وغیرہ میں ہاتھ اور اُنگلیاں وغیرہ ڈال کر دیکھیں، اس کا حجم وغیرہ دیکھیں، اندر سے دبا کر دیکھیں، وغیرہ، ایسا کرنا کیسا ہے؟ (مریض اور طالبِ علم مرد یا عورت میں سے کوئی بھی ہوسکتا ہے) اگر جواز نہیں تو اُستاد کے کہنے یا حکم کرنے کے بعد جواز کا کیا حکم ہے؟ جبکہ یہ فتنے کا دور ہے، اور طالبِ علم کے انکار پر اسے سالانہ امتحان میں فیل بھی کیا جاسکتا ہے۔

مسئلہ نمبر ۴

شعبۂ حادثات یعنی ایمرجنسی وارڈ میں عموماً مریض آتے ہیں جن کی حالت نازک ہوتی ہے، لہٰذا وہاں بعض اوقات ایک ایک مریض پر دو دو، تین تین ڈاکٹر لگے ہوتے ہیں، بعض اوقات ڈاکٹر کم ہوں یا مریض زیادہ ہوں تو طالبِ علم کو بھی شامل کرلیا جاتا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ مریضوں کی جان بچانے کی کوشش کی جاسکے، اس حالت میں بوتل بھی لگائی جاتی ہے، بوتل لگانے کے لئے عام طور پر مریض کے بازو کی خون کی ورید پر سوئی لگائی جاتی ہے، اگر وہاں نہ ملے تو جسم کے دُوسرے حصوں پر ورید تلاش کی جاتی ہے، بعض اوقات سارے جسم میں کہیں نہیں ملتی اور جاکر شرم گاہ کے ساتھ ران پر ملتی ہے، مریض، ڈاکٹر اور طالبِ علم، مرد و عورت میں سے کوئی بھی ہوسکتا ہے، یہاں پر اگر مریض کی حالت زیادہ نازک ہو تو پردہ کا زیادہ خیال نہیں رکھا جاتا بلکہ اس کی جان بچانے کی طرف زیادہ توجہ دی جاتی ہے، ایسی حالت میں ڈاکٹر اور طالبِ علم (مرد و عورت) کے لئے کیا حکم ہے؟ بعد جواز مع شرائط اور افضل کیا ہے؟ لکھ دیں۔

مسئلہ نمبر ۵

کالج میں تعلیم کے دوران تمام طلباء و طالبات کے لئے ضروری ہے کہ کالج و ہسپتال میں کل حاضری میں سے ۷۵ فیصد حاضری کا ہونا اور ۷۵ فیصد اسباق اُستاد سے پڑھنا ضروری ہے، ورنہ اسے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت نہیں ہوتی، بعض اوقات سال ضائع ہونے کا احتمال بھی ہوتا ہے، لہٰذا ۷۵ فیصد حاضری کے لئے کالج اور ہسپتال میں جانا مجبوراً ضروری ہے، اس سے زیادہ جانا یا نہ جانا اپنے اختیار میں ہے، اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے بتائیں کہ:-

۱/۵:- ایسی حالت میں کیا یہ ضروری ہے کہ ۷۵ فیصد کے بعد طالبِ علم کالج نہ جائیں، اس سلسلے میں لکھا نہیں کہ افضل کیا ہے؟ اگر جواز ہے تو کیا ہے؟ اور کن شرائط پر ہے؟

۲/۵:- کالج میں زیادہ تر لوگ صرف اس لئے جاتے ہیں کہ ۷۵ فیصد حاضری ضروری ہے،

اگر یہ ضروری نہ ہوتو اکثر لوگ نہ جائیں، بعض اوقات اگر پڑھنے کا دِل نہ کرے یا سبق سمجھ میں نہ آئے یا خاتون اُستاد آجائے تو بعض طالبِ علم دینی کتب، مواعظ اور بعض ناول وغیرہ دورانِ سبق پڑھتے رہتے ہیں، اس کا کیا حکم ہے؟ کیا یہ صحیح ہے؟

۳/۵:- یہاں کالج میں ابوالاعلیٰ مودودی کی جماعت بھی ہے، جن کے نزدیک داڑھی اتنی رکھنا کافی ہے کہ دُور سے نظر آئے، کچھ لڑکے ان کے اثر سے، اور کچھ فیشن کے طور پر چھوٹی سی داڑھی رکھ لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں واجب پورا ہوگیا، جب ہم انہیں کہتے ہیں کہ داڑھی پوری رکھو تو وہ کہتے ہیں کہ کیا وہ داڑھی نہیں ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں، تو وہ کہتے ہیں کہ اگر صحیح نہیں تو کیا ہم نے داڑھی جتنی رکھی ہے کٹوادیں؟ ہم انہیں کیا جواب دیں؟ ایک مولانا صاحب نے فرمایا تھا کہ: انہیں بے شک کہہ دو کہ اس داڑھی کا کوئی فائدہ نہیں لہٰذا بے شک کٹوادیں۔ بتائیں کہ ہم انہیں کیا جواب دیں؟ (ان کا پوری داڑھی رکھنے کا کوئی ارادہ نہیں اور وہ اسی کو سنت، واجب سمجھتے ہیں)۔

۴/۵:- طلباء کا کالج جانے کو دِل نہیں کرتا، نیز اس کے لئے صبح صبح اُٹھنا پڑتا ہے، لہٰذا بعض طلباء دُوسروں کو کہہ دیتے ہیں کہ ہم نہیں جاتے مگر ہماری حاضری لگوادینا، کیا یہ جائز ہے کہ طالبِ علم نہ جائے اور کوئی دُوسرا اس کی حاضری لگادے؟ بعض اساتذہ اجازت دیتے ہیں، مگر اکثر ناراض ہوتے ہیں۔

مسئلہ نمبر ۶

یہاں میڈیکل کالج میں جتنے بھی داڑھی والے طلباء ہیں ان کو ''مولوی'' کہا جاتا ہے، تمام ''مولویوں'' کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ یہ انتہائی درجے کے نالائق ہوتے ہیں، اور ہمیں طعنے سننے پڑتے ہیں، اگر کبھی کوئی ''مولوی'' کسی سوال کا جواب دیدے تو اُستاد صاحب فرماتے ہیں: ''آج تو کمال ہی ہوگیا، کوئی معجزہ ہوگیا کہ مولوی صاحب نے جواب دے دیا۔'' اساتذہ اور دوست وغیرہ اکثر ہمیں ان الفاظ سے سمجھاتے ہیں: ''مولویوں کو زیادہ پڑھنا چاہئے کیونکہ اسی میں دین کی عزّت ہے، نہ پڑھ کر مولوی دین کو بدنام کرواتے ہیں، اور تمام لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ جو دین پر چلتا ہے وہ کسی کام کا نہیں رہتا، لہٰذا تمہاری وجہ سے دین بدنام ہو رہا ہے۔'' ہم مولوی قطعاً نالائق نہیں ہیں بلکہ شرعی مجبوریوں کی وجہ سے پڑھائی اور معائنہ وغیرہ کی طرف کم سے کم توجہ دیتے ہیں، لوگ اور اساتذہ ہمیں طعنے دیتے ہیں ''نہ تم کسی پارٹی وغیرہ میں آتے ہو، نہ تم پڑھتے ہو، آخر تم لوگ کرتے کیا ہو؟'' ایک طرف دین کا حکم بھی ہے کہ اپنے آپ سے لوگوں کو غلط فہمی نہ ہونے دو، نیز دین کی اور اپنی عزّت کا خیال رکھو، بعض اوقات تو اساتذہ ایسی بات بھی کہہ دیتے ہیں جو صریح کفر ہوتی ہے۔

اب تک چار سال گزر چکے ہیں اور ہمیں کچھ بھی نہیں آتا، جس طرح ہم یہاں آنے سے پہلے کورے تھے، ویسے ہی اب بھی کورے ہیں، یقیناً کچھ نہیں آتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم لوگ شرعی مجبوریوں وغیرہ کی وجہ سے پڑھائی اور معائنہ وغیرہ پر توجہ نہیں دیتے۔

یہ بات بھی ہمارے سامنے ہے کہ ہم سے بڑے مولوی یعنی وہ مولوی صاحبان جو ہم سے پہلے یہاں سے تعلیم مکمل کر کے فارغ ہوئے ہیں، کوئی ان کے پاس جانا پسند نہیں کرتا، نہ ان کا کلینک چلتا ہے، وجہ وہی کہ انہوں نے معائنہ وغیرہ میں تجربہ حاصل نہیں کیا، لہٰذا ان کی تشخیص صحیح نہیں ہوتی، مریض کا حق ادا نہ کرنے کا گناہ علیحدہ ہے، اور یہ حدیث علیحدہ ہے کہ نااہل قاضی اور نااہل طبیب کا ٹھکانا جہنم کے سوا کچھ نہیں۔ وجہ یہی ہے کہ انہوں نے مریضوں پر پڑھا نہیں، اپنے ہاتھ سے کر کے نہیں دیکھا، معائنہ کر کے نہیں دیکھا، ان تمام باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل مسائل کا جواب عنایت فرمائیں۔

۶/۱:- اس پیرے کی روشنی میں دین دار طلباء و طالبات کے لئے جواز کی آخری حد کیا ہے؟ اور کن شرائط سے ہے؟ نیز یہ بھی بتادیں کہ افضل کیا ہے؟ کیا ہمارے لئے کوئی جواز نہیں کہ ہم علم حاصل کرسکیں؟ کیا ہم پڑھائی چھوڑ دیں؟ اگر ہم پڑھائیں چھوڑ دیں گے تو ہمارے ماں باپ، دوست، رشتہ دار سخت باتیں کہیں گے، آپ جانتے ہیں کہ آج کل لوگوں کے ایمان کتنے کمزور ہیں، ہمیں یقین ہے کہ ہمارے کالج چھوڑنے پر بہت سے اپنے پرائے ایسی باتیں کریں گے کہ کافر ہو جائیں گے۔

۶/۲:- کیا ہم طلباء، جو یہاں پڑھ رہے ہیں، ہم سب گناہِ کبیرہ کے مرتکب اور فاسق ہیں یا نہیں؟

مسئلہ نمبر ۷

ہمارے کالج، ہسپتال اور دار الاقامہ کے قریب کم و بیش چھ مساجد ہیں، ہمارے کالج میں ایک ڈاکٹر صاحب پڑھاتے ہیں، ڈاکٹر صاحب شکل و صورت، لباس کے لحاظ سے ماشاء اللہ دین دار ہیں، ماشاء اللہ تعالیٰ حافظِ قرآن بھی ہیں، آواز بھی اچھی ہے، مگر مخلوط تعلیم میں پڑھاتے ہیں، حالانکہ ڈاکٹر ہیں، اپنا کلینک بھی کھول سکتے ہیں، یہ صاحب ہسپتال کی لیبارٹری میں کام بھی کرتے ہیں، غالباً اپنی ذاتی لیبارٹری بھی ہے، ان اُمور کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے فرمائیں کہ:-

۷/۱:- کیا مخلوط تعلیم میں پڑھانے کی وجہ سے یہ صاحب فاسق ہیں یا نہیں؟

۷/۲:- ان کی امامت میں فرض نماز کا کیا حکم ہے؟

۷/۳:- ان کی امامت میں تراویح کی نماز کا کیا حکم ہے جبکہ قریب میں اور مساجد بھی ہیں؟

۷/۴:- اگر قریب اور مسجد نہ ہو تو ان کی امامت میں فرض و تراویح کا کیا حکم ہے؟ افضل اور

حدِ جواز اگر ہو تو مع شرائط بیان فرمادیں۔

برائے مہربانی مکمل تحقیق کے بعد جواب عنایت فرمائیں۔ جزاک اللہ

واللہ تعالیٰ ھو الموفق وھو المستعان ولا حول ولا قوۃ الا بہ

سید فاتح عظمت اللہ، فرحان شہزاد،
محمد عمران، محمد ہارون محمود،
کمرہ نمبر ۲۹ جوہر ہال
(طلبہ قائداعظم میڈیکل کالج بھاولپور
۲۳ر صفر ۱۴۲۳ ہجری)

جواب:-

مسئلہ نمبر ۱

شریعت کا اصل حکم تو یہ ہے کہ نامحرم مردوں اور عورتوں کے اختلاط سے پرہیز کیا جائے، خاص طور پر ایسا مستقل مشغلہ اختیار کرنا، جس میں نامحرم خواتین کے ساتھ مستقل میل جول ہو، بغیر ضرورت کے جائز نہیں، لہٰذا حکومت اور مسلم معاشرے کی شرعی ذمہ داری ہے کہ وہ مخلوط تعلیم کی بجائے لڑکوں کے لئے الگ اور لڑکیوں کے لئے الگ تعلیمی ادارے قائم کریں، لیکن جب تک ایسا انتظام نہ ہو تو چونکہ میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنا ایک ضرورت ہے اور اس میدان میں متدین افراد کی کمی ہے جسے دُور کرنے کا یہی راستہ ہے کہ متدین افراد میڈیکل کی تعلیم حاصل کریں[۱]، اس لئے اگر اس تعلیم کے حصول کا وہ راستہ نہ ہو جو اُوپر بیان کیا گیا تو اس شرط کے ساتھ تعلیم کے حصول کی گنجائش معلوم ہوتی ہے کہ حتی الامکان اپنے آپ کو بے پردہ نامحرم خواتین سے دُور رکھیں اور جہاں کہیں ایسی خواتین کا سامنا ہو وہاں نگاہ نیچی رکھیں، اور اپنی نگاہ اور دِل کی حفاظت کریں۔

خواتین کے لئے بھی میڈیکل تعلیم کا حصول اس شرط کے ساتھ جائز ہے[۲] کہ وہ پردہ کا مکمل اہتمام کریں اور مردوں کے قریب نہ بیٹھیں، عورتوں کے لئے تعلیم کی غرض سے مردوں کو دیکھنے کی گنجائش ہے، مگر یہ گنجائش ضرورت کی حد تک ہی محدود رہنی چاہئے۔[۳]

مسئلہ نمبر ۲

جب کتاب کا اصل مقصود تعلیم ہے اور اس میں تصویریں ضمنی طور پر آئی ہیں تو ایسی کتاب کو اس شرط کے ساتھ رکھنا اور پڑھنا جائز ہے کہ تصویروں کے جن حصوں کی، تعلیم کے لئے ضرورت نہ ہو ان کو

(۱ تا ۳) وفی مقدمة ردّ المحتار ج:۱ ص:۴۲ (طبع سعید) قال فی تبیین المحارم واما فرض الکفایة من العلم فھو کل علم لا یستغنی عنه فی قوام أمور الدنیا کالطب والحساب .... الخ. نیز دیکھئے ص:۱۴۳ کا فتویٰ اور ص:۱۴۴ پر اس کا حاشیہ نمبر۱۔

یا تو مٹا دیا جائے یا کسی کاغذ وغیرہ سے چھپا دیا جائے، خاص طور پر ایسی تصویر جو شہوت کو برانگیختہ کرے اس کو اس طرح تبدیل کر دیا جائے کہ صرف وہ حصہ باقی رہے جو تعلیم کی غرض سے ضروری ہے، ضرورت کا تعین اس موضوع سے کیا جاسکتا ہے جس موضوع کی اس تصویر کے ذریعے تعلیم دی جارہی ہے۔

مسئلہ نمبر۳

۱،۲، ۵، ۶، ۷:- ان تمام کاموں میں جو کام طب کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ضروری ہیں، ان کو بقدرِ ضرورت انجام دینے کی گنجائش ہے، لیکن ہر کام میں اس بات کا لحاظ رکھا جائے کہ مریض کے ستر کا اتنا ہی حصہ کھلے جتنا معائنے کے لئے ضروری ہے، اگر عملے کا کوئی فرد اس میں بے احتیاطی کرے تو اسے تاکید کی جائے کہ وہ ضرورت سے زیادہ نہ کھولے۔[۱]

مسئلہ نمبر۴

جب جان بچانے کے لئے بوتل یا انجکشن لگانا ضروری ہو اور جسم کے ظاہری حصوں پر رگ نہ ملے تو ستر والے حصے میں رگ تلاش کرنے کی گنجائش ہے، اس میں ڈاکٹر اور طالبِ علم کے درمیان کوئی فرق نہیں، تاہم اس میں یہ بھی ضروری ہے کہ حتی الامکان مرد مریضوں کے ساتھ یہ عمل مرد ڈاکٹر یا طلباء کریں، اور خواتین کے ساتھ یہ عمل لیڈی ڈاکٹر یا طالبات کریں۔[۲]

مسئلہ نمبر۵

۱،۲:- ۷۵ فیصد، حاضری کی کم سے کم مقدار ہے، ورنہ تعلیم کی تکمیل کے لئے سو فیصد حاضری ضروری ہے، لہٰذا ۷۵ فیصد کے بعد بھی حاضری کا اہتمام کرنا چاہئے اور حاضر ہو کر تعلیم ہی پر متوجہ رہنا چاہئے، تاہم حتی الامکان ان احتیاطوں کو ملحوظ رکھا جائے جو اُوپر بیان کی گئیں۔

۳:- داڑھی کی شرعی مقدار ایک قبضہ ہے، داڑھی کا ایک قبضہ سے نیچے کٹوانا جائز نہیں،[۳] جن لوگوں نے داڑھی ایک قبضہ سے کم رکھی ہوئی ہے، وہ اگر یہ کہیں کہ جتنی رکھی ہوئی ہے کیا وہ ہم کٹوا دیں؟

(۱،۲) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۳۷۰ (طبع سعید) ینظر الطبیب الی موضع مرضها بقدر الضرورة اذ الضرورات تتقدر بقدرها وکذا نظر قابلة وختان وینبغی أن یعلّم امرأة تداویها لأن نظر الجنس الی الجنس أخف. وفی الشامیة تحته فی الجوهرة اذا کان المرض فی سائر بدنها غیر الفرج یجوز النظر الیه عند الدواء لأنه موضع ضرورة وان کان فی موضع الفرج فینبغی أن یعلم امرأة تداویها فان لم توجد وخافوا علیها أن تهلک أو یصیبها وجع لا تحتمله یستروا منها کل شئ الا موضع العلة ثم یداویها الرجل ویغض بصره ما استطاع الا عن موضع الجرح.

(۳) وفی الدر المختار کتاب الحظر والاباحة فصل فی البیع ج:۲ ص:۴۰۷ (طبع سعید) والسنة فیها القبضة .... ولذا یحرم علی الرجل قطع لحیته .... الخ. وفی البحر الرائق ج:۲ ص:۲۸۰ (طبع رشیدیه کوئٹه) واما الأخذ منها وهی دون ذلک کما یفعل بعض المغاربة والمخنثة من الرجال فلم یبحه أحد .... الخ.

تو جواب یہ نہیں ہے کہ "ہاں کٹوادیں!" بلکہ جواب یہ ہے کہ داڑھی پوری رکھیں، اور یہ بات دُرست ہے کہ داڑھی کم رکھنا بالکل منڈوانے سے بہتر ہے۔

۴:- دُوسرے طالبِ علم کی حاضری لگوانا دھوکا ہے اور بالکل ناجائز ہے۔

مسئلہ نمبر۶

اس سوال میں آپ نے جو باتیں لکھی ہیں، اکثر و بیشتر مبالغہ پر مبنی ہیں، اگر واقعۃً آپ تعلیم میں کورے ہیں تو اس کی وجہ دین دار ہونا نہیں، بلکہ تعلیم کی طرف توجہ نہ دینا ہے، اور یہ بھی غلط ہے کہ جو دین دار لوگ میڈیکل تعلیم حاصل کرکے فارغ ہوچکے ہیں ان کا کلینک نہیں چلتا، ملک کے ہر خطے میں ایسے متدین ڈاکٹروں کی کمی نہیں ہے جو اپنی فنی مہارت میں مشہور ہیں، لہٰذا اس احساسِ کمتری سے نکلئے، اور اپنی بے عملی کو اپنے تدین کے ساتھ وابستہ نہ کیجئے، اگر واقعی آپ ایسا کریں گے تو یقیناً متدین لوگ بدنام ہوں گے۔

جواز کی حدود پیچھے بیان کی جاچکی ہیں، ان حدود میں رہ کر اگر محنت سے تعلیم حاصل کی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ مہارت حاصل نہ ہو۔

مسئلہ نمبر۷

محض مخلوط تعلیم میں پڑھانے کی وجہ سے ان صاحب کو فاسق نہیں کہا جاسکتا، عین ممکن ہے کہ وہ نگاہ و دِل کی حفاظت کرتے ہوئے پڑھاتے ہوں، لہٰذا ان کی امامت میں نماز بھی جائز ہے، اگر قریب کوئی دُوسری مسجد موجود ہو تو شبہ سے بچنے کے لئے اس مسجد میں چلے جائیں، ورنہ ان کے پیچھے نماز پڑھیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۲۹/۴/۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۵۹۵/۱۶)

(بنو ہاشم، بنو اُمیہ، جنگِ جمل، جنگِ صفین، حضرت حسینؓ، حضرت معاویہؓ اور یزید سے متعلق متعدّد سوالات اور جوابات)

کیا بنو ہاشم اپنے کو خلافت کا سب سے زیادہ مستحق سمجھتے تھے؟

سوال ۱:- کیا بنو ہاشم اپنے آپ کو خلافت کا سب سے زیادہ مستحق سمجھتے تھے؟ جیسا کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب "شہادتِ حسینؓ" میں تحریر کیا ہے؟

قبولِ اسلام کے بعد بنو ہاشم اور بنو اُمیہ کی خاندانی رنجشوں کی کیفیت

سوال۲:- کیا اسلام قبول کر لینے کے بعد بھی بنو ہاشم اور بنو اُمیہ نے قبلِ اسلام کی خاندانی رنجشوں کو ختم نہیں کیا تھا؟ جیسا کہ واقعہ کربلا کے پسِ منظر میں بیان کیا جاتا ہے، حالانکہ قرآنِ پاک نے مسلمان ہونے کے بعد خصوصاً صحابہؓ میں مودّتِ قلبی کا ذکر کیا ہے، اثبات کی صورت میں اس تأثر کے حامل کا کامل الایمان ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

کیا حضرت علیؓ نے خلافت کے لئے خلفائے سابقہ کے اتباع کی شرط سے انکار کردیا تھا؟

سوال۳:- کچھ تواریخ میں ذکر آتا ہے کہ حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد انتخابی شوریٰ نے حضرت عثمانؓ وحضرت علیؓ کے سامنے اطاعتِ خدا و رسولؐ کے ساتھ اتباعِ خلفائے اوّل وثانی کی شرط بھی رکھی تھی، جسے حضرت عثمانؓ نے قبول کرلیا، لیکن حضرت علیؓ نے خلفائے سابقہ کے اتباع کی شرط کو قبول نہیں کیا، چنانچہ حضرت عثمانؓ کا انتخاب عمل میں لایا گیا، کیا یہ صحیح ہے؟ اور کیا اطاعتِ خدا و رسولؐ کے بعد خلفائے سابقین کا اتباع منتخب خلیفہ کے لئے ایک لازمی اُمر تھا؟

قصاصِ عثمانؓ کا مطالبہ کرنے والوں کا حقیقی مقصد قصاصِ عثمانؓ تھا یا حضرت علیؓ کو خلافت سے روکنا؟

سوال۴:- عام تاریخوں سے یہ تأثر ملتا ہے کہ قصاصِ عثمانؓ ایک بہانہ تھا، ورنہ اصل مقصد خلافتِ علیؓ کو مرتب نہ ہونے دینا تھا، اگر یہ تأثر قبول کرلیا جائے تو اس میں حضرت عائشہؓ سے لے کر حضرت معاویہؓ تک اور حضرت طلحہؓ و زبیرؓ سے لے کر عمرو بن العاصؓ اور ابوموسیٰ اشعریؓ تک سب ملوّث ہیں، اور ان کے علاوہ بہت سارے ایسے صحابہؓ بھی ملوّث ہیں جن کو اکابر میں شمار کیا جاتا ہے اور جن کے ذریعہ دین کا ایک بڑا حصہ ہم تک پہنچا ہے، مذہبِ اہل السنۃ کس چیز سے انکار کرے گا؟ فسادِ ایمان سے بچنے کے لئے سکوت اختیار کرنے کا حکم ضرور دیا گیا ہے، لیکن اس سکوت کو فرار سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

حضرت معاویہؓ کے کردار کا تاریخی وشرعی جائزہ

سوال۵:- تاریخوں سے حضرت معاویہؓ کے کردار کا مطالعہ کرنے کے بعد دو باتیں لازمی طور پر پیدا ہوتی ہیں، یا تاریخیں غلط یا حضرت معاویہؓ کا ایمان مصلحتِ وقت کا تقاضا تھا، تیسری صورت میں جیسا کہ اہل السنۃ انہیں اکابر صحابہؓ میں شمار کرتے ہیں، نبی کی تربیت اور ذات محلِ نظر رہ جاتی ہے۔

کیا حضرت معاویہؓ نے اپنی زندگی میں بزور ولی عہدی کی بیعت لی تھی؟

سوال۶:- حضرت معاویہؓ کا اپنی زندگی میں بزور ولی عہدی کی بیعت لینا ایک سیاسی مسئلہ ہے یا مذہبی؟ اگر سیاسی مسئلہ ہے اور حضرت معاویہؓ کو خلفائے راشدین میں شمار نہیں کیا جاتا تو اعتراض کس چیز کا رہ جاتا ہے؟ اس سلسلے میں دو ضمنی سوال بھی پیش ہیں:

الف:- کیا نفسِ ولی عہدی کی بیعت لینا صحیح نہیں ہے؟

ب:- لوگوں کو اپنے بعد کسی کو ولی عہد بنانے کی وصیت کرنے بلکہ جواب حاصل کرنے اور بیعت لینے میں کیا فرق ہے؟ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے آخری وقت میں نہ صرف حضرت عمرؓ کو ولی عہد نامزد کیا تھا، بلکہ لوگوں سے ان کی اطاعت کا اقرار بھی کرایا تھا، اور حضرت علیؓ نے بھی اپنے آخری وقت میں حضرت حسنؓ کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔

یزید کے لئے ولایتِ عہد کی بیعت لینے کا شرعی حکم

سوال۷:- یزید فاسق و فاجر تھا، اور ایسے بیٹے کے لئے ولایتِ عہد کی بیعت لینا جائز تھا یا ناجائز؟ ناجائز کام کرنا معصیتِ خداوندی ہے یا نہیں؟

حضرت معاویہؓ کے عہد میں یزید پر شرعی حد کیوں جاری نہیں کی گئی؟

سوال۸:- تاریخوں میں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضرت معاویہؓ کی خلافت کے زمانے میں شرعی عدالتیں موجود تھیں، جو خدا کی نافرمانیوں اور قابلِ تعزیر جرائم کا ارتکاب کرنے والوں پر حدود جاری کیا کرتی تھیں، کیوں یزید پر حد جاری نہیں کی گئی؟ جبکہ اس کا شرابی، زانی ہونا اس قدر مشہور تھا کہ بیعتِ ولی عہدی کے دوران اس کا بزور اظہار کیا گیا، اس مسئلے کو سامنے رکھتے ہوئے حضرت معاویہؓ کے لئے یہ ریمارکس قائم نہیں کیا جاسکتا: ”أَتَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ“؟

یزید کا حکم؟ اور کیا حضرت معاویہؓ کے عہد میں مجالسِ غناء عام تھیں؟

سوال۹:- تاریخوں میں اجمالی حیثیت سے یزید کے فسق و فجور کا ذکر تو آیا ہے، لیکن کسی خاص واقعے کا ذکر کم از کم اُردو ترجموں میں سامنے نہیں آیا، کیا کسی عربی تاریخ نے حضرت معاویہؓ کے عہد میں اس قسم کے واقعات کا ذکر کیا ہے؟ شاید ابنِ خلدون نے مجالسِ غناء کا ذکر کیا ہے، کیا اس قسم کی مجالسِ غناء جو خلافِ شرع ہوں حضرت معاویہؓ کے دور میں عام ہوا کرتی تھیں؟

حضرت حسینؓ کے نام کوفیوں کے خطوط میں کیا بات درج تھی؟

سوال ۱۰:- تاریخوں میں حضرت معاویہؓ کی وفات کے بعد حضرت حسینؓ کے ساتھ کوفیوں کی خط وکتابت کا جو تذکرہ اُردو میں منتقل ہو چکا ہے، اس کے مطابق حضرت معاویہؓ کی وفات پر حضرت حسینؓ کو مبارک باد اور اپنا حق لینے کی ترغیب ہے، اس خط وکتابت میں ایک فاسق و فاجر خلیفہ کو ہٹانے کی جدوجہد کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا، براہِ کرم اگر عربی تاریخوں میں ایسا کوئی واقعہ ہو تو مطلع کریں، مختلف روایتوں کے مطابق تین سو خطوط یا بروایت دیگر ۳ بوریوں کی مقدار میں خطوط آنے کے بعد اور وفود آنے کے بعد حضرت حسینؓ نے مکہ مکرّمہ چھوڑا۔

فاسق حکمران کے خلاف حضرت حسینؓ کے خروج و جہاد کی شرعی حیثیت

سوال ۱۱:- واقعہ کربلا کا پسِ منظر بتاتے ہوئے ہر تحریر وتقریر میں یہ بات وضاحت کے ساتھ آتی ہے کہ ایک فاسق و فاجر حکمران سے جہاد کی خاطر حضرت حسینؓ مکہ مکرّمہ سے نکلے تھے، یہ مقصد واجب تھا یا مستحب؟ اگر واجب تھا تو دُوسروں کو ترغیب دِلانا ضروری تھا، کیا حضرت حسینؓ نے اس سلسلے میں دُوسروں کو ترغیب دِلائی؟ اور اگر مستحب تھا تو نتائج کا اندازہ کرکے حضرت حسینؓ کو ترک کردینا چاہئے تھا، ہر صورت میں بہتر تھا کہ حضرت حسینؓ اپنے ہم نوا پیدا کرتے، پھر نظریاتی یا عملی دباؤ ڈال کر حالات کو بہتر بناتے، اور اگر یہ خیال تھا کہ تیس ہزار کوفی تیار ہیں جیسا کہ تاریخیں لکھتی ہیں اور مسلم نے اطلاع دی تھی اور بغیر کسی مشورے کے حضرت حسینؓ ان تک پہنچنا چاہتے تھے تو بھی پورے خاندان واسباب کو لے کر روانہ ہونا مناسب نہ تھا، اکیلے یا ایک دو ساتھی کو لے کر کسی غیر معروف راستے سے جاکر کوفہ والوں سے ملتے، بلکہ تاریخوں میں جیسے آتا ہے کہ کوفہ والوں نے کھلم کھلا یزید کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا اور مسلم کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، اور حکومت کو ان کے رُجحانات کا علم تھا، لہٰذا حکومت کی طرف سے مزاحمت متوقع تھی، چنانچہ حضرت حسینؓ کا ایسے حالات میں خاندان والوں کو لے کر نکلنا اپنے آپ کو اور مشن کو نقصان پہنچانے کے مترادف تھا، اس لحاظ سے حضرت حسینؓ کو اپنے اس مشن میں مخلص ماننے میں تأمل پیدا ہوتا ہے یا پھر یہ مقصد ہی نہ تھا؟

کیا یزید نے اپنی مملکت میں غیر اسلامی دستور جاری کیا تھا؟

سوال ۱۲:- بتایا جاتا ہے کہ یزید قانونِ شریعت کو بدلنا چاہتا تھا، حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرنا چاہتا تھا، کیا تاریخ وسوانح کے ذریعہ کہیں یہ نظر آتا ہے کہ اپنے خلاف ہونے والی جدوجہد کو کچلنے

کے بعد اس نے اپنی مملکت میں غیر اسلامی دستور رائج کیا تھا؟ حالانکہ اس کے بعد اسے کسی قسم کی مزاحمت کی توقع نہ تھی۔

یزید کے خلاف جدوجہد میں دیگر صحابہ کرامؓ کیوں شریک نہیں ہوئے؟

سوال ۱۳:- یزید کے خلاف جدوجہد میں اس دور کے بقیہ صحابہؓ کی عدمِ شرکت کو کس بات پر محمول کیا جائے؟ حالانکہ حضرت حسینؓ کے مقابلے میں کوئی آدمی، درجہ کا صحابی بھی نہیں بلکہ ایک فاسق و فاجر حکمران تھا، کیا آلِ علیؓ کے سوا کسی پر یہ فرض عائد نہیں ہوتا تھا؟ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ابنِ عباسؓ اور دیگر صحابہؓ نے انہیں روکنے کی کوشش بھی کی تھی۔

حضرت حسینؓ کی طرف سے جہاد اور مقابلے کے فیصلے کی وجہ

سوال ۱۴:- مرثیہ خواں ذاکروں کی طرح سنی واعظ بھی لہک لہک کر اشعار پڑھتے ہیں کہ سر داد و نداد دست در دستِ یزید۔ اور بتاتے ہیں کہ حضرت حسینؓ کسی صورت میں یزید جیسے فاسق و فاجر کی خلافت کو اپنی زندگی میں برداشت کرنے کو تیار نہ تھے، جان دے دی لیکن یزید کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا، حالانکہ واقعات کے اعتبار سے نہ تو حضرت حسینؓ مکہ مکرمہ سے یزید کی بیعت کے خوف سے نکلے تھے، نہ ان پر مکہ مکرمہ میں کسی نے جبر کیا تھا، بلکہ کوفیوں کی خط وکتابت پر نکلے اور راستے میں جب معلوم ہوا کہ کوفی بدعہد ہوگئے ہیں تو لوٹنے کا ارادہ فرمایا، لیکن مسلم کی شہادت پر مشتمل اعزہ و اقارب کی ضد کی وجہ سے ارادے کا ساتھ دیا اور آخر میں تین شرطیں تک پیش کردیں، پھر مقصد کیا تھا؟ سمجھ میں نہیں آتا۔

تاریخِ اسلام کو روایات کی تحقیق کے ساتھ ازسرِ نو مرتب کرنے کی ضرورت

سوال ۱۵:- آخر میں ایک اہم سوال پیشِ خدمت ہے، اسلامی تاریخِ قدیم کا ذخیرہ ایک عجوبہ سے کم نہیں، کہیں ایک فرشتہ ہے اور دوسری جگہ شیطان بن جاتا ہے، بدقسمتی سے تراجم کے سلسلے میں بھی کوئی احتیاط نہیں کی گئی، علمائے کرام نے اس طرف توجہ نہیں دی کہ قرآن وسنت اور آثارِ سلف کے ماہر علماء کا ایک بورڈ مقرر کرکے اختلافِ روایات پر تحقیق کرتے اور کم از کم اہلِ سنت کو ابتدائی تاریخ ایسی ملتی جس میں اکابر صحابہؓ اور قرونِ خیر کی ایک اچھی اور متفق علیہ تصویر ہوتی، اب بھی وقت گیا نہیں، کیا آپ اس سلسلے میں کچھ کرسکتے ہیں؟ ورنہ ہوسکتا ہے کہ آئندہ آنے والی نسلیں، دوسرے مذاہب کی نہیں بلکہ سیاسی وملکی رہنماؤں کی تاریخوں کو بے عیب اور متفق علیہ پاکر، اور اسلامی تاریخ کے پورے ذخیرے کو اختلافات اور کشت وخون سے بھرا ہوا پاکر، خلافِ اسلام مشنریز کے پروپیگنڈے میں آکر محمد

عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی اور ان کے خلاف کھلم کھلا زبان درازی پر اُتر آئیں، اعوذ باللہ من شر ذٰلک۔

جواب:- محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

شرمندہ ہوں کہ اب تک آپ کے سوالات کا جواب لکھنے کا موقع نہیں مل سکا، دراصل میں اس انتظار میں تھا کہ کوئی اطمینان کا وقت ملے تو مفصل جواب تحریر کروں، لیکن اندازہ یہ ہوا کہ اطمینان کا وقت ملنا بہت مشکل ہے، اب جو تھوڑی بہت فرصت ملی ہے اس میں اختصار کے ساتھ آپ کے سوالات کا جواب عرض کردینا زیادہ مناسب ہے، اگر کسی جواب میں پھر کوئی اِشکال رہ جائے تو براہِ کرم آپ دوبارہ رُجوع فرمالیں، اپنے ناقص علم کی حد تک میں ان شاء اللہ جواب عرض کردوں گا۔

سب سے پہلے ایک اُصولی بات عرض کردوں، اور وہ یہ کہ ہمارے پاس علمِ تاریخ پر کتابوں کا جو ذخیرہ موجود ہے اس میں ایک ہی واقعے سے متعلق کئی کئی روایتیں ملتی ہیں، اور تاریخ میں روایت کی چھان پھٹک اور جرح وتنقید کا وہ طریقہ اختیار نہیں کیا گیا جو حدیث میں حضراتِ محدثینؒ نے اختیار کیا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کتبِ تاریخ میں ہر طرح کی روایتیں درج ہوگئی ہیں، صحیح بھی اور غلط بھی۔ کسی معاملے کی حقیقت پسندانہ تحقیق کرنی ہو تو یہ ضروری ہے کہ رطب ویابس کے اس مجموعے میں سے صرف ان روایات پر اعتماد کیا جائے جو روایت اور درایت کے اُصولوں پر پوری اُترتی ہوں، اگر کوئی ایسا عالم جسے جرح وتعدیل کے اُصولوں سے واقفیت ہو، ان روایتوں کو ان ہی اُصولوں کے مطابق چھانٹتا ہے تو شکوک وشبہات کا ایک بہت بڑا حصہ وہیں ختم ہوجاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کے آخری زمانے میں عبداللہ بن سبا کی سازش نے جو تحریک شروع کی تھی اس کے دو بڑے مقاصد تھے، ایک صحابہؓ کی عظمت کو مجروح کرنا، اور دُوسرے جھوٹی روایتیں پھیلانا، چنانچہ انہوں نے بے شمار غلط سلط حکایتیں معاشرے میں پھیلانے کی کوشش کی۔ حضراتِ محدثینؒ نے پوری تندہی اور جانفشانی کے بعد احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو اس سبائی تحریک کے اثرات سے جدوجہد کرکے دُودھ کا دُودھ اور پانی کا پانی الگ کردیا، لیکن علمِ تاریخ میں اہتمام نہ ہوسکا اور وہ روایتیں کتابوں میں درج ہوتی رہیں جو خالص سبائی پروپیگنڈے کی پیداوار تھیں۔

ہاں! محتاط مؤرّخین نے اتنا ضرور کیا ہے کہ ہر روایت کی سند لکھ دی ہے، اور اب تحقیقِ حق کرنے والوں کے لئے یہ راستہ کھلا ہوا ہے کہ علمِ اسماء الرجال کی مدد سے وہ روایتوں کی تحقیق کریں اور جن روایتوں کے بارے میں یہ ثابت ہوجائے کہ وہ کسی سبائی تحریک کے فرد کی بیان کی ہوئی ہیں ان پر صحابہ کرامؓ کے بارے میں اعتماد نہ کریں، کیونکہ صحابہؓ کے فضائل ومناقب اور ان کا اللہ کے نزدیک انبیاء

کے بعد محبوب ترین اُمت ہونا، قرآنِ کریم اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ناقابلِ انکار دلائل سے ثابت ہے، لہٰذا اس سبائی پروپیگنڈے پر کان دھر کر قرآن وسنت کے واضح ارشادات کو دریا بُرد نہیں کیا جاسکتا، اہلِ سنت کا جو عقیدہ ہے کہ مشاجراتِ صحابہؓ کی تحقیق میں پڑنا دُرست نہیں بلکہ اس معاملے میں سکوت اختیار کیا جائے، یہ کوئی تلخ حقائق سے فرار نہیں بلکہ اس کی وجہ یہی ہے کہ تاریخی روایات میں سے صحیح اور غلط، اور سچی اور جھوٹی کا امتیاز ہر انسان کا کام نہیں ہے، اس لئے جو شخص جرح وتعدیل کے اُصولوں سے ناواقف رہ کر ان روایات کو پڑھے گا وہ ہرگز کسی صحیح نتیجے تک نہیں پہنچ سکتا، صحیح روایات میں مشاجراتِ صحابہؓ سے متعلق جو مواد آیا ہے اسے سامنے رکھ کر اہلِ سنت کے تمام مرکزی علماء نے متفقہ طور پر یہ عقیدہ اختیار کیا ہے کہ اگرچہ صفین وجمل کی جنگوں میں حق حضرت علیؓ کے ساتھ تھا، لیکن ان کے مقابل حضرت عائشہؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت معاویہؓ وغیرہم کا موقف بھی سراسر بے بنیاد نہیں تھا، یہ حضرات بھی اپنے ساتھ شرعی دلائل رکھتے تھے اور ان سے جو غلط فہمی صادر ہوئی وہ خالص اجتہادی نوعیت کی تھی۔ اس تمہید کے بعد آپ کے سوالات کا جواب درج ذیل ہے۔

۱:- مولانا ابوالکلام مرحوم کی کتاب میں نے نہیں پڑھی، اس لئے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن یہ خیال غلط ہے کہ بنو ہاشم اپنے آپ کو خلافت کا سب سے زیادہ مستحق سمجھتے تھے، اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کی خلافت تک بنو ہاشم کے کسی فرد نے خلافت کا دعویٰ نہیں کیا، صرف حضرت علیؓ کے بارے میں یہ منقول ہے کہ انہوں نے ابتداءً حضرت صدیقِ اکبرؓ کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی تھی، لیکن خود انہوں نے بعد میں یہ وجہ بیان فرمائی کہ میری رنجیدگی کا اصل سبب یہ تھا کہ ہمیں مشورۂ خلافت میں شریک نہیں کیا گیا، چنانچہ بعد میں انہوں نے برسرِ عام حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کی اور نہ صرف حضراتِ شیخینؓ بلکہ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے ساتھ بھرپور تعاون فرمایا۔

۲:- اسلام کے بعد بلاشبہ بنو ہاشم اور بنو اُمیہ کی خاندانی رنجشیں ختم ہوگئی تھیں، اس کے بعد جو تھوڑی بہت رنجشیں ظاہر ہوئی ہیں، ان کا سبب خاندانی رقابت نہ تھی بلکہ کچھ دُوسرے اُمور تھے، اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ ان رنجشوں کے باوجود دونوں خاندانوں میں برابر رشتے ناطے ہوتے رہے۔

۳:- یہ غلط ہے کہ حضرت علیؓ نے انتخابی شوریٰ کی اس شرط کو ٹھکرا دیا تھا کہ وہ خلفائے سابقین کی اتباع کریں گے۔ علامہ طبریؒ نے حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد شوریٰ کا واقعہ تفصیل کے ساتھ نقل فرمایا اور اس میں صحیح وغلط ہر طرح کی روایت جمع کی ہیں، لیکن اس میں یہ بھی موجود ہے کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے، جو شوریٰ کے متفقہ نمائندہ تھے، حضرت علیؓ سے پوچھا: "علیک عهد الله و میثاقه لتعلمن بكتاب الله وسنة رسوله وسيرة الخليفتين من بعده"، تم پر اللہ کی طرف سے عہد ہوگا کہ تم

کتاب و سنت اور آپؐ کے بعد آنے والے دو خلفاء کی سیرت پر عمل کروگے، اس کے جواب میں حضرت علیؓ نے فرمایا: "أرجو أن أفعل وأعمل بمبلغ علمي وطاقتي"، مجھے اُمید ہے کہ میں اپنے علم اور اپنی طاقت کی حد تک اس پر عمل کروں گا۔ (ملاحظہ ہو تاریخِ طبری ج:۳ ص:۲۹۷، مطبعۃ الاستقامہ قاہرہ ۱۳۵۷ھ) اسی طرح کے الفاظ ایک اور روایت میں بھی ہیں جو مذکورہ تاریخ کے صفحہ:۳۰۱ پر منقول ہیں ان کا حاصل یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنی طاقت کی حد تک اتباع کا وعدہ کیا تھا۔

۴:- عام تاریخوں میں یہ تاثر پیدا کرنے والے وہی عبداللہ بن سبا کے افراد ہیں، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ قصاصِ عثمانؓ کا مطالبہ کرنے والے صحابہؓ پوری دیانت داری کے ساتھ یہی سمجھتے تھے کہ حضرت عثمانؓ کا قصاص اگر اس مرحلے پر نہ لیا گیا تو ایک طرف دین کا ایک اہم حکم جس پر قرآنِ کریم کی کئی آیات اُتری ہیں مجروح ہوگا۔ دُوسری طرف فتنہ پرور لوگوں کی جرأتیں بڑھ جائیں گی اور وہ جس خلیفہ کے ساتھ چاہیں گے یہی معاملہ کریں گے، جنگِ جمل میں تو یہ بات کھل کر سامنے آگئی تھی کہ فریقین کے درمیان لڑائی صرف سبائی فتنہ پردازوں نے کرائی، حضرت عائشہؓ اور حضرت علیؓ صلح پر متفق ہوچکے تھے، رات کے وقت سبائی فتنہ پردازوں نے آپس میں مشورہ کیا اور کہنے لگے: "رأی الناس فینا واللہ واحد وان یصطلحوا وعليٌّ فعلی دمائنا"[1] (ہمارے بارے میں ان سب لوگوں کی رائے ایک ہے، اب اگر ہم میں اور ان میں صلح ہوگئی تو وہ ہمارے خون پر ہوگی)، عبداللہ بن سبا نے یہ تجویز پیش کی کہ "اذا التقی الناس غدًا فانشبوا القتال ولا تفرغوهم للنظر"[2] (جب کل یہ لوگ ملیں تو لڑائی شروع کردینا اور انہیں سوچنے کی مہلت نہ دینا)، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور انہوں نے لڑائی چھیڑ دی اس کے نتیجے میں جنگِ جمل پیش آئی۔ (ملاحظہ ہو تاریخ طبری ج:۳ ص:۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۴، ۵۰۵، ۵۰۷[3]، اور کامل ابنِ اثیر ج:۳ ص:۲۳۳، ۲۳۶، ۲۴۱، ۲۴۲[4]، اور البدایہ والنہایہ ج:۷ ص:۲۳۴ تا ۲۳۷)[5]

رہا حضرت معاویہؓ کا معاملہ جس وقت حضرت ابوالدرداءؓ اور حضرت ابوامامہؓ، حضرت معاویہؓ سے گفتگو کرنے کے لئے تشریف لے گئے ہیں اسی وقت حضرت معاویہؓ نے واشگاف الفاظ میں فرمایا کہ حضرت علیؓ مجھ سے بہتر اور افضل ہیں، میرا ان سے اختلاف صرف قصاصِ عثمانؓ کے معاملے میں ہے، وہ اگر حضرت عثمانؓ کا قصاص لے لیں تو اہلِ شام میں سب سے پہلے ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے والا

(۱) تاریخ طبری ج:۳ ص:۵۰۷ (مطبعة الاستقامة، قاهرة).
(۲) تاریخ طبری ج:۳ ص:۵۰۸ (مطبعة الاستقامة، قاهرة).
(۳) تاریخ طبری ج:۳ ص:۵۰۷ (مطبعة الاستقامة، قاهرة).
(۴) التاریخ الکامل لابن اثیرؒ تحت ذکر مسیر عليّ الی البصرة والوقعة ج:۳ ص:۹۲، ۹۳.
(۵) ذکر مسیر أمیر المؤمنین علي بن أبي طالبؓ من المدینة الی البصرة (طبع مطبعة السعادة بجوار محافظة، مصر).
نیز دیکھئے: البدایة والنهایة (طبع دار الفکر بیروت) ج:۵ ص:۲۳۴. (محمد زبیر)

میں ہوں گا، (البدایہ والنہایہ ج:۷ ص:۲۵۸، ۲۵۹، و ج:۸ ص:۱۲۹) اس کے بعد اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے یہ محض بہانہ بنایا تھا تو اس کے اطمینان کے لئے شاید کوئی اور بات کافی نہ ہوگی۔

۵:- آپ کا خیال بڑی حد تک صحیح ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ تاریخ میں حضرت معاویہؓ پر جو الزامات عائد کئے گئے ہیں، وہ غلط سلط اور موضوع روایات پر مبنی ہیں، اگر صرف صحیح روایات پر بھروسہ کر کے حضرت معاویہؓ کی سیرت کا مطالعہ کیا جائے تو صورتِ حال بالکل مختلف ہوجاتی ہے، میں نے اپنے مضمون ''حضرت معاویہؓ'' میں اس کو تفصیل سے بیان کیا ہے، یہ مضمون ''سیرتِ معاویہؓ'' کے اضافے کے ساتھ عنقریب کتابی صورت میں آجائے گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

۶:- یزید کی ولی عہدی کے مسئلے پر میں اپنے مقالے میں مفصل گفتگو کرچکا ہوں، اگر آپ نے اس کا مطالعہ فرمالیا ہوگا تو اُمید ہے کہ اس میں آپ کو تمام سوالات کا جواب مل گیا ہوگا۔

۷:- اس مسئلے پر بھی میں اپنے مضمون میں روشنی ڈال چکا ہوں۔

۸:- یزید کا شراب پینا یا زنا کرنا کسی بھی قابلِ اعتماد روایت سے ثابت نہیں ہے، زنا کی روایت تو میں نے کسی بھی تاریخ میں نہیں دیکھی، کسی نے جو شیعہ راوی ہے یزید کا شراب پینا وغیرہ بیان کیا ہے، لیکن کسی مستند روایت میں اس کا ذکر نہیں، اگر یزید کھلم کھلا شرابی ہوتا تو حضراتِ صحابہؓ کی اتنی بڑی جماعت اس کے ساتھ قسطنطنیہ کے جہاد میں نہ جاتی، اس دور کے حالات کو دیکھ کر ظنِ غالب یہی ہے کہ یزید کم از کم حضرت معاویہؓ کے عہد میں شراب نہیں پیتا تھا اور حدِ شرعی اس وقت قائم ہوسکتی ہے جبکہ دو گواہوں نے پیتے وقت دیکھا ہو، ایسا کوئی واقعہ کسی شیعہ روایت میں بھی موجود نہیں ہے۔

۹:- ابنِ خلدون نے صرف اتنا لکھا ہے کہ حضرت معاویہؓ کی وفات کے بعد یزید کا فسق ظاہر ہوگیا تھا، اس میں غالباً مجلسِ غناء کا تذکرہ بھی ہے۔

۱۰:- اس زمانے میں مکتوب نگاری کا اُسلوب نہایت مختصر ہوتا تھا، آپ اس دور کے کسی بھی ایسے مکتوب کی مثال نہیں پائیں گے جس میں تفصیل و اطناب سے کام لیا گیا ہو، مختصر خطوط میں سب باتوں کی رعایت ممکن نہیں، پھر کوفہ کے باشندے حضرت حسینؓ کو خواہ کس لئے بلا رہے ہوں، حضرت حسینؓ کا اپنا موقف یہ تھا کہ ایک سلطان متغلب جو، ان کی نظر میں نااہل تھا، ابھی پورے عالمِ اسلام پر غلبہ نہیں پاسکا، اس کے غلبے کو روکنا ان کے پیشِ نظر تھا، اور اسی مقصد کے لئے وہ روانہ ہوئے تھے۔ اس پہلو کو بھی میں اپنے مضمون میں واضح کرچکا ہوں۔

۱۱:- حضرت حسینؓ کے خروج کی شرعی حیثیت میرے مضمون میں موجود ہے، اُمید ہے کہ آپ نے دیکھ لی ہوگی، یہ کہنا مشکل ہے کہ آپؓ نے پورے خاندان کو لے کر جانا کس وجہ سے مناسب سمجھا

تھا؟ لیکن اگر بالفرض حضرت حسینؓ کو معاذ اللہ غیر مخلص قرار دیا جاتا تب بھی تو یہ سوال باقی رہتا ہے، درحقیقت حضرت حسینؓ کا خلوص شک وشبہ سے بالاتر ہے، انہوں نے جو کچھ کیا وہ اللہ کے لئے کیا، اب چودہ سو سال کے بعد ان کے ایک ایک جزوی اقدام کی ٹھیک ٹھیک حکمت و مصلحت معلوم کرنا ہمارے لئے نہ ممکن ہے، نہ ضروری۔

۱۲:- یزید کے بارے میں صحیح بات وہی ہے جو میں لکھ چکا ہوں، قانونِ الٰہی کو بدلنے کا کوئی ثبوت کم از کم مجھے نہیں ملا۔

۱۳:- جیسا کہ میں اپنے مضمون میں عرض کر چکا ہوں، یزید ایک سلطان متغلب تھا، شرعاً اس کا حکم یہ ہے کہ اگر وہ پورا کنٹرول حاصل کر چکا ہو تو اس کے خلاف خروج نہ کیا جائے گا، اور اگر اس کا غلبہ روکنا ممکن ہو تو روکنے کی کوشش کی جائے، حضرت حسینؓ سمجھتے تھے کہ اس کا غلبہ روکنا ممکن ہے اس لئے وہ روانہ ہوگئے اور دُوسرے حضرات صحابہؓ کا خیال تھا کہ اب اس کے غلبہ کو روکنا استطاعت میں نہیں اور اس کو روکنے کی کوشش میں زیادہ خون ریزی کا اندیشہ ہے، اس لئے وہ خود بھی خاموش رہے اور حضرت حسینؓ کو بھی اپنے ارادے سے باز آنے کا مشورہ دیا۔

۱۴:- ''سر داد و نداد دست در دستِ یزید'' کوئی نقطۂ نظر نہیں ہے، حضرت حسینؓ شروع میں یہ سمجھتے تھے کہ سلطان متغلب کا غلبہ روکنا ممکن ہے اس لئے روانہ ہوئے اور اہلِ کوفہ پر اعتماد کیا، لیکن جب عبداللہ بن زیاد کے لشکر سے مقابلہ ہوا تو کوفیوں کی بدعہدی کا اندازہ ہوا، اس وقت آپ کو یقین ہوگیا کہ اہلِ کوفہ نے بالکل غلط تصویر پیش کی تھی، حقیقت میں یزید کا غلبہ روکنا اب استطاعت میں نہیں ہے، اس لئے انہوں نے یزید کے پاس جاکر بیعت تک کرنے کا ارادہ ظاہر کیا مگر عبداللہ بن زیاد نے انہیں غیر مشروط طور پر گرفتار کرنا چاہا، اس میں انہیں مسلم بن عقیلؓ کی طرح اپنے بے بس ہوکر شہید ہونے کا اندیشہ تھا، اس لئے ان کے پاس مقابلہ کے سوا چارہ نہ رہا۔

۱۵:- کوئی شک نہیں کہ تاریخ کو اس طرح چھان پھٹک کر مرتب کرنا بہت ضروری ہے، لیکن آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اس میں کام بے شمار ہیں، آدمی کم۔ کوئی شخص کیا کیا کام انجام دے؟ آج کل ایک مفصل کتاب میرے زیرِ قلم ہے، کسی اور کام میں لگنا مشکل ہے، تاہم کوشش کروں گا کہ احباب کو اس طرف متوجہ کروں۔ میں دوبارہ معذرت خواہ ہوں کہ آپ کے جواب میں بہت تاخیر ہوئی لیکن ہجومِ مشاغل کا یہ عالم ہے کہ یہ خط بھی کئی روز میں مختلف نشستوں کے اندر پورا کیا ہے، خدا کرے کہ یہ باعثِ اطمینان ہوسکے۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ مجھے اصل عربی تواریخ میں مشاجراتِ صحابہؓ کے زمانے کے واقعات پڑھنے کا موقع ملا ہے، اور شاید تاریخ کی کوئی کتاب جو آج کل

ملتی ہے چھوٹی نہیں، لیکن بحمداللہ میرا دل و دماغ صحابہؓ کی طرف سے بالکل مطمئن ہے، پہلے میں اہلِ سنت کے عقائد کا تقلیداً اگر اتباع کرتا تھا، اب بحمداللہ تحقیقاً ان کا متبع ہوں، اور تمام صحیح و سقیم روایات دیکھنے کے بعد بفضلہٖ تعالیٰ اس عقیدے پر اور زیادہ شرحِ صدر ہوا ہے، اس موضوع پر والد ماجد مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم نے ایک مقالہ ''مقامِ صحابہؓ'' کے نام سے لکھا ہے جو اِن شاء اللہ ایک دو ماہ میں منظرِ عام پر آجائے گا، موقع ہوتو اس کا بھی مطالعہ فرمائیں۔

والسلام

محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۹؍ربیع الاوّل ۱۳۹۱ھ

(فتویٰ نمبر ۴۰۴/۲۲ الف)

کس قسم کی غلطی کو ''اجتہادی غلطی'' قرار دیا جائے گا؟

سوال:- مکرمی و محترمی مولانا محمد تقی عثمانی ایڈیٹر ''البلاغ'' کراچی۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ کے بعد عرض یہ ہے کہ ذوالحجہ کا خصوصی ایڈیشن ماہنامہ ''البلاغ'' نظر سے گزرا، پڑھ کر دِل مطمئن ہوا لیکن ایک عبارت پر چند شکوک ذہن میں پیدا ہوئے۔ ان شکوک کو رفع کرنے کے لئے آپ کو خط لکھ رہا ہوں تاکہ آپ کا منشاء اس عبارت سے معلوم کرسکوں، عبارت درج ذیل ہے:-

''لیکن چونکہ حضرت عائشہؓ ہوں یا حضرت معاویہؓ دونوں سے یہ عمل حضرت علیؓ کی عداوت یا بغض کی وجہ سے نہیں بلکہ شبہ اور تأویل کی بنا پر صادر ہوا تھا، اور بہرحال وہ بھی اپنے پاس دلائل رکھتے ہیں جو غلط فہمی پر مبنی سہی لیکن دیانت دارانہ تھے، اس لئے اُخروی اَحکام کے اعتبار سے ان کا یہ عمل اجتہادی غلطی کے ذیل میں آتا ہے، اس لئے ان پر طعن کرنا جائز نہیں، اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ذبیحہ پر جان بوجھ کر بسم اللہ چھوڑ کر اسے ذبح کردینا اور پھر اسے کھانا دلائلِ قطعیہ کی بناء پر گناہِ کبیرہ ہے، لیکن امام شافعیؒ نے اپنے اجتہاد سے اسے جائز سمجھا، اس لئے اگر کوئی شافعی المسلک انسان اسے کھالے تو اس کا یہ عمل دلائلِ شرعیہ کی رُو سے گناہِ کبیرہ اور فسق ہے لیکن چونکہ وہ دیانت دارانہ اجتہاد کی بناء پر صادر ہوا اس لئے اس شخص کو فاسق نہیں کہا جائے گا۔'' (''البلاغ'' ۱۳۹۰ ص:۷۲)

میرا اس عبارت پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ اگر کوئی شخص قرآن کی آیتوں کا انکار کرتا چلا جائے تو آپ اس کو دیانت دارانہ اجتہاد کہیں گے؟ اور اس کی نیت کو دیکھیں گے، حالانکہ اللہ تعالیٰ ہی دِلوں کی باتوں کو جاننے والا ہے تو آپ کیسے دعوے کر رہے ہیں؟ اگر مرزائی قرآن مجید کی آیتوں کی تلاوت کرتے جائیں اور یہ کہیں کہ ہماری نیت ٹھیک ہے اور ہم دیانت داری سے کرتے ہیں، تو کیا وہ آپ کے نزدیک ٹھیک ہوگا؟ اگر کوئی یہ کہے کہ مولانا مودودی نے یہ اجتہادی غلطی کی تو آپ اس کا کیا

جواب دیں گے؟

یہ شکوک میرے ذہن میں پیدا ہوئے اس لئے ان شکوک کو دُور کرنے کے لئے آپ کی طرف متوجہ ہو رہا ہوں، مہربانی فرما کر آپ میرے شبہات دُور کر کے خدا کے ہاں اَجرِ عظیم کے مستحق ٹھہریں۔

جواب:- محترمی و مکرمی!　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ

گرامی نامہ موصول ہوا، کسی شخص کی غلطی کو اجتہادی غلطی قرار دینے کے لئے میں نے جو دو شرطیں عرض کیں، وہ غالباً آپ کی نگاہ سے اوجھل رہ گئیں، اس کی وجہ سے یہ شبہ پیدا ہوا، میں نے عرض کیا تھا کہ اگر کوئی شخص اجتہاد کا اہل ہے، یعنی اس میں وہ علمی و عملی صلاحیت پائی جاتی ہے جو تمام اُمت نے مجتہد کے لئے ضروری قرار دی ہے، اور اپنے مسلک کی بنیاد کسی شرعی دلیل پر رکھتا ہے خواہ وہ دلیل ہمیں کمزور معلوم ہوتی ہے تو اس کا یہ عمل ''اجتہاد'' کہلائے گا، اور اگر اس میں کوئی غلطی ہو تو وہ ''اجتہادی غلطی'' ہوگی۔ امام شافعیؒ نے حضرت عائشہؓ کی ایک حدیث کی بناء پر یہ مسلک اختیار کیا کہ بغیر بسم اللہ پڑھے بھی ذبیحہ دُرست ہے۔[1] اور قرآنِ کریم کی آیات کو "مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللهِ" پر محمول کیا، ساری اُمت نے اسے اجتہادی غلطی اس لئے قرار دیا کہ ان میں اجتہاد کی شرائط پوری طرح پائی جاتی تھیں، اور یہ مسلک بہرحال ایک شرعی دلیل پر مبنی ہے جو کمزور سہی لیکن اجتہاد کی حدود میں داخل ہے۔

آپ نے یہ سوال بڑا اچھا کیا ہے کہ پھر آج کل دُوسرے لوگ اگر اسی اجتہاد کو بہانہ بنا کر قرآن و سنت میں غلطیاں کرنے لگیں تو ان کو کیا کہا جائے گا؟ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص شرائطِ اجتہاد کا حامل ہو تو اس کی غلطی کو اجتہادی غلطی کہیں گے، لیکن جن لوگوں کی آپ نے مثال دی ہے ان میں شرائطِ اجتہاد مفقود ہیں، اس لئے ان کی غلطی کو اجتہادی غلطی نہیں کہہ سکتے۔ یہاں یہ سوال ہوسکتا ہے کہ ایک غلطی کوئی مجتہد کرے تو باعثِ ثواب اور اگر غیر مجتہد کرے تو باعثِ ملامت، یہ بے انصافی کیوں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ اگر ایک سند یافتہ ڈاکٹر کسی مریض کو کسی غلط فہمی کی بناء پر غلط دوا دیدے اور اس سے مریض کا کام تمام ہوجائے تو اگر یہ ثابت ہو کہ اس نے اپنے پیشے کی بجاآوری میں دیانت داری سے وہ دوا دی تھی، تو دُنیا کا کوئی قانون اسے مجرم قرار نہیں دیتا، اس کے برخلاف اگر وہی دوا کوئی غیر سند یافتہ عطائی کسی مریض کو دے اور اس سے اس کی موت واقع ہوجائے تو دُنیا کا ہر قانون اس پر گرفت کرتا ہے۔

---

(۱) وفی المجموع شرح المهذب، باب الأضحية ج:۹ ص:۳۵۲ (طبع جديد، دار الكتب العلمية بيروت) فرع فى مذاهب العلماء فى التسمية على ذبح الأضحية وغيرها من الذبائح .... مذهبنا أنها سنة فى جميع ذلك، فان تركها سهوًا أو عمدًا حلّت الذبيحة ولا اثم عليه۔ نیز دیکھئے: روضة الطالبين ج:۳ ص:۲۰۵ (طبع المكتب الاسلامى)۔

یہ فرق اس لئے ہے کہ غلطی سے دُنیا کا کوئی انسان محفوظ نہیں ہے، البتہ اس کے ذمہ یہ ضروری تھا کہ غلطی سے بچنے کے جتنے اسباب و وسائل ہو سکتے ہیں ان کو پوری طرح اختیار کرے، جو شخص ڈاکٹر بننا چاہتا ہے اس کے لئے اسباب یہ ہیں کہ وہ فنِ طب کو ماہر اساتذہ سے حاصل کر کے ان سے سند لے، اس کے بعد اس سے کوئی غلطی ہو جاتی ہے تو یہ ایسی غلطی ہے جس سے کوئی انسان محفوظ رہنے کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ اسی طرح ایک عالم کے لئے ظاہری وسائل یہ ہیں کہ وہ قرآن و سنت کا پورا علم باضابطہ حاصل کرے، ماہر اساتذہ سے اس کی تربیت لے، اس کے بعد وہ غلطی کرے گا تو یہ ایک ماہر ڈاکٹر کی غلطی کی طرح قابلِ ملامت نہ ہوگی، اس کے برخلاف جس شخص میں اجتہاد کی اہلیت نہیں ہے اس کی مثال عطائی کی سی ہے کہ اس کی غلطی قابلِ ملامت اور موجبِ گرفت ہے۔

یاد آوری کے لئے شکر گزار ہوں اور دُعا کی درخواست ہے۔ والسلام

۱۳۹۱/۱/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲/۳۴۶ الف)

﴿فصل فی تعلیم القرآن وتعظیمہ وتلاوتہ﴾

(قرآنِ کریم کی تعلیم، تعظیم، تلاوت اور آداب سے متعلق مسائل کے بیان میں)

قصص القرآن کی فلم بندی کا شرعی حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین مندرجہ ذیل مسئلے کے بارے میں کہ ایک فلم قصص القرآن کے نام سے جاری کی گئی ہے، جس کے اندر مختلف قرآنی واقعات کو فلم کے طور پر پیش کیا گیا ہے، مثلاً بنی اسرائیل کے ذبح کا واقعہ، فرعون کے غرق ہونے کا واقعہ اور بنی اسرائیل کے خروج کا واقعہ، فلم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شبیہ نہیں دِکھائی گئی، بلکہ کسی اور شخص کی زبانی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اَحکام بنی اسرائیل تک پہنچائے گئے ہیں۔

ایسی فلم کو دیکھنے اور دِکھلانے کا شرعاً کیا حکم ہے؟ براہِ کرم مدلل بیان فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔

جواب:- قرآنِ کریم کے واقعات کی مصوّر فلم بنانا، دیکھنا اور دِکھانا ہرگز جائز نہیں، بلکہ قرآنِ کریم کی بے حرمتی کی بناء پر اس عمل میں شدید وبال کا اندیشہ ہے، اس کی بہت سی وجوہات ہیں جن میں سے چند یہ ہیں:-

۱:- قرآنِ کریم کے مضامین جس عظمت و جلال کے حامل ہیں اس کا تقاضا یہ ہے کہ ان مضامین کو قرآنِ کریم ہی کے الفاظ میں پورے ادب و احترام کے ساتھ پڑھا، یا سنا جائے، اس کے برعکس پیشہ ور اداکاروں، اور بہروپیوں کو مقدس قرآنی شخصیتوں کی مصنوعی شکل میں پیش کرکے ان سے قرآنِ کریم کے بیان کردہ واقعات کی مصنوعی نقالی کرانا، آیاتِ قرآنی کو کھیل تماشہ بنانے کے مرادف ہے، جو بنصِ قرآنی حرام ہے، آیت ہے:-

وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ .... الخ.

(سورۃ انعام: ۷۰)

۲:- کوئی فلم جانداروں کی تصاویر سے خالی نہیں ہوتی، اور جانداروں کی تصاویر بنانا، دیکھنا اور

دِکھلانا شرعاً جائز نہیں، لہٰذا قرآنی مضامین کو ایسے ذرائع سے پیش کرنا جو درجنوں احادیث کی رُو سے ناجائز ہے، نہ صرف حرام بلکہ قرآنِ کریم کی توہین کے مترادف ہے۔

۳:- واقعات کی فلم اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک اس میں عورتوں کے کردار نہ ہوں، چنانچہ مذکورہ فلم میں بھی کردار موجود ہیں، اور خواتین کے بے حجاب مردوں کے سامنے آنا یا ان کی تصاویر کا بلاضرورت نامحرَموں کو دِکھلانا قرآن و حدیث کی رُو سے بالکل ناجائز ہے، اور ناجائز کام کو قرآنِ کریم کے مضامین کو بیان کرنے کے لئے ذریعہ بنانا بھی نہ صرف حرام بلکہ معاذ اللہ قرآنِ کریم کی توہین کے مترادف ہے۔

۴:- کسی سچے سے سچے واقعے کو بھی جب فلم کی شکل دی جاتی ہے تو اس میں فلم ساز کے فرضی تخیلات کی آمیزش ناگزیر ہے، اس کے بغیر عموماً کوئی فلم تیار نہیں ہوسکتی، فلم ساز کو ایک مربوط فلم بنانے کے لئے لامحالہ واقعات کے خلاء کو اپنے فرضی قیاسات سے پُر کرنا پڑتا ہے، اور کچھ نہیں تو متعلقہ اشخاص کی شکل و شباہت، ان کی تعداد، ان کے انداز نشست و برخاست، ان کے اِردگرد پائے جانے والے ماحول، پسِ منظر اور ان کے عادات و خصائل کو لازماً قیاسی مفروضات کی بنیاد پر پیش کرنا پڑے گا، اور فلم میں ان سب باتوں کو قرآنِ کریم سے ممتاز نہیں کیا جاسکتا، لہٰذا یہ سارے قیاسات قرآنِ کریم ہی کی طرف منسوب کئے جائیں گے جو قرآنِ کریم کی معنوی تحریف کے مشابہ ہے۔

زیرِ بحث فلم کے بارے میں بھی ذمہ دار فلم دیکھنے والوں نے بتلایا ہے کہ اس میں قرآنِ کریم کے بیان کردہ واقعات کے ساتھ بہت سی اسرائیلی روایات اور فرضی تخیلات کو قرآنی واقعات کے ساتھ شامل کردیا گیا ہے، اور جن ناواقف لوگوں کو قصص القرآن سے واقف کرانے کے موہوم شوق میں یہ فلم دِکھلائی جارہی ہے، ان کے لئے قرآن اور غیرِ قرآن میں امتیاز کرنے کا کوئی راستہ نہیں، وہ اس سارے مجموعے ہی کو قرآنی مضامین سمجھیں گے اور ان کو قرآنِ کریم کے بارے میں اس سنگین غلط فہمی میں مبتلا کرنے کی ذمہ داری ان لوگوں پر ہوگی جو اس فلم کو بنانے یا دِکھانے کے ذمہ دار ہیں۔

۵:- قرآنِ کریم کے بیان کردہ واقعات میں بہت سے مقامات پر ایسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جن کی ایک سے زیادہ تشریحات ممکن ہیں، اور ان میں سے کسی ایک تشریح کو یقینی اور قطعی طور پر کسی دُوسرے احتمال کے بغیر قرآنِ کریم کی حقیقی مراد قرار دینا جائز نہیں، مفسرین جب ایسی آیات کی تشریح کرتے ہیں تو عام طور سے ممکنہ احتمالات ذکر کردیتے ہیں، ورنہ کم از کم کسی نہ کسی صورت سے یہ واضح کردیتے ہیں کہ اتنی بات قرآنِ کریم کی ہے اور اتنی تفسیر کی، تاکہ قرآن کا غیرِ قرآن سے ملتبس ہونا

لازم نہ آئے، یہ صورت فلم میں کسی طرح ممکن نہیں، بلکہ فلم ساز کے ذہن میں مذکورہ آیت یا واقعے کی جو تفسیر ہے صرف اسی کو لازماً قرآنی مضمون کی شکل میں اس طرح پیش کیا جائے گا کہ اس میں کوئی دُوسرا احتمال نہیں ہوگا اور فلم کے زور سے اسی تفسیر کا نقش ذہن پر اس طرح قائم کردیا جائے گا کہ گویا اس فلم میں بیان کردہ تصویر عینِ قرآن ہے، یہ صورت بھی قرآن اور غیرِ قرآن کے درمیان التباس پیدا کرنے کا موجب ہے، اس لئے بھی یہ فلم بالکل ناجائز ہے۔

۶:- فلم کا اصل منشاء تعلیم و تبلیغ نہیں ہوتا، بلکہ تفریحِ طبع اور کھیل تماشوں سے لذّت حاصل کرنا ہوتا ہے، لہٰذا اس فلم کو دیکھنے والے دراصل تفریحِ طبع کی غرض سے فلم دیکھیں گے نہ کہ علم، عبرت یا نصیحت حاصل کرنے کی غرض سے، جس کی واضح دلیل یہ ہے کہ اگر یہی مضامین اپنی اصلی صورت میں وعظ و تذکیر کے لئے بیان کئے جاتے تو یہ لوگ اس میں شریک ہونے کے لئے تیار نہ ہوتے، اور قرآنی مضامین کو سننے سنانے کا مقصدِ اصلی کھیل تفریح کو بنالینا کسی طرح جائز نہیں، بلکہ اس کا مقصدِ اصلی عبرت اندوزی ہے، اس کے ضمن میں تنشیط و تفریح بھی حاصل ہوجائے تو اور بات ہے، لیکن کھیل تفریح کو اصل قرار دے کر اسی کو مقصدِ اصلی بنالینا ہرگز جائز نہیں۔

مذکورہ بالا وجوہ کی بناء پر، نیز دُوسرے متعدّد مفاسد کے پیشِ نظر ایسی فلم بنانا، دیکھنا، دِکھانا سب ناجائز ہے، مسلمانوں کو اس سے سختی کے ساتھ پرہیز کرنا چاہئے اور حکومت کا بھی فرض ہے کہ نہ صرف یہ کہ ایسی فلمیں دِکھانے سے باز رہے بلکہ آئندہ اس قسم کی فلموں کی نمائش کا مکمل طور پر سدِ باب کرے۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۸/۹/۱۴۰۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۵۹۹/۳۵ د)

الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح
محمد رفیع عثمانی عفی عنہ	بندہ عبدالرؤف سکھروی	اصغر علی ربانی
دارالافتاء دارالعلوم کراچی ۱۴	۱۸/۹/۱۴۰۴ھ	۱۸/۹/۱۴۰۴ھ

ماہواری کی حالت میں تلاوت، کلمہ، دُرود پڑھنے کا حکم

سوال:- کیا ایامِ حیض میں عورت، سورت یا کلمہ اور دُرود وغیرہ پڑھ سکتی ہے؟

جواب:- قرآنِ کریم کی تلاوت تو بالکل نہیں کرسکتی، کلمہ، دُرود وغیرہ پڑھنے میں

مضائقہ نہیں۔[1]

والله اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۲؍۷؍۱۳۸۸ھ
(فتویٰ نمبر ۶۲/۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع

قرآنی آیات والے اخبارات کی بے حرمتی کرنا

سوال:- مولانا احتشام الحق صاحب جو جمعہ کو اخبار میں آیتیں چھپواتے ہیں، وہ دُکاندار، ردّی میں پھینک دیتے ہیں، کیا یہ دُرست ہے؟

جواب:- جن کاغذات پر اللہ، رسول کا نام یا قرآنی آیات واحادیث لکھی یا چھپی ہوں ان کو بے حرمتی کی جگہ ڈالنا دُرست نہیں ہے۔[2]

والله اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۵؍۷؍۱۳۸۸ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد عاشق الٰہی

جن کتابوں میں قرآنی آیات بھی ہوں انہیں حالتِ حیض میں پڑھنا اور چھونا، اور حالتِ حیض میں تلاوت واذکار جائز ہیں یا نہیں؟

سوال ۱:- عورت کے لئے حالتِ حیض میں ایسی کتابوں کو چھونا اور پڑھنا جن میں چند آیات کلامِ پاک کی لکھی ہوتی ہیں جائز ہے یا نہیں؟ ان آیات کو چھوڑ کر صرف ترجمہ، تفسیر اور مطلب پڑھ لیا جائے؟

۲:- ایسے زمانے میں زبانی کلامِ پاک، کلمہ جات، دُرود شریف پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب ۱:- اس معاملے میں اُصول یہ ہے کہ اگر کتاب کا اکثر یا آدھا حصہ قرآنی آیات پر مشتمل ہے تو حالتِ حیض ونفاس اور جنابت میں اس کا چھونا جائز نہیں، اور اگر کتاب کا اکثر حصہ غیرِ قرآن ہے تو اس کو اس مقام سے چھونا جائز ہے جہاں قرآنی آیات لکھی ہوئی نہیں ہیں۔

قال الشامی: ان کان التفسیر أکثر لا یکرہ، وان کان القرآن أکثر یکرہ، والأولیٰ الحاق المساواۃ بالثانی، وھذا التفصیل ربما یشیر الیہ ما ذکرناہ عن النھر، وبہ یحصل

---

(۱) وفی الدر المختار باب الحیض، ج:۱ ص:۲۹۳ (طبع ایچ ایم سعید) ویمنع قراءۃ قرآن .... ولا بأس لحائض وجنب بقراءۃ أدعیۃ ومسھا وحملھا وذکر اللہ تعالٰی وتسبیح۔ مزید حوالہ جات اگلے صفحے کے حاشیہ نمبر۲ میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) تفصیل اور دلائل کے لئے گذشتہ صفحہ نمبر ۱۹۴ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

التوفیق بین القولیین. (شامی ج:۱ ص:۱۶۴ طبع استنبول)۔[1]

۲:- قرآنِ کریم کی تلاوت تو بالکل ناجائز ہے، البتہ دُعائیں، اذکار و اوراد اور احادیث وغیرہ پڑھے جاسکتے ہیں۔[2]

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۵/۱۲/۳ھ

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی

(فتویٰ نمبر ۱۳۸۸/ ۱۸ الف)

شبینہ کی محفلوں میں لاؤڈ اسپیکر پر تلاوت، اس پر اُجرت اور سجدۂ تلاوت وغیرہ سے متعلق چند سوالات کے جوابات

چند سال سے سہلٹ کے اطراف میں شبینہ کے نام سے ایک نئی قسم کی مجلسیں قائم ہوتی ہیں جو عموماً مغرب سے طلوعِ آفتاب کے دو ایک گھنٹہ بعد تک باقی رہتی ہیں ..... حاضرین کی تعداد اتنی کم ہوتی ہے کہ وہاں مائیکروفون کی ضرورت ہرگز نہیں ہوتی، لیکن شاید ہی کوئی ایسی مجلس مائیکروفون سے خالی رہتی ہے، حاضرینِ مجلس اکثر سوتے رہتے ہیں، کوئی خراٹے لیتا ہے، کوئی اُونگھتا ہے، کوئی باہر بیڑی سگریٹ پی رہا ہے، اس کی بدبو مجلس تک آتی رہتی ہے ..... گھر کے لوگوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ہمہ تن متوجہ ہوکر تلاوتِ کلامِ پاک سنتے ہیں، اکثر لوگ اپنے خانگی اُمور میں مشغول رہتے ہیں، گھر کے سونے والوں کے لئے یہ آواز حرجِ عظیم ہوا کرتی ہے، واعظین حضرات تلاوتِ قرآن ہوتے وقت بھی چائے نوش کرتے ہیں، پان کھاتے ہیں، کبھی کبھار آپس میں گفتگو بھی کرتے ہیں، کوئی سوئے ہوئے، تو کوئی بیٹھے ہوئے ہیں، بانیٔ مجلس کی طرف سے ان کو روپے ملتے ہیں، کم ہونے پر برہمی ظاہر کرتے ہیں اور کبھی پہلے سے روپے کا تصفیہ کرلیتے ہیں۔ اکثر واعظین مدارس کے مدرّس ہوتے ہیں اور ان مجلسوں کا سلسلہ عموماً ماہ کاتک سے ماہ بیساکھ تک جاری رہتا ہے، سو واعظ صاحب اس تقریب کی وجہ سے مدرسہ سے غیر حاضری کے ایام کی تنخواہ بھی لیتے ہیں، علاوہ ازیں طویل

---

(۱) شامی ج:۱ ص:۱۷۷ (طبع ایچ ایم سعید).

(۲) فی اعلاء السنن ج:۱ ص:۲۲۶ (طبع ادارة القرآن) عن ابن عمر عن النبی صلی الله علیه وسلم لا تقرأ الحائض ولا الجنب شیئًا من القران. أخرجه الترمذی ج:۱ ص:۱۹ (طبع فاروقی کتب خانه). وفی الدر المختار ج:۱ ص:۲۹۳ یمنع حل (دخول المسجد) الی قوله (وقراءة قرآن) بقصده ومسه الا بغلافه. وفی الهندیة ج:۱ ص:۳۸ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه) ومنها حرمة قراءة القرآن لا تقرأ الحائض والنفساء والجنب شیئًا من القرآن، والآیة وما دونها سواء فی التحریم علی الأصح، الا أن لا یقصد بمادون الآیة القراءة مثل أن یقول: "الحمد لله" یرید الشکر، أو "بسم الله" عند الأکل أو غیره فانه لا بأس به. وفی الدر المختار مع رد المحتار باب الحیض ج:۱ ص:۲۹۳ (طبع سعید) ولا بأس لحائض وجنب بقراءة أدعیة ومسها وحملها وذکر الله تعالیٰ وتسبیح.

سات مہینے میں وقتاً فوقتاً شب بیداری کی وجہ سے درسی کتابوں کا مطالعہ نہیں کر سکتے، بعض ایک ہی مدرسہ کے تین چار ایسے واعظ اساتذہ باہر رہا کرتے ہیں، اس سے مدرسہ کا جو تعلیمی نقصان ہوتا ہے وہ خارج عن البیان ہے۔

سوال ۱:- ایسی مجلس میں مائیکرفون لاکر اس کا کرایہ دینا بیجا خرچہ کہا جائے گا یا نہیں؟

جواب:- جب مجلس کے حاضرین تک بغیر لاؤڈ اسپیکر کے آواز پہنچ جاتی ہے تو لاؤڈ اسپیکر لگانا "غیر ضروری" بلکہ مضر ہے، لہٰذا یہ اسراف میں داخل ہے۔

سوال ۲:- ایسی مجلس کے مائیکروفون میں کلامِ پاک کی تلاوت جائز ہوگی یا نہیں؟

جواب:- اگر اس کی آواز ان لوگوں تک پہنچتی ہے جو مجلس میں حاضر نہیں اور ان کی نیند وغیرہ میں خلل اندازی ہوتی ہے یا اس سے تلاوتِ کلامِ پاک کی بے حرمتی کا امکان ہے تو مائیکرفون میں تلاوت کرنا دُرست نہیں۔

قال فی رد المحتار وعلیٰ هذا لو قرأ علی السطح والناس نیام یأثم. (شامی ج:۱ ص:۵۰۹)[۱]۔

سوال ۳:- ایسی مجلس کے مائیکروفون میں سجدے کی آیات تلاوت کرنے سے مجلس سے باہر یا گھر کے لوگوں کے سننے سے ان پر سجدہ کرنا واجب ہوگا یا نہیں؟ برتقدیرِ اوّل وہ لوگ اگر سجدہ نہ کریں تو تلاوت کرنے والے یا بانیٔ مجلس پر گناہ عائد ہوگا یا نہیں؟

جواب:- واجب ہوگا، اور اگر انہوں نے سجدہ نہ کیا تو اس کے ساتھ لاؤڈ اسپیکر لگانے والے بھی گناہ سے خالی نہ ہوں گے۔

سوال ۴:- کہتے ہیں کہ آدابِ تلاوت مجلسِ تلاوت کے لئے محدود ہیں، جب مائیکروفون میں تلاوت ہوگی تو مجلس کی تعریف میں اور توسیع ہوگی یا نہیں؟

جواب:- جی نہیں، مجلسِ تلاوت اسی جگہ کو کہا جائے گا جہاں حقیقتاً تلاوت ہو رہی ہے، لہٰذا بلاضرورت مائیکروفون پر تلاوت کی جائے تو باہر سننے والے عدمِ استماع وغیرہ میں معذور ہوں گے اور اس کا گناہ تلاوت کرنے والوں پر ہوگا۔

یجب علی القاری احترامه بأن لا یقرأه فی الأسواق ومواضع الاشتغال، فاذا قرأه فیها کان هو المضیع لحرمته فیکون الاثم علیه دون أهل الاشتغال. (رد المحتار ج:۱ ص:۵۱۰)[۲]۔

سوال ۵:- تلاوتِ قرآنِ پاک کے وقت سامع کو چائے نوش کرنا، پان کھانا یا گفتگو کرنا،

---

(۱) شامی فروع فی القراءة خارج الصلوٰة ج:۱ ص:۵۴۶ (طبع ایچ ایم سعید).

(۲) شامی مطلب الاستماع للقرآن فرض کفایة ج:۱ ص:۵۴۶ (طبع سعید).

مجلس میں لیٹنا کیسا ہے؟

جواب:- اگر تلاوتِ قرآن، شرائط کی رعایت کے ساتھ کی جارہی ہو تو سامعین کا چائے پینا، پان کھانا، لیٹنا یا اور کوئی ایسا کام کرنا جس سے تلاوت کی طرف سے بے توجہی کا اظہار ہو کراہت سے خالی نہیں۔

سوال۶:- واعظ مدرّس کو صاحبِ مجلس کی طرف سے عطیہ یا وعظ کی اُجرت لے لینے کے بعد مدرسہ سے غیر حاضری کے ایام کی تنخواہ لینا کیسا ہوگا؟

جواب:- اگر مدرسہ سے باضابطہ رُخصت لی ہے اور وعظ پر اُجرت لینے کا کوئی معاہدہ منتظمینِ مدرسہ سے نہیں ہوا، تو جائز ہے۔

سوال۷:- کسی مدرّس صاحب کا ایسی مجلسوں میں ہمیشہ ہمیشہ جاکر مدرسہ سے غیر حاضر رہ کر اور اکثر اوقات بغیر مطالعہ درس دے کر مدرسہ یا طلبہ کو نقصان پہنچانا کیسا ہوگا؟

جواب:- مجلس اگر ان منکرات پر مشتمل نہ ہو جن کا ذکر سوال میں کیا گیا ہے تو کبھی کبھی اس میں چلے جانے میں کوئی حرج نہیں، لیکن اس کو اس طرح روزانہ کا معمول بنالینا اور ایسا مشغلہ بنالینا کہ مطالعے کی فرصت نہ ملے جس سے مدرسہ کا نقصان ہو دُرست نہیں، اس صورت میں ان کی تنخواہ حلال طیب نہ رہے گی۔

سوال۸:- واعظ صاحب کو عطیہ یا وعظ کی اُجرت لے لینے کے بعد اُخروی ثواب کی اُمید باقی رہتی ہے یا نہیں؟

جواب:- وعظ اگر اُجرت لینے کے مقصد سے نہیں کیا گیا، تو اللہ سے اُمید رکھنی چاہئے، خواہ منتظمینِ وعظ کچھ ہدیہ، عطیہ دے دیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۹/۱/۱۳۸۸ھ
(فتویٰ نمبر ۱۷۰/۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

قرآنی آیات والے اخباری تراشوں کی بے حرمتی کرنا

سوال:- جو لوگ قرآنی آیات اخباروں میں درج کرتے ہیں، کیا یہ جائز ہے اور اس سے قرآن کی بے حرمتی نہیں ہوگی؟

جواب:- جس کاغذ پر قرآنی الفاظ لکھے ہوئے ہوں، اس کی بے حرمتی کرنا جائز نہیں[۱]، اخبارات میں بہتر یہی ہے کہ صرف ترجمہ لکھا جائے۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۱۳ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۳۱/۱۹ الف)

حفص کے علاوہ کسی اور قراءت میں تلاوت کا حکم

سوال:- آج کل قاریوں کی ایک جماعت ہے جو طرح طرح سے قرآن پڑھا کرتے ہیں، کبھی اعراب والا حرف بغیر اعراب کے پڑھتے ہیں، اور کبھی دو جملوں کو الگ الگ پڑھا کرتے ہیں، بعض لوگوں سے دریافت کیا تو کہا کہ اعراب کی غلطی کی وجہ سے نماز نہیں ہوتی۔

جواب:- یہ قاری صاحبان غالباً حفص کے علاوہ کسی اور قراءت میں پڑھتے ہوں گے، لیکن ہمارے ملک میں نمازوں میں اور عوامی محفلوں میں حفص کے علاوہ کسی دُوسری قراءت میں پڑھنے کو فقہاء نے منع کیا ہے تاکہ عوام تشویش میں نہ پڑیں، اس لئے انہیں اسے نہ پڑھنا چاہئے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۱۳ھ

(فتویٰ نمبر ۲۳۱/۱۹ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۱۳۸۸/۲/۱۳ھ

سات قراءتوں کے مطابق تلاوتِ قرآن کا حکم

سوال:- قرآن مجید پڑھنے کے کتنے طریقے ہیں؟ رمضان میں ایک قاری صاحب کی قراءت سے مستفید ہوا، قراءت کا طریقہ انتہائی جدا تھا، مثلاً کھڑی زبر کو وہ زیر کے طریقے سے کھینچتے تھے، مثلاً: "مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْن" کو "مَـلِکِ یَوْمِ الدِّیْن" پڑھتے تھے، اور شاید "مَـلِکِ یَوْمِ الدِّیْن" بھی پڑھتے ہیں، مثلاً: "مَـغضُوْبِ عَلَیْهِمْ" کو بھی اسی طرح پڑھتے تھے یعنی "عَلَیْهِمُ" معلوم کرنے پر فرمایا کہ تقریباً ۷ یا ۱۰ طریقے ہیں تلاوتِ کلام اللہ کے، غالباً اس طریقے کی تلاوت حضرت قاری فتح محمد صاحب پانی پتی مدظلہم بھی اکثر فرماتے ہیں۔

---

(۱) دیکھئے ص:۱۹۳ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ۔

جواب:- قرآنِ کریم کا سات حروف پر نازل ہونا بخاری ومسلم وغیرہ کی صحیح احادیث سے ثابت ہے،(۱) جو معنیً متواتر ہیں، ان سات حروف کے مطابق قرآنِ کریم کی تلاوت کے متعدد طریقے ہیں اور ان سب پر تلاوتِ قرآن جائز ہے۔ "مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ" میں ایک قراءت "مَلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ" بھی ہے، "مِلْکِ یَوْمِ الدِّیْنِ" کوئی قراءت نہیں، اسی طرح "عَلَیْهِمْ" کے بجائے "عَلَیْهُمْ" پڑھنا بھی بعض قراءتوں میں دُرست ہے، اس مسئلے کی مکمل تحقیق کے لئے احقر کی کتاب ''علوم القرآن'' کی طرف رُجوع فرمائیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۱۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۱۶/۲۸ ج)

قرآنِ کریم کو چومنے کا حکم

سوال:- قرآن شریف کو چومنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- جائز ہے۔(۲)

واللہ اعلم
۱۳۹۹/۹/۱۵ھ

ٹیپ ریکارڈ پر تلاوتِ قرآن سننے کا حکم

سوال:- حضرت جی! عرض یہ ہے کہ بندہ تبلیغی جماعت سے وابستہ ہے، اور تمام اعمال میں جڑنے کی پوری کوشش کرتا ہے اور الحمدللہ علمائے حق دیوبند کا خدمت گزار ہے۔

مؤرخہ ۲۰۰۱/۸/۱۷ء کو علاقائی جوڑ کے سلسلے میں مرکز رائے ونڈ حاضری ہوئی، وہاں ایک مبلغ نے اپنے بیان میں فرمایا کہ ٹیپ ریکارڈ کی کیسٹ میں قرآن سننا، رنڈی کا گانا سننے جیسا ہے، اور مزید کہا کہ یہ فتویٰ حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے دیا ہے۔

عریضہ ہذا کے ذریعہ عرض یہ کرنا ہے کہ اگر حضورِ والا نے اس قسم کا فتویٰ دیا ہے تو اس کی فوٹو کاپی ارسال فرمائیں، جوابی لفافہ لف ہے۔

بصورتِ دیگر اس پورے مسئلے میں شرعی نقطۂ نگاہ واضح فرمائیں، جزاکم اللہ خیراً!

---

(۱) وفی صحیح البخاری ج:۲ ص:۷۴۶ باب أنزل القران علی سبعة أحرف، ان ابن عباس حدثه أن رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: أقرأنی جبریل علی حرف فراجعته فلم أزل أستزیده ویزیدنی حتّی انتهی الی سبعة أحرف. وفیه أیضا .... قال رسول الله صلی الله علیه وسلم کذلک أنزلت أن هذا القران أنزل علی سبعة أحرف فاقرؤا ما تیسر منه.

(۲) فی الدّر المختار ج:۶ ص:۳۸۴ تقبیل المصحف قیل: بدعة، ولکن روی عن عمر رضی الله عنه أنه یأخذ المصحف کل غداة ویقبله ویقول: عهد ربی ومنشور ربی عز وجل، وکان عثمان رضی الله عنه یقبل المصحف ویمسحه علی وجهه. (مرتب عفی عنہ)

جواب:- محترمی و مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

استغفر اللہ! بندہ نے ایسا کوئی فتویٰ نہیں دیا، نہ یہ بات دُرست ہے، جن صاحب نے بھی یہ بات کہی ہے انہوں نے غیر ذمہ داری سے میری طرف غلط بات منسوب کی ہے، ان کو میرا یہ خط دِکھا کر بتادیں کہ آئندہ کسی کی طرف کوئی بات منسوب کرنے سے پہلے تحقیق کرلیا کریں۔ کیسٹ میں قرآن کریم سننا بالکل جائز ہے، اور اسے معاذ اللہ گانے سے تشبیہ دینا میرے نزدیک سخت گستاخی ہے۔

والسلام

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۲۲/۶/۲۸ھ

تلاوت کے موقع پر نیند آنا

سوال:- جب بھی ہم قرآن کی تلاوت کرنے بیٹھتے ہیں تو ہمیں نیند آنے لگتی ہے، اس کے متعلق ہمیں کچھ بتائیں۔

جواب:- اگر ایسا کبھی کبھی ہوتا ہو تو نیند آنے پر تلاوت چھوڑ دیں، لیکن اگر ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہو تو نیند بھگانے کے لئے کسی طبیب سے مشورہ کرکے کوئی تدبیر اختیار کریں۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۸/۲/۸ھ

(فتویٰ نمبر ۲۹/۱۵۰ الف)

قرآنی آیات والے اخبارات و کاغذات کی بے حرمتی کا حکم

سوال:- اخبارات و اشتہارات میں عباراتِ قرآن و احادیث کا چھاپنا اور ان کی بے حرمتی کرنا کیسا ہے؟ اور اس کی روک تھام کیسے کی جائے؟

جواب:- جن کاغذات پر اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی لکھا، یا چھپا ہوا ہو ان کو بے حرمتی کے مقامات پر رکھنا یا پھینکنا بالکل ناجائز ہے،[1] انسان کو چاہئے کہ خود بھی اس سے پرہیز کرے اور جس حد تک ممکن ہو دُوسروں کو بھی اس سے روکے، اگر ہر شخص اپنی اس ذمہ داری کو محسوس کرکے اس بات کا اہتمام کرے تو اس فعلِ ناجائز کا شیوع بڑی حد تک رُک سکتا ہے۔

واللہ اعلم — الجواب صحیح

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ — بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۱۳۸۷/۱۰/۲۸ھ — ۱۳۸۷/۱۰/۲۹ھ

(۱) دیکھئے اگلا فتویٰ اور اس کا حاشیہ۔

قرآنِ کریم کے بوسیدہ اوراق کا حکم

سوال:- قرآنِ پاک کے ایسے نسخے جو بوسیدہ ہوچکے ہوں اور تلاوت کے لئے استعمال نہ ہوتے ہوں، اور ایسے ہی پُرانے بوسیدہ سپارے اور ان کے منتشر اوراق، اسلامی رسائل اور کتابچے جن میں قرآنِ پاک کی آیات اور احادیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوں ان کو اس نیت پر کہ ان کی بے حرمتی اور توہین نہ ہو اور ان کی راکھ کو کسی محفوظ مقام پر دفن یا سمندر بُرد کردیا جائے گا، جلانا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ صحیح البخاری ج:۲ باب فضائلِ قرآن ص:۷۴۶ پر حدیث ہے کہ حضرت عثمانؓ نے قرآن جلانے کا حکم فرمایا ہے، شرعی حکم قرآن و حدیث اور فقہِ حنفی کی رُو سے عنایت فرمائیں۔

جواب:- فقہائے حنفیہ نے ترجیح اس کو دی ہے کہ قرآنِ کریم کے بوسیدہ اوراق کو جلانے کے بجائے یا تو کسی محفوظ جگہ پر دفن کردیا جائے یا اگر وہ اوراق دُھل سکتے ہوں تو حروف کو دھوکر ان کا پانی کسی کنویں یا ٹنکی وغیرہ میں شامل کردیا جائے، اور دفن کرنے کے لئے بھی بہتر طریقہ یہ ہے کہ ان اوراق کو کسی کپڑے میں لپیٹ کر دفن کردیا جائے، اگر یہ دونوں کام مشکل ہوں تو ان اوراق کو کسی دریا، سمندر یا کنویں میں بھی ڈالا جاسکتا ہے۔

فی الدر المختار الکتب التی لا ینتفع بھا یمحی عنھا اسم اللہ وملائکتہ ورسلہ ویحرق الباقی، ولا بأس بأن تلقی فی ماء جار کما ھی أو تدفن وھو أحسن کما فی الانبیاء. وفی الشامیۃ تحتہ: المصحف اذا صار خلقًا، تعذر القراءۃ منہ لا یحرق بالنار، الیہ أشار محمد وبہ نأخذ، ولا یکرہ دفنہ، وینبغی أن یلف بخرقۃ طاھرۃ ویلحد لہ، لأنہ لو شق ودفن یحتاج الی اھالۃ التراب علیہ. (شامی حظر و اباحت اواخر فصل البیع)۔ [1]

اور بعض علماء نے حضرت عثمانؓ کے عمل سے استدلال کرکے قرآنِ کریم کے بوسیدہ اوراق کو نذرِ آتش کرنے کی بھی اجازت دی ہے، لیکن دُوسرے علماء نے یہ توجیہ کی ہے کہ انہوں نے جن مصاحف کو نذرِ آتش کیا تھا وہ تمام تر قرآنِ کریم نہ تھے، بلکہ ان میں تفسیری اضافے وغیرہ بھی درج

---

(۱) الدر المختار مع رد المحتار ج:۶ ص:۴۲۲ (طبع ایچ ایم سعید) وفی بریقۃ محمودیۃ ج:۴ ص:۱۹۸ الکتب التی یستغنی عنھا وفیھا اسم اللہ تعالٰی تلقی فی الماء الکثیر الجاری أو تدفن فی أرض طیبۃ ولا تحرق بالنار وفی التاتارخانیۃ المصحف الذی خلق وتعذر الانتفاع بہ لا یحرق بل یلف بخرقۃ طاھرۃ ویحفر حفیرۃ یلحد بلا شق أو یجعل سقفًا ویدفن أو یوضع بمکان طاھر لا یصل الیہ الغبار والأقذار، وفی السراجیۃ یدفن أو یحرق اھ ملخصًا، وکذا عن منیۃ المفتی وعن المجتبی، الدفن أفضل من الإلقاء فی الجاری کالانبیاء وکذا جمیع الکتب وفی التاتارخانیۃ الأفضل أن یغسلھا ویأخذ القراطیس ... وأقول الراجح ھو الدفن أو الغسل لا الإحراق .... وکذا فی الھندیۃ.
نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۴ ص:۵۴، کفایت المفتی ج:۱ ص:۱۱۷، ۱۱۹، امداد المفتین ص:۲۳۸، و امداد الاحکام ج:۱ ص:۱۳۷، ۱۵۷۔ (محمد زبیر حق نواز عفی عنہ)۔

تھے، اگر وہ خالص قرآن ہوتے تو آپؓ انہیں نذرِ آتش نہ فرماتے، چنانچہ مُلاّ علی قاریؒ لکھتے ہیں:-

قال ابن حجر: وفعل عثمانؓ یرجّح الإحراق وحرقه بقصد صیانته بالکلیة لا امتهان فیه بوجه .... والقیاس علیٰ فعل عثمان لا یجوز، لأن صنیعه کان بما ثبت أنه لیس من القرآن أو مما اختلط به اختلاطا لا یقبل الانفکاک، وانما اختار الإحراق لأنه یزیل الشک فی کونه ترک بعض القرآن، اذ لو کان قرانا لم یجوز مسلم أن یحرقه ویدل علیه أنه لم یؤمر بحفظ رماده من الوقوع فی النجاسة. (مرقاة المفاتیح ج:۵ ص:۲۹)۔[۱]

خلاصہ یہ کہ احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ ایسے اوراق کو جلانے کے بجائے دفن کیا جائے، لیکن چونکہ بعض علماء نے جلانے کی بھی اجازت دی ہے اور اس کا مأخذ بھی ہے، اس لئے اگر کوئی نذرِ آتش کرے تو اسے حرام کہنا بھی مشکل ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۰/۱۰/۱۳۹۷ھ

تلاوت سننے میں قاری کی خوش الحانی کی طرف متوجہ ہونا اور ایک ہی سانس میں کئی آیات پڑھنے کو وجہِ فضیلت سمجھنا

سوال:- آج کل کراچی میں محافلِ قراءت ہو رہی ہیں، جن میں بیرونِ ملک سے قاری صاحبان آتے ہیں اور کلامِ پاک سناتے ہیں، اس پر زید اس طرح تبصرہ کرتا ہے: ''یہ جو آج کل کراچی میں قراءت کی محفلیں منعقد ہو رہی ہیں ان کی شکل بالکل مشاعروں کی طرح ہوتی ہے، جس طرح ایک شاعر اپنا کلام سنا کر دادِ تحسین حاصل کرتا ہے، پھر دُوسرا آتا ہے، اس طرح یہ سلسلہ چلتا ہے، جس شاعر کے کلام پر زیادہ داد ملتی ہے وہ خوشی سے پھولا نہیں سماتا، اور جس کلام پر واہ واہ نہیں ہوتی وہ منہ لٹکائے چلا جاتا ہے اور بہت دِلگیر ہوتا ہے۔ کیا قرآنِ پاک جو اللہ کا کلام ہے وہ اس حد تک نعوذ باللہ اُتار دیا جائے کہ لوگ اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کریں اور مائک پر آکر گلے بازیاں کریں اور وہ قاری جس کی آواز اچھی ہو اس پر لوگ جھومنے لگیں، اور جو سادہ پڑھے اس پر لوگ منہ بسورتے رہیں اور اس پر توجہ نہ دیں، کیا یہ قرآن کی بے حرمتی نہیں ہے؟ اگر ایسا شوق ہے تو جمعہ کے دن مساجد میں کسی قاری کو موقع دیا جائے اور لوگ سنیں، اس طرح قرآن کا احترام اور قاری کا احترام باقی رہے گا، مگر اس قسم کے مقابلوں میں لوگ مسلمان ہونے کی حیثیت سے براہِ راست قرآن کو تو کچھ نہیں کہتے مگر ان کے تأثرات سے قرآن کی عظمت کو ٹھیس پہنچتی ہے، جو ایک مسلمان کے حساس قلب کے لئے تکلیف دہ ہے۔''

---

(۱) (طبع مکتبہ امدادیہ، ملتان)۔

اس قسم کے تبصرے پر مجلس میں بہت سے لوگ بگڑ گئے اور کہنے لگے کہ اس رائے کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور یہ سب جہالت ہے، اس سے محفلِ قراءت کی مخالفت ہوتی ہے وغیرہ، شرعی حکم کیا ہے؟

جواب:- قرآنِ کریم کی تلاوت اور اس کا سننا کارِ ثواب ہے، البتہ اس میں صرف قاری کی خوش الحانی پر نگاہ رکھنا دُرست نہیں، اور نہ ایک سانس میں کئی آیتیں پڑھنے کو وجہِ افضلیت قرار دینا دُرست ہے، اصل نظر قرآن کے مضامین پر ہونی چاہئے، اور جو نہ سمجھ سکیں وہ اس بات کی طرف نظر کریں کہ قرآنِ کریم کا صحیح تلفظ کس طرح ہوتا ہے۔　　واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴/۱۲/۱۳۸۷ھ

بلاشبہ داد لینے اور تعریف کرانے کے لئے تلاوت کرنا سخت منع ہے، اس نیت سے تلاوت کرنے والوں اور داد دینے والوں کے بارے میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ان کے قلوب فتنے میں پڑے ہوں گے۔

فقال علیه الصلوة والسلام: سیجیٔ أقوام یقیمونه کما یقام القدح یتعجلونه ولا یتأجلونه. وفی روایة: وسیجیٔ بعدی قوم یرجّعون بالقرآن ترجیع الغناء والنوح لا یجاوز حناجرهم مفتونة قلوبهم وقلوب الذین یعجبهم شأنهم. (رواه البیهقی فی شعب الإیمان) مشکوٰة ص: ۱۹۱۔[1] (طبع قدیمی کتب خانہ)۔

اور قرآن شریف کو کانوں کی نمائش کا ذریعہ بنانا ہی بے ادبی ہے، نیتوں کو اللہ خوب جانتا ہے، سب اپنی اپنی نیت کا جائزہ لیں۔　　کتبہ العبد الحقیر

محمد عاشق الٰہی بلند شہری عفی عنہ

۱۴/۱۲/۱۳۸۷ھ

قرآنِ کریم کو بغیر وضو چھونے کا حکم

سوال:- کسی عدالت میں مخالف پارٹی اور ان کے ہمراہ آئے ہوئے آدمی رُوبرو آفیسر قرآن شریف پر ہاتھ رکھ کر باری باری بیان دیں، یہ ہمارے دینِ اسلام میں جائز ہے یا ناجائز، جبکہ ان کا وضو نہ ہو؟ کیا قرآن شریف پر بیان دینا اور بغیر وضو قرآن شریف کو ہاتھ لگانا جائز ہے؟

---

(۱) وفی المرقاة شرح المشکوٰة ج:۵ ص:۱۲، ۱۳ اقرؤا القران بلحون العرب وأصواتها .... بلا تکلف النغمات من المدات والسکنات فی الحرکات والسکنات بحکم الطبیعة الساذجة عن التکلفات (وایاکم ولحون أهل العشق) أی أصحاب الفسق (ولحون أهل الکتابین) أی أرباب الکفر من الیهود والنصاری فان من تشبه بقوم فهو منهم. قال الطیبی: اللحون جمع لحن وهو التطریب وترجیع الصوت، قال صاحب جامع الأصول: ویشبه أن یکون ما یفعله القراء فی زماننا بین یدی الوعاظ من اللحون العجمیة فی القرآن ما نهی عنه رسول الله صلی الله علیه وسلم (وسیجیٔ بعدی قوم یرجّعون بالقرآن ترجیع الغناء والنوح) .... والمراد تردیدًا مخرجًا لها عن موضوعها اذ لم یتات تلحینهم علی أصول النغمات .... (لا یجاوز حناجرهم) .... کنایة عن عدم القبول .... الخ.

جواب:- قرآن شریف کو بغیر وضو کے چھونا بالکل ناجائز ہے،[۱] اور حلف اُٹھا کر بیان دینے کے بارے میں جو باتیں پوچھی گئی ہیں، جب تک معاملے کی پوری تفصیل معلوم نہ ہو اس کا حکم نہیں بتایا جاسکتا ہے۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۲/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷۱/۲۸ الف)

۱:- روزے سے متعلق قرآنی آیتِ مبارکہ
۲:- ماہِ رمضان میں پیش آنے والے اہم واقعات
۳:- حضور ﷺ کا حضرت جبریل علیہ السلام کے ساتھ قرآن کا دَور کرنا

سوال ۱:- اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کیا گیا، جس طرح پہلی اُمتوں پر فرض کیا گیا۔ اس کے متعلق قرآن کی کون سی آیت ہے؟

۲:- ماہِ رمضان المبارک میں بہت سے واقعات ظہور پذیر ہوئے ہیں، ان میں سے چند واقعات تحریر فرمائیں۔

۳:- رمضان شریف میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کی تشریف آوری حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں روزانہ ہوا کرتی تھی، اس کا کیا مقصد تھا؟

جواب ۱:- وہ آیت یہ ہے: "یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ"۔ (سورۂ بقرہ پارہ نمبر۲ آیت:۱۸۳)

۲:- غزوۂ بدر، فتحِ مکہ، نزولِ قرآنِ کریم کی ابتداء، یہ اہم واقعات رمضان میں ہوئے، دُوسرے بہت سے واقعات کے لئے تاریخ کی کتابیں دیکھیں۔

۳:- آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قرآنِ کریم کا دَور کرتے تھے۔[۲]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۹۷۳/۲۸ ج)

---

(۱) "لَا یَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ" (سورة الواقعة: ۷۹) عن ابن عمرؓ ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لا يمس القرآن الا طاهر. اعلاء السنن ج: ۱ ص: ۲۶۸ (طبع ادارة القرآن). نیز دیکھئے: فتاویٰ رشیدیہ ص:۲۲۱، وتفسیر معارف القرآن ج:۸ ص:۲۸۷۔

(۲) وفي صحيح البخارى ج: ۲ ص: ۷۴۷ (طبع قديمى كتب خانه) باب كان جبريل يعرض القرآن على النبى صلى الله عليه وسلم، وقال مسروق عن عائشة عن فاطمة: أسرّ الى النبى صلى الله عليه وسلم أن جبريل يعارضنى بالقران كل سنة وانه عارضنى العام مرتين، ولا أراه الا حضر أجلى. حدثنا يحيى بن قزعة قال: حدثنا ابراهيم بن سعد عن الزهرى عن عبيدالله بن عبدالله عن ابن عباس قال: كان النبى صلى الله عليه وسلم أجود الناس بالخير، وأجود ما يكون فى شهر رمضان، لأن جبريل كان يلقاه فى كل ليلة فى شهر رمضان حتى ينسلخ يعرض عليه رسول الله صلى الله عليه وسلم القرآن، فاذا لقيه جبريل كان أجود بالخير من الريح المرسلة. (محمد زبیر حق نواز)

قرآن نہ پڑھے ہوئے شخص کے لئے الفاظ پر صرف اُنگلی پھیرنے کا حکم

سوال:- ہمارے صوبہ پنجاب کے علاقہ بھاولپور میں ایک مولوی واعظ صاحب نے اپنی تقریر کے دوران فرمایا کہ: جو لوگ عدیم الفرصت ہیں جیسے کسان یا عوام الناس دہقان، تاجر یا سوداگر یا مزدور پیشہ لوگ ہوتے ہیں، وہ علی الصبح باوضو ہوکر قرآن مجید کھول کر ایک یا دو پارے اوّل سے آخر تک اُنگلیاں پھیرتے چلے جائیں، اس طرح قرآن مجید ختم کریں، اس کا ثواب جتنا قاری عالم کو ہوگا اس سے دُگنا اس اُمّی جاہل کو ثواب ہوگا، حدیث شریف کی تمام کتابوں میں یہ حدیث درج ہے جس حدیث میں دیکھو یہ حدیث ملے گی۔ اب غضب یہ ہوگیا کہ ہمارے علاقے میں یہ رواج اتنا زور پکڑ گیا ہے کہ اکثر عورتوں اور مردوں نے قرآن مجید پڑھنا ترک کردیا ہے، اور اتنی محنتِ شاقہ کون اُٹھائے؟ پہلے لاکھوں میں سے ایک آدھ، سالہا سال کے بعد فضیلتِ تلاوت اور ختمِ قرآن کا ثواب حاصل کرسکتا تھا، اب تو ماشاء اللہ مولوی واعظ نے اللہ کی رحمت کو فیضِ عام کردیا ہے، کوئی اُجڈ، اَن پڑھ ہے وہ اُنگلیاں رکھ کر قاری عالم سے دُگنا ثواب حاصل کر رہا ہے، ایسا حدیث کی کتاب میں ہے یا نہیں؟

جواب:- ان واعظ صاحب نے یہ بات غلط انداز سے بیان کی ہے، جو لوگ قرآنِ کریم کی تلاوت کرسکتے ہیں ان کے لئے قرآنِ کریم کے حروف پر اُنگلی پھیر لینا کافی نہیں اور نہ ایسی کوئی حدیث ہمارے علم میں ہے، البتہ جو اَن پڑھ قرآنِ کریم نہیں پڑھ سکتے ان پر لازم ہے کہ قرآنِ کریم ناظرہ کی تعلیم حاصل کریں۔ ہاں! جب تک پڑھنا نہ آئے اس وقت تک اگر وہ قرآنِ کریم کھول کر بیٹھ جایا کریں اور حروف پر اُنگلی پھیر لیا کریں تو اِن شاء اللہ تلاوت کے ثواب سے محروم نہ رہیں گے، اس کا نہ یہ مطلب ہے کہ جو لوگ قرآنِ کریم کی تلاوت کرسکتے ہیں وہ بھی یہی کام شروع کردیں، اور نہ یہ کہنا دُرست ہے کہ اس عمل کا ثواب تلاوت سے بھی دُگنا ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۴/۷/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۳۸/۷۳۸ ب)

دینیات کی کتابوں کو بغیر وضو چھونے کا حکم

قرآنی آیات کی کثرت والی کتاب کو بغیر وضو چھونا جائز نہیں

سوال ۱:- آج کل مدارس میں دینیات و دیگر کتب کو بغیر وضو چھونا جائز ہے یا نہیں؟

۲:- ان کتب کی موجودگی میں اُستاذ کرسی پر بیٹھ سکتا ہے جبکہ کتب لڑکوں کے پاس نیچے ہوتی ہیں؟

جواب ا:- اگر کتاب میں لکھے ہوئے الفاظ کی اکثریت قرآنی آیات پر مشتمل ہو تو اسے بغیر وضو کے چھونا نہیں چاہئے، اور اگر قرآنی آیات کم ہیں اور دُوسری عبارتیں زیادہ تو بغیر وضو چھوا جاسکتا ہے۔[1]

۲:- جن کتابوں میں اللہ رسول کا نام یا قرآنی آیات تحریر ہوں ان سے بلند ہوکر کھڑا ہونا یا بیٹھنا ان کے ادب کے خلاف ہے، اس لئے نشست میں اس کا اہتمام کرنا چاہئے کہ یہ بے ادبی نہ ہو، تاہم ضرورت کے موقع پر گنجائش ہے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۱/۴/۲۶ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع

(فتویٰ نمبر ۲۲/۵۶۲ الف)

قرآنِ کریم حفظ کرنے کے بعد بھول جانے والے کا کیا حکم ہے؟

سوال:- احقر نے قرآن حفظ کیا تھا، مگر ٹی بی کی وجہ سے اس کا ورد جاری نہیں رہ سکا، اب صحت کی صورت نظر نہیں آتی، ایسی صورت میں اگر موت آئے تو کیا قیامت کے دن اندھا اُٹھایا جاؤں گا؟

جواب:- اس سلسلے میں جو حدیث وارد ہوئی ہے اس کے الفاظ میں کہ: "**ما من امرئ یقرأ القرآن ثم ینساه إلا لقي الله یوم القیامة أجزم**"۔[2] یعنی جو شخص بھی قرآن پڑھے پھر اسے بھلادے تو وہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ سے جزام کی حالت میں ملے گا۔ مُلّا علی قاریؒ "**ثم ینسه**" کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "**ان بالنظر عندنا وبالغیب عند الشافعي أو المعنی ثم یترک قراءته نسي أو ما نسي.**" (مرقاۃ المفاتیح ج:۲ ص:۷۱۵ کتاب فضائل القرآن)۔[3] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ وعید اس شخص پر ہے جو ناظرہ پڑھنے کی اہلیت بھی اپنی لاپرواہی سے ختم کردے، لہٰذا آپ یہ عزم رکھیں کہ صحت ہونے پر قرآن کو مکمل طور پر یاد رکھوں گا اور اس کا ورد جاری رکھنے میں جو کوتاہی ہوئی ہو، اس پر اللہ تعالیٰ سے توبہ استغفار کرتے رہیں، اُمید ہے کہ ان شاء اللہ اس وعید سے اللہ تعالیٰ بچالے گا۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۱/۱/۵ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) وفی الشامیة ج:۱ ص:۱۷۷ إن کان التفسیر أکثر لا یکره، وان کان القرآن أکثر یکره.

(۲) مشکوة المصابیح ج:۱ ص:۱۹۱ (طبع قدیمی کتب خانه).

(۳) مرقاة المفاتیح ج:۵ ص:۹ (طبع مکتبه امدادیه ملتان).

پیشاب سے سورۂ فاتحہ لکھنا سخت حرام ہے

سوال:- مکرم مفتی محمد تقی عثمانی صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعض حضرات جا بجا ایسے پمفلٹ تقسیم کر رہے ہیں جن میں یہ مذکور ہے کہ آپ نے علاج کی غرض سے پیشاب سے سورۂ فاتحہ لکھنے کے جائز ہونے کا فتویٰ دیا ہے، اور آپ اسے جائز سمجھتے ہیں۔ براہِ کرم اس بارے میں وضاحت فرمائیں کہ کیا آپ نے ایسا کوئی فتویٰ دیا ہے؟

ابراہیم
۹ر رجب ۱۴۲۵ھ

جواب:- میں نے ایسا کوئی فتویٰ نہیں دیا، پیشاب یا کسی بھی نجاست سے قرآنِ کریم کی کوئی آیت لکھنا بالکل حرام ہے، اور میں معاذ اللہ اسے جائز قرار دینے کا تصوّر بھی نہیں کرسکتا۔ جن لوگوں نے میری طرف یہ فتویٰ منسوب کیا ہے ان کی تردید کرچکا ہوں، جو ''روزنامہ اسلام'' کی ۱۲راگست ۲۰۰۴ء کی اشاعت میں شائع ہوچکی ہے، میری جس کتاب کا حوالہ میری طرف منسوب کرکے دیا جارہا ہے، اس کی حقیقت بھی میں نے اپنی تردید میں واضح کردی ہے، اس کے باوجود جو لوگ اس فتوے کو میری طرف منسوب کررہے ہیں، انہیں اللہ تعالیٰ سے، اور کسی پر بہتان لگانے سے ڈرنا چاہئے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۹ر رجب ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۴۷/۷۳۰)

﴿کتاب التفسیر وما یتعلق بالقرآن﴾

(قرآنِ کریم کے ترجمہ اور تفسیر سے متعلق مسائل کا بیان)

"اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ" الآیۃ کے مفہوم ومعنی کی تحقیق

سوال:- سورۂ آل عمران کی آیت:۲۳ میں ہے: "اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ یُدْعَوْنَ اِلٰی کِتٰبِ اللہِ"۔

اِشکال یہ ہے کہ یہاں "اُوتوا الکتٰب" کے بجائے "اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ" کیوں فرمایا گیا؟ "الکتٰب" اور "کتٰب اللہ" سے کیا مراد ہے؟ کیا "نصیبا" فرمانے کی وجہ یہ ہے کہ ان کے پاس تحریفات کے بعد کتاب کے بجائے "نصیبا من الکتٰب" ہی بچا تھا؟ یا یہ کہ "الکتٰب" تو صرف قرآن ہے اور باقی اہلِ کتاب کو اس کا کچھ حصہ عطا ہوا تھا۔

حضرت سے بیانِ مفصل کی درخواست ہے، اس ناچیز نے "تسہیل" میں یوں لکھ دیا: "کتابِ الٰہی تو ایک ہے، (الکتٰب پر الف لام جنس ہے)، اس کا ایک حصہ تورات کی شکل میں یہود کو، دُوسرا حصہ انجیل کی شکل میں نصاریٰ کو، اور مکمل کتاب قرآن کی شکل میں مسلمانوں کو عطا کی گئی ہے۔" کیا یہ تعبیر صحیح ہے؟

محتاجِ دُعا: محمد اسلم شیخوپوری

جواب:- مکرمی جناب مولانا محمد اسلم شیخوپوری صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا گرامی نامہ ملا، اس آیتِ کریمہ کی معروف تفسیریں دو ہیں۔ ایک یہ کہ "نصیبا من الکتٰب" میں "من" بیانیہ ہے،[1] جس کا حاصل یہ ہے کہ "اُوتوا نصیبا" کے معنی یہ ہیں کہ ان کو نعمتوں کا ایک بڑا حصہ دیا گیا، پھر "کتٰب" اس حصے کا بیان ہے، جس سے مراد توراۃ ہے۔

دُوسری تفسیر یہ ہے کہ "من" تبعیضیہ ہے،[2] اور "الکتٰب" سے مراد "توراۃ" ہی ہے، لیکن "ایتاء" سے مراد اس کی فہم عطا کرنا ہے، اور چونکہ کتابِ الٰہی کی مکمل فہم کسی انسان کے لئے ممکن نہیں، اس لئے اس کو "نصیبا من الکتٰب" سے تعبیر کیا گیا، یعنی فہم کا ایک حصہ عطا کیا گیا ہے، البتہ "من" تبعیضیہ لینے کی صورت میں "الکتٰب" سے مراد بعض حضرات نے لوحِ محفوظ بھی لی ہے، اور بعض

(۱، ۲) وفی تفسیر رُوح المعانی ج:۳ ص:۱۱۰ (طبع مکتبہ رشیدیہ لاہور) ومن إما للتبعیض وإما للبیان علٰی معنی (نصیبًا) هو الکتاب او نصیبًا منه لأن الوصول الٰی کنه کلامه تعالٰی متعذر فان جعل بیانا کان المراد انزال الکتاب علیهم وان جعل تبعیضًا کان المراد هدایتهم فهم ما فیه وعلی التقدیرین الّام فی (الکتٰب) للعهد والمراد به التوراة وهو المروی عن کثیر من السلف، والتنوین للتکثیر وجوز ان یکون الّام فی (الکتٰب) للعهد والمراد به اللوح، وان یکون للجنس .... الخ. وراجع أیضًا التفسیر المظهری ج:۲ ص:۲۷ (طبع بلوچستان بک ڈپو). (محمد زبیر حق نواز)

حضرات نے جنسِ کتاب، اگر جنسِ کتاب مراد لی جائے تو اگرچہ اس میں تمام دُنیا کی کتابیں شامل ہوں گی، لیکن سیاق اللہ تعالیٰ کی کتابوں کا ہے۔ اس لئے آپ نے جو تعبیر اختیار کی کہ کتابِ الٰہی تو ایک ہی ہے، اس کا ایک حصہ توراۃ کی شکل میں بنی اسرائیل کو عطا کیا گیا، یہ تعبیر بھی دُرست ہو سکتی ہے۔ البتہ یہ کہنا کہ چونکہ انہوں نے کتاب میں تحریفات کر لی تھیں، اس لئے کتب کے بجائے "نصیبا من الکتب" کہا گیا، علاوہ اس کے کہ کہیں منقول نہیں دیکھا، فی نفسہٖ بھی دُرست معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ "ایتاء" تو غیر محرف توراۃ کا ہوا تھا، بعد میں تحریف ان کا اپنا عمل ہے، اور آیتِ کریمہ کے پہلے حصے میں بیان اللہ تعالیٰ کے انعام کا ہے، ان کے اپنے فعل کا نہیں۔ ان کا اپنا فعل بعد میں "ثم یتولی" سے مذکور ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم
بقلم: عبداللہ میمن
۱۴۲۲/۶/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۴۹۲/۳۵)

عالمِ دین کا تفسیر سنانا

سوال:- عالمِ محقق کا تفسیر سنانا اور سننا دُرست ہے یا نہیں؟

جواب:- بلاشبہ جائز ہے۔

فقط واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۶/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹/۲۳۶ الف)

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

قیامت کے وقت کی تعیین سے متعلق قرآنی آیت پر ایک سوال کا جواب

سوال:- اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ: "یہ لوگ (منکر) آپ سے قیامت کے متعلق سوال کرتے ہیں، آپ کہہ دیجئے اس کی خبر تو بس اللہ ہی کے پاس ہے۔" اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضورؐ کو قیامت کے متعلق کچھ نہیں بتایا گیا۔ لہٰذا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قربِ قیامت کی علامات حضورؐ سے مروی ہیں، اور علمائے دین نے بھی قیامت کے متعلق بہت سی کتابیں تحریر فرمائی ہیں، جبکہ آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سلسلے میں علم نہیں تھا، تو قیامت کی علامات کیسے زیر

فرمادی گئیں؟

جواب:- مذکورہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کا صحیح صحیح وقت کہ وہ کب اور کس دن آئے گی، سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا، البتہ قربِ قیامت کی علامتیں خود قرآنِ کریم نے بتلائی ہیں اور وحیٔ الٰہی کے ذریعہ باخبر ہوکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بتلائی ہیں، چنانچہ صحیحین[1] کی مشہور حدیث میں مروی ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس انسان کی شکل میں آکر کچھ سوالات کئے، ان میں سے ایک سوال یہ تھا کہ آپ مجھے قیامت کے بارے میں بتایئے (کہ وہ کب آئے گی)، اس کے جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: اس بارے میں، میں خود سوال کرنے والے سے زیادہ نہیں جانتا، پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام نے پوچھا کہ: اچھا! مجھے قیامت کی کچھ علامتیں بتایئے، تو اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی علامتیں بتادیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۰/۱۰/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۳۳/۲۸ ج)

پکتھال کے انگریزی ترجمے کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین مندرجہ ذیل انگریزی ترجمۂ قرآنِ کریم کے مطالعے کے متعلق کہ جسے ادارہ معارفِ اسلامی، اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد نے چھاپا ہے جس کے مترجم ایک انڈونیشیا کے نومسلم ہیں جن کا نام درج ذیل ہے:

Muhammad Marmaduke Pickthall

ان کے انگریزی ترجمے کے متعلق شرعاً کیا حکم ہے؟

جواب:- پکتھال کے انگریزی ترجمے میں متعدّد مقامات پر غلطیاں بھی ہیں، لیکن بحیثیتِ مجموعی اسے استعمال کیا جاسکتا ہے، البتہ اب تک کے شائع شدہ انگریزی تراجم میں لعل محمد چاولہ کا ترجمہ نسبتاً سب سے بہتر ہے جو اسلامک پبلی کیشنز لاہور نے شائع کیا ہے۔ نیز سب سے بہتر ترجمہ وہ ہے جو معارف القرآن انگریزی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے، مگر ابھی وہ زیرِ تکمیل ہے۔

واللہ اعلم

۷/۶/۱۴۲۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱۷/۴۳۵)

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب سؤال جبریل النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن الایمان والاسلام والاحسان وعلم الساعة .... الخ ج:۱ ص:۱۲ (طبع قدیمی کتب خانہ کراچی).

تفسیر معارف القرآن میں "اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا" الآیۃ کے ترجمے کی تحقیق

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ اس وقت معارف القرآن جلد نمبر۴ پیشِ نظر ہے، سورۂ یونس رُکوع نمبر۷ کی پہلی آیت میں: "اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا" کا ترجمہ "کہ ہم نہیں حاضر ہوئے تمہارے پاس" سمجھ میں نہیں آرہا، ناقص فہم میں یہی آتا ہے کہ اگر لفظ "نہیں" نہ ہوتو ترجمہ صاف اور بے غبار ہوجائے گا، جیسا کہ حضرت تھانویؒ نے بیان القرآن میں مثبت ترجمہ کیا ہے: "ہم کو سب کی خبر رہتی ہے۔"

چونکہ معارف القرآن کا ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ کا ہے تو احقر نے تفسیرِ عثمانی مطبوعہ سعودی عرب کو دیکھا تو اس میں بھی وہی معارف القرآن والا ترجمہ درج ہے۔

از راہِ کرم وضاحت فرمادیں تو عنایت بے نہایت ہوگی۔

جواب:- "وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا" الآیۃ۔

ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ: اور نہیں ہوتا تو کسی حال میں اور نہ پڑھتا ہے اس میں سے کچھ قرآن اور نہیں کرتے ہو تم لوگ کچھ کام کہ ہم نہیں ہوتے حاضر تمہارے پاس۔[1]

ترجمہ حضرت تھانویؒ: اور آپ خواہ کسی حال میں ہوں اور آپ کہیں سے قرآن پڑھتے ہوں اور تم جو کام بھی کرتے ہو، ہم کو سب کی خبر رہتی ہے۔[2]

حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمے میں گو موجودہ محاورے کے اعتبار سے کچھ اغلاق ہے، لیکن ترجمہ بہر حال صحیح ہے، اس لئے کہ عربی میں استغراق پر دلالت کرنے کا ایک اُسلوب یہ بھی ہے کہ پہلے نفیِ عام لائی جائے (جو عموماً نکرہ تحت النفی کی صورت میں ہوتی ہے)، پھر استثناء لایا جائے، جیسے یہ بتانا ہو کہ "ہر نبی معصوم ہے" یوں کہیں گے: "ما من نبی الا وھو معصوم" ایسی تعبیرات کا اُردو میں ترجمہ عموماً دو طرح ہوسکتا ہے، ایک یہ کہ استغراق والا مثبت جملہ ذکر کردیا جائے جیسے مذکورہ مثال کا ترجمہ یوں کیا جائے: "جو نبی بھی ہوتا ہے وہ معصوم ہوتا ہے"۔ دُوسرا یہ کہ استثناء سے پہلے والے جملے کا ترجمہ نفی سے کرکے استثناء کے بعد والے جملے کو بصورتِ نفی اس کی صفت بنادیا جائے، جیسے: "کوئی نبی ایسا نہیں جو معصوم نہ ہو"۔ حضرت تھانویؒ کا ترجمہ پہلے طریقے کے مطابق ہے، اور حضرت شیخ الہندؒ کا

(۱) ترجمہ شیخ الہندؒ تفسیر عثمانی (طبع دار الاشاعت) ج:۱ ص:۶۱۰۔ (۲) بیان القرآن ج:۵ ص:۲۰ (طبع ایچ ایم سعید کمپنی)۔

دُوسرے طریقے کے۔ اس میں اغلاق کی وجہ حرفِ نفی نہیں ہے بلکہ وجہ یہ ہے کہ اس ترجمے میں موصوف اور صفت کو لفظ ''کہ'' کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے، جبکہ آج کل عموماً یہ ربط ''جو''، ''جس'' وغیرہ کے ذریعہ سے کیا جاتا ہے۔ ''وَمَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا کُنَّا عَلَیْکُمْ شُھُوْدًا'' کے ترجمے میں لفظ ''کہ'' کی جگہ ''جس پر'' وغیرہ لفظ رکھ کر دیکھئے، انشاء اللہ بات واضح ہوجائے گی۔

باقی اگر ''ہم نہیں حاضر ہوتے'' سے حرفِ نفی حذف کردیا جائے تو احقر کے ناقص فہم کے مطابق ترجمہ غلط ہوجائے گا، یہ ایسے ہی ہوگا جیسے اُوپر ذکر کردہ مثال کا ترجمہ یوں کیا جائے: ''کوئی نبی ایسا نہیں جو معصوم ہو'' اسی طرح یہاں حرفِ نفی حذف کرنے سے ترجمے کا حاصل یہ نکلے گا کہ تم کوئی عمل ایسا نہیں کرتے جس پر ہم حاضر ہوتے ہوں۔ واللہ اعلم بالصواب

محمد زاہد فیصل آبادی

حال وارد دارالعلوم کراچی ۱۴

یہ جواب احقر کی ہدایت پر لکھا گیا ہے، اور احقر کی نظر میں دُرست ہے۔ واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴/۱۲/۱۴۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱/۱۴۲)

مُعوّذتین کے قرآنِ کریم کا حصہ ہونے سے متعلق حضرت ابنِ مسعودؓ کے عقیدے کی مفصل تحقیق

سوال:- ایک مشہور تفسیرِ قرآن میں مُعوّذتین (سورۂ فلق والناس) کی قرآنیت کے متعلق بحث نے میرے ذہن کو کافی حد تک پریشان و پراگندہ کردیا ہے، اور اس بات کا شدید خطرہ ہے کہ سرے سے قرآن ہی کے غیر محرف ہونے کا ایمان نہ متزلزل ہوجائے۔ اس تفسیر میں بے شمار روایات و احادیث کے حوالوں سے ثابت کیا گیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ مُعوّذتین کو قرآن کی سورتیں نہیں مانتے تھے اور اسی لئے انہوں نے ان کو اپنے مصحف سے بھی ساقط کردیا تھا۔ بعض روایات میں اضافہ ہے کہ وہ ان سورتوں کو نماز میں بھی نہیں پڑھتے تھے۔ مفسرِ محترم نے ان روایات کو صحیح قرار دیا ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ یہ رائے صرف حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی رائے تھی جو اجتہادی غلطی تھی، لہٰذا ان کی رائے کو باقی صحابہؓ کے اجماع کے مقابلے میں رَدّ کیا جاسکتا ہے۔ اس بحث سے کم از کم میں مطمئن نہیں ہوسکا، اس لئے مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات کا طالب ہوں:-

۱:- قرآن کی کسی آیت کا انکار کرکے آیا کوئی شخص مسلمان بھی رہ سکتا ہے؟ درآنحالیکہ یہ انکار

کتنی ہی معصومیت سے کیا جائے؟ اگر نہیں تو حضرت عبداللہؓ کے متعلق آپ کی اور دُوسرے محققین کی کیا رائے ہے؟

۲:- حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے آخر ان سورتوں کا کیوں انکار کیا؟ یہاں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ہوسکتا ہے کہ ابنِ مسعودؓ کو ان کی خبر نہ پہنچ سکی ہو، کیونکہ جیسا کہ ابنِ حجرؒ نے بجا طور پر یہ لکھا ہے کہ یہ سورتیں دورِ اوّل ہی سے متواتر تھیں اور نازل بھی مکی دور میں ہوئی ہیں، اتنے عرصے تک ابنِ مسعودؓ بے خبر نہیں رہ سکتے، اس دور کے مسلمانوں کا یہ طریقہ بھی تھا کہ ان تک وحی خبرِ متواتر کے ذریعہ پہنچے، اور وہ اس بحث میں اُلجھ پڑیں کہ مجھے تو معلوم نہیں، لہٰذا یہ قرآن نہیں ہے۔ اور پھر یہ اَمر بھی معلوم ہے کہ حضرت عثمانؓ کے عہدِ مبارک میں تو ان سورتوں کا خبرِ متواتر ہونا مخفی نہیں رہ سکتا تھا اور موجودہ قرآن کی صحت پر تو صحابہ کرامؓ کا اجماع بھی ہو چکا تھا۔ ان حالات میں حضرت ابنِ مسعودؓ ناواقف نہیں رہ سکتے تھے، پھر انہوں نے ان سورتوں کا کیوں انکار کیا؟

۳:- عاصم، حمزہ، کسائی اور خلف جو مشہور قراء میں سے ہیں ان کی سند پر تمام اُمت کا اتفاق ہے، ان چاروں نے اسی قرآن کی سند، جسے اب ہم آپ پڑھتے ہیں اور جس میں مُعوّذتین بھی شامل ہیں، ابنِ مسعودؓ تک پہنچائی ہے، لیکن ابنِ مسعودؓ سے منسوب روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سلسلۂ اسناد غلط ہے، کیونکہ اس قرآن میں مُعوّذتین شامل ہیں اور وہ ان کے منکر تھے، اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ موجودہ قرآن میں یہ سورتیں الحاقی ہیں۔ ابنِ مسعودؓ کے شاگردوں نے کم از کم ایک دفعہ تو ان پر جھوٹ گھڑا ہے، باقی قرآن کے متعلق بھی اللہ ہی جانتا ہے کہ کتنا حصہ الحاقی ہوگا اور کتنا وہ حصہ ہے جو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا، ان احادیث سے قرآن کی قطعیت متاثر نہیں ہو جاتی؟

جواب:- محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا گرامی نامہ مجھے دس بارہ دن پہلے مل گیا تھا، جواب میں تاخیر اس لئے ہوئی کہ آپ کا جواب قدرے تفصیل کا طالب تھا، اور مجھے ہجومِ مصروفیات میں اتنا وقت نہ مل سکا کہ فوراً جواب لکھوں۔ بہرکیف! اب آپ کے سوالات کا جواب پیشِ خدمت ہے، خدا کرے کہ یہ جواب آپ کی تشفی کر سکے۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی پوری اُمت کی طرح مُعوّذتین کو قرآن کا جزء مانتے تھے، اور جن روایتوں میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ان کو قرآن کا جزء نہیں مانتے تھے، وہ دُرست نہیں ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے قرآنِ کریم کی جو متواتر قراءتیں منقول ہیں ان میں مُعوّذتین شامل ہیں۔

قراءتِ عشرہ میں سے عاصم کی قراءت حضرت ابو عبدالرحمٰن سلمیؒ، حضرت زر بن حبیشؒ اور

حضرت ابوعمرو الشیبانیؒ سے منقول ہے، اور یہ تینوں اسے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے نقل کرتے ہیں، (دیکھئے النشر فی القراءات العشر لابن الجزریؒ ج:۱ ص:۱۵۶)۔[1] اسی طرح حمزہ کی قراءت علقمہؒ، اسودؒ، ابنِ وہبؒ، عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کرتے ہیں، (ایضاً ج:۱ ص:۱۶۶)۔[2] اس کے علاوہ قراءت عشرہ میں سے کسائیؒ اور خلفؒ کی قراءتیں بھی بالآخر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ پر منتہی ہوتی ہیں، کیونکہ کسائیؒ، حمزہؒ کے شاگرد ہیں، اور خلفؒ ان کے شاگرد کے شاگرد ہیں، اور اس بات پر اُمت کا اجماع ہے کہ قراءاتِ عشرہ کی اسانید ساری دُنیا میں سب سے زیادہ قوی اور صحیح اسانید ہیں اور نسلاً بعد نسلٍ تواتر کے ساتھ نقل ہوتی چلی آرہی ہیں، (فیض الباری ج:۴ ص:۲۶۲)۔[3] اس لئے اگر کوئی خبرِ واحد ان متواتر قراءتوں کے خلاف ہو تو وہ یقیناً واجب الردّ ہے اور اسے قبول نہیں کیا جاسکتا۔ اسی بناء پر محقق علماء اور محدثین کی اکثریت نے ان روایتوں کو ضعیف، موضوع کم از کم ناقابلِ قبول بتایا ہے جو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی طرف یہ باطل مذہب منسوب کرتی ہیں، چند اقوال ذیل میں پیشِ خدمت ہیں:-

۱:- شیخ الاسلام علامہ نوویؒ جو جلیل القدر محدثین میں سے ہیں شرح مہذب میں تحریر فرماتے ہیں:-

أجمع المسلمون علٰی أنّ المعوّذتین والفاتحة من القرآن، وان من جحد منها شیئًا کفر، وما نقل عن ابن مسعودؓ باطل لیس بصحیح. (بحوالہ الاتقان ج:۱ ص:۸۱)۔[4]

''مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ مُعوّذتین اور فاتحہ قرآنِ کریم کا جزء ہیں، اور اگر کوئی شخص ان میں سے کسی کا بھی انکار کرے تو وہ کافر ہوجائے گا، اور اس سلسلے میں حضرت ابنِ مسعودؓ سے جو کچھ منقول ہے وہ صحیح نہیں۔''[5]

۲:- علامہ ابنِ حزمؒ تحریر فرماتے ہیں:-

وکل ما روی عن ابن مسعود من أن المعوّذتین وأم القرآن لم تکن فی مصحفه فکذب موضوع، لا یصحّ وانما صحت عنه قراءة عاصم عن زر بن حبیش عن ابن مسعود وفیها أم القرآن والمعوّذتان. (المحلی لابن حزم ج:۱ ص:۱۳، طبع دمشق و مصر)

---

(۱) النشر فی القراءات العشر لابن الجزری ج:۱ ص:۱۵۵ (مطبع مصطفٰی محمد، مصر).

(۲) ج:۱ ص:۱۶۵ (مطبع مصطفٰی محمد، مصر).

(۳) وفی فیض الباری قبیل کتاب فضائل القرآن ج:۴ ص:۲۶۲ (طبع مکتبه حقانیه پشاور) واعلم أن سند الکسائی ینتهی الی ابن مسعود، لأنه قرأ علٰی حمزة ومثله ینتهی سند خلف الذی من العشرة الی ابن مسعود فانه قرأ علٰی سلیم وهو علٰی حمزة واسناد القراء العشرة أصح الأسانید باجماع الأمة وتلقی الأمة له بقبولها.

(۴) دیکھئے: الإتقان فی علوم القرآن ج:۱ ص:۲۷۲ (طبع مکتبه نزار مصطفی الباز، مکة المکرمة) وکذا فی فیض الباری ج:۴ ص:۲۶۲ (طبع مکتبه حقانیه پشاور).

(۵) دیکھئے: اُردو ترجمہ الاتقان فی علوم القرآن ج:۱ ص:۲۱۲ (طبع ادارۂ اسلامیات ۱۴۰۲ھ بمطابق ۱۹۸۲ء)

''وہ تمام روایات جن میں کہا گیا ہے کہ مُعوّذتین اور سورۂ فاتحہ حضرت ابنِ مسعودؓ کے مصحف میں نہیں تھیں، وہ جھوٹی اور من گھڑت ہیں، بلکہ ان سے قراءتِ عاصم ثابت ہے جو زر بن حبیشؒ سے منقول ہے اور اس میں مُعوّذتین بھی ہیں اور فاتحہ بھی۔''

۳:- امام فخر الدین رازیؒ اور قاضی ابوبکر بن عربیؒ نے بھی اس روایت کو صحیح ماننے سے انکار کیا ہے۔ (المحلی لابن الحزم ج:۱ ص:۱۳ مطبوعہ دمشق سنہ ۱۳۴۷ھ)

۴:- علامہ بحر العلوم تحریر فرماتے ہیں:-

فنسبة إنكار كونها من القرآن اليه غلط فاحش، ومن أسند الانكار الى ابن مسعود فلا يعبأ بسنده عند معارضة هذه الأسانيد الصحيحة بالاجماع والملتقاة بالقبول عند العلماء الكرام بل والأمة كلها كافّة، فظهر أن نسبة الانكار الى ابن مسعود باطل.

''حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو مُعوّذتین کے جزءِ قرآن ہونے کا منکر بتانا نہایت فحش غلطی ہے، اور جس شخص نے اس انکار کی نسبت ان کی طرف کی ہے اس کی سند ان اسانید کے مقابلے میں ناقابلِ اعتبار ہے جو اجماعی طور پر صحیح ہیں اور جنھیں علمائے کرام بلکہ پوری اُمت نے قبول کیا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ حضرت ابنِ مسعودؓ کی طرف انکار کی نسبت باطل ہے۔''

(بحر العلوم شرح سلم الثبوت ج:۲ ص:۱۲)[1]

۵:- مصر کے علمائے متأخرین کے سرخیل علامہ زاہد الکوثریؒ لکھتے ہیں:-

ومن زعم أنه لم يكن فى مصحفه الفاتحة والمعوّذتان أو أنه كان يحك المعوّذتين فكاذب قصدا أو واهم من غير قصد، والمعوّذتان موجودتان فى قراءة ابن مسعود المتواترة عنه بطريق أصحابه. وكذٰلك الفاتحة وقراءتهُ هى قراءة عاصم المتواترة التى يسمعها المسلمون فى مشارق الأرض ومغاربها فى كل حين وفى كل الطبقات، وأنى يناهض خبر لآحاد الرواية المتواترة .... وقد أجاد ابن حزم الردّ علىٰ تقولات المتقولين فى هٰذا الصدد فى كثير من مؤلفاته.

''اور جس شخص کا یہ خیال ہو کہ حضرت ابنِ مسعودؓ کے مصحف میں فاتحہ اور مُعوّذتین نہیں تھیں یا وہ مُعوّذتین کو مصحف سے مٹادیا کرتے تھے تو وہ شخص یا تو جان بوجھ کر جھوٹ بولتا ہے یا غیر شعوری طور پر وہم میں مبتلا ہے، کیونکہ مُعوّذتین اور اسی طرح سورۂ فاتحہ حضرت ابنِ مسعودؓ کی اس قراءت میں موجود ہیں جو ان کے شاگردوں کی سند سے متواتراً منقول ہے، اور ان کی قراءت عاصم کی وہ مشہور قراءت

(۱) فواتح الرحموت ج:۲ ص:۱۳ (طبع دار احياء التراث العربى، بيروت لبنان).

ہے جسے مشرق ومغرب کے تمام مسلمان ہر زمانے اور ہر طبقے میں سنتے چلے آئے ہیں، اور یہ اخبارِ آحاد اس متواتر قراءت کا مقابلہ کیسے کرسکتی ہیں؟ اور علامہ ابنِ حزمؒ نے اپنی متعدد کتابوں میں اس قسم کے اقوال کی بڑی اچھی تردید کی ہے۔'' (مقالات الکوثری ص:۱۶)[1]

یہ چند اقوال صرف نمونے کے لئے پیش کئے گئے ہیں، ورنہ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے محقق علماء نے ان روایات کو صحیح ماننے سے انکار کیا ہے۔

اس پر یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ حافظ ابنِ حجرؒ اور علامہ نورالدین ہیثمیؒ نے تصریح کی ہے کہ ان روایتوں کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ (فتح الباری ج:۸ ص:۶۰۳،[2] ومجمع الزوائد ج:۷ ص:۱۴۹)[3]

پھر ان روایتوں کو غیر صحیح کیسے کہا جاسکتا ہے؟ لیکن جو حضرات علم حدیث سے واقف ہیں، ان پر یہ بات مخفی نہیں ہے کہ صرف راویوں کا ثقہ ہونا کسی روایت کے صحیح ہونے کے لئے کافی نہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں کوئی علت یا شذوذ نہ پایا جائے۔ تمام محدثین نے ''حدیثِ صحیح'' کی تعریف میں یہ بات لکھی ہے کہ وہ روایت ہر قسم کی علت اور شذوذ سے خالی ہو۔ چنانچہ اگر کسی روایت میں کوئی علت یا شذوذ پایا جاتا ہو تو راویوں کے ثقہ ہونے کے باوجود اس کو صحیح قرار نہیں دیا جاتا۔ حافظ ابن الصلاحؒ اپنے مقدمے میں تحریر فرماتے ہیں:-

فالحديث المعلل هو الحديث الذى اطلع فيه على علة تقدح فى صحته مع أن الظاهر السلامة منها ويتطرق ذلك إلى الإسناد الذى رجاله ثقات لجامع شروط الصحة من حيث الظاهر ويستعان على إدراكها بتفرد الراوى وبمخالفة غيره له مع قرائن تنضم إلى ذلك تنبه العارف بهذا الشأن. (بحوالہ مقدمۃ فتح الملہم ج:۱ ص:۵۴)[4]۔

''پس حدیث معلل وہ حدیث ہے جس میں کوئی ایسی ''علت'' معلوم ہوئی ہو جو اس حدیث کی صحت کو مجروح کرتی ہو باوجودیکہ ظاہری نظر میں وہ حدیث صحیح سالم معلوم ہوتی ہو اور یہ ''علت'' اس سند میں بھی واقع ہوجاتی ہے جس کے راوی ثقہ ہوتے ہیں اور جس میں بظاہر صحت کی تمام شرائط موجود ہوتی ہیں، اور اس علت کا ادراک علمِ حدیث میں بصیرت رکھنے والوں کو مختلف طریقوں سے ہوجاتا ہے، کبھی راوی کو متفرد دیکھ کر، اور کبھی یہ دیکھ کر کہ وہ راوی کسی دُوسرے راوی کی مخالفت کر رہا ہے اور اس کے ساتھ کبھی دُوسرے قرائن بھی مل جاتے ہیں۔''

---

(۱) (مطبع ایچ ایم سعید).
(۲) فتح الباری ج:۸ ص:۷۴۳ (مطبع دار نشر الکتب الاسلامیہ لاہور).
(۳) (مطبع دار الکتاب العربی، بیروت لبنان).
(۴) فتح الملہم ج:۱ ص:۱۴۲ (طبع مکتبۃ دار العلوم کراچی).

حدیث کی ایک قسم ''شاذ'' ہے، اس کے راوی بھی ثقہ ہوتے ہیں لیکن چونکہ وہ اپنے سے زیادہ ثقہ راویوں کی مخالفت کرتے ہیں اس لئے ان کی حدیث قبول نہیں کی جاتی۔

لہٰذا جن روایتوں میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی طرف یہ قول منسوب کیا گیا ہے کہ وہ مُعوّذتین کو قرآنِ کریم کا جزء نہیں مانتے تھے، علامہ نوویؒ اور ابنِ حزمؒ وغیرہ نے ان کو، روایوں کے ثقہ ہونے کے باوجود مندرجہ ذیل تین وجوہ سے قابلِ قبول نہیں سمجھا:-

۱:- یہ روایتیں معلول ہیں اور ان کی سب سے بڑی علت یہ ہے کہ وہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی ان قراءتوں کے خلاف ہیں جو ان سے بطریقِ تواتر منقول ہیں۔

۲:- مسندِ احمد کی وہ روایت جس میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا یہ صریح قول نقل کیا گیا ہے کہ: ''إنهما ليستا من كتاب الله'' (مُعوّذتین اللہ کی کتاب کا جزء نہیں ہیں) صرف عبدالرحمٰن بن یزید نخعیؒ سے منقول ہے، اور کسی نے صراحۃً ان کا یہ جملہ نقل نہیں کیا۔ (دیکھئے: مجمع الزوائد للهيثمي ج:۷ ص:۱۴۹،[1] و الفتح الرباني ج:۱۸ ص:۳۵۱،۳۵۲[2])

اور متواترات کے خلاف ہونے کی وجہ سے یہ جملہ یقیناً شاذ ہے، اور محدثین کے اُصول کے مطابق ''حدیثِ شاذ'' مقبول نہیں ہوتی۔

۳:- اگر بالفرض ان روایتوں کو صحیح مان بھی لیا جائے تب بھی بہرحال یہ اخبارِ آحاد ہیں اور اس بات پر اُمت کا اجماع ہے کہ جو خبرِ واحد متواترات اور قطعیات کے خلاف ہو وہ مقبول نہیں ہوتی۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے جو قراءتیں تواتر کے ساتھ ثابت ہیں ان کی صحت قطعی ہے، لہٰذا ان کے مقابلے میں یہ اخبارِ آحاد یقیناً واجب الردّ ہیں۔

اب صرف ایک سوال رہ جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر یہ روایتیں صحیح نہیں ہیں تو ان ثقہ راویوں نے ایسی بے اصل بات کیونکر روایت کردی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان روایتوں کی حقیقت یہ ہوسکتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ مُعوّذتین کو قرآنِ کریم کا جزء تو مانتے ہوں لیکن کسی وجہ سے انہوں نے اپنے مصحف میں ان کو نہ لکھا ہو۔ اس واقعے کو روایت کرتے ہوئے کسی راوی کو وہم ہوا اور اس نے اسے اس طرح روایت کردیا گویا وہ انہیں سرے سے جزءِ قرآن ہی نہیں مانتے تھے، حالانکہ حقیقت صرف اتنی تھی کہ مُعوّذتین کو جزءِ قرآن ماننے کے باوجود انہوں نے اپنے مصحف میں ان کو نہیں لکھا تھا، اور نہ لکھنے کی وجوہ بہت سی ہوسکتی ہیں، مثلاً علامہ زاہد الکوثریؒ نے فرمایا ہے کہ: انہوں نے مُعوّذتین کو

---

(۱) (مطبع دار الكتاب العربي، بيروت لبنان)۔
(۲) ناشر: أحمد عبدالرحمن، البنا الساعاتي۔

اس لئے نہیں لکھا کہ ان کے بھولنے کا کوئی ڈر نہ تھا، کیونکہ یہ ہر مسلمان کو یاد ہوتی ہیں۔ (مقالات الکوثری ص:۱۶)۔[1]

اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اپنے مصحف میں سورۂ فاتحہ بھی نہیں لکھی تھی، اور امام ابوبکر الانباریؒ نے اپنی سند سے روایت کیا ہے کہ ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ: "لو کتبتھا لکتبتھا مع کل سورۃ" (اگر میں سورۂ فاتحہ لکھتا تو اسے ہر سورت کے ساتھ لکھتا)۔ امام ابوبکر فرماتے ہیں کہ: اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز میں ہر سورت سے پہلے سورۂ فاتحہ پڑھی جاتی ہے، اس لئے ہر سورت کا افتتاح فاتحہ سے ہونا چاہئے۔ لہٰذا حضرت ابنِ مسعودؓ نے فرمایا کہ: میں نے اسے نہ لکھ کر اختصار سے کام لیا اور مسلمانوں کے حفظ پر اعتماد کیا۔[2]

بہرکیف! اگر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے مصحف میں سورۂ فاتحہ اور مُعوّذتین تحریر نہ فرمائی ہوں تو اس کی بہت سی معقول توجیہات ہوسکتی ہیں، اور ان سے یہ سمجھنا کسی طرح دُرست نہیں ہے کہ وہ ان کو قرآنِ کریم کا جزء نہیں مانتے تھے، جبکہ ان سے تواتر کے ساتھ پورا قرآن ثابت ہے۔

اس تحقیق کے بعد آپ کے تمام سوالات کا جواب ہوجاتا ہے، کیونکہ وہ اس قصے کو صحیح قرار دینے پر مبنی ہے۔

یہ مکتوب احقر نے حضرت والد صاحب مدظلہم کو بھی سنادیا تھا، انہوں نے بھی اس کی تائید و تصدیق فرمائی۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۳/۷/۶ھ
(فتویٰ نمبر ۹۱/۷۲۴ د)

"اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ" کی تفسیر

سوال:- محترمی جناب مفتی صاحب! مہربانی فرماکر اس آیت کا خلاصۂ تفسیر تحریر فرمادیں: "اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ"۔

جواب:- اس آیت کا لفظی ترجمہ تو یہ ہے کہ: "اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم)! آپ کو بھی موت آنی ہے اور ان کو بھی۔" آیت کا سیاق و سباق یہ ہے کہ مشرکین کے عقیدۂ شرک کا ابطال کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ آپؐ میں اور ان مشرکین میں جو اختلاف ہے اس کا فیصلہ دونوں کی وفات

(۱) (مطبع ایچ ایم سعید)۔
(۲) تفسیر القرطبی ج:۱ ص:۱۱۴، ۱۱۵ (مطبع دار الکتاب العربی للطباعۃ والنشر ۱۳۸۷ھ - ۱۹۶۸ء انتشارات ناصر خسرو، ایران)۔

کے بعد یقینی طور پر ہوجائے گا، جب مؤمن و کافر سب بارگاہِ الٰہی میں جمع ہوں گے تو ان مشرکین کو خود پتہ چل جائے گا کہ وہ کتنی غلطی پر تھے۔(۱)

یہ اس آیت کا خلاصۂ تفسیر ہے، یہ آیت حیاتِ انبیاء کے عقیدے کے منافی نہیں ہے، اس لئے کہ انبیاء کی اور عام انسانوں کی موت میں یہ فرق ہوتا ہے کہ انبیاء کی ارواح کا تعلق ان کے اجسام کے ساتھ عام انسانوں کے مقابلے میں زیادہ باقی رہتا ہے، اس لئے ان کی میراث تقسیم نہیں ہوتی، اور ان کی ازواجِ مطہرات سے ان کے بعد کسی کے لئے نکاح جائز نہیں ہوتا، اور اسی لئے اس آیت میں دونوں کی موت کو الگ الگ ذکر فرمایا گیا ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۱/۱۰/۵ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۶۰۹/۲۲ ب)

''تفہیم القرآن'' کا بغیر تنقید کے مطالعہ کرنا

سوال:- مولانا مودودی کی تفسیر ''تفہیم القرآن'' بغیر کسی تنقید کے پڑھنا پڑھانا کیسا ہے؟

جواب:- ''تفہیم القرآن'' میں بہت سی باتیں جمہور کے مُسلَّمات و اقوال کے خلاف ہیں، اس لئے اسے بقولِ سائل بلاتنقید پڑھنا پڑھوانا دُرست نہیں ہے۔ درسِ قرآن کے لئے حضرت تھانویؒ یا علامہ عثمانیؒ کی مستند تفاسیر سے استفادہ کیا جائے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

یکم ذی قعدہ ۱۳۸۷ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۴۰۴/۱۸ الف)

سب سے پہلی تفسیر کون سی ہے؟

سوال:- کسی صاحب نے ''ابلاغ'' میں لکھا ہے کہ حضرت اُبیّ بن کعبؓ نے سب سے پہلے قرآنِ پاک کی تفسیر لکھی ہے۔ میں نے ایک کتاب میں دیکھا ہے کہ علامہ ذہبیؒ کے بیان کے مطابق فنِ تفسیر میں سب سے پہلے حضرت سعید بن جبیرؒ نے کتاب لکھی ہے، اور مؤرّخ ابنِ خلکانؒ کے بیان کے مطابق ابنِ جریجؒ متوفی سنہ ۱۵۰ھ نے سب سے پہلے تفسیر لکھی، حضرت عبداللہ بن عباسؓ متوفی سنہ ۶۸ھ نے بھی ایک تفسیر لکھی تھی۔ جناب سے گزارش ہے کہ اس سلسلے میں اپنی تحقیق

(۱) دیکھئے: خلاصۂ تفسیر معارف القرآن ج:۷ ص:۵۵۵۔

حوالے کے ساتھ تحریر فرمائیں۔

جواب:- جہاں تک ہماری معلومات رہنمائی کرتی ہیں، حضرت اُبیّ بن کعبؓ ہی سب سے پہلے صاحبِ تصنیف مفسر ہیں۔ صحابہ کرامؓ میں سے بہت سے حضرات تفسیر کا درس دیا کرتے تھے، لیکن کسی کی تفسیر کا کتابی شکل میں مدوّن ہونا ثابت نہیں ہے، اور حضرت اُبیّ بن کعبؓ کے بارے میں علامہ جلال الدین سیوطیؒ تحریر فرماتے ہیں:-

وأما أبی بن کعبٌ فعنهٗ نسخة کبیرة یرویها أبو جعفر الرازی عن الربیع بن أنس عن أبی العالیة عنه وهٰذا اسناد صحیح، وقد أخرج ابن جریر وابن أبی حاتم منها کثیرا، وکذا الحاکم فی مستدرکه وأحمد فی مسنده. (الاتقان ج:۲ ص:۱۸۹، حجازی قاهرة سنة ۱۳۶۸ھ).[۱]

ترجمہ:- ''رہے حضرت اُبیّ بن کعبؓ تو ان سے ایک بڑا نسخہ منقول ہے، جسے ابوجعفر رازی، ربیع بن انس عن ابی العالیہ کے واسطے سے روایت کرتے ہیں، اور یہ سند صحیح ہے۔ ابنِ جریر اور ابن ابی حاتم نے اس نسخے سے بہت سی روایات لی ہیں، اسی طرح حاکمؒ نے مستدرک میں اور امام احمدؒ نے مسند میں بھی۔''[۲]

رہے حضرت عبداللہ بن عباسؓ، سو اگرچہ وہ باتفاق مفسرین کے امام ہیں، لیکن اوّل تو ان کی تفسیر کتابی شکل میں کسی صحیح سند سے ثابت نہیں ہے، آج کل "تنویر المقباس" کے نام سے جو نسخہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی طرف منسوب ہے اس کی سند نہایت ضعیف ہے، کیونکہ یہ نسخہ محمد بن مروان السدی الصغیر عن الکلبی عن ابی صالح کی سند سے ہے، اور اس سلسلۂ سند کو محدثین نے ''سلسلۃ الکذب'' قرار دیا ہے۔[۳]

اور اگر بالفرض حضرت ابنِ عباسؓ کی تفاسیر کا کوئی کتابی مجموعہ ثابت بھی ہو تب بھی اسے علمِ تفسیر کی پہلی کتاب قرار نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ حضرت اُبیّ بن کعبؓ ان سے متقدم ہیں، حضرت ابنِ عباسؓ کی وفات طائف میں سنہ ۶۸ھ میں (سنہ ۲۸ھ میں نہیں، جیسا کہ سائل نے لکھا ہے) ہوئی ہے، جبکہ حضرت اُبیّ بن کعبؓ سنہ ۲۰ھ میں وفات پاچکے تھے۔ (مقدمہ تفسیر مراغی ج:۱ ص:۷)[۴]

---

(۱) الاتقان فی علوم القرآن ج:۴ ص:۱۲۱۸ (طبع مکتبه نزار مصطفیٰ الباز، مکة المکرمة).

(۲) اُردو ترجمے کے لئے دیکھئے الاتقان ج:۲ ص:۴۶۵ (طبع ادارۂ اسلامیات لاہور)

(۳) وفی مقدمة تفسیر المراغی ج:۱ ص:۶، ۷ (مطبع مصطفیٰ، مصر) طریق أبی النصر محمد بن السائب الکلبی المتوفی سنة ۱۴۶ھ وهی أوهی الطریق، ولا سیما اذا وافقتها طریق محمد بن مروان السدی الصغیر المتوفی سنة ۱۸۶ھ وقد طبع تفسیر ینسب الی ابن عباسؓ بروایة الفیروزآبادی صاحب القاموس سماه "تنویر المقباس من تفسیر ابن عباس".

(۴) (مطبع مصطفیٰ، مصر).

علامہ ذہبیؒ اور قاضی ابنِ خاکانؒ کے اقوال ہماری نظر سے نہیں گزرے، یہ اپنی جگہ دُرست ہے کہ حضرت سعید بن جبیرؒ اور ابنِ جریجؒ کی تفسیریں بھی کتابی شکل میں مدوّن ہوئی تھیں، لیکن چونکہ یہ حضرات تابعین میں سے ہیں، اور حضرت اُبَیّ بن کعبؓ کی تفسیر ان سے بہت پہلے لکھی جاچکی تھی، اس لئے اوّلیت کا شرف حضرت اُبَیّ بن کعبؓ ہی کو حاصل ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۲۴ محرم ۱۳۸۷ھ[1]

جناب مودودی صاحب کا حضرت داؤد علیہ السلام کے قصے میں اوریاء کی بیوی کا واقعہ ذکر کرنا

سوال:- مودودی صاحب لکھتے ہیں کہ: ''مگر اس کی اصلیت صرف اس قدر تھی کہ حضرت داؤد نے اپنے عہد کی اسرائیلی سوسائٹی کے عام رواج سے متأثر ہوکر اوریاء سے طلاق کی درخواست کی تھی .... الخ'' اس عبارت پر اعتراض یہ ہے کہ کیا خدا کا نبی بڑی سوسائٹی سے متأثر ہوسکتا ہے؟ دُوسری عرض یہ ہے کہ مفسرین حضرات نے اس واقعے کو نقل کیا ہے، لیکن کیا کسی مفسر نے یہ لکھا ہے کہ ہمارے نزدیک باقی تمام تأویلات سے یہ تأویل ہی مرجح ہے؟

۲:- عصمت، انبیاء علیہم السلام کے لوازمِ ذات سے ہے یا نہیں؟

۳:- کیا انبیاء علیہم السلام کو نبوّت سے قبل بھی وہی عصمت حاصل ہوتی ہے جو کہ نبی ہونے کے بعد ہوا کرتی ہے؟

جواب ۱:- اصل یہ ہے کہ محقق مفسرین نے حضرت داؤد علیہ السلام کے اس واقعے میں اوریاء کی بیوی کے قصے کو اختیار نہیں کیا، حافظ ابنِ کثیرؒ تحریر فرماتے ہیں کہ: **اکثرھا مأخوذ من الاسرائیلیات، ولم یثبت فیھا عن المعصوم حدیث یجب اتباعہ، لکن روی ابن أبی حاتم ھھنا حدیثًا لا یصح سندہ، لأنہ من روایۃ یزید الرقاشی عن أنسؓ، ویزید وان کان من الصالحین لکنہ ضعیف الحدیث عند الأئمۃ۔**[2]

اوریاء کا یہ قصہ درحقیقت بائبل کی کتاب سموئیل سے مأخوذ ہے، جس کے مصنف کا آج تک پتہ ہی نہیں چل سکا، لہٰذا بہت سے محققین نے صحیح اسے قرار دیا ہے کہ دراصل حضرت داؤد علیہ السلام نے ظالم کے بجائے مظلوم سے خطاب فرمایا، جس سے طرف داری متوہم ہوتی تھی اور اسے خلافِ عدل سمجھ

---

(۱) یہ فتویٰ ''البلاغ'' کے شمارہ صفر ۱۳۸۷ھ سے لیا گیا ہے۔

(۲) تفسیر ابن کثیر ج:۳ ص:۳۵۷ سورۃ صٓ۔

کر اِستغفار فرمایا۔ (بیان القرآن ج:۱۰ ص:۸)۔[1]

امام رازیؒ نے اسی قسم کی اور توجیہات بھی نقل کی ہیں۔ (تفسیر کبیر ج:۱ ص:۱۸۹)۔[2]

لہٰذا آیت کی بے غبار اور محقق تفاسیر تو وہی ہیں جو امام رازیؒ یا حضرت تھانویؒ اور علامہ آلوسیؒ وغیرہ نے نقل کی ہیں۔

البتہ بعض مفسرین نے اس کو بھی اختیار کیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں کسی شخص سے اس کی بیوی کو طلاق دینے کی درخواست کرنا مروّت کے خلاف نہ سمجھا جاتا تھا، اور قانونی قباحت تو اس میں آج بھی نہیں ہے، اس لئے حضرت داؤد علیہ السلام نے اوریاء سے اسی قسم کا مطالبہ کیا تھا۔ **فقیل: انه علیه السلام رای امراة رجل .... فسأله ان یطلقها فاستحی ان یرده ففعل فتزوجها وهی أم سلیمان، وکان ذٰلک جائزًا فی شریعته معتادا فیما بین أمته غیر مخل بالمروءة.** (رُوح المعانی ج:۲۳ ص:۱۸۵)۔[3]

لہٰذا یہ تفسیر جو سوال میں نقل کی گئی ہے بے اصل تو نہیں، مگر اوّل تو مرجوح ہے، دُوسرے ''سوسائٹی کے رواج سے متأثر ہونے'' کا لفظ قدرے خلافِ احتیاط ہے، اس کے بجائے ''سوسائٹی کے عام رواج کے مطابق'' کا لفظ ہوتا تو مناسب تھا، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ نبی کسی بُرے کام میں سوسائٹی کے رواج سے متأثر ہوگیا، کیونکہ یہ کام نہ ناجائز تھا اور نہ خلافِ مروّت۔ ہاں! نبوّت کے مقامِ بلند کے پیشِ نظر حضرت داؤد علیہ السلام نے اسے بُرا سمجھ کر اس پر اِستغفار فرمایا۔

۲:- عصمت، انبیاء علیہم السلام کے لئے لازم ہے، اور ان سے کسی وقت بھی یہ صفت جدا نہیں ہوتی، ان کی لغزشوں کا ذکر قرآنِ کریم وغیرہ میں آیا ہے، وہ سب خلافِ اَولیٰ باتیں تھیں، جو شرعاً معصیت نہیں، مگر انبیاء علیہم السلام کو ان کی جلالتِ قدر کی وجہ سے ان پر بھی تنبیہ کی گئی۔

۳:- صحیح یہ ہے کہ نبوّت سے قبل بھی انبیاء علیہم السلام سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۲۳ھ

(فتویٰ نمبر ۳۰۰/۱۹ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) بیان القرآن ج:۱۰ ص:۶ (طبع سعید) نیز تفصیل کے لئے دیکھئے: معارف القرآن حضرت کاندھلویؒ ج:۶ ص:۳۱ تا ۳۱۳ (طبع مکتبہ عثمانیہ لاہور)۔

(۲) دیکھئے: تفسیر کبیر ج:۱۶ ص:۱۹۰ تا ۱۹۹۔

(۳) (طبع مکتبه رشیدیه لاهور).

''وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ .... الخ'' میں قنوت کا معنی ''قراءت'' سے کرنا

سوال:- سورۃ الاحزاب میں پارہ۲۲ رُکوع دوم کی آیت اوّل یوں شروع ہوتی ہے: ''اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ .... الخ'' یہاں ''اَلْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ'' کے معنی حضرت شاہ رفیع الدینؒ نے قرآن پڑھنے والے، قرآن پڑھنے والیاں کیا ہے۔ اس کا ترجمہ شیخ الہندؒ نے عاجزی کرنے والے مرد اور عاجزی کرنے والی عورتیں کیا ہے۔ یہاں سوال یہ ہے کہ قنوت کا معنی قرآن پڑھنا کیسے ہوگیا؟ دونوں بزرگ مذکورہ بالا چوٹی کے علماء ہیں، لغوی لحاظ سے قنوت، قرآن پڑھنے کے معنی میں نہیں آتا، سائل ایک طالبِ علم ہے اور چاہتا ہے کہ عقل ونقل سے اس ترجمے کی توجیہ اسے سمجھائی جائے، ابھی تو یہی شک گزرتا ہے کہ کاتب وغیرہ سے غلطی ہوئی ہوگی۔

جواب:- قنوت کے لغت میں بہت سے معانی آتے ہیں، جن میں سے ایک قراءت بھی ہے، حضرت شاہ رفیع الدینؒ کا ترجمہ اسی معنی کے مطابق ہے۔[1]　　واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

قرآنِ کریم کو رسمِ عثمانی کے علاوہ کسی اور رسم الخط میں لکھنا

سوال:- لوگوں کو قرآنِ کریم پڑھانے کے لئے قرآن کو رسمِ عثمانی کے سوا کسی اور رسم الخط میں لکھنا جائز ہے یا ناجائز؟

جواب:- قرآنِ کریم کو رسمِ عثمانی کے سوا کسی اور رسم الخط میں لکھنا باجماع ناجائز ہے،[2] لوگوں کو قرآنِ کریم پڑھانے کے لئے عربی رسم الخط سکھایا جائے، عجمی رسم الخط میں لکھنا دُرست نہیں،

---

(۱) وفی لسان العرب ج:۱۱ ص:۳۱۳، ۳۱۴ قنت (قنوت) ویرد بمعان متعددة کالطاعة والخشوع والصلاة والدعاء والعبادة والقیام وطول القیام والسکوت. فیصرف فی کل واحد من هذه المعانی الی ما یحتمله لفظ الحدیث الوارد فیه، وفیه أیضًا بعد أسطر: القانت الذاکر لله تعالی، کما قال الله تعالی: ''اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا'' وکذا فی المنجد ص:۶۸۱. نیز قنوت کا ایک معنی ''عاجزی کرنا'' بھی ہے، دیکھئے، اُردو منجد ص:۶۸۱، ومصباح اللغات ص:۷۰۹۔ (از مرتب)۔

(۲) وفی الاتقان فی علوم القرآن، النوع السادس والسبعون فی مرسوم الخط وآداب کتابته ج:۴ ص:۱۱۵۳ (طبع مکتبة نزار مصطفی الباز، مکة المکرمة) قال أشهب: سئل مالک: هل یکتب المصحف علی ما أحدثه الناس من الهجاء؟ فقال: لا إلّا علی الکتبة الأولی. رواه الدانی فی المقنع، ثم قال: ولا مخالف له من علماء الأئمة. وبعد أسطر: وقال الامام أحمد: یحرم مخالفة مصحف الامام فی واو أو یاء أو الف أو غیر ذلک. وفی خلاصة النصوص الجلیة ص:۴۵ (بحواله جواهر الفقه) احمع المسلمون قاطبة علی وجوب اتباع رسم مصاحف عثمان ومنع مخالفته .... الخ، وکذا فی الفرائد الحسان فی بیان رسم القران ص:۵۸. نیز درج ذیل کتب دیکھئے: مناهل العرفان للزرقانی ص:۳۷۰، دلیل الحیران ص:۳۰، المقنع فی رسم مصاحف الأمصار ص:۳۳، نثر المرجان فی رسم نظم القرآن ج:۱ ص:۶۹، لطائف البیان فی رسم القرآن ج:۲ ص:۲۷، الجامع لما یحتاج الیه من رسم المصحف ص:۵۲.

تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو جواہر الفقہ ج:۱ ص:۳۷ مؤلفہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴/۶/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۶۳۰/ ۲۸ ب)

وحی سے متعلق مقدمہ معارف القرآن کی ایک عبارت کی وضاحت

سوال:- حضرت مولانا نے معارف القرآن کے مقدمہ میں جہاں وحی کی حقیقت بیان کی ہے وہاں راقم الحروف کے ایک مقامی دوست نے ایک شبہ کی طرف توجہ دلائی۔ حضرت مولانا سے مؤدبانہ درخواست ہے کہ اس کی وضاحت فرمادیں۔ وہ یہ ہے کہ راقم الحروف نے اپنی کوتاہ نظر سے یہ عبارت لکھی ہوئی پائی: ''چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ تین چیزیں ایسا پیدا کی ہیں جن کے ذریعہ اسے مذکورہ بالا باتوں کا علم حاصل ہوتا رہے۔ ایک انسان کے حواس، یعنی آنکھ، کان، منہ اور ہاتھ پاؤں، دُوسرے عقل اور تیسرے وحی'' (نیز معارف القرآن کے انگریزی ترجمے میں Has Created پایا)۔ اور دُوسرے صفحہ پر یہ لکھا ہوا پڑھا: ''اسے اپنا پیغمبر قرار دے دیتا ہے اور اس پر اپنا کلام نازل فرماتا ہے، اسی کلام کو ''وحی'' کہا جاتا ہے۔'' چنانچہ راقم الحروف کی ناقص فہم میں یہ شبہ سا ہوتا ہے کہ چونکہ یہاں وحی کا لفظ عام ہے، وحیٔ متلو اور وحیٔ غیر متلو دونوں پر مشتمل ہے، لہٰذا وحیٔ متلو پر اِشکال نظر آتا ہے، لہٰذا رہنمائی فرمائیں۔ عبدالحفیظ خانڈوالا، کینیا

جواب:- محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط ملا، ''وحی'' کے معنی ہیں ''اللہ تعالیٰ کا کسی بندے (پیغمبر) پر اپنا کلام نازل فرمانا، یا کسی اور طرح سے اُسے خبر دینا'' اور اس معنی میں وحی مخلوق، حادث اور غیر قدیم ہے۔ جو چیز قدیم اور غیر مخلوق ہے وہ اللہ کا کلامِ نفسی ہے، لیکن وحی کا اس کلامِ نفسی سے متعلق ہونا حادث اور مخلوق ہے، لہٰذا اس عبارت میں کوئی اِشکال نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱/۴/۱۴۲۲ھ

﴿کتاب الحدیث وما یتعلق به﴾

(حدیث اور اس سے متعلق مسائل کا بیان)

مرسل حدیث کی حجیت سے متعلق احناف کا موقف

سوال:- مرسل روایت کے متعلق محدثین (جمہور) کا جو مسلک ہے وہ تو معلوم ہے، اور علمائے احناف کا مسلک معلوم ہے کہ ان کے ہاں مرسل روایت مقبول و حجت ہے، لیکن دریافت طلب امر یہ ہے کہ یہ مرسل روایت کا مقبول ہونا اکابر علمائے حنفیہ کے نزدیک علی الاطلاق ہے یا اس کی چند صورتیں مستثنیٰ ہیں، یعنی مثلاً ایک مرسل روایت کسی صحیح متصل سند والی مرفوع روایت کے مخالف ہے اور اس کے منافی ہے، حتیٰ کہ ان میں تطبیق کی صورت بھی نہ ہو، یا مثلاً اس مرسل روایت سے کوئی عقیدہ ثابت ہو، یا کسی مُسَلَّم عقیدے کے خلاف ہو مثلاً روایۃ العرنیین، یا پھر اس مرسل روایت سے کسی صحابی کی ناموس وغیرہ پر تردید ظاہر ہو، تو کیا یہ سب صورتیں اور اس قسم کی دُوسری صورتیں بھی مرسل روایت کی مقبول ہیں؟ یا یہ صورتیں اس قاعدے سے مستثنیٰ ہیں، یعنی ایسی صورت میں وہ مقبول نہیں ہوتی، اگر اس قسم کی صورتوں میں اکابر علمائے حنفیہ مرسل روایت کو قبول نہیں فرماتے، اور جناب کو ایسے حوالے معلوم ہوں تو مہربانی فرماکر اپنی اوّلین فرصت میں مجھے اس حوالہ و کتاب وغیرہ سے مطلع فرمائیں، نہایت شدید ضرورت ہے۔ ہاں! متقدمین اکابر حنفیہ کی کوئی قید نہیں لیکن اگر متقدمین میں سے حوالجات ہوں تو اور بھی بہتر ہے، ورنہ متأخرین اکابر حنفیہ کے بھی حوالجات کافی ہوں گے، حتیٰ کہ معاصرین علماء جید کے حوالجات ہوں تو وہ بھی تحریر فرمائیں، والسلام! پیر محب اللہ شاہ راشدی (حیدرآباد سندھ)

جواب:- حدیثِ مرسل کے بارے میں عرض یہ ہے کہ اس بارے میں عام طور پر حنفیہ کے مسلک کو دُرست طور پر سمجھا نہیں گیا۔ حنفیہ، محدثین کی اصطلاح کے مطابق مرسل کو علی الاطلاق حجت نہیں سمجھتے، بلکہ جو مرسل حنفیہ کے نزدیک حجت ہوتی ہے اس کے لئے تین شرائط ہیں:-

۱:- پہلی شرط یہ ہے کہ مرسل قرونِ ثلاثہ مشہود لہا بالخیر میں سے کوئی ہو۔ ۲:- دُوسری شرط یہ ہے کہ وہ خود جرح و تعدیل وغیرہ سے باخبر امام اور ثقہ ہو۔ ۳:- تیسری شرط یہ ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی قول یا فعل کو بصیغۂ جزم مثلاً "قال رسول الله صلى الله عليه وسلم كذا" روایت کرے، لہٰذا عنعنہ کرے گا تو اس شرط کے مفقود ہونے کی بناء پر حدیث حجت نہ ہوگی، چنانچہ محقق ابنِ ہمامؒ نے "تحریر" میں مرسل کی یہ تعریف فرمائی ہے: "**المرسل قول الامام الثقة: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم مع حذف من السند**"۔[1]

(۱) التقریر والتحبیر علی تحریر الامام الکمال ابن الهمام "مسئلة مرسل" ج:۲ ص:۲۸۸ (طبع دار الکتب العلمية بیروت).

یہ تعریف چونکہ محدثین کی تعریف سے مختلف ہے، اس لئے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ حنفیہ ہر اس حدیث کو حجت مانتے ہیں جو محدثین کی اصطلاح کے مطابق مرسل ہو، حالانکہ صورتِ حال ایسی نہیں ہے۔ اس مسئلے پر حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی قدس سرہٗ نے مقدمۂ فتح الملہم ص:۸۰ تا ۸۲ پر مفصل بحث کی ہے، اس کو ملاحظہ فرمالیں تو انشاء اللہ حنفیہ کا اصل موقف سامنے آجائے گا۔

ان شرائط کے ساتھ جو حدیث مرسل ہو وہ بعض اوقات مسند سے بھی قوی ہوسکتی ہے، لیکن کم از کم اس کے ہم پلہ تو ضرور ہوگی، لہٰذا اگر کسی مسند موصول حدیث کا ایسی حدیثِ مرسل کے ساتھ تعارض ہو تو وہی معاملہ کیا جائے گا جو دو موصول حدیثوں میں تعارض کے وقت کیا جاتا ہے، اور اگر مرسل کی مذکورہ تین شرائط میں سے کوئی شرط مفقود ہو تو وہ حنفیہ کے نزدیک حجت ہی نہیں ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ حدیث موصول صحیح اس پر راجح ہوگی، ھذا ما فھمت من مذھب الحنفیۃ۔ واللہ اعلم

۶/۱/۱۴۰۴ھ

(فتویٰ نمبر ۳۵/۴۹ الف)

"من جدّد قبرًا ومثّل مثالًا .... الخ" حدیث ہے یا نہیں؟

سوال:- ہماری مسجد میں سیکریٹری اور کارکن جماعتِ اسلامی کے ہیں، مسجد کا چبوترہ ایک شخص کو دیا ہوا تھا، میری دُکان کرایہ پر سامنے تھی، صبح جب میں قرآن شریف کی تلاوت کرتا تو وہ شخص ریڈیو پر فحش ریکارڈ بلند آواز سے چلاتا رہتا، مسجد کے کارکنوں سے شکایت کی، کوئی شنوائی نہ ہوئی، جماعت کے آدمی نے کہا کہ یہ سب تمہاری شہ پر ہو رہا ہے۔

محرّم کے مہینے میں ان میں سے بعض ایسے لوگ آتے ہیں جو خود شیعہ ہیں، میں نے ایک حدیث پڑھی غالبًا عربی الفاظ یہ ہیں: "من جدّد قبرًا ومثّل مثالًا فھو زائر لیخرج الاسلام" یہ سن کر اس شخص نے مجھے مارا، کیا یہ حدیث صحیح ہے؟

جواب:- ان الفاظ سے کوئی حدیث ہمارے علم میں نہیں، اور حدیث کی کتابوں میں تلاش سے بھی نہیں ملی، آپ نے جس کتاب میں دیکھی ہو اس کا مفصل حوالہ لکھ کر بھیجیں تو کچھ کہا جاسکتا ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۵/۱۱/۱۴۰۱ھ

سندِ حدیث میں لفظِ "نا" کا مطلب

سوال:- سند میں لفظِ "نا" کا استعمال کرتے ہیں، اس کا کیا مطلب ہے؟

جواب:- سند میں جو لفظِ "نا" ہوتا ہے، وہ "حدثنا" کا مخفف ہے، یعنی ہم سے حدیث

بیان کی۔ واللہ اعلم

۱۴۰۱/۱۱/۱۵ھ

(فتویٰ نمبر ۱۱۷۱/۳۲ ج)

ہندوستان سے فرحت بخش ہوا آنے سے متعلق حدیث کی تحقیق

سوال:- کیا کوئی حدیث شریف اس مضمون کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہو کہ: ''ہندوستان سے ایسی فرحت بخش ہوا آتی ہے'' یا یہ مضمون ہو کہ ''میرا سینہ کشادہ ہو جاتا ہے اور مجھے فرحت محسوس ہوتی ہے'' یا یہ مضمون ہو کہ ''ہندوستان کے لوگ مجھے عزیز ہیں، کیونکہ وہ مجھے دیکھے بغیر ایمان لائیں گے۔''؟

جواب:- اس مضمون کی کوئی حدیث احقر کے علم میں نہیں ہے، اور کتبِ حدیث میں سرسری تلاش سے ملی بھی نہیں۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۲/۲۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸۰۵/۲۷ و)

مطالعے کے لئے حدیث کی مستند کتب

سوال:- حدیث کی مستند ترین کتب برائے مطالعہ ارشاد ہوں۔

جواب:- ''انوار الباری'' (مکتبہ ناشر العلوم، بخارہ روڈ بجنور، یوپی)، ''الأدب المفرد'' امام بخاریؒ، ''ریاض الصالحین'' از امام نوویؒ اور ''مشکوٰۃ المصابیح'' کے اُردو ترجمے چھپے ہوئے ہیں، لیکن فقہی اَحکام کے بارے میں صرف ایک آدھی حدیث کو دیکھ کر خود سے کوئی شرعی حکم نہ لگالیں، کیونکہ احادیث سے فقہی اَحکام مستنبط کرنے کے لئے وسیع و عمیق علم کی ضرورت ہے، جب تک تمام احادیث نگاہ کے سامنے نہ ہوں ان سے فقہی اَحکام کا مستنبط کرنا دُرست نہیں ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفا اللہ عنہ
۱۳۸۸/۲/۱۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۹۲/۱۹ الف)

طوالتِ عمر کی فضیلت میں ایک حدیث

سوال:- طوالتِ عمر کی فضیلت میں ایسی کوئی حدیث موجود ہے یا نہیں؟ اس طرح کہ ''جتنی عمر بڑھتی جائے گی اس دس سال کے معاصی کی مغفرت ہوتی جائے گی''؟

جواب:- اس مضمون کی کوئی حدیث کہیں نظر سے نہیں گزری، البتہ بڑی عمر کی فضیلت میں

یہ حدیث نسائی[1] اور ترمذی[2] وغیرہ میں مروی ہے کہ: "من شاب شيبة في الاسلام كانت له نورًا يوم القيامة." (الجامع الصغیر ص:۱۷۳)[3] یعنی جو شخص اسلام کی حالت میں بوڑھا ہوگیا ہو تو بڑھاپے کی سفیدی اس کے لئے قیامت کے دن نور ہوگی۔ اور ابوداؤد کی روایت میں الفاظ یہ ہیں: "لا تنتفوا الشيب فانه نور المسلم، من شاب شيبة في الاسلام كتب الله له بها حسنة وكفّر عنه بها خطيئة ورفعه بها درجة." رواه أبو داؤد. (مشکوۃ کتاب اللباس، باب الترجل ص:۳۸۲)[4] یعنی سفید بالوں کو مت نوچو کیونکہ وہ مسلمان کا نور ہے، جو شخص اسلام کی حالت میں بوڑھا ہوگیا اللہ تعالیٰ اس کے لئے اس کی بناء پر ایک نیکی لکھے گا اور ایک خطا معاف کرے گا اور ایک درجے میں اضافہ فرمائے گا۔ واللہ اعلم

۱۳۹۷/۱/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹۲/۲۸ الف)

اثرِ صحابی نقل کرنے کے بعد "أو كما قال رضي الله عنه" کہنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی پر لمبا دُرود پڑھنا کیا حدیث کے پڑھنے پر بھی "تلاوت" کا لفظ بولا جاسکتا ہے؟

سوال ۱:- حدیث نقل کرنے کے بعد "كما قال عليه السلام" کہا جاتا ہے، اثرِ صحابی میں بھی کیا یہ حکم ہے؟

۲:- حدیث پڑھتے ہوئے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسمِ گرامی آتا ہے تو "صلی اللہ علیہ وسلم" کہا جاتا ہے، کیا یہ بھی دُرست ہے: "صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم"؟

۳:- لفظِ "تلاوت" جیسے عام طور پر قرآن پر بولا جاتا ہے، یعنی جیسے "میں نے تلاوتِ قرآن کی"، تو حدیث پر بھی یہ لفظ بولنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب ۱:- احادیث وآثار کے نقل کرنے میں جس قدر احتیاط سے کام لیا جائے، بہتر ہے، لہٰذا آثارِ صحابہؓ میں بھی "أو كما قال رضي الله عنه" کہنے میں کوئی حرج نہیں۔

۲:- بلاشبہ جائز بلکہ مستحسن ہے۔

---

(۱) سنن نسائی ج:۲ ص ۲۷ (مكتب المطبوعات الاسلامية، حلب).
(۲) جامع الترمذي، باب ما جاء في فضل من شاب شيبة في .... الخ ج:۴ ص:۱۷۲ (دار احياء التراث العربي) وكذا في صحيح ابن حبان ذكر اعطاء الله جل وعلا نورا في القيامة. ج:۷ ص:۲۵۱ (مؤسسة الرسالة، بيروت).
(۳) الجامع الصغير للسيوطي رقم الحديث:۸۷۶۳ ج:۴ ص:۱۷۵۴ (مكتبة نزار مصطفى الباز، مكة المكرمة). وكذا في المشكوة ص: ۳۸ باب الترجل (قديمي كتب خانه).
(۴) مشكوة المصابيح (قديمي كتب خانه).

۳:- احادیث کے لئے لفظِ ''تلاوت'' کے استعمال میں شرعاً تو کوئی اشکال نہیں، لیکن عرف و محاورے کے خلاف ہے۔

واللہ اعلم بالصواب
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۴ھ

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی

(فتویٰ نمبر ۱۳۹۶/۱۸ الف)

ایک حدیث یا مقولہ؟

سوال:- از راہِ کرم اس حدیث کے معانی سمجھا دیجئے کہ: "ألا ان أولیاء الله لا یموتون .... الخ"۔

جواب:- یہ الفاظ احادیث کے کسی مجموعے میں ہمیں نہیں ملے، یہاں تک کہ موضوع احادیث کے مجموعے "اللآلی المصنوعة فی الأحادیث الموضوعة" (للحافظ السیوطیؒ) اور "الأحادیث الموضوعة للشوکانیؒ" بھی اس سے خالی ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی کا مقولہ ہے، حدیث نہیں ہے۔ بہرحال اگر اس جملے کا یہ مطلب لیا جائے کہ اولیاء اللہ اپنے کارناموں کی وجہ سے زندہ جاوید ہوتے ہیں تو دُرست ہے، لیکن اگر یہ مطلب لیا جائے کہ اولیاء اللہ کو موت نہیں آتی تو غلط ہے۔ قرآن کا واضح ارشاد ہے: "كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ"(۱) یعنی ہر جان موت کا مزہ چکھنے والی ہے۔

واللہ اعلم
۱۳۸۷/۳/۲۴ھ (۲)

بظاہر دو متعارض احادیث میں تطبیق (فارسی)

سوال:- تطبیق و مطلبِ احادیث ذیل مطلوب است، اُمید تفصیلاً بزبان فارسی عام در قیدِ تحریر برآوردہ بندہ را از موجِ خلجان رہا نمائید، جواب بزبان فارسی ضرور نیست بلکہ ام زبان کہ باشد۔

عاصم ابن کلیب الجرمی عن أبیه قال: حسبته من الأنصار .... انه کان مع رسول الله صلی الله علیه وسلم فی جنازة فلقیه رسول امرأة من قریش یدعوه الی طعام، فجلسنا مجلس الغلمان من ابائهم، ففطن اباؤنا للنبی صلی الله علیه وسلم وفی یده أکلة فقال: ان هذه الشاة تخبرنی أنها أخذت بغیر حلها، فقالت: یا رسول الله! لم یزل یعجبنی أن تأکل فی بیتی وانی أرسلت الی النقیع فلم توجد فیه شاة وکان أخی اشتری شاة بالأمس فأرسلت بها الی

(۱) سورة آل عمران: ۱۸۵۔
(۲) یہ فتویٰ ''البلاغ'' کے شمارہ ربیع الثانی ۱۳۸۷ھ سے لیا گیا ہے۔ (مرتب)

أهله بالثمن، فقال: أطعموها الأساری. (مشكل الآثار للطحاویؒ ج:۴ ص:۱۳۲). [1]

غرض اینکہ این حدیث سنداً ومتناً مضطرب است۔

سنداً:- درحدیث مشکل الآثار عاصم عن أبیه عن رجل أحسبه من الأنصار أبوحنیفة عاصم بن کلیب عن أبی بردة ابن أبی موسیٰ عن أبی موسی الأشعری أبوحنیفة عاصم عن أبیه عن رجل من أصحاب النبی والحاکم والذی لم یذکرا عاصما بل خالفاه فی تمام السند۔

متناً: از حدیث مشکل الآثار معلوم میشود نیز از مشکوٰۃ کہ آنحضرت بجنازہ رفتہ بود و بعد از رُجوع عن الجنازہ داعی زن آمدہ بود، واز حدیث ابوحنیفہ معلوم میشود کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم برائے ملاقات یک قوم رفتہ بود ایشاں شاۃ را ذبح کرد، واز بعقل مفہوم میشود کہ کسی از صحابہؓ برائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شان تیار کردہ بود دعوت دادند، واز حاکم معلوم میشود کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واصحاب بزنی مرور نمودند آن برائے شان شاۃ ذبح نمودند۔

جواب:- در احادیث مذکور ہیچ اضطراب نیست، واقعہ اینست کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم برائے جنازہ رفتہ بودند کہ بعد از فراغ زنے از انصار مردے را فرستاد وآنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم را دعوت طعام داد، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف بردند، پس در روایت مشکل الآثار ومشکوٰۃ مکمل واقعہ بیان کردہ شدہ است، ودر روایتِ ثالثہ کہ از امام ابوحنیفہ مروی است قصہ جنازہ حذف کردہ، ومراد از قوم در "زاد قوما من الأنصار فی دارهم" ہماں زن است، واین مراد نیست کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم برائے زیارت قوم انصار رفتہ بود کہ زن ایشاں را مدعو کرد واما در روایتِ رابعہ کہ در آں "صنع رجل من اصحاب النبی صلی الله علیه وسلم" آمدہ است پس بظاہر نسبت صنع طعام بمردم مجاز است کہ مراد از ورسول زن داعی بود نہ کہ داعی، واما روایتِ خامسہ کہ دران مرور نبی صلی اللہ علیہ وسلم بر زن داعی مذکور است، پس بروایاتِ سابقہ متعارض نیست، زیرا کہ ممکن است کہ وقتِ رفتن بجنازہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مرور بر زن فرمودہ وزن ایشان را دعوت دادہ، پس بعد از فراغ آن زن دوبارہ مردے را فرستاد کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم را بیارد خصوصاً وقتیکہ بموجب روایتِ مشکوٰۃ زن داعی زن متوفی بود۔

اما اختلافیکہ در سند نظر می آید اضطراب نیست بلکہ تعددِ طرق است۔ فقط واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۱۲ھ

الجواب صحیح
محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۶/۱۹ الف)

---

(۱) مشکل الآثار للطحاویؒ باب بیان مشکل ما روی عن رسول الله صلی الله علیه وسلم مما یقضی بین المختلفین من الفقهاء فی الشاة المغصوبة اذا ذبحت وشویت .... الخ. رقم الحدیث: ۳۰۰۵، ۳۰۰۶ ج:۷ ص:۳۵۵ (طبع مؤسسة الرسالة بیروت).

رأى الحنفية فى قبول الأحاديث الضعيفة فى فضائل الأعمال

(فضائلِ اعمال میں ضعیف احادیث قبول کرنے میں حنفیہ کی رائے سے متعلق عربی فتویٰ)

الى فضيلة الشيخ الفقيه البارع والمحدث المتقن مولانا محمد تقى العثمانى

حفظه الله ونفع به

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته

أحمد اليكم الله الذى لا اله الا هو، ونصلى ونسلم على المبعوث رحمة للعالمين وعلى اله وصحبه أجمعين، وبعد!

من يمن الايمان والحكمة من صنعاء أبعث اليكم بهذه الرسالة سائلا الله العلى القدير أن يحفظكم وان يكثر فى الأمة الاسلامية من أمثالكم، ولكم حرصت علىٰ لقائكم عندما زرتُ مدينتكم كراتشى قبل عامين ولٰكن مع الأسف لم أجدكم فيها، فقد كنتم حينها خارج بلادكم الباكستان، وكاتب هٰذه السطور هو محبكم فى الله عادل بن حسين أمين اليمانى الندوى وقد حدثنى عنكم عندما كنت فى الهند مولانا العلم الشامخ الأديب العملاق العالم الربانى سماحة الشيخ أبى الحسن الندوى حفظه الله تعالىٰ وكذٰلك الأستاذ الفاضل سبحان الحسينى الندوى، وصدق القائل "والأذن تعشق قبل العين أحيانا" وأسأل الله أن يسّر لى الاجتماع والاستفادة منكم وهو علىٰ ذٰلك قدير.

فضيلة الشيخ، لقد أردت أن أستفسركم وأوجه اليكم هذا السؤال الهام، الا وهو ما ذكره العلامة المحقق محمد عبدالحى اللكنوى رحمه الله تعالىٰ فى كتابه النفيس - الأجوبة الفاضلة فى صفحة: ٤٣ - عندما نقل كلام شمس الدين السخاوىؒ فى (القول البديع فى الصلاة على الحبيب الشفيع) وذكر كلام الحافظ ابن حجر العسقلانى رحمه الله فى جواز رواية الحديث الضعيف فى فضائل الأعمال وشروطه الثالثة المذكورة هنالك؛ وقد نقل العلائى الاتفاق على الشرط الأول، وأما الشرط الثانى والثالث فقد نقلا عن العز بن عبدالسلام وعن ابن دقيق العيد.

والسؤال هنا هو: ما هو رأى علماء الحديث من السادة الحنفية فى هذه الشروط؟ هل يعتبرونها أصلا هاما فى جواز رواية الحديث الضعيف فى فضائل الأعمال أم لا؟

وهل لهم أقوال في هذه المسئلة؟ نرجو منكم غاية الرجاء البسط الشافي الكافي في الجواب، ولكم بذلك عظيم الأجر والثواب من الله تعالىٰ.

وأنتهز هذه الفرصة لمعرفة وقتكم المناسب حتّى تتكرموا بزيارة لنا الى اليمن الميمون، وبالأخص الى جامعة الايمان التي يترأسها فضيلة الشيخ عبدالمجيد الزنداني ويدرس فيها مجموعة طيبة من أهل العلم كالشيخ الدكتور عبدالكريم زيدان وغيره، والجامعة تحرص كثيرًا على استقدام علماء من البلاد الاسلامية، وقد زار الجامعة كثير منهم ونتمنى أن تبدوا وتظهروا استعدادكم حتّى يوجه شيخنا الزنداني دعوة الى فضيلتكم، وينفع الله بزيارتكم لهذه البلاد ورؤية ما فيها من الاثار والعبر، ولا أنسى أن أقول لكم: ان الأستاذ سلمان الحسني الندوى قد زار الجامعة قبل ثلاثة أعوام، وحرض على أهمية الاتصال العلمي والثقافي بعلماء شبه القارة الهندية، وأنتم يا فضيلة الشيخ من أعلام علماء هٰذه القارة، ودعوتي هذه لكم هي اصالة عن نفسي ونيابة عن الجامعة التي أعمل فيها، ونأمل منكم قبول هذه الدعوة الصادقة وعدم ردّها، فهي مفتاح خير وبركة ان شاء الله تعالىٰ.

في الأخير! أرجو المعذرة من الاطالة، وأطلب منكم صالح دعواتكم لكاتب هٰذه السطور المبتلي بالعجز والتقصير - كما يعلم الله ذلك - وبلغوا سلامي علىٰ محبيكم وتلامذتكم وأنا في انتظار جواب السؤال وجواب الدعوة.

والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته

وكتبه محبّكم في الله

عادل بن حسن أمين اليماني الندوى

صنعاء - جامعة الايمان - يمن

الاجابة:-

الى فضيلة الشيخ عادل بن حسن أمين اليماني المؤقر، حفظه الله تعالىٰ ورعاه

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته

فقد تسلمت رسالتكم الكريمة، وقد تشرفت بمطالعتها والتعرف عليكم، فجزاكم الله تعالىٰ خيرًا، وأجزل لكم مثوبة.

سألتم عن رأى الحنفية في قبول الأحاديث الضعيفة في فضائل الأعمال، وما ذكر الامام اللكنوى رحمه الله تعالىٰ من ثلاثة شروط لقبول الحديث الضعيف، فهو المختار عند

جمع كبير من الحنفية، ومن أهم هذه الشروط أن الحديث الضعيف لا يثبت به حكم جديد، حتى الاستحباب على سبيل الحتم، وانما معنى قبوله أن يتأكد به حكم ثبت سابقا بنص صحيح أو حسن، أو أن يعمل به على سبيل الاحتياط والاحتمال، دون الحتم بالقول بسنيته أو استحبابه، وهناك جمع من العلماء الحنفية يقبلون الحديث الضعيف، حتى لاثبات حكم جديد في الفضائل، وان مشائخي الذين شرّفني الله بالتلمذ عليهم، كانوا يختارون الرأى الأوّل، فمثلًا: حديث صوم السابع والعشرين من رجب، لم يثبت في حديث صحيح،[1] ولذلك أنكر الشيخ أشرف على التهانوى رحمه الله سنية هذا الصوم أو استحبابه، ولكن أجاز أن يصوم أحد على سبيل احتمال الاستحباب.

أما اذا تأيد الحديث الضعيف بتعامل العلماء فانه يمكن عند الحنفية أن يثبت له حكم جديد، وهذا مثل فضل صلاة التسبيح واحياء ليلة النصف من شعبان، وأمثلة ذلك كثيرة.

واني أشكركم على ما دعوتموني الى جامعة الايمان باليمن، وكم يسعدني أن أتشرف بزيارة العلماء وطلبة العلم هناك، واني أقبل هذه الدعوة بكل اعتزاز وسرور، ولكن الأشهر الثلاثة القادمة مرهقة بالأسفار الأخرى، فلعل ذلك انما يتيسر بعد الحج، في بداية شهر محرم الحرام ان شاء الله تعالى، وان وصلت الى الدعوة الرسمية في خلال شهر ذى الحجة، فسوف أحدّد التاريخ بالضبط ان شاء الله تعالى.

والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته

محمد تقى العثمانى

من الرياض ۹ من شوال ١٤١٩هـ

وعنواني الدائم: دار العلوم كراتشى ١٤،

الرمز البريدى ٧٥١٨٠ باكستان

(فتویٰ نمبر ۳۴۷/۶۴)

”لن تجتمع أمتي على الضلالة“ کے بعد ”فان أجمعت أمتي على الضلالة ....الخ“ کے الفاظ حدیث میں ہیں یا نہیں؟

سوال:- ”لن تجتمع أمتي على الضلالة“ کے بعد ”فان أجمعت أمتي على الضلالة

(۱) وفي عون المعبود ج:۷ ص:۲۰ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) ولم يثبت في صوم رجب نهى ولا ندب ولا نهى لعينه، ولكن أصل الصوم مندوب اليه

فأنا بریٔ منهم" کے الفاظ بھی حدیث میں ہیں یا نہیں؟

جواب:- "لن تجتمع أمتي على الضلالة"[1] کے بعد "فان أجمعت أمتي على الضلالة فأنا بریٔ منهم" کے الفاظ کسی مستند کتاب میں ہمیں نہیں ملے۔

واللہ اعلم بالصواب

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۳۰ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۹ الف)

حدیث "بعثت الى الأسود والأحمر" کی تحقیق؟

سوال:- "بعثت الى الأسود والأحمر" کی حدیث کس کتاب اور کس مقام پر ہے؟

جواب:- ان الفاظ کے ساتھ کوئی حدیث نظر سے نہیں گزری، اور مراجعتِ کتب کی اس وقت فرصت نہیں، البتہ مضمون صحیح ہے اور صحیح احادیث سے ثابت ہے۔[2]

فقط واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۱/۱۶ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۸۵/۱۹ الف)

---

(۱) دیکھئے: مجمع الزوائد للهيثمیؒ ج:۵ ص:۲۱۸ (طبع دار الريان للتراث قاهرة، و دار الكتب العربي بيروت) نیز اس معنی کی اور احادیث دیکھئے: مشكوة المصابيح، باب الاعتصام بالكتاب والسنّة ج:۱ ص:۳۰ (طبع قديمی كتب خانه كراچی)۔

(۲) سائل نے اپنے سوال میں "بعثت الى الأسود والأحمر" کے الفاظ ذکر کئے ہیں جبکہ ان الفاظ کے بجائے "بعثت الى الأحمر والأسود" کے الفاظ مختلف کتب احادیث میں موجود ہیں، چنانچہ مجمع الزوائد للهيثمی ج:۸ ص:۲۵۸ (طبع دار الريان للتراث، دار الكتاب العربي قاهره و بيروت) میں ہے: باب عموم بعثته صلى الله عليه وسلم عن ابى موسى قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: اعطيت خمسا بعثت الى الأحمر والأسود وجعلت لي الأرض طهورا وأحلت لي الغنائم ولم تحل لمن كان قبلي ونصرت بالرعب شهرا وأعطيت الشفاعة وليس من نبي الا وقد سأل شفاعة واني اختبات شفاعتي ثم جعلتها لمن مات لا يشرك بالله شيئا. رواه أحمد متصلا ومرسلا والطبراني ورجاله رجال الصحيح. وعن ابن عباس أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: أعطيت خمسا لم يعطهن نبي قبلي ولا أقولن فخرًا بعثت الى الأحمر والأسود ونصرت بالرعب .... الخ. اس کے علاوہ بعض دیگر صحابہؓ سے بھی دیگر روایت میں یہ الفاظ ثابت ہیں جن میں سے بعض طرق ضعیف اور بعض صحیح ہیں۔ دیکھئے: صحيح ابن حبان ج:۳ ص:۳۷۵ (طبع مؤسسة الرسالة بيروت) رقم الحديث: ۶۴۶۲. معجم الأوسط طبرانی ج:۷ ص:۲۵۷ (طبع دار الحرمين قاهرة). موارد الظمآن ج:۱ ص:۷۵ (طبع دار الكتب العلمية بيروت). سنن دارمی ج:۲ ص:۲۹۵ (طبع دار الكتاب العربي بيروت) و مجمع الزوائد ج:۸ ص:۳۶۹ (طبع دار الكتاب العربي بيروت). مصنف ابن ابی شيبه ج:۶ ص:۳۰۳، ۳۰۴ (طبع مكتبة الرشد، رياض). مسند أحمد ج:۱ ص:۲۵۰ (طبع مؤسسة قرطبة). (محمد زبیر حق نواز)

عمامہ کی فضیلت میں حدیث

سوال:- کسی حدیث میں عمامہ کی خصوصی فضیلت موجود ہے یا نہیں؟

جواب:- عمامہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے اور یہی اس کی فضیلت ہے، اس کے علاوہ ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان ایک امتیازی علامت یہ ہے کہ مسلمان ٹوپی پر عمامہ پہنتے ہیں۔ "فرق ما بین المسلمین والمشرکین العمائم علی القلانس"۔[1]

واللہ اعلم

۱۳۹۹/۱۰/۱۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۷۰۸/۳۰ و)

***

(۱) وفی جامع الترمذی باب العمائم علی القلانس رقم الحدیث: ۱۷۸۴ ج:۴ ص:۲۴۷ (طبع دار احیاء التراث العربی بیروت) .... قال رکانۃ: سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: ثم ان فرق ما بیننا وبین المشرکین العمائم علی القلانس. وکذا فی سنن أبی داؤد رقم الحدیث: ۴۰۷۸ ج:۴ ص:۵۵ (طبع دار الفکر).

﴿کتاب ما یتعلق بالدعوۃ والتبلیغ﴾

(دعوت وتبلیغ کے مسائل)

تبلیغ اور جہاد کے فرضِ عین اور فرضِ کفایہ سے متعلق تحقیق اور مروّجہ تبلیغی جماعت اور اس میں اوقات لگانے کی شرعی حیثیت

سوال:- سیّدی حضرتِ اقدس حضرت مولانا جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ، مزاجِ گرامی! دِل سے دُعائیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ حضرت کو ہمیشہ صحت و عافیت کے ساتھ خدمتِ دین کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

حضرت! اس ناکارہ کے دِل میں حضرت کی جو محبت و عظمت ہے، اس کے اظہار میں طوالت ہوجائے گی، مختصراً عرض ہے کہ حضرت کے لئے دِل و جان سے، دِل کی اتھاہ گہرائیوں سے دُعائیں نکلتی رہتی ہیں۔

حضرت کی مصروفیات تو واقعی ہوتی ہیں، تاہم ایک مسئلہ میں حضرت کی رائے مطلوب ہے، دُوسری کسی جگہ سے حضرت جیسی تسلی متوقع نہیں تھی، اُمید ہے جواب سے بہرہ مند فرمائیں گے۔

حضرت! اکابر کی کتابوں سے اور حضرت کے ایک مستقل وعظ ''دین کی حقیقت تسلیم و رضا'' سے یہ بات دِل میں بیٹھ گئی ہے کہ دین شوق پورے کرنے کا نام نہیں بلکہ اس وقت جو حکم اور وقت کا تقاضا ہو، اس کے پورے کرنے کا نام دین ہے۔ لیکن دُوسری طرف اپنے اکابر تبلیغی جماعت والوں کے ہاں دین کی حقیقت کو ''قربانی'' کے نام سے پیش کیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے تردّد ہوتا ہے کہ صحیح طرزِ عمل کیا ہونا چاہئے؟

مثلاً ہمارے پاکستان کے سابقہ امیر .... صاحب مدظلہم کا جس ہفتے کا سہ روزہ متعین تھا، اسی ہفتے ان کے سسر کا انتقال ہوگیا، اب وہ سوچ میں تھے کہ کیا کریں؟ تسلیم و رضا کے پیشِ نظر تو سہ روزہ کو اس ہفتے مؤخر بھی کیا جاسکتا تھا، تاکہ غمزدہ بیوی کو شوہر کے ساتھ رہنے سے تسلی ہو، لیکن امیر صاحب پاکستان نے سہ روزہ کو مقدم رکھا اور چلے گئے، واپسی پر فکرمند تھے کہ بیوی ضرور خفا ہوگی، لیکن بیوی خلافِ توقع بہت محبت سے پیش آئی، اور عرض کیا کہ: رات اباجی خواب میں ملے تھے، انہوں نے کہا کہ .... آئے تو اس پر خفا نہ ہونا، اس کے سہ روزہ پر جانے سے اللہ تعالیٰ نے میری مغفرت فرمادی ہے۔ اب تسلیم و رضا کے تحت نہ نکلتے تو یہ مغفرت کا بہانہ کیسے بنتا؟

اکثر اکابر تبلیغ والوں سے سنتے ہیں کہ انتظامی چلّوں اور سالوں سے ثواب تو ہوتا ہے لیکن کفر نہیں ٹوٹے گا، کیونکہ اس کے لئے ''قربانی'' شرط ہے کہ گھر میں بیوی بیمار ہے، کھیت میں فصل تیار ہے،

جیب میں رقم نہیں، حالات خراب ہیں، تب نکلے گا تو ہدایت عام ہوگی۔ اب تسلیم و رضا کے پیشِ نظر جب بیوی بیمار ہے تو اس کی دِلجوئی ضروری ہے، فصل تیار ہے تو کٹائی ضروری ہے، اب اس میں تسلیم و رضا کو دیکھا جائے یا قربانی کو؟ غالباً غزوۂ تبوک میں کھجور بالکل پکی ہوئی تھیں، لیکن دین کی حقیقت قربانی کے پیشِ نظر صحابہؓ اللہ کے راستے میں نکل گئے۔

ایک صاحب نے ایک عالم سے پوچھا کہ ایک شخص اللہ کے راستے میں نکلنا چاہتا ہے لیکن اس کا بوڑھا والد نابینا ہے، جوان بیوی ہے اور آس پاس ماحول بھی سازگار نہیں، اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچے بھی ہیں۔ اس عالم نے کہا کہ صورتِ مسئولہ میں یہ شخص اگر نکلتا ہے تو بڑا ظالم ہے۔ اس عالم کو بتایا گیا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر کی یہی حالت تھی جب وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے تھے۔ اب تسلیم و رضا کے تحت تو نہ نکلنا سمجھ میں آتا ہے، لیکن بزرگ کہتے ہیں کہ جب اسی حالت میں نکلے گا تو جہاں کفر ٹوٹے گا وہاں اس کا یقین بھی بنے گا اور گھر والوں کا یقین بھی بنے گا کہ حقیقی محافظ اور رازق تو اللہ ہے۔

بعض لوگوں سے یہ بھی سنتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے وقت چونکہ بلوغِ اسلام نہیں ہوا تھا، اس لئے ان پر یہ ذمہ داری بڑھی ہوئی تھی، اب تو بلوغِ اسلام ہوگیا ہے، اب ویسی ذمہ داری نہیں، جبکہ تبلیغ والے کہتے ہیں کہ جب بے دینی اور دین سے دُوری اسی دور کے مثل عود کر آئی ہو تو کیا حکم وہی عود کر نہیں آئے گا؟

اکابر اہلِ علم، تبلیغ میں نکلنے کی شرعی حیثیت کو فرضِ کفایہ کہتے ہیں، جبکہ تبلیغ کے بزرگ کہتے ہیں کہ کفایہ کا مطلب تو یہ ہے کہ وہ فرض کی ادائیگی میں کفایت بھی کر جائے، اب اربوں انسان دین سے دُور ہیں، تو کیا سینکڑوں اور ہزاروں کا نکلنا اس فرض کی ادائیگی میں کفایت کر رہا ہے؟

بعض ساتھیوں سے یہ بھی سنتے ہیں کہ ایک سفر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزے تو اِفطار کروادیئے تھے لیکن تبلیغی سفر موقوف نہیں فرمایا۔ اسی طرح حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کو جب غسلِ جنابت کی حاجت تھی، وقت کا تقاضا تو غسل تھا، لیکن انہوں نے اسی ناپاکی کی حالت میں اللہ کے راستے کو مقدم رکھا۔

حضرت! اُمید ہے کہ میں نے اپنے اِشکال کی وضاحت کافی حد تک کردی ہے، مزید طوالت مناسب نہیں لگتی۔ حضرت اپنی فقیہانہ بصیرت و خداداد فہم کے تحت اس بات کی کسی قدر تفصیل سے وضاحت فرمادیجئے کہ بعض اوقات جب دین کا تقاضا تبلیغ والے پیش کرتے ہیں تو اس وقت کوئی نہ کوئی شرعی تقاضا بھی درپیش ہوجائے تو تسلیم و رضا کے تحت اس تقاضے کو پورا کیا جائے یا صحابہ کرامؓ کی طرح

قربانی کر کے ان تقاضوں کو مؤخر کر دیا جائے؟

حضرت! مذکورہ اِشکال کے ساتھ ایک بات ضمناً عرض کرتا چلوں کہ بعض اُمور میں اکابر اہلِ علم اور اکابر اہلِ تبلیغ کے زاویۂ نگاہ میں کچھ فرق محسوس ہوتا ہے، مثلاً عام اہلِ علم تبلیغ میں نکلنے کو فرضِ کفایہ اور تبلیغ والے فرضِ عین بتلاتے ہیں، جیسے آج سے نصف صدی قبل حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے صحبتِ اہل اللہ کے فرضِ عین ہونے کا فتویٰ دیا تھا، کیونکہ بدون صحبتِ اہل اللہ س وقت اصلاحِ ظاہر و باطن قریب قریب ناممکن تھی۔ اب یہ بات بھی مشاہدہ ہے کہ نکلنے سے نہ صرف عوام بلکہ علمائے کرام کی دینی حالت میں جو انقلاب آتا ہے اس کا خود مشاہدہ ہے اور ناقابلِ انکار حقیقت ہے، تو اگر مقدمۃ الواجب واجبٌ کے تحت نکلنے کو فرضِ عین بتلایا جائے تو اس کی کیا شرعی حیثیت ہوگی؟ والسلام

بندہ محمد راشد

جواب:- مکرمی ومحترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا گرامی نامہ ملا، آپ احقر ناکارہ کے لئے جس طرح دُعائیں کرتے ہیں، اس پر کس زبان سے شکر ادا کروں، اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا بہترین صلہ دُنیا و آخرت میں عطا فرمائیں، آمین۔

آپ نے تبلیغی جماعت کے بارے میں جو باتیں پوچھی ہیں، ان کے بارے میں چند اُصولی باتیں عرض کرتا ہوں، خدا کرے کہ وہ باعثِ اطمینان ہوں۔

۱:- جب جہاد فرضِ عین ہو جائے تو اس وقت ایک ایمرجنسی کی حالت ہوتی ہے، اس وقت نہ تجارت جائز ہے، نہ بیوی بچوں کے عام حقوق اس طرح باقی رہتے ہیں جیسے امن کی حالت میں ہوتے ہیں، اور نہ جہاد کے سوا کوئی اور ایسا کام جائز ہوتا ہے جو جہاد کے منافی یا اس کی راہ میں رُکاوٹ بننے والا ہو۔[1] آپ نے صحابہ کرامؓ کے عہدِ مبارک کی جتنی مثالیں پیش کی ہیں، وہ سب اسی حالت سے متعلق ہیں، غزوۂ تبوک میں جہاد کے فرضِ عین ہونے کا اعلان خود قرآنِ کریم میں بھی فرمایا گیا تھا،[2] اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دوٹوک الفاظ میں واضح فرما دیا تھا، لہٰذا پکی ہوئی کھیتیاں یا گھر والوں کے مسائل اس فرضِ عین کی ادائیگی میں مانع نہیں ہوسکیں۔ اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ جیسے جانباز صحابی کو حکم دیا کہ وہ مدینہ منوّرہ میں رہ کر کمزوروں کی دیکھ بھال کریں۔ حضرت علیؓ کی خواہش تو یہ تھی کہ وہ جہاد کی فضیلت حاصل کریں، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی وجہ سے تسلیم و

---

(۱) تفصیل کے لئے حضرتِ والا دامت برکاتہم کی تصنیف "تکملہ فتح الملہم" کتاب الامارۃ، مسئلۃ فرضیۃ الجہاد ج:۳ ص:۳۷۴ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) "مَا كَانَ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِنَ الْأَعْرَابِ أَنْ يَتَخَلَّفُوا عَنْ رَسُولِ اللهِ وَلَا يَرْغَبُوا بِأَنْفُسِهِمْ عَنْ نَفْسِهِ" الآية. سورۃ التوبۃ: ۱۲۰۔

رضا کی خاطر مدینہ منوّرہ میں رہے، اور کمزوروں کی دیکھ بھال کی۔[1] حضرت حنظلہؓ کا واقعہ بھی ایسے ہی وقت کا ہے جب دُشمن حملہ آور ہو چکا تھا اور جہاد فرضِ عین تھا۔[2] حضرت صدیقِ اکبرؓ پر بھی حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہجرت فرض ہوچکی تھی، اور انہوں نے اسی فریضے کو ادا فرمایا، ورنہ عام حالات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے والدین کی خدمت کو جہاد پر مقدم قرار دیا، اور ایسے صحابہؓ کو لوٹا دیا جو والدین کو روتا ہوا چھوڑ کر جہاد کے لئے آئے تھے۔[3]

اگر سہ روزہ یا چلّے پر نکلنا اسی درجے میں فرضِ عین قرار دیا جائے جس درجے میں جہاد نفیرِ عام کے وقت فرض ہوتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ تجارت، صنعت، زراعت کچھ جائز نہ ہو، بلکہ ہر انسان ہر وقت تبلیغی سفر پر ہی رہے، جیسا کہ جہاد کے فرضِ عین ہونے کے وقت دُوسرا کوئی کام جائز نہیں ہوتا۔ سوال یہ ہے کہ اگر سہ روزہ یا چلّہ لگانا فرضِ عین ہے تو اس کی حد کیا ہے؟ کتنے سہ روزوں اور کتنے چلّوں سے یہ فرضِ عین ادا ہوجائے گا؟ تو اوّل تو یہ تعیین کس بنیاد پر کی گئی؟ کیا قرآن و حدیث کا کوئی حکم اس کی تعیین کرتا ہے؟ دُوسرے سہ روزہ لگانے کے بعد جب آدمی پورے مہینے تجارت یا زراعت میں مصروف ہوگا تو کیا اس وقت تبلیغی سفر فرضِ عین نہیں ہوگا؟ اگر نہیں ہوگا تو وہ فرضِ عین کہاں رہا؟ اور ہوگا تو تجارت اور کسبِ معاش کیسے جائز ہوا؟

۲:- آپ نے لکھا ہے کہ: ’’ایک سفر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزے تو اِفطار کرا دیئے، لیکن تبلیغی سفر موقوف نہیں فرمایا۔‘‘ اوّلاً تو یہ تبلیغی سفر نہیں تھا، فتحِ مکہ کے جہاد کا سفر تھا۔[4] دُوسرے روزے، مشقتِ شدیدہ کی وجہ سے اِفطار کرائے گئے،[5] سفر موقوف کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی، زیادہ سے

---

(۱) وفی صحیح البخاری باب من حبسه العذر عن الغزو ج:۱ ص:۳۱۸ حدثنا أحمد بن یونس ثنا زهیر ثنا حمید أن أنسا حدثهم قال: رجعنا عن غزوة تبوک مع النبی صلی الله علیه وسلم .... الخ. و ثنا سلیمان بن حرب ثنا حماد هو ابن زید عن حمید عن أنس أن النبی صلی الله علیه وسلم کان فی غزاة فقال: ان أقواما بالمدینة خلفنا ما سلکنا شعبا ولا وادیا الا وهم معنا فیه حبسهم العذر .... الخ. وکذا فی صحیح مسلم ج:۲ ص:۱۴۱ (طبع قدیمی کتب خانه).

(۲) وفی المغنی لابن قدامة ج:۹ ص:۱۷۴ (طبع دار الفکر بیروت) مسئلة قال وواجب علی الناس اذا جاء العدو أن ینفروا المقل منهم والمکثر ولا یخرجوا الی العدو الا باذن الأمیر الا أن یفجأهم عدو غالب یخافون کلبه فلا یمکنهم أن یستأذنوه .... أن النفیر یعم جمیع الناس ممن کان من أهل القتال حین الحاجة الی نفیرهم لمجیء العدو الیهم ولا یجوز لأحد التخلف الا من یحتاج الی تخلفه لحفظ المکان والأهل والمال ومن یمنعه الأمیر .... وذٰلک لقول الله تعالٰی: اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا. التوبة. وقول النبی صلی الله علیه وسلم: اذا استنفرتم فانفروا .... وقال بعد أسطر .... وقد نفر من أصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم وهو جنب یعنی غسیل الملٰئکة حنظلة بن الراهب .... الخ.

(۳) دیکھئے: الصحیح لمسلم ج:۲ ص:۳۱۳ (طبع قدیمی کتب خانه) و جامع الترمذی ج:۱ ص:۲۰۰ (طبع فاروقی کتب خانه).

(۴، ۵) وفی الترمذی ج:۱ ص:۸۹ (طبع فاروقی کتب خانه) باب ما جاء فی کراهیة الصوم فی السفر، عن جابر بن عبدالله أن رسول الله صلی الله علیه وسلم خرج الی مکة عام الفتح فصام حتّٰی بلغ کراع الغمیم وصام الناس معه فقیل له: ان الناس شق علیهم الصیام، وأن الناس ینظرون فیما فعلت، فدعا بقدح من ماء بعد العصر فشرب والناس ینظرون الیه، فافطر بعضهم وصام بعضهم .... الخ. ....(باقی اگلے صفحے پر)

زیادہ شدید گرمی تھی، صرف اتنی بات سے جہاد کو ترک کرنا ضروری نہ تھا، کیونکہ اس مشقت کا اثر زیادہ سے زیادہ اپنی ذات پر تھا، کسی کا حق یا مال تلف نہیں ہو رہا تھا۔

۳:- آپ نے فرضِ کفایہ کا جو مطلب لکھا ہے، اگر کفایہ کا یہی مطلب ہے تو پوری تاریخِ اسلام میں جہاد کو کبھی ''فرضِ کفایہ'' نہ ہونا چاہئے تھا، کیونکہ غیر مسلموں کی تعداد تاریخ کے ہر دور میں مسلمانوں کے تین گنے سے بھی ہمیشہ زائد رہی ہے۔ کروڑوں انسان ہر دور میں دین سے دُور رہے ہیں، لہٰذا جب فقہائے اُمت نے جہاد کو فرضِ کفایہ قرار دیا تو کیا اس وقت دُنیا کی اکثریت مسلمان ہوگئی تھی؟ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دُنیا سے تشریف لے گئے تو صحابہ کرامؓ کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار بتائی جاتی ہے، جو ظاہر ہے کہ اس وقت کی دُنیا کی آبادی کا بہت مختصر حصہ تھا۔ لیکن کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغی سفر کو فرضِ عین قرار دے کر کبھی صحابہ کرامؓ کو یہ حکم دیا کہ وہ سب اپنے حقوقِ واجبہ ترک کر کے دُوسرے شہروں اور ملکوں میں جائیں؟ واقعہ یہ ہے کہ ''فرضِ کفایہ'' کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ اگر مسلمانوں کی معتد بہ جماعت یہ کام کر رہی ہے تو اس کا یہ عمل دُوسروں کے فریضے کی ادائیگی کے لئے بھی کافی ہو جاتا ہے۔

۴:- ''تسلیم و رضا'' اور ''قربانی'' میں کوئی تعارض نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت قربانی چاہتی ہے، کبھی یہ قربانی جان کی ہوتی ہے، کبھی مال کی، کبھی خواہشات کی، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو تبوک جانے سے روکا اور انہوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا تو یہ تسلیم و رضا بھی تھی اور خواہش کی قربانی بھی، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حذیفہ بن یمانؓ کو جنگِ بدر میں شرکت سے روکا اور انہوں نے اطاعت کی تو یہ بھی خواہش کی قربانی تھی۔ جب جہاد فرضِ عین ہو جائے اس وقت جان، مال اور دُنیوی خواہشات کی قربانی دی جاتی ہے۔ اور جب فرضِ کفایہ ہو، اور انسان کے لئے شرعاً جانا جائز ہو تب بھی وہ انہی چیزوں کی قربانی پیش کرتا ہے، لیکن جب تک فرضِ عین نہ ہو، یہ قربانی اپنی ذات کی حد تک محدود رہتی ہے، دُوسرے اصحابِ حقوق کی قربانی نہیں کی جاتی۔ ہاں! اگر اصحابِ حقوق اپنے حقوق خوشی سے چھوڑ دیں تو ان کے لئے باعثِ اجر ہے، اور اس صورت میں جہاد یا دعوت کے کام میں شرکت باعثِ اجرِ عظیم ہے۔ آپ نے جن بزرگ کی مثال دی کہ ان کے سسر کا انتقال ہوگیا تھا، پھر بھی وہ سہ روزہ پر چلے گئے، ان کے بارے میں عرض یہ ہے کہ اگر ان کی اہلیہ کو ان کے جانے

(گزشتہ سے پیوستہ)......... وفی جامع الترمذی، أبواب فضائل الجهاد، باب فی الفطر عند القتال ج:۱ ص:۲۰۱، ۲۰۲ (طبع مذکور) عن ابی سعید الخدری قال: لمّا بلغ النبی صلی الله علیه وسلم عام الفتح مرّ الظهران فآذننا بلقاء العدو فأمرنا بالفطر فأفطرنا أجمعین. هذا حدیث حسن صحیح. مزید احادیث اور تفصیل کے لئے دیکھئے: درسِ ترمذی ج:۲ ص:۵۵۵۔ (محمد زبیر حق نواز)

سے کوئی نا قابلِ برداشت تکلیف نہیں ہوئی تو شرعاً ان کا یہ عمل ناجائز نہیں تھا، البتہ افضل ہونے میں رائیں مختلف ہوسکتی ہیں۔ اور خواب کوئی شرعی حجت نہیں ہے جس سے کسی حکمِ شرعی پر استدلال کیا جائے۔

۵:- یہ بات احقر کی فہمِ ناقص سے بالاتر ہے کہ تبلیغ میں نکلنے پر ہمیشہ صحابہ کرامؓ کے جہاد کے واقعات سے استدلال کیا جاتا ہے، لیکن عملاً جہاد کے بارے میں طرزِ عمل یہ ہے کہ گویا جہاد کوئی شرعی فریضہ ہی نہیں ہے، بلکہ اسے عملاً منسوخ سمجھا جاتا ہے اور جہاد کی بعض اوقات مخالفت بھی کی جاتی ہے۔

۶:- مذکورہ بالا گزارشات کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ میں تبلیغی جماعت کا مخالف ہوں، یا یہ کہ تبلیغ کے کام کو اہمیت نہیں دیتا۔ حقیقت یہ ہے کہ تبلیغ کا کام نہایت اہمیت کا حامل ہے، خاص طور پر تبلیغی جماعت نے بفضلہٖ تعالیٰ مجموعی حیثیت سے بڑا قابلِ تعریف کام کیا ہے اور اس سے اُمت کو بہت فائدہ پہنچا ہے، لیکن کسی کام کی اہمیت واضح کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ اسے ہر قیمت پر فرضِ عین قرار دیا جائے۔ دُوسرے، جہاں تبلیغی جماعت کے ساتھ تعاون و تناصر ضروری ہے، وہاں بعض غلو آمیز باتوں کی اصلاح بھی ضروری ہے جو بعض نو وارد یا حدود کی رعایت نہ رکھنے والے حضرات سے سرزد ہوتی رہتی ہیں، اور اب بعض اوقات اَحکامِ شرعیہ میں تصرف کی حد تک پہنچ رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے دین کی صحیح فہم اور اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ والسلام

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۱۸/۳/۲۸ھ

(فتویٰ نمبر ۴۵/۲۷۶)

عورتوں کے لئے تبلیغی اجتماع میں شرکت کا حکم

سوال:- جس طرح مرد مسجد میں تبلیغ کرتے ہیں، اسی طرح عورتیں بھی مبلغ ہیں، محلے کی عورتوں کو دعوت دیتی ہیں، ان کی طرف سے مرد، مسجد میں اعلان کرتے ہیں کہ فلاں جگہ عورتوں کا اجتماع ہے، آپ حضرات اپنی ماں، بہنوں کو وہاں بھیجیں۔ عورتوں کا اس قسم کے اجتماع کے لئے غیر محرم کے گھر جانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- اگر عورتیں پردے کے اہتمام کے ساتھ تبلیغی اجتماع میں جائیں تو جائز ہے، بلکہ بحالاتِ موجودہ ایسے اجتماعات میں عورتوں کی شرکت مفید ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۱۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۵۵۲/۲۷ د)

جو خود دین کا پابند نہ ہو، کیا وہ تبلیغ کر سکتا ہے؟

سوال:- ایک شخص خود تو دین کا پابند نہیں ہے، لیکن وہ تبلیغ کرتا ہے، تو کیا وہ ایسا کر سکتا ہے؟

جواب:- کر سکتا ہے[۱]، لیکن خود بھی دین کی پابندی کی پوری کوشش کرنی واجب ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۵/۱/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۸/۲۸ الف)

ایک حدیث کی رُو سے تبلیغ کو ترک کرنے کا حکم

سوال:- جب تم دیکھو کہ حرص کی اطاعت کی جارہی ہے، خواہشِ نفس کی پیروی کی جارہی ہے، دُنیا کو آخرت پر ترجیح دی جارہی ہے، اور ہر شخص اپنی رائے کو اچھا سمجھتا ہے تو اپنی فکر کرو اور عوام کی فکر چھوڑ دو۔ کیا وہ وقت اس وقت موجود ہے؟ اگر موجود ہے تو ''عوام کی فکر'' اس میں کون سے اُمور شامل ہیں؟ کیا تبلیغ ترک کردی جائے؟

جواب:- حدیثِ مذکور[۲] میں جس زمانے کا ذکر ہے، بظاہر ابھی وہ دَور نہیں آیا، ابھی تبلیغِ دین کا فریضہ ساقط نہیں ہوا، بحالاتِ موجودہ تبلیغ فائدے سے خالی نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۲۸ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۳۲۹/۱۹ الف)

والدین کی اجازت کے بغیر تبلیغ یا کسی اور سفر پر جانے کا حکم

سوال:- بندہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں رہتا ہے، ایک نہایت معتبر عالم نے بیان کیا کہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے معارف القرآن میں یہ فتویٰ دیا ہے کہ والدین کی اجازت کے بغیر تبلیغی جماعت کے ساتھ جانا جائز ہے، لیکن معارف القرآن میں تلاشِ بسیار کے بعد بھی نہیں ملا۔ غالباً ان کو کتاب کے نام

---

(۱) تفصیل کے لئے معارف القرآن ج:۷ ص:۳۲۴، ۳۲۵ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) وفی التفسیر للطبریؒ ج:۷ ص:۹۷ (طبع دار الفکر بیروت) عن أبی أمیة الشعبانی قال: سألت أبا ثعلبة الخشنی: کیف نصنع بهذه الآیة: "یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ" فقال أبو ثعلبة: سألت عنها خبیرًا سألت عنها رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال: ائتمروا بالمعروف وتناهوا عن المنکر حتّی اذا رأیت شحًا مطاعًا وهوًی متبعًا واعجاب کل ذی رای برأیه فعلیک بخویصة نفسک وذرهم فان وراء کم أیاما أجر العامل فیها کاجر خمسین منکم .... الخ. اور حدیثِ مذکور کے آخری الفاظ کے ہم معنی الفاظ "علیک بأمر خاصة نفسک ودع أمر العامة" جامع الترمذی بحوالہ مشکوٰۃ کتاب الفتن ص:۴۶۳ (طبع قدیمی کتب خانہ) میں بھی موجود ہیں۔ (مرتب عفی عنہ)

میں مغالطہ ہوا، آپ کی طرف رُجوع فرمانے کا انہوں نے مشورہ دیا، اس بنا پر آنجناب سے درخواست ہے کہ اگر مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے یہ فتویٰ تحریر فرمایا ہو تو اس کا متن مع استفتاء تحریر فرمادیں اور ساتھ ہی کتاب کا نام اور صفحے کا حوالہ بھی تحریر فرمائیں، کیونکہ تبلیغی حضرات بڑی شدّت کے ساتھ اس چیز کو بیان فرماتے ہیں کہ اس وقت ان حضرات کا جماعتوں میں جانا تبلیغ کے لئے نہیں ہے بلکہ اس وقت ان کا گھر سے نکلنا اس بات کے لئے ہے کہ مسلمان کو اس کی کھوئی ہوئی دولت، جس کو دعوت الی اللہ کہتے ہیں، دوبارہ مل جائے اور ہر مسلمان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دِل کے غم اور جذبے کو اپنا غم اور جذبہ بنائے، اور اسی چیز کو یہ حضرات دین کی اساس کہتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ اس کے نہ ہونے کی وجہ سے آج سرِعام اللہ کے اَحکام کو توڑا جارہا ہے اور سنتوں کو پامال کیا جارہا ہے۔

اور یہ بھی کہتے ہیں کہ ان حالات کی بناء پر کسی شخص کا والدین اور بیوی بچوں کے حقوق کی وجہ سے گھر میں بیٹھے رہنا ناجائز ہے، اور اپنی بات کے حق میں یہ دلائل پیش کرتے ہیں کہ وہ تمام صحابہ کرامؓ جو اپنے والدین کو، اپنے بیوی بچوں کو فاقوں میں چھوڑ کر گھروں سے نکلے، کیا انہوں نے غلط کیا؟ اور اس سلسلے میں بے شمار واقعات پیش کرتے ہیں۔ اور یہاں تک کہتے ہیں کہ کیا نعوذ باللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں غلط حکم دیا؟ اس سلسلے میں قرآنِ پاک کی آیتیں پیش کرتے ہیں، مثال کے طور پر: ”کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ... الخ“، ”اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا ....“، ”قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآءُکُمْ وَاَبْنَآءُکُمْ وَاِخْوَانُکُمْ“ وغیرہ وغیرہ۔

میرے جیسے حضرات ان کے یہ بھاری بھرکم دلائل سن کر خاموش ہوجاتے ہیں، ابھی پچھلے دنوں ایک صاحب نے بیان کیا کہ مسلمان کا دعوت نہ دینا ساری انسانیت پر ظلم ہے، مطلب یہی ہے کہ جن چیزوں کی وجہ سے یہ دعوت دینے سے رُکے گا وہ بھی ظلم کہلائے گا۔ براہِ کرم اس کی وضاحت فرمائیں، نیز یہ کہ اگر یہ کام حق ہے تو کس درجے کا حق ہے؟ یعنی نفلی عبادت کے زُمرے میں ہے یا سنت و واجب؟ یا موجودہ حالت میں سارے فرائض سے بڑھ کر سب سے بڑا فرض ہے؟

جواب:- والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا کوئی فتویٰ اس اطلاق کے ساتھ احقر کے علم میں نہیں، ویسے مسئلہ یہ ہے کہ اگر والدین تنگ دست ہوں اور بیٹے کے سفر پر جانے کی صورت میں ان کے خرچ کا انتظام نہ ہو، یا ضعیف اور بیمار ہوں اور ان کی خدمت اور خبرگیری کے لئے اور کوئی موجود نہ ہو، تب تو ان کی اجازت اور مرضی کے خلاف کسی بھی سفر میں جانا جائز نہیں، خواہ وہ سفر تبلیغ کا ہو، یا تحصیلِ علم کا، یا حج وعمرہ کا، لیکن اگر ان کے خرچ کا بھی انتظام ہے اور خبرگیری کرنے والے بھی موجود ہیں تو ایسی صورت میں فقہاءؒ نے ایسے سفر کی اجازت دی ہے جس میں ہلاکت کا

گمان غالب نہ ہو، اس حال میں اگر والدین کی اجازت کے بغیر بھی کوئی شخص تبلیغ کے سفر پر چلا جائے تو إن شاء اللہ گناہ نہ ہوگا۔

قال محمدؒ في السير الكبير: اذا أراد الرجل أن يسافر الى غير الجهاد لتجارة أو حج أو عمرة وكره ذٰلک أبواه فان كان يخاف الضيعة عليهما بأن كانا معسرين ونفقتهما عليه، وما له لايفي بالزاد والراحلة ونفقتهما فانه لا يخرج بغير اذنهما .... وان كان لا يخاف الضيعة عليهما بأن كانا موسرين لم تكن نفقتهما عليه.

ان كان سفرا لا يخاف على الولد الهلاک فيه كان له أن يخرج بغير اذنهما .... وكذا الجواب فيما اذا خرج للفقه. (عالمگيرية ج:۵ ص:۳۶۵ كتاب الحظر والاباحة باب:۲۶).[۱]

البتہ اگر یہ سفر ایسا خطرناک ہو کہ اس میں ہلاکت کا اندیشہ ہو، مثلاً جہاد (بشرطیکہ نفیرِ عام نہ ہو) یا شدید گرمی یا سردی میں پیدل صحراؤں، پہاڑوں کا سفر ہو تو اس میں والدین کی اجازت ضروری ہے۔ شمس الائمہ سرخسیؒ تحریر فرماتے ہیں: لأن بر الوالدين وترک ما يلحق الضرر والمشقة بهما فرض عليه عينا والجهاد فرض على الكفاية اذا لم يقع النفير عاما فعليه أن يقدم الأقوىٰ، وفي خروجه الضرر والمشقة بهما فان المجاهد على خطر في التمكن من الرجوع. (شرح السير الكبير ج:۴ ص:۲۸)۔[۲] اس صورت کے لئے علامہ سرخسیؒ نے یہ حدیث بھی نقل کی ہے کہ: ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور عرض کیا کہ "میں آپؐ کے ساتھ جہاد کرنے کے لئے آیا ہوں اور والدین کو روتا ہوا چھوڑ کر آیا ہوں"، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "واپس جاؤ اور جس طرح انہیں روتا چھوڑ کر آئے ہو اب جا کر انہیں ہنساؤ" (ایضاً ص:۱۲۸)۔[۳]

اور جو صحابہ کرامؓ والدین کو چھوڑ کر جہاد کے لئے جاتے تھے وہ یا تو نفیرِ عام کی بناء پر یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خصوصی حکم سے یا والدین کی اجازت اور رضامندی سے جاتے تھے، اور عام سفروں میں جانا ہوتا تو ان کی خبرگیری کا انتظام کر کے جاتے تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ نہ علی الاطلاق یہ کہا جاسکتا ہے کہ تبلیغی سفر کسی بھی حال میں والدین کی اجازت کے بغیر جائز نہیں، اور نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر حال میں جائز ہے، بلکہ اس کی تفصیل وہی ہے جو

---

(۱) (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ).

(۲، ۳) شرح السير الكبير رقم المسئلة: ۲۱۶، ۲۱۷ ج:۱ ص:۱۹۲ (ناشر مولانا نصر الله منصورؒ).

وفي الدر المختار كتاب الجهاد ج:۴ ص:۱۲۴، ۱۲۵ (طبع سعيد) لا يفرض على صبي وبالغ له ابوان أو أحدهما لأن طاعتهما فرض عين وقال عليه الصلوٰة والسلام للعباس بن مرداس لما أراد الجهاد: "الزم أمک فان الجنة تحت رجل أمک." سراج، وفيه لا يحل سفر فيه خطر الا باذنهما وما لا خطر فيه يحل بلا اذن. وفي الشامية (قوله فيه خطر) كالجهاد وسفر البحر والخطر .... الخ. (قوله وما لا خطر) كالسفر للتجارة والحج والعمرة يحل بلا اذن الا ان خيف عليهما الضيعة. سرخسي.

اُوپر گزری۔

حکیم الاُمت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ نے بھی حقوق الوالدین[1] میں یہی تفصیل بیان فرمائی ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۷ھ
(فتویٰ نمبر ۶۲۲/۲۸ الف)

تبلیغ میں وقت لگانے کے ساتھ حقوق العباد ادا کرنا لازم ہے

سوال:- تبلیغی جماعت میں وقت لگانے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اور اس کا کام کیسا ہے؟ نیز تبلیغِ دین کی شرائط کیا ہیں؟ اور حقوق العباد کی ادائیگی کا کیا حکم ہے؟

جواب:- تبلیغی جماعت کا کام مفید ہے، البتہ تبلیغِ دین کی شرائط کسی عالمِ دین سے معلوم کرلی جائیں، ان کے مطابق عمل کیا جائے، اور حقوق العباد کی ادائیگی کا پورا اہتمام کیا جائے۔

واللہ اعلم بالصواب
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۴ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۴۰۰/۱۸ الف)

بعض تبلیغی واعظوں کی طرف سے غیرمحتاط باتوں کی بناء پر تبلیغی جماعت کو ترک کرنا

سوال:- تبلیغ جو خاکسار کے نزدیک صحیح بھی ہے، اس میں چند لوگ (واعظ) وعظ کے درمیان شرک کی باتیں کہہ دیتے ہیں، چونکہ جماعت میں اکثر اَن پڑھ ہوتے ہیں، ایسی حالت میں ان کے ساتھ جانا چاہئے یا نہیں؟

جواب:- تبلیغی جماعت سے دین کو مجموعی طور پر بڑا نفع پہنچ رہا ہے، اس میں شریک ہونا بہتر ہی بہتر ہے، البتہ بعض اوقات چونکہ جماعت کے اُمراء عالم نہیں ہوتے، اس لئے ان کے منہ سے غیرمحتاط باتیں نکل جاتی ہیں، ایسے موقع پر اُن کو نرمی اور محبت سے سمجھا دینا چاہئے، اور وہ بات نہ سمجھیں تو جماعت کے اکابر میں سے کسی کی طرف رُجوع کرکے ان کے ذریعہ فہمائش کرادینی چاہئے، لیکن اس بناء پر جماعت کو نہ چھوڑیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۱/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷۵۵/۲۷ د)

(۱) دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۴ ص:۴۸۵ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)۔

﴿کتاب التصوّف والکشف والالهام والرّؤیاء﴾

(تصوّف، کشف، الہام اور خوابوں سے متعلق مسائل کا بیان)

شیطان کا خواب میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں نہ آسکنا

سوال:- شیطان، رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل مبارک میں نہیں آسکتا، لیکن کیا شیطان کسی اور صورت میں آکر یہ کہنے کی طاقت رکھتا ہے کہ نعوذ باللہ یوں کہہ دے کہ میں رسول ہوں یا یہ کہنے کی طاقت نہیں رکھتا؟ اس کی وضاحت فرمادیں۔

جواب:- شیطان، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت اور حلیہ مبارکہ میں نہیں آسکتا[1]، لیکن کسی اور کی صورت میں آکر دھوکا دے سکتا ہے، یعنی یہ جھوٹا دعویٰ کرسکتا ہے کہ میں یا فلاں شخص رسول ہوں۔ ان الشیطان قد یأتی النائم فی صورة ما من معارف الرائی وغیرھم فیشیر له الی رجل آخر: ھٰذا فلان النبی وھٰذا الملک الفلانی أو من أشبه ھؤلاء ممن لا یمثل الشیطان به فیوقع اللبس علی الرائی بذٰلک. (الاعتصام للشاطبیؒ ج:۱ ص:۲۱۲)۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۳ھ
(فتویٰ نمبر ۵۹۱/۲۸ ب)

بزرگ سے ملاقات کے موقع پر خود اپنے ہاتھ کو چومنا

سوال:- کسی عالمِ دین یا بزرگ سے ملاقات کرنے کے بعد خود اپنے ہاتھ کو چومنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- فی الدر المختار: وکذا ما یفعله الجهال من تقبیل ید نفسه اذا لقی غیره فهو مکروه فلا رخصة فیه۔ (شامی حظر واباحت ج:۵ ص:۳۳۷)[3]۔ اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی دُوسرے سے ملاقات کے وقت اپنے ہاتھ چومنا مکروہِ تحریمی ہے، البتہ کسی بزرگ کے ہاتھ کبھی کبھی

---

(۱) عن أبی هریرة رضی الله عنه أنّ رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: من رآنی فی المنام فقد رآنی فان الشیطان لا یتمثل بی، وفی روایة: فی صورتی. متفق علیه مشکوٰة المصابیح ج:۲ ص:۳۹۴. وانظر فی جامع الترمذی، باب ما جاء فی قول النبی صلی الله علیه وسلم: من رآنی فی المنام فقد رآنی. ج:۲ ص:۵۲ (طبع میر محمد کتب خانه).
نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۵ ص:۲۴۳ تا ۲۴۵۔

(۲) الاعتصام للشاطبیؒ ج:۱ ص:۲۶۳ (طبع دار المعرفة بیروت).

(۳) الدر المختار، حظر واباحت ج:۶ ص:۳۸۳، وفی مجمع الانهر شرح ملتقی الأبحر ج:۴ ص:۲۰۵ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) کتاب الکراهیة وتقبیل ید العالم. وفی الدر المنتقی تحته ان لنیل الدنیا کره کتقبیل ید نفسه أو ید صاحبه.

بقصدِ تبرک چوم لئے جائیں تو مضائقہ نہیں۔ کما فی الدر۔ [1]

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۱/۹ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع

(فتویٰ نمبر ۱۹/۲۹ الف)

کشفِ قبور اور انوار و تجلیات کے مشاہدے کی شرعی حیثیت

سوال:- ....صاحب نے اپنے خلیفہ ....صاحب کو نشکی ضلع چاغی بھیجا ہے، یہ ان کے پُرانے مرید ہیں، ....صاحب کا مسلک مختصراً درج ذیل ہے۔ ۱:- تصوّف میں نقشبندی اویسی سلسلہ، ۲:- کشفِ قبور، دعویٰ کے ساتھ فرماتے ہیں چھ مہینے کے اندر ان کو سب کچھ ہم دِکھاتے ہیں اور رُوحانی طور پر براہِ راست نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات وغیرہ، ۳:- کشفِ قبور کو اس وقت ایک سنت مردہ قرار دے دیا گیا ہے، کوئی اس کے احیاء کی کوشش کرے گا تو اسے سو شہیدوں کا ثواب ملے گا۔ اس طریق میں شمولیت اختیار کرنا کیسا ہے؟ کیا رُوحانی تربیت حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ سے شریعتِ مطہرہ میں جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- کشفِ قبور اور بعض انوار و تجلیات کا مشاہدہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے کسی بندے کو کرادیا جائے تو ممکن بھی ہے اور اس میں کوئی بات خلافِ شرع بھی نہیں، البتہ یہ چیزیں شریعت وطریقت میں مقصود نہیں، [2] مقصود اِتباعِ سنت وشریعت اور اصلاحِ اعمال واخلاق ہے، اس قسم کے کشف وغیرہ کو مقصود بنانا یا سنت قرار دینا، بدعت ہے، اور جو لوگ اس کو مقصود سمجھ کر کریں ان کی صحبت سے پرہیز کرنا چاہئے، ان کے بجائے ایسے شیخ کو اختیار کریں جو متبعِ سنت ہوں اور اعمال واخلاق کی اصلاح کی فکر کرتے ہوں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۱۰/۱۰/۲۶ھ

(فتویٰ نمبر ۱۶۱۱/۳۲ ج)

بغیر عمل کے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کا حسنِ ظن رکھنا

سوال:- اللہ تعالیٰ سے مغفرت کا حسنِ ظن بلا عمل رکھنے کا کیا حکم ہے؟ بالخصوص فرائضِ شرعیہ مثل نماز جس کا ہر ایک مکلف ہے، چھوڑ کر حسنِ ظن رکھنا دُرست ہے یا نہیں؟ ایسا نظریہ رکھنے والے شخص کا کیا حکم ہے؟ اور وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اللہ کو ہماری عبادت کی ضرورت نہیں، وہ ویسے ہی

---

(۱) وفی الدر المختار مع رد المحتار ج:۶ ص:۳۸۳ (ولا باس بتقبیل ید) الرجل (العالم) والمتورّع علیٰ سبیل التبرک .... الخ.

(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے: شریعت وطریقت ص:۲۷۷، شریعت وتصوف ص:۲۷۱، کشف الحقیقۃ ص:۶۵ تا ۱۱۰، تعلیم الدین ص:۷۰، ۸۵۔

معاف کردے گا۔

جواب:- اللہ کی ذات سے مغفرت کا حسنِ ظن رکھنا اچھی بات ہے، لیکن اس کا حق اس شخص کو پہنچتا ہے جو اللہ کے اَحکام کی پابندی کرتا ہو،(۱) اس لئے اس خیال سے فرائضِ شرعیہ کا چھوڑنا گناہِ عظیم ہے۔(۲) اللہ عبادت کا محتاج نہیں، لیکن انسان اپنی نجات اور فائدے کے لئے اس کی عبادت کا محتاج ہے، اگر صرف یہ حسنِ ظن کافی ہوتا تو اللہ کو قرآن اور حدیث کے ذریعہ اتنے اَحکام بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز کی تاکید کیوں فرماتے تھے؟ اس شخص کو چاہئے کہ اپنے ان خیالات سے توبہ کرے۔

واللہ اعلم وعلمہٗ اتم واحکم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۰/۲۶ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۸ الف)

شیخِ طریقت کے لئے کیا شرائط ہیں؟

سوال:- شیخِ طریقت کے لئے کیا شرائط ہیں؟ اور مجتہد کی کیا شرائط ہیں؟

جواب:- شیخِ طریقت ہونے کے لئے بہت سی شرائط ہیں، جن کی تفصیل یہاں مشکل ہے، مختصر یہ ہے کہ کسی کامل شیخِ طریقت نے اسے بیعت کرنے کی اجازت دی ہو، تفصیل کے لئے دیکھئے ''قصد السبیل'' از حضرت تھانویؒ و'' آداب الشیخ والمرید'' از حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ، اور مجتہد کے لئے بھی بہت سی شرائط ہیں جن کی تفصیل اُصولِ فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے۔

سوال۲:- شریعت، طریقت، حقیقت و معرفت کی کیا تعریف ہے؟

جواب:- اس کا جواب بھی تفصیل طلب ہے، ''تعلیم الدین'' یا ''قصد السبیل'' یا ''شریعت و

(۱ و ۲) وفي جامع الترمذی ج:۴ ص:۶۳۸ (طبع دار احیاء التراث العربی بیروت) باب ۲۴۵۹ عن شداد بن أوس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: الکیّس من دان نفسہ وعمل لما بعد الموت، والعاجز من اتبع نفسہ ھواھا وتمنّی علی اللہ. قال ھذا حدیث حسن ومعنی قولہ من دان نفسہ یقول حاسب نفسہ فی الدنیا قبل أن یحاسب یوم القیامۃ.

وفي الترمذی أیضًا ج:۲ ص:۶۴ (طبع ایچ ایم سعید) باب ما جاء فی حسن الظن باللہ تعالٰی، عن أبی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ان اللہ تعالٰی یقول: أنا عند ظن عبدی بی، وأنا معہ اذا دعانی. ھذا حدیث حسن صحیح. وفی تحفۃ الأحوذی ج:۳ ص:۵۳ (طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت) ای انا أعاملہ علٰی حسب ظنہ بی، وأفعل بہ ما یتوقعہ منی من خیر أو شر، والمراد الحث علٰی تغلیب الرجاء علی الخوف وحسن الظن بحسن الظن باللہ. وقال القرطبی فی المفھم معنی ظن عبد بی ظن الاجابۃ، ثم الدعاء وظن القبول ثم التوبۃ وظن المغفرۃ ثم الاستغفار وظن المجازاۃ، ثم فعل العبادۃ بشروطھا تمسکا بصادق وعدہ، قال: ویؤیدہ قولہ فی الحدیث الأخر: ادعوا اللہ تعالٰی وأنتم موقنون بالاجابۃ، قال: لذٰلک ینبغی للمرء ان یجتھد فی القیام بما علیہ موقنا بأن اللہ یقبلہ ویغفر لہ، لأنہ وعد بذٰلک وھو لا یخلف المیعاد .... قال وأما ظن المغفرۃ مع الاصرار فذٰلک محض الجھل والغرّۃ وھو یجر الی مذھب المرجئۃ .... الخ. (محمد زبیر)

طریقت"،تصانیف حضرت تھانویؒ کا مطالعہ فرمایئے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۲/۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸۲۶/۲۷ و)

خواب کی وجہ سے قبر کو اُکھاڑنا

سوال:- میری بیٹی جس کا نام عظیمہ عرف "چھوگڑیا" تھا، جس کو لانڈھی مل ایریا کے قبرستان میں دفن کردیا ہے، اس کو بڑی تکلیف اُٹھانی پڑی، خیر یہ تو خدا کی مرضی ہے، اس کی عمر ۵ سال تھی، مجھ سے بہت پیار کرتی تھی، ۱۰ دن فوت ہوئے ہوئے ہیں، مگر میرے خواب میں برابر آتی ہے، میرے کانوں میں دن کے وقت یہ آواز گونجتی رہتی ہے کہ: "بابا میں زندہ ہوں، مجھے باہر نکالو" آج مؤرخہ ۲۱ رشعبان کو میں نے کچھ ساتھیوں کے ساتھ قبر کے سرہانے کا پتھر نکال کر دیکھا تو وہ ویسے ہی سو رہی تھی، میرے سوا کسی نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا، کیا اس کا کچھ کفارہ ادا کرنا ہوگا؟

جواب:- اس قسم کے خوابوں کی وجہ سے قبر کو اُکھاڑنا شرعاً بالکل ناجائز ہے،(۱) اور ایسا کرنے سے آپ نے گناہ کا ارتکاب کیا، اب اس کا کفارہ یہی ہے کہ صدقِ دِل کے ساتھ توبہ و اِستغفار کریں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۸/۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۲۶/۲۸ ج)

خواب کی قسمیں اور خواب میں شیطانی خیالات واوہام اور رُؤیائے صادقہ میں فرق کی تدبیر

سوال:- انسان عالمِ خواب میں کچھ نظارے دیکھتے ہیں، دو حال سے خالی نہیں، رُوحانی یا تخیلی، اگر شقِ اوّل ہے تو کسی اجنبی یا جان پہچان بزرگوں کو دیکھنا اور کلام کرنا۔ کسی اجنبی مردہ بمع قبر یا جان پہچان کو لین دین، خوشی یا غمی میں دیکھنا، کلام کرنا کسی اجنبی عورت یا جان پہچان کو اجنبی مقام یا جانی پہچانی جگہ میں دیکھنا، کلام کرنا، صحبت کرنا کیسا ہے؟ نیز بچہ، جوان، بوڑھی میں تو فرق نہیں ہے؟ اور کیا یہ واقعۃً ایسا ہوتا ہے؟

دریافت طلب اَمر یہ ہے کہ اگر واقعی رُوح کو اپنے جسم سے نکل کر کہیں جانا دُرست ہے تو رُوح کی صحبت سے جسم میں حرارت ولذّت محسوس ہونا کیسا ہے؟

---

(۱) وفي الاعتصام للشاطبيؒ ج:۱ ص:۲۲۰ (طبع دار المعرفة بيروت) ان الرؤيا من غير الأنبياء لا يحكم بها شرعًا على حال الّا أن تعرض على ما في أيدينا من الأحكام الشرعية فان سوغتها عمل بمقتضاها، والّا وجب تركها والاعراض عنها وانما فائدتها البشارة أو النذارة خاصة، واما استفادة الأحكام فلا .... الخ. نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۵۴۰۔

اگر شقِ آخر ہے تو انسان جاگتے وقت کتنا ہی اپنا خیال دوڑائے لیکن اسے اجنبی عورت، اجنبی مقام اور اجنبی بزرگوں کا تو خیال آتا ہی نہیں اور نہ ہی کوئی چیز کھانے سے یا صحبت کرنے سے حرارت و لذّت محسوس ہوتی ہے، اگر خواب نبوّت کے چالیس حصوں میں سے ایک ہے تو بعض خواب شیاطین و جنات کی طرف سے بھی ہوتے ہیں، ان میں فرق کرنے کی کوئی معقول تدبیر تحریر فرمائیں۔

جواب:- بعض خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے ہیں، اور رُؤیائے صادقہ ہوتے ہیں، ان کو حدیث میں نبوّت کا چھیالیسواں حصہ قرار دیا ہے،[1] بعض شیطان کی طرف سے ہوتے ہیں جن میں عموماً فسق و فجور یا گندگیاں نظر آتی ہیں، بعض محض خیالات ہوتے ہیں،[2] اور چونکہ ان تینوں کے درمیان فرق کرنے کی کوئی یقینی صورت موجود نہیں، اس لئے دین میں خواب حجت نہیں ہیں،[3] اور خواب میں رُوح کا تعلق جسم سے باقی رہتا ہے اس لئے رُوحانی لذّت والے خواب کا اثر جسم بھی محسوس کرتا ہے۔

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۲۵ھ

(فتویٰ نمبر ۶۵۴/۲۸ ب)

کیا بینک ملازم رہتے ہوئے شیخِ کامل بن سکتا ہے؟

سوال:- ایک شخص کسی شیخِ کامل سے منسلک ہے، وہ کسی بینک یا ازقسم بینک میں ملازمت کرتے ہوئے اللہ کا مقرب بندہ بن سکتا ہے؟ اور اس کے ذمہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے رُشد و ہدایت کی کوئی دینی خدمت سپرد کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

جواب:- بینک کی ملازمت ناجائز ہے،[4] دُوسری ملازمت تلاش کی جائے اور جب تک

---

(۱) وفی جامع الترمذی باب أنّ رؤیا المؤمن جزء من ستة وأربعین جزأ من النبوة ج:۲ ص:۵۱ (میر محمد کتب خانه) عن عبادة بن الصامت ان النبی صلی الله علیه وسلم قال: رؤیا المؤمن جزءٌ من ستة وأربعین جزء من النبوة.

(۲) اور خواب کی ان تینوں قسموں (یعنی رُؤیائے صادقہ اور شیطان کی طرف سے آنے والے خواب اور محض خیالات) کا ذکر اس حدیث شریف میں آیا ہے: عن أبی هریرةؓ قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: اذا اقترب الزمان لم تکد رؤیا المؤمن تکذب، واصدقهم رؤیا أصدقهم حدیثا، ورؤیا المسلم جزء من ستة وأربعین جزأ من النبوة، والرؤیا ثلاث: فالرؤیا الصالحة بشریٰ من الله، والرؤیا من تحزین الشیطان، والرؤیا مما یحدث الرجل نفسه، فاذا رای أحدکم ما یکره فلیقم ولیتفل ولا یحدث به الناس. قال وأحب القید فی النوم واکره الغلّ. القید ثبات فی الدین. هذا حدیث صحیح. جامع الترمذی، باب ان رؤیا المؤمن جزء من ستة وأربعین جزأ من النبوة ج:۲ ص:۵۱ (طبع میر محمد کتب خانه).

(۳) وفی الاعتصام للشاطبیؒ ج:۱ ص:۲۶۰ (طبع دار المعرفة بیروت) انّ الرؤیا من غیر الأنبیاء لا یحکم بها شرعًا علی حال الّا أن تعرض علی ما فی أیدینا من الأحکام الشرعیة فان سوغتها عمل بمقتضاها، والّا وجب ترکها والاعراض عنها وانما فائدتها البشارة أو النذارة خاصة، واما استفادة الأحکام فلا .... الخ. نیز دیکھئے امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۵۴۰ سوال نمبر ۲۶۰۔

(۴) بینک ملازمت کی اقسام اور ان کے حکم سے متعلق فتویٰ ان شاء اللہ ”کتاب الاجارۃ“ میں اپنے مقام پر آئے گا۔ (محمد زبیر)

دُوسری ملازمت باوجود کوشش کے نہ ملے اس ملازمت کو بُرا سمجھتے ہوئے اس میں لگے رہیں، اور جونہی ملازمت ملے چھوڑ دیں، اس دوران میں عام دینی خدمات انجام دے سکتے ہیں، مگر مرشد و مربی کا منصب اس ملازمت کو باقی رکھتے ہوئے حاصل نہیں ہوسکتا۔ واللہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۶/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۶۴۹/۱۹ الف)

ایک خواب کی حقیقت

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کہتا ہے کہ میرے والد کو کثرت سے رُؤیائے صادقہ ہوتے تھے اور میرے والد کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بے انتہا محبت، عشق اور تعلق ہے، جس کی مثال عالم میں کم ملے گی، والد بیمار ہوگئے تو خواب دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے ہیں کہ تم بیمار ہوتے ہو تو میں بھی بیمار ہوجاتا ہوں، تمہارے سر میں درد ہوتا ہے تو میرے سر میں بھی درد ہوتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا ایسے خواب یقین کرنے کے قابل ہیں؟ اور یہ الفاظ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کرنا شریعت میں کیا حکم رکھتا ہے؟ عنداللہ جواب سے مطلع فرماکر اس ذہنی اُلجھن سے نجات دلائیں۔

جواب:- نہ یقین کرنے کی ضرورت ہے، نہ انکار کرنے کی، اگر کسی مسلمان کو اس قسم کا خواب نظر آئے تو اس میں کوئی بُعد نہیں۔ رہا یہ معاملہ کہ واقعۃً ایسا خواب کسی کو نظر آیا ہے یا نہیں؟ اس کو معلوم کرنے کا کوئی یقینی ذریعہ بجز دیکھنے والے کے قابلِ اعتماد ہونے کے، کوئی نہیں۔ اگر قابلِ اعتماد ہو تو تصدیق بھی کی جاسکتی ہے اور یہ کوئی ایسا مسئلہ بھی نہیں ہے جس پر ایمان لانا واجب ہو، اس لئے اگر کوئی شخص اس پر یقین نہ کرے تب بھی اس کو ہدفِ ملامت نہیں بناسکتے۔ واللہ اعلم

۱۳۹۹/۹/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۵۹/۳۰ د)

قطب اور ابدال کی حقیقت

اور کیا زمین میں چار قطب ہوتے ہیں؟

سوال:- چند لوگ کہتے ہیں کہ زمین کے چار قطب ہیں جو کہ زمین کے چار برابر حصوں میں رہتے ہیں اور یہی سلسلہ چلتا رہتا ہے، یہ قطب زمین کی حفاظت کرتے ہیں، کیا یہ صحیح ہے؟

جواب:- اقطاب وابدال تکوینیات کی اصطلاحیں ہیں، جن کی حقیقت اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے، قرآن وحدیث میں بھی ان کی تفصیلات موجود نہیں ہیں، البتہ صوفیائے کرام اور بزرگانِ دین کے مکاشفات وتجربات ہیں،[1] جن کی تردید بھی نہیں کی جاسکتی، لیکن دین کے کسی مسئلے پر عمل یا عقیدہ ان اصطلاحات کو جاننے یا تسلیم کرنے پر موقوف نہیں ہے۔　واللہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷۵۵/۲۷ د)

سلسلۂ قادریہ کے افراد میں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی رُوح کے حلول کا عقیدہ

سوال:- کیا حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کی رُوح، سلسلۂ قادریہ کے آدمیوں کے اندر حلول کرکے بات کرسکتی ہے؟ اگر نہیں کرسکتی تو ایسا بولنے اور عقیدہ رکھنے والوں کا کیا حکم ہے؟

جواب:- حلول کا یہ عقیدہ اسلام کے قطعی طور پر خلاف ہے، ایسا عقیدہ رکھنے والا گمراہ ہے۔

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۶۳۰/۲۸ ب)

***

(۱) قطب اور ابدال وغیرہ القاب سے متعلق تحقیق وتفصیل کے لئے علامہ سیوطی رحمہ اللہ کا رسالہ "الخبر الدال علی وجود القطب والأوتاد والنجباء والأبدال"، اور حضرت امامِ ربانی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "معارف لدنیہ" ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر)

﴿کتاب الذکر والدعاء والتعویذات﴾

(ذکر، دُعا اور تعویذات کے بیان میں)

دُعا کس قسم کی عبادت ہے؟

سوال:- دُعا عبادت ہے، اگر عبادت ہے تو کس قسم کی ہے؟ دُعا کو تمام عبادتوں کا مغز بتلاتے ہیں، حدیث کی رُو سے تمام عبادتوں کا نچوڑ ہے، کوئی ناسمجھ انسان عبادتوں کا نچوڑ سمجھ کر دُعا کو ہی عبادت نہ تصوّر کرنے لگے؟

جواب:- دُعا عبادت بھی ہے،[1] اور عبادتوں کا مغز بھی،[2] لہٰذا اسے عبادت سمجھنا دُرست ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ دُوسری عبادتیں انجام نہ دی جائیں بلکہ جتنی عبادتیں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلائی ہیں ان سب پر حسبِ مراتب عمل کرنا چاہئے، انہی میں سے دُعا بھی ہے۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۰/۲۸ الف)

عزّت حاصل کرنے کے لئے ''یا عزیز'' کا وظیفہ پڑھنا

سوال:- مجموعۂ وظائف کے صفحہ:۱۵۵ پر درج ہے الاسم الخاص عزیز اس کو ایک لاکھ مرتبہ پڑھے توجہ سے یعنی مطلب اس کا اصطلاحِ تصوّف میں یہ ہے کہ اے اللہ! مجھ کو اپنی عزّت کے واسطے سے عزّت والوں میں داخل کر، عزّت والوں کا کام مجھے عطا کر، مجھ کو عزّت دے، عزّت والے بندوں میں داخل کر، اگر یا کے ساتھ پڑھے تو یا عزیز بلاتنوین پڑھے۔ مندرجہ بالا وظیفہ پڑھ سکتا ہوں یا نہیں؟ اگر میں ایک ہی مرتبہ ایک لاکھ مرتبہ نہ پڑھ سکوں تو کوئی متبادل طریقہ ہوسکتا ہے؟ وظیفہ پڑھنے کے درمیان کیا احتیاطی تدابیر اختیار کی جائیں؟

جواب:- مذکورہ بالا مقاصد کے لئے ''یا عزیز'' کا وظیفہ پڑھنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے، اور شرعی اعتبار سے اس کی کوئی خاص مقدار مقرّر نہیں، عملیات کے نقطۂ نظر سے ایک لاکھ مرتبہ

---

(۱) الدعاء هو العبادة، صحیح ابن حبان ج:۲ ص:۱۲۴ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) و مشکوة المصابیح ج:۱ ص:۱۹۴ (طبع قدیمی کتب خانه).

(۲) قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: الدعاء مخ العبادة. رواه الترمذی، مشکوة المصابیح کتاب الدعوات ج:۱ ص:۱۹۴.

پڑھا جائے تو مضائقہ نہیں، اور اس کے طریقے کے بارے میں کسی عامل سے رُجوع کریں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۹ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۵۶۳ ب)

ذکر جہراً افضل ہے یا سراً؟

سوال:- تیرہ محرّم الحرام کے رسالہ ''خدام الدین'' (لاہور) میں یہ لکھا ہے کہ ذکر جہری مبتدیوں کے لئے ہے اور اس کے کئی فائدے ہیں، مثلاً زبان، دِماغ، دِل متوجہ ہوجاتا ہے اور خیال غیر کی طرف نہیں جاتا، کیونکہ اللہ کھیلنے والوں کا ذکر قبول نہیں فرماتا، اور منتہی دو طرح کے ذکر کرتے ہیں، مگر مبتدیوں کے لئے یہی ایک طریقہ ہے، کیونکہ ابتداء میں یکسوئی حاصل نہیں ہوتی، بعد میں تربیت کرنے سے حاصل ہوجاتی ہے۔ اس پر میرے ایک دوست نے کہا کہ یہ بدعت ہے، میں نے بڑے بڑے علماء کا ثبوت دیا مگر اس نے کہا یہ بدعت ہندوستان، پاکستان ہی میں ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ چیزیں نہ تھیں؟ کیا ذکر جہراً وسراً دونوں طرح جائز ہے اور اس میں افضل کون سا ہے؟

جواب:- اس معاملے میں محقق علماء کا مسلک یہ ہے کہ ذکر دونوں طرح جائز ہے، سراً بھی اور جہراً بھی، پھر مختلف حالات ومواقع کے اعتبار سے افضلیت بدلتی رہتی ہے، کہیں آہستہ ذکر کرنا افضل ہے اور کہیں جہراً، لہٰذا کسی پابندِ شریعت شیخ کامل نے مرید کے حالات کے پیشِ نظر ذکرِ جہر کے لئے کہا ہو تو اسے جہراً ذکر کرنا جائز ہے، لیکن دو شرطوں کے ساتھ، ایک یہ کہ اس کا یہ ذکرِ جہر کسی شخص کی نیند میں خلل یا کسی اور معقول تکلیف کا موجب نہ ہو، دُوسرے یہ کہ جہراً ذکر کو عبادتِ مقصودہ نہ سمجھا جائے بلکہ اسے علاج کے طور پر اختیار کیا جائے۔ آپ کے دوست کا ذکرِ جہر کو بدعت کہنا دُرست نہیں، قرآن و حدیث میں ذکرِ جہر کا بھی ثبوت ملتا ہے، قرآنِ کریم میں ہے: ''وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ.'' (سورۃ البقرۃ:۱۱۴)

ظاہر ہے کہ ذکر جہر سے منع کرنا، اطلاعِ ذکر کے بغیر ممکن نہیں۔ اور اس کے علاوہ صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے بعد بلند آواز سے ''لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ''[1] پڑھا کرتے

(۱) الصحیح للامام مسلمؒ باب استحباب الذکر بعد الصلوٰۃ ج:۱ ص:۲۱۸ (طبع قدیمی کتب خانہ).

تھے، اس طرح اور بھی کئی روایات سے ذکرِ جہر کا ثبوت ملتا ہے، تفصیلی دلائل حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ نے امداد الفتاویٰ ج:۵ ص:۱۵۹ مطبوعہ کراچی[1] میں کتاب السلوک کے تحت بیان فرمائے ہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹/۱۷۵ الف)

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

"لا اِلٰہ اِلَّا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ احدًا صمدًا" والی حدیث صحیح ہے یا نہیں؟

سوال:- کیا یہ حدیث صحیح ہے: "لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ احدًا صمدًا لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفوًا احد"؟ اور کون سی کتاب میں ہے؟

جواب:- مندرجہ بالا الفاظ حافظ عبدالعظیم منذری نے الترغیب والترہیب[2] میں بحوالہ طبرانی نقل کئے ہیں، راویٔ حدیث حضرت عبداللہ بن ابی اَوفیٰ ہیں، اور اس روایت میں ہے اس کو گیارہ بار

---

(۱) امداد الفتاویٰ ج:۵ ص:۱۵۱ تا ۱۵۵ اور دونوں طرح ذکر کے جواز اور ذکرِ جہر کی شرائط سے متعلق چند فقہی عبارات یہ ہیں:
وفی رد المحتار ج:٦ ص:۳۹۸ (الحظر والاباحة) وقد حرر المسئلة فی الخیریة وحمل ما فی فتاویٰ القاضی علی الجهر المضر وقال: ان هناک أحادیث اقتضت طلب الجهر وأحادیث طلب الاسرار والجمع بینهما بأن ذٰلک یختلف باختلاف الأشخاص والأحوال فالاسرار أفضل حیث خیف الریاء أو تأذی المصلین أو النیام، والجهر أفضل حیث خلا مما ذکر لأنه أکثر عملا ولتعدی فائدته الی السامعین ویوقظ قلب الذاکر فیجمع همه الی الفکر ویصرف سمعه الیه ویطرد النّوم ویزید النشاط. وکذا فی فتاویٰ شامیة ج:۱ ص:۲٦۰. وفی الفتاوی الخیریة ج:۲ ص:۱۸۱ (طبع بولاق، مصر) والجمع بینهما بأن ذٰلک یختلف باختلاف الأشخاص والأحوال کما جمع بین الأحادیث الطالبة للجهر بالقراءة والطالبة للاسرار بها ولا یعارض ذٰلک خیر الذکر الخفی لأنه حیث خیف الریاء أو تأذی المصلین أو النیام والجهر ذکر بعض أهل العلم أنه أفضل حیث خلا مما ذکر لأنه أکثر عملًا ولتعدی فائدته الی السامعین .... الخ.
وفی حاشیة الطحطاوی علیٰ مراقی الفلاح ج:۱ ص:۴۳۱ (طبع مکتبة الأسد، دمشق، وفی طبع "قدیمی کتب خانه" ص:۱۷۴) اختلف أهل الاسرار فی الذکر أفضل؟ فقیل نعم لأحادیث کثیرة تدل علیه منها خیر الذکر الخفی وخیر الرزق ما یکفی ولأن الاسرار أبلغ فی الاخلاص وأقرب الی الاجابة وقیل الجهر أفضل لأحادیث کثیرة منها ما رواه ابن الزبیر کان رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا سلم من صلاته قال بصوته الأعلیٰ: لا اله الا الله وحده لا شریک له. وتقدم وقد کان صلی الله علیه وسلم یأمر من یقرأ القران فی المسجد أن یسمع قراءته وکان ابن عمرؓ یأمر من یقرأ علیه وعلیٰ أصحابه وهم یستمعون، ولأنه أکثر عملًا وأبلغ فی التدبر ونفعه متعد لإیقاظ قلوب الغافلین .... فمتیٰ خاف الریاء أو تأذی به أحد کان الاسرار أفضل اهـ. نیز دیکھئے: امداد المفتین ص:۲۴۵، ۲۴۷، وعزیز الفتاویٰ ص:۱۵۰۔
(۲) الترغیب والترهیب ج:۲ ص:۴۲۰ (طبع مصطفیٰ البابی، مصر). (محمد زبیر)

پڑھنے پر بیس لاکھ نیکیاں ملیں گی، لیکن حدیث ضعیف ہے۔(۱)

واللہ اعلم
۱۲/۱۲/۱۳۸۷ھ

ایک مہمل وظیفہ

سوال:- وظیفہ ہے: ”جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو قدرت ہے کمال تو نبی جی کی جھولی بھرے بیچ میں ہے قرآن تو“ کیا یہ جائز ہے؟

جواب:- یہ مہمل قسم کا وظیفہ ہے، اس کے بجائے اندیشے کے موقع پر ”اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ شَرِّ مَا أَجِدُ وَأُحَاذِرُ“(۲) پڑھنا چاہئے۔

وسیلہ اختیار کرکے دُعا کرنا کیسا ہے؟

سوال:- وہابی کسی کے لئے کسی درمیانی واسطے کی شفاعت کے قائل نہیں، خواہ وہ اللہ کا کتنا ہی مقبول کیوں نہ ہو، وہ کہتے ہیں جس طرح ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کرے اور کسی کے واسطے کے بغیر بجالائے، اسی طرح وہ اپنی حاجات و مشکلات کو بلاواسطہ اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کرے اور امداد کا طالب ہو۔ کیا درمیانی طور پر وسیلہ اختیار کرنا دُرست ہے یا نہیں؟

جواب:- بے شک اللہ تعالیٰ سے بلاواسطہ دُعا مانگنا بھی جائز ہے، لیکن اگر کوئی شخص اس طرح توسل کرے کہ یا اللہ! آپ کا فلاں بندہ آپ کا مقبول بندہ ہے، مجھے اس سے محبت ہے، اور اس محبت کی بناء پر میں اس کا وسیلہ پیش کرکے آپ سے فلاں چیز مانگتا ہوں تو اس میں بھی کوئی شرعی قباحت

(۱) عن عبداللہ بن ابی اوفیٰ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من قال احدی عشرة مرة لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ، أحدًا صمدًا لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفوًا أحد، کتب اللہ لہ ألفی ألف حسنة. أخرجہ ابن عساکر فی تاریخ دمشق فی ترجمة علی بن الحسین ابن عبدالرزاق أبی الحسن الشعرانی ج:۴۱ ص:۳۵۸ (طبع دار الفکر) وقال فی المجمع ج:۱۰ ص:۸۵ (طبع دار الکتاب بیروت)، رواہ الطبرانی وفیہ فاید الورقاء وھو متروک. وقال البوصیریؒ فی اتحاف الخیر المھرة ج:۶ ص:۳۱۲ (طبع دار الوطن، ریاض) رواہ الطبرانی (وعبد بن حمید وأبو یعلی الموصلی) قلت مدار ھذہ الطرق علی أبی ورقاء واسمہ فائد العطّار وھو ضعیف، ضعّفہ أحمد بن حنبل وابن معین وأبو حاتم وأبو زرعة وابن حبان والبخاری وأبو داؤد والترمذی والنسائی والساجی والعقیلی والدارقطنی وغیرھم وقال الحاکم ابو عبداللہ الحافظ روی عن ابن أبی أوفی أحادیث موضوعة.

(۲) دیکھئے: سنن أبی داؤد، باب کیف الرقی ج:۲ ص:۱۸۷ (طبع مکتبہ حقانیہ ملتان) وجامع الترمذی، باب ما جاء فی الرقی اذا اشتکی. (محمد زبیر حق نواز)

نہیں ہے، بلکہ اس کے جواز پر قرآن وسنت سے دلائل موجود ہیں۔[1] واللہ اعلم

۱۳۹۹/۱۰/۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱۶۸۱/۳۰ د)

فرض نماز کے بعد سر پر ہاتھ رکھ کر پڑھی جانے والی دُعا کا حکم

سوال:- فرضوں کے بعد سر پر ہاتھ رکھ کر جو "بسم اللہ الذی لا الٰہ الا ھو الرحمٰن الرحیم، اللّٰھم اذھب عنی الھم والحزن" پڑھتے ہیں، کیا یہ کسی حدیث میں ہے یا مستحب ہے یا بزرگ پڑھتے آئے ہیں؟ اس پر بعض لوگ اعتراض بھی کرتے ہیں، اس کا کیا حکم ہے؟

جواب:- ابن السنی نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوتے تھے تو اپنے داہنے ہاتھ سے اپنی پیشانی پر مسح فرماتے اور یہ الفاظ پڑھتے تھے: "أشھد ان لا الٰہ الا اللہ ھو الرحمٰن الرحیم، اللّٰھم أذھب عنی الھم والحزن".

(کتاب الأذکار للنوویؒ ص:۳۵)۔[2] واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۸۸/۵/۲۳ھ

(فتویٰ نمبر ۵۸۹/۱۹ الف)

---

(۱) وفي جامع الترمذی ج:۲ ص:۱۹۸ (طبع سعید) عن عثمان بن حنیف، ان رجلا ضریر البصر أتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم .... یدعوا بھذا الدعاء اللّٰھم انی أسئلک وأتوجہ الیک بنبیک محمد نبی الرحمۃ۔ وفی الشامیۃ ج:۶ ص:۳۹۷ (طبع سعید) یراد بالحق الحرمۃ والعظمۃ، فیکون من باب الوسیلۃ وقد قال تعالیٰ: وَابْتَغُوْا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ. وقد عد من اداب الدعاء التوسل علی ما فی الحصن .... وقال بعد أسطر: نعم ذکر العلامۃ المناوی فی حدیث اللّٰھم انی أسئلک وأتوجہ الیک بنبیک نبی الرحمۃ، عن العز بن عبدالسلام أنہ ینبغی کونہ مقصورًا علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم .... وقال السبکی یحسن التوسل بالنبی الیٰ ربہ ولم ینکرہ أحد من السلف ولا الخلف الا ابن تیمیۃ فابتدع ما لم یقلہ عالم قبلہ اھ۔ ونازع العلامۃ ابن امیر حاج فی دعوی الخصوصیۃ وأطال الکلام علی ذلک۔

توسل بالانبیاء والصالحین کی مختلف صورتوں اور شرائط سے متعلق تفصیلی بحث کے لئے حضرت والا دامت برکاتہم کی تصنیف تکملۃ فتح الملھم "مسئلۃ التوسل" ج:۵ ص:۶۲۰ کا مطالعہ فرمائیں۔

(۲) ص:۹۲ (مطبع مصطفیٰ محمد، مصر) وفی مسند البزار والأوسط للطبرانی کان صلی اللہ علیہ وسلم اذا صلی وفرغ من صلوتہ مسح بیمینہ علیٰ رأسہ وقال: بسم اللہ الذی لآ الٰہ الا ھو الرحمن الرحیم، اللّٰھم أذھب عنی الھم والحزن. بحوالہ حصن حصین مع اُردو ترجمہ ص:۲۲۳ (طبع دارالاشاعت) وفی مجمع الزوائد ج:۱۰ ص:۱۱۰ (طبع دار الکتاب بیروت) وفیہ زید العمی وقد وثقہ غیر واحد وضعفہ الجمھور وبقیۃ رجال احد اسنادی الطبرانی ثقات وفی بعضھم خلاف. وراجع أیضًا کشف الأستار عن زوائد البزار ج:۴ ص:۲۲ (طبع مؤسسۃ الرسالۃ بیروت). وکذا فی مجمع البحرین ج:۸ ص:۳۴ رقم الحدیث: ۳۶۶۳ و ۳۶۶۴ (طبع مکتبۃ الرشید، ریاض). (محمد زبیر حق نواز)

اسمِ اعظم سے کیا مراد ہے؟
سجدے کی حالت میں دُعا مانگنے کا حکم

سوال ۱:- اسمِ اعظم سے کیا مراد ہے؟ جن آیات میں اسمِ اعظم کا گمان غالب ہے ان کی نشاندہی کردیں تو مہربانی ہوگی۔

۲:- سجدے کی حالت میں دُعا مانگنا کیسا ہے؟

جواب ۱:- اسمِ اعظم عام طور سے اللہ تعالیٰ کے اس مبارک نام کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ دُعا کرنا زیادہ اُمیدِ قبولیت رکھتا ہے، اس نام مبارک کی تعیین میں مختلف احادیث وروایات اور علماء کے مختلف اقوال منقول ہیں، حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ ایک صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ان الفاظ سے دُعا شروع کی: "اللّٰھم انی أسالک بأن لک الحمد لا الٰہ الا أنت الحنان المنان بدیع السمٰوٰت والأرض یا ذا الجلال والاکرام یا حی یا قیوم أسالک"۔

اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: "دعا اللہ باسمہ الأعظم الذی اذا دُعی بہ أجاب واذا سئل بہ أعطی"۔[1] "اس شخص نے اللہ تعالیٰ کے اس اسمِ اعظم کے ذریعے دُعا مانگی ہے جس کے ذریعے جب بھی دُعا کی جائے اللہ تعالیٰ قبول فرماتا ہے اور اس کے ذریعے جب کوئی چیز مانگی جائے وہ دے دیتا ہے۔" نیز بعض روایات میں ہے کہ اسمِ اعظم سورۂ بقرہ، آلِ عمران اور سورۂ طٰہٰ ہیں، مشکوٰۃ کی ایک اور حدیث میں مروی ہے کہ اسمِ اعظم ان دو آیتوں میں ہے: "وَاِلٰـهُكُمْ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ" اور "الٓمّٓ. اللّٰهُ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ"۔[2]

بعض صحابہؓ سے مروی ہے کہ "الحی القیوم" اسمِ اعظم ہے، امام رازیؒ اور علامہ نوویؒ نے اسی کو اختیار کیا ہے، علامہ جزریؒ نے فرمایا ہے کہ "میرے نزدیک اسمِ اعظم "لا الٰہ الا ھو الحی القیوم" ہے۔" بعض حضرات نے لفظِ "رَبّ" کو، اور بعض نے لفظِ "اللّٰہ" کو اسمِ اعظم قرار دیا ہے،[3] اور بعض علماء نے فرمایا کہ "اسمِ اعظم" ایک راز ہے جس سے کوئی واقف نہیں۔ علمائے محققین نے اس سلسلے

---

(۱) رواہ الترمذی وأبو داؤد والنسائی وابن ماجة، مشکوٰة المصابیح، باب أسماء اللہ تعالیٰ ج:۱ ص:۱۹۹، ۲۰۰ (طبع قدیمی کتب خانہ).

(۲) وفی مشکوٰة المصابیح ج:۱ ص:۲۰۰ عن أسماء بنت یزید أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: اسم اللہ الأعظم فی ھاتین الآیتین: وَاِلٰـهُكُمْ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ، و فاتحة آل عمران الٓمّٓ. اللّٰهُ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ. رواہ الترمذی وأبو داؤد وابن ماجة والدارمی.

(۳) امام رازی، علامہ نووی، علامہ جزری رحمہم اللہ اور بعض دیگر حضرات کے مذکورہ بالا اقوال کے لئے دیکھئے: مرقاة المفاتیح ج:۵ ص:۱۰۲ (طبع مکتبہ امدادیہ ملتان)۔

میں یہ فرمایا ہے کہ درحقیقت تمام اسمائے باری تعالیٰ عظیم ہیں اور کسی کو کسی پر فضیلت نہیں، لہٰذا ایسا اسمِ اعظم جس سے زیادہ عظمت کسی اسمِ باری کو حاصل نہ ہو مستند روایات سے ثابت نہیں ہے، اور جن جن اسماء کے بارے میں احادیث میں وارد ہوا ہے کہ وہ اسمِ اعظم ہیں ان سے مراد یہ ہے کہ یہ بھی باری تعالیٰ کے عظیم اسماء میں سے ہیں اور ان کے ذریعے خاص طور پر دُعا قبول ہوتی ہے، اسی لئے اس بارے میں مختلف روایات مروی ہیں۔

اور متفقہ طور پر کسی ایک نام کو علی الاطلاق اسمِ اعظم کہنا مشکل ہے، مُلّا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ مذکورہ بالا تمام اقوال نقل کرنے کے بعد امام طبرانیؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں: **وعندی أن الأقوال کلھا صحیحۃ اذ لم یرد فی خبر منھا أنہ الاسم الأعظم ولا شیٔ أعظم منہ۔** (مرقاۃ المفاتیح ج:۵ ص:۱۰۲ باب اسماء اللہ تعالیٰ، طبع مکتبہ امدادیہ ملتان)۔

۲:- فرائض کے رُکوع و سجود میں تو اذکارِ مسنونہ کے سوا کچھ اور نہ پڑھنا چاہئے، البتہ نوافل کے سجدے میں دُعا دُرست ہے، لیکن دُعا ماثورہ ہو یا کم از کم عربی زبان میں ہو اور آخرت سے متعلق ہو۔

لما فی الدر المختار: ودعا بالعربیۃ وحرم بغیرھا [1] **وفی ردّ المحتار: ینبغی أن یدعو فی صلٰوتہ بدعاء محفوظ وأما فی غیرھا فینبغی أن یدعو بما یحضرہ۔** (شامی ج:۱ ص:۳۵۰، ۳۵۲)۔[2]

اور نماز کے علاوہ خاص دُعا کے لئے سجدہ کرنا اور اس میں دُعا کرنا کہیں منقول نظر سے نہیں گزرا، لیکن ظاہراً کچھ حرج بھی نہیں، کیونکہ صورت تذلل کی ہے، مگر اس کو عادت بنانا یا سنت سمجھنا دُرست نہیں، کذا فی امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۵۴۰۔[3]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۲۰ھ
(فتویٰ نمبر ۹۸۱/۲۸ ج)

مسجد میں بلند آواز سے فضائل کی کتاب پڑھنا
دورانِ تلاوت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام آنے پر دُرود شریف پڑھنے کا حکم

سوال ۱:- تبلیغ والے مسجد میں فرضوں کے بعد بلند آواز سے فضائل کی کتاب پڑھتے ہیں یا تقریر کرتے ہیں، اس وقت بہت سے نمازی نمازیں پڑھتے رہتے ہیں، مصلّیوں میں ایسے مسبوق بھی

---

(۱) الدر المختار ج:۱ ص:۵۲۱ (طبع سعید).
(۲) رد المحتار تتمۃ تحت مطلب فی خلف الوعید وحکم الدعاء بالمغفرۃ للکافر ولجمیع المؤمنین. ج:۱ ص:۵۲۳ (طبع سعید).
(۳) دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۵۵۶ سجدۂ دُعا۔

ہوتے ہیں جو کہ سنت ونوافل ادا کرتے ہوتے ہیں، اس کے علاوہ تسبیح وغیرہ میں مشغول مصلّیوں کی طرف سے شکایت ہوتی ہے کہ اس کی وجہ سے ہماری تسبیحات میں خلل واقع ہوتا ہے، منع کرنے سے وہ نہیں مانتے، بلکہ تبلیغ والے کہتے ہیں کہ جاکر صحن وغیرہ میں تسبیح ونوافل پوری کرو۔ شرعاً کیا حکم ہے؟

۲:- تلاوتِ قرآن شریف میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم شریف آئے اس وقت دُرود پڑھنا چاہئے یا نہیں؟ یا بعد ختم تلاوت کے پڑھے؟

جواب ۱:- مسجد میں فضائل کی کتاب پڑھنے میں کوئی حرج نہیں بلکہ مفید ہے، البتہ اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ اس سے نمازیوں کی نماز میں خلل نہ پڑے، لہٰذا اگر نمازی نماز میں مشغول ہوں تو ان سے دُور ہٹ کر کتاب پڑھی جائے یا ان کے فارغ ہونے کا انتظار کیا جائے، نمازیوں کو دُوسری جگہ نماز پڑھنے کو کہنا دُرست نہیں۔ كما يفهم من عبارة الشامية تحت قول الدر: ورفع صوت بذكر الا للمتفقه، وفي حاشية الحموي عن الامام الشعراني أجمع العلماء سلفًا وخلفًا على استحباب ذكر الجماعة في المساجد وغيرها الا أن يشوش جهرهم على نائم أو مصل أو قاري. (شامي ج:۱ ص:۴۴۴ أحكام المساجد من الصلوٰة)۔[1]

۲:- تلاوت کے بعد پڑھنا چاہئے۔[2]

واللہ اعلم
۱۳۹۶/۱۱/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۲۵۵۲/۲۷ و)

نماز کے بعد "اِنَّ اللہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ" بلند آواز سے پڑھنا

سوال:- ہمارے پیش امام صاحب کچھ دنوں تک یہ آیت نماز کے بعد پڑھتے تھے "اِنَّ اللہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ .... الخ"، چند دن ہوئے انہوں نے اس آیت کو ترک کردیا، میں نے ایک دن ان سے وجہ دریافت کی تو جواب دیا کہ نماز میں خلل آتا ہے اور تم سمجھ لئے گئے ہو، اور اس کے بعد چل دیئے، میں نے یہی بات سیکریٹری مسجد، جو ایک شریف آدمی ہے، سے ذکر کی، انہوں نے پیش امام صاحب کو ذکر کیا ہو یا نہ کیا ہو، مجھے اس کا علم نہیں، ایک دن نمازِ عشاء کے بعد امام صاحب نے

---

(۱) شامي ج:۱ ص:۶۶۰ (طبع ايج ايم سعيد). وفي الشامية ج:۲ ص:۳۹۸ وفي المتلقى وعن النبي صلى الله عليه وسلم أنه كره رفع الصوت عند قراءة القرآن والجنازة والزحف والتذكير. وفيها .... فالاسرار أفضل حيث خيف الرياء أو تأذى المصلّين .... الخ. وفي المرقاة شرح مشكوة ج:۲ ص:۳۵۷ (طبع مكتبه امداديه ملتان) قوله تعالى: "وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ .... الخ" ويسن الاسرار في سائر الأذكار أيضًا الّا في التلبية .... الخ. وراجع أيضًا الدر المختار ج:۱ ص:۵۱۹، ۵۲۳.

(۲) وفي الهندية ج:۵ ص:۳۱۶ (طبع مكتبه رشيديه كوئته) ولو قرأ القران فمر على اسم النبي صلى الله عليه وسلم وأصحابه فقراءة القرآن على تأليفه ونظمه أفضل من الصلوة على النبي صلى الله عليه وسلم في ذلك الوقت فان فرغ ففعل فهو أفضل .... الخ.

درسِ قرآن میں اسی آیت کو شروع کیا اور جو کچھ ان کے علم میں تھا، بیان کیا، اور شاید مجھ کو چغل خور کہا اور دیگر تنقیدیں کی، اب عرض یہ ہے کہ کیا اس بارے میں میں اس تنقید کا مستحق ہوں جو پیش امام صاحب نے میرے بارے میں بیان کی ہے؟

جواب:- آپ نے جتنی بات لکھی ہے اگر واقعہ صرف اتنا ہی ہے تو آپ کا کوئی قصور نہیں، امام صاحب نے بھی چغل خوری کا صریح الزام آپ پر نہیں لگایا، اگر ان کے دِل میں کسی وجہ سے آپ کی طرف سے کدورت پیدا ہوگئی ہو تو اسے ملاقات اور باہمی افہام وتفہیم سے دُور کردیجئے۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱/۲/۱۳۸۸ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۷۱/۱۹ الف)

(اس جواب کے بعد سائل کی طرف سے اسی بارے میں دوبارہ سوال آیا جو درج ذیل ہے) (مرتب)

سوال:- عرض ہے کہ دوبارہ ارسال ہے، آپ نے جو جواب دیئے ہیں وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ مولانا سے بڑا جھگڑا ہے، جھگڑا کوئی نہیں ہے جو امام صاحب سے ملاقات سے دُور کیا جاسکے، میں تو از روئے شرع چاہتا ہوں کہ:-

۱:- اُوپر والی آیت پڑھنے سے نماز میں خلل ہوتا ہے یا کہ نہیں؟

۲:- اس آیت کا اگر درس دیا جائے تو اس میں چغل خوری اور ریا کا ذکر ہے؟ جسے ذکر کرنا چاہئے، ان دونوں باتوں میں بھی شرعی جواب چاہتا ہوں۔

جواب ۱:- نماز کے بعد جبکہ لوگ نماز میں مشغول ہوں بلند آواز سے تلاوتِ قرآن یا تقریر نہیں کرنا چاہئے،[1] لہٰذا اگر امام صاحب نے اس وجہ سے آیت کو پڑھنا چھوڑ دیا تو انہوں نے ٹھیک کیا ہے، اس پر کسی کو اعتراض نہیں کرنا چاہئے۔

۲:- اس آیت میں تو چغل خوری اور ریاکاری کا ذکر نہیں ہے، لیکن اگر آیت کے ذیل میں کوئی بات آجائے اور یہ مسئلہ بیان کردیا جائے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ واللہ اعلم

۲۰/۶/۱۳۸۸ھ

---

(۱) دلائل کے لئے پچھلے صفحہ:۲۶۶ کا حاشیہ نمبر۱ ملاحظہ فرمائیں۔

جنات کو قید کرنے یا جلانے کا حکم

سوال:- عاملین لوگ جنات کو آگ میں جلا دیتے ہیں، حالانکہ یہ عذاب، اللہ رَبّ العزّت کے ساتھ مخصوص ہے، جنات کو آگ میں جلانا شریعتِ مطہرہ کی چار چیزوں یعنی قرآن، سنت، قیاس، اجماع سے ثابت کیا جائے۔ نیز عامل لوگ جنات کو ہانڈی یا بوتل میں مخصوص مدّت تک کے لئے قید کردیتے ہیں، پھر آزاد کرنے کے وقت جنات سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں کہ تم نے چونکہ ایک مسلمان کو ایذاء پہنچائی تھی اس بناء پر تمہیں قید کیا گیا، اب آزاد کیا جاتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی دُعا پر زد نہ آئے، اگر تم نے دوبارہ مخلوقِ خدا کو تنگ کیا تو پھر دوبارہ قید کرلئے جاؤگے۔ شریعتِ مطہرہ کیا اس کی اجازت دیتی ہے؟ فرق کرنے کی کوئی معقول تدبیر بیان فرمائیں۔

جواب:- اس بارے میں قولِ فیصل یہ ہے کہ اگر جنات کا اثر ان کو جلائے بغیر زائل ہوسکتا ہو مثلاً دَم کرنے یا دُعا کرنے سے یا ان کو مار کر یا دھمکا کر، تب تو قتل کرنا یا جلانا جائز نہیں، لیکن اگر وہ مذکورہ طریقوں سے نہ جائے تو قید کرنا یا قتل کرنا یا جلانا جائز ہے، البتہ عامل کو یہ چاہئے کہ پہلے نرم طریقے استعمال کرے اور جب اس بات کا اطمینان ہوجائے کہ یہ جن جلائے بغیر نہیں جائے گا، تب جلانے کا اقدام کرے، علامہ بدرالدین شبلی حنفی رحمۃ اللہ علیہ اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے علامہ ابوالعباس ابنِ شیبہؒ کے اس قول کی تصدیق کرتے ہیں کہ:-

یجوز بل یستحب وقد یجب أن یذب عن المظلوم وأن ینصر فان نصر المظلوم مأمور به بحسب الامکان واذا برئ المصاب بالدعاء والذکر وأمر الجن ونهیهم وانتهارهم وسبهم ولعنهم ونحو ذلک من الکلام حصل المقصود، وان کان ذلک یتضمن مریض طائفة من الجن أو موتهم فهم الظالمون لأنفسهم اذا کان الراقی الداعی المعالج لم یتعد علیهم کما یتعدی علیهم کثیر من أهل العزائم فیأمرون بقتل من لا یجوز قتله۔

(آکام المرجان فی غرائب الأخبار وأحکام الجان ص:۱۱۱، باب ۵۳، طبع نور محمد کارخانہ)

آگے علامہ شبلیؒ لکھتے ہیں: **فحاصل ذلک أنه متی حصل المقصود بالأهون لا یصار الی ما فوقه ومتی احتیج الی الضرب وما هو أشد منه صیر الیه ومن قتل الصائل من الجن قتل عائشةؓ الجنی الذی کان لا یزال یطلع فی بیتها۔** (ص:۱۱۴)

اور انہوں نے صفحہ:۲۰ پر باب۶ کے تحت سند سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابنِ عباسؓ نے ایک جن کو قتل کیا تھا، اور حکیم الأمت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جن کو جلانے کے

بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ ''اگر کسی تدبیر سے پیچھا نہ چھوڑے تو دُرست ہے، بہتر ہے کہ اس تعویذ میں یہ عبارت لکھ دیں کہ اگر نہ جائے تو جل جائے''۔[1]

واللہ اعلم
۱۳۷۷/۶/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۶۵۴/۲۸ ب)

جنیہ سے انسان کے نکاح کا حکم اور انسانوں پر جنات کے اثرات کی شرعی حیثیت

سوال:- ''البلاغ'' ۱۳۹۷ھ پڑھا تو کچھ نکات ایسے پائے گئے جن کی تشریح مطلوب ہے، مثلاً صفحہ:۱۴۰ پر ''کیا انسان کا نکاح جنی عورت سے ہوسکتا ہے؟'' کے عنوان کے تحت ساتویں سطر میں مذکور ہے کہ مسلمان مرد سے مسلمان جنیہ کا نکاح ہوا اور اس سے اولاد بھی ہوئی۔ اس میں شک وشبہ کی مطلقاً گنجائش ہی نہیں کہ جنات اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں اور یہ بات نص سے ثابت ہے، مگر جب جنات کو ناری مخلوق کہا گیا ہے اور وہ دیکھنے میں بھی نہیں آتے تو کس طرح انسان سے ان کا تعلق اور پھر میاں بیوی کی حد تک قائم رہ سکتا ہے؟ جنات میں مسلم وغیرمسلم کا مسئلہ واضح ہے، مگر سائنسی نقطۂ نظر سے نہ سہی تو بھی بغیر مدلل تشریح کے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جنیہ عورت اگر توالد کی اہل بھی ہے تو کیونکر انسانِ خاکی کے ساتھ بیوی کی حیثیت سے رہ سکتی ہے؟ اس لئے آپ سے گزارش ہے کہ آپ ''جنات کا انسانوں پر اثر'' کے عنوان کی تشریح فرمائیں۔ ہم اخبارات و رسائل میں پڑھتے ہیں اور عاملین حضرات کے قصے کو ایجنٹوں سے سنتے چلے آئے ہیں کہ جنات:-

الف:- غیب کی خبریں سناتے ہیں، مثلاً فلاں چیز چوری کرنے والا فلاں فلاں ہے اور فلاں جگہ رہتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

ب:- فلاں عامل نے جنات کو کوزے میں بند کر رکھا ہے، جس طرح سمندر کوزے میں بند کئے جانے کا محاورہ ہے۔

ج:- فلاں پیر نے چلہ کشی کے بعد جنات پر قابو پالیا ہے اور جنات اس کے تابع ہیں (گویا سلیمانِ ثانی ہیں)۔

د:- ڈاکٹروں نے مریض کو لاعلاج قرار دے دیا، مگر فلاں عامل نے مریض کو جنات کے زیرِ اثر بتایا اور علاج کر کے شفا دی۔ کچھ عرصہ قبل اخبارات میں اس مسئلے پر بڑی لے دے شروع ہوگئی تھی، بہرحال میں سمجھتا ہوں کہ جہاں تک مندرجہ بالا چند نکات کا تعلق ہے وہ کچھ یوں ہیں:-

---

(۱) امداد الفتاویٰ ج:۴ ص:۸۸، ۸۹۔

الف:- حضرت سلیمان علیہ السلام کے عصاء کو جب تک کیڑوں نے کھوکھلا نہ کردیا اور وہ نہ گر گئے جنات برابر کام کرتے رہے، لہٰذا غیب جاننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بلکہ انبیاء بھی غیب کا علم نہ جانتے تھے (حوالہ ''البلاغ'' ہذا ۱۳۱)۔

ب:- انگریز قوم بڑی توہم پرست ہے، انگلینڈ میں ایک بار ٹی وی پر بدرُوحوں کو لایا گیا (آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ یہ محض تصویری خاکے اور کیمرہ ٹرک تھی) اکثر نے یقین کرلیا کہ فی الحقیقت بدرُوحوں سے ملاقات کا شرف نصیب ہوا، شعبدہ بازی کے کئی کھیل دیکھے، انسانی ذہن کی تیزی، مسلسل مشق، لگاتار محنت اور لگن نے وہ وہ کرتب پیش کئے کہ عقل دنگ رہ گئی، مگر یہ سب کچھ شعبدہ باز کی مہارت کا نتیجہ تھا، ابنِ خلدون نے اس پر معرکۃ الاراء بحث کی ہے جو صحیح ہے، اور اس کا لب لباب وہی ہے جو اُوپر لکھ آیا ہوں۔ ایک مسلمان عالم تو کیا ایک دہریہ بھی یہ کچھ کرسکتا ہے جو ہمارے یہاں ڈبہ پیر اور عاملین کرتے ہیں کہ معلوم نہیں کہ راسپوتین (دُنیا کا سب سے بڑا بدکار) جو پیشین گوئی کرتا تھا پوری ہوجاتی تھی، ۱۹۳۳ء میں کشمیر کا ایک مسلمان (نام یاد نہیں رہا) نے انگلینڈ میں تین مقامات پر دہکتے ہوئے انگاروں پر ننگے پاؤں چل کر دِکھایا تھا، جبکہ ڈاکٹروں نے اس کے تمام جسم پر ایسی ادویات کا استعمال کیا تھا جس سے جسم پر ملی ہوئی کسی بھی دوائی کا اثر زائل ہوجایا کرتا ہے، مگر وہ کامران رہے، اس کے انٹرویوز لئے گئے تو اس نے بتایا کہ یہ اس کی خدا کی ذات پر کامل اعتماد کی ایک معمولی جھلک ہے اور اس اعتماد نے اس کی قوتِ ارادی کو ناقابلِ شکست بنادیا ہے۔ غرض اس طرح کے واقعات آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں مگر عاملین کا جنات کو کوزے میں بند کرلینا کیا شرعی حیثیت رکھتا ہے؟ جبکہ یہ بات بغیر ذہن پر زور دیئے سمجھ میں آجاتی ہے کہ خالد بن ولیدؓ زہر کھاکر کیوں نہ مرے، جبکہ اس زہر کو اگر کنویں میں حل کردیا جاتا تو ایک لشکر کی موت واقع ہوسکتی تھی، یا حضرت عمرؓ کا خطبہ کے دوران ساریہ کو آواز دے کر جبل کی جانب متوجہ کرنا بغیر تذبذب کے سمجھ میں آسکتا ہے۔

ج:- سائنس تسلیم کرے یا نہ کرے، عقل سمجھے یا نہ سمجھے مگر ہمارا ایمان ہے کہ حضرت سلیمانؑ کا جنات اور چرند پرند پر غلبہ تھا، اور وہ ان کی زبان سے بھی واقف تھے، واقعۂ ہدہد اس پر دال ہے، مگر یہ عاملین کیونکر سلیمان بن گئے؟ اس کی شرعی حیثیت پر بحث فرمایئے۔

د:- تشنج کی کئی اقسام ہیں، ایک ایسا مریض جس کی عمر کم اور وزن ۵۰/۶۰ پونڈ ہوتا ہے تشنج کی حالت میں اتنے زور کا مظاہرہ کرتا ہے کہ محسوس ہوتا ہے کہ کسی پہلوان سے واسطہ پڑ رہا ہو، پٹھوں کے تناؤ کی وجہ سے یہ حالت پیدا ہوجاتی ہے، مگر ہمارے یہاں کے عاملین نے اسے آگے گل سے بلبل کے پَر باندھنے کی سعادت یوں حاصل کی ہے کہ مریض پر جنات کا غلبہ ہے اور یہ سارا زور جنات یا ایک

جن (نر ہو یا مادہ) کا ہے وگرنہ ایسے کم عمر اور کم وزن رکھنے والے مریض میں اتنا زور کہاں سے آسکتا ہے؟ وغیرہ، جہاں تک ڈاکٹری علاج کا تعلق ہے وہ سائنس کا ایک پہلو ہے، اور یہ بات آپ پر عیاں ہے کہ سائنس کافی حد تک ثبوت تو دیتی ہے مگر عقیدہ نہیں دے سکتی، جبکہ فلسفہ نہ ثبوت دیتا ہے اور نہ ہی عقیدہ، جبکہ مذہب ثبوت بھی دیتا ہے اور عقیدہ بھی (مگر اسلام کے لئے لفظِ ''مذہب'' کا استعمال دُرست نہیں سمجھتا، اس لئے کہ اسلام دین ہے، جبکہ مذہب ایک حصہ جیسے آنکھ، کان، ناک وغیرہ ایک جسم کے مختلف حصے ہیں) سائنس کے تابع ڈاکٹری علم نے اگر مریض کو لاعلاج کردیا تو بات سمجھ میں آسکتی ہے، فلسفے نے اگر کچھ مزید گرہیں لگائی ہیں تو بھی سمجھ میں آنے والی بات ہے، مگر دین نے اگر صرف عاملین کو یہ اختیار دے دیا ہے کہ وہ جنات پر حکمرانی کریں اور چاہیں تو جیب میں ڈالے پھریں، تو یہ سب کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

قرآن مجید، احادیث دونوں میں سے کوئی بھی ہو، اس کا اثر ظاہر و باہر ہے، خدا کا کلام تو افضل ترین کلام ہے، اس کا اثر ہوتا ہے اور ہوگا بھی، مگر عاملین جس طرح بتاتے ہیں وہ یہ ہے کہ انہیں چلہ کشی کے دوران جنات کو قابو کرنے کی صلاحیت ملی اور وہ جنات کو قابو کرسکتے ہیں اور ان کا انسانی جسم پر اثر زائل کرسکتے ہیں، گویا عامل کا چلہ دافعِ بلا ہے نہ کہ کلام اللہ، آپ یہ واضح کریں کہ انسانی جسم پر جن کا اثر کیونکر ہوسکتا ہے؟ اور اگر ہوسکتا ہے تو کس حد تک؟ اور پھر جنات کو قابو میں لایا جانا کس طرح ثابت ہے؟ جبکہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ قرآن و حدیث اور دیگر علوم از قسم فقہ، صرف ونحو وغیرہ کے بجائے ہمیں ہماری نانیاں دادیاں جنوں، پریوں کے قصے بچپن میں سناتی رہی ہیں، ان داستانوں کا لازمی نتیجہ و نفسیاتی اثر ہوتا ہے جو بڑے ہوکر لاشعور میں موجود رہتا ہے۔ پھر ہسٹریا کی ایک مریضہ کے اصلی علاج کی بجائے اسے عامل کی بدکرداری کے سامنے لاڈالا جاتا ہے اور وہ بے ضمیر، گندم، کاجو فروش، سلیمانِ ثانی ہونے کا مدعی، چند سکوں کے لالچ میں جنات کا اثر بتاکر ایک انسان کی زندگی کی خوشیاں لوٹ لیتا ہے۔ میرے بیان کردہ ان چار نکات کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب:- جواب میں تاخیر ضرور ہوئی، لیکن آپ کا سوال قدرے تفصیل چاہتا تھا، جس کی فرصت اس سے پہلے نہ مل سکی، اب آپ کے سوال کا جواب پیشِ خدمت ہے۔

۱:- جہاں تک انسان اور جنیہ کے درمیان نکاح کا تعلق ہے، شریعت میں اس کی اجازت تو نہیں ہے لیکن جہاں تک اس کے عقلی امکان کا تعلق ہے اس میں کوئی بات غیرممکن نہیں ہے، علامہ بدرالدین شبلیؒ معروف محقق عالم ہیں، انہوں نے اپنی کتاب "آکام المرجان فی غرائب الأخبار وأحکام الجان" کے باب ۳۰ میں صفحہ:۶۶ پر اس مسئلے پر مفصل بحث کی ہے۔

اور آپ نے جو اعتراض کیا ہے خاکی انسان کا نکاح ناری جن سے کیسے ہوسکتا ہے؟ اس کا یہ جواب دیا ہے کہ انسان بے شک خاکی اور جن بے شک ناری ہیں، لیکن جس طرح انسانوں میں سب سے پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام خاک سے پیدا کئے گئے لیکن ان کے بعد جب توالد و تناسل جاری ہوا تو ہر انسان براہِ راست خاک سے پیدا نہیں کیا گیا، بلکہ اس میں تمام عناصر کارفرما رہے، اسی طرح جنات میں سب سے پہلا جن جس کا قرآنی نام ''الجان'' ہے، براہِ راست آگ سے پیدا کیا گیا تھا، اس کے بعد تمام جنات توالد و تناسل سے پیدا ہوتے رہے اور ان میں بھی انسانوں کی طرح دُوسرے عناصر کارفرما رہے ہیں، لہٰذا اب جنات مطلقاً آگ یا حرارت کا پیکرِ مجسم نہیں ہوتے بلکہ ان میں حرارت و برودت کا اعتدال ہوتا ہے، اس بناء پر عقلی طور سے انسان اور جن کے درمیان جنسی اختلاط ممکن ہے۔[1]

علامہ شبلیؒ نے اس پر یہ استدلال بھی کیا ہے کہ قرآنِ کریم نے جنت کی حوروں کے بارے میں یہ فرمایا ہے کہ: ''لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ''[2] یعنی ان کو جنتیوں سے پہلے نہ کسی انسان نے چھوا اور نہ کسی جن نے۔ اگر جن و اِنس کے درمیان اختلاط عقلاً ناممکن ہوتا تو یہاں جن کے ذکر کی ضرورت نہ تھی۔

خلاصہ یہ کہ عقلاً نکاح ہونا غیرممکن نہیں، اور علامہ شبلیؒ نے اس پر سند کے ساتھ کچھ واقعات بھی لکھے ہیں کہ جنات و انسان کے درمیان شادیاں ہوئیں، ان واقعات کے بارے میں یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے، لیکن ان کو عقلاً ناممکن نہیں کہا جاسکتا، اور معارف القرآن میں بھی صرف اتنی ہی بات کہی گئی ہے۔

۲:- دُوسرا مسئلہ آپ نے یہ اُٹھایا ہے کہ جنات کے انسانوں پر چڑھ جانے اور انسانوں کے ان کو تابع بنالینے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ اتنی بات تو قرآن و حدیث کے قطعی دلائل سے ثابت ہے کہ ''جن'' انسانوں سے الگ ایک مخلوق ہیں، وہ عام نظروں کو نظر نہیں آتے، اور ان میں مؤمن و کافر، صالح و فاسق ہر طرح کے ہوتے ہیں، لہٰذا اتنی بات پر تو ایمان رکھنا ضروری ہے، رہا یہ کہ وہ انسانوں کو پریشان کرنے کے لئے ان پر چڑھ جاتے ہیں یا نہیں؟ نیز یہ کہ جو عاملین انہیں اُتارنے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ صحیح ہے یا نہیں؟ سو یہ کوئی ایمانیات کا مسئلہ نہیں جس پر ایمان رکھنا ضروری ہو، بلکہ واقعات کا مسئلہ ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ہر زمانے میں جنات کے انسانوں کو پریشان

---

(۱) جنیہ سے انسان کے نکاح سے متعلق تفصیل کے لئے دیکھئے معارف القرآن ج:۶ ص:۵۷۲۔

(۲) سورۃ الرحمٰن: ۵۶ و ۷۴۔

کرنے کے واقعات اتنی کثرت سے ہوتے ہیں کہ ان کا انکار مشکل ہے،[1] ایک واقعہ تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سنایا ہے جو شمائل ترمذی میں موجود ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''بنو عذرہ'' قبیلے کا ایک شخص جس کا نام خرافہ تھا، اسے جنات پکڑ کر لے گئے تھے، وہ ایک عرصے تک جنات کے درمیان مقیم رہا، پھر وہی اسے انسانوں کے پاس چھوڑ گئے، اب وہ واپس آنے کے بعد عجیب عجیب قصے سنایا کرتا تھا، اس لئے لوگ (ہر عجیب بات کو) خرافہ کا قصہ کہنے لگے۔

(شمائل ترمذی ص:۲۱ باب ما جاء في كلام رسول الله صلى الله عليه وسلم في السحر)

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جن اُتارنے کے واقعات بھی بعض روایات میں موجود ہیں، چنانچہ ابوداؤد، مسند احمد اور معجم طبرانی وغیرہ میں یہ حدیث مروی ہے کہ:-

عن أم أبان بنت الوازع عن أبيها أن جدها انطلق الى رسول الله صلى الله عليه وسلم بابن له مجنون أو ابن أخت له فقال: يا رسول الله! ان معي ابنا لي أو ابن أخت لي مجنون أتيتك به لتدعو الله تعالى له، قال: ائتني به، قال: فانطلقت به اليه وهو في الركاب فأطلقت عنه وألقيت عليه ثياب السفر وألبسته ثوبين حسنين وأخذت بيده حتّى انتهيت الى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: أدنه مني واجعل ظهره مما يليني، قال: فأخذ بمجامع ثوبه من أعلاه وأسفله فجعل يضرب ظهره حتّى رأيت بياض ابطيه ويقول: أخرج عدو الله فأقبل ينظر نظر الصحيح ليس بنظر الأوّل .... الخ. (آكام المرجان ص:۱۱۳ باب ۵۳)

اُمِّ ابانؓ اپنے والد سے روایت کرتی ہیں کہ ان کے دادا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنے ایک مجنون (اس کے معنی پاگل بھی ہوسکتے ہیں اور جن زدہ بھی) بیٹے یا بھتیجے کو لے گئے اور عرض کیا کہ ''یارسول اللہ! میں اپنے اس بیٹے یا بھتیجے کو جو مجنون ہے دُعا کے لئے لایا ہوں''، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اسے میرے پاس لے آؤ''، میں آپؐ کے پاس لے گیا، آپؐ نے فرمایا کہ ''اسے مجھ سے قریب کردو اور اس کی پشت میری طرف کردو''، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے کپڑے پکڑ کر اس کی پشت پر مارنا شروع کیا یہاں تک کہ مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بغلوں کی سفیدی دِکھائی دینے لگی، آپؐ مارتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے کہ: ''او دُشمنِ خدا نکل!'' چنانچہ وہ تھوڑی دیر میں تندرستوں کی طرح دیکھنے لگا....الخ۔

لہٰذا اگر کسی پر جن کا اثر ہوجائے تو اس کا علاج عملیات کے ذریعہ کرنا نہ عقلاً ناممکن ہے، اور

(۱) وفي كتاب الروح ص:۴۶۵ ان تداخل الأجسام المحال أن يتداخل جسمان كثيفان احداهما في الأخرة بحيث يكون حيزهما واحدًا وأما أن يدخل لطيف في كثيف يسري فيه فهذا ليس بمحال.

نہ شرعاً ناجائز، بشرطیکہ اس میں کوئی خلافِ شرع طریقہ اختیار نہ کیا جائے[۱]، اور اگر کسی شخص کو جن اُتارنے کا طریقہ آتا ہو تو اسے قدرتِ خداوندی میں دخل اندازی نہیں کہا جاسکتا، جس طرح بیماری کے جراثیم مارنے پر انسان کو قدرت دی گئی ہے، اگر اللہ تعالیٰ نے جن اُتارنے پر بھی کسی کو قدرت دے دی ہو تو کیا بعید ہے؟ البتہ جنات کو غلام بنالینا اگرچہ عقلاً ممکن ہے لیکن شرعاً جس طرح آزاد انسان کو اسبابِ شرعیہ کے بغیر غلام بنانا جائز نہیں، اسی طرح آزاد جنات کو غلام بنانا بھی دُرست نہیں[۲]، البتہ ایک تو یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اس مسئلے کا تعلق ایمانیات سے نہیں واقعات سے ہے۔ دُوسرے جو عامل یہ دعویٰ کرے کہ جنات اس کو مستقبل کی غیبی خبریں دیتے ہیں وہ باطل ہے۔ تیسرے یہ کہ جنات کو قابو میں کرنے کے لئے بہت سی سفلی اعمال جادُوگر کرتے ہیں جن کا مقصد شیاطین کو خوش کرنا ہوتا ہے، وہ باجماعِ اُمت حرام اور ناجائز ہیں۔ چوتھے یہ کہ اس مقصد کے لئے ایسے منتر پڑھنا جس کے معنی سمجھ میں نہ آتے ہوں یہ بھی ناجائز ہے۔[۳]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۹ھ
(فتویٰ نمبر ۴۳۴/ ۲۸ ب)

بے پردہ خاتون سے جھاڑ پھونک کرانے کا حکم

سوال:- مندرجہ ذیل طریقے سے جھاڑ پھونک کرنا یا اس سے استفادہ کرنا از روئے شریعت جائز ہے یا نہیں؟ ایک غیر شادی شدہ بالغ خاتون جنھوں نے یہ طریقہ نکالا ہے کہ ان کے اعلان کے مطابق کوئی ولی یا سائیں بابا کا سایہ ان پر ہوگیا ہے اور اس ولی یا سائیں بابا نے خاتون کو یہ حکم دیا ہے کہ ان کے حکم سے تم انسانیت کی خدمت کرو، یہ بات ظاہر نہیں ہوئی کہ یہ سائیں بابا زندہ ہیں یا مردہ؟ بلکہ خاتون سے جب بھی اس کے متعلق پوچھا گیا تو فرماتی ہیں کہ انہیں یہ بتانے کی اجازت نہیں۔ طریقۂ علاج یہ ہے کہ یہ خاتون بناؤ سنگھار کرکے بے پردہ بیٹھ جاتی ہیں اور ہر آنے والے سے خواہ وہ مرد ہو یا عورت اس کا حال پوچھتی ہیں، مریض اپنا حال بتاتا ہے، خاتون کے سامنے پھولوں کا ہار ٹنگا ہوا

---

(۱) وفي مشكوة المصابيح كتاب الطب والرقى ص:۳۸۸ (طبع قديمى كتب خانه) عن عوف بن مالك الأشجعي قال: كنا نرقي في الجاهلية فقلنا: يا رسول الله! كيف ترى في ذلك؟ فقال: اعرضوا على رقاكم لا بأس بالرقى ما لم يكن فيه شرك. (رواه مسلم). وفي الشامية ج:۶ ص:۳۶۳ ولا بأس بالمعوذات اذا كتب فيها القران أو أسماء الله تعالى (الى قوله) وانما تكره العوذة اذا كانت بغير لسان العرب ولا يدرى ما هو ولعله يدخله سحر أو كفر أو غير ذلك واما ما كان من القرآن أو شئ من الدعوات فلا بأس به. (تفصیل کے لئے تکملة فتح الملهم ج:۴ ص:۳۱۷ ملاحظہ فرمائیں)۔

(۲) جنات کو تابع بنانے کے شرعی حکم سے متعلق مزید تفصیل کے لئے معارف القرآن ج:۷ ص:۲۶۵ ملاحظہ فرمائیں۔ (مرتب عفی عنہ)

(۳) دیکھئے اسی صفحے کا حاشیہ نمبر ۱ و ۲۔

ہوتا ہے جس کے متعلق خاتون کا کہنا ہے کہ وہ ولی یا سائیں بابا اس ہار کے سامنے براجمان ہوتے ہیں جنھیں صرف وہ خاتون ہی دیکھ سکتی ہیں، کوئی دُوسرا شخص اس ولی یا سائیں بابا کی آواز نہیں سن سکتا۔ خاتون، مریض کا حال اس ہار کی طرف رُخ کرکے دُہراتی ہیں اور تھوڑی دیر منتظر رہتی ہیں گویا انہیں کوئی خاموش پیغام مل رہا ہے، پھر مریض کو بتاتی ہیں کہ سائیں بابا نے کہا ہے کہ تمہارا مسئلہ حل ہوجائے گا۔
سائل کو دو باتیں از روئے شرع غلط محسوس ہوئیں:-

۱:- اسلام میں پردہ بنیادی حکم ہے، مگر یہ خاتون صرف بے پردہ ہی نہیں بلکہ پوری طرح میک اَپ کرکے مجلس میں بیٹھتی ہیں اور ہر ایک سے بے حجابانہ گفتگو کرتی ہیں، مزید یہ کہ جب پردے کی طرف توجہ دلائی گئی تو فرماتی ہیں کہ سائیں بابا نے ان کو اس کی اجازت دے رکھی ہے۔ بلکہ بے پردگی کا یہ عالم ہے کہ ان کی مکمل میک اَپ میں تصویریں اخبارات اور رسائل میں چھپتی ہیں۔

۲:- مریضوں سے سوال و جواب کے درمیان یہ بتانا کہ ''سائیں بابا نے یہ فرمایا ہے کہ تمہارا مسئلہ حل ہوجائے گا'' گویا براہِ راست علمِ غیب کا دعویٰ ہے، جبکہ علمِ غیب صرف اللہ کو ہے۔

مجھے فتویٰ کی ضرورت اس لئے بھی پڑی ہے کہ میری بچی کافی دنوں سے بیمار ہے، علاج جاری ہے، مسنون دُعائیں پڑھ کر دَم کرتا ہوں یا کسی کے متعلق یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ جائز طریقے سے علاج کرتے ہیں تو ان کے پاس بھی حاضر ہوتا ہوں، مذکورہ خاتون کی شہرت سن کر ارادہ ہوا کہ میں بھی اپنی بچی کو لے کر ان کے پاس جاؤں مگر ان کا طریقہ دیکھ کر مجھے اُلجھن ہوگئی، لہٰذا مذکورہ خاتون کے بارے میں شرعی فتویٰ کیا ہے؟ خاتون کا دعویٰ رُوحانیت اور یہ اعلان کرنا کہ ان پر اللہ تعالیٰ کے کسی ولی یا سائیں بابا کا سایہ ہوگیا ہے اور وہ ان کے حکم سے انسانیت کی خدمت کر رہی ہیں جبکہ دُوسری طرف طریقہ غیرشرعی ہے، نیز یہ کہ جب ان سے یہ سوال کیا گیا کہ یہ قوتِ رُوحانی یا سائیں بابا کا سایہ ان پر ان کے کسی خاص عملیات یا ریاضت کی وجہ سے حاصل ہوا؟ تو جواب نفی میں ملا، خاتون کا کہنا ہے کہ انہوں نے کوئی عمل یا ریاضت نہیں کی، براہِ کرم جواب دیں کہ اس خاتون کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟

جواب:- مذکورہ خاتون سے علاج کروانا اور اس غرض سے اس کے پاس جانا جائز نہیں، اور جن دو غلط باتوں کا سائل نے ذکر کیا ہے وہ بلاشبہ غلط اور گناہ ہیں، اور اس کی غیب کی بتلائی ہوئی باتوں پر بحیثیت غیب یقین کرنا کفر ہے، مذکورہ خاتون کا بے پردہ، بناؤ سنگھار کے ساتھ مردوں کے سامنے بیٹھنا شریعت کے بالکل خلاف ہے، اور اس خلافِ شریعت عمل پر سائیں بابا کی طرف سے اجازت کا ذکر، اس بات کی دلیل ہے کہ یا تو ان کا دعویٰ غلط ہے یا انہیں کوئی شیطان بہکا رہا ہے، ایسی صورت

میں ان کی باتوں کا یقین کر کے ان پر عمل کرنا جائز نہیں اور نہ ایسے لوگوں سے علاج کرانا دُرست ہے۔

واللہ اعلم

۱۳۸۵/۵/۲۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۴۹/۳۶ د)

چور یا گم شدہ چیز معلوم کرنے کے لئے منتر اور ٹوٹکے معتبر ہیں یا نہیں؟

سوال:- چور یا گم شدہ چیز معلوم کرنے کے بارے میں بعض ٹوٹکے اور منتر حیلے وغیرہ شرعاً دُرست ہیں یا نہیں؟ اور کیا یہ معتبر ہیں یا نہیں؟

جواب:- اس قسم کے اعمال شرعاً حجت نہیں ہیں، ان پر اعتماد نہ کرنا چاہئے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی

۱۳۸۷/۱۰/۲۹ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۳۲۵/۱۸ الف)

قبرستان میں قبلہ رُو ہوکر ہاتھ اُٹھاکر دُعا کرنا

سوال:- صلوٰۃِ جنازہ کے متصل بعد دُعا ثابت نہیں، مُسلَّم ہے، اور بعد الدفن دُعا مسنون ہے، مگر وضاحت طلب امر یہ ہے کہ بعد الدفن اور بعد پڑھنے سورۂ بقرہ کا اوّل و آخر، جو دُعا کی جاتی ہے آیا اس میں ہاتھ اُٹھاکر دُعا کرنی چاہئے یا ہاتھ چھوڑ کر؟ قبل ازیں تو دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھاکر دُعا کرتے کراتے رہے، مگر حضرت مولانا خیر محمد صاحب مرحوم کی نمازِ حنفی مترجم نظر سے گزری، جس میں درج ہے کہ بغیر ہاتھ اُٹھائے دُعا کرنی چاہئے جبکہ اس کے مقابل حافظ ابنِ حجرؒ نے صحیح ابی عوانہ سے فتح الباری ج:۱۱ ص:۱۲۲ میں حدیث: عن ابن مسعود رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی قبر عبداللہ ذی البجادین. الحدیث. وفیہ فلما فرغ من دفنہ استقبل القبلۃ رافعًا یدیہ، سے ثابت ہوتا ہے کہ ہاتھ اُٹھاکر دُعا فرمائی ہے، جو بات سنت یا مستحب ہو بحوالہ کتب ارشاد فرمادیں کہ آیا بعد الدفن ہاتھ اُٹھاکر دُعا کرنی چاہئے یا چھوڑ کر؟

جواب:- قبرستان میں قبلہ رُو ہونے کی صورت میں ہاتھ اُٹھاکر دُعا کرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت اور جائز ہے، صحیح مسلم میں لیلۃ البراءۃ کا واقعہ بیان کرتے ہوئے حضرت عائشہؓ

(۱) دیکھئے: فتاویٰ رشیدیہ ص:۲۲۱، والقول الجمیل مؤلفہ حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ بحوالۂ مذکورہ، اور امداد الفتاویٰ ج:۴ ص:۸۸۔

فرماتی ہیں:-

حتّی جاء البقیع فقام فاطال القیام ثم رفع یدیه ثلاث مرات. (ج:۱ ص:۳۱۳ قبیل کتاب الزکوۃ)۔[1]

اس کے تحت علامہ نوویؒ لکھتے ہیں: فیه استحباب اطالة الدعاء وتکریره ورفع الیدین فیه۔ اور حنفیہ کے اُصول پر بھی مسئلہ یہی ہے، چنانچہ علامہ ابنِ نجیمؒ لکھتے ہیں: ویکره عند القبر کل ما لم یعهد من السنّة والمعهود منها لیس الا زیارتها والدعاء عندها قائما کما کان یفعل صلی اللہ علیه وسلم فی الخروج الی البقیع. (البحر الرائق)۔[2]

اور اُوپر گزر گیا کہ بقیع میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے رفعِ یدین ثابت ہے، اس کے علاوہ صحیح ابوعوانہ کی جو حدیث آپ نے نقل فرمائی ہے وہ فتح الباری کی "کتاب الاستیذان باب الدعاء مستقبل القبلة" کے تحت حافظؒ نے نقل کی ہے، اور اس پر سکوت کیا ہے، وہ بھی اس کی دلیل ہے، حکیم الاُمت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی پر فتویٰ دیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں: فی ردّ المحتار: اداب زیارة القبور "ثم یدعوا قائمًا طویلًا"۔[3] اس سے دُعا کا جائز ہونا ثابت ہوا، اور ہاتھ اُٹھانا مطلقاً آدابِ دُعا سے ہے، پس یہ بھی دُرست ہوا، (امداد الفتاوی)۔[4]

لہٰذا اصل مسئلہ تو یہی ہے کہ رفعِ یدین جائز ہے، البتہ اکابرِ دیوبند کا عام معمول ترکِ رفع کا رہا ہے، جس کی وجہ غالبًا یہ تھی کہ ہندوستان میں قبر پرستوں کی کثرت تھی جو صاحبِ قبر سے دُعائیں مانگتے تھے، ان کے ساتھ تشبہ سے پرہیز کے لئے وہ ہاتھ اُٹھائے بغیر دُعا کر لیتے تھے، لیکن کسی نے رفعِ یدین کو ناجائز بھی نہیں کہا، بلکہ بعض مستند علمائے دیوبند کو احقر نے خود ہاتھ اُٹھا کر دُعا کرتے دیکھا ہے، لہٰذا حضرت مولانا خیر محمد صاحبؒ نے جو بات لکھی ہے وہ مبنی بر احتیاط ہے، رفعِ یدین کے ناجائز ہونے کی بنا پر نہیں، هذا ما عندی!

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۱۰/۳ھ

(فتویٰ نمبر ۳۱۶/۲۸ ب)

تعویذ کے ذریعہ علاج کرانے کا حکم

سوال:- گزارش یہ ہے میری اہلیہ عرصہ ۱۴ سال سے تکلیف میں ہے، حالت بدلتی رہتی ہے،

---

(۱) (طبع قدیمی کتب خانه).
(۲) البحر الرائق ج:۲ ص:۱۹۶ (طبع سعید).
(۳) شامیة ج:۲ ص:۲۴۲.
(۴) امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۵۰۰.

سر کا گھٹنا اور ایسا محسوس کرنا کہ پھٹ جائے گا، ٹانگوں میں ایسا محسوس ہونا کہ کوئی کاٹ رہا ہے، پورے جسم کا ٹھنڈا ہونا یا جلتا ہوا محسوس ہونا، گھر سے بھاگنے کی سعی کرنا، کپڑے پھاڑ لینا، جسم پر ورم ہونا، جسم کا لطیف ہونا، پورے جسم یا کندھوں پر انتہائی بوجھ محسوس ہونا، کچھ ایسی حرکتیں محسوس ہونا جن کا تذکرہ نہیں کیا جاسکتا، اور مدینہ طیبہ کی طرف جاتے وقت ایسی غلط باتیں ذہن میں آتی ہیں کہ آدمی ایمان سے جائے، اور کبھی راستے سے واپس آنے کو کہتی ہے، اس قسم کی مختلف حالتیں ہوتی ہیں، بعض اوقات بے چینی ایسی ہوتی ہے کہ اِدھر اُدھر بھاگنے لگتی ہے، اس کا علاج ڈاکٹروں سے بہت کرایا لیکن آرام آنے کے بجائے ان دواؤں کے جسم پر اور اثرات ہوئے، ڈاکٹروں نے کہا کہ رُوحانی علاج کراؤ، ۱۹۷۸ء سے مختلف لوگوں سے رُوحانی علاج بھی کرائے اس علاج میں وہ تعویذ باندھنے، پینے یا جلانے کے لئے دیتے ہیں، کوئی ہمیں ایسا رُوحانی پیشوا نہیں ملا جو بغیر تعویذات کے علاج کرے، میرے بچوں پر بھی مختلف کیفیات ہوتی ہیں، ان کا علاج بھی رُوحانی کرانے سے کچھ افاقہ ہوتا ہے، یہاں کے انگریزی اخبار میں تعویذوں کے استعمال کے بارے میں استفتاء پر ایسی باتیں لکھی ہیں جس سے میں انتہائی پریشان ہوگیا ہوں، اس کے مطابق تعویذوں کا استعمال اسلام میں ممنوع ہے۔

میں آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ آپ اس سلسلے میں میری رہبری فرمائیں، کیا میں اپنی بیوی اور بچوں کا علاج تعویذات کے ذریعے کراسکتا ہوں؟ اگر نہیں کراسکتا تو میرے لئے اور کوئی راستہ بتائیں کیونکہ بیوی اور بچوں کے علاج کا میں ذمہ دار ہوں۔ سائل:- عبدالوحید، جدہ سعودی عرب

جواب:- تعویذ کے ذریعے علاج کرانا شرعاً جائز ہے[۱]، بشرطیکہ تعویذ میں جو کلمات لکھے جائیں ان کے معنیٰ معلوم ہوں[۲]، اور ان میں کوئی بات مشرکانہ نہ ہو، مثلاً آیاتِ قرآنی پر مشتمل تعویذ میں کچھ حرج نہیں ہے[۳]۔ سعودی عرب کے بعض علماء تعویذوں کی ممانعت کے بارے میں جو احادیث پیش کرتے ہیں ان سے مراد ایسے تعویذ ہیں جن میں مشرکانہ باتیں ہوں[۴]، یا جن کو اللہ تعالیٰ کے بجائے بذاتِ خود شافی سمجھا جائے، ورنہ آیاتِ قرآنی کا دَم کرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اور تعویذ لکھ کر

(۱ تا ۴) وفی مشکوۃ المصابیح ج:۲ ص:۳۸۸ (طبع قدیمی کتب خانه) عن عوف بن مالک الأشجعیؓ قال: کنّا نرقی فی الجاهلیة فقلنا: یا رسول الله! کیف تری فی ذلک؟ فقال: اعرضوا علیّ رقاکم، لا بأس بالرقی ما لم یکن فیه شرک. رواه مسلم (ج:۲ ص:۲۲۴ طبع قدیمی کتب خانه). (وکذا فی أبی داؤد ج:۲ ص:۱۸۶ طبع مکتبه حقانیه ملتان). وفی الشامیة ج:۶ ص:۳۶۳ (طبع ایچ ایم سعید) ولا بأس بالمعوذات اذا کتب فیها القران، أو أسماء الله تعالٰی .... وانّما تکره العوذة اذا کانت بغیر لسان العرب، ولا یدری ما هو ولعله یدخله سحر أو غیر ذلک، وأما ما کان من القران أو شیٔ من الدعوات فلا بأس به .... الخ.

نیز مکمل تفصیل کے لئے حضرتِ والا دامت برکاتہم کی ہی تصنیف تکملة فتح الملهم ج:۴ ص:۳۱۷ ملاحظہ فرمائیں۔

پلانا یا لٹکانا حضراتِ صحابہؓ وتابعینؒ سے ثابت ہے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۱۱/۹/۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۱۷/۴۷)

قرآنِ کریم کے نقش کے علاوہ کسی اور تعویذ کا حکم

سوال:- میرے ماموں زاد بھائی کہتے ہیں کہ نقشِ قرآن مجید کے علاوہ باقی نقوش وتعویذ کا احادیث سے ثبوت نہیں، میں نے کہا کہ بزرگوں کے تجربات ہیں ان سے بھی مخلوق کو فائدہ پہنچتا ہے، لیکن وہ تسلیم نہیں کرتے، لہٰذا کیا حکم ہے؟

جواب:- جن تعویذوں میں کوئی خلافِ شرع بات نہ ہو وہ جائز ہیں، تعویذ میں صرف قرآنی آیات درج کرنا ہی ضروری نہیں۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۰/۹/۲۵ھ

ماہواری کی حالت میں تلاوت اور ذکر کا حکم

سوال:- کیا ایامِ ماہواری میں عورت، سورت یا کلمہ، دُرود وغیرہ پڑھ سکتی ہے؟

جواب:- قرآنِ کریم کی تلاوت تو بالکل نہیں کر سکتی، کلمہ اور دُرود پڑھنے میں مضائقہ نہیں۔[3]

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۷/۲ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۶۲/۱۹ الف)

اسم ''بدوح'' کی تحقیق

سوال:- ''یا بدوح'' یہ کیا اللہ کا نام ہے؟ جبکہ تلاش کے بعد بھی معلوم نہ ہو سکا۔

جواب:- ''یا بدوح'' قرآن میں تو یہ نام نہیں ہے، مگر بعض اہلِ علم نے لکھا ہے کہ عبرانی

(۱،۲) مسلم شریف بعد کتاب الطب والمرض والرقی ج:۲ ص:۲۲۴ (تکملة فتح الملهم ج:۴ ص:۳۱۷ طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)۔ فتاوی شامیة ج:۶ ص:۳۶۳،۳۶۴۔ عبارات سابقہ فتویٰ کے حاشیہ میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) فی الهندیة ج:۱ ص:۳۸ ومنها حرمة قراءة القران لا تقرأ الحائض والنفساء والجنب شیئًا من القران والآیة وما دونها سواء فی التحریم علی الأصح، وفیه أیضًا ج:۱ ص:۳۸ ویجوز للجنب والحائض الدعوات وجواب الأذان ونحو ذٰلک. وکذا فی الدر المختار ج:۱ ص:۲۹۳ ولا بأس لحائض وجنب بقراءة أدعیة ومسها وحملها وذکر الله تعالٰی وتسبیح. (و بہشتی زیور ج:۲ ص:۱۸۳)۔

زبان میں اللہ کا نام ہے۔[1]

فقط واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۷/۲ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۶۲/۷/۱۹ الف)

ناچاقی دُور کرنے کے لئے شوہر پر تعویذ کرنے کا حکم

سوال:- زید کی بہن عمر کے نکاح میں عرصہ ۱۰ یا بارہ سال سے ہے، اور ہر طرح فرمانبردار اور اطاعت گزار ہے، لیکن عمر اسے ہمیشہ مارتا پیٹتا ہے، اور تکلیف اور آزار پہنچاتا ہے، زید اور اس کی بہن صبر سے کام لیتے ہیں، مگر اس ظالم پر کچھ بھی اثر نہیں ہوتا، طلاق حاصل کرنا چند وجوہات کی بناء پر مشکل ہے، اس صورت میں عملیات سے عمر کو مطیع کرنا یا سرزنش کرنا جائز ہے یا نہیں؟ یا اور کوئی صورت ہو تو بتلا دیں۔

جواب:- سب سے اچھا راستہ تو یہ ہے کہ عمر کے لئے خوش خلقی کی دُعا کیجئے اور نرمی اور فہمائش سے راہِ راست پر لانے کی کوشش کی جائے، لیکن اگر یہ چیزیں کارگر نہ ہوں تو کسی دیندار اور پابندِ شرع عامل سے ایسے تعویذ وغیرہ لینے میں کوئی حرج نہیں[2] جن سے شوہر کے دِل میں بیوی کی محبت پیدا ہو جائے، لیکن تعویذات وعملیات کے ذریعہ اسے نقصان پہنچانا ہرگز جائز نہیں سخت گناہ ہے۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۱۷ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۸/۱۹ الف)

رمضان میں تراویح کے بعد وعظ کرنے اور چالیس مرتبہ صلوٰۃ وسلام پڑھنے کا حکم

سوال:- چند سالوں سے ہمارے شہر گلوسٹر برطانیہ میں رمضان شریف میں یہ دستور چلا آرہا ہے کہ روزانہ تراویح کی نماز کے بعد تھوڑی دیر کے لئے کچھ وعظ و بیان ہوتا ہے، جس کے بعد امام

(۱) لفظ "بدوح" (بفتح باء، وتخفیف دال) کی مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: فتاویٰ دار العلوم دیوبند (امداد المفتین) ص:۲۳۸، وفتاویٰ دارالعلوم دیوبند (عزیز الفتاویٰ) ص:۱۲۹۔

(۲) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۲۷۸ اور اس کا حاشیہ۔

صاحب چالیس صلوٰۃ وسلام کو جہراً پڑھتے ہیں اور باقی حضرات سنتے ہیں، اس کے بعد دُعا ہوتی ہے، سوال یہ ہے کہ دُرود شریف پڑھنے کا یہ طریقہ شرعاً جائز ہے؟

جواب:- یہ طریقہ فی نفسہٖ جائز ہے، البتہ چالیس صلوٰۃ وسلام جہراً پڑھنے کا ایسا التزام و اہتمام جائز نہیں جس سے ایسا کرنے کے مسنون یا ضروری ہونے کا شبہ ہو، لہٰذا مناسب یہ ہے کہ اس کی پابندی نہ کی جائے، کبھی کرلیں، کبھی چھوڑ دیں، نیز بہتر یہ ہے کہ دُرود شریف آہستہ پڑھا جائے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۲۰/۱۰/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۴۰۰/۵)

کیا ظاہری اسباب نہ ہونے کی صورت میں بھی دُعا کا اثر ہوتا ہے؟

سوال:- اگر آدمی کو اسباب و وسائل میسر نہ ہوں تب بھی دُعا کا اثر ہوتا ہے یا نہیں؟

جواب:- جی ہاں! دُعا بھی دُوسرے وسائل و اسباب کی طرح ایک وسیلہ ہے، اور دُوسرے مادّی وسائل کے مقابلے میں زیادہ بہتر ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۹۷۰/۲۸ ج)

اسمِ اعظم سے کیا مراد ہے؟

سوال:- اسمِ اعظم کی دُعائیں کون سی ہیں؟ اور اس سے کیا مراد ہے؟ کتاب کا حوالہ درج فرمادیں۔

جواب:- اسمِ اعظم بعض حضرات نے "یا حی یا قیوم" کو کہا ہے، بعض نے "لَآ اِلٰـہَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ" کو بعض نے "رَبِّ رَبِّ" کو، بعض نے "اَللہ" کو، بعض نے "لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحٰنَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ" کو اور یہ تمام صیغے[1] دُعا کی قبولیت کے لئے مجرّب ہیں، البتہ اسمِ

---

(۱) وفی مشکوٰۃ المصابیح ج:۱ ص:۱۹۹ عن انسؓ قال: کنت جالسًا مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی المسجد ورجل یصلی فقال: اللّٰھم انی اسئلک بان لک الحمد لا الٰہ الا أنت الحنان المنان بدیع السمٰوٰت والأرض یا ذا الجلال والاکرام یا حی یا یقوم اسألک، فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: دعا اللہ باسمہ الأعظم الذی اذا دعی بہ أجاب واذا سئل بہ أعطیٰ. رواہ الترمذی وأبو داوٗد والنسائی وابن ماجۃ. وفیہ أیضًا ج:۱ ص:۲۰۰ عن أسماء بنت یزید أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: اسم اللہ الأعظم فی ھاتین الأیتین: اِلٰـھُکُمْ اِلٰـہٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ، و فاتحۃ ال عمران الٓمّٓ. اللہُ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ. رواہ الترمذی وأبو داوٗد وابن ماجۃ والدارمی.

اعظم کے بارے میں محققین کی تحقیق یہ ہے کہ کسی ایک اسمِ اعظم باری تعالیٰ کو معین طور سے اسمِ اعظم کہنا مشکل ہے۔[۱]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۹۷۰ /۲۸ ج)

روزہ افطار کے وقت دُعا زیادہ قبول ہوتی ہے

سوال:- دُعا کی مقبولیت کے متعلق سنا ہے کہ روزہ کھولنے کے وقت اور روزہ رکھنے کے وقت زیادہ قبول ہوتی ہے، کیا یہ دُرست ہے؟

جواب:- اِفطار کے وقت دُعا کی قبولیت کی اُمید حدیث سے ثابت ہے۔[۲]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۹۷۰ /۲۸ ج)

تعویذ میں اگر کوئی خلافِ شرع بات نہ ہو تو جائز ہے

سوال:- تعویذ بنانا اگرچہ قرآن شریف کی آیات سے ہو، جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- تعویذ میں اگر کوئی بات خلافِ شرع نہ ہو تو اس کا بنانا رکھنا جائز ہے۔[۳]

واللہ اعلم
۱۳۸۲/۱۱/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۷۵۵/۱۲ و)

عمل ''حاضرات'' کی شرعی حیثیت

سوال:- از روئے شریعت عمل حاضرات کی کیا حیثیت ہے؟ جائز ہے یا ناجائز؟ ۲:- حاضرات کے ذریعہ کیا ہوا فیصلہ قابلِ قبول ہونا چاہئے یا نہیں؟

---

(۱) وفی المرقاة وقال ابو جعفر الطبرانیؒ اختلفت الآثار فی تعیین الاسم الأعظم وعندی ان الأقوال کلها صحیحة اذ لم یرد فی خبر منها انه الاسم الأعظم ج:۵ ص:۱۰۲۔

(۲) عن عبدالله بن عمرو بن العاصؓ یقول سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول: ان للصائم عند فطره لدعوة ما ترد. کتاب الدعاء ج:۲ ص:۱۲۲۹ فی اسناده اسحاق بن عبدالله مدنی وهو مقبول وبقیة رجاله حسن، وقال ابن حجرؒ هذا حدیث حسن الفتوحات الربانیة وأخرجه ابن ماجة عن هشام بن عمار مثلا فی الصیام باب فی الصائم لا ترد دعوته، وفی الزوائد اسناده صحیح۔

(۳) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۲۷۸ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ۔

جواب:- عمل ''حاضرات'' کی مفصل کیفیت اور حقیقت اب تک ہمیں کسی قابلِ اعتماد ذریعے سے معلوم نہیں ہوسکی، البتہ اتنا واضح کردینا ضروری ہے کہ اگر اس عمل کے ذریعے جنات کو اس طرح تابع یا مسخر بنایا جاتا ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مختار نہ رہیں، بلکہ عامل کی مرضی کے مکمل تابع ہوجائیں تو یہ عمل بالکل ناجائز ہے، کیونکہ جنات حُر ہیں، اور انہیں غیر شرعی طریقے سے غلام بنانا بالکل حرام ہے،(۱) اور اگر اس کی حقیقت کچھ اور ہے تو اسے مفصل لکھ کر مسئلہ دوبارہ معلوم کرلیا جائے۔ واللہ اعلم

۱۳۹۸/۱۱/۲۷ھ

''بدیع العالم'' نام رکھنے اور صرف ''اِلَّا اللہ'' کا ذکر کرنے کا حکم

سوال:- خدمتِ بابرکت میں عرض ہے کہ بندہ کے دِل میں اپنے نام کے متعلق مدّت سے ایک اِشکال ہے، اور وہ یہ ہے کہ بندہ کا نام ''بدیع العالم'' رکھا گیا، حالانکہ ''بدیع'' کا لفظ شانِ باری تعالیٰ میں وارد ہوا ہے، اس لئے بندہ کے دِل میں یہ خوف ہے کہ اس نام پر مؤاخذہ ہوجائے، لہٰذا کیا اس لفظ کے کوئی ایسے معنی ہیں جس کی بناء پر اِشکال کا دفعیہ ہوجائے۔

دیگر عرض یہ ہے کہ صرف ''اِلَّا اللہ'' کا ذکر کیسا ہے؟ یہ ذکر جائز ہے یا نہیں؟ ہمارے بعض حضرات اس کو ناپسند کرتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ ''اِلَّا'' بمعنی غیر ہے، لہٰذا ''اِلَّا اللہ'' کا ذکر درحقیقت غیراللہ کا ذکر ہے۔

عرض گزار احقر بدیع العالم
سابق پرنسپل عالیہ مدرسہ
(لکشام بنگلہ دیش)

جواب:- مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
گرامی نامہ باعثِ افتخار ہوا۔

''بدیع'' ان اسمائے حسنیٰ میں سے نہیں ہے جن کا استعمال غیراللہ کے لئے جائز نہ ہو، اس لئے یہ نام ناجائز تو نہیں ہے، البتہ ایک دعوے کا پہلو اس میں ضرور ہے، اس کی وجہ سے بدلنا چاہیں تو اختیار ہے۔

---

(۱) فی احکام القرآن ج:۴ ص:۴۴ نعم یشهد فلعه علیه السلام علیٰ ان تسخیر الجن کان غیر مرضی عنده لکمال الأدب فی شان سلیمان علیه السلام فغیره أولیٰ به وهو الذی قلنا من جوازه اذا کان الجن یحل استعانته وتسخیره من الکفرة واما المسلم فلا یحل استرقاقه أو تقییده من غیر وجه کما فی الانسان کما لا یخفی.
نیز جنات کو مسخر کرنے سے متعلق تفصیل کے لئے دیکھئے: معارف القرآن ج:۷ ص:۲۶۵،۲۶۶۔

''اِلَّا اللہ'' کا ذکر دوازدہ تسبیح کا ایک جزو ہوکر اس لئے دُرست ہے کہ اس سے پہلے پورے کلمے ''لا اِلٰہ اِلَّا اللہ'' کی تسبیحات پڑھی جاچکی ہوتی ہیں، اس لئے ہر ''اِلَّا اللہ'' کے ساتھ ''لا اِلٰہ'' محذوف و ملحوظ ہوتا ہے، نیز مشائخ یہ بھی بتاتے ہیں کہ ''لا معبود اِلَّا اللہ''، ''لا محبوب اِلَّا اللہ'' وغیرہ کا تصوّر کریں۔

البتہ دوازدہ تسبیح کے جزء کے بغیر، یا مذکورہ تصوّر کے بغیر ''اِلَّا اللہ'' کا ذکر واقعی نہ منقول ہے نہ معقول۔ دُعا کی درخواست ہے، والسلام

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۲۴/۲/۱۲ھ

***
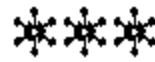
﴿کتاب حقوق المعاشرۃ وآدابھا﴾

(حقوقِ معاشرت اور اس کے آداب)

گھریلو ناچاقی اور والد کی سخت مزاجی کا حل اور طلاق کے معاملے میں والد کی اطاعت واجب ہے یا نہیں؟

سوال:- محترم جناب مفتی صاحب، دار العلوم کورنگی کراچی السلام علیکم

مؤدّبانہ عرض ہے میں مندرجہ ذیل مسئلے کا حل قرآن اور سنت کی روشنی میں چاہتا ہوں، اور چاہتا ہوں کہ اس مسئلے سے اللہ اور اس کے رسول کی ناراضگی مول لئے بغیر نکلوں۔

میں اپنے والدین کا ایک ہی لڑکا ہوں، نیز یہ کہ میری دو بہنیں بھی ہیں۔ ان بہنوں میں سے ایک بہن شادی شدہ ہے۔ میں اپنی دونوں بہنوں سے بڑا ہوں، میں حتی الامکان اپنے ماں باپ کی فرمانبرداری کی کوشش کرتا ہوں اور اللہ پاک کا شکر ہے کہ میں اپنی کوشش میں کامیاب ہوں۔ میرے والد جن کی عمر تقریباً ساٹھ سال ہے، بہت ہی سخت مزاج آدمی ہیں، نیز یہ کہ وہ حد درجہ اَناپرست آدمی بھی ہیں، اور وہ اپنی بات کے آگے کسی کی بات سننا یا ماننا پسند نہیں کرتے۔ میری والدہ تقریباً پچاس سال کی ہیں اور وہ مستقل بیمار رہتی ہیں، کچھ عرصہ قبل ان کا رسولی کا آپریشن ہوا تھا، جس کا انہوں نے ذہن پر اتنا اثر لیا کہ ان کے اعصاب بُری طرح متأثر ہوئے، بہت زیادہ علاج اور گھر والوں (بشمول میرے والد اور میری بیوی) کی دیکھ بھال کی وجہ سے ان کی ذہنی حالت تو بحال ہوگئی، لیکن ہاتھ پاؤں میں طاقت نہیں رہی، جس کی وجہ سے ان کی دیکھ بھال کی ہر وقت ضرورت رہتی ہے۔ میرے والد نے میری شادی میرے (مرحوم) ماموں کی لڑکی سے کردی اور اس سے میری تین عدد لڑکیاں ہیں، میری شادی کے بعد سے اب تک میری زندگی اور میری بیوی کی زندگی کے ہر معاملے میں میرے والد صاحب کی مرضی چلتی ہے اور بعض اوقات اس وجہ سے میں اپنی بیوی اور بچوں کے حقوق صحیح طور پر ادا نہیں کر پاتا ہوں۔ میں ایک پرائیویٹ ادارے میں ملازم ہوں اور اپنے بہت سارے فرائض اپنی ملازمت میں مصروفیت کی وجہ سے بھی ادا نہیں کر پاتا ہوں۔ میری بیوی کا گو کہ میرے والد بہت خیال بھی رکھتے ہیں مگر بعض مسئلوں میں بُری طرح ناراض بھی ہوتے ہیں اور اکثر بہت نازیبا الفاظ کا استعمال بھی کرتے ہیں، جس کو میں اور میری بیوی والدین کا حق سمجھ کر برداشت بھی کرتے ہیں۔

یوں ہم نے سات سال بڑی مشکل سے اپنے والد کی خوشی کو پورا کرکے گزارے ہیں اور

بہت سے مرحلے ایسے بھی آئے جب میرے والد نے ہم کو گھر سے نکل جانے کو کہہ دیا، مگر ہم نے اپنی عاقبت خراب ہونے کے ڈر سے معافی تلافی کرکے ان کو منالیا۔

اب صورتِ حال ایسی ہوگئی ہے کہ میرے والد بہت ساری باتیں اور ہماری غلطیاں جن کو وہ نظرانداز کرسکتے ہیں یا اس پر سمجھا بجھا کر معاملہ رفع دفع کرسکتے ہیں، اس پر بھی سخت رویہ اختیار کرتے ہیں اور معاملات کو انتہائی حد تک بگاڑ دیتے ہیں، اور بات بات پر ہم کو نکل جانے کو کہہ دیتے ہیں، اور کبھی کبھی میری بیوی کو طلاق دِلوانے کی بات بھی کرتے ہیں، جب وہ ہم کو نکالنے کی بات کرتے ہیں تو مجھے یہ بھی کہتے ہیں کہ تمہیں اپنی ماں کا آخری دیدار تک نہیں کرنے دُوں گا اگر تم کو گھر سے نکالا، دُوسری طرف میری بیوی جوکہ خود بھی بہت زیادہ اچھے مزاج کی نہیں ہے، مگر میرے سمجھانے پر ساری چیزیں برداشت کرتی ہے، بعض اوقات میرے ماں باپ کی خدمت میں لاپرواہی بھی کرجاتی ہے جس پر میں اسے ٹوکتا ہوں تو سمجھ جاتی ہے۔ زیادہ تر خوش مزاجی کا مظاہرہ کرتی ہے، مگر فطرۃً زیادہ خوش مزاج نہیں ہے، میری بہنوں کا حتی الامکان خیال رکھتی ہے، کبھی کبھی معمول کی ناچاقی بھی ہوجاتی ہے، اپنے گھر والوں کی بُرائی سن کر اس کا مزاج خراب ہوجاتا ہے جوکہ میرے والد اکثر ناراضگی کی حالت میں بہت کرتے ہیں۔

جہاں تک میرا تعلق ہے تو میری کیفیت ایسی ہے جیسے مجھے کسی نے تلوار سے درمیان سے چیر دیا ہو، یعنی میں اپنے والدین سے بھی بہت محبت کرتا ہوں خاص طور پر اپنی ماں اور بہنوں سے، اور اپنے بیوی بچوں سے بھی بہت محبت کرتا ہوں، اور اپنے روزگار یعنی دفتری مسائل کے ساتھ ساتھ ان گھریلو مسائل سے بہت پریشان رہتا ہوں۔ مجھے اپنی بچیوں کے مستقبل کی بھی بہت فکر رہتی ہے کہ اگر میرا گھر خراب ہوا یعنی مجھے اپنی بیوی کو چھوڑنا پڑا اپنے والد کی مرضی کی وجہ سے، تو میرے بیوی بچوں کا کیا بنے گا؟ یا اگر مجھے اپنا گھر چھوڑنا پڑا اور گھر والوں یعنی اپنے والد کی ناراضگی مول لینا پڑی تو میرے والدین خاص طور پر والدہ کا خیال کون رکھے گا؟ دُوسرے، اللہ بھی ناراض ہوگا۔

یعنی میں دُنیا اور آخرت دونوں کے کھوجانے کے خوف میں رہتا ہوں، ابھی کچھ دن پہلے بھی اس طرح کا مسئلہ ہوگیا تھا، ہوا یوں تھا کہ میری بیوی اپنی والدہ کے یہاں گئی ہوئی تھی، اس دوران میری والدہ بیت الخلاء میں پھسل گئیں اور مجھے ان کو لے جاکر ٹانکے لگوانا پڑے، کیونکہ ان کا سر پھٹ گیا تھا اور زخم آیا تھا۔

میری بیوی کو والد صاحب نے دُوسرے دن فون پر بتانے کے لئے کہہ دیا اور کہلوایا کہ تم جتنی

جلدی ہوسکے آجاؤ، میں نے اپنے دفتر سے فون کیا اور اس سے کہا کہ جلدی تو جانا مگر بدحواس مت ہونا، میری بیوی کو گھر پہنچنے میں تاخیر ہوگئی اور والد صاحب حسبِ مزاج بہت برہم ہوئے، اس موقع پر میری بیوی نے بھی کچھ غلط رَدِّعمل کا اظہار کیا، جس کی وجہ سے معاملات بہت بگڑ گئے، میرے سمجھانے پر میری بیوی نے والد صاحب سے معافی مانگ لی۔

یہاں پر اب میں یہ بتاؤں میری زندگی میں یہ مسئلے مسائل بہت بڑھ گئے ہیں، اور اب معاملات اس حد تک پہنچ گئے ہیں کہ میرے ذہن میں ایک دن یہ خیال آیا کہ میں دبئی جاکر نوکری کرلوں اور بیوی بچوں کو بھی وہاں بلالوں اور والدین کو اکثر وہاں بلالیا کروں، یا میں خود ان سے ملنے آجایا کروں، مگر اس میں بھی والد صاحب کی ناراضگی اور والدہ کی خدمت سے محرومی کا ڈر لگا رہتا ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟ کیونکہ کسی بھی فیصلے میں اللہ اور اس کے رسول کی ناراضگی کا ڈر رہتا ہے کہ والدین یا بیوی بچوں کے حقوق کے سلسلے میں قیامت کے روز میری پکڑ نہ ہوجائے۔

مندرجہ بالا تفصیلات کے بعد میری آپ سے گزارش ہے کہ میرے مسئلے کا قرآن اور سنت کی روشنی میں ممکنہ حل بیان کریں تاکہ میں اپنے دین کی حدود میں رہتے ہوئے اس مسئلے کو حل کرسکوں اور ذہنی سکون پاسکوں۔

میں اس سلسلے میں آپ کا بہت ممنون ہوں گا اور اللہ پاک سے دُعا کروں گا کہ آپ کو اس کا اجر دے۔

جواب:۔ محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جو حالات آپ نے لکھے ہیں ان میں مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ خوش اُسلوبی کے ساتھ اپنی رہائش علیحدہ کرلیں۔ اور علیحدہ رہ کر والدین کی جتنی خدمت کرسکتے ہوں کریں، آپ کسی وقت اگر ممکن ہوتو اپنے والد صاحب سے نرمی کے ساتھ بات کرلیں کہ مزاجوں کے اختلاف وغیرہ کی وجہ سے ساتھ رہنے میں آپ کی حق تلفیاں ہوجاتی ہیں اور مسائل پیدا ہوتے ہیں، اس لئے کوئی ایسی صورت پیدا کرلینا مناسب معلوم ہوتا ہے جس میں یہ مسائل پیدا نہ ہوں، اور آپ کی خدمت احسن طریقے سے کرنے کا موقع ملے۔ اگر اس بات چیت کے نتیجے میں کوئی ایسا راستہ پیدا ہوجائے جس سے گھر میں رہتے ہوئے مسائل حل ہوسکیں تو خیر، ورنہ علیحدگی اختیار کرلیں، اس پر بھی اگر والد صاحب ناراض ہوں تو اِن شاء اللہ اس کا گناہ آپ پر نہیں ہوگا، آپ ہر ممکن طریقے سے ان کی خدمت اور ان کی رضاجوئی کی کوشش ہر حال میں جاری رکھیں، یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ اگر باپ بیوی کو طلاق

دینے کا حکم دے تو اس کی تعمیل شرعاً واجب نہیں ہے، جب تک بیوی واقعۃً طلاق دینے کی لائق نہ ہو۔[۱]

والسلام
۱۴۲۳/۴/۲۰ھ
(فتویٰ نمبر ۵۵۰/۷۵)

شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر جانا، جائز اَمر میں شوہر کی اطاعت واجب ہے

سوال ۱:- کیا مسلمان عورت خاوند کی بغیر اطلاع یا بغیر اجازت محلے میں قرآن خوانی یا میّت میں یا قریبی رشتہ داروں میں یا مارکیٹ میں کوئی سامان خریدنے جاسکتی ہے، جبکہ وہ دو تین بچوں کی ماں بن چکی ہو؟

۲:- کیا شریعت نے خاوند کو اس کی منکوحہ مسلمان بیوی پر فوقیت یا افضلیت عطا کی ہے؟ کیا عورت، خاوند کے ہر حکم کی پابند ہے؟ اور کیا رُوگردانی کی صورت میں گناہگار ہوگی؟

جواب ۱:- شوہر کی اجازت یا مرضی کے خلاف مذکورہ مقاصد میں سے کسی بھی مقصد کے لئے گھر سے باہر جانا بیوی کے لئے جائز نہیں۔[۲]

۲:- شوہر کی اطاعت بیوی پر واجب ہے،[۳] اِلّا یہ کہ وہ کسی ایسے کام کا حکم دے جو شرعاً ناجائز ہو تو ایسی صورت میں اس کی مخالفت ضروری ہے،[۴] اور اس لحاظ سے شوہر کو بیوی پر فوقیت حاصل ہے، لقوله تعالٰی: "اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ"،[۵] ولقوله تعالى: "وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ"۔[۶]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۸/۲۹ھ

---

(۱) اس مسئلے کی مکمل تفصیل کے لئے دیکھئے: امداد الفتاویٰ رسالہ "تعدیل حقوق الوالدین" ج:۴ ص:۴۸۵ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)۔

(۲) وفي الدر المختار ج:۳ ص:۱۴۵ (طبع سعيد) فلا تخرج الا لحق لها أو عليها أو لزيارة أبويها كل جمعة مرة أو المحارم كل سنة ولكونها قابلة أو غاسلة لا فيما عدا ذلك. وفي الشامية (قوله فيما عدا ذلك) عبارة الفتح، وما عدا ذلك من زيارة الأجانب وعيادتهم والوليمة لا يأذن لها ولا تخرج .... الخ.

(۳) وفي مشكوة المصابيح باب عشرة النساء ص:۲۸۱ (طبع قديمي كتب خانه) عن أبي هريرة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لو كنت امرًا أحدًا ان يسجد لأحد لأمرت المرأة أن تسجد لزوجها. رواه الترمذي. وفيه أيضًا ص:۲۸۳ عن أبي هريرة قال: قيل لرسول الله صلى الله عليه وسلم: أي النساء خير؟ قال: التي تسره اذا نظر وتطيعه اذا أمر ولا تخالفه في نفسها ولا مالها بما يكره. رواه النسائي والبيهقي في شعب الايمان. وفي البدائع ومنها وجوب اطاعة الزوج على الزوجة لقوله تعالى: وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِىْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ" ... فبدل على لزوم طاعتهن الأزواج.

(۴) وفي الصحيح للامام مسلم رقم الحديث: ۱۸۳۹ ج:۳ ص:۱۴۶۹ (طبع دار احياء التراث العربي) لا طاعة في معصية الله، انما الطاعة في المعروف. وفي مصنف ابن أبي شيبة رقم الحديث: ۳۳۷۱۷ ج:۶ ص:۵۴۵ (طبع مكتبة الرشد، رياض) لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق.

(۵) سورة النساء: ۳۴. (۶) سورة البقرة: ۲۲۸ (محمد زبیر حق نواز)

گھر میں ٹیلی ویژن لانے کے لئے باپ کو گھر سے نکالنا، عالم کا والد اور بہن بھائیوں سے قطع تعلق کرنا

سوال ا:- کن کن وجوہ سے مسلمان اپنے عزیز و رشتہ دار، بہن بھائیوں سے قطع تعلق کرسکتا ہے؟ اور کن وجوہ سے منع ہے؟

۲:- ایک لڑکا شادی شدہ ہے، صاحبِ ثروت ہے، کراچی میں دو مکان ہیں، ایک کو کرایہ پر دیا ہوا ہے، باپ موجود ہے جس کی عمر ۷۰ سال ہے، بڑھئی کا کام کرتا تھا، باپ کے پاس اس لڑکے کے مکان کے سوا اور کوئی جگہ رہائش نہیں ہے۔ لڑکا کھیل تماشے کا عادی ہے، بیوی ریڈیو پر گانا سنتی رہتی ہے، بیوی نے لڑکے سے شکایت کی، میاں بیوی کی رائے ٹیلی ویژن لانے کی ہوئی تو میاں بیوی نے مشورے سے والد کو تنگ کرنا شروع کیا، آخر باپ تنگ آکر چھوٹی بیٹی کے یہاں چلا گیا، ٹیلی ویژن بھی آگیا اور محلے والوں کو دیکھنے کی دعوت بھی دی جانے لگی، اس طرح کھیل تماشا دیکھنے کے لئے بہانہ بناکر باپ کو گھر سے نکال دینا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟

۳:- ایک شخص نے لڑکے کو علمِ دین کے لئے لگایا، دیوبند خیال کے ہیں، لڑکا دو سال درسِ نظامی حاصل کرتا رہا اور چار سال بعد نیو کراچی میں والد نے مکان بھی خرید دیا اور شادی کردی، یہ مولوی صاحب جب دو سال کے تھے تو والدہ کا انتقال ہوگیا تھا، باپ نے ہی پرورش کی تھی، لیکن شادی کے بعد مولوی صاحب نے اپنے والد، بہن بھائیوں سے قطع تعلق کرلیا ہے، غیروں سے میل جول ہے، اس کا شرعی حکم کیا ہے؟

جواب ا:- اس سوال کے جواب میں بہت تفصیل ہے، کوئی خاص صورت معین کرکے لکھیں تو اس کا حکم بتادیا جائے گا۔

۲:- صورتِ مسئولہ میں لڑکے کا عمل سراسر خلافِ شرع ہے، گھر میں ٹیلی ویژن رکھنا بذاتِ خود ایک فتنہ ہے، چہ جائیکہ اس کی خاطر باپ کو تنگ کرکے گھر سے نکلنے پر مجبور کرنا، اس میں تو بہت سے گناہ جمع ہوگئے۔[۱]

۳:- صورتِ مسئولہ میں اس لڑکے کا عمل دُرست نہیں، جو صحیح معنی میں عالمِ دین ہو وہ ایسا نہیں کرسکتا، اس کو چاہئے کہ اپنے اس عمل سے توبہ کرکے اپنے والد اور اعزّہ کے حقوق ادا کرے۔[۲]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۱/۶ھ

(حاشیہ نمبر ۱، ۲ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

غیبت کے چرچوں کی وجہ سے پڑوسیوں کے گھر آمد ورفت سے رُکنا

سوال:- ہر گھر میں آج کل فتنہ اور غیبت کا بہت زور ہے، ہمسایہ وغیرہ کو غیبت کے چرچے سے منع کروں تو عورتیں نہیں رُکتیں، بہر حال فتنہ وغیبت کی وجہ سے بیمار پُرسی اور ماتم پُرسی میں بھی جانا نہیں چاہتی، اگر جاؤں تو غیبت اور دیگر مفاسد میں مبتلا ہونا پڑتا ہے، اگر نہ جاؤں تو پڑوسی ناراض ہوتے ہیں، کیا حکم ہے؟ اور ایسی صورت میں اگر میت والوں سے یہ کہا جائے کہ میں بہت زیادہ مشغول تھی تو کہیں یہ جھوٹ تو نہیں ہوگا؟

جواب:- حقوقِ شرعیہ مثلاً عیادت وتعزیت میں جانا چاہئے[1]، البتہ جب یہ اندیشہ ہو کہ غیبت یا کسی اور بُرائی میں مشغول ہوں گی تو اس صورت میں اہلِ میت سے اپنے آپ کو مشغول کہنے میں جھوٹ بھی اِن شاء اللہ نہ ہوگا، اور نیت اپنی گھریلو مشغولیات یا ذکر اللہ میں مشغول ہونے کی کرلیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۸/۶/۱۲ھ

(فتویٰ نمبر ۵۹۱/۲۹ ب)

ناجائز اُمور میں باپ کی اطاعت کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ یہاں ایک شخص اپنے بیٹے کو نماز پڑھنے اور مسجد میں جانے اور قرآنِ پاک پڑھنے سے منع کرتا تھا، لوگ اسے کمیونسٹ کہتے، بعض مرزائی کہتے، اس کے پڑوس میں میت ہوئی وہ اس کے جنازے میں شریک نہ ہوا، ایک مرزائی کے جنازے میں شریک ہوا اور پوری رسومات میں شریک ہوا، اس کے بعد اس کے بیٹے محمد قاسم نے باپ کے ساتھ کام کرنا چھوڑ دیا کہ میرا باپ مرزائی ہے، اب محمد قاسم کہتا ہے کہ میرا باپ مرزائی ہے، مجھ کو اس سے کیا معاملہ کرنا چاہئے؟

جواب:- باپ کی اطاعت صرف جائز کاموں میں واجب ہے، لہٰذا اگر باپ کسی جائز کام کا حکم دے تو بیٹے کو اس کی اطاعت کرنا چاہئے، اور اس کے ساتھ حسنِ سلوک اور اس کی خدمت میں

(حاشیہ متعلقہ صفحہ گزشتہ)...... (۱، ۲) "وقضی ربک الا تعبدوا الا ایاہ وبالوالدین احسانا. اما یبلغن عندک الکبر احدھما او کلٰھما فلا تقل لھما اف ولا تنھرھما وقل لھما قولا کریما. واخفض لھما جناح الذل من الرحمۃ" الآیۃ. (الاسراء: ۲۳، ۲۴). "وآت ذا القربی حقہ" الآیۃ. (الاسراء: ۲۶). نیز دیکھئے: جامع الترمذی ابواب البر والصلۃ، باب ما جاء فی عقوق الوالدین ج: ۲ ص: ۱۲ (طبع فاروقی کتب خانہ).

(۱) وفی مشکوۃ المصابیح باب السلام ص: ۳۹۸ (طبع قدیمی کتب خانہ) عن علیؓ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: للمسلم علی المسلم ست بالمعروف یسلم علیہ اذا لقیہ ویجیبہ اذا دعاہ ویشمتہ اذا عطس ویعودہ اذا مرض ویتبع جنازتہ اذا مات ویحب لہ ما یحب لنفسہ. رواہ الترمذی والدارمی.

کوتاہی نہیں کرنی چاہئے، لیکن اگر وہ کسی ناجائز کام کا حکم دے یا فرائضِ شرعیہ کی ادائیگی سے روکے تو اس کی اطاعت واجب نہیں، لقولہ تعالٰی: وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِیْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ" الآیۃ۔[1] واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷۳۹/۲۷ و)

والدہ کے حکم سے بیوی کو طلاق دینے کا حکم

سوال:- میری عمر ۳۶ سال ہے، والد صاحب قبلہ کا انتقال ۱۹۵۹ء میں ہوا، اس کے بعد ساری ذمہ داری مجھ پر آئی، ہم تین بھائی بڑے ہیں، پھر دو بہنیں ہیں، میں منجھلا ہوں، جب سے مجھ پر ذمہ داری آئی میں نے اپنی دونوں بہنوں اور بڑے بھائی کی شادی کردی، ان فرائض کی ادائیگی کی وجہ سے میں شادی نہ کرسکا، والدہ ڈھائی تین سال تک رشتے کی تلاش میں رہیں، کہیں لڑکی پسند نہ آئی، کہیں لڑکی والوں نے انکار کردیا، سرپرست نہ ہونے کی وجہ سے غلط راستہ اختیار کرلیا، ایک غریب لڑکی ملی، ہم دونوں ایک دُوسرے سے ملنے لگے، پھر ایک مرتبہ ہم سے غلطی ہوئی اور حمل ہوگیا، ہم نے اسقاط کروادیا، دُوسری مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا، میں نے توبہ کی، مگر تعلق میں کمی نہ ہونے کے سبب اور لڑکی کے یہ کہنے کے سبب کہ اب وہ کبھی شادی نہیں کرے گی کیونکہ اس کی زندگی خراب ہوئی ہے۔ میں اس کے ساتھ اس خیال سے ملتا رہا کہ کہیں غلط راہ پر نہ چلی جائے، ہوسکے تو کہیں اس کی شادی کرادوں، اسی دوران ہم سے تیسری غلطی ہوئی اور حمل ٹھہر گیا (اس دوران میں اپنی والدہ کو منانے کی کوشش کرتا رہا کہ شادی ہوجائے، مگر وہ نہ مانیں، اگر مان جاتیں تو شاید یہ غلطی نہ ہوتی)، تیسری مرتبہ اسقاط کرانے کے حق میں نہ تھا، اگرچہ وہ راضی تھی۔ چنانچہ ایک قاضی صاحب سے بات کی اور باقاعدہ چند دوستوں کے سامنے نکاح کرالیا، دوستوں کو یہی پتہ تھا کہ میرا نکاح ہو رہا ہے، تاریخ میں نے دو ماہ پہلے کی ڈلوائی، اب والدہ، بھائی، بہنوں کو علم ہے کہ کہیں میں نے شادی کرلی ہے، مگر والدہ شدید ناراض ہیں، چونکہ میں ان کے ارمانوں کا مرکز تھا، اب والدہ کہتی ہیں کہ اس لڑکی کو طلاق دے دو، تو میں معاف کردوں گی، دُودھ بھی بخش دوں گی، ورنہ نہیں۔ میں پنج وقتہ نمازی ہوگیا ہوں، اللہ سے گناہوں کی معافی چاہتا ہوں، مجھے ماں کی بھی ضرورت ہے، اور اس بدنصیب بیوی کی بھی، لیکن یہ آگ پانی کس طرح ملیں گے، آپ کوئی وظیفہ لکھیں تاکہ دُنیا میں شرمندگی نہ ہو۔

---

(۱) سورۃ لقمٰن:۱۵۔ وفی الصحیح للامام مسلمؒ رقم الحدیث:۱۸۳۹ ج:۳ ص:۱۴۶۹ (طبع دار احیاء التراث العربی) لا طاعة فی معصیة اللہ، انما الطاعة فی المعروف .... الخ. وفی مصنف ابن أبی شیبة رقم الحدیث:۳۳۷۱۷ ج:۲ ص:۵۴۵ (طبع مکتبة الرشد، ریاض) لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق.

جواب:- آپ سے اور آپ کی بیوی سے جو گناہ سرزد ہوئے ان پر صدقِ دل سے توبہ استغفار کیجئے، اور اپنی زندگی کو اَحکامِ الٰہی کے مطابق بنانے کی فکر میں لگ جائیں، اِن شاء اللہ سچی توبہ ہوگی تو اللہ تعالیٰ یہ گناہ معاف کردے گا۔ اب اگر آپ اپنی بیوی سے مطمئن ہیں اور کوئی وجہ طلاق دینے کی نہیں پاتے تو آپ پر اس معاملے میں والدہ کے حکم کی تعمیل واجب نہیں[1]، البتہ والدہ کو راضی کرنے کے لئے انہیں اصل حقیقت مناسب طریقے پر بتادیجئے۔ نیز قرآن وحدیث کے وہ اَحکام دِکھایئے جس میں تصریح ہے کہ سچی توبہ سے ہر گناہ معاف ہوجاتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کو معاف کرنے کا حکم دیا ہے۔ اگر وہ راضی ہوجائیں فبہا، ورنہ آپ پر اس معاملے میں ان کی تعمیل واجب نہیں[2]، انہیں دُوسرے طریقوں سے خوش کرنے کی کوشش کیجئے اور اپنی بیوی کو بھی ہدایت کیجئے کہ وہ ان کی خدمت سے ان کی رضامندی حاصل کرے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۴۲ ج)

مرزائیوں سے تعلق رکھنے والے رشتہ داروں سے تعلق کا حکم

سوال:- زید کا قریبی رشتہ دار بکر مرزائی ہے، زید کا شرعی قانون کے مطابق بکر کے ساتھ کسی قسم کا میل جول نہیں ہوسکتا، مگر زید کے رشتہ دار ایسے آدمیوں کے گھر خوشی غمی میں جاتے ہیں جہاں بکر کی آمد ورفت ہے، ایسے آدمیوں سے مراد بھی رشتہ دار ہی ہیں کہ جن سے برادری کے تعلقات ہیں، مگر یہ لوگ باوجود مسلمان ہونے کے بکر وغیرہ سے میل جول رکھتے ہیں اب جو اُن تعلق داروں کے گھر، معاملات وغیرہ میں شریک ہو اور بکر کی آمد ورفت وہاں ہو تو کیا شرعاً ایسے گھر جانا جائز ہے؟ جو لوگ ایسے ہوں کہ ان کے ہاں مرزائی کا آنا جانا ہو یا ان کی برادری کے گھر مرزائی کا آنا جانا ہو، ان سے تعلق کے بارے میں وضاحت فرمائیں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں زید کے لئے اپنے مسلمان رشتہ داروں کے یہاں آنے جانے کی گنجائش ہے، البتہ اسے چاہئے کہ وہ اپنے مسلمان رشتہ داروں کو مرزائیوں سے قریبی تعلقات رکھنے سے حکمت کے ساتھ روکتا رہے۔[3]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۸/۶/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۹/۷۹۴ ب)

(۱،۲) اس مسئلے کی مکمل تفصیل کے لئے دیکھئے: حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہٗ کا رسالہ ''تعدیل حقوق الوالدین'' امداد الفتاویٰ ج:۴ ص:۳۸۰ تا ۳۸۵ (طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی)۔

(۳) وفی تکملۃ فتح الملہم ج:۵ ص:۳۵۶ قال ابن عبدالبر .... اجمع العلماء علی أن من خاف من مکالمۃ احد وصلتہ ما یفسد علیہ دینہ او یدخل مضرۃ فی دنیاہ یجوز لہ مجانبتہ وبعدہ ورب صرم جمیل خیر من مخالطۃ تؤذیہ .... الخ۔

اُستاذ کو گالی دینے کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے میں کہ کوئی شاگرد اُستاذ کو گالیاں دیدے تو اس کا کیا حکم ہے؟ عاق ہوسکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- کسی مسلمان کو گالیاں دینا حرام ہے، سباب المسلم فسوق، الحدیث[1] خاص طور پر اُستاذ کو گالی دینا بڑا گناہ ہے، حدیث میں علماء کی تعظیم کا ذکر ہے، اور جو علماء کی توہین کرے گا فرمایا گیا ہے کہ وہ ہم میں سے نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۸۷/۱۱/۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۳۳/۱۸ الف)

والدین اور اساتذہ کے لئے تعظیماً کھڑے ہونے کی شرعی حیثیت

سوال:- والدین یا اساتذہ کے لئے تعظیماً کھڑا ہونا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- والدین، اُستاذ، اہلِ علم یا دُوسرے قابلِ تعظیم افراد کے لئے کھڑا ہونا بغرضِ تعظیم جائز ہے بلکہ فقہاء نے اسے مستحب لکھا ہے، درمختار میں ہے: وفی الوھبانیة یجوز بل یندب القیام تعظیمًا للقادم کما یجوز القیام ولو للقاریٔ بین یدی العالم وقال الشامیؒ تحته أی ان کان ممن یستحق التعظیم قال فی القنیة قیام الجالس فی المسجد لمن دخل علیه تعظیمًا وقیام قاریٔ القرآن لمن یجیٔ تعظیمًا لا یکرہ اذا کان ممن یستحق التعظیم. (شامی ج:۵ ص:۲۴۶ کتاب الحظر والاباحة قبیل فصل البیع)۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۱/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷۵۵/۲۷ و)

والدین کے کہنے پر بلاعذرِ شرعی، بیوی کو طلاق دینے کا حکم

سوال:- عام طور پر مشہور ہے کہ صرف والدین کے کہنے پر بلاعذرِ شرعی بھی بیوی کو طلاق دے دینی چاہئے، کیا یہ دُرست ہے؟ گھر میں جھگڑے کی وجہ سے اگر والدین اس پر مجبور کریں تو کیا حکم ہے؟

---

(۱) وفی صحیح البخاری باب ما ینھی عن السباب واللعن ج:۲ ص:۸۹۳ قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم: سباب المسلم فسوق، وقتاله کفر. وفیه أیضًا ان النبی صلی اللہ علیه وسلم یقول: لا یرمی رجل رجلًا بالفسوق ولا یرمیه بالکفر الا ارتدت علیه ان لم یکن صاحبه کذلک.

(۲) الدر المختار مع رد المحتار ج:۶ ص:۳۸۴ (طبع سعید) وفی صحیح البخاری ج:۲ ص:۹۲۶ باب قول النبی صلی اللہ علیه وسلم "قوموا إلی سیّدکم" عن ابی سعید ان اھل قریظة نزلوا علی حکم سعد فارسل النبی صلی اللہ علیه وسلم الیه، فجاء، فقال: قوموا إلی سیّدکم .... الخ. وفی حاشیة البخاری وفیه استحباب القیام عند دخول الأفضل وھو غیر القیام المنھی، لأن ذلک بمعنی الوقوف وھذا بمعنی النھوض .... الخ.

جواب:- اگر شوہر طلاق دینے کی کوئی معقول وجہ نہیں سمجھتا تو اسے اپنے والدین کو نرمی کے ساتھ سمجھانا چاہئے کہ طلاق بالکل آخری قدم ہے جسے بغیر شدید مجبوری کے اختیار نہ کرنا چاہئے، حدیث میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد منقول ہے کہ: "ابغض المباح الی اللہ الطلاق"[1]، یعنی مباحات میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض چیز طلاق ہے، اُمید ہے کہ نرمی اور حکمت سے فہمائش کی جائے گی تو والدین سمجھ جائیں گے، اور اگر پھر بھی وہ نہ سمجھیں تو طلاق نہ دے[2]، اور راضی کرنے کی کوشش کرتا رہے۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۲۲ھ

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی بلند شہری

(فتویٰ نمبر ۱۳۶۴/۱۸ الف)

بھائی بہنوں سے بیوی کی ملاقات پر پابندی لگانے کا حکم

سوال:- کیا کسی مسلمان شوہر کو اسلامی شریعت نے یہ اختیار دیا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو اپنی ذاتی وجوہات رنجش، عداوت، غرور وتکبر کی وجہ سے اس کے بھائیوں بہنوں سے ملاقات کرنے پر پابندی لگائے؟

جواب:- بھائیوں کے بیوی سے ملنے پر بلاوجہ پابندی لگانا شوہر کے لئے مناسب نہیں ہے، البتہ کوئی معقول وجہ ہو، مثلاً ان سے ملنے سے فساد کا اندیشہ ہو، تو بات دُوسری ہے۔ واللہ اعلم

۱۴۱۲/۱/۸ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۹/۵۶)

***

(۱) سنن أبی داوٗد ج:۱ ص:۳۰۳ (طبع مکتبہ امدادیہ ملتان).

(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۴ ص:۳۸۰ تا ۳۸۵، وعزیز الفتاویٰ ص:۱۵۳۔

﴿کتاب السیر والمناقب﴾

(انبیاء اور مختلف شخصیات کے حالات ومناقب)

قسطنطنیہ پر حملے میں شرکت کی بناء پر یزید کے جنتی ہونے کا عقیدہ رکھنا

سوال:- عن خالد بن معدان ان عمير بن الأسود العنسي حدثه أنه أتى عبادة بن الصامت وهو نازل في ساحل حمص وهو في بناء ومعه أم حرام قال عمير فحدثتنا أم حرام أنها سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقول: أوّل جيش من أمتي يغزون البحر قد أوجبوا، قالت أم حرام: قلت: يا رسول الله! أنا فيهم؟ قال: أنت فيهم، قالت: ثم قال: أوّل جيش من أمتي يغزون مدينة قيصر مغفور لهم، فقلت: أنا فيهم يا رسول الله؟ قال: لا.

قسطلانی شارحِ بخاری نے لکھا ہے کہ: كان أوّل من غزا مدينة قيصر يزيد بن معاوية ومعه جماعة من سادات الصحابة كابن عمرو وابن عباس وابن الزبير وأبي الأنصاري وتوفي بها أبو أيوب سنة اثنين وخمسين من الهجرة۔ علامہ ابنِ حجرؒ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں: قال المهلب في هذا الحديث منقبة لمعاويةؓ لأنه أوّل من غزا البحر ومنقبة لولده لأنه أوّل من غزا مدينة قيصر۔ اس پرچہ میں یزید کے متعلق احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جنتی ہے جیسا کہ بخاری کا حوالہ دیا گیا، حقیقت سے آگاہ کریں۔

جواب:- جو حدیث منسلکہ پرچہ میں نقل کی گئی ہے وہ صحیح بخاری میں صحیح سند کے ساتھ موجود ہے، پھر علماء نے اس پر کلام کیا ہے کہ اس لشکر سے کون سا لشکر مراد ہے؟ جہاں تک پہلے سمندری جہاد کا تعلق ہے اس کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ وہ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں حضرت معاویہؓ کے ہاتھوں انجام پایا، البتہ قسطنطنیہ پر پہلی بار حملہ آور ہونے والا لشکر کون سا تھا؟ اس بارے میں اقوال مختلف ہیں، ایک قول یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ نے سفیان بن عوفؓ کی سرکردگی میں ایک لشکر قسطنطنیہ روانہ کیا تھا، جس میں حضرت ابنِ عباسؓ، ابنِ زبیرؓ اور ابوایوب انصاریؓ موجود تھے، اور اسی میں حضرت ابوایوبؓ کی وفات ہوئی، علامہ عینیؒ نے اس قول کو زیادہ راجح قرار دیا ہے، قلت الا ظهر ان هؤلاء السادات من الصحابة كانوا مع سفيان هذا ولم يكونوا مع يزيد بن معاوية لأنه لم يكن اهلًا ان يكون هؤلاء السادات في حدمته۔ یہ زیادہ ظاہر ہے کہ یہ اکابر صحابہ سفیانؓ کے ساتھ ہوں گے، یزید

بن معاویہ کے ساتھ نہیں کیونکہ وہ اس بات کا اہل نہ تھا کہ یہ حضراتِ صحابہؓ اس کی خدمت میں رہیں۔

(عمدۃ القاری ج:۱۴ ص:۱۹۸، ۱۹۹ ادارۃ الطباعۃ المنیرۃ، وکذا فی طبع دار الفکر)۔

لیکن تاریخی طور پر یہ قول زیادہ مشہور ہے کہ قسطنطنیہ پر مسلمانوں کا پہلا حملہ یزید بن معاویہ کی سرکردگی میں ہوا ہے، اس سے بعض علماء نے یزید بن معاویہ کی فضیلت اخذ کی ہے، لیکن حافظ ابنِ حجرؒ، علامہ بدرالدین عینیؒ اور دُوسرے علمائے محققین نے اس کی تردید کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ حدیثِ مذکور میں ایک عام حکم دیا گیا ہے کسی فرد کی تخصیص نہیں، لہٰذا یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص دُوسرے اسباب کی بناء پر اس عام حکم سے خارج ہو، (فتح الباری ج:۶ ص:۷۸) گویا یہ ایسا ہی ہے جیسے حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے: "من قال لا اِلٰہ اِلَّا اللہ دخل الجنۃ" جو شخص لا اِلٰہ اِلَّا اللہ کہے وہ جنت میں داخل ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک عام حکم ہے اور لا اِلٰہ اِلَّا اللہ کہنے کا تقاضا تو یہی ہے کہ وہ جنت میں داخل ہو، لیکن اگر دُوسرے گناہوں کا ارتکاب کرے یا بعد میں مرتد ہوجائے تو وہ اس عام حکم سے خارج ہوجائے گا، صحیح بات یہ ہے کہ اس حدیث کا اصل مقصد قسطنطنیہ کے جہاد کی ترغیب دینا اور اس جہاد میں شرکت کی فضیلت کا اظہار ہے، جس کو یہ فضیلت حاصل ہوتی ہے اس کا انکار کرنا بھی غلط ہے۔

لیکن اس فضیلت کی بناء پر اس کے دُوسرے ناجائز افعال کا جواز تلاش نہیں کیا جاسکتا، یزید بن معاویہ نے اگر اس جہاد میں شرکت یا اس کی سربراہی کی تو بلاشبہ اس کا یہ عمل نیک اور باعثِ اَجر ہے، لیکن اس نیک عمل سے ان ناجائز افعال کا جواز ثابت نہیں کیا جاسکتا جو اس نے اپنے عہدِ حکومت میں انجام دیئے ہوں، چنانچہ اہلِ سنت والجماعت کا مسلک اس کے بارے میں یہی ہے کہ وہ مسلمان تھا، اسی لئے محقق علماء نے اس پر لعنت کرنے کو جائز قرار نہیں دیا، اور نہ یہ کہنا دُرست ہے کہ قیامت میں اس کی بخشش نہیں ہوگی۔ اس نے اپنے عہد میں بلاشبہ بعض ناجائز افعال کئے، ان افعال کو ناجائز قرار دیا جائے گا، اس کے بعد معاملہ اللہ کے ساتھ ہے، وہ چاہے تو مغفرت کردے اور چاہے تو سزا دے، ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے کہ جس سے دُنیا میں اس کے مغفور لہٗ یا معذّب ہونے کا فیصلہ کرسکیں۔ یزید کے بارے میں اہلِ سنت کے مسلک کی بہترین ترجمانی علامہ ابنِ تیمیہؒ نے ان الفاظ میں کی ہے: **الناس فی یزید طرفان ووسط، قوم یعتقدون أنہ من الصحابۃ أو من الخلفاء الراشدین المھدیین أو من الأنبیاء وھٰذا کلہ باطل، وقوم یعتقدون أنہ کافر منافق فی الباطن .... وکلا القولین باطل یعلم بطلانہ کل عاقل، فان الرجل ملک من ملوک المسلمین وخلیفۃ من الخلفاء الملوک لا ھٰذا ولا ھٰذا.** (منھاج السنۃ علامۃ ابن تیمیۃؒ ج:۲ ص:۲۴۱ طبع مکتبۃ الریاض الحدیثۃ، ریاض)۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یزید کو خلفائے راشدین مہدیین میں سے

سمجھنا بھی غلط ہے، اور اسے کافر، منافق قرار دینا بھی صحیح نہیں، اہلِ حق کا مسلک اس افراط و تفریط کے درمیان ہے، اس اعتدال پر قائم رہنا چاہئے اور اس قسم کی فضول بحثوں میں نزاع و جدال یا ان میں اپنی عمر کے اوقات صَرف کرنے سے اجتناب کرنا چاہئے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۱/۱/۱۰ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۲/۴۳ الف)

قبیلۂ ''جون'' کی عورت اُمیمہ بنت شراحبیل سے متعلق شیعوں کا من گھڑت قصہ

سوال:- یہ واقعہ بخاری میں موجود ہے یا نہیں؟ شیعوں کی کتاب سے نقل کردہ یہ واقعہ عدالت میں پیش کرنا ہے۔ میرے سامنے جو کتاب ہے اس کے ص:۶۷ پر یہ واقعہ یوں نقل کیا گیا ہے اور میں اس کو حرف بحرف نقل کر رہا ہوں۔ ''ایک جونیہ عورت کو حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے (معاذ اللہ) کسی تدبیر سے اس کے گھر سے منگا بھیجا اور شہر کے باہر جا کر درختوں کے پتوں کی آڑ کر کے اس سے اپنا مطلب پورا کرنا چاہا، اس پر وہ چیخنے اور دُعائیں دینے لگی، جب کسی طرح راضی نہیں ہوئی معاملہ طول کھینچ گیا، پکڑ دھکڑ کا خوف ہوا، راز فاش ہوجانے کی گھڑی پہنچ گئی، انتہائی درجے کی رُسوائی کا اندیشہ ہوگیا، اور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس سے بالکل مایوس ہوگئے تو اس کو کچھ دے دِلا کر واپس کردیا۔''

یہ نہایت درجہ رُسوا کرنے والا واقعہ بھی اس صحیح بخاری کی جلد نمبر۶ ص:۱۶۲ میں موجود ہے۔ اس کو بھی پڑھ کر آج کی دُنیا حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی عفت و شرافت کی کتنی دھجیاں اُڑاتی ہوں گی؟

جواب:- آپ کا خط ملا، شیعوں کی جس کتاب سے آپ نے عبارت نقل کی ہے، وہ ان لوگوں نے اپنی عادت کے مطابق غلط طور پر گھڑ کر بیان کی ہے، اصل واقعہ جو صحیح بخاری میں مروی ہے اس کا خلاصہ دُوسری روایات کی روشنی میں یہ ہے کہ قبیلۂ جون کا ایک سردار مسلمان ہوکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، اور اس نے ذکر کیا کہ ہمارے قبیلے میں ایک خاتون اُمیمہ بنت شراحبیل بیوہ ہوگئی ہیں اور انہوں نے آپ کے ساتھ نکاح کی رغبت ظاہر کی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے حالات معلوم کرنے کے بعد نکاح کی رضامندی فرمادی اور نکاح کر بھی لیا اور ان کے وطن سے مدینہ طیبہ بلوالیا، جو صاحب ان کو لے کر آئے تھے انہوں نے ان کو بنوساعدہ کی ایک حویلی میں ٹھہرایا اور

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع دی، آپ وہاں تشریف لے گئے اور منکوحہ ہونے کی حیثیت سے ان کے کمرے میں داخل ہوئے، اور جب ان سے کوئی بات شروع کی تو انہوں نے یہ کلمہ کہا: ''میں آپ سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر فرمایا کہ: تم نے ایک ایسی ذات کی پناہ مانگی ہے جو پناہ مانگنے کے لائق ہے، چنانچہ آپ نے اس کے بعد اسے طلاق دے دی اور ان کو جوڑے دے کر واپس ان کے گھر بھجوانے کا حکم دے دیا۔

واقعہ کا یہ خلاصہ صحیح بخاری کتاب الأشربة حدیث نمبر ۵۶۳۴، صحیح مسلم کتاب الأشربة، باب اباحة النبیذ، اور طبقات ابنِ سعد ج:۸ ص:۱۴۳ سے مأخوذ ہے۔[1]

رہا یہ سوال کہ اس خاتون نے پناہ کیوں مانگی؟ اس کے بارے میں بعض ضعیف روایتوں میں یہ کہا گیا ہے کہ کچھ ازواجِ مطہراتؓ نے ان کو یہ سکھا دیا تھا کہ ''اعوذ باللہ منک'' کا کلمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند ہے، اور مقصد یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے یہ کلمہ سن کر ان کو طلاق دے دیں۔ لیکن یہ روایات واقدی اور ہشام بن الکلبی کی روایتیں ہیں، جو طبقات ابنِ سعد میں ان کے حوالے سے بیان کی گئی ہیں، اور یہ دونوں ناقابلِ اعتبار راوی ہیں، جو اپنے جھوٹ اور اپنے رفض میں مشہور ہیں، لہٰذا اس پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا، اور نہ اُمہات المؤمنینؓ سے یہ توقع ہوسکتی ہے۔

احقر نے تمام متعلقہ روایات کو سامنے رکھنے کے بعد تکملة فتح الملهم[2] میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ شاید یہ خاتون دماغی اعتبار سے نارمل نہیں تھیں، ان کے کچھ اور جملے بھی صحیح بخاری وغیرہ میں مروی ہیں، جن سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ یہ ہے واقعہ کی مختصر حقیقت اس کو مذکورہ کتاب کی عبارت سے ملا کر دیکھ لیجئے کہ دونوں میں کتنا تضاد ہے؟ جس کو تحریف اور بددیانتی کے سوا کوئی اور نام نہیں دیا جاسکتا۔

والسلام
۱۴۱۰/۱/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۴/۴۱ الف)

بعض تاریخی روایات کی بنیاد پر صحابہ کرامؓ کے حق میں بدگمانی کرنا

سوال:- کیا کوئی ان الفاظ سے صحابہ کرامؓ کی توہین کا کوئی پہلو نقل کرسکتا ہے؟

۱:- عمرو بن العاص نے امیر معاویہ کو کہا: اب میں ایک ایسی چال چلوں گا یا تو جنگ ختم ہوجائے گی یا حضرت علی کی فوج میں نفاق پڑ جائے گا، اس نے اپنی فوج کے متعدد نیزوں پر قرآن بند چڑھوا دیئے۔

---

(۱) صحیح بخاری ج:۲ ص:۸۴۲، صحیح مسلم ج:۲ ص:۱۲۸، ۱۲۹، وطبقات ابن سعد ج:۸ ص:۱۴۳، ۱۴۴۔
(۲) کتاب الأشربة ج:۳ ص:۲۵۰۔

۲:- حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور عمرو بن العاصؓ نے ایک گوشۂ خلوت میں بیٹھ کر مشورہ کیا کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ دونوں کو اپنے منصب سے معزول کریں، عمرو بن العاص نے فریب کیا کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری کو منبر پر فیصلے کے لئے کھڑا کردیا، حضرت ابوموسیٰ اشعری نے اعلان کیا کہ ہم دونوں کو معزول کرتے ہیں، بعد میں حضرت عمرو بن العاص نے حضرت علی کی معزولی کا اعلان کیا اور حضرت معاویہ کی معزولی کی نفی کی، ابوموسیٰ اشعری اس کے بیان پر ششدر رہ گئے اور فرمایا کہ یہ اعلان صریح غداری اور بے ایمانی ہے۔

۳:- امیر معاویہ نے زبردستی سے یزید کے لئے بیعت لی تھی، لیکن امام حسین متفق نہ ہوئے، خلفائے راشدین کا تو یہ حال تھا کہ خلافت کا معاملہ رائے شماری پر چھوڑتے تھے مگر امیر معاویہ نے قیصر وکسریٰ کی سنت کے مطابق بادشاہت کا سلسلہ جاری کردیا۔

جواب:- عباراتِ مذکورہ میں صحابہ کرامؓ کی طرف منسوب جو واقعات بیان کئے گئے ہیں وہ تاریخ کی بعض کتابوں میں موجود ہیں، لیکن خاص طور سے مشاجراتِ صحابہ کے بیان میں تاریخی روایات اس قدر مختلف، بسا اوقات متضاد ہیں کہ ان سے صحیح واقعات کا پتہ معلوم کرنا بڑا مشکل ہے، لہٰذا ان کی بنیاد پر صحابہؓ کے حق میں بدگمانی کرنا، دانش مندی کے خلاف ہے، ان کا معاملہ انہی پر چھوڑا جائے اور ان کی حرمت وعظمت دِل میں رکھنی چاہئے: "تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ"۔[1]

فقط واللہ اعلم بالصواب
۱۳۸۷/۱۱/۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۳۵/ ۱۸ الف)

حضرت فاطمہؓ کے نکاح کی تاریخ

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کا نکاح کس تاریخ میں ہوا؟ اور مہر کتنا مقرّر ہوا تھا؟

جواب:- حضرت فاطمہؓ کا نکاح رمضان سنہ۲ھ میں ہوا، اور چار سو مثقال چاندی مہر مقرّر کیا گیا، تاریخِ نکاح کے بارے میں رجب سنہ۲ھ کا بھی ایک قول ہے۔ (اصابہ[2]، واستیعاب[3])۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۳/۴/۲۷ھ

---

(۱) سورۃ البقرۃ: ۱۳۴ و ۱۴۱۔ (۲) ج:۴ ص:۳۶۶ (مطبع مصطفی محمد، مصر)۔
(۳) ج:۴ ص:۱۸۹۳، ۱۸۹۴ (طبع دار الجیل بیروت)۔

جواب صحیح ہے، چار سو مثقال چاندی ہمارے مروّجہ وزن کے اعتبار سے ڈیڑھ سو تولہ تقریباً ہوتے ہیں۔

محمد شفیع عفا اللہ عنہ

حضرت خدیجہؓ کے مال سے تجارت کرنے پر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کوئی کمیشن مقرّر تھا؟

سوال:- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب حضرت خدیجہؓ کا مال لے کر تجارت کے لئے جاتے تو ابتداء میں آپ کے لئے کوئی کمیشن مقرر ہوتا تھا یا نہیں؟

جواب:- علامہ واقدی نے لکھا ہے کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ جن لوگوں کو اپنے مال کی تجارت کے لئے روانہ کرتی تھیں ان سے مضاربت کا معاملہ کرتی تھیں، یعنی منافع میں سے ایک مناسب حصہ ان کو دیا کرتی تھیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے انہوں نے عام لوگوں سے دُگنا حصہ مقرّر کیا تھا، وانا أعطيك ضعف ما أعطى رجلا من قومك .... وكانت تستأجر الرجال وتدفع اليهم المال مضاربة (از زرقانی شرح المواہب ج:۱ ص:۱۹۸)۔[1]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۱۴ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی بلندشہری

(فتویٰ نمبر ۱۴۳۹/۱۸ الف)

حضرت معاویہؓ کے بارے میں کتاب ”شہیدِ کربلا“ اور بعض اکابر کی عبارات کا جواب

سوال:- گزارش یہ ہے کہ آپ کی تصنیف کردہ کتاب ”حضرت معاویہؓ اور تاریخی حقائق“ کو پڑھ کر بے حد مسرّت ہوئی۔ کافی لوگ جنھوں نے خلافت وملوکیت کا مطالعہ کیا تھا حضرت معاویہؓ کو طعن وتشنیع کی نگاہ سے دیکھتے تھے، آپ کی کتاب پڑھ کر کافی حد تک ان کے شبہات کا ازالہ ہوگیا ہے۔ مگر آپ کے والد ماجد مفتیٔ اعظمؒ کی کتاب ”کربلا“ کے صفحہ گیارہ سے لے کر بیس تک کے مطالعے سے مخالفین کے شبہات کو تقویت پہنچتی ہے جو حضرت معاویہؓ کو بغض وعناد سے دیکھتے ہیں۔ ”کربلا“ میں مفتی صاحبؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ خلافت کا سلسلہ جب امیر معاویہؓ پر پہنچتا ہے تو حکومت میں خلافتِ راشدہ کا وہ رنگ نہیں رہتا جو خلفائے راشدینؓ کی حکومتوں کو حاصل تھا۔ (ص:۱۱)

جنابِ من! اگر یہ بات مان ہی لی جائے کہ حضرت معاویہؓ کی خلافت کو خلافتِ راشدہ میں

(۱) (طبع دار المعرفة بيروت).

شمار نہ کیا جائے تاہم معاویہؓ کے بعد جو اُمراء اور سلاطین ہوئے ہیں، خود عمر بن عبدالعزیزؒ بھی۔ ان سب سے معاویہؓ کا دور بہتر اور افضل ہے، یہ اقرار اور اعتراف خود ڈاکٹر اسرار احمد صاحب بھی کر رہے ہیں، جس کو آپ کا بھی مؤید کہتے ہیں۔

بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز کے دورِ حکومت پر کسی قلم کار نے یہ نہیں لکھا کہ ان کی حکومت خلافتِ راشدہ کے رنگ کی نہ تھی، بلکہ کچھ نے تو انہیں خلیفۂ راشد ہی مانا ہے، اس کے علاوہ اہلِ سنت کی کتابوں کو دیکھ کر شبہات کچھ پکے ہونے لگتے ہیں۔

۱:- ہدایہ جلد ثالث میں ہے کہ سلطان جائر کی تقلید جائز ہے، جیسا کہ معاویہ رضی اللہ عنہ۔

۲:-''مؤمن کے ماہ و سال'' مصنفہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ ص:۳۵ میں ہے:''اسی سال سنہ ۴۳ھ میں امیر معاویہؓ نے زیاد بن اُمیہ کو اپنا نائب بنایا اور یہی وہ پہلا عمل ہے جس کے ذریعے اَحکامِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خلاف ورزی کی گئی، (ثعالبی وغیرہ)۔'' خلافت و ملوکیت کے صفحہ:۱۷۴ میں نظر ڈالیں تو اس نے بھی یہی لکھا ہے کہ معاویہؓ نے کتاب اللہ و سنتِ رسول کی خلاف ورزی کی، برائے کرم آپ صحیح مسئلہ سے آگاہ کریں۔

جواب:- آپ کا خط ملا، احقر نے اپنی کتاب ''حضرت معاویہؓ'' میں ایک مستقل باب اسی موضوع پر لکھا ہے کہ علمائے اہلِ سنت کے نزدیک حضرت معاویہؓ کے عہدِ حکومت کی صحیح حیثیت کیا تھی؟ اسے ملاحظہ فرمالیں، خلاصہ اس کا بھی یہی ہے کہ آپؓ کے عہد کو خلافتِ راشدہ کے برابر تو نہیں کہا جاسکتا، لیکن آپؓ ایک امامِ عادل تھے۔ لہٰذا اگر حضرت والد صاحبؒ نے یہ لکھا ہے کہ آپؓ کے عہد میں خلافتِ راشدہ کا مثالی رنگ باقی نہیں رہا تھا، تو اس میں علمائے اہلِ سنت کے موقف کے خلاف کوئی بات نہیں ہے، اور اس کا مقابلہ ''خلافت و ملوکیت'' کی ان عبارتوں سے نہیں کیا جاسکتا جن پر احقر نے تنقید کی ہے۔

جہاں تک حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور کا تعلق ہے، اس کو خلافتِ راشدہ قرار دینے پر اتفاق نہیں ہے، اور حضرت معاویہؓ بلاشبہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے صحابیت کی بناء پر بدرجہا فوقیت رکھتے ہیں، لیکن اگر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہدِ حکومت کو بحیثیت مجموعی کوئی شخص بہتر کہے تو اس سے مُسلَّم اُصول بظاہر متأثر نہیں ہوتا۔

جہاں تک صاحبِ ہدایہ کی عبارت کا تعلق ہے! اس میں سلطانِ جائر ایک فقہی اصطلاح کے طور پر استعمال ہوا ہے، فقہ میں جو شخص امامِ برحق کے مقابلے میں برسرِ جنگ ہو خواہ وہ کتنا متقی ہو اور اپنے اجتہاد سے ایسا کر رہا ہو اس کو اصطلاحاً ''سلطانِ جائر'' ہی کہتے ہیں، لیکن صاحبِ ہدایہ نے احتیاط

فرمائی ہے کہ حضرت معاویہؓ کو آپ نے سلطانِ جائر نہیں کہا،[۱] بلکہ یہ کہا ہے کہ حق حضرت علیؓ کے ساتھ تھا، اس کے باوجود صحابہ کرامؓ نے ان سے قضاء کو قبول کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امامِ برحق کے مدِمقابل (جسے اصطلاحاً سلطانِ جائر کہتے ہیں) کی تقلید جائز ہے۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی جو عبارت[۲] آپ نے نقل فرمائی ہے، وہ درحقیقت بعض ضعیف تاریخی روایات پر مبنی ہے، اور احقر یہ واضح کرچکا ہے کہ وہ روایات قابلِ اعتماد نہیں ہیں، حضرت شیخ عبدالحق صاحبؒ نے ضمنی طور پر انہیں ذکر کردیا ہے، شاید تحقیق کا موقع نہ ملا ہو، اور حضرت معاویہؓ کا عذر اگر ان کے سامنے آتا تو شاید ان کی رائے بھی مختلف ہوتی، اس کے ساتھ ہی ان کی عبارت اور خلافت وملوکیت کی عبارت کا موازنہ کرکے دیکھ لیجئے کہ کون سی عبارت توہین آمیز ہے؟ اور اُصولی طور پر یہ بات بھی احقر لکھ چکا ہے کہ ایک صحابیؓ پر کسی ضعیف روایت کی بنیاد پر الزام عائد کرنے سے کہیں بہتر یہ ہے کہ بعد کے کسی عالم کے بارے میں یہ تسلیم کرلیا جائے کہ ان سے تسامح ہوا ہے۔

والسلام

۱۴۰۸/۱۱/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۳۹/۲۲۸۳ ز)

حضرت عباسؓ کی اولاد سادات میں شامل ہے

سوال:- ایک آدمی کہتا ہے کہ سیّد زادیاں اُمتوں پر جائز ہیں، اس نے ساتھ میں یہ بھی کہا ہے کہ عباسی بھی سیّد ہوسکتے ہیں، ہم اس سے ناواقف ہیں!! آپ بیان فرمادیں۔

جواب:- سوال کا خط کشیدہ جملہ سمجھ میں نہیں آیا، واضح کرکے لکھیں، اور سادات تمام بنوہاشم ہیں، لہٰذا حضرت عباسؓ کی اولاد بھی سادات میں شامل ہے۔[۳]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۱/۲۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱۸/۱۳۳ الف)

---

(۱) هداية ثالث، كتاب أدب القاضي ص:۱۳۳ (طبع مكتبه شركت علميه ملتان).

(۲) دیکھئے: "مؤمن کے ماہ وسال" ص:۳۰ (طبع دارالاشاعت)۔

(۳) وفي رد المحتار ج:۲ ص:۳۵۰ (قوله ولا الى بنو هاشم) اعلم أن عبدمناف وهو الأب الرابع للنبي صلى الله عليه وسلم أعقب أربعة وهم: هاشم، والمطلب، ونوفل، وعبدشمس، ثم هاشم أعقب أربعة انقطع نسل الكل الا عبدالمطلب فانه أعقب اثني عشر، تصرف الزكاة الى أولاد كل اذا كانوا مسلمين فقراء الا أولاد عباس وحارث وأولاد أبي طالب من علي وجعفر وعقيل .... الخ.

یزید کے بارے میں جنتی ہونے کا عقیدہ

سوال:- قوم کو اس وقت ایسے مسائل درپیش ہیں جن کے حل کی طرف فکر کی ضرورت ہے، لیکن کچھ لوگوں نے بخاری شریف کی حدیث سے غلط استدلال کرکے یزید جیسے فاسق و فاجر کو جنتی ہونا ثابت کیا ہے، براہِ کرم آپ اس حدیث کی وضاحت فرمائیں۔

جواب:- ہر شخص کو اپنے ایمان اور عملِ صالح کی فکر کرنی چاہئے، یزید کے صالح یا فاسق ہونے کی تحقیق شرعاً کچھ ضروری نہیں، اور نہ آخرت میں اس کے بارے میں سوال ہوگا، قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ: "تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ"۔[1] اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: "من حسن اسلام المرء ترکہ ما لا یعنیہ"۔[2] لہٰذا ان فضول بحثوں سے اجتناب کرنا چاہئے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۲/۸ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۶/۲۹ الف)

یزید کے نام کے ساتھ "صلی اللہ علیہ وسلم" لکھنا

سوال:- ایک کتاب بنام رشید بن رشید مصنفہ ابویزید محمد دین بٹ نظر سے گزری، جس میں یزید کو "صلی اللہ علیہ وسلم" لکھا ہے، کتاب مذکور میں بہت سے علمائے دیوبند کی رائے بھی درج ہے، گزارش ہے کہ اس مسئلہ کی حقیقت سے مطلع فرمائیں۔

جواب:- یزید کو کافر کہنا دُرست نہیں ہے، لیکن اس کے ساتھ "صلی اللہ علیہ وسلم" یا "رضی اللہ عنہ" لگانا ان کلمات کی بے ادبی ہے، اس سے پرہیز کرنا چاہئے، یہ اُمتِ مسلمہ کا متفقہ عقیدہ ہے، اس پر عمل کرنا چاہئے، اور اس سے زائد فضول و لایعنی بحثوں میں پڑنا کسی طرح دُرست نہیں۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۳ھ

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۸۹/۱۹ الف)

کیا حضرت یوسف علیہ السلام کا زلیخا سے نکاح ہوگیا تھا؟

سوال:- کیا حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ اس عورت کا عقد نکاح ہوگیا تھا جس نے

---

(۱) سورۃ البقرۃ: ۱۳۴ و ۱۴۱۔
(۲) جامع الترمذی ابواب الزھد ج:۲ ص:۵۵ (طبع فاروقی کتب خانہ ملتان)۔

بُرے ارادے سے مکان کے دروازے بند کردیئے تھے؟

جواب:- بعض تاریخی روایات میں ایسا آیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا نکاح زلیخا سے ہوگیا تھا،[۱] لیکن قطعی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔　　　واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۸۸/۲/۸ھ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۲۲۳ الف)

کیا یزید بن معاویہؓ پر لعنت بھیجنا ثواب ہے؟

سوال:- یزید بن معاویہؓ پر ہر روز ایک سو بار لعنت بھیجنا کیا کارِ ثواب عمل ہے؟

جواب:- ہرگز نہیں،[۲] یزید کے بارے میں یہ عقیدہ کافی ہے کہ اس نے حضرت حسینؓ کے ساتھ جو سلوک کیا وہ غلط تھا، لیکن اس پر لعنت بھیجنا اہلِ سنت کا عقیدہ نہیں ہے۔　　　واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۸۸/۲/۸ھ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۲۲۳ الف)

پاک رحموں اور پاک صلبوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا مطلب

سوال:- نبی علیہ السلام کی حدیث ہے کہ میری پیدائش پاک رحموں اور پاک صلبوں سے ہے، حضرت عبداللہ والد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی منی رحم مائی آمنہ میں آنا کیسا ہے؟ اگر بذریعہ منی ہے تو کیا حضرت عبداللہ کی منی پاک تھی؟ اگر پاک تھی تو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی منی کے متعلق اَحکامِ غسل دھونا آیا ہے، اگر پلید تھی تو حدیث پر حرف آتا ہے؟

جواب:- پاک رحموں اور پاک صلبوں سے مراد صحیح النسب ہونا ہے، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام آباء و اجداد صحیح النسب تھے، اس کا مطلب منی کی طہارت نہیں ہے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۱۶ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

علامہ ابنِ تیمیہؒ کے بارے میں جمہور علماء کی رائے

سوال:- بندۂ ناچیز نے مولوی محمد عمر صاحب کی ایک کتاب پڑھی ہے، اس میں لکھا ہے کہ

---

(۱) دیکھئے: تفسیر معارف القرآن ج:۵ ص:۹۷۔

(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے: امداد الفتاویٰ "تحقیق لعن یزید" ج:۵ ص:۴۲۵۔

حضرت شیخ الاسلام امام ابنِ تیمیہؒ کو بڑے بڑے محدثین معاذ اللہ کافر کہتے ہیں۔ آپ مہربانی فرماکر بندۂ ناچیز کو اس حقیقت سے آگاہ کریں کہ جمہور علماء کی کیا رائے ہے؟ یا کوئی کتاب بتائیں جس میں مولوی عمر کو مکمل جواب دیا ہو، بندہ آپ کے جواب کا منتظر رہے گا۔

جواب:- شیخ الاسلام ابنِ تیمیہؒ بڑے عالم گزرے ہیں، البتہ انہوں نے بعض مسائل میں جمہور فقہاء ومحدثین اور علمائے اُمت سے اختلاف کیا ہے۔ جمہور اُمت نے ان کے تفردات کو قابلِ عمل نہیں سمجھا، اور اس بناء پر بعض حضرات نے ان کی تردید میں کتابیں بھی لکھی ہیں، ان کے مفصل حالات علامہ ابوزہرہ کی کتاب ''ابن تیمیہ'' میں مل سکتے ہیں، جس کا اُردو ترجمہ شائع ہوگیا ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۹/۹/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۶۲/۳۰ و)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلات کا حکم

سوال ۱:- ایک شخص نے مجھ سے سوال کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلات کا کیا حکم ہے؟

۲:- سنا ہے ''تقریرِ دل پذیر'' شائع فرما رہے ہیں، مجھے ضرورت ہے۔

جواب ۱:- اس کے بارے میں علماء کا اختلاف رہا ہے، اکثر حنفی علماء اس کے قائل ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام فضلات پاک تھے، مُلّا علی قاریؒ اور علامہ شامیؒ وغیرہ کا رُجحان بھی اسی طرف ہے، علامہ شامیؒ لکھتے ہیں: صحح بعض أئمة الشافعية طهارة بوله صلى الله عليه وسلم وسائر فضلاته وبه قال أبو حنيفة كما نقله في المواهب اللدنية عن شرح البخاري للعيني وصرح به البيري في شرح الأشباه وقال الحافظ ابن حجر تظافرت الأدلة علىٰ ذٰلك، وعد الأئمة ذٰلك من خصائصه صلى الله عليه وسلم ونقل بعضهم عن شرح المشكوٰة لمُلّا علي قاري أنه قال: اختاره كثير من أصحابنا، وأطال في تحقيقه في شرحه على الشمائل في باب ما جاء في تعطره عليه الصلوٰة والسلام۔ (شامی باب الانجاس ج:۱ ص:۲۱۲)۔[1]

۲:- غالبًا دار الاشاعت مقابل مولوی مسافرخانہ بندر روڈ کراچی یہ کتاب شائع کر رہا ہے، آپ ان سے خط لکھ کر معلوم کرلیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۱/۳/۲۶ھ

(۱) رد المحتار مطلب في طهارة بوله صلى الله عليه وسلم ج:۱ ص:۳۱۸ (طبع سعيد)۔
نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۸۰ تا ۸۲۔

کتاب الطہارۃ

(طہارت کا بیان)

﴿فصل فی الوضوء والغسل والتیمّم﴾

(وضو، غسل اور تیمّم کے فرائض، واجبات، سنن، مستحبات، آداب ومکروہات کا بیان)

جنازے کے لئے کئے گئے وضو سے فرائضِ پنج گانہ پڑھ سکتے ہیں

سوال:- کیا جنازے کی نماز کے لئے کیا گیا وضو فرائضِ پنج گانہ کے لئے بھی کافی ہے؟ یعنی اس سے فرائضِ پنج گانہ پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- ظاہر ہے کہ وضو ایک طہارتِ مطلقہ ہے، جب وہ مکمل ہوجائے تو ہر عبادت جو طہارت کے ساتھ مشروط ہو اس سے ادا ہوسکتی ہے،(۱) ہر عمل کے لئے جداگانہ نیت وضو کے ساتھ کرنا کسی کے نزدیک شرط نہیں، اس میں شبہ کی گنجائش نہیں۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۷۹/۱۱/۲۳ھ (۲)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

غسل خانے میں بات کرنے کا حکم

سوال:- غسل خانہ اور پاخانہ میں بات کرنے کو عوام ناجائز سمجھتے ہیں، سو شرعاً اس کی کوئی اصل ہے؟

جواب:- قال ابن عابدینؒ عبارة الغزنوية ولا يتكلم فيه أى فى الخلاء، وفى الضياء عن بستان أبى الليث يكره الكلام فى الخلاء، وظاهره أنه لا يختص بحال قضاء الحاجة وذكر بعض الشافعية أنه المعتمد عندهم، وزاد فى الامداد: ولا يتنحنح أى الا بعذر كما اذا خاف دخول أحد عليه. (رد المحتار ج:۱ ص:۳۱۸)(۳)۔

---

(۱) وفى الهندية ج:۱ ص:۲۶ (طبع مكتبه ماجديه كوئٹه) تيمم لصلوة الجنازة أو لسجدة التلاوة أجزأه أن يصلى المكتوبة بلا خلاف. نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۷، وکفایت المفتی ج:۲ ص:۳۱۷ (جدید ایڈیشن دار الاشاعت)۔

(۲) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم کی تمرین الفتاء (درجۂ تخصص) کی کاپی سے لیا گیا ہے۔

(۳) فتاوى شامية "تنبيه" ج:۱ ص:۳۴۴ (طبع ايچ ايم سعيد)

عبارتِ مرقومہ سے معلوم ہوا کہ بیت الخلاء میں نہ صرف یہ کہ بوقتِ قضاءِ حاجت بات کرنا مکروہ ہے، بلکہ دُوسرے حالات میں بھی بولنا دُرست نہیں، مثلاً کوئی شخص اگر بیت الخلاء میں وضو کر رہا ہو تو تسمیہ اور دُوسری دُعائیں پڑھنا بھی دُرست نہیں، کما قال الشامیؒ، اسی طرح بے ضرورت کھانسنا بھی مکروہ ہے۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۷۹/۱۱/۲۴ھ (۱)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

دانت میں چاندی بھری ہوئی ہو تو وضو اور غسل کا حکم

سوال:- دانتوں میں کیڑا لگ جانے کی وجہ سے اور کوئی علاج مستقل مفید نہ ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر نے علاجاً چاندی بھر دی ہے، اس صورت میں وضو میں کوئی نقص تو نہیں رہے گا؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں وضو میں تو کوئی اشکال ہی نہیں، غسل میں اِشکال ہوسکتا تھا لیکن فقہاء نے تصریح فرمائی ہے کہ مواضعِ ضرورت میں نیچے تک پانی پہنچانا ضروری نہیں۔

چنانچہ درمختار میں ہے:-

ولا يمنع ما على ظفر صباغ ولا طعام بين أسنانه أو في سنه المجوف به يفتى. وقيل: ان صلبًا منع وهو الأصح، وقال الشامي: قوله وهو الأصح صرح به في شرح المنية وقال: لامتناع نفوذ الماء مع عدم الضرورة والحرج. (شامي ج:۱ ص:۱۵۴ مبحث الغسل، طبع ايچ ايم سعيد).

وقد تقرر في موضعه أنه مفاهيم الكتب حجة، فدل على أنه لا يمنع عدم نفوذ الماء في مواقع الضرورة، وقد صرح به امداد الفتاوىٰ ج:۱ ص:۱۸.

اور عالمگیریہ میں ہے: قال محمدؒ في الجامع الصغير: ولا يشد الأسنان بالذهب ويشدها بالفضة يريد به اذا تحركت الأسنان وخيف سقوطها فأراد صاحبها أن يشدها يشدها بالفضة ولا يشدها بالذهب، وهذا قول أبي حنيفةؒ، وقال محمدؒ: يشدها بالذهب أيضًا. (عالمگيرية ج:۵ ص:۳۳۶)۔ (۲)

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۱۱ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۱۰۳۹ ج)

---

(۱) یہ فتویٰ حضرت والا دامت برکاتہم کی تمرین افتاء (درجۂ تخصص) کی کاپی سے لیا گیا ہے۔
(۲) كتاب الكراهية باب ۱۰ وكذا في امداد الفتاوىٰ ج:۱ ص:۱۹.

برہنہ ہوکر غسل کرنا

سوال:- غسل (فرض، سنت، مستحب) اگر مکان میں پردے کا پورا انتظام ہے تو برہنہ ہوکر کرسکتا ہے؟ اور جو وضو غسل کے لئے کیا ہے، بعد میں نماز کے لئے یہی وضو برقرار ہوگا یا نیا وضو کرنا ہوگا؟

جواب:- بہتر تو یہی ہے کہ کوئی کپڑا وغیرہ باندھ کر غسل کیا جائے، لیکن برہنہ ہوکر غسل کرنا جبکہ پردے کا پورا انتظام ہے، بھی بلاکراہت جائز ہے۔(۱) غسل میں جو وضو کیا جاتا ہے وہ بعد میں نماز پڑھنے کے لئے کافی ہے، نیا وضو کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔(۲)

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۹ھ

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۱۴/۱۹ الف)

گردن کے مسح کی شرعی حیثیت

سوال:- گردن کا مسح سنت ہے یا بدعت؟ مع الدلیل بیان کیجئے۔

جواب:- قال فی الدر المختار (فی مستحبات الوضوء) ومسح الرقبة بظهر يديه (لا الحلقوم) لأنه بدعة،(۳) وقال الشامیؒ تحت قوله لأنه بدعة اذ لم يرد فی السنة، وقال فی البحر قوله ومسح رقبته يعني بظهر اليدين۔(۴) اس عبارت سے معلوم ہوا کہ مسحِ رقبہ تو مستحب ہے، لیکن حلقوم کا مسح بدعت ہے، چونکہ سنت سے ثابت نہیں۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۷۹/۱۱/۲۵ھ (۵)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

مرض کی وجہ سے پانی نقصان دہ ہوتو تیمّم کیا جاسکتا ہے

سوال:- زید کی بیوی ایک طویل بیماری میں مبتلا ہے حتیٰ کہ نل کے پانی سے وضو کرنے سے

---

(۱) روى البخاریؒ عن أم هانیؓ بنت أبی طالب أنها ذهبت الى رسول الله صلى الله عليه وسلم عام الفتح فوجدته يغتسل وفاطمة تستره، وعن ميمونة قالت: سترت النبی صلى الله عليه وسلم وهو يغتسل من الجنابة فغسل يديه .... الخ. صحيح البخاری، كتاب الغسل ج:۱ ص:۴۲ (طبع قديمی كتب خانه كراچی)۔

(۲) وفی مشكوة المصابيح ج:۱ ص:۴۸ (طبع قديمی كتب خانه) عن عائشة قالت: كان النبی صلى الله عليه وسلم لا يتوضأ بعد الغسل. رواه الترمذی وأبو داؤد والنسائی وابن ماجة. وفی المرقاة ج:۱ ص:۳۳۸ لا يتوضأ بعد الغسل أی اكتفا بوضوئه الأول فی الغسل وهو سنة، وكذا فی عزيز الفتاوی ص:۱۷۵، وامداد المفتين ص:۱۷۵.

(۳) فتاوىٰ شامية ج:۱ ص:۱۲۴.

(۴) البحر الرائق ج:۱ ص:۲۸. نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۱۳۔

(۵) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم کی تمرینِ افتاء (درجہ تخصص) کی کاپی سے لیا گیا ہے۔ (محمد زبیر حق نواز)

بھی اس کے پیٹ میں درد ہو جاتا ہے، کیا اس بیماری کی وجہ سے زید کی بیوی کے لئے تیمّم کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟

جواب:- کسی طبیب سے مشورہ کیا جائے، اگر وہ وضو کو مضر قرار دے تو تیمّم کیا جاسکتا ہے۔[1]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۵/۲۶ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۶۱۸/ ۱۹ الف)

غسل کے بعد دوبارہ وضو کا حکم

سوال:- اگر وضو کرتے وقت ستر کھلا ہوا ہو مثلاً غسل کے دوران جو وضو کیا جاتا ہے تو یہ وضو نماز کے لئے کافی ہوگا یا نہیں؟ یا کپڑے پہننے کے بعد دوبارہ وضو کرنا ہوگا؟

جواب:- غسل کے وقت کیا ہوا وضو نماز کے لئے کافی ہے،[2] بشرطیکہ اس وضو کے بعد کوئی ایسا اَمر نہ پیش آیا ہو جس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، اور اس میں ستر کھلے ہونے سے کچھ فرق واقع نہیں ہوتا۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۱۱/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۱۳۳/۲۸ ج)

---

(۱) وفی الدر المختار باب التیمم ج:۱ ص:۲۳۲. من عجز عن استعمال الماء .... لمرض یشتد أو یمتد بغلبة ظن أو قول حاذق مسلم .... تیمم. وکذا فی الهندیة الباب الرابع فی التیمم ج:۱ ض:۲۸.

(۲) وفی مشکوۃ المصابیح ج:۱ ص:۴۸ (طبع قدیمی کتب خانه) عن عائشة رضی الله عنها قالت: کان النبی صلی الله علیه وسلم لا یتوضأ بعد الغسل. رواه الترمذی وأبو داوٗد والنسائی وابن ماجة. وفی المرقاة ج:۱ ص:۳۳۸ لا یتوضأ بعد الغسل أی اکتفا بوضوئه الأول فی الغسل وهو سنة، وکذا فی عزیز الفتاویٰ ص:۱۷۵.

﴿فصل فی النّجاسات وأحکام التطهیر﴾
(نجاسات کے اَحکام اور پاکی کا طریقہ)

ناپاک رُوئی کو پاک کرنے کا طریقہ

سوال:- رُوئی اگر ناپاک ہوجائے تو اس کے پاک کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

جواب:- علامہ شامیؒ نے تطہیر کے جو طریقے ابنِ وہبانؒ سے نقل کئے ہیں، ان میں سے ایک ندف بھی ہے، جس کے معنی ہیں "دُھنا"، (ملاحظہ ہو شامی ج:۱ ص:۲۹۰)[۱] اور یہ طریقہ رُوئی ہی پر چسپاں ہوسکتا ہے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۷۹/۱۱/۲۶ھ[۲]

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

تیل کو پاک کرنے کا طریقہ

سوال:- گھی اور تیل اگر نجس ہوجائیں تو تطہیر کا طریقہ کیا ہے؟

جواب:- تیل کو پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو کسی برتن میں ڈال کر اتنا ہی پانی اس میں ڈال دیا جائے اور ہلاکر چھوڑ دیا جائے جب تک کہ تیل اُوپر آجائے، پھر برتن میں سوراخ کرکے یا نتھار کر پانی علیحدہ کردیا جائے، تین مرتبہ یہی عمل کرنے سے تیل پاک ہوجائے گا۔ (کذا فی العالمگیریۃ ج:۱ ص:۴۳)[۳]۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۷۹/۱۱/۲۶ھ[۴]

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) واخر دون الفرک والندف والجفاف .... الخ. فتاویٰ شامیۃ ج:۱ ص:۳۱۵ (طبع ایچ ایم سعید).

(۲) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم کی تمرینِ افتاء (درجۂ تخصص) کی کاپی سے لیا گیا ہے۔

(۳) عالمگیریة، الباب السابع فی النجاسة واحکامها ج:۱ ص:۴۲ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ). وفی الدر المختار ج:۱ ص:۳۳۴ (طبع ایچ ایم سعید) ویطهر لبن وعسل ودبس ودهن یغلی ثلاثًا. وفی الشامیة تحته قال فی الدرر لو تنجس العسل فتطهیره أن یصب فیه ماء بقدره فیغلی حتی یعود الی مکانه والدهن یصب علیه الماء فیغلی فیعلو الدهن الماء فیرفع بشیء هکذا ثلاث مرات وهذا عند أبی یوسف خلافا لمحمد وهو أوسع، وعلیه الفتوی.

(۴) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم کی تمرینِ افتاء (درجۂ تخصص) کی کاپی سے لیا گیا ہے۔ (محمد زبیر)

تطہیرِ اشیاء کے طریقوں کی تعداد اور مکمل تفصیل

سوال:- تطہیرِ اشیاء کے کیا کیا طریقے ہیں؟ اور ان میں کیا تفصیل ہے؟

جواب:- تطہیرِ اشیاء کے دس طریقے ہیں:-

۱:- دھونا، جیسے ناپاک کپڑا وغیرہ اسی طریقے سے پاک کیا جاتا ہے۔

۲:- پھیر لینا، یہ طریقہ ان اشیاء کے لئے مخصوص ہے جو شفاف ہوں، جیسے آئینہ، تلوار وغیرہ۔

۳:- (فرک) کھرچنا، یہ طریقہ منی سے تطہیر کے لئے ہے، عالمگیریہ میں اس کو مطلق چھوڑا گیا ہے، لیکن العرف الشذی میں حضرت شاہ صاحبؒ نے اس طریقے کو قرونِ اُولیٰ کے ساتھ بایں وجہ مخصوص قرار دیا ہے کہ اس زمانے میں منی بہت غلیظ ہوتی تھی، اور آج کل عام طور سے منی کی رقت شائع ہے، اس لئے منیٔ رقیق کے لئے محض فرک کافی نہیں۔

۴:- ملنا اور رگڑنا، (حت و دلک) اور یہ طریقہ اس صورت کے لئے ہے جبکہ نجس چیز ثخین ہو اور نجاست متجسد (یعنی خشک ہونے کے بعد نظر آنے والی) ہو۔

۵:- سوکھ جانا، یہ حکم زمین اور اس میں گڑی ہوئی چیزوں کے لئے ہے، جیسے دیواریں درخت، اینٹیں وغیرہ، یہ تمام چیزیں صرف سوکھ جانے سے پاک ہوجاتی ہیں۔

۶:- جلانا، گوبر اور نجس کیچڑ اس طریقے سے پاک ہوجاتے ہیں، اسی طرح اگر بکری وغیرہ کا سر جو خون میں لتھڑا ہوا ہو اس قدر جلایا جائے کہ خون بالکل زائل ہوجائے تو وہ طاہر ہوجاتا ہے۔

۷:- ایک حالت سے دُوسری حالت کی طرف تبدیل کردینا استحالہ، مثلاً شراب کو کسی نئے مٹکے میں سرکہ بنا دینا، یہ بھی تطہیر کا سبب بن جاتا ہے۔

۸:- دباغت، خنزیر اور آدمی کے علاوہ تمام جانوروں کی کھالوں کو دُھوپ میں رکھ کر یا نمک لگا کر مدبوغ کرلیا جائے تو وہ پاک ہوجاتی ہیں۔

۹:- ذکاۃ یعنی حیوان کا ذبح کردینا اس کی جلد کو پاک کردیتا ہے اور گوشت کو بھی، خواہ وہ حیوان غیر ماکول ہو۔

۱۰:- نزح، یعنی اگر کنویں میں نجاست گرجائے تو اس کی مناسبت سے کنویں کا پانی کھینچ لینا۔

یہ دس طریقے عالمگیریہ میں ص:۴۲ سے ۴۶ تک نقل کئے گئے ہیں، اور ابنِ وہبانؒ اور علامہ حصکفیؒ نے ان کے ساتھ چند چیزیں اور ملا کر انہیں اشعار میں جمع کردیا ہے، ابنِ وہبانؒ کے اشعار علامہ شامیؒ نے نقل فرمائے ہیں:-

واخر دون الفرک والندف والجفا ف والنحت قلب العين والغسل يطور
ولا دبغ تخليل ذكاء تخلل ولا المسح والنزح الدخول التغوّر

وزاد شارحها بيتا، فقال:-

وأكل وقسم غسل بعض ونحله وندف وغلى بيع بعض تقور
(شامی ج:۱ ص:۲۹۰)[1]

علامہ حصکفیؒ نے انہی اشعار کو ذرا سا بدل کر فرمایا ہے: ؎

وغسل ومسح والجفاف مطهر ونحت وقلب العين والحفر يذكر
ودبغ وتخليل ذكاة تخلل وفرک ودلک والدخول التغور[2]
تصرفه في البعض ندف ونزحها ونار وغلى غسل بعض تقور

جس سے مندرجہ ذیل طریقہ ہائے تطہیر مزید معلوم ہوئے:-

۱:- کھودنا، اور یہ طریقہ زمین کو پاک کرنے کے لئے ہے۔

۲:- دخول، جس کی تفسیر علامہ ابنِ عابدینؒ نے یہ کی ہے کہ پاک پانی کا ایسے چھوٹے حوض میں داخل ہونا کہ جو ناپاک ہوگیا ہو، جبکہ ایک طرف سے اس کا پانی نکل رہا ہو، اور نیا پاک پانی داخل ہو رہا ہو، تو اگرچہ حوض کا پانی قلیل ہو، لیکن پھر بھی وہ پاک ہوجاتا ہے۔ (كذا في رد المحتار ج:۱ ص:۲۹۰)۔[3]

۳:- تغور، یعنی کنویں کا اتنا پانی خشک ہوجائے کہ جتنا نجاست گرنے کی وجہ سے نکالنا واجب تھا تو یہ پانی نکالنے کے قائم مقام ہوجائے گا۔

۴:- تصرف، یعنی ایک نجس چیز میں تصرف کرنا، مثلاً گندم ڈھیر میں سے کچھ ناپاک ہوجائے تو اس کے اندر اکل، بیع، ہبہ اور صدقہ وغیرہ کے ذریعہ تصرف کرلیا جائے تو وہ پاک ہوجاتا ہے۔

۵:- جوش دینا، جیسے کہ اگر تیل یا گوشت نجس ہوجائیں تو ان کو جوش دے کر پاک کیا جاسکتا ہے۔

۶:- تقویر، یعنی جہاں جہاں نجاست ہو، وہاں وہاں سے ان نجس چیز کا علیحدہ کردینا، چنانچہ اگر جما ہوا گھی ناپاک ہوجائے تو اس میں یہی طریقہ استعمال کیا جائے گا۔

یہ چھ طریقے مزید ملا کر کل سولہ طریقہ ہائے تطہیر معلوم ہوئے۔[4]

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۷۹/۱۱/۲ھ[5]

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) فتاویٰ شامية ج:۱ ص:۳۱۵ (طبع ایچ ایم سعید)۔ (۲) الدر المختار ج:۱ ص:۳۱۵ (طبع ایچ ایم سعید)۔
(۳) شامية ج:۱ ص:۳۱۵ (طبع ایچ ایم سعید)۔
(۴) تطہیر اشیاء کے مذکورہ طریقے فتاویٰ عالمگیریہ ج:۱ ص:۴۱ تا ۴۵ (مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ) میں بھی موجود ہیں۔
(۵) یہ فتویٰ حضرت والا دامت برکاتہم کی تمرین افتاء (درجہ تخصص) کی کاپی سے لیا گیا ہے۔

مٹی کا تیل پاک ہے

سوال:- کروشین تیل پاک ہے یا ناپاک؟ اگر نجس ہے تو نجاست خفیفہ ہے یا غلیظ؟ بغیر دھوئے نماز دُرست ہوگی یا نہیں؟

جواب:- کروشین تیل معلوم نہیں کیا ہوتا ہے؟ اگر مراد مٹی کا تیل ہے تو وہ پاک ہے، اسی طرح اور کوئی تیل جو معدن سے نکلتا ہو وہ بھی پاک ہے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۱۱/۹ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۴۳/۱۹ الف)

بیت الخلاء کے لوٹے سے طہارت حاصل کی جاسکتی ہے

سوال:- مساجد میں بھنگی وغیرہ صفائی کرتے ہیں، مگر وہ پیشاب خانے اور بیت الخلاء دھوتے وقت زور زور سے پانی بہاتے ہیں، استنجا کے لوٹے وہیں رکھے ہوتے ہیں، کیا ایسے برتنوں میں پانی لے کر پھر طہارت کی جاسکتی ہے؟

جواب:- ان برتنوں کے ناپاک ہونے کا اندیشہ ہو تو پہلے ان کو تین مرتبہ دھولیں، پھر بے کھٹکے ان سے طہارت حاصل ہوسکتی ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۵۸۸/۲۸ ب)

دھوبی کے دُھلے ہوئے کپڑوں کا حکم

سوال:- کپڑے جو کہ نجس ہوتے ہیں ان کے بارے میں طہارت کے اُصول کے مطابق پاک پانی سے تین مرتبہ سختی سے نچوڑنے کے اَحکام ہیں، جبکہ آج کل دھوبی گندے نالوں میں یا حوض وغیرہ میں دھوتے دیکھے جاتے ہیں، پھر گندی جگہوں پر وہ کپڑے سکھاتے ہیں، کیا ایسے دُھلے ہوئے کپڑے پہن کر نماز پڑھی جاسکتی ہے؟

جواب:- اصل میں تو کسی دھوبی کو مقرر کرتے وقت اس بات کا اطمینان کرنا چاہئے کہ وہ کپڑوں کو پاک کرکے دھوتا ہے یا نہیں؟ لیکن جب تک ناپاک پانی سے دھونے کا صرف اندیشہ ہو اس

---

(۱) کروشین تیل سے مٹی کا تیل مراد ہے، بنگلہ زبان میں مٹی کے تیل کو کہتے ہیں۔ (محمد زبیر)

وقت تک ابتلائے عام کی بناء پر ان کی طہارت ہی کا حکم کیا جاتا ہے۔[۱] واللہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۵۸۸/۲۸ ب)

کتے کی دباغت شدہ کھال پاک ہے

سوال:- خلاصۂ سوال یہ ہے کہ ماہنامہ ''البلاغ'' بابت ماہِ شوال سنہ ۱۳۸۷ھ میں ''آپ کے سوال'' کے عنوان کے تحت کتے کی کھال کے بارے میں یہ فتویٰ دیا گیا ہے کہ کتے کی کھال کو اگر شرعی طور پر ذبح کیا جائے اور اس کی کھال کو اس طرح صاف کیا جائے کہ وہ سڑنے سے محفوظ ہوجائے ..... سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک ناپاک، نجس، حرام، گندی چیز کو کسی بھی طریقے سے ذبح کریں، اوّل تو لفظِ ذبح وہاں جائز ہی نہیں ہے، پھر اس کی شرعی حیثیت؟

جواب:- حدیث میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد موجود ہے: **''أیما أھاب دبغ فقد طھر''** أو كما قال عليه السلام، (اخرجه مسلم في صحيحه)۔[۲] یعنی جس کھال کو بھی دباغت دے دی جائے تو وہ پاک ہوجاتی ہے۔ دُوسرے دلائل کی روشنی میں اس سے صرف خنزیر اور انسان کی کھال کو مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ اس لئے فقہائے کرامؒ لکھتے ہیں: **كل أهاب دبغ فقد طهر جازت الصلوة فيه والوضوء منه الا جلد الخنزير والآدمي ..... وليس الكلب نجس العين، ألا ترى أنه ينتفع به حراسة واصطيادًا بخلاف الخنزير.** (هداية ص: ۴۰، ۴۱)۔[۳]

ان عبارتوں سے معلوم ہوگیا کہ کتے کی کھال دباغت سے پاک ہوجاتی ہے، اور کتے کا حکم خنزیر کی طرح نہیں ہے جو کسی حال پاک نہیں ہوتا، اور کتے کو ذبح کرنا کھانے کے لئے نہیں ہوتا بلکہ اس کی کھال وغیرہ استعمال کرنے کے لئے ہوسکتا ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۲۶/۱۸ الف)

---

(۱) جیسا کہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا ہے کہ: ''یہ مسئلہ ائمہ کے درمیان مختلف فیہ ہے، سخت ضرورت ..... میں دُوسرے امام کے قول کو لے لینا جائز ہے، اس لئے جو شخص دُوسرے طریقے سے نہ دُھلوا سکے اس کے لئے پاکی کا حکم کیا جائے گا۔ دیکھئے امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۸۰۔

(۲) وفي الصحيح للامام مسلمؒ ج:۱ ص:۱۵۹ (طبع قديمي كتب خانه) عن عبدالله بن عباسؓ قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: اذا دبغ الاهاب فقد طهر.

(۳) (طبع مكتبه شركت علميه). وفي الدر المختار ج:۱ ص:۲۰۳، ۲۰۴ (وكل اهاب دبغ وهو يحتملها طهر) ... (وما) أي أهاب (طهر به) بدباغ (طهر بذكاة)، وفي البحر الرائق ج:۲ ص:۹۱ (وبعد بياع وينتفع به) وقيد بالميتة، لأن جلد المذكاة يجوز بيعه قبل الدباغ.

ذبح کرنا کوئی فرض واجب نہیں، اگر کوئی شخص کرلے تو اس کا حکم لکھا ہے۔

محمد عاشق الٰہی بلند شہری

کیا دھوبی سے کپڑے دُھلانے کے بعد دوبارہ دھونا ضروری ہے؟

سوال:- کیا کسی فیکٹری کے دھوبی سے کپڑے دُھلوانے سے کپڑے پاک ہوجاتے ہیں یا نہیں؟

جواب:- یہ تو فیکٹری کے طریقِ کار پر منحصر ہے۔ اگر وہ کپڑوں کو پاک کرنے کا اہتمام کریں یعنی کپڑوں کا میل کاٹ کر انہیں سکھانے سے پہلے ہر کپڑے کو الگ الگ تین مرتبہ دھولیں تب تو کپڑوں کے پاک ہونے میں کوئی شبہ ہی نہیں ہے، اور اگر کوئی اور طریقہ اختیار کرتے ہیں تو اس کی وضاحت کی جائے۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۶/۱۲ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

دھوبی سے کپڑا دُھلوانے کے بعد کیا دوبارہ پاک کرنا ضروری ہے؟ اور کیا کپڑا پاک کرتے وقت کلمۂ طیبہ پڑھنا ضروری ہے؟

سوال:- کپڑوں کی دُھلائی کے بعد اس کو پاک کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر ضروری ہے تو کس صورت میں؟ اور کیا اس وقت کلمۂ طیبہ پڑھنا ضروری ہے؟

جواب:- اگر کپڑے دھونے والے نے دھوتے وقت پاک کرنے کا اہتمام کیا ہے تب تو دوبارہ پاک کرنے کی ضرورت نہیں، اور اگر یہ معلوم ہو کہ دھوتے وقت پاکی کا اہتمام نہیں ہوا تو بعد میں پاک کرلیں۔ اور پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اسے اتنا دھویا جائے کہ نجاست کا اثر زائل ہوجائے، تین مرتبہ دھولیں تو بہتر ہے، اور اس وقت کلمۂ طیبہ پڑھنا ضروری نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۱۰/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۱۰۱۵ ج)

ہاتھی کی سونڈ سے نکلنے والے پانی کا حکم
مچھلی کا پِتہ پاک ہے یا نہیں؟

سوال ۱:- ہاتھی کی سونڈ سے جو پانی نکلتا ہے وہ عادۃً گرمی کے سبب اپنے بدن پر چھڑکا کرتا ہے، یہ پانی پاک ہے یا نہیں؟

۲:- مچھلی کا پِتہ پاک ہے یا نہیں؟

جواب ۱:- ہاتھی کی سونڈ کا پانی دراصل اس کا لعاب ہے، جو فقہاءؒ کی تصریحات کے مطابق ناپاک ہے، درمختار میں ہے: "وسؤر (خنزیر وکلب وسباع بهائم) ومنه الهرة البرية (وشارب خمر فور شربها وهرة فور أكل فارة نجس)" اور سباع بہائم کے تحت علامہ ابنِ عابدین شامیؒ رقم طراز ہیں: هي ما كان يصطاد بنابه كالأسد والذئب والفهد والنمر والثعلب والفيل .... الخ. (شامي استنبولي "مطلب في السور" ج:۱ ص:۲۰۵)۔[1]

اس سے معلوم ہوا کہ ہاتھی کا جھوٹا نجس ہے، جو لعاب ہی کی فرع ہے، جیسا کہ عالمگیریہ میں ہے: عرق كل شئ معتبر بسؤره. (ج:۱ ص:۲۴)۔[2] اور فتاویٰ قاضی خان میں خود سوالِ مذکور کا جواب بایں طور مصرح ہے: لعاب الفيل نجس كلعاب الفهد والأسد اذا أصاب الثوب بخرطومه ينجسه. (خانية ج:۱ ص:۱۷)۔[3] لہٰذا ہاتھی کی سونڈ سے نکلنے والا پانی ناپاک ہے۔

۲:- کوئی جزئیہ تو نہیں مل سکا، البتہ چونکہ مچھلی کا خون ناپاک نہیں ہے جیسا کہ علامہ علاء الدین حصکفیؒ نے درمختار میں تصریح کی ہے، اور علامہ شامیؒ نے اس کے تحت تحریر فرمایا ہے: لأنه ليس بدم حقيقة، لأنه اذا يبس يبيض والدم يسود. (رد المحتار، باب الأنجاس ج:۱ ص:۲۹۴)۔[4]

یعنی مچھلی کا خون درحقیقت خون نہیں، چونکہ وہ خشک ہونے کے بعد سفید ہوجاتا ہے، حالانکہ خون خشکی کے بعد سیاہ رہتا ہے، اس لئے خون پر قیاس کر کے پتہ کو بھی پاک کہنا بعید از قیاس معلوم نہیں ہوتا۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ خون پر پتے کو قیاس کرنا اس لئے دُرست نہیں کہ پتہ حرام ہے، جیسا کہ علامہ شامیؒ نے کتاب الذبائح ج:۵ ص:۲۷۱ میں ذکر فرمایا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ کسی چیز کی حرمت سے اس کی نجاست لازم نہیں، جیسے کہ زہر کا استعمال ناجائز ہے، اس کے باوجود اس وجہ سے وہ نجس نہیں ہوتا، اسی طرح پتہ بھی ایک سمیاتی اثرات کا مجموعہ ہے، جو سمیت کی وجہ سے اگر ناجائز ہو تو اس سے اس کی پاکی پر اثر نہیں پڑتا۔

اس تحریر کے بعد ایک عبارتِ مصرحہ پر نظر پڑی: ومرارة كل شئ كبوله. (عالمگیرية ج:۱ ص:۴۷)۔[5] ہر چیز کا پتہ حکم میں اس کے پیشاب کی طرح ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ناپاک ہے،

---

(۱) شامية ج:۱ ص:۲۲۳ (طبع ایچ ایم سعید).
(۲) فتاویٰ عالمگیریة ج:۱ ص:۲۳ (طبع مکتبہ رشدیہ، کوئٹہ).
(۳) خانية على هامش الهندية ج:۱ ص:۲۱ (أيضًا).
(۴) فتاویٰ شامية ج:۱ ص:۳۱۹ (طبع ایچ ایم سعید)
(۵) فتاویٰ عالمگیریة ج:۱ ص:۴۶ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ). وفي الدر المختار ج:۱ ص:۳۴۹ (طبع سعید) مرارة كل حيوان كبوله .... الخ. نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۵۲۔ (محمد زبیر حق نواز)۔

لیکن مچھلی کا پیشاب ہونا خود مشکوک ہے، اس لئے دُوسرے اہلِ علم سے بھی رُجوع کرلیا جائے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۷۹/۱۱/۲۳ھ[1]

ہاتھ پر نجاست لگنے کی صورت میں کتنی مرتبہ دھونا لازم ہے؟

سوال:- ہاتھ پر پیشاب لگ گیا، پانی سے اتنا دھویا جتنی دیر میں تین بار پانی ڈالا جاتا ہے، تو پاک ہوگیا یا الگ الگ دو مرتبہ اور دھوئیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں ہاتھ کو اتنا دھونا ضروری ہے کہ پیشاب کے ہاتھ سے چھوٹ جانے کا غالب گمان ہوجائے، الگ الگ تین مرتبہ پانی ڈالنا ضروری نہیں، لما فی الدر المختار: ویطهر محل غیرها أی غیر مرئیة بغلبة ظن غاسل طهارة محلها بلا عدد، به یفتی. (شامی ج:۱ ص:۲۲۰)[2]۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۰ھ
(فتویٰ نمبر ۹۳۶/۲۸ الف)

جوتے یا چپل وغیرہ کو وضوخانے میں دھونے کا حکم

سوال:- جوتا اور چپل خراب ہوجائے اور گیلی مٹی لگ جائے یا خراب پانی میں گر جائے تو کیا وضوخانے میں دھویا جاسکتا ہے؟

جواب:- بہتر یہ ہے کہ اس قسم کی چیزوں کو مسجد کے وضوخانے کے بجائے کسی اور جگہ دھویا جائے، لیکن اگر ضرورت کے وقت وہاں جوتے دھولئے جائیں تو مضائقہ نہیں، البتہ پھر اس جگہ کو صاف کردینا چاہئے تاکہ نمازیوں کو تکلیف نہ ہو۔

واللہ اعلم
۱۳۹۶/۹/۲۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۲۸۳/۲۷)

---

(۱) یہ فتویٰ حضرت والا دامت برکاتہم کی تمرین افتاء (دورِ تخصص) کی کاپی سے لیا گیا ہے۔
(۲) الدر المختار ج:۱ ص:۳۳۱ (طبع ایچ ایم سعید)۔ (محمد زبیر حق نواز)

﴿فصل فی أحکام الماء﴾

(پانی اور کنویں وغیرہ سے متعلق مسائل کا بیان)

تالاب سے پانی لیتے وقت اگر گھڑے میں مینگنی آجائے تو کیا کرے؟

سوال:- ہمارے علاقے میں پانی جمع کرنے کی غرض سے تالاب بنے ہوئے ہیں، بارش کا پانی اس میں جمع ہوتا ہے، کبھی کبھی جب ہم اس سے پانی لیتے ہیں تو اس میں ایک آدھی مینگنی یا گوبر آجاتا ہے، کیا یہ پانی پاک ہے یا نہیں؟

جواب:- تالاب سے پانی لیتے وقت کوئی مینگنی آجائے تو اسے گھڑے سے نکال کر پھینک دے تو پانی پاک ہوگا، اور اگر مینگنی گھڑے میں رہ گئی تو احتیاط اس میں ہے کہ اس سے وضو اور غسل نہ کیا جائے، فی الھدایۃ: فان وقعت فیھا بعرۃ أو بعرتان من بعر الابل أو الغنم لم تفسد الماء الی قولہ: ولا یعفی القلیل فی الاناء علی ما قیل لعدم الضرورۃ، وعن أبی حنیفۃ أنہ کالبیر فی حق البعرۃ والبعرتین. (ھدایۃ ج:۱ ص:۴۲)-[۱] وفی فتح القدیر: فی الشاۃ تبعر فی المحلب قالوا: ترمی البعرۃ أی من ساعتہ فلو أخر .... لا یجوز. (ص:۶۹)-[۲]

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۱۴ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۴۵۵/۱۸ الف)

''دہ در دہ'' حوض میں نجاست گرنے کا حکم

سوال:- ایک مسجد کا حوض پختہ ''دہ در دہ'' پانی سے بھرا ہوا تھا، اس میں چند ٹین کے لوٹے گرگئے جن کے نکالنے کے لئے بندوبست کیا گیا، ان لوٹوں کے ساتھ تین چپل بھی نکل آئے، یہ معلوم نہیں کہ کب سے گری ہوئی تھیں؟ چونکہ ماءِ کثیر تھا تو زید (امام مسجد) نے تمام پانی نکلوادیا اور حوض خالی ہوگیا، آج کل پانی کی جو قلت ہے وہ ظاہر ہے، اور جواب میں مولانا عبدالحی کا یہ سوال و جواب پیش کیا:-

سوال:- اگر حوض دہ در دہ تھا اور پانی کم ہوجانے پر اس میں نجاست پڑی پھر

---

(۱) (طبع مکتبہ شرکت علمیہ). (۲) فتح القدیر ج:۱ ص:۸۷ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ).

حوض میں پانی آ گیا اور وہ بھر گیا اور کوئی چیز ان میں سے باہر نہیں نکلی تو وہ حوض کا پانی دُرست ہے یا نہیں؟

جواب:- بعض کے نزدیک دُرست ہے، اور بعض کے نزدیک دُرست نہیں ہے۔

جواب:- حوض کا پانی اگر کثیر (دہ در دہ) ہو تو اس میں نجاست کے گرنے سے پانی ناپاک نہیں ہوتا جب تک کہ پانی کا رنگ، بو یا مزہ نہ بدل جائے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر پانی کے اندر کوئی تغیر پیدا نہیں ہوا تھا تو حوض خالی کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔[1] فتاویٰ مولانا عبدالحی کا جو سوال و جواب[2] نقل کیا گیا ہے اس سے استدلال دُرست نہیں ہے، اس کی صورت بالکل مختلف ہے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۵/۲۳ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۵۹۵/۱۹ الف)

کنویں میں سانپ گرنے کی صورت میں کیا حکم ہے؟

سوال:- ایک کنویں میں سانپ کا بچہ سوا گز لمبا اور ایک انچ موٹا مرکر سڑ گیا اور جدا نہیں ہوا، آیا اس کے نکالنے سے پانی صاف ہے یا ناپاک؟ اور اگر سارا پانی نکالنا ہے تو اس میں بہت دُشواری ہے، اگر یہ سانپ نہ نکالا جائے تو کیا حکم ہے؟

جواب:- اگر سانپ خون والا تھا تو مطلقاً پانی ناپاک ہے، اور اس کو نکالنے کے بعد کنویں کا تمام پانی نکالنا واجب ہے۔ رہی دُشواری سو اگر وہ اس وجہ سے ہے کہ کنواں تلی توڑ ہے (یعنی اس میں ہر وقت پانی آتا رہتا ہے) تب تو اس قدر پانی نکالنا کافی ہوجائے گا جتنا کہ نکالنا شروع کرتے وقت ہے، اور اس کا اندازہ دو ایسے عادل شخص لگائیں جن کو کنویں کی مساحت وغیرہ میں مہارتِ تامہ حاصل ہو، اس کے بعد جو پانی آئے گا وہ پاک ہوگا۔ اور اگر دُشواری عام کنووں میں بھی معلوم ہوتی ہے تو وہ

---

(۱) وفي الدر المختار ج:۱ ص:۱۹۰ الى ۱۹۲ وكذا يجوز براكد كثير كذلك أى وقع فيه نجس لم ير أثره .... لـكن فى النهر وانت خبير بأن اعتبار العشر اضبط .... الخ. وفى الشامية قوله: لم ير أثره أى من طعم أو لون أو ريح .... الخ. وفى شرح الوقاية كتاب الطهارات ج:۱ ص:۸۰ (طبع ايج ايم سعيد) ولا بماء راكد وقع فيه نجس الا اذا كان عشرة أذرع فى عشرة أذرع ولا ينحسر أرضه بالغرف فحكمه حكم الماء الجارى. نیز دیکھئے: فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ج:۱ ص:۱۴۹ سوال نمبر ۱۷۵، ۱۷۷، و ج:۱ ص:۱۳۹۔

(۲) دیکھئے: مجموعۃ الفتاویٰ فارسی ج:۳ ص:۲۸ و معلّم الفقہ اردو ترجمہ مجموعۃ الفتاویٰ علامہ عبدالحی لکھنوی (طبع قدیم) باب الحوض ج:۱ ص:۲۰۰ (طبع میر محمد کتاب خانہ)۔

شرعاً معتبر نہیں، پورا پانی نکالنا ضروری ہوگا، جس کے دلائل حسبِ ذیل ہیں:-

۱:- تنویر الابصار میں ہے: اذا وقعت نجاسة فی بئر دون القدر الکثیر أو مات فیها حیوان دموی وانتفخ أو تفسخ ینزح کل مائها بعد اخراجه. (شامی ج:۱ ص:۱۶۵، ۱۶۶)۔[1]

۲:- درمختار میں ہے: (وان تعذر) نزح کلها لکونها معینا (فبقدر ما فیها) وقت ابتداء النزح قاله الحلبی (یؤخذ ذٰلک بقول رجلین عدلین لهما بصارة بالماء) به یفتی. (شامی ج:۱ ص:۱۹۸)۔[2]

اور اگر سانپ خون والا نہیں تھا تو اس کے گرنے سے پانی ناپاک نہیں ہے، اس کو نکالنے کے بعد مزید پانی نکالنے کی حاجت نہیں۔ درمختار میں ہے:-

(ویجوز) رفع الحدث (بما ذکر وان مات فیه) أی الماء ولو قلیلا (غیر دموی کزنبور ومائی مولد کسمک وسرطان) وضفدع الا بریاله دم سائل وهو ما لا سترة له بین أصابعه فیفسد فی الأصح کحیة بریة ان لها دم والا لا۔ اور علامہ شامیؒ "والا لا" کے تحت تحریر فرماتے ہیں: أی وان لم یکن للضفدع البریة والحیة البریة دم سائل فلا یفسد. (شامی ج:۱ ص:۱۷۱)۔[3]

یہ تفصیل اس صورت میں تھی جبکہ سانپ خشکی کا ہو، اور اگر پانی کا سانپ ہے تو وہ مطلقاً بہر صورت پانی کو فاسد نہیں کرتا، جیسا کہ علامہ ابن عابدینؒ نے لکھا ہے: أما المائیة فلا تفسد مطلقا کما علم مما مر. (رد المحتار ج:۱ ص:۱۷۱)۔[4]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۷۹/۱۱/۲۷ھ[5]

کیا ٹینکی سے آنے والا پانی "ماءِ جاری" کے حکم میں ہے؟

سوال:- آج کل پائپ سسٹم میں یہ رواج ہے کہ مکان کی چھت پر پانی کی ایک ٹینکی ہوتی ہے، اور ہینڈ پمپ کے ذریعہ نیچے سے اس میں پانی جمع کرلیا جاتا ہے، اس ٹینکی سے تمام مکان میں پانی پہنچایا جاتا ہے، تو اگر اُوپر سے پانی ٹینکی میں ڈالا جارہا ہو اور نیچے سے پائپ کے ذریعہ پانی نکل رہا ہو تو کیا یہ پانی "ماءِ جاری" ہوگا یا نہیں؟

---

(۱) ج:۱ ص:۲۱۱، ۲۱۲ (طبع ایچ ایم سعید)۔
(۲) الدر المختار ج:۱ ص:۲۱۴ (أیضاً)
(۳) شامیة ج:۱ ص:۱۸۳ الی ۱۸۵ (طبع ایچ ایم سعید)۔
(۴) شامیة ج:۱ ص:۱۸۵ (طبع سعید)
(۵) یہ فتویٰ حضرت والا دامت برکاتہم کی تمرینِ افتاء (درجۂ تخصص) کی کاپی سے لیا گیا ہے۔ (محمد زبیر)

اور اگر ایسی ٹینکی میں نجاست اس وقت گرے جبکہ پانی ٹھہرا ہوا ہو، کسی ایک جانب سے یا دونوں جانبوں سے پانی نہ نکل رہا ہو تو کیا جس وقت پانی جاری ہوگا اس وقت وہ ٹینکی پاک ہو جائے گی یا نہیں؟

جواب:- قال فی منیة المصلی عن أبی یوسفؒ ماء الحمام بمنزلة الماء الجاری ...... (واختلف المتأخرون فی بیان هذا القول، قال بعضهم: مراده حالة مخصوصة وهو .... اذا کان الماء یجری من الأنبوب الی حوض الحمام والناس یغترفون منه غرفا متدارکا) وقال تحته العلامة الحلبی نقلا عن فتاوی قاضی خان: وان کان الناس یغترفون من الحوض بقصاعهم ولا یدخل من الأنبوب ماء أو علی العکس اختلفوا فیه، وأکثرهم علی أنّه یتنجس ماء الحوض، وان کان الناس یغترفون بقصاعهم ویدخل الماء من الأنبوب اختلفوا فیه وأکثرهم علٰی أنه لا یتنجس (انتهٰی) فهٰذا هو الذی ینبغی أن یعتمد علیه. (کبیری شرح منیة ص:۱۰۰)[۱]۔

وقال العلامة طاهر البخاریؒ: وفی الفتاوی وحوض الماء اذا اغترف رجل منه وبیده نجاسة وکان الماء یدخل من أنبوبه فی الحوض والناس یغترفون من الحوض غرفا متدارکا لم یتنجس. (خلاصة الفتاوی ج:۱ ص:۵، طبع امجد اکیڈمی لاهور)، ومثله فی الدر المختار علی الشامی ج:۱ ص:۹۰۔

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ وہ حوضِ صغیر جس کے ایک جانب سے پائپ کے ذریعہ پانی آرہا ہو اور دُوسری جانب سے اس میں سے پانی بھر رہے ہوں تو ''ماءِ جاری'' کے حکم میں ہے۔ آج کل جو ٹینکوں کی صورت مروّج ہے وہ بھی بظاہر اس میں داخل ہے۔ مگر اس پر یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ علامہ شامیؒ نے اس حکم کو اس صورت میں خاص کیا ہے کہ جیسے پانی اوپری کی طرف سے نکالا جا رہا ہو، اور اگر نیچے سے کسی سوراخ وغیرہ کے ذریعے سے پانی نکل رہا ہو جیسا کہ مروجہ چھت کی ٹنکیوں سے بذریعہ پائپ نکلتا ہے تو اس صورت میں یہ حکم نہ ہوگا۔

اس کا جواب میرے خیال میں یہ ہے کہ علامہ شامیؒ نے یہ حکم حوض کے بارے میں بیان فرمایا[۲] اور اس کی تلی میں اگر سوراخ ہو تو یقیناً وہ اس حکم میں نہ ہوگا، کیونکہ اس وقت حوض سے پانی کا خروج نہایت سست رفتار سے اور بہت کم ہوگا۔ بخلاف اس صورت کے کہ ٹینکی سے پانی پوری قوت و

(۱) غنیة المتملی ص:۱۰۲، ۱۰۳ (طبع سہیل اکیڈمی لاہور)۔
(۲) شامی مطلب لو أدخل الماء من أعلی الحوض وخرج أسفله فلیس بجار ج:۱ ص:۱۹۰۔

شدت کے ساتھ نیچے بہتا ہو، ان دونوں میں فرق ہوگیا۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۰/۵/۸ھ[2]

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

ہندو خاکروب کی دھوئی ہوئی جگہ پر نماز پڑھنے کا حکم

سوال:- صدرِ مملکت پاکستان نے جیسا کہ حکم صادر کیا ہے کہ تمام سرکاری دفاتر میں نماز ادا کی جائے، ہمارے یہاں ہندو خاکروب ہیں، اس سے ہم وہ جگہ جو ہم نے نماز کے لئے تجویز کی ہے پانی سے دُھلانا چاہتے ہیں، اگر وہ ہندو خاکروب اپنے ہاتھ پاؤں دھوکر اس جگہ کی دُھلائی کرے تو اس جگہ پر نماز پڑھنا دُرست ہے؟

جواب:- مذکورہ ہندو خاکروب اپنے ہاتھ پاؤں دھوکر اگر زمین کو دھوئے اور اگر جھاڑو استعمال کرے تو وہ پاک ہو تو اس جگہ نماز پڑھی جاسکتی ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۹/۱/۱۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۱۴/۳۰ الف)

(۱) تفصیل کے لئے ”خیر الکلام فی حوض الحمام“ مصنفہ حضرت مفتیٔ اعظم پاکستان مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ کا مطالعہ فرمائیں۔
(۲) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم کی تمرینِ افتاء (درجۂ تخصص) کی کاپی سے لیا گیا ہے۔

﴿فصل فی أحکام الجنب والمعذور﴾
(جنبی اور معذور سے متعلق مسائل کا بیان)

غسلِ جنابت میں سر کا تیل چھڑانا ضروری نہیں

سوال:- کیا غسلِ جنابت میں سر کا تیل چھڑانا ضروری ہے؟ اور تکیہ، بستر وغیرہ کا دھونا ضروری ہے؟

جواب:- غسلِ جنابت میں سر کا تیل چھڑانا ضروری نہیں، تاہم چھڑا دیں تو بہتر ہے۔

فی الدر المختار: ولا یمنع الطھارۃ ونیم .... وحناء ولو جرمہ، بہ یفتی ودرن ووسخ ....، وکذا دھن ودسومۃ، وفی رد المحتار أی کزیت وشیرج بخلاف نحو شحم وسمن جامد. (شامی ج:۱ ص:۱۰۴)[1]

سوال:- تیل لگے ہوئے سر پر کوئی پرندہ بیٹ کر دے تو صرف پانی سے بال دھونا کافی ہے یا تیل چھڑانا ضروری ہے؟

جواب:- جانور کی بیٹ چھڑا لینی چاہئے، تیل چھڑانے کا حکم اُوپر آ گیا، اور جتنی چکناہٹ کا ازالہ ممکن ہو، کر لے اور جس کا ازالہ متعذر ہو وہ معاف ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۱۳ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۵۸۸ ب)

حالتِ جنابت میں دُرود شریف پڑھنے کا حکم

سوال:- حالتِ جنابت میں دُرود شریف کا معمول پورا کر سکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- حالتِ جنابت میں صرف قرآنِ کریم کی تلاوت ممنوع ہے، لیکن دُعائیں، اذکار و تسبیحات اور دُرود شریف پڑھنا، ناجائز نہیں، البتہ مستحب یہ ہے کہ دُرود شریف اور اذکار و دُعا کے لئے

---

(۱) رد المحتار ج:۱ ص:۱۵۴ (طبع سعید). وفی الھندیۃ الفصل الأول فی فرائضہ ج:۱ ص:۱۴ (طبع ماجدیہ کوئٹہ) واذا ادھن فامر الماء فلم یصل یجزئ .... الخ.

کم ازکم وضو کرلے۔ لما فی الدر المختار: ولا بأس لحائض وجنب بقراءة أدعية ومسها وحملها وذكر الله تعالى وتسبيح، وقال الشامي: الى أن وضوء الجنب لهٰذه الأشياء مستحب كوضوء المحدث. (شامی ج:۱ ص:۱۹۳)[۱]۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۳/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۳۲۶/۲۸ ب)

جنابت کی حالت میں قرآن چھونے کا حکم

سوال:- ایک شخص پر غسل واجب ہے، وضو کرکے قرآن مجید پر ہاتھ لگا کر پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- جنابت کی حالت میں جب انسان پر غسل واجب ہو اس کے لئے قرآنِ کریم کا چھونا، پڑھنا سب ناجائز ہے[۲]، اور صرف وضو کرنے سے جنابت ختم نہیں ہوتی، اس لئے صرف وضو کرنے سے قرآنِ کریم کا چھونا یا پڑھنا بھی جائز نہیں ہوتا، اس کے لئے غسل ضروری ہے۔

واللہ اعلم بالصواب
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۲/۱۷ھ

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۴۶۷/۱۸ الف)

ایک ہی شب میں دوبارہ ہم بستری کے لئے غسلِ جنابت ضروری نہیں

سوال:- اپنی بیوی سے صحبت کرنے کے بعد اگر دوبارہ خواہش ہو تو کیا دوبارہ صحبت کے لئے غسلِ جنابت کرنا ضروری ہے؟

(۱، ۲) فتاوی شامية ج:۱ ص:۲۹۳ (طبع ایچ ایم سعید). وفی مشكوة المصابيح ج:۱ ص:۴۹ (طبع قديمی كتب خانه) عن ابن عمرؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا تقرأ الحائض ولا الجنب شيئا من القرآن. (رواه الترمذی). وفی المرقاة تحته ج:۲ ص:۱۲۰ وفی شرح السنة اتفقوا على ان الجنب لا يجوز له قراءة القرآن .... والحاصل ان جمهور العلماء على الحرمة، اذ هی اللائقة بتعظيم القرآن وفی الدلالة عليها الأحاديث الكثيرة المصرحة بها وان كانت كلها ضعيفة، لأن تعدد طرقها يورثها قوة أی قوة وترقيها الى درجة الحسن لغيره وهو حجة فی الأحكام.
وفی الدر المختار ج:۱ ص:۱۷۲ ويحرم به تلاوة قرآن ولو دون آية على المختار بقصده ومسه.
وفی الهندية ج:۱ ص:۳۸ ومنها حرمة قراءة القرآن لا تقرأ الحائض والنفساء والجنب شيئا من القرآن، والآية وما دونها سواء فی التحريم على الأصح. (محمد زبیر حق نواز)

جواب:- دوبارہ صحبت کرنے کے لئے غسلِ جنابت ضروری نہیں، البتہ بیچ میں وضو کر لینا بہتر ہے۔[۱]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۵/۶ھ
(فتویٰ نمبر ۴۵۱/ ۲۸ ب)

کئی مرتبہ ہم بستری کے بعد ایک غسلِ جنابت کافی ہے

سوال:- کیا اپنی بیوی سے ایک شب میں جتنی مرتبہ ہم بستری کی جائے اتنی مرتبہ غسل کرنا بھی ضروری ہوگا؟ یعنی ایک شب میں ایک دفعہ ہم بستری ہوگئی، تو دُوسری دفعہ تب ہم بستری کرے کہ پہلے غسل کرے؟ ورنہ یہ فعل حرام ہے؟

جواب:- ایک شب میں ہم بستری خواہ کتنی مرتبہ کی جائے سب کے لئے آخر میں ایک غسل کافی ہے،[۲] البتہ اگر کسی ہم بستری کے بعد غسل کرلیا تو آئندہ ہم بستری کے بعد نیا غسل کرنا ہوگا۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۲۰ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۵۳/ ۱۸ الف)

لیکن ہر بار غسل کرنا افضل ہے، اور یہ مشکل ہو تو صرف وضو کرے، اور وہ بھی نہ ہوسکے تو کوئی گناہ نہیں، آخر میں غسل کرے۔[۳]

محمد عاشق الٰہی

ایک ہی شب میں دوبارہ ہم بستری سے پہلے اگر غسل نہ کرے تو کیا حکم ہے؟

سوال:- عورت کے ساتھ ہم بستری کرنے کے بعد دوبارہ اگر ہم بستری کی ہو تو دوبارہ غسل کرنا ضروری ہے یا اسی حالت میں ہم بستری کرسکتے ہیں؟

جواب:- دوبارہ ہم بستری کا ارادہ ہو تو پہلے غسل یا وضو کرلینا مستحب ہے، لیکن اگر نہ کرے تو کوئی گناہ بھی نہیں۔[۴]

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۱/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۱۵۶/ ۲۸ الف)

(۱ تا ۴) وفي مشكوة المصابيح ج:۱ ص:۴۹ (طبع قديمي كتب خانه) عن ابي سعيد الخدريؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: اذا أتى أحدكم أهله ثم أراد أن يعود فليتوضأ بينهما وضوء. (رواه مسلم). وفيه أيضًا بعده: عن أنس قال: كان النبي صلى الله عليه وسلم يطوف على نسائه بغسل واحد. (رواه مسلم).
وفي الدر المختار ج:۱ ص:۱۷۶، ۱۷۷ لا (يكره) معاودة أهله قبل اغتساله الا اذا احتلم لم يأت أهله. قال الحلبيؒ: ظاهر الحديث انما يفيد الندب لا نفي الجواز المفاد من كلامه.

پیشاب کے قطروں کی بناء پر کپڑے کی پاکی اور وضو کا حکم

سوال:- مثانے کی کمزوری کی بناء پر اکثر پیشاب سکھانے کے بعد قطرے نکل جاتے ہیں، اکثر وضو کرنے کے بعد ایسا ہوجاتا ہے، وضو اور کپڑے کی پاکی یا ناپاکی کا کیا حکم ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں جب قطرہ آئے تو کپڑا پاک کرکے وضو دوبارہ کیا جائے۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۹۷۰/۲۸ ج)

''لیکوریا'' کے پانی کا حکم اور اس سے متعلق متعدّد مسائل

سوال:- عورتوں کو لیکوریا کی بیماری ہوتی ہے، جس کی وجہ سے رحم سے سفید پانی رِستا رہتا ہے۔

۱:- کیا یہ سفید پانی نجاستِ خفیفہ ہے یا کہ نجاستِ غلیظہ؟

۲:- اگر کسی عورت کو یہ بیماری ہو اور وہ نماز بھی پڑھتی ہو، چونکہ پانی رِسنے کا کوئی خاص وقت مقرّر نہیں ہوتا تو کیا اس پانی کی وجہ سے کپڑے ناپاک ہوجاتے ہیں؟

۳:- باوضو ہونے کی صورت میں یہ پانی نکلے تو کیا وضو ٹوٹ جاتا ہے؟

۴:- اگر نماز کی ادائیگی کے دوران پانی نکل آئے تو کیا نماز ہوجاتی ہے؟

۵:- اگر نماز نہیں ہوتی تو اس سلسلے میں کیا طریقہ اختیار کیا جائے کہ نماز ضائع نہ ہو؟

۶:- شرعاً کیا اس قسم کے مریض کو معذور سمجھا جائے گا؟

جواب ۱:- لیکوریا کی بیماری میں جو پانی خارج ہوتا ہے وہ چونکہ رحم سے خارج ہوتا ہے اس لئے وہ مذی کی طرح نجاستِ غلیظہ ہے، ولیس ھو فی حکم رطوبۃ الفرج الداخل کما فی امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۶۵ و۴۷۔[۱]

۲:- اس سے کپڑے ناپاک ہوجاتے ہیں۔[۲]

۳:- اس کے نکلنے سے وضو بھی ٹوٹ جاتا ہے۔[۳]

(۱ تا ۳) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۳۱۳ أی رطوبۃ الفرج فیکون مفرعا علٰی قولھما بنجاستھا، وقال ابن عابدینؒ تحتہ: .... ومن وراء باطن الفرج فانہ نجس قطعًا ککل خارج من الباطن کالماء الخارج مع الولد أو قُبَیْلِہٖ.

۴:- نماز نہیں ہوگی، اِلّا یہ کہ معذوری کی وہ صورت ہوجائے جو نمبر۵ و ۶ کے جواب میں آرہی ہے۔

۵، ۶:- اگر یہ پانی ہر وقت بہتا رہتا ہے اور اتنا وقفہ بھی نہیں ملتا کہ اس میں چار رکعت نماز ادا کی جاسکے تو پھر یہ عورت ''معذور'' کے حکم میں ہے، ایسی عورت کے لئے جائز ہے کہ وہ ہر نماز کا وقت داخل ہونے پر وضو کرلے اور اس سے جتنی چاہے نمازیں نوافل وغیرہ پڑھتی رہے، جب تک اس نماز کا وقت رہے گا، اس کا وضو سیلان کا پانی نکلنے سے نہیں ٹوٹے گا، پھر جب دُوسری نماز کا وقت آئے تو اس کے لئے نیا وضو کرے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۲/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۲۳۳/۲۷ ء)

---

(۱) وفي الدر المختار ج:۱ ص:۳۰۵ وصاحب عذر من به سلس بول لا يمكنه امساكه أو استطلاق بطن ريح أو انفلات أو المستحاضة .... ان استوعب عذره تمام وقت صلاة مفروضة بأن لا يجد في جميع وقتها زمنا يتوضأ ويصلي فيه خاليا عن الحدث .. . وحكمه الوضوء .... لكل فرض .... ثم يصلي به فيه فرضا أو نفلا، فاذا خرج الوقت بطل.

﴿فصل فی الاستنجاء﴾

(استنجاء کے مسائل کا بیان)

کیا طہارت کے لئے ڈھیلا اور پانی دونوں استعمال کرنا ضروری ہے؟

سوال:- استنجے کے لئے مجھے دو بار ضرور جانا پڑتا ہے، پہلے مٹی استعمال کرتا ہوں، اور اس کے بعد پانی سے طہارت حاصل کرتا ہوں۔ میری سمجھ میں مجھ کو مکمل طہارت کے لئے ایسا کرنا پڑتا ہے، لیکن اس وقت بڑی تکلیف ہوتی ہے جبکہ جماعت نماز کے لئے کھڑی ہو اور میں سارا وقت استنجے میں صرف کردوں یا بارش وغیرہ کے وقت طہارت کے لئے مٹی کا ڈھیلا دستیاب نہیں ہوتا، اسی طرح سفر میں بھی مٹی دستیاب نہیں ہوتی۔ نماز اور حج وغیرہ میں اس کا اہتمام کرنے سے ارکان ہی چھوٹ جائیں گے، آخر کیا کروں؟ رہنمائی فرمائیں۔

جواب:- افضل تو بے شک یہی ہے کہ ڈھیلا اور پانی دونوں استعمال کئے جائیں، لیکن ضرورت کے وقت صرف پانی سے استنجا کرلینا بھی کافی ہے، اور اتنا دھویا جائے کہ نجاست باقی نہ رہے، زیادہ وہم میں پڑنا ٹھیک نہیں۔ ثم اعلم أن الجمع بين الماء والحجر أفضل ويليه في الفضل الاقتصار على الماء. (شامی ج:۱ ص:۲۲۶)[1]۔ والغسل بالماء الى أن يقع في قلبه أنه طهر ما لم يكن موسوسا. (درمختار ج:۱ ص:۲۲۵)[2]۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۲/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۵۸۸ ب)

پیشاب کے بعد ڈھیلا استعمال کرنا مسنون ہے اور صرف پانی کا استعمال بھی کافی ہے

سوال:- پیشاب کے بعد استعمال کے لئے ڈھیلا اگر میسر نہ آئے تو کیا صورت اختیار کرنی چاہئے؟ جبکہ دیوار بھی سنگِ مرمر کی ہو، اور ڈھیلا اور پانی کے استعمال کے بعد بھی کسی شخص کو قطرہ نکل

---

(۱) فتاوی شامية ج:۱ ص:۳۳۸ (طبع ایچ ایم سعید). وفي الهندية ج:۱ ص:۴۸ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ) والأفضل أن يجمع بينهما كذا في التبيين. (۲) الدر المختار ج:۱ ص:۳۴۲

آتا ہے تو اس کے لئے پاکی کیا صورت ہوگی؟

جواب:- پیشاب کے بعد ڈھیلا استعمال کرنا مسنون ہے، تاہم اگر ڈھیلا میسر نہ ہو تو صرف پانی بھی کافی ہے، لیکن صرف ڈھیلے پر اکتفاء نہیں کرنا چاہئے۔ ڈھیلے اور پانی دونوں کے استعمال کے بعد بھی اگر قطرہ آجائے تو استنجاء اور وضو دوبارہ کرلینا چاہئے اور کپڑا پاک کرلینا چاہئے۔

واللہ اعلم

۱۳۹۱/۴/۲۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲/۲۹۳ الف)

فصل فی المسح علی الخفین
(موزوں پر مسح سے متعلق مسائل کا بیان)

مروّجہ موزوں پر مسح کا مسئلہ

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ کن موزوں پر مسح کرنا دُرست ہے؟

الف:- جہاں تک چمڑے کے موزوں پر مسح کا تعلق ہے، اس کے جواز پر تقریباً تمام ہی علمائے کرام کا اتفاق ہے۔

البتہ اُونی، سوتی اور نائیلون وغیرہ کے موزوں پر مسح کے جائز ہونے کے بارے میں کچھ اختلاف ہے، بیشتر فقہاء اُونی اور سوتی موزوں پر مسح جائز ہونے کے بارے میں کچھ شرائط رکھتے ہیں۔

لیکن دورِ حاضر کے ایک مشہور صاحبِ فکر و بصیرت فرماتے ہیں کہ ہر قسم کے موزوں پر کسی قید کے بغیر مسح کرنا دُرست ہے۔

ب:- فقہائے کرام نے جو شرائط موزوں پر مسح کے جائز ہونے کی رکھی ہیں ان کے بارے میں مشہور مفکر فرماتے ہیں کہ:-

''میں نے اپنی امکانی حد تک یہ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان شرائط کا مأخذ کیا ہے؟ مگر سنت میں کوئی ایسی چیز نہ مل سکی۔''

سنت سے جو کچھ ثابت ہے وہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جرابوں اور جوتیوں پر مسح فرمایا ہے، نسائی کے سوا کتبِ سنن میں اور مسندِ احمد میں مغیرہ بن شعبہؓ کی روایت موجود ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا اور (مسح علی الجوربین والنعلین) اپنی جرابوں اور جوتوں پر مسح فرمایا۔ ابوداؤد کا بیان ہے کہ حضرت علی، عبداللہ بن مسعود، براء بن عازب، انس بن مالک، ابواُمامہ، سہیل بن سعد اور عمر بن حریث رضی اللہ عنہم نے جرابوں پر مسح کیا، نیز حضرت عمرؓ اور حضرت عباسؓ سے بھی یہ فعل مروی ہے، بلکہ بیہقی نے ابنِ عباسؓ اور انس بن مالکؓ سے، طحاوی نے اوس بن اوسؓ سے

روایت نقل کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف جوتوں پر مسح فرمایا، اس میں جرابوں کا ذکر نہیں ہے، اور یہی عمل حضرت علیؓ سے بھی منقول ہے، ان مختلف روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف جراب اور جرابیں پہنے ہوئے جوتے پر بھی مسح کرنا اسی طرح جائز ہے جس طرح چمڑے کے موزوں پر مسح کرنا دُرست ہے، ان روایات میں کہیں یہ نہیں ملتا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فقہاء کی تجویز کردہ شرائط میں سے کوئی شرط بیان فرمائی ہو، اور نہ ہی یہ ذکر کسی جگہ ملتا ہے کہ جن جرابوں پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اور صحابہ کرامؓ نے مسح فرمایا وہ کس چیز کی تھیں؟

اس لئے میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ فقہاء کی عائد کردہ ان شرائط کا کوئی مأخذ نہیں، اور فقہاءؒ چونکہ شارع نہیں اس لئے ان کی شرطوں پر اگر کوئی عمل نہ کرے تو وہ گناہگار نہ ہوگا۔ اس تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر قسم کے موزوں پر اطمینان کے ساتھ مسح کیا جاسکتا ہے چاہے وہ اُونی ہوں یا سوتی، نائیلون کے ہوں یا کسی اور ریشے کے، چمڑے کے ہوں یا آئل کلاتھ کے اور ریگزین کے، حد یہ کہ اگر پاؤں پر کپڑا لپیٹ کر بھی مسح کرلیا جائے تو یہ بھی جائز ہے۔

ان مفکر کے علاوہ علامہ ابنِ تیمیہؒ نے بھی اپنے فتویٰ کی کتاب جلد دوم میں یہ فتویٰ دیا ہے، اور حافظ ابنِ قیمؒ اور علامہ ابنِ حزمؒ کا بھی یہی مسلک ہے کہ کسی قید کے بغیر ہر قسم کے موزے پر مسح کیا جاسکتا ہے۔

آخر میں مستدعی ہوں کہ اپنے مصروف اوقات میں سے اس دینی مسئلے کو حل فرما کر مرسل فرمائیں، فتویٰ مدلل اور مفصل درکار ہے۔

آپ کے فتویٰ کا منتظر رہوں گا تاکہ اس اُلجھن سے نکل کر راہِ راست پاسکوں۔

منتظر الجواب

محمد طاہر غوری

چشتیاں، ضلع بہاول نگر

الجواب وباللہ التوفیق

جس قسم کے سوتی، اُونی یا نائیلون کے موزے آج کل رائج ہیں، ان پر مسح کرنا ائمۂ اربعہ میں سے کسی کے نزدیک جائز نہیں، آپ کا خیال غلط ہے کہ اس مسئلے میں فقہاءؒ کے درمیان کوئی اختلاف ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ایسے باریک موزوں کے بارے میں ائمۂ اربعہ اس پر متفق ہیں کہ ان پر مسح کرنا جائز نہیں ہے، چنانچہ ملک العلماء کاسانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:-

فان کانا رقیقین یشفان الماء لا یجوز المسح علیھما بالاجماع.
(بدائع الصنائع ج:۱ ص:۱۰)[۱]

پس اگر موزے اتنے باریک ہوں کہ ان میں سے پانی چھن سکتا ہو تو ان پر باجماع مسح جائز نہیں۔

اور علامہ ابنِ نجیم رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:-

ولا یجوز المسح علی الجورب الرقیق من غزل أو شعر بلا خلاف، ولو کان ثخینًا یمشی معہ فرسخًا فصاعدا .... فعلی الخلاف. (البحر الرائق ج:۱ ص:۱۹۲)[۲]

اس سے معلوم ہوا کہ جن موزوں میں "ثخین" کی شرائط نہ پائی جاتی ہوں، یعنی ان میں پانی چھن جاتا ہو، یا وہ کسی چیز سے باندھے بغیر محض اپنی موٹائی کی بناء پر کھڑے نہ رہ سکتے ہوں، یا ان میں ایک کوس تک بغیر جوتے کے چلنا ممکن نہ ہو، ان پر مسح کرنا کسی بھی مجتہد کے مذہب میں جائز نہیں، ہاں! جن موزوں میں یہ تینوں شرائط پائی جاتی ہوں، ان پر مسح کے جواز و عدمِ جواز میں اختلاف ہے۔

جہاں تک جناب مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا تعلق ہے، انہوں نے بہت سے مسائل میں جمہورِ اُمت سے الگ راستہ اختیار کیا ہے، یہ مسئلہ بھی ایسا ہی ہے جس میں انہوں نے جمہور فقہاء کی مخالفت کر کے سخت غلطی کی ہے، آپ نے ان کے جو دلائل ذکر کئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف نے مسئلے کی اصل حقیقت کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش ہی نہیں فرمائی۔ آپ کے اطمینان کے لئے مسئلے کی حقیقت مختصراً عرض کی جاتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے سورۂ مائدہ میں وضو کا جو طریقہ بیان فرمایا ہے اس میں پوری وضاحت کے ساتھ پاؤں کو دھونے کا حکم دیا ہے، نہ کہ ان پر مسح کرنے کا۔ لہٰذا قرآنِ کریم کی اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ وضو میں ہمیشہ پاؤں دھوئے جائیں، اور ان پر مسح کسی صورت میں بھی جائز نہ ہو، یہاں تک کہ جب کسی شخص نے چمڑے کے موزے پہنے ہوئے ہوں اس وقت بھی مسح کی اجازت نہ ہو، لیکن چمڑے کے موزوں پر مسح کی جو اجازت باجماعِ اُمت دی گئی، اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے موزوں پر مسح کرنا اور اس کی اجازت دینا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے تواتر کے ساتھ ثابت ہے جس کا انکار ممکن نہیں، اگر مسح علی الخفین کے جواز پر دو تین ہی حدیثیں ہوتیں تب بھی ان کی بناء پر قرآنِ کریم کے مذکورہ صریح حکم میں کوئی تقیید دُرست نہ ہوتی، کیونکہ اخبارِ آحاد سے قرآنِ کریم پر زیادتی یا اس کا نسخ

---

(۱) (طبع ایچ ایم سعید)۔
(۲) البحر الرائق باب المسح علی الخفین ج:۱ ص:۱۸۳ (طبع ایچ ایم سعید)۔

یا اس کی تقیید جائز نہیں ہوتی۔ لیکن چونکہ مسح علی الخفین کی احادیث معنیً متواتر ہیں، اس لئے ان متواتر احادیث کی روشنی میں تمام اُمت کا اس پر اجماع منعقد ہوگیا کہ قرآنِ کریم کی آیت میں پاؤں دھونے کا حکم اس صورت کے ساتھ مخصوص ہے جب انسان نے "خفین" (یعنی چمڑے کے موزے) نہ پہن رکھے ہوں، چنانچہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

ما قلت بالمسح حتی جاءنی فیه ضوء النهار۔ (البحر الرائق ج:۱ ص:۱۷۳)[۱]

میں مسح علی الخفین کا اس وقت تک قائل نہیں ہوا جب تک میرے پاس روزِ روشن کی طرح اس کے دلائل نہیں پہنچ گئے۔

چنانچہ "مسح علی الخفین" کا حکم اسّی (۸۰) صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے روایت کیا ہے، حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ فتح الباری میں لکھتے ہیں:-

وقد صرح جمع من الحفاظ بأن المسح على الخفين متواتر وجمع بعضهم رواته فجاوزوا الثمانين منهم العشرة۔ (نیل الاوطار ج:۲ ص:۱۷۶)[۲]

حفاظ کی ایک بڑی جماعت نے تصریح کی ہے کہ مسح علی الخفین کا حکم متواتر ہے، اور بعض حضرات نے اس کے روایت کرنے والے صحابہؓ کو جمع کیا تو وہ اسّی (۸۰) سے متجاوز تھے جن میں عشرۂ مبشرہ بھی شامل ہیں۔

اور حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

ادركت سبعين بدريا من الصحابة كلهم كانوا يرون المسح على الخفين۔

(تلخیص الحبیر ج:۱ ص:۱۵۸[۳] و بدائع ج:۱ ص۷۲)

اگر مسح علی الخفین کا حکم ایسے تواتر یا استفاضے کے ساتھ ثابت نہ ہوتا تو قرآنِ کریم نے پاؤں دھونے کا جو حکم دیا ہے اس میں کسی تخصیص یا تقیید کی گنجائش نہیں تھی، چنانچہ امام ابویوسفؒ فرماتے تھے:-

انما يجوز نسخ القرآن بالسنة اذا وردت كورود المسح على الخفين في الاستفاضة۔ (احکام القرآن للجصاص ج:۲ ص:۴۲۵)[۴]

---

(۱) البحر الرائق باب المسح على الخفين ج:۱ ص:۱۶۵ (طبع ایچ ایم سعید)، وكذا في فتح القدير ج:۱ ص:۱۲۶ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه)۔

(۲) نيل الأوطار للشوكاني أبواب المسح على الخفين باب في شرعيته ج:۱ ص ۱۵۵ (طبع مصطفى البابي، مصر)۔

(۳) وفي تلخيص الحبير باب المسح على الخفين ج:۱ ص:۲۲۸ (طبع مكتبة نزار مصطفى الباز، مكة المكرمة) عن الحسن البصري قال حدثني سبعون من أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم انه كان يمسح على الخفين۔ وكذا في نيل الأوطار للشوكاني أبواب المسح على الخفين باب في شرعيته ج:۱ ص:۱۵۵ (طبع قديم، مصر) والبحر الرائق ج:۱ ص:۱۶۵ (طبع ایچ ایم سعید)۔

(۴) احكام القرآن للجصاص رحمه الله، ذكر الخلاف في المسح على الخفين ج:۲ ص:۳۲۸ (طبع سهيل اكيڈمي لاهور)۔

سنتِ نبویہ سے قرآن کریم کے کسی حکم کو منسوخ (بمعنی مقید) کرنا اسی وقت جائز ہوسکتا ہے جب وہ سنت ایسے تواتر سے ثابت ہو جیسے مسح علی الخفین ثابت ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ وضو میں پاؤں دھونے کا قرآنی حکم ایسی چیز نہیں ہے جسے دو تین روایتوں کی بنیاد پر کسی خاص بات کے ساتھ مخصوص کردیا جائے، بلکہ اس کے لئے ایسا تواتر درکار ہے جیسے مسح علی الخفین کی احادیث کو حاصل ہے۔ اب ''خفین'' (چمڑے کے موزوں) کے بارے میں تو یہ تواتر موجود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر مسح خود بھی فرمایا اور دوسروں کو بھی اس کی اجازت دی، لیکن ''خفین'' کے سوا کسی چیز پر مسح کرنے کے بارے میں ایسا تواتر موجود نہیں ہے۔ اور ''خفین'' چونکہ عربی زبان میں صرف چمڑے کے موزوں کو کہتے ہیں، کپڑے کو موزوں کو ''خف'' نہیں کہا جاتا، اس لئے یہ اجازت صرف چمڑے ہی کے موزوں کے ساتھ مخصوص رہے گی، دوسرے موزوں کے بارے میں قرآن کریم کے اصلی حکم یعنی پاؤں دھونے پر ہی عمل ہوگا۔ ہاں! اگر کپڑے کے موزے اتنے ثخین (موٹے) ہوں کہ وہ اپنی خصوصیات اور اوصاف میں چمڑے کے ہم پایہ ہوگئے ہوں، یعنی نہ تو ان میں پانی چھنتا ہو، نہ انہیں کھڑا رکھنے کے لئے کسی بیرونی سہارے کی ضرورت ہو اور ان کو پہن کر تین میل چل سکتے ہوں تو ایسے موزوں کے بارے میں فقہاءؒ کے درمیان اختلاف ہوگیا، بعض فقہاء نے فرمایا کہ چونکہ ایسے موزے چمڑے ہی کے معنی میں آگئے ہیں اس لئے ان پر بھی مسح جائز ہونا چاہئے، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ چونکہ مسح کرنا تواتر کے ساتھ صرف خفین (چمڑے کے موزوں) پر ہی ثابت ہے، اس لئے ان پر مسح کرنا دُرست نہیں، گویا موزے تین قسم کے ہوگئے:-

۱:- چمڑے کے موزے جنہیں خفین کہا جاتا ہے، ان پر مسح بالاجماع جائز ہے۔

۲:- وہ باریک موزے جو نہ چمڑے کے ہوں، اور نہ ان میں چمڑے کے اوصاف پائے جاتے ہوں، جیسے آج کل سوتی، اُونی یا نائیلون کے موزے، ان کے بارے میں اجماع ہے کہ ان پر مسح جائز نہیں کیونکہ ایسے موزوں پر مسح کرنا ایسے دلائل سے ثابت نہیں جن کی بناء پر پاؤں دھونے کے قرآنی حکم کو چھوڑا جاسکے۔

۳:- وہ موزے جو چمڑے کے تو نہیں ہیں، لیکن ان میں موٹے ہونے کی بناء پر اوصاف چمڑے ہی کے پائے جاتے ہیں، ان پر مسح کے جواز میں فقہاءؒ کا اختلاف ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو موزے چمڑے جیسے نہ ہوں، ان پر مسح کے عدمِ جواز میں مجتہدینِ اُمت کا کوئی اختلاف نہیں، اور اس کی وجہ یہی ہے کہ پاؤں دھونے کے قرآنی حکم کو اس وقت تک نہیں چھوڑا جاسکتا ہے جب تک کہ مسح کا حکم ایسے تواتر سے ثابت نہ ہوجائے جس تواتر سے مسح علی الخفین کا جواز

ثابت ہے۔ لہٰذا فقہائے کرامؒ نے کپڑے کے موزوں پر مسح کے لئے جو شرطیں لگائی ہیں وہ اپنی طرف سے نہیں لگائیں، بلکہ ان موزوں میں چمڑے کے اوصاف کے تحقق کے لئے لگائی ہیں، اور اس میں بھی اختلاف رہا ہے کہ ان شرائط کے تحقق کے بعد بھی ان پر مسح جائز ہے یا نہیں؟

حقیقتِ مسئلہ کی وضاحت کے بعد اب ان روایات کو دیکھئے جن میں جوربین (جرابوں) پر مسح کا ذکر آیا ہے، سارے ذخیرۂ حدیث میں یہ کل تین حدیثیں ہیں، ایک حضرت بلالؓ سے مروی ہے، ایک حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے، اور ایک حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے۔ حضرت بلالؓ کی حدیث معجم صغیر طبرانی میں ہے، اور حضرت ابوموسیٰؓ کی ابنِ ماجہؒ اور بیہقیؒ وغیرہ نے روایت کی ہے، لیکن حافظ زیلعیؒ نے ان دونوں کے بارے میں ثابت کیا ہے یہ دونوں سنداً ضعیف ہیں۔ (نصب الرایۃ ج:۱ ص:۱۸۳،۱۸۴)[1]

اور حضرت ابوموسیٰؓ کی حدیث کے بارے میں تو امام ابوداؤدؒ نے بھی لکھا ہے کہ:-

لیس بالمتصل ولا بالقوی.　　　　(بذل المجہود ج:۱ ص:۹۶)[2]

لہٰذا یہ دونوں روایتیں تو خارج از بحث ہیں۔

اب صرف حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی حدیث رہ جاتی ہے، اس کا معاملہ بھی یہ ہے کہ اگرچہ امام ترمذیؒ نے اسے ''حسن صحیح'' کہا ہے، لیکن دوسرے ائمۂ حدیث نے ان کے اس قول پر سخت تنقید کی ہے، امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کو روایت کر کے لکھتے ہیں:-

وکان عبدالرحمٰن بن مہدی لا یحدث بھذا الحدیث لأن المعروف عن المغیرۃ أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم مسح علی الخفین.　　　　(بذل المجہود ج:۱ ص:۹۶)[3]

حضرت عبدالرحمٰن بن مہدیؒ یہ حدیث بیان نہیں کیا کرتے تھے کیونکہ حضرت مغیرہؓ سے جو معروف روایتیں ہیں وہ مسح علی الخفین کی ہیں (نہ کہ جوربین پر مسح کی)۔

امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ سننِ کبریٰ میں لکھتے ہیں:-

لا نعلم احدا تابع أبا قیس علی ھذہ الروایۃ، والصحیح عن المغیرۃ أنہ علیہ السلام مسح علی الخفین.　　　　(نصب الرایۃ ج:۱ ص:۱۸۳)[4]

یہ روایت ابوقیس کے سوا کسی نے روایت نہیں کی، اور ہمارے علم میں کوئی اور راوی اس کی

---

(۱) (طبع مؤسسۃ الریان بیروت).

(۲) دیکھئے بذل المجھود فی حل أبی داؤد ج:۲ ص:۳۳ (طبع ندوۃ العلماء لکھنؤ). وکذا فی الکفایۃ علی ھامش فتح القدیر ج:۱ ص:۱۳۹ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ).

(۳) حوالہ بالا۔

(۴) نصب الرایۃ لأحادیث الھدایۃ ج:۱ ص:۱۸۴ (طبع مؤسسۃ الریان بیروت).

تائید نہیں کرتا، البتہ حضرت مغیرہؓ سے صحیح روایت مسح علی الخفین ہی کی ہے۔

اس کے علاوہ امام مسلمؒ، امام بیہقیؒ، سفیان ثوریؒ، امام احمدؒ، یحییٰ بن معینؒ، علی بن المدینیؒ اور دُوسرے محدثین نے اس روایت کو ابوقیس اور ہزیل بن شرجیل دونوں کے ضعف کی بناء پر ضعیف قرار دیا ہے، اور علامہ نوویؒ شارحِ صحیح مسلم لکھتے ہیں:-

کل واحد من هؤلاء لو انفرد قدم علی الترمذی مع ان الجرح مقدم علی التعدیل، واتفق الحفاظ علٰی تضعیفه، ولا یقبل قول الترمذی أنه حسن صحیح. (نصب الرایة بحوالہ بالا)[1]

جن حضرات نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے اگر ان میں سے ہر ایک تنہا ہوتا تب بھی وہ امام ترمذیؒ پر مقدم ہوتا، اس کے علاوہ یہ قاعدہ ہے کہ جرح، تعدیل پر مقدم ہوتی ہے، اور حفاظِ حدیث اس کی تضعیف پر متفق ہیں، لہٰذا ترمذی کا یہ قول کہ یہ ''حسن صحیح ہے'' قابلِ قبول نہیں۔

یہ ہے اس حدیث کی اسنادی حیثیت جسے مولانا مودودی صاحب نے اپنی دلیل میں پیش کیا ہے، آپ نے دیکھا کہ اوّل تو اکثر حفاظِ حدیث کے نزدیک یہ حدیث ضعیف اور ناقابلِ استدلال ہے۔ دُوسرے اگر بالفرض امام ترمذیؒ کے قول کے مطابق اسے صحیح مان لیا جائے تو پورے ذخیرۂ حدیث میں تنہا یہ ایک روایت ہوگی جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جوربین پر مسح کرنا مذکور ہے۔

اب آپ غور فرمائیے کہ قرآنِ کریم نے پاؤں دھونے کا جو صریح حکم دیا ہے، اسے صرف اس ایک روایت کی بناء پر کیسے چھوڑ دیا جائے؟ جبکہ ائمۂ حدیث نے اس پر شدید تنقید بھی کی ہے۔ آپ پیچھے دیکھ چکے ہیں کہ مسح علی الخفین کا حکم اس وقت ثابت ہوا کہ جب اس کی احادیث تواتر کی حد تک پہنچ گئیں، اور امام ابویوسفؒ فرماتے ہیں کہ اگر مسح علی الخفین کی احادیث اتنی کثرت کے ساتھ نہ ہوتیں تو پاؤں دھونے کے قرآنی حکم کو چھوڑنے کی گنجائش نہ تھی، لیکن مسح علی الجوربین کی احادیث متواتر تو کیا ہوتیں؟ پورے ذخیرۂ حدیث میں اس کی صرف تین روایتیں ہیں، ان میں سے دو تو بالاتفاق ضعیف ہیں، اور ایک کو اکثر محدثین نے ضعیف کہا ہے، صرف امام ترمذیؒ اسے صحیح کہتے ہیں۔ ایسی روایات کی بناء پر قرآنِ کریم کے کسی حکم میں کوئی تخصیص یا تقیید پیدا نہیں کی جاسکتی، چنانچہ امام ابوبکر جصاصؒ فرماتے ہیں:-

والأصل فیه أنه قد ثبت أن مراد الآیة الغسل علٰی ما قدمنا، فلو لم ترد الآثار المتواترة عن النبی صلی الله علیه وسلم فی المسح علی الخفین لما جاز لنا المسح ولما لم ترد الآثار فی جواز المسح علی الجوربین فی وزن ورودها فی المسح علی الخفین أبقینا

---

(۱) نصب الرایة لأحادیث الهدایة ج:۱ ص:۱۸۴ (طبع مؤسسة الریان بیروت).

حکم الغسل علٰی مراد الآیۃ. (احکام القرآن للجصاص ج:۲ ص:۴۲۸)(۱)

مسئلے کی حقیقت یہ ہے کہ آیت کی اصلی مراد پاؤں دھونا ہے، جیسے کہ پیچھے گزر چکا، لہٰذا اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مسح علی الخفین کی متواتر احادیث ثابت نہ ہوتیں تو ہم کبھی مسح علی الخفین کو جائز قرار نہ دیتے ..... اور چونکہ جوربین (کپڑے کے موزوں) پر مسح کی احادیث اس وزنی طریقے سے مروی نہیں ہیں جس وزنی طریقے سے مسح علی الخفین کی احادیث مروی ہیں اس لئے ہم نے وہاں آیتِ قرآنی کی اصل مراد یعنی پاؤں دھونے کے حکم کو برقرار رکھا ہے۔

اب صرف یہ سوال رہ جاتا ہے کہ جن حضراتِ صحابہ کرامؓ سے منقول ہے کہ انہوں نے جوربین پر مسح کیا یا اس کی اجازت دی، تو ان کے اس عمل کی کیا وجہ تھی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کے ان آثار میں کہیں بھی یہ صراحت نہیں ہے کہ جوربین کپڑے کے باریک موزے تھے، اور جب تک یہ صراحت نہ ہو اس وقت تک ان آثار سے باریک موزوں پر مسح کا جواز کیسے ثابت ہوسکتا ہے؟ چنانچہ مشہور اہلِ حدیث عالم علامہ شمس الحق صاحب عظیم آبادی لکھتے ہیں:-

ان الجورب یتخذ من الادیم وکذا من الصوف وکذا من القطن ویقال لکل من ھذا أنہ جورب ومن المعلوم ان ھذہ الرخصۃ بھذا العموم .... لا تثبت الا بعد ان یثبت ان الجوربین الذین مسح علیھما النبی صلی اللہ علیہ وسلم کانا من صوف .... الخ.

(عون المعبود ج:۱ ص:۶۲)(۲)

یعنی جوربین کھال کے بھی ہوتے ہیں، اُون کے بھی اور رُوئی کے بھی، اور ہر ایک کو جورب کہا جاتا ہے، اور ہر قسم کے موزے پر مسح کی اجازت اس وقت تک ثابت نہیں ہوسکتی ہے جب تک یہ ثابت نہ ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان جوربین پر مسح فرمایا، بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ ثابت ہے کہ ان حضرات نے جن جوربین پر مسح فرمایا وہ زیادہ تو چمڑے کے تھے یا اپنی موٹائی کی وجہ سے چمڑے کے موزوں کی طرح تھے، اور ان میں چمڑے کے موزوں کی صفات پائی جاتی تھیں، چنانچہ مصنف ابنِ ابی شیبہ میں روایت ہے:-

حدثنا ھشیم قال أخبرنا یونس عن الحسن وشعبۃ عن قتادۃ عن سعید بن المسیب والحسن انھما قالا: یمسح علی الجوربین اذا کانا صفیقین. (مصنف ابن ابی شیبۃ ج:۱ ص:۱۸۸)(۳)

---

(۱) أحکام القرآن للجصاص رحمہ اللہ ج:۲ ص:۳۵۰ (طبع سھیل اکیڈمی لاھور).

(۲) عون المعبود باب المسح علی الجوربین ج:۱ ص:۱۸۷ (طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت).

(۳) (طبع ادارۃ القرآن کراچی).

حضرت سعید بن مسیبؒ اور حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ جرابوں پر مسح جائز ہے، بشرطیکہ وہ خوب موٹی ہوں۔ واضح رہے کہ ثوب صفیق اس کپڑے کو کہتے ہیں جو خوب مضبوط اور دبیز ہو، ملاحظہ ہو قاموس اور مختار الصحاح وغیرہ۔

حضرت حسن بصریؒ اور حضرت سعید بن المسیبؒ دونوں جلیل القدر تابعین میں سے ہیں، اور انہوں نے صحابہ کرامؓ کا عمل دیکھ کر ہی یہ فتویٰ دیا ہے۔

لہٰذا ان حضرات کے عمل اور فتویٰ سے جو بات ثابت ہوئی وہ اس سے زائد نہیں کہ جو موزے بہت موٹے ہونے کی بناء پر چمڑے کے اوصاف کے حامل ہوں، ان پر مسح جائز ہے، اور اس موٹائی کی وضاحت کے لئے فقہاءؒ نے وہ تین شرائط ذکر کی ہیں کہ ایک تو ان میں پانی نہ چھنے، دُوسرے وہ کسی چیز سے باندھے بغیر اپنی موٹائی کی وجہ سے خود کھڑے رہیں، اور تیسرے یہ کہ ان کو پہن کر تین میل چلنا ممکن ہو، ایسے موزے چونکہ چمڑے کے اوصاف کے حامل ہوتے ہیں، اس لئے ان کو بھی اکثر فقہاءؒ نے "مسح علی الخفین" کی احادیث کی دلالۃ النص اور مذکورہ آثارِ صحابہؓ کی بناء پر "خفین" کے حکم میں داخل کرلیا، چنانچہ علامہ ابن الہمامؒ تحریر فرماتے ہیں:-

لا شک ان المسح علی الخف علی خلاف القیاس، فلا یصلح الحاق غیرہ به، الا اذا کان بطریق الدلالة، وهو أن یکون فی معناه، ومعناه الساتر لمحل الفرض الذی هو بعدد متابعة المشی فیه فی السفر وغیرہ. (فتح القدیر ج:۱ ص:۱۰۹)[۱]

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسح علی الخفین کی مشروعیت خلافِ قیاس ہوئی ہے، لہٰذا کسی دُوسری چیز کو ان پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، الّا یہ کہ وہ دلالۃ النص کے طریقے پر خفین کے معنی میں داخل ہو، اور خفین کے معنی ایک ایسے موزے کے ہیں جنھوں نے پاؤں کو بالکل ڈھانپ رکھا ہو، اور ان میں سفر وغیرہ کے دوران مسلسل چلنا ممکن ہو۔

لہٰذا فقہاءؒ نے جوربین پر مسح کے لئے جو شرائط مقرر کی ہیں، ان کی یہ تعبیر بالکل غلط اور خلافِ واقعہ ہے کہ حدیث میں مسح علی الجوربین کی اجازت مطلق تھی، اور انہوں نے اپنی طرف سے شرائط عائد کرکے اسے مقید کردیا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اُصولی اعتبار سے پاؤں دھونے کے فریضے کو چھوڑ کر مسح کرنے کا حکم اس وقت تک ثابت نہیں ہوسکتا، جب تک کہ اس پر احادیث متواتر موجود نہ ہوں، خفین

[۱] فتح القدیر باب المسح علی الخفین ج:۱ ص:۱۳۹ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔

میں چونکہ ایسی احادیث موجود تھیں، اس لئے وہاں مسح کی اجازت دے دی گئی، لیکن جوربین پر مسح کسی ایسی حدیث سے بھی ثابت نہیں جو متفق علیہ طور پر صحیح ہو، لہٰذا ان پر مسح کی اجازت نہیں دی جاسکتی تھی، اِلَّا یہ کہ وہ جوربین، خفین کی صفات کی حامل ہوکر خفین کے حکم میں بدلالۃ النص داخل ہوجائیں، اور چونکہ صحابہؓ وتابعینؒ سے ایسے ہی موزوں پر مسح ثابت تھا، اس لئے بیشتر فقہاء نے اس کی اجازت دی، اور "خفین" کی بنیادی صفات کو مذکورہ تین شرائط کے ذریعہ بیان کردیا، اور اس پر تمام ائمۂ مجتہدینؒ کا اجماع منعقد ہوگیا۔

جہاں تک علامہ ابنِ حزمؒ یا علامہ ابنِ تیمیہؒ اور علامہ ابنِ قیمؒ کا تعلق ہے، ان کا مقامِ بلند اپنی جگہ ہے، لیکن انہوں نے بہت سے مسائل میں جمہور اُمت سے الگ راہ اختیار کی ہے، جسے اُمت نے بحیثیت مجموعی قبول نہیں کیا، بالخصوص اس مسئلے میں تو انہوں نے اپنے مسلک پر کوئی دلیل بھی نہیں دی، لہٰذا پوری اُمت کے فقہاء، محدثین اور مجتہدین کے مقابلے میں صرف ان تین حضرات کی رائے پر عمل کرکے پاؤں دھونے کے قرآنی حکم کو ترک کردینا ایک سنگین جسارت ہے۔ اور اس "اجتہاد" کا تو کوئی جواب ہی نہیں ہے کہ: "اگر پاؤں پر کپڑا لپیٹ کر بھی مسح کرلیا جائے تو اس پر بھی مسح جائز ہے۔" ساری اُمت کے تمام فقہاء، تمام محدثین اور تمام مجتہدین کے بارے میں تو یہ الزام ہے کہ ان کے اس قول کا کوئی مأخذ نہیں، حالانکہ ان کے ناقابلِ انکار دلائل آپ پیچھے دیکھ چکے ہیں، اور دُوسری طرف اپنا خود "اجتہاد" یہ ہے کہ بلاوجہ پاؤں پر کپڑا لپیٹ کر اس پر بھی مسح کیا جاسکتا ہے۔ کیا اس لایعنی حرکت کی خاطر پاؤں دھونے کے قرآنی حکم کو ترک کرنے کا بھی کوئی مأخذ ہے؟

آپ نے جناب مولانا مودودی صاحب کی جو عبارت نقل فرمائی ہے، اس میں چونکہ جوتوں پر مسح کرنے کا بھی ذکر ہے، اس لئے اس کی حقیقت بھی آخر میں مختصراً عرض ہے۔

جوربین اگر موٹے ہوں تو ان پر مسح کرنے کے تو بعض فقہاء قائل بھی ہیں، لیکن جوتوں پر مسح کرنا تو کسی بھی امام کے مذہب میں جائز نہیں۔

لم يذهب احد من الأئمة الى جواز المسح على النعلين. (معارف السنن ج:۱ ص:۳۴۷)[1]

ائمہ میں سے کوئی بھی جوتوں پر مسح کرنے کا قائل نہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جوتوں پر مسح کرنا اس وقت ثابت ہے جبکہ

---

(۱) (طبع ایچ ایم سعید).

آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے ہی سے باوضو ہوتے تھے، لیکن نئی نماز کے لئے تازہ وضو فرماتے تھے، ایسی حالت میں چونکہ وضو پہلے سے ہوتا تھا، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پاؤں دھونے کے بجائے اپنے جوتوں پر ہاتھ پھیر لیتے تھے، چنانچہ صحیح ابن خزیمہ میں روایت ہے:-

عن علیؓ انہ دعا بکوز من ماء ثم توضأ وضوءاً خفیفًا مسح علی نعلیہ، ثم قال: ھکذا وضوء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم للطاھر ما لم یحدث.

(صحیح ابن خزیمۃ ج:۱ ص:۱۰۰ باب۵۴ حدیث:۲۰۰)[1]

حضرت علیؓ نے پانی کا ایک گلاس منگوایا، اور بہت مختصر وضو کیا اور اپنے جوتوں پر مسح کیا، پھر فرمایا ''طہارت کی حالت میں جب تک وضو نہ ٹوٹا ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح وضو فرمایا کرتے تھے۔''

اس وضاحت کے بعد ''جوتوں پر مسح'' ثابت کرنے والی روایات سے بے وضو آدمی کے لئے جوتوں پر مسح کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

لہٰذا

اُمت کے تمام مستند فقہاء و مجتہدین کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ باریک موزے جن سے پانی چھن جاتا ہو یا وہ کسی چیز سے باندھے بغیر پنڈلی پر کھڑے نہ رہتے ہوں، یا ان میں تین میل مسلسل چلنا ممکن نہ ہو، ان پر مسح جائز نہیں، اور نہ جوتوں پر مسح دُرست ہے۔ اور چونکہ ہمارے زمانے میں جو سوتی، اُونی، نائیلون کے موزے رائج ہیں وہ باریک ہوتے ہیں اور ان میں مذکورہ اوصاف نہیں پائے جاتے، اس لئے ان پر مسح کسی حال میں جائز نہیں ہے، اور جو شخص ایسا کرے گا تو امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام احمدؒ، بلکہ کسی بھی مجتہد کے مسلک میں اس کا وضو صحیح نہیں ہوگا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
(از ماہنامہ ''البلاغ''
جمادی الاولیٰ ۱۳۹۷ھ)

---

(۱) طبع المکتب الاسلامی بیروت۔

نائیلون کی مروّجہ جرابوں اور سوتی جرابوں پر مسح کا حکم

سوال:- موزوں پر مسح کرنا جائز ہے، ربڑ کے موزے کے علاوہ واٹر پروف موزے وغیرہ اور نائیلون کی جرابیں، سوتی جرابیں، ان پر مسح جائز ہے یا نہیں؟ واضح طور پر صحیح ثبوت کے ساتھ باحوالہ تحریر فرمائیں۔

جواب:- چمڑے یا ربڑ کے موزے اگر اتنے موٹے ہوں کہ محض اپنی موٹائی اور سختی کی وجہ سے یا لاسٹک باندھے بغیر خود کھڑے رہیں تو ان پر مسح دُرست ہے، نائیلون کی مروّجہ جرابیں پتلی ہوتی ہیں ان پر مسح دُرست نہیں۔[1] واللہ اعلم

۱۳۹۱/۲/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۲۹۳/۲۲ الف)
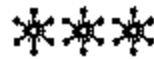
(۱) دلائل اور تفصیل کے لئے پچھلا فتویٰ ملاحظہ فرمائیں۔

﴿کتاب الصلوٰۃ﴾

(مسائلِ نماز)

﴿فصل فی مواقیت الصلوٰۃ﴾
(اوقاتِ نماز سے متعلق مسائل کا بیان)

دارالعلوم کراچی کے نقشۂ اوقاتِ نماز میں صبحِ صادق کے وقت پر اعتراض اور اس کا جواب

سوال:- محترم واجب الاحترام مفتی تقی عثمانی صاحب زید مجدکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بندہ نے تقریباً ایک مہینے سے دارالعلوم کے مفتیوں کے ساتھ صبحِ صادق اور صبحِ کاذب کے بارے میں گفت وشنید کی، جس سے معلوم ہوا کہ ان کو اس فن کا کوئی علم ہی نہیں سوائے اندھی تقلید کے۔

جناب مولانا اشرف صاحب بیت المکرّم والے سے تین بار فون پر گفت وشنید کی، اور ان سے عرض کیا کہ ہمیں وقت دے دیں کہ ہم تین آدمی اس بارے میں دلائل سے گفتگو کریں۔ مشاہدات کے لئے میں محمد اشرف جنوبی وزیرستان، علمِ جدید کے لئے احمد نفیس انجینئر، علمِ ہیئتِ قدیم کے لئے مفتی بلال صاحب، لیکن وہ اس پر تیار نہ ہوئے، بالآخر تیسری بار یہ فرمایا کہ یہ نقشۂ اوقاتِ نماز عباسی صاحب نے مرتب کیا ہے، غرضیکہ سوائے اندھی تقلید کے اور کوئی دلائل زیرِ اُفق اٹھارہ درجے پر صبحِ صادق ہونے کے، نہیں تھے۔

آخر میں یہ فرمایا کہ آپ مفتی رفیع عثمانی صاحب اور مفتی محمد تقی عثمانی صاحب سے بات کریں۔

جناب محترم! آپ دونوں بھائیوں نے اور علماء حضرات کے ساتھ اندازاً تین بار مشاہدات کئے ہیں، اور آپ صاحب نے اپنے قلم سے زیرِ اُفق اٹھارہ درجے صبحِ کاذب ثابت کیا ہے، پھر آپ نے اسی صبحِ کاذب کو صبحِ صادق کیسے ثابت کیا؟ غرضیکہ مشاہدات سے بھی اور حسابات سے بھی آپ دونوں بھائی زیرِ اُفق اٹھارہ درجے پر صبحِ کاذب کے قائل ہوگئے تھے، پھر بغیر مشاہدات اور حسابات کے زیرِ اُفق پندرہ درجہ صبحِ صادق کی کیوں مخالفت شروع کی ہے؟

جناب محترم! مؤدّبانہ التماس ہے کہ بندوں کو سیدھی راہ دِکھانے کی خاطر آئندہ کے لئے

ہٹ دھرمی اور اندھی تقلید چھوڑیں اور مسئلے کو صحیح حل فرمانے کی مہربانی فرمائیں، تاکہ عوام کی نمازِ فجر ضائع ہونے سے بچ جائے، اُمیدِ واثق ہے کہ دارالعلوم سے شائع ہونے والے نقشۂ اوقاتِ نماز کی اپنے لکھے ہوئے اُصول کے مطابق شائع کرنے کی ہدایت جاری فرمائیں گے۔

یعنی انتہاءِ سحر پُرانے نقشوں کے مطابق، اذانِ فجر صبحِ صادق مفتی رشید احمد دامت برکاتہم کے مرتب کردہ حساب کے مطابق، صبحِ صادق زیرِ اُفق پندرہ درجے پر ہونے کو شائع کرنے کی ہدایت جاری فرمائیں۔ وفقکم اللہ تعالیٰ

بندہ محمد اشرف عفا اللہ تعالیٰ
جنوبی وزیرستان
۲۴ رشوال ۱۴۱۷ھ

(مذکورہ تحریر کے بعد سائل کی طرف سے ذیل کا استفتاء بھی آیا)

محترم المقام واجب الاحترام مفتیان حضرات زید مجدکم، و مفتی تقی عثمانی صاحب
دارالعلوم کورنگی کراچی ۱۴

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ حق کو نہ چھپاؤ، حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ۔ یہاں کراچی شہر میں صبح و انتہاءِ سحر و اِفطار کے نقشے چھپتے ہیں، ان نقشوں میں سحر کے وقت اور اَذانِ فجر کے مابین کوئی فرق نہیں لکھا ہے، تعجب کی بات ہے کہ انتہاءِ سحر کے وقت لاؤڈ اسپیکروں پر اذانیں دینا بھی شروع کردیتے ہیں، ساتھ ہی لوگ انفرادی و اجتماعی طور پر فجر کی نماز ادا کرتے ہیں، لیکن بہت سے ایسے مفتیان و علمائے کرام جن کو معلوم ہے کہ مروّجہ جنتریوں میں جو صبحِ صادق کا وقت لکھا ہے وہ صبحِ کاذب کا ہے، لیکن پھر بھی وہ غلط نقشوں کی نشر و اشاعت کررہے ہیں۔

اب بندہ اپنے پندرہ سال کے عینی مشاہدات لکھ رہا ہے، وہ یہ کہ زیرِ اُفق اٹھارہ درجے صبحِ کاذب کا وقت ہے، اور زیرِ اُفق پندرہ درجے صبحِ صادق کا وقت ہے، نیز پُرانے نقشے جو برِصغیر پاک و ہند میں چھپتے ہیں ان میں صبح و عشاء کا وقت غلط ہے، جو نقشہ صاحبِ احسن الفتاویٰ مفتی رشید احمد صاحب نے مرتب کیا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔

کراچی شہر میں جتنے اوقات مدارس والے یا کوئی اور چھاپتے ہیں اس میں صبحِ صادق کا وقت غلط ہے، دارالعلوم کراچی کا نقشہ بھی غلط ہے، جو صبح کا وقت لکھا ہے وہ صبحِ کاذب ہے، اب آئندہ کے لئے اگر کراچی شہر کے مفتیوں اور علماء نے اس مروّجہ جنتری کے غلط ہونے کا فتویٰ نہیں دیا اور خود بھی عمل

نہیں کیا تو جن لوگوں کی نمازیں ضائع ہوئی ہیں ان کا وبال ان علماء پر پڑے گا۔

آپ کراچی شہر کے علماء سے دردمندانہ اپیل ہے کہ اس مسئلے کے حل کے لئے جدوجہد شروع فرمائیں اور اس بارے میں عینی مشاہدات کریں، جس کی صورت یہ ہے کہ کراچی شہر سے باہر جاکر مہینے میں پانچ دن مشاہدات کئے جائیں، اس طرح آپ حضرات پر اپنی غلطی روزِ روشن کی طرح عیاں ہوجائے گی۔

مفتیانِ کرام کی پانچ رُکنی کمیٹی نے نقشہ مرتب کرنے کے جو دو اُصول مقرّر فرمائے ہیں:-

۱:- سال بھر عینی مشاہدات کئے جائیں، اس کے بعد نقشہ مرتب کیا جائے۔

۲:- حسابات کے مطابق نقشہ مرتب کیا جائے، لیکن اس کے لئے بھی سال بھر مشاہدات کئے جائیں۔

دارالعلوم کا مرتب کردہ نقشہ ان دونوں اُصولوں کے خلاف ہے، غرضیکہ پورے پاکستان میں شائع کئے جانے والے نقشوں میں صبحِ صادق کی جگہ صبحِ کاذب کا وقت لکھا ہے، جبکہ صبحِ صادق اور کاذب کے مابین بارہ سے بیس منٹ کا فرق ہے۔ دوبارہ التماس ہے کہ کراچی کے علماء اور مفتیان حضرات اس مسئلے کے حل کے لئے جدوجہد شروع کریں، میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ رہا ہوں کہ دُنیا کا کوئی بھی شخص زیرِ اُفق اٹھارہ درجے پر صبحِ صادق ثابت نہیں کرسکتا اور نہ کرسکے گا، اگر کسی کو دعویٰ ہے تو وہ مشاہدے کے لئے آئے۔ بندہ محمد اشرف عفا اللہ عنہ

(سائل کو جواب میں ٹنڈوآدم کے مشاہدات کے نتیجے میں مرتب کردہ درج ذیل تحریر بھی بھیجی گئی اور ساتھ ہی حضرتِ والا دامت برکاتہم نے مستقل جواب بھی تحریر فرمایا، جو اس تحریر کے بعد درج ہے۔ از مرتب عفی عنہ)

صبحِ صادق

حضرت مفتی رشید احمد صاحب مدظلہم کے رسالہ صبحِ صادق کے دلائل پر غور وخوض کرنے کے لئے ۱۳؍ذیقعدہ ۱۳۹۲ھ کو مجلس منعقد ہوئی، جس میں حضرت مفتی رشید احمد صاحب مدظلہم، حضرت مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم اور حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب مدظلہم نے شرکت فرمائی، اس تحریر میں یہ تمام حضرات متفق تھے، اور اس میں سب حضرات کے دستخط بھی ثبت تھے، اور مفتیٔ اعظم مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ اگرچہ اس مجلس میں موجود نہ تھے، مگر بعد میں حضرتؒ نے اس تحریر سے اتفاق کیا اور اپنے تصدیقی دستخط ثبت فرمائے، یہاں وہ تحریر بعینہٖ نقل کی جارہی ہے۔

الحمدللہ و کفٰی و سلام علی عبادہ الذین اصطفٰی، اما بعد:

آج بتاریخ ۱۳؍ذیقعدہ ۱۳۹۲ھ صبحِ صادق اور عشاء کے اوقات کے مسئلے پر غور کرنے کے لیے مجلس منعقد ہوئی، جس میں مندرجہ ذیل حضرات شامل تھے:-

حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب

حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب

حضرت مولانا مفتی رفیع عثمانی صاحب

احقر تقی عثمانی

اس مجلس میں مولانا رشید احمد صاحب کے رسالہ صبحِ صادق کے دلائل پر غور کیا گیا، اور متعلقہ کتب کی مراجعت کی گئی، نیز مسئلے کی تحقیق اور مشاہدات کے لیے ٹنڈو آدم کا سفر کیا گیا، اس کے نتائج زیرِ غور آئے، بحث و تمحیص کے بعد مندرجہ ذیل باتیں پایۂ ثبوت کو پہنچیں:-

۱:- مروّجہ جنتریوں میں صبحِ صادق اور عشاء کا جو وقت لکھا ہوا ہے، وہ اس وقت کا ہے جب آفتاب اُفق سے اٹھارہ درجے نیچے ہوتا ہے، اس کی تصریح محکمۂ موسمیات نیول ہیڈکوارٹر کے خطوط رسالہ صبحِ صادق ص:۶۵ ج:۲ وص:۶۷ میں موجود ہے، اور ناٹیکل المینک جوگرین وچ سے شائع ہوتی ہے اس سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

۲:- اٹھارہ درجے زیرِ اُفق فلکیات کے جدید ماہرین کی تصریحات کے مطابق وہ وقت ہے کہ مشرق کی طرف صبح کو اس سے پہلے، اور مغرب کی طرف رات کو اس کے بعد کوئی ہلکی سی روشنی بھی اُفق پر نہیں ہوتی، آخرِ شب میں جو روشنی سب سے پہلے نمودار ہوتی ہے اسے اسٹرانومیکل ٹوایلائٹ کہتے ہیں۔

۳:- ہیئت کی قدیم کتابوں سے بھی قولِ راجح و مشہور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اٹھارہ درجہ زیرِ اُفق صبحِ کاذب کا وقت ہے، نہ کہ صبحِ صادق کا، بعض کتب میں سترہ زیرِ اُفق، اور بعض میں انیس زیرِ اُفق کے اقوال بھی بصیغۂ تمریض موجود ہیں، لیکن وہ مرجوح ہیں۔

۴:- اس مسئلے کے زیرِ غور آنے کے بعد متفرق ایام میں جتنے مشاہدات کئے گئے ان میں سے کسی میں بھی مروّجہ جنتریوں کے مطابق صبحِ صادق نہیں ہوئی بلکہ اس کے بعد ہوئی، ان سب اُمور سے ثابت ہوتا ہے کہ مروّجہ جنتریوں میں صبحِ صادق کے نام سے جو وقت لکھا گیا ہے وہ درحقیقت صبحِ کاذب کا ہے، اور غالبًا روزے کے بارے میں احتیاط کے پیشِ نظر لکھا گیا ہوگا۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ پھر صبحِ صادق کا صحیح وقت کیا ہے؟ اس کا تعین دو طریقوں سے ممکن تھا، ایک مشاہدات سے، دُوسرے حسابات سے۔ جہاں تک مشاہدات کا تعلق ہے ان کی بنیاد پر

کوئی جنتری اس وقت بنائی جاسکتی ہے جبکہ سالہا سال مکمل مشاہدات کئے جائیں، اور ظاہر ہے اس کے مواقع میسر نہیں، اور جو تھوڑے بہت مشاہدات کئے گئے ان سے سال بھر کے لئے اوقات کا تعین ممکن نہیں تھا۔ دُوسرا طریقہ حسابات کا تھا، حضرت مفتی رشید احمد صاحب مدظلہٗ نے بعض ہیئت کی کتابوں کی تصریح کے مطابق پندرہ درجے زیرِ اُفق صبحِ صادق کا وقت قرار دے کر حسابات سے اس کا نقشہ بنایا ہے۔ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ تصریح فرمائی ہے کہ صبحِ صادق اور صبحِ کاذب کے درمیان تین درجات کا فرق ہے، اور جب مذکورہ بالا دلائل کی رُو سے ثابت ہوا کہ صبحِ کاذب اٹھارہ درجے زیرِ اُفق پر ہوتی ہے تو علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کے بیان سے یہی نتیجہ نکلے گا کہ صبحِ صادق پندرہ درجے زیرِ اُفق پر ہوگی۔ اس بناء پر حضرت مفتی رشید احمد صاحب نے صبحِ صادق کے جو اوقات نکالے ہیں ان کا مقابلہ ٹنڈو آدم کے مشاہدات سے کیا گیا تو زیادہ سے زیادہ تین منٹ کا فرق نکلا، مگر یہ تین منٹ کا فرق صبحِ کاذب میں بھی تھا، اس لئے صبحِ کاذب اور صادق کے درمیان پر کوئی اثر نہیں پڑا، مفتی رشید احمد صاحب نے بارہ جون کو وہاں کے لئے چار بج کر تین منٹ صبحِ کاذب (اٹھارہ زیرِ اُفق) کا اور چار بج کر بیس منٹ صبحِ صادق (پندرہ درجہ زیرِ اُفق) کا وقت لکھا، مگر مشاہدے سے صبحِ کاذب پورے چار بجے اور صبحِ صادق چار بج کر سترہ منٹ پر نظر آئی، یہ تین منٹ کا فرق شبہے کی وجہ بن سکتا تھا، لیکن بقول حضرت مفتی صاحب مدظلہم طول وعرض نصف النہار کے پیشِ نظر اتنا فرق ہوسکتا ہے اس کے لئے مفتی صاحب کی رائے میں بھی پانچ منٹ کی احتیاط ضروری ہے اور بعد میں مفتی صاحب نے دوبارہ احتیاط کے ساتھ اس تاریخ اور اس طول وعرض کا حساب نکالا تو معلوم ہوا کہ فرق صرف ایک منٹ کا تھا اور پہلے حساب میں کچھ غلطی ہوگئی تھی۔

بہرکیف! مذکورہ بالا تحقیق سے ہمیں بھی یہ ظن غالب ہوتا ہے کہ مولانا مفتی رشید احمد صاحب نے جو حسابی طریقے سے اوقات نکالے ہیں اس کے مطابق نقشے بنالینے میں کوئی حرج نہیں، لیکن معلوم ہوا کہ بعض دُوسرے علماء کا اس پر اطمینان نہیں ہوسکا، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ صبحِ صادق پندرہ درجے زیرِ اُفق سے پہلے ہوجاتی ہے، اس کے علاوہ ہمارے ظن غالب کی بنیاد بھی حسابات ہیں نہ کہ ایسے مسلسل مشاہدات جو کہ دائمی جنتریوں کی بنیاد بن سکیں جبکہ شریعت میں اصل مدار مشاہدات پر ہے، اور حسابی جنتریوں پر اعتماد اسی وقت صحیح ہوسکتا ہے جبکہ مشاہدات سے متواتر تائید ہوگئی ہو، اس لئے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ نقشوں میں وقتِ فجر کے لئے دو خانے الگ الگ لکھے جائیں، ایک کا عنوان ہو احتیاطی منتہاءِ سحر اور اس کے تحت قدیم معمول کے مطابق قدیم جنتریوں کے اوقات لکھے جائیں، دُوسرا عنوان ہو وقتِ اذانِ فجر اور اس میں حضرت مفتی رشید احمد کے نکالے ہوئے اوقاتِ صبحِ صادق لکھے

جائیں، دونوں کے درمیانی وقت میں نہ سحری کھائی جائے اور نہ نماز پڑھی جائے۔

احقر محمد تقی عثمانی
۱۴ر ذیقعدہ ۱۳۹۲ھ

اس سے اتفاق ہے اگرچہ میں حاضرِ مجلس نہ تھا
محمد شفیع عفا اللہ عنہ
۱۴ر ذیقعدہ ۱۳۹۲ ہجری
دار الافتاء دار العلوم کراچی ۱۴

محمد عاشق الٰہی

رشید احمد

العبد محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ

بندہ عبدالرؤف سکھروی
۲۱ر شعبان ۱۴۱۷ھ

(مذکورہ بالا تحریر کے علاوہ حضرتِ والا دامت برکاتہم نے سائل کے استفتاء کے جواب میں باقاعدہ فتویٰ بھی تحریر فرمایا جو درج ذیل ہے۔ از مرتب عفی عنہ)

جواب:- محترمی و مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط ملا، صبحِ صادق کے مسئلے پر حضرت والد صاحبؒ اور حضرت مولانا بنوری صاحب قدس سرہٗ کے زمانے میں مہینوں تحقیق جاری رہی، جس میں مشاہدات بھی کئے گئے اور حسابی تحقیق بھی کی گئی، آپ نے ٹنڈو آدم کے جس مشاہدے کا ذکر فرمایا ہے وہ متعدد مشاہدات کا ایک مرحلہ تھا، کوئی حتمی مشاہدہ نہیں تھا، اس وقت یہ بات سب پر واضح تھی کہ مطلع گرد آلود ہونے کی بناء پر اس مشاہدے کو کسی حتمی فیصلے کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا، اس کے بعد بھی متعدد مشاہدات کئے گئے، کتابی تحقیق بھی ہوئی، بالآخر حضرت والد صاحبؒ اور حضرت مولانا بنوری صاحبؒ دونوں نے حضرت مفتی رشید احمد صاحب مدظلہم کی تحقیق سے اختلاف اور اس پر عدمِ اطمینان کا اعلان فرمایا، اس کے بعد انہی حضرات کے حکم سے خود احقر نے ایک مفصل تحریر حضرت مفتی رشید احمد صاحب مدظلہم العالی کی خدمت میں بھیجی جس میں ان بزرگوں کے فیصلے کی وجوہ عرض کی تھیں، حضرت مدظلہم کی طرف سے اس تحریر کا کوئی جواب بھی موصول نہیں ہوا، بہرصورت یہ مسئلہ مہینوں کی محنت اور تحقیق و مشاہدے کے بعد کم از کم ہماری حد تک واضح ہوگیا، افسوس ہے کہ اس کے باوجود ہر موقع پر ٹنڈو آدم کے اس ناتمام مشاہدے کی بنیاد پر بزرگوں کو مطعون کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اور ان حضرات کی بعد کی تحریروں، مشاہدات اور زبانی گفتگو کا کوئی حوالہ نہیں دیا جاتا۔

بہرکیف! اگر کسی صاحب کو حضرت مفتی رشید احمد صاحب مدظلہم کی تحقیق پر ہی اعتماد ہے تو بے شک اس پر عمل فرمائیں، لیکن مذکورہ بزرگوں کے موقف کو اندھی تقلید پر مبنی قرار دینا اور ان وفات

یافتہ بزرگوں کے بارے میں زبانِ طعن دراز کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔

والسلام
۱۴۱۷/۱۱/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۲۶۰/۲)

انتہاءِ زوال اور ابتداءِ ظہر میں فاصلے کی مقدار

سوال ۱:- انتہائے زوال اور ابتدائے ظہر میں کتنا فصل ہوتا ہے؟

۲:- زوال کی مدّت کتنے منٹ ہوتی ہے؟

جواب ۱، ۲:- زوال ایک آنی چیز ہے جو ایک منٹ سے بھی کم وقت میں پورا ہوجاتا ہے، اور اس کے فوراً بعد ظہر کا وقت شروع ہوجاتا ہے، لہٰذا استواءِ شمس کے فوراً بعد نمازِ ظہر کا وقت آجاتا ہے، دونوں میں کوئی معتد بہ فاصلہ نہیں ہے، البتہ زوال کے اطمینان کے لئے پانچ منٹ کا احتیاطاً انتظار کرلینا چاہئے۔

وقد وقع فی عبارات الفقهاء أن الوقت المكروه هو عند انتصاف النهار الٰی أن تزول الشمس ولا يخفی أن زوال الشمس انما هو عقيب انتصاف النهار بلا فصل. (شامی ج:۱ ص:۲۴۸)[1]۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۲/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۲۶۰/۲۸ الف)

حنبلی مسلک میں زوال سے پہلے جمعہ کا وقت اور اس کی بناء پر حنفی مقتدی کے لئے حکم

سوال:- کویت میں نماز کے اوقات کا ایک کتابچہ جس کا نام "نتيجة تقويم الهجری"

---

(۱) رد المحتار ج:۱ ص:۳۷۱ (طبع سعید). وفی فتح الملهم ج:۵ ص:۳۱۵ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی) عن عقبة بن عامر الجهنیؓ يقول ثلٰث ساعات كان رسول الله صلی الله عليه وسلم ينهانا أن نصلی فيهن أو أن نقبر فيهن موتانا، حين تطلع الشمس بازغة حتّٰی ترتفع وحين يقوم قائم الظهيرة حتّٰی تميل الشمس وحين تضيف الشمس للغروب حتّٰی تغرب. رواه مسلم. وفی فتح الملهم قوله: وحين يقوم قائم الظهيرة .... الخ: هی شدة الحر فی نصف النهار، قال السندی: قال النوویؒ: الظهيرة حال استواء الشمس ومعناه حين لا يبقی للقائم فی الظهيرة ظل فی المشرق ولا فی المغرب وفی المجمع هو من قامت به دابته ووقفت يعنی ان الشمس اذا بلغت وسط السماء ابطأت حركته الٰی أن يزول فيحسب انها قد وقفت وهی سائرة لٰكن لا يظهر اثره ظهوره قبل الزوال وبعده انتهٰی.

ہے، یہ کتابچہ حکومت کی طرف سے مفت مہیا کیا جاتا ہے، اوقات کے روزانہ تغیر کے ساتھ ساتھ نماز کے اوقات بھی بدلے جاتے ہیں، دو سال قبل جمعہ کی پہلی اذان ابتدائے ظہر پر کہی جاتی ہے اور دو رکعت ادا کرنے کے بعد امام منبر پر تشریف لاتا اور خطبہ کی اذان کہی جاتی، اس مختصر وقفے میں ہم پاکستانی چار رکعت نماز ادا کر لیتے، لیکن دو سال سے حکم جاری ہے جس کی بناء پر جمعہ کی پہلی اذان ظہر سے آدھا گھنٹہ پہلے ہوتی ہے اور ابتدائے ظہر پر خطبہ کی اذان کہی جاتی ہے، کبھی خطیب دو منٹ پہلے ہی منبر پر تشریف لے آتے ہیں اور اذان بھی اسی وقت ہوجاتی ہے، ان حالات میں چار رکعت قبلِ جمعہ کا کیا حکم ہے؟

جواب:- وہ لوگ حنبلی مسلک کے ہوں گے، ان کے مسلک میں جمعہ کا وقت زوال سے پہلے ہوجاتا ہے۔ بہرحال اس صورت میں حنفی حضرات کو چاہئے کہ وہ خطیب صاحب سے اپنی مشکل بیان کر کے انہیں اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ زوال کے بعد چار رکعات کا وقت دیا کریں، اُمید ہے کہ وہ اسے قبول کرلیں گے، اور اگر بالفرض وہ قبول نہ کریں تو سنتیں جماعت کے بعد ادا کرلی جائیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۸/۲/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۶۰/۲۸ الف)

ظہر کا وقت

سوال:- کیا ظہر کی نماز ایک بج کر ۵ منٹ پر ادا کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ ہماری فیکٹری میں مستقل اسی وقت ظہر کی جماعت ادا کی جاتی ہے۔

جواب:- ظہر کا وقت زوالِ آفتاب کے فوراً بعد ہوجاتا ہے، اور زوالِ آفتاب کا وقت موسموں کے اختلاف سے بدلتا رہتا ہے، اس کے لئے اوقات کے مفصل نقشے چھپے ہوئے عام ملتے ہیں، ان کو سامنے رکھ کر فیصلہ کریں، چونکہ اکثر موسموں میں ایک بجے سے پہلے ہی ظہر کا وقت ہوجاتا ہے اس لئے آپ ایک بجے نماز پڑھ سکتے ہیں۔

والسلام
۱۳/۱/۱۳۹۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۱۷/۳۰ الف)

کینیڈا میں عصر اور عشاء کا وقت

سوال ۱:- یہاں امام شافعیؒ کے مسلک کے مطابق نمازوں کے اوقات کا چارٹ چھپا ہوا

ہے، آپ عصر کی نماز کا وقت حنفی مسلک کے مطابق متعین فرمادیں۔

۲:- یہاں کینیڈا میں غروبِ آفتاب کے بعد شفقِ اَحمر تو غائب ہوجاتا ہے، مگر شفقِ اَبیض رات گیارہ بجے تک یا اس سے بھی دیر تک رہتا ہے، گیارہ بجے تک کا انتظار خاصا مشکل ہے اور نمازِ عشاء اکثر رہ جاتی ہے، یہ انتظار اس لئے بھی مشکل ہے کہ صبح جلدی اُٹھنا پڑتا ہے۔ آپ فرمائیں کہ مغرب کے بعد جلد سے جلد عشاء کی نماز کا وقت کب شروع ہوجاتا ہے؟

جواب ۱:- عصر کی نماز کا وقت حنفی مسلک میں اس وقت ہوتا ہے جب زمین پر ہر چیز کا سایہ (سایۂ اصل کے علاوہ) دُگنا ہوجائے[1]، یہ وقت مختلف موسموں میں اور مختلف مقامات کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے اور وہاں ماہرین سے رُجوع کرکے معلوم کیا جاسکتا ہے، اور اگر وہاں مشکل ہو تو مولانا مفتی رشید احمد صاحب اشرف المدارس ناظم آباد کراچی ۴ کو لکھ کر ان سے پورا نقشہ بنوایا جائے، ان کو اس میں مہارت ہے، احقر کو مہارت نہیں۔

۲:- صورتِ مسئولہ میں شفقِ اَحمر کے غروب ہوجانے کے بعد عشاء کی نماز ادا کرلینے کی گنجائش ہے، عملاً بقول الصاحبین فی مواقع العذر۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۹/۹/۷ھ
(فتویٰ نمبر ۳۰/۱۶۵۰ د)

۱:- عصر میں اصفرارِ شمس تک تأخیر
۲:- عشاء کا وقت

سوال ۱:- احناف کے مسلک پر نمازِ عصر میں جو تأخیر افضل ہے تو اس افضلیت پر گھنٹوں

---

(۱) وفی جامع الترمذی باب ما جاء فی تاخیر الظهر فی شدة الحر ج:۱ ص:۲۲، ۲۳ (طبع فاروقی کتب خانه) عن ابی هریرةؓ قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: اذا اشتد الحر فابردوا عن الصلوٰة فان شدة الحر من فیح جهنم. طریقِ استدلال یہ ہے کہ حجاز کی گرمی کا ابراد مثلِ اوّل پر نہیں ہوتا۔ وفیه أیضاً ج:۱ ص:۲۳ عن ابی ذرؓ ان رسول الله صلی الله علیه وسلم کان فی سفر ومعه بلال فأراد ان یقیم فقال: ابرد! ثم أراد أن یقیم فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم: أبرد فی الظهر. قال: حتّٰی رأینا فیئ التلول ثم اقام فصلّٰی، فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم: ان شدة الحر من فیح جهنم فابردوا عن الصلوٰة. وفی الصحیح للامام البخاریؒ ج:۱ ص:۷۶، ۷۷ (طبع قدیمی کتب خانه) حتّٰی ساوی الظل التلول. طریقِ استدلال یہ ہے کہ ٹیلوں کا سایہ ان کے مساوی ہونے کا حاصل یہ ہے کہ عرب کے ٹیلے عموماً منبسط ہوتے ہیں، اس لئے ان کا سایہ کافی دیر میں ظاہر ہوتا ہے، اور ان کا سایہ اس وقت ایک مثل ہوتا ہے جبکہ دُوسری چیزوں کا سایہ ایک مثل سے کافی زائد ہوچکا ہو، دیگر احادیث اور مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: فتح الملهم ج:۴ ص:۲۹۷ تا ۳۰۶ (طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی) و درسِ ترمذی ج:۱ ص:۳۹۵۔

(۲) وفی اعلاء السنن ج:۲ ص:۱۱ (طبع ادارة القرآن کراچی) وفی البحر الشفق هو البیاض عند الامام الی ان قال فثبت ان قول الامام هو الأصح .... ولا یعدل عنه الی قولهما او قول أحدهما أو غیرهما الا لضرورة من ضعف دلیل أو تعامل بخلافه کالمزارعة وان صرح المشائخ بأن الفتوی علی قولهما کما فی هذه المسئلة وفی السراج الوهاج فقولهما أوسع للناس وقول أبی حنیفة أحوط. (محمد زبیر حق نواز)

کے حساب سے عصر اور مغرب کے درمیان کتنا وقت ہونا چاہئے؟

۲:- مغرب کی نماز کے کتنے وقت بعد عشاء کا وقت داخل ہوتا ہے؟

جواب ۱:- حنفیہ کے نزدیک عصر کی نماز اصفرارِ شمس یعنی سورج کے زرد ہونے سے پہلے تک تاخیر کرنا افضل ہے، لیکن جماعت میں یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ نماز ختم کرنے کے بعد اصفرار سے پہلے اتنا وقت باقی رہے کہ اگر نماز کا اعادہ کرنا ہو تو وہ بھی اصفرار سے پہلے کیا جاسکے، یہ وقت موسموں اور شہروں کے اختلاف سے بدلتا رہتا ہے، اس لئے گھنٹہ منٹ کے حساب سے اس کی کوئی مقدار دائمی طور پر مقرّر نہیں کی جاسکتی۔[1]

۲:- جب شفقِ اَبیض (یعنی مغربی اُفق پر سفیدی) غائب ہوجائے تو عشاء کا وقت داخل ہوجاتا ہے،[2] اس کا مدار بھی شہر کے محلِ وقوع اور موسم پر ہوتا ہے، اس لئے گھنٹہ اور منٹ کے لحاظ سے اس کی بھی دائمی مقدار نہیں بتائی جاسکتی۔

واللہ سبحانہ اعلم

۲۲/۱۰/۱۴۰۱ھ

نمازِ فجر میں اِسفار افضل ہے

سوال:- یہاں دیہی علاقے میں لوگ نمازِ فجر کافی دیر کرکے پڑھتے ہیں، مثلاً ۳رذی الحجہ ۱۳۹۶ھ کو جامع مسجد جیمس آباد میں نمازِ فجر ۶:۱۵ (سوا چھ بجے پڑھی گئی) جبکہ کراچی کی نسبت طلوع و غروب میں ۵ منٹ کا فرق ہے، براہِ کرم وضاحت فرمائیں۔

جواب:- نمازِ فجر حنفیہ کے نزدیک اِسفار یعنی اُجالے میں پڑھنا افضل ہے، البتہ نماز طلوعِ آفتاب سے اتنے پہلے ختم ہوجانی چاہئے کہ اگر کسی وجہ سے نماز کا اعادہ کرنا پڑے تو طوالِ مفصل

---

(۱) وقتِ عصر سے متعلق دلائل گزشتہ صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) فی الھدایۃ ج:۱ ص:۸۲ (طبع مکتبہ شرکت علمیہ ملتان) (مواقیت صلوٰۃ) واول وقت العشاء اذا غاب الشفق واخر وقتھا ما لم یطلع الفجر. وفی الشامیۃ ج:۱ ص:۳۶۱ تحت قولہ والیہ رجع الامام الخ .... قال فی الاختیار الشفق البیاض وھو مذھب الصدیق ومعاذ بن جبل وعائشۃ رضی اللہ عنھا وعنھم قلت رواہ عبدالرزاق عن أبی ھریرۃ وعن عمر بن عبدالعزیزؒ الی قولہ قال العلامۃ قاسم فثبت أن قول الامام ھو الأصح ومشی علیہ فی البحر .... الخ. وفی اعلاء السنن ج:۲ ص:۱۱ وفی البحر الشفق ھو البیاض عند الامام الی أن قال فثبت أن قول الامام ھو الأصح وبھذا ظھر أنہ لا یفتی ولا یعمل الا بقول الامام الأعظم ولا یعدل عنہ الی قولھما أو قول أحدھما أو غیرھما الّا لضرورۃ من ضعف دلیل أو تعامل بخلافہ کالمزارعۃ وان صرح المشائخ بأن الفتوی علی قولھما کما فی ھذہ المسئلۃ وفی السراج الوھاج فقولھما أوسع للناس وقول أبی حنیفۃ أحوط. (محمد زبیر)

کی قراءت کے ساتھ اعادہ ہو سکے اور پھر بھی کچھ وقت بچ رہے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۸/۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷۸۰/۲۷ و)

شرعی رات کی تحقیق

سوال:- شامی کتاب الصوم ج:۲ ص:۸۸ میں ہے کہ النہار الشرعی صبحِ صادق سے غروب تک ہے، باقی رات ہے، بخلاف عرفی نہار کے۔ یہاں رات شرعی مراد ہے یا عرفی؟

جواب:- غروب کے ساتھ ہی شرعی رات شروع ہوجاتی ہے، **لقوله تعالیٰ: أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى الَّيْلِ.**[2] **ولما في رد المحتار والمراد بالغروب زمان غيبوبة جرم الشمس بحيث تظهر الظلمة في جهة الشرق قال صلى الله عليه وسلم: "اذا أقبل الليل من ههُنَا فقد أفطر الصائم" أي اذا وجدت الظلمة حسا في جهة المشرق فقد ظهر وقت الفطر أو صار مفطرًا في الحكم، لأن الليل ليس ظرفًا للصوم۔** (شامی ج:۲ ص:۸۰ اوّل کتاب الصوم)۔[3]

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۱/۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۵۳/۲۸ الف)

عشاء میں جلدی کا حکم

سوال:- عشاء کی اذان اور نماز میں اکثر مسجدوں میں اتنی جلدی کرتے ہیں کہ مغرب کی اذان سے عشاء کی جماعت تک ڈیڑھ گھنٹہ بھی ٹھیک سے نہیں ہوتا، تو کیا ایسی صورت میں اذان اور نماز ہوجاتی ہے؟

جواب:- ہر موسم میں مغرب اور عشاء کے درمیان فاصلہ الگ ہوتا ہے، اس کام کے لئے نقشے چھپے ہوئے ہیں، حافظ فریدالدین صاحب وکٹوریہ روڈ والے اوقاتِ نماز کا جو نقشہ چھاپتے ہیں اس

---

(۱) في الكبيرى شرح منية المصلي ص:۲۳۲ (طبع سهيل اكيڈمی لاهور) ويستحب في صلاة الفجر الاسفار بها، بان تصلي في وقت ظهور النور وانكشاف الظلمة والغلس بحيث يرمي الرامي موقع نبله عندنا خلافا للثلاثة، لقوله عليه السلام: اسفروا بالفجر فانه أعظم للأجر. رواه الترمذي. وفي المراقي في "حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح" ج:۱ ص:۲۵۲ (طبع مكتبة العلم الحديث دمشق) يستحب الاسفار وهو التأخير للاضاءة بالفجر بحيث لو ظهر فسادها اعادها بقراءة مسنونة قبل طلوع الشمس لقوله عليه السلام: اسفروا بالفجر فانه أعظم للأجر. وفيه أيضًا ج:۱ ص:۲۵۳ والاسفار بالفجر مستحب سفرًا وحضرًا. وفي الدر المختار ج:۱ ص:۳۶۶ (طبع سعيد) والمستحب للرجل الابتداء في الفجر باسفار والختم به هو المختار بحيث يرتل أربعين اية ثم يعيده بطهارة لو فسد.... الخ. وفي الهداية ج:۱ ص:۸۲ (طبع مكتبه شركت علميه ملتان) (باب المواقيت) ويستحب الاسفار بالفجر لقوله عليه السلام: اسفروا بالفجر فانه أعظم للأجر.

(۲) سورة البقرة:۱۸۷.

(۳) شامية ج:۲ ص:۳۷۱ (طبع ايچ ايم سعيد). (محمد زبیر حق نواز)

کے مطابق عمل کریں۔[1]

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۲۰ھ

رمضان میں عشاء اور صبحِ صادق کا وقت

سوال:- رمضان المبارک میں عشاء کی نماز کا ابتدائی وقت (یعنی اذان کا وقت) کتنے بجے شروع ہوتا ہے؟ اور صبحِ صادق کا وقت کب تک رہتا ہے؟ اس مسئلے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ کئی مساجد میں اوقاتِ نماز کے دو مختلف نقشے آویزاں ہیں، ان میں تقریباً اوقاتِ صبحِ صادق اور وقتِ عشاء میں ۲۰-۲۵ منٹ کا فرق ہے، اور نقشے کے نیچے یہ درج ہے کہ اس میں اوقاتِ صبحِ صادق وعشاء کی تصحیح کی گئی ہے اس میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کا بھی نام ہے، جبکہ عمل عموماً اس کے خلاف ہے، اب ہم کس نقشے کے مطابق اذانوں کا وقت متعین کریں؟ اور سحری کا وقت کس نقشے کے مطابق ہو؟ مفتی صاحب کا جس نقشے میں نام ہے اس میں اختتامِ سحری ۴ بج کر اُنسٹھ منٹ لکھا ہے، دُوسرے نقشے میں وقتِ سحری چار بج کر بیالیس منٹ لکھا ہے۔

جواب:- حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کو شروع میں اوقاتِ فجر وعشاء کے بارے میں کچھ تردّد ہوگیا تھا، لیکن آخر میں ان کا فتویٰ یہی تھا کہ قدیم نقشے دُرست ہیں، چنانچہ گزشتہ رمضان میں خود انہوں نے جو نقشہ شائع کروایا وہ قدیم نقشوں کے مطابق تھا، اب آپ کو دیکھنا ہو تو دارالعلوم نانک واڑہ سے نقشہ حاصل کرلیجئے۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۲/۹ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۴۳ ج)

سحری کا وقت ختم ہوتے ہی نماز پڑھنا

سوال:- فجر کی اذان سحری ختم ہوتے ہی دے دی جائے تو جائز ہے؟ اور سحری کا وقت ختم ہوتے ہی نماز پڑھنا دُرست ہے؟

جواب:- احتیاط اس میں ہے کہ جب موجودہ نقشوں کے مطابق سحری کا وقت ختم ہوجائے تو فوراً نمازِ فجر نہ پڑھیں، بلکہ دس پندرہ منٹ انتظار کر کے پڑھیں تاکہ صبحِ صادق بلا اختلاف ہوجائے، تاہم اگر کسی نے فوراً نماز پڑھ لی تو اس کی نماز ہوجائے گی۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۹/۱۰/۱۰ھ
(فتویٰ نمبر ۳۰/۱۶۸۰ و)

(۱،۲) اب اوقاتِ نماز کا ایک نقشہ خود حضرت والا دامت برکاتہم اور دیگر اکابر دارالعلوم کی زیرِ نگرانی بھی تیار کیا گیا ہے، جسے مکتبہ نعمانیہ کراچی نے شائع کیا ہے، بوقتِ ضرورت اس کی طرف مراجعت بھی مناسب ہے۔ (مرتب)

صبحِ صادق کے وقت پر حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ سے اختلاف کی تحقیق (عربی فتویٰ)

سوال: –قال مولانا مفتی رشید أحمد ادام الله حياته في أحسن الفتاوىٰ أن الجداول لأوقات الصلوٰت في عامة المساجد ليست بصحيحة ونقل جهده وجهد علماء عصره بهٰذا الصدد وذكر اسمك بين هذه العلماء ونقل موافقتكم معه في رأيه وذكر في الأخر رجوعكم عن موافقة المذكورة وأسف علىٰ هذا شديدًا وقال رجعوا بغير دليل واستدلال وبغير قيل وقال.

جواب: – قد وقع تحقيق مسئلة وقت الصبح الصادق في زمن والدى الشيخ المفتي محمد شفيع والعلامة الشيخ البنوري رحمهما الله تعالىٰ، وكانا في أول الأمر قد مالا الىٰ رأى شيخنا المفتي رشيد أحمد حفظه الله تعالىٰ ولكن بعد المشاهدات المتوالية ومراجعة كتب الفقه والحساب عدلا عن رأيه.

المشاهدة التي ذكرها شيخنا المفتي رشيد أحمد حفظه الله تعالىٰ فهي "مشاهدة ننڈوآدم" وكانت احدى المشاهدات ما بين عدة مشاهدات وكان مطلع الشرق اذ ذاك مغبرا ولم يكن أحد يرى أن هذه المشاهدة كافية للوصول الى نتيجة حاسمة فلا ينبغي التعويل عليها.

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۰۵/۵/۴ھ

عصر کی نماز کے لئے ساڑھے چار بجے کا وقت مقرر کرنا

سوال: – مشکوٰۃ شریف اور ترمذی کی ایک حدیث ہے اور اس امامتِ جبرئیل والی حدیث میں زوال کے فوراً بعد ظہر کی نماز ادا کرنے کا ذکر ہے، اور عصر کی نماز جب سایہ ایک مثل ہوگیا تو اس کے بعد عصر کی نماز ادا کرنے کا ذکر موجود ہے۔

ان صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کی نماز سایہ کے ایک مثل ہوجانے کے بعد ادا فرمائی۔

اس حدیث کی روشنی میں، نیز چونکہ ہم سب کاروباری لوگ ہیں اور غرض یہ ہے کہ ہم سب جماعت کے ساتھ نماز ادا کرسکیں، اس کی بناء پر ہم نے مناسب یہ سمجھا کہ ساڑھے چار بجے عصر کی

جماعت کرالی جائے، یہ ٹائم ہم نے عصر کی جماعت کے لئے مقرّر کیا ہے، ہمارا یہ وقت مقرّر کرنا حدودِ جواز میں داخل ہے یا نہیں؟

جواب:- رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں چونکہ گھڑیاں نہیں تھیں اس لئے اوقات کا تعین جنتری یا گھڑیوں کے حساب سے نہ تھا، بلکہ اوقات کی مختلف علامتیں مقرّر تھیں، ان علامتوں کا بیان مختلف احادیث میں آیا ہے اور اس بارے میں ایک دو نہیں، بہت سی احادیث مروی ہیں، امام ابوحنیفہؒ نے ان تمام احادیث کو سامنے رکھ کر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ عصر کا وقت اس وقت شروع ہوتا ہے جب ہر چیز کا سایہ اس سے دُگنا ہو جائے۔[1] یہ وقت موسموں اور مقامات کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے، کراچی میں عصر کا وقت کم سے کم چار بج کر آٹھ منٹ پر (۷؍دسمبر کو) ہوتا ہے اور زیادہ سے زیادہ پانچ بج کر تیئس (۱۵؍جولائی کو) ہوتا ہے۔ آج یعنی (۱۴؍مارچ کو) عصر کا وقت پانچ بج کر دو منٹ پر شروع ہوگا، اس سے پہلے امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک نماز پڑھنا دُرست نہیں۔ لہٰذا آپ نے آج کل ساڑھے چار بجے کا جو وقت مقرّر کیا ہوا ہے وہ حنفی مسلک کے لحاظ سے دُرست نہیں ہے۔ آپ کو چاہئے کہ اوقاتِ نماز کے جو طبع شدہ نسخے ملتے ہیں وہ اپنے پاس رکھیں اور اس میں روزانہ عصر کا وقت دیکھ کر اس کے مطابق جماعت کا وقت مقرّر فرمائیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۱/۴/۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸۷/۲۹ الف)

---

(۱) وفي الدر المختار كتاب الصلوة ج: ۱ ص: ۳۵۹ و ۳۶۰ ووقت الظهر من زواله أي ميل زكاء عن كبد السماء الى بلوغ الظل مثليه. وفيه بعد أسطر ص: ۳۶۰ ووقت العصر منه الى قبيل الغروب وفي الشامية تحته (قوله منه) أي من بلوغ الظل مثليه .... الخ.

﴿فصل فی الأذان﴾
(اذان سے متعلق مسائل کا بیان)

اذان میں تجوید کی غلطی کا حکم

سوال:- ایک شخص اذان دیتے ہوئے بہت غلطیاں کرتا ہے، تلاوتِ قرآن شریف بھی بہت غلط پڑھتا ہے، جابجا لحنِ جلی کرتا ہے، "حی علی الصلوۃ" میں حاء کو ھاء پڑھتا ہے، ایسا شخص اس منصب کے قابل ہے یا نہیں؟ فتاویٰ رشیدیہ کا مسئلہ اس بارے میں دُرست ہے یا نہیں؟

جواب:- مؤذن کا تقرر کرتے وقت اس بات کا پورا لحاظ رکھنا چاہئے کہ مؤذن صحیح خواں ہو، اور کسی قسم کا لحن نہ کرتا ہو، پھر اگر وہ ایسی غلطی کرے جو معنی بگاڑ دے تو اذان ہی نہیں ہوتی، "حی علی الصلوۃ" کو "ھَیَّ علی الصلوٰۃ" پڑھنے سے معنی نہیں بگڑتے، البتہ اس غلطی کی اصلاح کے بغیر مؤذن کا تقرر نہ کرنا چاہئے، لیکن اگر تقرر کرلیا گیا ہو تو اذان ہوجائے گی، فتاویٰ رشیدیہ[1] کا مسئلہ بالکل دُرست ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم
۱۳۸۷/۱۱/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۰۹/۱۸ الف)

اذان سے پہلے دُرود وسلام پڑھنے کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین کہ اذان سے پہلے بلند آواز سے دُرود وسلام پڑھنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ براہِ کرم تفصیل سے بتلایئے۔

جواب:- اذان سے پہلے بلند آواز کے ساتھ دُرود وسلام پڑھنا کسی حدیث یا صحابہ کرامؓ

(۱) فتاویٰ رشیدیہ ص:۲۵۹ (ادارۂ اسلامیات طبع محرم ۱۴۰۸ھ)۔

کے کسی عمل سے ثابت نہیں ہے، لہٰذا اس کو زیادہ ثواب کا موجب سمجھ کر کرنا یا اس کی پابندی کرنا بدعت ہے،[۱] بلکہ اذان کے کلمات میں اپنی طرف سے کچھ کلمات کا اضافہ کرنا ہے جو باتفاقِ اُمت ناجائز ہے۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۳۰۴ ۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

جمعہ کی اذانِ ثانی کہاں دی جائے؟

سوال:- جمعہ کی اذانِ ثانی منبر اور خطیب کے سامنے دی جائے یا کہ مسجد کے باہر؟

جواب:- جمعہ کی اذانِ ثانی کا خطیب کے سامنے ہونا مسنون ہے، فی الدر المختار:

ویؤذن ثانیًا بین یدیه أی الخطیب، وقال تحته أی علی سبیل السنیة کما یظهر من کلامهم، رملی۔ (شامی ج:۱ ص:۷۷۰)۔[۲]

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۱/۴ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۵۲/ ۱۸ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) وفی الابداع فی مضار الابتداع ص:۷۷، ۷۸ (طبع مکتبة علمیة مدینة المنورة) لا کلام فی ان الصلوة والسلام علی النبی صلی الله علیه وسلم عقب الأذان مطلوبان شرعا لورود الأحادیث الصحیحة .... انما الخلاف فی الجهر بهما علی الکیفیة المعروفة، والصواب أنها بدعة مذمومة بهذه الکیفیة التی جرت بها عادة المؤذنین من رفع الصوت بهما کالأذان والتمطیط والتغنی فانّ ذلک احداث شعار دینی علی خلاف ما عهد عن رسول الله صلی الله علیه وسلم وأصحابه والسلف الصالح من أئمة المسلمین ولیس لأحد بعدهم ذلک. وفیه بعد أسطر: ومن ثم قال العلامة ابن حجر فی فتاویه الکبری من صلّی علی النبی صلی الله علیه وسلم قبل الأذان أو قال محمد رسول الله بعده معتقدا سنّیته فی ذلک المحلّ ینهی ویمنع منه لأنه تشریع بغیر دلیل ومن شرع بغیر دلیل یزجر ویمنع. تفصیل کے لئے "کتاب السنة والبدعة" میں ص:۱۱۱ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر ۲ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) فتاوی شامیة ج:۲ ص:۱۲۱ (طبع ایچ ایم سعید)۔ وفی الهدایة ج:۱ ص:۱۷۱ (مکتبہ شرکت علمیہ، ملتان) واذا صعد الامام المنبر جلس وأذن المؤذّنون بین یدی المنبر بذلک جری التوارث الخ.

وفی الهندیة ج:۱ ص:۱۴۹ (مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ) واذا جلس علی المنبر أذن بین یدیه واقیم بعد تمام الخطبة بذلک جری التوارث کذا فی البحر الرّائق. وفی غنیة المتملی ص:۵۲۱ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور) واذا جلس الامام علی المنبر أذن المؤذن بین یدیه الأذان الثانی للتوارث. (وفی طبع مکة علی الصفحة: ۳۳۱). (محمد زبیر حق نواز عفی عنہ)

سیاسی مقاصد کے لئے اذان دینے کا حکم

سوال:- آج کل مساجد میں پانچ وقت کی اذانوں کے علاوہ جو اذانیں رات میں دی جارہی ہیں، شرعی طور پر اس کا کیا حکم ہے؟

جواب:- قرآن وسنت اور فقہائے کرامؒ کی تصریحات سے اذان کے بعد جو مواقع ثابت ہیں، آج کل پانچ وقت کے علاوہ دی جانے والی اذانیں ان میں سے کسی میں داخل نہیں ہوتیں،[1] البتہ مسلمانوں پر کوئی عام مصیبت آئی ہو تو اس کے ازالے کے لئے فجر کی نماز میں قنوتِ نازلہ ثابت ہے،[2] اور ایسے مواقع پر اس کا اہتمام کرنا چاہئے۔

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۹ھ

(فتویٰ نمبر ۵۶۲/۲۸)

---

(۱) نماز کے علاوہ دیگر مواقع اذان کی تفصیل کے لئے دیکھئے فتاوی شامیۃ مطلب فی المواضع التی یندب لها الأذان فی غیر الصلوٰۃ ج:۱ ص:۳۸۵ (طبع ایچ ایم سعید)۔

(۲) وفی رد المحتار ج:۲ ص:۱۱ وان نزل بالمسلمین نازلة قنت الامام فی صلوٰۃ الجهر .... قنت فی صلوٰۃ الفجر الخ. تفصیل کے لئے فتاوی شامیۃ "مطلب فی القنوت للنّازلة" ج:۲ ص:۱۱ ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر)

﴿فصل فی شروط الصلوٰۃ و أركانها وواجباتها وسننها و اٰدابها﴾

(نماز کی شرائط، فرائض، ارکان، واجبات، سنن اور آداب کے بیان میں)

سمتِ قبلہ کا مطلب

سوال:- نماز پڑھتے وقت کعبہ کا تعین مغرب کی سمت میں کیا جاتا ہے، جبکہ ضروری نہیں کہ دُنیا کے ہر حصے کے لئے یہ اُصول دُرست ہو۔ اگر یہ اُصول محض اس لئے وضع کیا گیا تھا کہ تمام مسلمان ایک سمت کو سجدہ کریں تو نماز میں یہ کہنا کہاں تک دُرست ہے کہ "میرا رُخ کعبے شریف کی طرف ہے" جبکہ ہم کو یقین ہے کہ ہمارا منہ مغرب کی طرف ہے؟

جواب:- غالباً آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ تمام دُنیا کے مسلمان خواہ وہ کہیں آباد ہوں، نماز کے وقت مغرب کا رُخ کرتے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ نہیں ہے۔ اصل میں ہمیں نماز کے اندر کعبہ مشرفہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، ہندوستان اور پاکستان وغیرہ کے لحاظ سے چونکہ کعبہ مغرب کی سمت میں ہے، اس لئے یہاں کے باشندے مغرب کا رُخ کرتے ہیں، لیکن جو لوگ مغربی ممالک مثلاً یورپ اور امریکہ وغیرہ میں بستے ہیں وہ نماز کے وقت مغرب کی بجائے مشرق کی طرف منہ کرتے ہیں، مدینہ طیبہ کے باشندے جنوب کی طرف رُخ کرتے ہیں، اور جنوبی افریقہ کے لوگ شمال کی طرف۔ خلاصہ یہ ہے کہ اصل چیز کعبہ ہی کا استقبال ہے، وہ جس خطے کے لحاظ سے جس سمت میں ہو، ادھر ہی کا رُخ کیا جائے گا۔

واللہ اعلم

۲۰ ربیع الاوّل ۱۳۸۷ھ [1]

حالتِ اِحرام میں جاءِ نماز پر سجدہ کا حکم

سوال:- لوگوں کا خیال ہے کہ حالتِ اِحرام میں ناک اور چہرہ جاءِ نماز سے نہیں لگنا چاہئے، بلکہ اپنے دونوں ہاتھ ملاکر سجدہ اس پر کرنا چاہئے، یہ کہاں تک صحیح ہے؟

(۱) یہ فتویٰ "البلاغ" کے شمارہ ربیع الثانی ۱۳۸۷ھ سے لیا گیا ہے۔ (مرتب)

جواب:- حالتِ اِحرام میں جاءِ نماز پر سجدہ کرنا جائز ہے، دونوں ہاتھ ملاکر ان پر سجدہ کرنا دُرست نہیں۔
واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۲/۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷۷۷/۲۷ و)

ٹرین میں فرض نماز بیٹھ کر پڑھنا

سوال:- سفر کے دوران عصر کی نماز کے لئے خانیوال اسٹیشن تجویز کیا کہ وہاں گاڑی تقریباً ۲۰ منٹ رُکتی ہے، چونکہ گاڑی تاخیر سے چل رہی تھی، اس لئے اس شش و پنج میں رہا کہ کہیں وہاں پہنچتے پہنچتے عصر کا وقت تنگ نہ ہوجائے یا اس وقت تک وضو نہ ٹوٹ جائے، اس لئے گاڑی ہی میں نماز پڑھ لی، لیکن جب گاڑی خانیوال پہنچی تو عصر کا وقت اچھا خاصا تھا، میں نے گاڑی میں نماز بیٹھ کر پڑھی تھی اور خانیوال پہنچ کر اس نماز کو نہیں دُہرایا، کیا میری عصر کی نماز دُرست ہوگئی یا قضا لازم ہوگی؟

جواب:- فرض نماز شدید معذوری کے بغیر بیٹھ کر پڑھنا جائز نہیں،[1] لہٰذا ریل گاڑی میں بیٹھ کر نماز پڑھنے کی بناء پر اب اس نماز کا لوٹانا لازم ہے۔[2]
واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۰/۸ھ
(فتویٰ نمبر ۲۳۴۰/۲۷ ہ)

سجدے میں پیشانی کے ساتھ ناک رکھنے سے متعلق بہشتی زیور اور احسن الفتاویٰ میں تعارض کی تحقیق

سوال:- سجدے میں بہشتی زیور شبیری مکمل مدلل میں صفحہ نمبر ۸۹ پر تحقیقی عنوان سے ہے کہ پیشانی کے ساتھ ناک زمین پر رکھنا واجب نہیں ہے، صرف وضعِ جبہہ علی الارض سے بھی نماز دُرست ہوگی۔

حضرت مفتی رشید احمد صاحب دامت برکاتہم نے اپنے احسن الفتاویٰ میں ناک رکھنا واجب لکھا ہے، اور اگر ناک نہ رکھے تو نماز واجب الاعادہ فرماتے ہیں۔ آپ حضرات اپنی تحقیق سے مطلع فرمائیں اور دلائل بھی تحریر فرمائیں۔ والسلام (حضرت مولانا) حکیم محمد اختر (صاحب مدظلہم)

جواب:- دراصل اس مسئلے میں بہشتی زیور اور احسن الفتاویٰ میں اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ اس مسئلے میں کتبِ فقہ کے درمیان تھوڑا سا اختلاف پایا جاتا ہے۔ عام طور سے کتبِ فقہ میں وہی مسئلہ

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۴۴۲ و ص:۴۴۴ (طبع سعید) من فرائضها .... ومنها القیام فی فرض لقادر علیه، وفی الشامیة تحته، قوله (لقادر علیه) فلو عجز عنه حقیقة وهو ظاهر أو حکمًا کما لو حصل له به ألم شدید أو خاف زیادة المرض وکالمسائل الأتیة .... الخ.

(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۳۹۳ و ۳۹۴ سوال نمبر ۵۱۳ اور اس کا حاشیہ۔ (محمد زبیر)

درج ہے جو بہشتی زیور میں منقول ہے، چنانچہ بدائع، تحفہ اور الاختیار میں اقتصار علی الجبہہ کو بلاکراہت جائز قرار دیا ہے (کما فی البحر ج:۱ ص:۳۳۶)[۱]، اور اکثر کتبِ فقہ میں اس کو مطلق مکروہ لکھا ہے، چنانچہ عالمگیری میں ہے: وان کان من غیر عذر فان وضع جبهته دون أنفه جاز اجماعا، ویکره .... الخ۔ (ج:۱ ص:۷۰)[۲]۔

پھر بعض فقہاء نے اس کو مکروہِ تنزیہی پر محمول کیا، چنانچہ علامہ شامیؒ نے صاحبِ نہر کا قول نقل کیا ہے: لو حملت الکراهة فی رأی من أثبتها علی التنزیهیة ومن نفاها علی التحریمیة لارتفع التنافی، وعبارته فی السراج المستحب أن یضعهما۔ (منحة الخالق ج:۱ ص:۳۳۶)[۳]۔

اور صاحبِ بحر نے کراہتِ تحریمی کو ترجیح دی ہے اور لکھا ہے: وکره أی الاقتصار علی أحدهما سواء کان الجبهة أو الأنف وهی عند الاطلاق منصرفة الی کراهة التحریم، وهکذا فی المفید والمزید فالقول بعدم الکراهة ضعیف۔ (ج:۱ ص:۳۳۶)[۴]۔

علامہ شامیؒ نے اسی بنیاد پر صاحبِ حلیہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ کراہتِ تحریم کا مقابل چونکہ واجب ہوتا ہے اس لئے وضع الانف واجب ہوا، چنانچہ فرماتے ہیں: فالأشبه وجوب وضعهما معًا وکراهة ترک وضع کل تحریما، واذا کان الدلیل ناهضا به فلا بأس بالقول به انتهٰی۔ (شامی ج:۱ ص:۳۳۵)[۵]۔

اسی عبارت کی بناء پر مفتی رشید احمد صاحب مدظلہم نے احسن الفتاویٰ میں وجوب کے قول پر اعتماد کیا ہے[۶]، لیکن خود علامہ شامی رحمہ اللہ نے البحر الرائق کے حاشیہ پر جو بحث کی ہے اس سے ان کا رُجحان عدمِ وجوب کی طرف معلوم ہوتا ہے، وہاں ان کی پوری عبارت یہ ہے:-

قال فی النهر: لو حملت الکراهة فی رأی من أثبتها علی التنزیهیة ومن نفاها علی التحریمیة لارتفع التنافی، وعبارته فی السراج: المستحب أن یضعهما (انتهٰی). لکن قال الشیخ اسماعیل: وفی غرر الأذکار أن الاقتصار علی الجبهة یجوز بلا کراهة وان لم یکن علی الأنف عذرا اتفاقا، وکذلک فی مجموع المسائل وانه به یفتی، وفی الاختیار: وان اقتصر علی جبهته جاز بالاجماع ولا اساءة بعد أن قال: فان اقتصر علی الأنف جاز وقد أساء، وقالا:

---

(۱) البحر الرائق ج:۱ ص:۳۱۸ (طبع ایچ ایم سعید).
(۲) عالمگیریة (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه).
(۳) منحة الخالق علی البحر الرائق ج:۱ ص:۳۱۸ (طبع سعید).
(۴) البحر الرائق ج:۱ ص:۳۱۸ (طبع ایچ ایم سعید).
(۵) فتاویٰ شامیة ج:۱ ص:۴۹۹ (طبع ایچ ایم سعید).
(۶) احسن الفتاویٰ ج:۳ ص:۲۱.

لا یجوز الا من عذر، انتھی کلامہ فلیتأمل. ویبعد ما قالہ فی النھر قول المتن وکرہ علی أحدھما، فانہ لا یصح حملہ علی التنزیھیۃ نظرا الی ترک السجود علی الجبھۃ لکن سیأتی حمل الکراھۃ علی طلب الکف طلبا غیر جازم. (منحۃ الخالق ج:۱ ص:۳۳۶)۔[1]

اس عبارت کے آخری جملے میں علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے وہ بنیاد منہدم کردی ہے جس کی وجہ سے سجود علی الانف کو واجب کہا گیا تھا، اور وہ یہ کہ مطلق کراہت کا اطلاق کراہت تحریمی پر ہوتا ہے جس کا مقابل واجب ہے۔ منحۃ الخالق میں ان کے قول کا حاصل یہ ہے کہ کراہت کا اطلاق طلب الکف طلبا غیر جازم پر بھی ہوتا ہے، جو کراہتِ تنزیہی کو بھی شامل ہے۔

علامہ شامیؒ کی اس رائے سے بہشتی زیور کی تائید ہوتی ہے، اور یہ اس لئے بھی راجح معلوم ہوتا ہے کہ اوّل تو اس سے فقہاء کے مختلف اقوال میں تطبیق ہوجاتی ہے، دُوسرے منحۃ الخالق، رد المحتار کے بعد لکھی گئی ہے، لہٰذا یہ ان کا آخری مسلک ہے۔ تاہم اس میں شبہ نہیں کہ رد المحتار سے جو وجوب سمجھ میں آتا ہے، اس پر عمل زیادہ قرینِ احتیاط ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۱۱/۸ھ

(فتویٰ نمبر ۱۱۷۳/۲۸ ج)

امام کا تکبیر کے وقت بیٹھے رہنا اور ''حی علی الفلاح'' پر کھڑا ہونا

سوال:- جب تکبیر شروع ہوتی ہے تو امام صاحب بیٹھے رہتے ہیں، اور ''حی علی الفلاح'' پر کھڑے ہوتے ہیں، یہ صحیح ہے یا نہیں؟

جواب:- صحیح طریقہ یہ ہے کہ تکبیر کی ابتداء ہی میں تمام مقتدی کھڑے ہوکر صفیں دُرست کرلیں، اور بعض مقامات پر جو رواج ہوگیا ہے کہ امام اور مقتدی باہر سے آکر بیٹھ جانے کا اہتمام کرتے ہیں اور ''حی علی الفلاح'' سے پہلے کھڑا ہونے کو بُرا جانتے ہیں، یہ طرزِ عمل دُرست نہیں۔ فقہاء نے جو لکھا ہے کہ ''حی علی الفلاح'' پر کھڑے ہوجانا چاہئے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ''حی علی الفلاح'' کہنے کے بعد کوئی بیٹھا نہ رہے، یہ مطلب نہیں کہ پہلے کھڑا ہونا ناجائز ہے۔ اس مسئلے کی پوری تفصیل جواہر الفقہ[2] مؤلفہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں موجود ہے۔ تفصیل کے لئے اس کی طرف رُجوع فرمالیں۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۰/۲۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲۲۸/۲۷ ہ)

---

(۱) منحۃ الخالق علی البحر الرائق ج:۱ ص:۳۱۸ (طبع ایچ ایم سعید).

(۲) ج:۱ ص:۳۰۹ تا ۳۲۴

تکبیر کے دوران نمازی کب کھڑے ہوں؟

سوال:- ایک مولوی صاحب نے وسیع طبع شدہ چارٹ لگایا جس میں اقوالِ نبویؐ، اقوالِ صحابہؓ اور مسلکِ بزرگانِ دین سے یہ ثابت کیا ہے کہ تکبیرِ اُولیٰ کے وقت بیٹھنا مستحب ہے، اور شروع میں کھڑا ہونا مکروہ ہے، تو کیا یہ صحیح ہے یا نہیں؟

جواب:- درحقیقت مسئلہ یہ ہے کہ مقتدیوں کے کھڑے ہونے کا تکبیر کے کسی لفظ کے ساتھ تعلق نہیں ہے، بلکہ جس وقت مقتدی امام کو آتا دیکھیں اس وقت سے لے کر مکبّر کے "حی علی الفلاح" کہنے تک کسی بھی وقت کھڑے ہوسکتے ہیں، ہاں! اس کے بعد کھڑا ہونا مکروہ ہے۔ یہ کہنا دُرست نہیں ہے کہ "حی علی الفلاح" سے پہلے کھڑا ہونا مکروہ ہے، جو لوگ اس سے پہلے کھڑے ہوتے ہیں وہ کسی مکروہ عمل کا ارتکاب نہیں کرتے۔

مسندعبدالرزاق کی ایک حدیث میں ہے: عن ابن جریج عن ابن شھاب ان الناس کانوا ساعۃ یقول المؤذن: اللہ أکبر یقومون الی الصلوٰۃ فلا یأتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم مقامہ حتی تعتدل الصفوف (فتح الباری)۔[1] اور فتاویٰ عالمگیری میں ہے: فأما اذا کان الامام خارج المسجد فان دخل المسجد من قبل الصفوف فکلما جاوز صفا قام ذٰلک الصف، والیہ مال شمس الأئمۃ الحلوانی والسرخسی وشیخ الاسلام خواھر زادہ، وان کان الامام دخل المسجد من قدامھم یقومون کما رأوا الامام۔ (عالمگیری ج:۱ ص:۴۴)۔[2]

اور جن کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ "حی علی الفلاح" کہنے پر سب کھڑے ہوجائیں، ان کا مقصد یہ ہے کہ "حی علی الفلاح" کہنے پر کوئی شخص بیٹھا نہ رہے، یہ مطلب نہیں کہ اس سے پہلے کھڑا ہونا مکروہ ہے۔[3]

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی
۱۳۹۱/۴/۲۳ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع

(فتویٰ نمبر ۵۴۷/۲۲ الف)

---

(۱) فتح الباری، کتاب الأذان، باب متی یقوم الناس اذا رأوا الامام عند الاقامۃ، ج:۲ ص:۱۲۰ (طبع دار نشر کتب الاسلامیہ لاھور)۔

(۲) فتاوی عالمگیریۃ ج:۱ ص:۵۷ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔

(۳) تفصیل کے لئے جواہر الفقہ ج:۱ ص:۳۰۹ تا ۳۲۴ ملاحظہ فرمائیں۔

تکبیر کے دوران مقتدی کب کھڑے ہوں؟

سوال:- تکبیر کے وقت مقتدیوں کو "حی علی الصلوٰۃ" تک بیٹھنا ہے یا اوّل تکبیر پر کھڑا ہونا چاہئے، اور اگر پیش امام بیٹھا ہے اور مقتدی بھی کافی تعداد میں یا ایک دو افراد کھڑے ہوں تو ان کو زبردستی بٹھلانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- اوّل تکبیر پر کھڑا ہونا بہتر ہے، کوئی شخص "حی علی الفلاح" کہنے تک بھی کھڑا ہوجائے تو ٹھیک ہے، لیکن اس سے پہلے کھڑے ہونے کو بُرا سمجھنا اور اہتمام کر کے لوگوں کو بٹھانا جائز نہیں۔[1]

واللہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۱۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۷۷ الف)

نماز کے لئے کیسا لباس پہننا ضروری ہے؟ اور صرف ٹوپی پہن کر نماز پڑھانے کا حکم

سوال:- لباسِ مسنونہ کون سا لباس ہوسکتا ہے؟ کیا نماز میں امام اور مقتدی کا لباس ایک جیسا ہونا چاہئے؟ کیونکہ دونوں نمازی ہیں، یا الگ الگ ہیں جیسا کہ بعض لوگ امام کے لئے عمامہ ضروری تصوّر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ مسنون ہے، تو پھر امام اور مقتدی دونوں کے لئے ہونا چاہئے۔ اور صرف ٹوپی پہن کر نماز پڑھانے سے لوگ اعتراض کرتے ہیں۔ مولانا احتشام الحق صاحبؒ ٹوپی پہن کر نماز پڑھاتے ہیں، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب:- نماز کے صحیح ہونے کے لئے کسی خاص وضع کا لباس شرط نہیں ہے، بلکہ ہر اس لباس میں نماز ہوجاتی ہے جس سے سترِ عورت پورا ہوجاتا ہو، البتہ جو پاجامہ ٹخنے سے نیچے لٹکا ہوا ہو یا ایسا لباس ہو جس میں غیر مسلم قوم کی مشابہت ہے تو اس کے ساتھ نماز مکروہ ہے،[2] فاسد پھر بھی نہیں ہوتی۔ اور عمامہ نہ امام کے لئے شرط ہے، نہ مقتدی کے لئے، کپڑے کی ٹوپی ہو یا کھال کی یا کسی اور چیز کی، ہر قسم کی ٹوپی سے نماز بلاکراہت جائز ہوجاتی ہے۔ جو لوگ عمامے کو امامت کے لئے شرط قرار

---

(۱) تفصیل کے لئے سابقہ فتویٰ اور جواہر الفقہ ج:۱ ص:۳۰۹ تا ۳۲۴ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) وفی المشکوۃ ج:۱ ص:۷۵ قال علیہ السلام: ان اللہ لا یقبل صلاۃ رجل مسبل ازارہ. رواہ الترمذی (فی ج:۱ ص:۸۷). وقال الطحطاوی علی المراقی (فی المکروھات) ص:۱۸۹ وکذا ما ھو عادۃ أھل التکبر.

دیتے ہیں وہ غلطی پر ہیں، البتہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بکثرت عمامہ زیبِ سر فرماتے تھے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اِتباع میں عمامہ باندھنا اور عمامے سے نماز پڑھنا افضل اور زیادہ موجبِ ثواب ہے، لیکن اس کے بغیر بھی نماز بلاکراہت صحیح ہوجاتی ہے۔[۱] واللہ سبحانہ اعلم

۲؍رمضان المبارک ۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۰۵ ج)

ایک طرف سلام نہ پھیرنے سے نماز دُرست ہوگی یا نہیں؟

سوال:- امام کے آخری قعدے میں بیٹھ کر دائیں جانب سلام پھرانے کے بعد ایک مقتدی نے اللہ اکبر کہہ کر امام کو لقمہ دیا، لقمے کی آواز سے امام ٹھٹک گیا، بائیں طرف سلام نہ پھرا کر کھڑے ہوکر سوال کیا کہ نماز پوری نہیں ہوئی؟ اکثر مقتدیوں نے کہا کہ نماز پوری ہوگئی، لقمہ دینے والے نے غلطی کی۔ کیا بائیں طرف نہ پھرانے سے نماز تمام ہوجائے گی یا اعادہ ضروری ہے؟

جواب:- نماز کے اختتام پر دونوں طرف سلام پھیرنا اصح قول کی بناء پر واجب ہے، (اگرچہ بعض فقہاء نے دُوسرے سلام کو سنت بھی کہا ہے) لہٰذا صورتِ مسئولہ میں امام نے ترکِ واجب کا ارتکاب کیا، جس کا حکم یہ ہے کہ نماز کی فرضیت تو ساقط ہوگئی لیکن وقت کے اندر اندر نماز کا اعادہ واجب تھا، اب جبکہ وقت بھی گزر چکا اور ان مصلیوں کا اجتماع نہ رہا تو نماز کراہت کے ساتھ ہوگئی، البتہ امام کو اس غلطی پر توبہ و اِستغفار کرنا چاہئے۔

قال فی الدر المختار: ولفظ السلام مرتین، فالثانی واجب،[۲] وفی مراقی الفلاح (فی بیان حکم الواجب فی الصلوٰۃ) (واعادتها بترکه عمدا) وسقوط الفرض ناقصا ان لم یسجد ولم یعد، وقال الطحطاوی تحت قوله (واعادتها بترکه عمدا) أی ما دام الوقت باقیا وکذا فی السهو ان لم یسجد له وان لم یعدها حتّی خرج الوقت تسقط مع النقصان وکراهة التحریم، ویکون فاسقًا اثمًا، وکذا الحکم فی کل صلوٰۃ أدیت مع کراهة التحریم، والمختار أن المعادة

---

(۱) وفی عمدة الرعایة علی هامش شرح الوقایة کتاب الصلوٰۃ ج:۱ ص:۱۲۹ (طبع سعید) وقد ذکروا أن المستحب أن یصلی فی قمیص وازار وعمامة ولا یکره الاکتفاء بالقلنسوة ولا عبرة لما اشتهر بین العوام من کراهة ذلک وکذا ما اشتهر أن المؤتم لو کان معتما بعمامة والامام مکتفیا علی القلنسوة یکره … الخ.

(۲) الدر المختار ج:۱ ص:۴۶۸ (طبع سعید).

لترک واجب نفل جابر والفرض سقط بالأولٰی. (الطحطاوی علی المراقی ص:۱۳۴ فی فصل بیان الواجب)۔[۱]

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۰/۱۲/۲۷ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۹۹/۲۱ الف)

نماز میں ثناء اور دُرود شریف پڑھنا سنتِ مؤکدہ ہے یا غیر مؤکدہ؟

سوال:- نماز میں ثناء، دُرود شریف، دُعا وغیرہ کا پڑھنا سنتِ مؤکدہ ہے یا غیر مؤکدہ؟

جواب:- نماز میں ثناء، دُرود شریف اور اس کے بعد کی دُعا سُننِ مؤکدہ میں سے ہے۔

لما فی الدر المختار وسننها .... الثناء والتعوّذ .... والصلوٰة على النبى صلى الله عليه وسلم والدعاء۔[۲] اور "وسننها" کے تحت صاحبِ درمختار لکھتے ہیں: ترک السنة لا يوجب فسادا ولا سهوا بل اسائة لو عامدًا غير مستخف .... الخ۔[۳] اور یہ تعریف سنتِ مؤکدہ کی ہے، كما يظهر من كلام الشامیؒ۔ (ج:۱ ص:۳۱۸ و ۳۱۹)۔[۴]

اس کے علاوہ فقہاء جب نماز کی سنت مطلق بولتے ہیں تو اس سے مؤکدہ ہی مراد ہوتی ہے، سُننِ زوائد یا سُننِ غیر مؤکدہ کو عموماً آداب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۶/۲۴ھ
(فتویٰ نمبر ۶۹۲/۲۹ ب)

---

(۱) (طبع قديمى كتب خانه). وفى بدائع الصنائع ج:۱ ص:۱۹۴ وأما الذى هو عند الخروج من الصلوٰة فلفظ "السلام" عندنا، وعند مالک والشافعى فرض، والكلام فى التسليم يقع فى مواضع فى بيان صفته أنه فرض أم لا وفى بيان قدره .... (وقال بعد أسطر:) ولنا ما روى عن عبدالله بن مسعود رضى الله عنه أنه قال: صليت خلف رسول الله صلى الله عليه وسلم وخلف أبى بكرؓ و عمرؓ وكانوا يسلمون تسليمتين عن أيمانهم وعن شمائلهم وروى عن على انه قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يسلّم تسليمتين .... وأما الأحاديث فالأخذ بما روينا أولىٰ، لأن عليا وابن مسعود كانا من كبار الصحابة وكانا يقومان بقربه صلى الله عليه وسلم .... الخ. وكذا فى عامة كتب الفقه الحنفى.
نیز دونوں سلام کے وجوب سے متعلق محدثانہ کلام کے لئے حضرتِ والا دامت برکاتہم کی کتاب درسِ ترمذی ج:۲ ص:۶۴ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲ تا ۴) الدر المختار ج:۱ ص:۴۷۳ - ۴۷۷ (طبع سعيد). وفى تبيين الحقائق ج:۱ ص:۲۸۶ (طبع سعيد) وسننها رفع اليدين للتحريمة .... والثناء والتعوّذ .... والصلوٰة على النبى صلى الله عليه وسلم والدعاء يعنى بعد التشهد فى القعدة الأخيرة لقوله عليه السلام: اذا صلّى أحدكم فليبدأ بالثناء على الله تعالىٰ ثم بالصلوٰة ثم بالدعاء. وقال الشافعى رحمه الله: الصلوٰة على النبى فرض .... ولنا أنه عليه السلام علم الأعرابى فرائض الصلوٰة ولم يعلمه الصلوٰة على النبى صلى الله عليه وسلم. وفى شرح العناية على الهداية على هامش فتح القدير ج:۱ ص:۳۴۱ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه) وبالسنة ما فعله رسول الله صلى الله عليه وسلم بطريق المواظبة ولم يتركها الا لعذر كالثناء والتعوّذ وتكبيرات الركوع والسجود، وكذا فى البحر الرائق ج:۱ ص:۳۰۳ (طبع سعيد).

تسمیہ، سورۂ فاتحہ سے پہلے پڑھی جائے یا بعد میں؟

سوال:- تسمیہ، الحمد سے پہلے پڑھی جائے یا بعد میں؟

جواب:- ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ سے پہلے بسم اللہ پڑھنی چاہئے۔[1] واللہ اعلم

الجواب صحیح
محمد شفیع عفی عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۴ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۰۰/۱۸ الف)

با جماعت نماز ادا کرنا سنت ہے یا واجب؟

سوال:- نماز با جماعت ادا کرنا سنتِ مؤکدہ ہے یا واجب؟
نیز سفر کے دوران نماز با جماعت کا اہتمام ضروری ہے یا نہیں؟

جواب:- سنتِ مؤکدہ قریب بہ واجب ہے،[2] اور سفر میں اگر جماعت سے نماز پڑھنا ممکن نہ ہو یا جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کی صورت میں ساتھیوں سے بچھڑنے کا خطرہ ہو یا سواری کی روانگی کا خطرہ ہو تو ایسی صورت میں جماعت کے بغیر اکیلے نماز پڑھنا جائز ہے۔ وفی بدائع الصنائع (ج:۱ ص:۱۵۳): وأمّا المسافرون فالأفضل لهم أن يؤذنوا ويقيموا ويصلّوا بجماعة، لأن الأذان والاقامة من لوازم الجماعة المستحبة والسفر لم يسقط الجماعة فلا يسقط ما هو من لوازمها .... الخ۔[3] تاہم حتی الامکان جماعت ہی سے نماز پڑھنے کا اہتمام کرنا چاہئے۔ واللہ اعلم

۱۴۱۲/۱/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۶۵/۵۸)

---

(۱) وفی غنية المتملی ص:۳۰۲ (طبع سهيل اكيڈمی لاهور) (يسمی) أی يقرأ بسم الله الرحمٰن الرحيم (فيأتی بها) أی بالتسمية (فی أول كل ركعة). وفی الهندية ج:۱ ص:۷۴ (طبع رشيديه كوئته) ويأتی بها فی أول كل ركعة وهو قول أبی يوسفؒ وفی الحجة وعليه الفتویٰ. وفی التنوير مع شرحه باب صفة الصلٰوة ج:۱ ص:۴۹۰ (طبع سعيد) وكما تعوذ سمّٰی سرًا فی أول كل ركعة.

(۲) وفی الدر المختار باب الامامة ج:۱ ص:۵۵۲ (طبع سعيد) (والجماعة سنة مؤكدة للرجال) قال الزاهدی أرادوا بالتأكيد الوجوب الا فی جمعة وعيد فشرط .... الخ. وفی رد المحتار تحت (قوله قال الزاهدی) توفيق بين القول بالسنية والقول بالوجوب الاتی وبيان أن المراد بهما واحد أخذا من استدلالهم بالأخبار الواردة بالوعيد الشديد بترک الجماعة، وفی النهر عن المفيد الجماعة واجبة وسنة لوجوبها بالسنة .... الخ.

(۳) وفی الدر المختار باب الامامة ج:۱ ص:۵۵۴ - ۵۵۶ فتسن أو تجب (الجماعة) علی الرجال العقلاء البالغين الأحرار القادرين علی الصلٰوة بالجماعة من غير حرج، فلا تجب علی مريض .... وارادة سفر. وفی الشامية تحت قوله (وارادة سفر) أی واقيمت الصلٰوة ويخشٰی ان تفوته القافلة بحر، واما السفر نفسه فليس بعذر كما فی القنية.
نیز جماعت کے ''سنتِ مؤکدہ قریب بہ واجب'' ہونے کے مطلب سے متعلق تفصیل کے لئے دیکھئے: امداد الاحکام ج:۱ ص:۵۳۳ تا ۵۳۵۔ (محمد زبیر حق نواز)

اِستقبالِ قبلہ شرط ہے، اِستقبالِ قبلہ کی نیت شرط نہیں

(نیتِ اِستقبالِ قبلہ کی مختلف صورتوں کا تفصیلی جائزہ اور ان کا حکم)

سوال:- زید اِستقبالِ خانہ کعبہ کی نیت سے نماز شروع کرتا ہے، کیا اس کی نماز ہوجائے گی یا نہیں؟ علامہ شامیؒ نے تذبذب میں ڈال دیا ہے، کیونکہ ان کی مندرجہ ذیل عبارت ج:۱ ص:۳۳۲ سے راجح و صحیح جواز معلوم ہوتا ہے:-

اما علی القول الراجح من انہ لا یشترط نیتھا فلا یضرہ نیۃ غیرھا بعد وجود الاستقبال الذی ھو الشرط .... فما ذکرہ الشارح تبعًا للبحر والحلیۃ صحیح.(۱)

اور اس کے بعد عبارت نمبر۲ جو شرح منیہ سے نقل فرمائی ہے کہ:-

ان نیۃ القبلۃ وان لم تشترط لٰکن عدم نیۃ الاعراض عنھا شرط وعلیہ فھو مفرع علی الراجح۔(۲) سے معلوم ہوتا ہے کہ راجح قول عدمِ جواز کا ہے، لہٰذا براہِ کرم محقق مفتیٰ بہ جواب عنایت فرما کر عند اللہ مأجور ہوں۔

جواب:- بیشتر فقہاء نے مسئلہ یہی لکھا ہے اور اسی کو ترجیح دی ہے کہ نماز میں اِستقبالِ قبلہ شرط ہے، لیکن اِستقبالِ قبلہ کی نیت ضروری نہیں، بغیر نیت اِستقبال ہوجائے گا، تب بھی نماز دُرست ہوگی۔ خود شارحِ منیہ نے بھی یہ مسئلہ ذکر کر کے اس کو صحیح قرار دیا ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں:-

وقال صاحب الھدایۃ فی التجنیس نیۃ الکعبۃ لیست بشرط فی الصحیح من الجواب لأن استقبال القبلۃ شرط فلا یشترط فیہ النیۃ کالوضوء انتھٰی. وھٰذا لأن الشروط یراعی وجودھا تبعًا لا وجودھا قصدًا لأنھا وسائل لیست بمقصودۃ بالذات. (کبیری شرح منیۃ)(۳)۔

البتہ آگے چل کر انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگرچہ اِستقبالِ قبلہ کی نیت شرط نہیں لیکن عدم نیۃ الاعراض عن القبلۃ شرط ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص اعراض عن القبلۃ کی نیت کرے گا تو اس کی نماز فاسد ہوجائے گی۔ علامہ شامیؒ نے ان کا یہ قول محتمل طریقے سے نقل فرمایا ہے، اس لئے تردّد ہوتا ہے، لیکن علامہ ابراہیم حلبیؒ شارحِ منیہ کی عبارتیں دیکھنے کے بعد ان کے قول کا جو منشاء سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ مسئلے کی چند صورتیں ہیں:-

---

(۱، ۲) رد المحتار ج:۱ ص:۴۲۵ (طبع سعید).

(۳) غنیۃ المتملی ص:۲۱۸ (طبع سھیل اکیڈمی لاھور).

۱:- اِستقبالِ قبلہ بھی ہو اور اس کی نیت بھی ہو، یہ بالاتفاق دُرست ہے۔

۲:- اِستقبالِ قبلہ ہو اور نیت کچھ نہ ہو، اس صورت میں راجح قول کی بناء پر نماز دُرست ہے، کما مرّ قول شارح المنية عن صاحب الهداية وهو الذي اختاره في تنوير الأبصار والدر المختار۔

۳:- اِستقبالِ قبلہ ہو اور نیت غیرِ قبلہ کی ہو، اس معنی میں کہ وہ کعبہ کی طرف رُخ کرنے کی بجائے اور چیز کو قبلہ سمجھ کر اس کا رُخ کرنا چاہتا ہو، یہ وہ صورت ہے جس میں شارحِ منیہ نے نماز کو فاسد کہا ہے۔

كمن توجه الى الركن اليماني ناويًا الصلوٰة الى بيت المقدس فان نية القبلة وان لم يشترط الا ان عدم نية الاعراض عنها شرط. (کبیری ص:۲۲۳)۔[1]

اس پر قیاس کرکے انہوں نے یہ مسئلہ بھی بیان فرمایا ہے کہ:-

ان نوى المصلّي يعني وقت الشروع ان قبلته محراب مسجده لا تجوز صلوٰته لأنه علامة على جهة القبلة. (بحوالہ مذکورہ)۔[2]

اس سے واضح ہوتا ہے کہ فسادِ صلوٰۃ کی صورت یہ ہے کہ محراب کی طرف اس خیال سے رُخ کرے کہ قبلہ یہی ہے۔ اس پر علامہ شامیؒ نے اس صورت کو بھی قیاس فرمایا ہے کہ کوئی شخص بناءِ کعبہ کی نیت کرے تو اس کا بھی حکم یہی ہوگا۔ لیکن مقیس علیہ پر غور کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ اس وقت ہے جب وہ عرصۂ کعبہ سے صراحۃً اعراض کرنے کی نیت کرے اور محض بناء و جدران کو قبلہ سمجھے، جس کی علامت یہ ہے کہ اس کا خیال یہ ہو کہ اگر یہ پتھر اس مقام سے ہٹا کر کہیں اور رکھ دیئے جائیں تو وہی قبلہ ہوں گے اور انہی کا استقبال کیا جائے گا، تب اس کی نماز فاسد ہوگی، لیکن ظاہر ہے ایسا خیال کرنا بہت بعید ہے۔

۴:- چوتھی صورت اس سے خودبخود نکل آئی اور وہ یہ کہ کوئی شخص کسی مسامت قبلہ چیز کے اِستقبال کی نیت کرے، نہ اس وجہ سے کہ وہ قبلہ ہے بلکہ اس وجہ سے کہ وہ جہتِ قبلہ کی علامت ہے تو اس صورت میں نماز ہوجائے گی، مثلاً محراب کے اِستقبال کی نیت کرے، لیکن مقصد یہ نہ ہو کہ محراب، قبلہ ہے، بلکہ یہ ہو کہ قبلہ کی علامت ہے۔ تو درحقیقت یہ اِستقبالِ محراب کی نیت نہیں ہوگی بلکہ اس کو اِستقبالِ قبلہ کی نیت ہی کہا جائے گا، اس لئے نماز جائز ہوگی۔

كما يفيده قول المنية ان نوى المصلّي ان قبلته محراب مسجده .... الخ. وقوله

(۱، ۲) غنية المتملي ص:۲۲۳ (طبع سهيل اكيذمي لاهور).

لأن علامة علی جهة القبلة .... الخ۔[1]

اسی طرح اگر کوئی شخص بناءِ کعبہ کی نیت کرے لیکن اس لئے نہیں کہ وہ قبلہ ہے، بلکہ اس لئے کہ قبلہ کی علامت ہے تو بلاشبہ اس کی نماز دُرست ہوگی۔ اس تفصیل سے واضح ہوگیا کہ اگر کوئی شخص نماز میں کعبہ کا رُخ کرنے کی نیت کرے تو اس کی نماز دُرست ہوگی، کیونکہ اس نیت کا مفہوم عرفاً یہی ہے کہ مقصود اِستقبالِ قبلہ وکعبہ ہے، اور خانۂ کعبہ کو عرف میں لفظ کعبہ ہی کے لئے بولتے ہیں، نیز اگر اس سے بناءِ کعبہ ہی مراد ہو تب بھی اس کے اِستقبال کی نیت بوجہ علامت ہونے کے ہے، نہ کہ بوجہ قبلہ ہونے کے، جس کی دلیل یہ ہے کہ اگر بناء کے پتھر وہاں سے ہٹا کر کہیں اور رکھ دیئے جائیں تو یہ مصلّی ان کا استقبال نہیں کرے گا لہٰذا اس کی نماز دُرست ہے، ہاں! اگر کوئی شخص ان پتھروں کو قبلہ سمجھے اور ان کے اپنی جگہ سے ازالے کے بعد انہی کی طرف رُخ کرنے کا قائل ہو تو اس کی نماز دُرست نہیں ہوگی، وهذا لا یتصوّر فی مسلم۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۲/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۳۲۹/۲۲ الف)

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی

بیٹھ کر نماز پڑھنے کے دوران کھڑے ہوجانا

سوال:- نماز بیٹھ کر پڑھنے کے دوران ایک رکعت کے بعد طاقت محسوس کی تو اَب کھڑے ہوجانا دُرست ہے یا نہیں؟ اور بیٹھے ہوئے پڑھنے میں حرج تو نہیں؟

جواب:- نفلوں میں اس طرح کرنا بہتر ہے، اور اگر فرض مجبور ہوکر بیٹھ کر پڑھ رہا تھا اور طاقت آگئی تو کھڑا ہونا فرض ہے۔[2]

فقط واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۲۷/۱۸ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد عاشق الٰہی بلندشہری

---

(۱) غنية المتملي ص:۲۲۳ (طبع سهيل اکیڈمی لاهور).

(۲) وفي مجمع الأنهر شرح ملتقی الأبحر ج:۱ ص:۲۲۹ ولو افتتحها قاعدًا للعجز يركع ويسجد فقدر علی القيام بنی قائمًا عند الشيخين .... الخ.

﴿فصل فی الامامۃ والجماعۃ﴾
(امامت اور جماعت سے متعلق مسائل کا بیان)

امامت کی نیت کا طریقہ

سوال:- اگر کسی کو امام بنادیا جائے تو اس کو امامت کی نیت کس طرح کرنی چاہئے؟

جواب:- بس یہ نیت کرلیں کہ میں ان تمام لوگوں کی امامت کر رہا ہوں جو میری اقتداء کریں۔ نیت، زبان سے ہونی ضروری نہیں، دِل میں یہ ارادہ کرلینا کافی ہے۔(۱) واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۱/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۶ الف)

امام کے شرعی اوصاف

سوال:- ایک امام جو تمام اوقات کی نماز پڑھاتا ہو، اس کے شرعی اوصاف کیا ہونے چاہئیں؟ کیا اس میں جسمانی اعضاء کا بھی لحاظ ہے؟ مثلاً جس شخص کا ہاتھ پیدائشی طور پر مفلوج ہو، یا پیدائشی چھوٹا ہو اور وہ تکبیر کے وقت ہاتھ کانوں تک نہ لے جاسکتا ہو، کیا اس عذر کا شخص نماز پڑھانے کا اہل ہے؟

جواب:- سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ امام، بارگاہِ خداوندی میں مسلمانوں کی درخواست پیش کرنے کے لئے ایک نمائندہ کی حیثیت رکھتا ہے، اس لئے شریعت کی طرف سے اس کے کچھ مخصوص اوصاف مقرّر کئے گئے ہیں، تاکہ یہ نمائندہ مسلمانوں کے شایانِ شان ان کی نمائندگی کرسکے۔ ان اوصاف میں سے بعض تو لازمی ہیں، اور جس شخص میں یہ اوصاف نہ پائے جاتے ہوں اس کے پیچھے نماز نہیں ہوتی، اور بعض اوصاف ایسے ہیں کہ ان کے بغیر نماز ہوجاتی ہے، مگر مکروہ رہتی ہے، اور بعض اوصاف صرف مستحسن اور پسندیدہ ہیں، ان کے بغیر نماز میں کوئی کراہت نہیں آتی، مگر بہتر یہ ہے کہ امام اسی شخص کو بنایا جائے جس میں یہ اوصاف بھی موجود ہوں۔

(۱) دیکھئے: الدر المختار مع رد المحتار ج:۱ ص:۴۱۵ (طبع سعید) و عالمگیریۃ ج:۱ ص:۶۵ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ).

لازمی اوصاف جن کے بغیر مقتدیوں کی نماز ہی نہیں ہوسکتی، مندرجہ ذیل ہیں:-

۱:- امام مسلمان ہو، بالغ ہو، دیوانہ نہ ہو، نشے میں نہ ہو۔

۲:- نماز کا طریقہ جانتا ہو۔

۳:- نماز کی تمام شرائط وضو وغیرہ اس نے پوری کر رکھی ہوں۔

۴:- کسی ایسے مرض میں مبتلا نہ ہو، جس کی وجہ سے اس کا وضو قائم نہ رہتا ہو، مثلاً مسلسل نکسیر وغیرہ (ایسے شخص کو فقہاء معذور کہتے ہیں، ایسا شخص اپنے جیسے معذور کی امامت تو کرسکتا ہے، مگر تندرست لوگوں کا امام نہیں بن سکتا)۔

۵:- رُکوع اور سجدے پر قادر ہو، اگر کسی بیماری وغیرہ کی وجہ سے وہ رُکوع سجدے پر قادر نہ ہو تو تندرست لوگوں کی امامت نہیں کرسکتا۔

۶:- گونگا، توتلا یا ہکلا نہ ہو۔[1]

اور دُوسری قسم کے اوصاف جن کے بغیر نماز مکروہ رہتی ہے، مندرجہ ذیل ہیں:-

۱:- صالح ہو، یعنی کبیرہ گناہوں میں مبتلا نہ ہو۔

۲:- فاسد العقیدہ نہ ہو۔

۳:- نماز کے ضروری مسائل سے واقف ہو۔

۴:- قرآنِ کریم کی تلاوت صحیح طریقے سے کرسکتا ہو۔

۵:- کسی ایسے جسمانی عیب میں مبتلا نہ ہو جس کی وجہ سے اس کی پاکیزگی مشکوک ہوجائے، یا لوگ اس سے گھن یا اس کا استخفاف کرتے ہوں۔ اسی وجہ سے نابینا، مفلوج، ابرص وغیرہ کے پیچھے نماز پڑھنے کو فقہاء نے خلافِ اَولیٰ قرار دیا ہے، لیکن یہ کراہت اسی وقت ہے جب اس سے بہتر دُوسرا امام مل سکتا ہو، اگر اس سے بہتر نہ مل سکے تو کوئی کراہت نہیں ہے۔ (شامی ج:۱ ص:۵۲۳ تا ۵۲۵)[2]

یہ تمام اوصاف تو قانونی انداز کے تھے، ان کے علاوہ چونکہ امامِ مسجد اپنے محلے کا دینی مرکز اور ایک طرح سے مربی بھی ہوتا ہے، اس لئے بہتر یہ ہے کہ مندرجہ ذیل مزید اوصاف اس میں پائے جاتے ہوں:-

حاضرین میں علمِ دین اور تلاوتِ قرآن کے اعتبار سے سب سے زیادہ بلند رُتبہ ہو۔

خوش اخلاق، شریف النسب، باوقار اور وجیہ ہو۔

---

(۱) یہ تمام اوصاف رد المحتار لابن عابدین الشامیؒ ج:۱ ص:۵۵۷ تا ۵۶۲ (طبع ایچ ایم سعید) میں موجود ہیں۔

(۲) شامی ج:۱ ص:۵۶۰ - ۵۶۲ (طبع ایچ ایم سعید)۔

صفائی، ستھرائی، تقویٰ اور طہارت کا خیال رکھتا ہو۔

مستغنی طبیعت رکھنے والا اور سیر چشم ہو، اور محلے کی دینی تربیت کے لئے جتنے اوصاف کی ضرورت ہے، وہ اس میں پائے جاتے ہوں۔

محلے کی مساجد میں امام کا انتخاب کرتے وقت ان اوصاف کی رعایت کرلی جائے تو محلے میں ایک نہایت خوشگوار دینی ماحول پیدا ہوسکتا ہے۔ مذکورہ بالا تشریح کے بعد آپ کے تمام سوالات کا جواب خودبخود واضح ہوجاتا ہے۔ جس شخص کے ہاتھ اتنے چھوٹے ہوں کہ وہ کانوں تک نہ پہنچتے ہوں تو اگر اس میں کوئی اور عیب نہیں ہے تو اس کے پیچھے بلاکراہت نماز پڑھی جاسکتی ہے۔ واللہ اعلم

۲۵ محرم ۱۳۸۷ھ[1]

جس کا علم زیادہ ہو، اسے امام بنانا افضل ہے

سوال:- ایک مسجد میں دو اُستاذ بچوں اور بچیوں کو پڑھاتے ہیں، ایک اُستاذ مقامی ہیں، جو کہ صرف عالم ہی ہیں، دُوسرے غیر مقامی ہیں جو کہ عالم، قاری اور حافظ بھی ہیں۔ مقامی اُستاذ صرف بچیوں کو پڑھاتے ہیں، دُوسرے اُستاذ بچوں کو سارا دن صبح شام پڑھاتے ہیں، جبکہ نمازیں اور جمعہ کی نماز مقامی اُستاذ پڑھاتے ہیں۔ ان دونوں میں سے نماز اور جمعہ پڑھانے کا کون زیادہ مستحق ہے؟ اس میں جھگڑے کی کوئی بات نہیں ہے اور نہ کوئی اختلاف ہے۔

جواب:- ان دونوں میں سے جن کا علم زیادہ ہو، خاص طور سے نماز کے مسائل سے جو صاحب زیادہ واقف ہوں اور جن کے علم وتقویٰ پر لوگ زیادہ اعتماد کرتے ہوں، ان کو امام بنانا زیادہ بہتر ہے،[2] ویسے جائز دونوں کی امامت ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۸/۶/۱۵ھ

(فتویٰ نمبر ۷۹۱/۲۹ ب)

شرعی مسئلے کو نہ ماننے والے کی امامت کا حکم

سوال:- زید کسی جامع مسجد میں امام ہے، اس میں مندرجہ ذیل عیوب موجود ہیں:-

۱:- جملہ مقتدی اس سے ناراض ہیں، ناراضگی دُنیوی کاموں پر ہے، سوائے متولّی کے جو کہ اس

---

(۱) یہ فتویٰ ''البلاغ'' کے شمارہ صفر ۱۳۸۷ھ سے لیا گیا ہے۔

(۲) وفی الدر المختار (باب الامامة ج:۱ ص:۵۵۷) والاحق بالامامة تقديما بل نصبا الأعلم بأحكام الصلاة فقط صحة وفسادا بشرط اجتنابه للفواحش الظاهرة .... ثم الأورع .... الخ. وفی الهندية (الباب الخامس فی الامامة الفصل الثانی ج:۱ ص:۸۳) الأولى بالامامة أعلمهم بأحكام الصلوة هكذا فی المضمرات، وهو الظاهر هكذا فی البحر الرائق هذا اذا علم من القراءة .... قدر ما تقوم به سنة القراءة ولم يطعن فی دينه.

سے مجبور ہے، اس ناراضگی کی وجہ سے محلے کے لوگوں نے اسے لاٹھی بھی ماری، پھر بھی وہ پیش امام ہے۔

۲:- مقتدیوں پر بہتان اور ان کے عیوب کو افشاء کرنا اس پیش امام کی عادت ہے۔

۳:- غرور سے اتنا بھرا ہوا ہے کہ اگر نماز میں کوئی خلل واقع ہو، خود نہیں جانتا، اور اگر مقتدی کسی صاحبِ علم سے مسئلہ تحقیق کر کے بتائیں تو ان کی باتوں کو نہیں مانتا، علماء کو غلط کہتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ ایسا امام امامت کا حق دار ہے یا اس کو مسجد سے نکال دیں؟

جواب:- اگر سوال میں درج شدہ واقعات دُرست ہیں، یعنی امام خود عالم نہیں ہے اور علماء کے بتائے ہوئے مسئلے کو مانتا نہیں اور مسلمانوں پر بہتان لگاتا ہے تو اسے مقتدیوں کی امامت سے الگ ہوجانا چاہئے، کیونکہ حدیث میں ایسے شخص کی امامت پر اصرار کرنے پر وعید آئی ہے۔[1] اگر وہ خود مستعفی نہ ہو تو متولیٔ مسجد کو بھی اختیار ہے کہ وہ اسے معزول کردے۔　　واللہ سبحانہ اعلم

۲۹/۱۱/۱۴۰۱ھ

(فتویٰ نمبر ۳۲/۱۷۷۰ ج)

بدکردار شخص کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم

سوال:- ۱:- ایک شخص جو کچھ خفیہ اور اندرونی کوششوں کے ذریعے سے محکمۂ اوقاف کو جل دے کر ایک جامع مسجد میں خطیب اور امام کا عہدہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ ۲:- اس شخص کو جس نے خود کو مصنوعی طور پر عالم اور قاری مشہور کر رکھا ہے، مسجد میں کم وبیش ایک سال کا عرصہ امامت وخطابت کے فرائض انجام دیتے ہوئے گزر چکا ہے۔ اس طویل عرصے میں متعدد نمازیوں کو اس شخص کے علم وفضل، رفتار وگفتار اور کردار واخلاق کے بارے میں قابلِ اعتراض شہادتیں فراہم ہوچکی ہیں، بایں وجہ ایک کثیر تعداد نمازیوں کی اس شخص کی وجہ سے مسجد کو چھوڑنے پر مجبور ہوئی اور دُور دُور جاکر فریضۂ نماز ادا کرنے کی زحمت اُٹھا رہی ہے۔ ۳:- یہ شخص تلاوتِ قرآن مجید کے دوران فاسد قسم کی غلطیاں کرتا ہے اور ارکانِ نماز پوری طرح ادا نہیں کرتا اور لوگوں کو غلط مسائل اور فتوے دیتا ہے۔ ۴:- اس شخص کے کردار کے بارے میں بھی بہت سے سنجیدہ لوگوں کے ذہنوں میں شکوک وشبہات موجود ہیں، اور بعض باتیں ایسی کہی جاتی ہیں کہ اگر ان کی تحقیق کرلی جائے تو اس شخص کا بدکردار ہونا ثابت ہوسکتا ہے۔ ۵:- یہ شخص مفتی اور مفسر بھی ہے، اس نے مسجد کے مسلمانوں کی جماعت میں شدید

---

(۱) وفي الدر المختار ج:۱ ص:۵۵۹ (طبع سعيد) (ولو أم قومًا وهم له كارهون ان) الكراهة لفساد فيه أو لأنهم أحق بالامامة منه كره له ذلك تحريمًا لحديث أبي داؤد: "لا يقبل الله صلاة من تقدم قوما وهم له كارهون."

وفيه أيضا ج:۱ ص:۵۵۷ والأحق بالامامة تقديما بل نصبا مجمع الأنهر الأعلم بأحكام الصلاة فقط صحة وفسادا بشرط اجتنابه للفواحش الظاهرة. وفي البحر الرائق ج:۱ ص:۳۴۸ (طبع مكتبه رشيديه كوئته) واما الكراهة فمبنية على قلة رغبة الناس في الاقتداء بهؤلاء فيؤدي الى تقليل الجماعة المطلوب تكثيرها تكثيرا للأجر.

قسم کا انتشار برپا کردیا ہے اور غلط باتوں کے ذریعہ آپس میں لڑادیتا ہے۔ ۶:- یہ شخص محکمۂ اوقاف کے افسران سے خفیہ ربط و تعلق رکھتا ہے اور ناجائز اثرات استعمال کرکے مسجد مذکورہ کے ایک مؤذن کو جو حافظ و عالم تھے، مختلف قسم کے غلط الزامات لگاکر اور سازش و شرارت کرکے علیحدہ کرواچکا ہے۔
۷:- اب صورتِ حال یہ ہے کہ اس مسجد کے نمازی سخت تکلیف اور اذیت میں مبتلا ہیں، اور اس شخص سے خلاصی پانے کے لئے انہوں نے کچھ تحقیقات کی ہیں اور جن جن مساجد میں اس نے ملازمت کی ہے، وہاں جاکر دریافت حال کیا تو معلوم ہوا کہ یہ شخص شدید قسم کا بدکردار، اوباش، مفسد، بددیانت اور بےعلم ہے، اور وہاں سے شدید نفرت کے ساتھ نکالا جاچکا ہے، اور یہ ایک مسجد سے دُوسری مسجد بھاگ نکلا ہے، اور وہاں کوئی شخص بھی ایسا نہیں ملا جو اس کے لئے کلمۂ خیر کہہ سکتا ہو، مزید یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ غیرشادی شدہ ہے اور اپنے ساتھ ایسے دوستوں کو رکھتا ہے جس سے ماحول مکدر ہو رہا ہے، مندرجہ بالا کوائف پیش کرکے آپ سے التماس ہے کہ یہ شخص قابلِ امامت ہے یا نہیں؟

جواب:- امام کسی ایسے شخص کو بنانا چاہئے جو صحیح العقیدہ، متقی، پرہیزگار اور ضروری دینی مسائل سے کماحقہ باخبر ہو، نیز قراءت صحیح کرتا ہو، اور کم از کم نماز کے مسائل سے پوری طرح باخبر ہو۔[1] لہٰذا سوال میں جو باتیں لکھی گئی ہیں اگر وہ دُرست ہیں تو ایسے شخص کے پیچھے نماز مکروہ ہے،[2] اسے معزول کرکے کسی ایسے شخص کو امام بنانا چاہئے جس میں مذکورہ شرائط پائی جاتی ہوں، البتہ جب تک کسی دُوسرے امام کا انتظام نہ ہو اس وقت تک ان کے پیچھے نماز پڑھنا تنہا نماز پڑھنے سے بہتر ہے، اور جو نمازیں اس طرح پڑھی جائیں گی وہ ہوجائیں گی۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۲/۱ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷۳۵/ ۲۷ و)

کسی ناجائز فعل سے منع کرنے پر امامت سے معزول کرنا

سوال:- عرض یہ ہے کہ سائل امامِ مسجد موضع بٹ تھانہ شیروان ضلع ایبٹ آباد کی جدی طور سے پشت در پشت ۲۱۵ سال سے دیہہ مذکور میں امامت چلی آرہی ہے، اور اب سائل امامت وخطابت

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۵۵۷ (طبع ایچ ایم سعید) والأحق بالامامة تقديما بل نصبا مجمع الأنهر. (الأعلم بأحكام الصلوٰة) فقط صحة وفسادًا بشرط اجتنابه للفواحش الظاهرة .... (ثم الأحسن تلاوة) وتجويدًا (للقراءة ثم الأورع) أى الأكثر اتقاء للشبهات والتقوى اتقاء المحرمات. وفى الشامية تحته (قوله بأحكام الصلوة فقط) أى وان كان غير متبحر فى بقية العلوم.... (قوله بشرط اجتنابه .... الخ) .... الأعلم بالسنة أولى الا أن يطعن عليه فى دينه، لأن الناس لا يرغبون فى الاقتداء به وفى البحر الرائق ج:۱ ص:۳۴۸ وأما الكراهة فمبنية على قلة رغبة الناس فى الاقتداء بهؤلاء فيؤدى الى تقليل الجماعة المطلوب تكثيرها تكثيرًا للأجر.

(۲) وفی الدر المختار ج ۱ ص:۵۵۹ (طبع ایچ ایم سعید) (ولو أم قوما وهم له كارهون ان) الكراهة (لفساد فيه .... كره) له ذلك تحريما. وفيه أيضا ج:۱ ص:۵۵۹ و ۵۶۰ ويكره امامة عبد .... وفاسق .... الخ.

کے فرائض سرانجام دے رہا ہے۔

سائل مستند عالمِ دین فارغ التحصیل از مدرسہ تعلیم القرآن راولپنڈی ہے۔ مؤرخہ ۱۹۸۳/۹/۲۲ء کو دیہہ مذکورہ کے زرین وغیرہ مسجد شریف کا جنریٹر (بجلی) بدون اجازت سینہ زوری سے اپنے مال و دولت کے نشے میں اپنے عبدالستار کی شادی میں لے گئے تھے۔ ان کے اس فعلِ مجرمانہ پر میں نے بحیثیت امام کے ان کو آگاہ کیا، اور خدا کا خوف دِلایا، کیونکہ جنریٹر بجلی مسجد شریف کی ملکیت کا استعمال ان لوگوں نے ناچ گانے والی عورتوں کے تماشے پر صرف کیا۔ ان ملزموں کو ان کے اس فعل سے باز رکھنے کے لئے جب میں نے وعظ ونصیحت کی تو اُلٹا انہوں نے میرے گھر پر پتھراؤ کیا، گالی گلوچ کی اور مجھ پر حملہ آور ہوئے، اور مجھے امامت سے برطرف کردیا۔ ملزموں نے مجھے امامت سے اس لئے برطرف کیا ہے کہ میں نے انہیں مضمون جاری کیا اور یہ کہ میں نے انہیں مسجد شریف کی ملکیت جنریٹر ناچ گانوں میں استعمال کرنے سے کیوں منع کیا، اور اس منع کرنے پر ان کی توہین ہوئی، لہٰذا اس کی سزا یہ ہے کہ مسجد شریف کی امامت سے مجھے برطرف کردیا گیا۔ لہٰذا آپ بحیثیت مفتی وشرعی جج ہونے کے فیصلہ صادر فرمادیں کہ سائل یہاں امامت وخطابت کا اہل وحق دار ہے یا نہیں؟

۱:- سائل بفضلہٖ تعالیٰ مستند عالم ہے۔

۲:- باشرع ہے، صاحبِ اولاد ہے، چھ بچوں کا باپ ہے، کسی قسم کا کوئی عیب شرعی نہیں ہے۔

جواب:- اگر واقعات مندرجہ سوال دُرست ہیں اور سائل میں کوئی شرعی نقص نہیں ہے تو ان کے پیچھے نماز بلاشبہ ہوجاتی ہے، اور ایک بُری بات سے منع کرنے کی بناء پر ان کو معزول کرنا شرعاً ناجائز ہے۔ جہاں تک معزولی کے شرعاً معتبر ہونے کا تعلق ہے وہ یہ جاننے پر موقوف ہے کہ شرائطِ ملازمت کیا تھیں؟

واللہ اعلم

۱۴۰۷/۸/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۸۴/۳۸ د)

جس امام سے مقتدی راضی نہ ہوں، اس کی امامت کا حکم

سوال:- ایک صاحب گزشتہ پندرہ سال سے ایک مسجد میں امامت کراتے ہیں، مگر علمی قابلیت کے مالک نہیں، جمعہ کی تقریر کے لئے دُوسرے مولانا صاحب آتے ہیں جو مستند عالم ہیں۔ قراءۃ بھی تجوید کے مطابق ہے، لیکن یہ فقط تقریر کرتے ہیں اور نمازِ جمعہ پیش امام مسجد پڑھاتے ہیں، جبکہ لوگوں کی خواہش ہے کہ مقرِّر ہی نمازِ جمعہ پڑھائیں، لیکن مذکورہ امام اس وجہ سے اس کی اجازت نہیں دیتے کہ کہیں خطیب صاحب قابض نہ ہوجائیں، جبکہ خطیب صاحب اس کا اقرار کرتے ہیں کہ میرا

مقصد ان کی جگہ پر قبضہ کرنا نہیں۔ کئی لوگ مذکورہ امام کے پیچھے کئی وجوہ سے نماز نہیں پڑھتے:-
ا:- امام صاحب قرآن و حدیث کا علم نہیں رکھتے۔ ۲:- قراءۃ قرآن مجہول ہے۔ ۳:- خطبہ بھی غلط پڑھتے ہیں۔ ۴:- ذرا سی بات بھی خلافِ طبع ہوجائے تو فحش گالیاں دیتے ہیں۔ ۵:- لوگ ان کے طرزِ عمل پر انہیں غور کرنے کو کہتے ہیں تو وہ لوگوں کو نماز پڑھنے سے منع فرمادیتے ہیں۔ لہٰذا ان کی اقتداء صحیح ہے یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں جبکہ مقتدی ان امام صاحب کے پیچھے نماز پڑھنے سے خوش نہیں ہیں اور ان سے زیادہ علم رکھنے والا امام موجود ہے تو ان امام صاحب کا اپنی امامت پر اصرار کرنا مکروہِ تحریمی ہے، لیکن جو لوگ مذکورہ وجوہات کی بناء پر ان کے پیچھے نماز پڑھنے کے بجائے گھر میں اکیلے نماز پڑھتے ہوں وہ بھی غلطی پر ہیں، انہیں چاہئے کہ ان کی جگہ افضل امام کو مقرّر کرنے کی کوشش فتنہ برپا کئے بغیر جاری رکھیں اور جب تک دُوسرے امام کا انتظام نہ ہو اس وقت تک انہی امام صاحب کے پیچھے نماز پڑھتے رہیں، کیونکہ ان کے پیچھے نماز بہرحال ہوجائے گی، اور ان کے پیچھے نماز پڑھنا اکیلے پڑھنے سے بہتر ہے۔

فی الدر المختار: ولو أم قوما وهم له كارهون ان الكراهة لفساد فيه أو لأنهم أحق بالامامة منه كره له ذلک تحريمًا (ج:۱ ص:۳۷۶)۔ (۱)

وفی رد المحتار تحت قوله: "صلى خلف فاسق أو مبتدع نال فضل الجماعة" أفاد أن الصلاة خلفهما أولى من الانفراد، لكن لا ينال كما ينال خلف تقي ورع لحديث: من صلّى خلف عالم تقي فكانما صلّى خلف نبي۔ (شامی ج:۱ ص:۳۷۷)۔ (۲)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۲/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۴۹۷/۲۷ و)

علمائے دیوبند کے عقائد سے جزوی اختلاف رکھنے والے ایک امام کی امامت سے متعلق تفصیلی فتویٰ

(ژوب بلوچستان کے کچھ علمائے کرام اپنے ایک مقامی امام کے عقائد اور نماز میں اس کی اقتداء سے متعلق تنازعے کے تصفیے کے لئے حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کے پاس آئے تھے، حضرت والا دامت برکاتہم نے فریقین کو ایک متفقہ استفتاء مرتب کرنے کی ہدایت فرمائی جس کا حضرتِ والا

(۱) الدر المختار ج:۱ ص:۵۵۹ (طبع ایچ ایم سعید) وفي البحر الرائق ج:۱ ص:۳۴۸ وأما الكراهة فمبنية على قلة رغبة الناس في الاقتداء بهؤلاء فيؤدي الى تقليل الجماعة المطلوب تكثيرها تكثيرا للأجر.
(۲) فتاویٰ شامیة ج:۱ ص:۵۶۲ (طبع ایچ ایم سعید).

دامت برکاتہم نے تفصیلی جواب تحریر فرمایا، اور اس سے پہلے ریکارڈ میں وضاحت اور یادداشت کے لئے ایک تحریر بھی مرتب فرمائی، ریکارڈ سے یہ وضاحتی تحریر، اس کے بعد فریقین کا متفقہ استفتاء اور حضرت والا دامت برکاتہم کی جانب سے اس کا جواب درج ذیل ہے۔ حضرت والا دامت برکاتہم کے اس جواب پر بعض حضرات کی طرف سے دوبارہ استفتاء کیا گیا وہ استفتاء اور اس کا جواب بھی آخر میں درج ہے۔) (محمد زبیر عفی عنہ)

حضرتِ والا دامت برکاتہم کی وضاحتی تحریر

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ۔ عرض گزار ہے کہ علاقہ ژوب بلوچستان کے دو فریق احقر کے پاس اپنے ایک تنازعے کے سلسلے میں تحکیم کے لئے تشریف لائے۔ ان میں سے ایک فریق مولانا محمد شیرانی صاحب اپنے چند رفقاء کے ہمراہ پہلے تشریف لائے، پھر دُوسرا فریق یعنی مولانا صبغت اللہ صاحب اپنے چند رفقاء کے ہمراہ اگلے روز تشریف لائے۔ دونوں نے احقر سے الگ بھی باتیں کیں اور اجتماعی طور پر بھی، دونوں کی خواہش یہ تھی کہ احقر ان کے درمیان حَکَم بن کر ان کے تنازعے کا فیصلہ کرے، لیکن چونکہ احقر کے لئے واقعات کی چھان بین اور تفتیش ممکن نہیں تھی، اس لئے احقر نے تحکیم سے معذوری ظاہر کی، اور یہ عرض کیا کہ اگر دونوں فریق کوئی متفقہ استفتاء مرتب فرمالیں تو احقر اس کا جواب لکھ کر دیدے گا۔

تنازعہ اس بات پر تھا کہ مولانا صبغت اللہ صاحب اپنے عقائد ونظریات کے لحاظ سے مستحقِ امامت ہیں یا نہیں؟ اس لئے احقر نے تجویز پیش کی کہ ان کے متنازعہ عقائد لکھ کر متفقہ طور پر استفتاء کرلیا جائے، اس پر مولانا شیرانی صاحب کو اعتراض یہ تھا کہ اس وقت مولانا صبغت اللہ صاحب جو عقائد و نظریات لکھ کر دیں گے وہ ان کے ان حقیقی عقائد ونظریات سے بہت کم اور اَخف ہوں گے جو وہ علاقے میں بیان کرتے رہتے ہیں، اس لئے استفتاء سے صحیح صورتِ حال واضح نہیں ہوگی۔ لیکن بالآخر انہوں نے اس شرط پر متفقہ استفتاء مرتب کرنے کو قبول کرلیا کہ وہ کم سے کم اُمور جن کا انہوں نے اعتراف کیا ہو، اس استفتاء میں درج کئے جائیں گے، اور دُوسرے اُمور چونکہ متفقہ استفتاء میں درج نہیں ہوسکتے، اس لئے یہاں ان کو درج نہیں کیا جارہا، ان کے بارے میں ہم اپنا حقِ استفتاء الگ محفوظ رکھیں گے۔ چنانچہ اس کے بعد متفقہ استفتاء مرتب کیا گیا اور اس پر دونوں فریقوں نے دستخط کردیئے۔

یہ استفتاء اور اس پر احقر کا جواب اس تحریر کے ساتھ منسلک ہے۔

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۴۱۴/۸/۱۷ھ
(فتویٰ نمبر ۳۱/۱۱۰۳)

فریقین کی طرف سے پیش کیا گیا استفتاء اور اس کا جواب

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ ہمارے علاقے میں ایک صاحب کے عقائد کے بارے میں یہ تنازعہ ہے کہ ان کے عقائد جمہور اہلِ سنت والجماعت بالخصوص مسلکِ علمائے دیوبند کے مطابق ہیں یا نہیں؟ نیز ان کے عقائد کے پیشِ نظر انہیں امام بنانا شرعاً دُرست ہے یا نہیں؟ اور جو نمازیں ان کے پیچھے ادا کی گئیں ان کا کیا حکم ہے؟ چنانچہ ان صاحب سے ان کے عقائد کے سلسلے میں کچھ سوالات کئے گئے جن کا جواب انہوں نے تحریری شکل میں دیا ہے۔

آپ ان جوابات[1] کا بغور مطالعہ فرما کر یہ تحریر فرمائیں کہ مسلکِ علمائے دیوبند کے مطابق یہ جوابات کیا حیثیت رکھتے ہیں؟ اور مذکورہ صاحب کی امامت کے بارے میں شرعی استفتاء کے ساتھ سات ورق میں منسلک ہیں۔

جواب:- استفتاء کے ساتھ منسلک مولانا صبغت اللہ صاحب کے لکھے ہوئے چودہ سوالات کے جوابات[2] کا احقر نے بغور مطالعہ کیا، اور بعض اُمور میں مولانا موصوف سے زبانی وضاحتیں بھی طلب کیں، ان میں سے بعض اُمور میں بعض جوابات واضح طور پر علمائے دیوبند کے مسلک کے مطابق ہیں، مثلاً اوقاتِ مکروہہ ومنہیہ میں تحیۃ المسجد کا ممنوع ہونا، یا سوال نمبر۶ کے جواب میں دُعا کے وقت فی الجملہ رفعِ یدین کو موافقِ سنت کہنا، لیکن بعض جوابات مجمل ہیں، مثلاً شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی اور علامہ ابنِ تیمیہؒ کے بارے میں انہوں نے یہ واضح نہیں فرمایا کہ جن مسائل میں علمائے دیوبند کو ان حضرات سے اختلاف ہے ان مسائل میں مولانا موصوف کا موقف کیا ہے؟ نیز سوال نمبر۴ کے جواب میں یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ تین دن کے بعد میّت کے گھر جاکر تعزیت کرنے کو مولانا موصوف علی الاطلاق بدعت وناجائز کہتے ہیں یا اس کی کسی خاص ہیئت کو؟

لیکن مولانا موصوف کے جوابات میں چار اُمور ایسے ہیں جو صراحۃً علمائے دیوبند کے مسلک کے خلاف ہیں، اور وہ مندرجہ ذیل ہیں:-

۱:- مولانا نے حدیثِ مبارک: "لا تشد الرحال الّا الی ثلاثۃ مساجد" کی اس تشریح کی طرف اپنا رُجحان ظاہر کیا ہے جو علامہ ابنِ تیمیہؒ سے منقول ہے، چنانچہ وہ زیارتِ قبور کے لئے سفر کو حدیثِ مذکور کی نہی میں شامل سمجھتے ہیں یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس کی

(۱،۲) امام صاحب کی طرف سے اہلِ علاقہ کو اپنے عقائد سے متعلق دیئے گئے ان وضاحتی جوابات کی تحریر ریکارڈ میں موجود نہیں ہے، تاہم آگے حضرتِ والا دامت برکاتہم کی طرف سے دیئے گئے فتویٰ میں چونکہ ان کے عقائد کا جائزہ لیا گیا ہے لہٰذا اس سے امام صاحب کے عقائد بھی واضح ہوجاتے ہیں۔ (محمد زبیر عفی عنہ)

زیارت کی نیت سے سفر کرنے کو بھی دُرست نہیں سمجھتے، بلکہ ان کے نزدیک سفر کا مقصد مسجدِ نبوی کی زیارت ہونا چاہئے اور ضمناً روضۂ اقدس کی زیارت بھی ہو جائے تو مضائقہ نہیں۔ انہوں نے احقر سے زبانی یہ بیان کیا کہ اب تک مجھے چونکہ کوئی نقلی دلیل زیارتِ روضۂ اقدس کے استحباب کی نہیں ملی، اس لئے میرا عمل یہ ہے کہ میں نے مسجدِ نبوی کے قصد سے مدینہ طیبہ کا سفر کیا اور وہاں پہنچ کر روضۂ اقدس کی زیارت بھی ہوگئی، اور آئندہ بھی ایسا ہی ارادہ ہے۔

مولانا کا یہ نظریہ علمائے دیوبند کے مسلک کے صراحۃً مخالف ہے، اس بارے میں بہت سی تحریریں موجود ہیں، لیکن خاص طور سے "المهند على المفند" جو حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری قدس سرہٗ کی مرتب فرمودہ کتاب ہے، اور جس پر اس وقت کے تمام اکابر علمائے دیوبند کے دستخط ہیں، اس کی عبارت یہ ہے کہ:

''ہمارے نزدیک اور ہمارے مشائخ کے نزدیک زیارتِ قبرِ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم اعلیٰ درجے کی قربت اور نہایت ثواب اور سببِ حصول نصیب ہے، اور سفر کے وقت آپ کی زیارت کی نیت کرے اور ساتھ میں مسجدِ نبوی اور دیگر مقامات و زیارت گاہ ہائے متبرکہ کی بھی نیت کرے، پھر جب وہاں حاضر ہوگا تو مسجدِ نبوی کی بھی زیارت ہو جائے گی ......

رہا وہابیہ کا یہ کہنا کہ مدینہ منورہ کی جانب سفر کرنے والے کو صرف مسجدِ نبوی کی نیت کرنی چاہئے اور اس قول پر حدیث کو دلیل لانا کہ کجاوے نہ کسے جاویں مگر تین مسجدوں کی جانب، سو یہ قول مردود ہے .... الخ۔'' (عقائد علمائے دیوبند ص:۲)

۲:- اسی طرح مولانا نے اپنے جواب میں تعویذ کی ہر قسم کو کم از کم مکروہ بتایا ہے۔ جہاں تک ایسے تعویذات کا تعلق ہے جن میں استمداد بغیر اللہ ہو یا جو غیر معلوم المعنی ہوں تو ان کے حرام ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں، لیکن جن نقوش اور ہندسوں کے معنی معلوم ہوں انہیں حرام کہنا، یا آیاتِ قرآنی اور اسمائے حسنیٰ کے ذریعے تعویذ کو مکروہ قرار دینا علمائے دیوبند کے مسلک کے خلاف ہے، جس کی تصریحات علمائے دیوبند کے فتاویٰ میں موجود ہیں، مثلاً ملاحظہ ہو فتاویٰ رشیدیہ صفحہ:۲۱۸، وعزیز الفتاویٰ ج:۱ ص:۱۵۲۔ تمام علمائے دیوبند کا عمل بھی اس پر رہا ہے اور حکیم الاُمت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ایک مستقل کتاب ''اعمالِ قرآنی'' اسی مقصد کے لئے تألیف ہوئی ہے، لہٰذا اس عمل کو مکروہ کہنا مسلکِ علمائے دیوبند کے بالکل خلاف ہے۔[1]

---

(۱) تفصیلی دلائل کے لئے درج ذیل کتب ملاحظہ فرمائیں: ابوداؤد ج:۲ ص:۱۸۲، مشكوة المصابيح ج:۲ ص:۳۸۸ (طبع قديمي كتب خانه)، شامية ج:۲ ص:۳۶۳ (طبع ايچ ايم سعيد)، و تكملة فتح الملهم ج:۴ ص:۳۱۷.

۳:- فرض نمازوں کے بعد بہ ہیئتِ اجتماعی ہاتھ اُٹھاکر دُعا مانگنے کا استحباب کتبِ فقہ میں مصرح ہے، اور اگر اسے مستحب سمجھ کر اس پر عمل کیا جائے تو علمائے دیوبند کے مسلک کے مطابق دُرست ہے، لیکن مولانا نے اپنے جواب نمبرا میں جس شدّت اور عموم کے ساتھ اس پر نکیر کی ہے اور اسے بدعت اور واجب الترک بتایا ہے، وہ علمائے دیوبند کے مسلک کے خلاف ہے۔ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کا ایک پورا رسالہ اسی موضوع پر ہے، اس میں وہ حدیث وفقہ کے مفصل دلائل بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں:-

''یہ روایاتِ فقہیہ ہیں جن سے صراحۃً ثابت ہوتا ہے کہ فرض نماز کے بعد امام اور مقتدی سب مل کر دُعا مانگیں اور دُعا سے فارغ ہوکر ہاتھ منہ پر پھیریں۔'' (کفایت المفتی ج:۳ ص:۲۹۷)[1]

اور حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے اعلاء السنن میں اس مسئلے پر بیس صفحات میں بحث کی ہے، اور آخر میں لکھا ہے: فثبت أن الدعاء مستحب بعد كل صلاة مكتوبة متصلا بها برفع اليدين كما هو شائع في ديارنا وديار المسلمين قاطبة ۔ (اعلاء السنن ج:۳ ص:۲۱۱،۲۱۲)[2]۔ اسی طرح حضرت مولانا سیّد محمد یوسف بنوریؒ نے معارف السنن میں اس مسئلے پر مفصل بحث کرنے کے بعد لکھا ہے: فهٰذه وما شاكلها من الروايات في الباب تكاد تكفي حجة لما اعتاده الناس في البلاد من الدعوات الاجتماعية دبر الصلوات، ولذا ذكره فقهاؤنا أيضًا كما في نور الايضاح ۔ (معارف السنن ج:۳ ص:۱۲۳ باب ما يقول اذا سلم)۔ اور العرف الشذی کی نقل اس کے مقابلے میں موثوق نہیں ہے، بہرصورت علمائے دیوبند کے مسلک میں فرائض کے بعد دُعا مع رفع الیدین مستحب ہے، بدعت نہیں ہے۔

۴:- مولانا نے نماز کی نیت کے تلفظ کو بھی بدعت قرار دیا ہے، حالانکہ اگر احضارِ نیت کے خیال سے اس کو سنتِ نبوی یا واجب سمجھے بغیر تلفظِ نیت کیا جائے تو وہ علمائے دیوبند کے نزدیک بدعت نہیں ہے۔ حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی قدس سرہٗ تحریر فرماتے ہیں: واباحه بعض لما فيه من تحقيق عمل القلب وقطع الوسوسة، وما روى عن عمرؓ أنه أدب من فعله فهو محمول على أنه انما زجر من جهر به. (فأما المخافتة به) فلا بأس بها فمن قال من مشائخنا: ان التلفظ بالنية سنة لم يرد بها سنة النبي صلى الله عليه وسلم بل سنة المشائخ لاختلاف الزمان وكثرة الشواغل على

---

(۱) کفایت المفتی ج:۳ ص:۳۴۵، ۳۴۶ (جدید ایڈیشن ۲۰۰۱ء، دارالاشاعت)۔

(۲) اعلاء السنن باب الانحراف بعد السلام وكيفيته، وسنية الدعاء والذكر بعد الصلوٰة ج:۳ ص:۱۶۷ (طبع ادارۃ القرآن کراچی)۔

القلوب .... الخ۔ (اعلاء السنن ج:۲ ص:۱۳۴)۔[1]

بہر کیف! مذکورہ چار مسائل میں مولانا صبغت اللہ صاحب نے اپنا جو موقف بیان فرمایا ہے وہ علمائے دیوبند کے موقف سے مختلف ہے، اور مجموعی طور پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مولانا موصوف، علمائے دیوبند کے مسلک کے کلی طور پر پابند نہیں ہیں بلکہ بعض مسائل میں ان کی اپنی تحقیقات ہیں جو زیادہ تر علامہ ابنِ تیمیہؒ اور علامہ ابنِ قیمؒ کی تحقیقات پر مبنی ہیں۔ لہٰذا جس مقام پر مقتدی حضرات علمائے دیوبند سے وابستہ ہوں وہاں ایسے شخص کو امام مقرر کرنا چاہئے جو کلی طور پر علمائے دیوبند کے مسلک کا قائل ہو، اور اگر وہاں کوئی ایسا شخص امامت کے لئے موجود ہو تو ایسے مقام پر مولانا موصوف مستحقِ امامت نہیں، تاہم جو نمازیں ان کے پیچھے پڑھی گئی ہیں وہ ادا ہوگئیں، ھذا ما عندی!

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۰/۸/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۹۱/۳۱ د)

مذکورہ جواب کے چند اُمور کی مزید وضاحت کے لئے

دُوسرا استفتاء اور اس کا جواب

سوال:- حضرت علامہ محمد تقی عثمانی صاحب

السلام علیکم! گزارش کی جاتی ہے کہ جنابِ والا نے جو حکم درباره فیصلہ بین الفریقین یعنی مولوی محمد خان و رفقاؤہ وصبغت اللہ و رفقاؤہ دیا تھا، اس میں آپ نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ: ”جہاں پر مقتدی حضرات علمائے دیوبند سے وابستہ ہوں وہاں ایسے شخص کو مقرّر کرنا چاہئے جو کلی طور پر علمائے دیوبند کے مسلک کا قائل ہو، اور وہاں کوئی ایسا شخص امامت کے لئے موجود ہو تو ایسے مقام پر مولانا موصوف مستحقِ امامت نہیں ہیں۔“

اس میں سخت اجمال ہے، کیونکہ اس کا یہ مطلب بھی لیا جاسکتا ہے کہ اس وجہ سے مستحق نہیں کہ دائرۂ اسلام میں نہیں، اور یہ احتمال بھی رکھتا ہے کہ اہلِ سنت والجماعت سے خارج ہے۔ پھر سوال پیدا ہوگا کہ ان مذکورہ فی الفتویٰ چار مسائل کا قائل کیا اہلِ سنت والجماعت میں نہیں رہتا؟

اور یہ امکان بھی رکھتا ہے کہ ان مسائل والا متبعِ مذہبِ حنفی نہیں سمجھا جاتا تو پھر یہ شبہ پیدا ہوگا

---

(۱) اعلاء السنن ج:۲ ص:۱۴۹ (طبع ادارۃ القرآن کراچی) اس مسئلے سے متعلق مزید تفصیلی دلائل کے لئے دیکھئے: الدر المختار مع رد المحتار ج:۱ ص:۴۱۵ (طبع ایچ ایم سعید)، اور فتاویٰ عالمگیریہ ج:۱ ص:۶۵ (طبع مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ) اور فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج:۲ ص:۱۴۷۔

کہ آیا مذاہبِ اربعہ جو سب اہلِ سنت والجماعت ہیں ان کی ایک دُوسرے کے پیچھے نمازیں صحیح نہیں، فاسد ہیں؟ حالانکہ یہ کہنا کتنے خراب نتائج پیدا کرے گا، بہرحال یہ اجمال محتاجِ ازالہ ہے۔ واضح کرکے مطمئن فرمایا جائے، کیونکہ جب موصوف مستحقِ امامت نہیں ہے تو پھر کوئی بھی کہیں اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز نہ جانے گا بلکہ نہ اس سے تعلیم حاصل کرے گا، نہ اس کے وعظ و نصیحت کو کوئی سننے کو تیار ہوگا۔ حاصل یہ کہ اس پر اور اس کے ہم خیال لوگوں پر دین کی خدمت کے تمام راستے بند ہوجائیں گے اور اس کی ساری زندگی اُلجھن میں رہے گی، خویش و اقارب و اغیار ہمیشہ اس کو شک و اشتباہ کی نظروں سے دیکھیں گے۔ اگر وہ واقعی اس کا از رُوئے دلیل مستحق ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ اس کا عذر خدا کے نزدیک بن جائے گا اور مخالفین کے ساتھ خدا کا حساب کیسے ہوگا۔ برائے مہربانی اصل حقیقت سے واضح الفاظ میں آگاہ فرماویں، خدا تعالیٰ جزائے خیر دیں۔

جواب:- جس استفتاء اور اس کے جواب کا آپ نے حوالہ دیا ہے، اس میں مولانا صبغت اللہ صاحب کو اس محلے میں غیر مستحقِ امامت قرار دینے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ معاذاللہ وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہیں یا ان کے پیچھے نماز فاسد ہوتی ہے، بلکہ اس کی بنیاد اس بات پر تھی کہ ان کو اپنی بعض ایسی تحقیقات پر اصرار ہے جو علمائے دیوبند کے عام مسلک سے مختلف ہیں، اس لئے جہاں علمائے دیوبند سے وابستہ حضرات آباد ہوں، وہاں ان کی امامت موجبِ فتنہ بن سکتی ہے۔ اسی طرح جن چار نظریات کی بناء پر مذکورہ فتویٰ دیا گیا تھا وہ نظریات علمائے دیوبند کے مسلک کے خلاف ہیں، لیکن محض ان چار نظریات کی وجہ سے نہ کوئی شخص دائرۂ اسلام سے خارج ہوسکتا ہے اور نہ اسے اہلِ سنت والجماعت سے خارج کیا جاسکتا ہے، اور نہ اس کے پیچھے نماز فاسد ہوتی ہے۔ چنانچہ مذکورہ فتویٰ ہی میں یہ بھی لکھ دیا گیا تھا کہ جو نمازیں ان کے پیچھے پڑھی گئی ہیں وہ ادا ہوگئیں۔ البتہ اس فتویٰ کا حاصل صرف یہ ہے کہ جہاں ایسا امام دستیاب ہو جو کلی طور پر علمائے دیوبند کے مسلک کے مطابق ہو، وہاں ایسے متفرّد نظریات کا حامل مستحقِ امامت نہیں۔ لہٰذا اس فتویٰ کی بنیاد پر مولانا موصوف کو دائرۂ اسلام سے یا اہلِ سنت والجماعت سے خارج سمجھ کر ان سے کافروں یا غیر اہلِ سنت جیسا برتاؤ کرنا ہرگز دُرست نہیں ہوگا۔ آخر میں عرض ہے کہ خدارا ہر فریق اپنی آخرت کی فکر کرے، ایک دُوسرے پر طعن و تشدّد سے گریز کرے اور مسلمانوں کو ہر قیمت پر فتنے سے بچائے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۲۱؍شعبان سنہ ۱۴۰۰ھ

(فتویٰ نمبر ۳۱/۱۱۳۶ د)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حاضر ناظر ماننے والے کی اقتداء میں نماز پڑھنے کا حکم

سوال:- اپنے محلہ کی مسجد میں عرصہ دو مہینے سے مسجد کمیٹی نے ایک پمفلٹ دیا ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حاضر ناظر ہونے کا بیان ہے۔ ایسے امام کے پیچھے جس کا یہ عقیدہ ہو، نماز جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- جو شخص اللہ تعالیٰ کے سوا کسی نبی یا ولی کے لئے حاضر و ناظر ہونے کا عقیدہ رکھتا ہو ایسے شخص کو امام بنانا دُرست نہیں۔ واللہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۴۶۲/۲۷ د)

داڑھی منڈانے والے کو امام بنانا

سوال:- جو شخص داڑھی منڈاتا یا کتراتا ہے، اس کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟ اور تراویح میں ایسے شخص کو امام بنایا جاسکتا ہے؟

جواب:- ایسے شخص کو باختیارِ خود امام بنانا جائز نہیں[۱]، اور صالح و متدین امام کے پیچھے نماز پڑھنے کی کوشش ضروری ہے، تاہم اس کی اقتداء نہ کرنے کی صورت میں جماعت بالکل فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا انفراداً نماز پڑھنے سے بہتر ہے[۲]۔ اور تراویح میں بھی ایسے شخص کو امام بنانا جائز نہیں، اگر اور کوئی مہیا نہ ہو تو "اَلَمْ تَرَ کَیْفَ" سے پڑھ لینا بہتر ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۹/۶/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۹۷۵/۴۰ ج)

داڑھی مونڈنے والے کو امام بنانے کا حکم

سوال:- اگر بالغ شخص جو داڑھی، مونچھ مونڈتا ہے، کیا وہ امامت کرسکتا ہے؟

(۱، ۲) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۵۵۹، ۵۶۰ ویکرہ امامۃ عبد .... وفاسق. وفی رد المحتار قولہ (وفاسق) من الفسق وھو الخروج عن الاستقامۃ، ولعل المراد بہ من یرتکب الکبائر .... وفی المعراج قال أصحابنا: لا ینبغی أن یقتدی بالفاسق .... الخ. وفیہ أیضًا: وأما الفاسق فقد عللوا کراھۃ تقدیمہ بأنہ لا یھتم لأمر دینہ وبأن فی تقدیمہ للامامۃ تعظیمہ وقد وجب علیھم اھانتہ شرعًا. وکذا فی مراقی الفلاح ص:۱۶۵ وفی البحر الرائق ج:۱ ص:۳۴۸.
وفی الدر المختار ج:۲ ص:۴۱۸ وأما الأخذ منھا وھی دون ذلک کما فعلہ بعض المغاربۃ مخنثۃ الرجال فلم یبحہ أحد وأخذ کلھا فعل یھود الھنود ومجوس الأعاجم. وفیہ أیضًا ج:۱ ص:۵۶۲ صلّی خلف فاسق أو مبتدع نال فضل الجماعۃ، وقال الشامیؒ تحتہ (قولہ نال فضل الجماعۃ) أفاد ان الصلوٰۃ خلفھما أولٰی من الانفراد لکن لا ینال کما ینال خلف تقی ورع. وکذا فی کفایت المفتی ج:۳ ص:۹۷ و ۹۹ (طبع دار الاشاعت) وفتاوی دار العلوم دیوبند ج:۳ ص:۲۲۶ و ۲۴۰.

جواب:- داڑھی مونڈنا موجبِ فسق ہے، اور ایسے شخص کے پیچھے نماز مکروہ ہے،[1] تاہم جو نماز اس کے پیچھے پڑھ لی گئی وہ ہوگئی۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۲۶ھ

(فتویٰ نمبر ۶۵۷/۲۸ ب)

ایک مشت سے کم داڑھی والے کی امامت کا حکم

سوال:- ہمارا امام کچھ جدت پسند ہے، ویسے تو دین دار آدمی ہے، مگر داڑھی ایک مشت سے کم رکھتا ہے، نیز وہ بعض فلموں کو جائز سمجھتا ہے، جیسے جن فلموں میں حج وغیرہ دکھایا جاتا ہے۔ اس کے پیچھے نماز کا کیا حکم ہے؟

جواب:- ایک مشت سے کم داڑھی کو کٹوانا ناجائز ہے، اور جو شخص اس پر اصرار کرے اس کے پیچھے نماز مکروہِ تحریمی ہے۔[2] واللہ اعلم بالصواب

۱۳۸۷/۱۲/۳ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۸۷/۱۸ الف)

ایک مشت سے کم داڑھی رکھنے والے کی اقتداء میں نماز کا حکم

سوال:- ایک مشت سے کم داڑھی رکھنے والے شخص کے پیچھے نماز پڑھنی چاہئے یا نہیں؟

جواب:- قبضہ سے کم داڑھی کتروانا گناہ ہے، ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ ہے،[3] لیکن اگر ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھ لی گئی تو نماز ہوگئی، اور اگر کوئی متشرّع امام نہ ملے تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا تنہا پڑھنے سے بہرحال بہتر ہے۔[4] واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۵/۷ھ

ایک مشت سے کم داڑھی رکھنے والے کے پیچھے نماز کا حکم

سوال:- ایک بریلوی نے کسی آدمی کی نمازِ جنازہ پڑھائی، اس کی داڑھی قبضہ سے بالکل کم ہے، بندہ نے کہا کہ ایسے آدمی کے پیچھے نمازِ جنازہ بالکل نہیں ہوسکتی، بندہ کا کہنا صحیح ہے یا غلط؟

جواب:- داڑھی کو قبضہ سے اُوپر کٹوانا ناجائز ہے،[5] اور جو شخص اس ناجائز کام کا مرتکب ہو اس کے پیچھے نماز مکروہ ہے،[6] لیکن اگر کوئی نماز اس کے پیچھے پڑھ لی گئی تو نماز کراہت کے ساتھ ہوگئی، اس کا اعادہ بھی واجب نہیں ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۰/۲۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۴۲۵/۲۷ د)

(۱ تا ۶) دیکھئے پچھلے صفحہ کا حاشیہ۔

عرش پر اللہ تعالیٰ کے جسمانی قیام کا عقیدہ رکھنے والے شخص کی امامت کا حکم

سوال:- ہم سب اہلِ محلّہ حنفی المسلک ہیں اور ہمارے جو پیش امام تھے وہ بھی حنفی المسلک کے دعویدار تھے، لیکن دو سال ہوئے ہیں وہ سعودی عرب گئے وہاں تقریباً ایک سال سے زائد عرصہ گزارا اور وہاں مبلغ بھی رہ چکے ہیں، واپسی پر جب آئے ہیں تو ان سے ایسے افعال اور اقوال صادر ہوئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غیر مقلد ہیں، بلکہ حنفی المسلک بالکل نہیں ہیں، کیونکہ وہ صاف الفاظ میں یہ کہتے ہیں کہ ہمیں جب حدیثِ نبوی ملتی ہے تو ہم کسی شخص کی تابعداری نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ صبح کی سنتیں اور فرض کے درمیان تحیۃ المسجد پڑھنا اور اوقاتِ مکروہہ میں نماز دُرست کہنا بلکہ فرض نمازوں کے بعد دُعا کو بدعت کہنا، کھانا کھانے کے بعد میزبان کو دُعائے خیر کرنا، مردے کے گھر جاکر ورثاءِ میت کو دُعا کرنا بدعت سمجھتا ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے قصد پر جانا حرام اور ناجائز سمجھتا ہے، اور حدیث "لا تشد الرحال .... الخ" سے دلیل پیش کرتا ہے، اللہ جل شانہ کے لئے عرش پر مکان اور قیام کا قائل ہے۔

مندرجہ بالا افعال و اقوال کے بعد اس شخص کو امام رکھنا ٹھیک ہے یا کہ سبکدوش کیا جائے؟ جبکہ ہمارے سب علماء نے بھی سبکدوشی کا مشورہ دیا ہے، لیکن مولوی موصوف شرعی حکم کے بغیر سبکدوش نہیں ہوتا، جبکہ مسجد میں ایک دو دفعہ جھگڑا بھی ہوا ہے، اور گورنمنٹ سے موصوف نے عدم مداخلت فی المسجد کی ضمانت بھی لی ہے۔ کیا اہلِ محلّہ مولوی صاحب کو سبکدوش کرنے کا حق رکھتے ہیں یا نہیں؟ اور تمام اہلِ محلّہ اس کی امامت پر ناراض ہیں، کیا حکم ہے؟

جواب:- سوال میں امام صاحب موصوف کی طرف جو خیالات منسوب کئے گئے ہیں اگر واقعۃً ان امام صاحب کے عقائد و خیالات یہی ہیں تو انہیں حنفی مقتدیوں کا امام مقرّر کرنا دُرست نہیں، خاص طور سے اگر وہ باری تعالیٰ کے لئے عرش پر جسمانی قیام کا عقیدہ رکھتے ہیں تو یہ اہلِ سنت والجماعت کے عقائد کے قطعی خلاف ہے، ایسے عقیدے والے امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھنی چاہئے،[1] ان کے بجائے کوئی صحیح العقیدہ امام متعین کیا جائے۔

واللہ اعلم

۱۴۰۰/۸/۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۴۹/۳۱ ج)

---

(۱) کیونکہ فسق اعتقادی، فسق عملی سے زیادہ بُرا ہے، جیسا کہ حلبی کبیر شرح المنیۃ ص: ۵۱۴ (طبع سہیل اکیڈمی لاہور) میں ہے: ویکرہ تقدیم المبتدع ایضًا، لأنه فاسق من حیث الاعتقاد وھو أشد من الفسق من حیث العمل۔

معراجِ جسمانی کے قائل کی اقتداء میں نماز کا حکم

سوال:- ایک شخص کہتا ہے کہ صحیح مذہب یہ ہے کہ معراج جسمانی ہے، اور وہ کہتا ہے کہ جو لوگ معراجِ رُوحانی کے قائل گزرے ہیں ان کی وہ شخص تکفیر نہیں کرتا، ایسے شخص سے کیسا برتاؤ کرنا چاہئے؟ امامت کا حق دار ہوسکتا ہے؟ اپنے کو حنفی دیوبندی کہلاتا ہے۔

جواب:- جمہور اہلِ سنت کا عقیدہ یہی ہے کہ معراج جسمانی ہے،(۱) جو شخص معراجِ جسمانی کا منکر ہو وہ فاسق اور مبتدع ہے، لیکن اگر اسراءِ جسمانی کا قائل ہے تو کافر نہیں،(۲) لہٰذا مذکورہ بالا صاحب کا عقیدہ دُرست ہے اور ان کے پیچھے نماز دُرست ہے۔ واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۳ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۸۲/۱۸ الف)

الجواب صحیح، قرآن میں مسجدِ اقصیٰ تک بھی ایک رات میں سیر کرانے کی تصریح ہے، اور یہ لفظ ''عبدہٗ'' کے ساتھ ہے جو جسمانی طور پر سیر کرانے کے لئے بالکل واضح اور صریح ہے، لہٰذا مسجدِ اقصیٰ تک کی جسمانی سیر کا منکر کافر ہوگا۔ مُلّا علی قاریؒ شرح فقہ اکبر ص:۱۳۵ پر لکھتے ہیں: من أنکر المعراج ینظر ان أنکر الاسراء من مکة الی بیت المقدس فھو کافر۔(۳) اور علامہ تفتازانیؒ شرح عقائد میں لکھتے ہیں: وقوله الی السماء اشارة الی الرد علیٰ من زعم أن المعراج فی الیقظة لم یکن الا الی بیت المقدس علیٰ ما نطق به الکتاب۔(۴)

بندہ محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

---

(۱) وفی شرح المسلم للنوویؒ ج:۱ ص:۹۱ (طبع قدیمی کتب خانہ) والحق الذی علیه أکثر الناس ومعظم السلف وعامة المتأخرین من الفقهاء والمحدثین والمتکلمین أنه أسری بجسده صلی الله علیه وسلم والأثار تدل علیه، وفی التفسیر المظهری سورة الأسری ج:۵ ص:۴۰۱ والأکثرون علی أن الله تعالیٰ أسری بعبده محمد صلی الله علیه وسلم لیلة المعراج بجسده فی الیقظة وتواترت الأخبار الصحیحة بذٰلک وعلیه انعقد الاجماع ولو کان المعراج فی المنام لما أنکر علیه قریش اذ لا استبعاد فی الرؤیا .... الخ. وفی أیسر التفاسیر ج:۲ ص:۵۸۱ تحت الأیة: "سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ" الأیة، تقریر عقیدة الاسراء والمعراج بالنبی صلی الله علیه وسلم بالروح والجسد معًا من المسجد الحرام الی المسجد الأقصٰی ثم الی السمٰوات العلی. مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: حکیم الأمت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کا رسالہ تنویر السراج فی لیلۃ المعراج، اور تفسیر معارف القرآن ج:۵ ص:۴۶۶۔

(۲) مکہ سے بیت المقدس، اسراءِ جسمانی کا منکر کافر ہے، جبکہ بیت المقدس سے آسمان تک معراجِ جسمانی کا منکر کافر نہیں، فاسق اور گمراہ ہے، چونکہ سوالِ مذکور میں امام صاحب معراجِ جسمانی کے منکر کی تکفیر نہیں کرتے لہٰذا یہ دُرست ہے، کیونکہ معراجِ جسمانی کا منکر کافر نہیں فاسق ہے۔ البحر الرائق ج:۱ ص:۳۴۹ (طبع ایچ ایم سعید) میں ہے: ومن أنکر الاسراء من مکة الی بیت المقدس فھو کافر، ومن أنکر المعراج من بیت المقدس فلیس بکافر.

(۳) الفقه الأکبر ص:۱۰۰ (طبع دار الکتب العربیة الکبری).

(۴) شرح عقائد ص:۱۴۵ (طبع قدیمی کتب خانه).

شیعہ کے پیچھے نماز پڑھنا

سوال:- ہمارے محلے میں شیعہ اور سنی آبادی ملی جلی ہے، اگر ہم الگ جماعت کرتے ہیں تو آپس میں لڑائی جھگڑے کا خطرہ ہے، اگر ہم مصالحت کی وجہ سے ان کے پیچھے نماز پڑھ لیں تو جائز ہے یا نہیں؟ یا فرداً فرداً نماز ادا کریں؟

جواب:- شیعہ حضرات کے پیچھے نماز جائز نہیں،(۱) ان کے عقائد سے قطعِ نظر بھی کرلی جائے تو نماز کے اُحکام اتنے مختلف ہیں کہ اہلِ سنت کے ساتھ نماز کے اتحاد کی کوئی شکل نہیں۔ لہٰذا کوشش کی جائے کہ اہلِ سنت حضرات اپنی مسجد الگ بنائیں اور اس میں باجماعت نماز ادا کرلیں، اور جب تک یہ ممکن نہ ہو کسی کے گھر میں جماعت کرلی جائے۔ واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۵/۲۶ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۶۱۸/ ۱۹ الف)

شیعہ سے اپنی بیٹی کا نکاح کرانے والے کے پیچھے نماز کا حکم

سوال:- گزارش یہ ہے کہ سنی عقیدہ سے منسلک آدمی نے اپنی بیٹی کا نکاح باوجود عوام و خواص واعزّہ کے روکنے کے، ایک شیعہ آدمی سے کردیا، اور اپنے لڑکوں کا نکاح شیعہ لڑکیوں سے کردیا، حالانکہ داماد اور بہوؤں کا شیعہ ہونا ظاہر اور مشہور ہے۔ اس شیعہ داماد کا شیعہ مدارس میں تعلیم حاصل کرنا واضح ہے، نیز شیعہ مسلک سے منسلک مدرسہ کا اہتمام بھی اس کے پاس ہے، شیعوں سے چندے لیتا ہے، شیعوں سے قریبی روابط ہیں، شیعوں کا امام اور خطیب نیز ذاکر بھی ہے۔

جواب طلب اَمر یہ ہے کہ اہلِ سنت والجماعت کے علمائے کرام کے فتاویٰ کے مطابق اثناء عشری شیعہ، امامت، عصمتِ ائمۂ کرام، تحریفِ قرآن وغیرہ جیسے اُمور کی وجہ سے کافر ہیں اور مرتد ہیں، ان کے ساتھ معاملات مرتد جیسے ہونے چاہئیں۔

---

(۱) وفی الکفایة شرح الهدایة ج:۱ ص:۳۰۵ ویکره الاقتداء بصاحب الهوىٰ والبدعة والحاصل ان کل من کان من أهل قبلتنا ولم یغل فی هواه حتى یحکم بکفره تجوز الصلاة (مع الکراهة التحریمیة) خلفه، وان کان هوى یکفر أهلها کالجهمي والقدری الذی قال بخلق القرآن والرافضی الغالي الذي ینکر خلافة أبی بکرؓ لا تجوز.

وفی البحر الرائق (ج:۱ ص:۳۴۸ الامامة) وکره امامة العبد والاعرابی والفاسق والمبتدع. وفیه أیضًا ج:۱ ص:۳۴۹ (المبتدع) بأن لا تکون بدعته تکفره، فان کانت تکفره فالصلوٰة خلفه لا تجوز.

وفی البحر الرائق أیضًا ج:۱ ص:۳۴۹ والرافضي ان فضل علیًا علىٰ غیره فهو مبتدع. وفی الهندیة ج:۱ ص:۸۴ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه) قال المرغیناني: تجوز الصلاة خلف هوى وبدعة ولا تجوز خلف الرافضي والجهمي .... الخ. وفی الکبیری شرح المنیة ص:۵۱۴ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور) ویکره تقدیم المبتدع أیضًا لأنه فاسق من حیث الاعتقاد وهو أشد من الفسق من حیث العمل.

ترکِ نماز مع الجماعت سے بچنے کے لئے اس کی امامت میں کبھی کبھی نماز جائز ہوسکتی ہے؟ جبکہ یہ آدمی اپنے آپ کو سنی کہتا ہے اور شیعہ کو اپنی زبانی غلط سمجھتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ میرا داماد پیسوں کی وجہ سے شیعہ ہے۔ کیا حکم ہے؟ (از مقامی علمائے کرام موضع سلطانی ضلع رحیم یار خان)

جواب:- شیعہ خواہ کافرانہ عقیدے رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں، دونوں صورتوں میں کسی سنی کے لئے ان سے نکاح کرنا ہرگز جائز نہیں ہے، اور پہلی صورت میں نکاح منعقد بھی نہیں ہوتا۔ اب جس شخص کو دین یا عقائدِ دین کی اہمیت کا اتنا بھی احساس نہیں ہے وہ شخص امام بنانے کے لائق نہیں ہے۔[1] تاہم اگر کسی وقت ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھ لی گئی تو کراہت کے ساتھ نماز ہوجائے گی، اعادے کی ضرورت نہیں ہے۔

واللہ اعلم

۱۴۱۰/۱۱/۱۰ھ

(فتویٰ نمبر ۴۱/۲۲۹ ز)

لواطت کے مرتکب کی امامت کا حکم

سوال:- ایک پیش امام نے جو شادی شدہ بھی ہے، ایک لڑکے سے لواطت کی اور اس پر دو عادل نمازیوں نے گواہی دی، یہ تمام ماجرا بستی کے مولوی صاحب سے (جو پیش امام کے علاوہ ہے) بیان کیا، مولوی صاحب نے پیش امام سے اس بارے میں معلومات حاصل کیں تو پیش امام نے اقرارِ جرم کرلیا، بعد ازاں پیش امام مذکور کو اپنے عہدے سے الگ کردیا گیا، اور تمام لوگوں میں اس بات کی تشہیر کردی گئی، اس کے بعد اس پیش امام نے ایک دفعہ نماز پڑھائی ہے، کیا کوئی صورت ہے کہ امامِ مذکور کو واپس اپنے منصب پر لایا جائے؟

جواب:- لواطت کا مرتکب فاسق ہے، اس کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ ہے،[2] لیکن اگر نماز پڑھ لی جائے تو ہوجاتی ہے، اور جب تک وہ شخص توبہ نہ کرے اس کے پیچھے نماز جائز نہیں، البتہ اگر وہ صدقِ دل سے توبہ کرے تو اسے امام بنایا جاسکتا ہے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۱/۲۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۷۶/۱۸ الف)

الجواب صحیح، لیکن ایک مسلمان کے گناہ کی تشہیر کرنا ٹھیک نہیں، صرف اتنا کافی تھا کہ ان کو امامت سے معزول کردے۔

محمد عاشق الٰہی

(۱، ۲) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۵۵۹، ۵۶۰ ویکرہ امامۃ عبد .... وفاسق. وفی الشامیۃ (قولہ وفاسق) من الفسق وھو الخروج عن الاستقامۃ، ولعل المراد بہ من یرتکب الکبائر کشارب الخمر والزانی .... الخ. وراجع ایضاً البحر الرائق ج:۱ ص:۳۴۸، والھندیۃ ج:۱ ص:۸۴.

گالی دینے والے کو امام بنانے کا حکم

سوال:- ایک امام بدگو، جلد مشتعل ہوجانے والا اور غصّے میں آپے سے باہر ہوجانے والا ہے، نیز غیبت و دروغ گوئی کا بھی عادی ہے، ایسے امام کی اقتداء میں نماز ہوجاتی ہے یا نہیں؟ ایک امام جس کے پیچھے اس کی اخلاقی پستیوں کی بناء پر نماز پڑھنے کی طرف دِل مائل نہ ہو اور دُوسری مسجد بھی نزدیک نہ ہو، تو کیا ایسے امام کے پیچھے نماز باجماعت پڑھنے سے نماز ادا ہوجائے گی؟

جواب:- سب وشتم کا عادی، جھوٹ بولنے اور غیبت کرنے والا فاسق ہے، اس کے پیچھے نماز مکروہِ تحریمی ہے،(۱) تاوقتیکہ وہ ان گناہوں سے توبہ نہ کرے، البتہ جو نمازیں اس کے پیچھے پڑھ لی گئی ہوں وہ ادا ہوجاتی ہیں، ان کا لوٹانا ضروری نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۲۷/۱۱/۱۳۸۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۷۲/۱۸ الف)

امام کی بُرائی کرنے والے کا اسی امام کی اقتداء میں نماز پڑھنا

سوال:- ایک شخص امام کے پیچھے ہر وقت بُرائی کرتا ہے اور پھر اس کے پیچھے نماز بھی پڑھتا ہے، یہ جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- پیش امام لائقِ احترام ہے، اس کی بے عزّتی کرنا جائز نہیں، بُرائی کرنا تو ہر مسلمان کا بُرا ہے، خاص طور سے پیش امام کی بُرائی کرنا اور بھی قبیح ہے، لیکن اس سے اس پیش امام کے پیچھے بُرائی کرنے والے کی نماز فاسد نہیں ہوتی۔

سوال:- ایک شخص پیش امام کے مارنے کے لئے ہاتھ اُٹھالیتا ہے اور پھر بھی وہ اس کے پیچھے نماز پڑھتا ہے، جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- سابق میں ملاحظہ فرمائیں۔

واللہ اعلم

۱۷/۱/۱۳۸۸ھ

(فتویٰ نمبر ۷۷/۱۹ الف)

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۵۵۹، ۵۶۰ (ایچ ایم سعید) ویکرہ امامة عبد .... وفاسق .... الخ.

وفی الدر المختار أیضًا ج:۱ ص:۵۶۲ صلّی خلف فاسق أو مبتدع نال فضل الجماعة. وقال الشامی تحته (قوله نال فضل الجماعة) أفاد ان الصلاة خلفهما أولیٰ من الانفراد لٰکن لا ینال کما ینال خلف تقی ورع. وکذا فی البحر الرائق ج:۱ ص:۳۴۸، ۳۴۹، والهندیة ج:۱ ص:۸۴.

فسقیہ افعال کے مرتکب کو امام بنانا

سوال:- ایک پیش امام جو عورتوں کو گنڈا تعویذ دیتا ہو اور اکثر و بیشتر وقت عورتوں کے جھرمٹ میں گزارتا ہو، غیر شادی شدہ ہونا ظاہر کر کے شادی کی خواہش رکھتا ہو، اور لڑکیوں کی فوٹو منگوا کر بھی دیکھتا ہو، اور جھوٹ بولنے اور دھوکا دینے کی عادت ہو تو کیا ایسے پیش امام کے پیچھے نماز ہوسکتی ہے؟

جواب:- جو شخص جھوٹ بولنے، دھوکا دینے اور نامحرم عورتوں سے آزادانہ میل جول رکھنے کا مرتکب ہو اس کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے،[1] تاوقتیکہ وہ اپنے ان گناہوں سے توبہ نہ کرے۔

واللہ اعلم
۱۳۸۸/۲/۱۳ھ
(فتویٰ نمبر ۲۲۸/۱۹ الف)

گالی گلوچ کرنے والے شخص کو امام بنانے کا حکم

سوال:- ایک مستفتی نے کافی طویل خط لکھا جس میں اصل سوال کا خلاصہ یہ تھا کہ ۱:- ایک امام گالی گلوچ، جھوٹ بیانی اور ہر وقت لڑائی جھگڑے کا مرتکب رہتا ہے، اس کے ان افعال سے تنگ آکر مستفتی نے الگ مسجد بنائی ہے، کیا اس مسجد میں نمازِ جمعہ جائز ہے یا نہیں؟ ۲:- ایسے افعال والے امام کے پیچھے نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

جواب ۱:- مستفتی نے جو علیحدہ مسجد بنائی ہے، اگر اس میں تمام لوگوں کو آنے کی اجازت عام ہو تو اس میں جمعہ کی نماز پڑھی جاسکتی ہے۔ ۲:- جو شخص گالی گلوچ، دروغ بیانی اور لڑائی جھگڑے کا مرتکب ہو وہ فاسق ہے، جب تک وہ اپنے ان افعال سے اعلانیہ توبہ نہ کرے اس کے پیچھے نماز جائز نہیں،[2] مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اسے نرمی سے سمجھائیں، اور اگر وہ باز نہ آئے تو اس سے بیزاری کا اظہار کریں۔

(آپ کے اتنے طویل خط سے یہی دو معقول سوال سمجھ میں آتے ہیں جن کا جواب لکھ دیا گیا)۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۸۸/۱/۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۲۶/۱۹ الف)

(۱، ۲) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۵۵۹، ۵۶۰ ویکرہ امامۃ عبد .... وفاسق، وفی الشامیۃ (قولہ وفاسق) من الفسق وھو الخروج عن الاستقامۃ ولعل المراد بہ من یرتکب الکبائر کشارب الخمر والزانی. وکذا فی البحر الرائق ج:۱ ص:۳۴۸، والھندیۃ ج:۱ ص:۸۳.

کس مسجد کے امام کے پیچھے نماز پڑھنا اَولیٰ ہے؟

سوال:- ایک مسجد نئی بن رہی ہے، لوگوں کا عقیدہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حاضر و ناظر ہونے کا اور کھڑے ہوکر سلام پڑھنے کا ہے، وہ لوگ مجھے اس مسجد میں نماز پڑھنے کی دعوت دے رہے ہیں کہ قرآنی آیات اور حدیث پڑھنے، سننے کو، کوئی منع نہیں کرسکتا، جبکہ میں پہلے سے ایک مسجد میں نماز پڑھ رہا ہوں، میرے لئے کیا حکم ہے؟

جواب:- جس مسجد کا امام صحیح العقیدہ اور عملی اعتبار سے زیادہ متقی پرہیزگار ہو اس میں نماز پڑھیئے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۳/۲۶ھ

(فتویٰ نمبر ۳۵۱/۲۸ ب)

تصویر کھینچنے اور کھنچوانے والے کی اقتداء میں نماز کا حکم

سوال:- عرض اینکہ ماہِ رمضان المبارک میں ایک مسجد کے اندر ایک حافظِ قرآن صاحب جو مسجد میں تراویح کی نماز پڑھاتے ہیں، اسی مسجد میں پیش امام اور مسجد کے مدرسہ تعلیم القرآن میں مدرّس بھی ہیں۔ حافظ صاحب کی اعانت کے لئے ایک نائب مدرّس بھی ہے جو اِن ہی حافظ صاحب کا شاگرد ہے۔ ۲۷ر رمضان کی رات ختمِ قرآن کی مجلس میں جن بچوں نے اس سال قرآن شریف ختم کیا تھا اور جو بچے مائک پہ آکر تلاوت کر رہے تھے، ان بچوں کو خطیبِ مسجد کے ہاتھ سے انعام دیا جارہا تھا، اس وقت نائب مدرّس نے تصویر کھینچنا شروع کردیا، جس پر ایک شخص نے فوراً تصویر کشی سے منع کردیا اور خطیب صاحب سے مخاطب ہوکر کہا کہ کیا تصویر کھینچنا مسجد میں جائز ہے؟ خطیب صاحب نے کہا مکروہ ہے۔ اس کے بعد وہ نائب مدرّس اس صاحب (جنھوں نے منع کیا تھا) کے پاس آیا اور کہا کہ حافظ صاحب کی اجازت سے کیمرہ میں رِیل بھری گئی ہے میں تصویر کھینچوں گا۔ حالانکہ ان سے کہا گیا کہ دوبارہ حافظ صاحب سے پوچھ لو مگر اس نے ضد کی اور جب حافظ صاحب تقریر کے لئے کھڑے ہوگئے تو ان کی کئی جانب سے تصویر کھینچی، حافظ صاحب نے اس کو منع نہیں کیا، بعد میں دُوسرے روز حافظ صاحب نے قرآنِ پاک ہاتھ میں لے کر قسم کھائی کہ میں نے نہ اجازت دی ہے، نہ رِیل بھروائی ہے۔ کیا مسجد میں تصویر کشی جائز ہے؟ ایسے امام کی اقتداء میں جس نے قسم کھا کر اپنی صفائی پیش کردی

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۵۵۷ (طبع ایچ ایم سعید) والأحق بالامامة تقدیمًا بل نصبًا مجمع الأنهر (الأعلم بأحکام الصلوٰة) فقط صحةً وفسادًا بشرط اجتنابه للفواحش الظاهرة. وفی الشامیة (قوله بشرط اجتنابه للفواحش) الأعلم بالسنة أولی الا ان یطعن علیه فی دینه .... الخ.

ہو، نماز پڑھنا جائز ہے؟

جواب:- تصویر کھینچنا اور کھنچوانا مسجد سے باہر بھی ناجائز ہے، خاص طور پر مسجد کو اس ناجائز فعل سے آلودہ کرنا تو اور بھی گناہ ہے۔ اگر واقعۃً ان کی اجازت سے ریل بھری گئی تھی اور انہوں نے تصویر کھینچتے دیکھ کر قدرت کے باوجود منع نہیں کیا، اس کے باوجود قسم کھالی کہ میری اجازت سے تصویر نہیں کھینچی گئی تو انہوں نے سخت گناہ کا ارتکاب کیا، اگر وہ اس گناہ پر اللہ تعالیٰ سے توبہ کرلیں تو خیر ورنہ اگر اصرار کریں تو انہیں اپنے اختیار سے امام نہیں بنانا چاہئے۔[۱] تاہم جو نمازیں ان کے پیچھے پڑھی گئیں وہ ادا ہوگئیں۔ واللہ اعلم

۱۳۰۸/۱۱/۱۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۳۳۰ ۳۹ ز)

جھوٹ بولنے والے کے پیچھے نماز کا حکم

سوال:- امام اگر جھوٹ بولے یا جھوٹی قسم کھائے تو اس کے پیچھے نماز جائز ہے یا نہیں؟ اور اس کی کیا سزا ہوگی؟

جواب:- جو شخص جھوٹ بولتا ہو یا جھوٹی قسم کھاتا ہو وہ گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہے اور فاسق ہے، جب تک ان گناہوں سے توبہ نہ کرے، اس وقت تک اسے امام بنانا جائز نہیں۔[۲] شرعی سزاؤں کو نافذ کرنے کا اختیار صرف اسلامی حکومت کو ہے، عوام کو نہیں۔[۳] واللہ اعلم بالصواب

۱۳۸۷/۱۱/۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۲۷ ۱۸ الف)

بدعتی اور مجہول پڑھنے والے کی اقتداء کا حکم

سوال:- ایک شخص ہمیشہ تارکِ صلوٰۃ جماعت ہے، بدعتی ہے، قرآن مجید غلط پڑھتا ہے، ایسا غلط کہ معنی غلط ہوجاتا ہے، حرام کو حلال کہتا ہے، پردہ کو عورتوں کے لئے غیر ضروری کہتا ہے، مسلمانوں کے ساتھ بائیکاٹ کرنے پر لوگوں کو دعائے خیر دیتا ہے۔ ایک شخص کی شادی میں نوٹ لے اور

(۱، ۲) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۵۵۹، ۵۶۰ (طبع ایچ ایم سعید) ویکرہ امامة عبد .... وفاسق. وفی الشامیة قوله (وفاسق) من الفسق وهو الخروج عن الاستقامة. ولعل المراد به من یرتکب الکبائر ..... وفی المعراج قال أصحابنا: لا ینبغی أن یقتدی بالفاسق .... الخ. وفیه أیضا. وأما الفاسق فقد عللوا کراهة تقدیمه بأنه لا یهتم لأمر دینه وبأن فی تقدیمه للامامة تعظیمه وقد وجب علیهم اهانته شرعا. وفی الهدایة ج:۱ ص:۱۲۲ ویکره تقدیم العبد ... والفاسق لأنه لا یهتم لأمر دینه ... وان تقدموا جاز لقوله علیه السلام: صلّوا خلف کل بر وفاجر .... الخ.

(۳) دیکھئے: الدر المختار مع رد المحتار ج:۴ ص:۵۹ (طبع سعید).

مجلس آئی ہوئی تھی، لوگوں نے کہا کہ ہم تیری دعوت کا کھانا نہیں کھاتے اس لئے کہ تم نے بدعت کا کام کیا ہے، یعنی مجلس بلوائی ہے، لیکن یہ شخصِ مذکور شریک ہوا اور کہتا ہے کہ کھانا جائز ہے۔ اب اس کی امامت کی وجہ سے لوگوں میں جھگڑا پیدا ہونے کا خطرہ ہے، اس نے اپنے چچا کو بھی دیوث کہا ہے، ایک شخص نے قسم کھا کر کہا کہ اس نے لواطت بھی کی ہے، قبر میں نور نامہ رکھنا جائز قرار دیتا ہے، ایسے شخص کی اقتداء کیسی ہے؟

جواب:- مذکورہ شخص کے بارے میں جو باتیں سوال میں درج ہیں اگر وہ دُرست ہیں تو ایسے شخص کے پیچھے نماز مکروہ ہے اور ایسے شخص کو امام بنانا دُرست نہیں، کیونکہ مذکورہ باتوں میں سے بہت سی موجبِ فسق ہیں۔ لہٰذا ایسے امام کو بدلنا چاہئے[1] البتہ جب تک کسی دُوسرے نیک صحیح العقیدہ امام کا انتظام نہ ہو اس وقت تک جو نمازیں اس کے پیچھے پڑھی جائیں گی وہ ہوجائیں گی، اور اگر دُوسرے امام کے پیچھے نماز پڑھنا ممکن نہ ہو تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا تنہا نماز پڑھنے سے بہتر ہے۔[2]

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۱۹ھ

(فتویٰ نمبر ۶۳۶/۲۸ ب)

جماعتِ اسلامی کے رکن کی اقتداء میں نماز کا حکم

سوال:- چند مہینوں سے یہ مہم چلی آرہی ہے کہ جماعتِ اسلامی اور اس کے اہل کاروں کے پیچھے نماز کی اقتداء جائز نہیں، اور جیسا کہ جناب کو معلوم ہے کہ یہ فتویٰ ہزاروی گروپ نے صادر کیا ہے، کیا یہ فتویٰ صحیح ہے یا غلط؟

جواب:- امیرِ جماعتِ اسلامی کے بعض نظریات جمہور اہلِ سنت کے خلاف ہیں، خاص طور سے بعض انبیاءؑ وصحابہؓ پر جو تنقیص آمیز تنقید انہوں نے کی ہے اس سے اہلِ سنت کے متفقہ عقائد مجروح ہوتے ہیں، لہٰذا جو شخص ان کے ان خیالات سے متفق ہو اسے امام بنانے سے احتراز کرنا چاہئے اور کسی صحیح العقیدہ مسلمان کو امام بنانے کی کوشش کرنی چاہئے، البتہ اگر کسی وقت ایسا امام میسر نہ ہو اور امیرِ

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۵۵۹، ۵۲۰ ویکرہ امامة عبد .... وفاسق. وفی رد المحتار قوله (وفاسق) من الفسق وهو الخروج عن الاستقامة، ولعل المراد به من یرتکب الکبائر .... وفی المعراج قال أصحابنا: لا ینبغی أن یقتدی بالفاسق .... الخ.

(۲) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۵۶۲ صلّی خلف فاسق أو مبتدع نال فضل الجماعة، وقال الشامیؒ تحته (قوله نال فضل الجماعة) أفاد ان الصلاة خلفهما أولٰی من الانفراد لکن لا ینال کما ینال خلف تقی ورع.

جماعتِ اسلامی کے خیالات کے کسی شخص نے نماز پڑھادی تو نماز ہوجائے گی، کیونکہ نماز ہر مسلمان کے پیچھے ہوجاتی ہے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۰/۱۲/۹ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۸۸/۱۸ الف)

لڑکی کو بیچنے والے کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم

سوال:- ایک آدمی مسمّی احمد دین جو ایک گاؤں کا پیش امام بھی ہے، پچیس آدمیوں کے رُوبرو قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کرتا ہے کہ میں نے اپنی زمین فلاں شخص کو اتنے روپیہ پر فروخت کردی ہے، کچھ رقم نقد بھی وصول کرلی ہے اور باقی بوقت بیع نامہ وصول کروں گا۔ دو ماہ کے بعد مسمّی مذکور اپنے وعدے سے منحرف ہوگیا کہ میں زمین نہیں دیتا ہوں۔ مسمّی مذکور نے اپنی دُختر فروخت کردی تھی جس کا عوام کو ابھی تک علم نہیں ہوا ہے، اور رقم لے کر ہضم کرچکا ہے، جو ایک زندہ خاوند کی بیوی تھی، اور بدستور امامت بھی کرتا ہے۔ کیا ایسے شخص کی اقتداء دُرست ہے؟

جواب:- ایسا شخص جو وعدہ خلافی اور لڑکی کو بیچنے اور دُوسروں کی رقم ناجائز طور سے کھانے کا مرتکب ہو، فاسق ہے، اور جب تک وہ ان گناہوں سے علانیہ توبہ نہ کرے اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز نہیں،[2] لیکن اگر کسی وجہ سے کوئی نماز پڑھ لی گئی تو نماز ہوجائے گی، واجب الاعادہ نہ ہوگی۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۲۳ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) وفي الدر المختار ج:۱ ص:۵۶۲ صلّى خلف فاسق أو مبتدع نال فضل الجماعة. وقال الشاميؒ تحته أفاد ان الصلوة خلفهما أولى من الانفراد .... الخ. نیز اس مسئلے کی مکمل تفصیل کے لئے مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کی کتاب جواہر الفقہ ج:۲ ص:۱۷۲ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) وفي حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح ص:۱۸۱ (مطبع مصطفى البابي، مصر) (و) لذا كره امامة الفاسق العالم لعدم اهتمامه بالدين فتجب اهانته شرعا فلا يعظم بتقديمه للامامة، قال الطحطاوي: فتجب اهانته شرعا فلا يعظم بتقديمه للامامة تبع فيه الزيلعي ومفاده كون الكراهة في الفاسق تحريمية. وفي الدر المختار ج:۱ ص:۵۵۹، ۵۶۰ (ويكره امامة عبد .... وفاسق) وفي رد المحتار (وفاسق) من الفسق وهو الخروج عن الاستقامة، ولعل المراد به من يرتكب الكبائر .... وفيه أيضًا: وأما الفاسق فقد عللوا كراهة تقديمه بأنه لا يهتم لأمر دينه وبأن في تقديمه تعظيمه وقد وجب عليهم اهانته شرعًا. وكذا في فتاوى دار العلوم ديوبند ج:۳ ص:۱۳۶.

خائن شخص کو امام بنانے کا حکم

سوال:- ایک شخص میں مندرجہ ذیل عیوب موجود ہیں:-

۱:- جھوٹ بولنے کا عادی ہے۔ ۲:- نام نہاد مدرسہ کے طلبہ اور یتامیٰ کے نام سے زکوٰۃ، فطرہ، صدقہ، خیرات، قربانی کی کھالیں اور عشر وغیرہ وصول کرکے ناجائز طور پر اپنے مصرف میں لاتا ہے، حالانکہ تنخواہ اس کے علاوہ وصول کرتا ہے۔ یہ باتیں عام لوگوں کو معلوم ہیں جس کی وجہ سے لوگوں کا اعتماد اس سے اُٹھ گیا ہے۔ ۳:- اپنے عیوب چھپانے کے لئے دُوسروں پر بیباکانہ طور پر اتہام لگاتا ہے۔ کیا اس کے پیچھے نماز صحیح ہے؟

جواب:- اگر واقعۃً کسی شخص میں مذکورہ بالا عیوب پائے جاتے ہوں تو اسے امام بنانا جائز نہیں۔(۱)

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۰/۱۰/۲۶ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۶۲/۲۱ الف)

ماموں سے ناراض شخص کے پیچھے نماز پڑھنا

سوال:- ایک شخص نے اپنے ماموں سے قرآن شریف پڑھا ہے، اب اس کا ماموں اس سے سخت ناراض ہے اور اپنے حقوق اس کو نہیں بخشتا، کیا اب اس شخص کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے جبکہ اس کو ماموں اپنے رشتہ داری کے حق حقوق بھی نہیں بخشتا؟

جواب:- اگر ماموں کسی معقول اور شرعی وجہ سے ناراض ہے تو اس پر واجب ہے کہ ان کو راضی کرنے کی کوشش کرے، اور اس کے پیچھے نماز پڑھنے کا مسئلہ اس پر موقوف ہے کہ ماموں کی ناراضگی کی وجہ معلوم ہو۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۲۴ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۲۵/۱۹ الف)

بے خبری میں بریلوی امام کی اقتداء میں نماز پڑھ لی تو کیا حکم ہے؟

سوال:- ایک شخص ایک مسجد میں نمازِ جمعہ پڑھنے گیا، اسے معلوم نہ تھا کہ یہ مسجد کس مسلک

---

(۱) پچھلے صفحے کا حاشیہ نمبر ۲ ملاحظہ فرمائیں۔

کے لوگوں کی ہے۔ بعد ازاں اسے پتہ چلا کہ امام صاحب بریلوی مسلک سے تعلق رکھتے ہیں، ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھ لینی چاہئے یا نہیں؟ اگر پڑھ لی گئی تو ادا ہوگی یا نہیں؟

جواب:- نماز پڑھنے کے لئے ایسا امام منتخب کرنا چاہئے جو صحیح العقیدہ ہو، تاہم اگر بریلوی مسلک کے کسی امام کے پیچھے نماز بے خبری میں پڑھ لی گئی یا اس کے علاوہ کہیں اور جماعت ملنا ممکن نہ تھا اس حالت میں پڑھ لی گئی تو نماز ہوگئی۔[1]

واللہ اعلم

۱۴۰۱/۱۱/۱۵ھ

(فتویٰ نمبر ۳۲/۱۷ ج)

جرگے کا فیصلہ مقدم ہے یا باجماعت نماز؟

شور جھگڑے کی بناء پر جماعت کی نماز توڑنا

سوال ۱:- نماز کا وقت ہوگیا تھا اور مولوی صاحب مسجد کے سامنے جرگے میں بیٹھے تھے، مولوی صاحب کو دو بار آواز دی گئی کہ نماز کا وقت ہوگیا ہے لوگ انتظار کر رہے ہیں، اس پر مولوی صاحب نے کہا کہ فرض نماز سے پہلے جرگے کا فیصلہ اہمیت رکھتا ہے۔ آئندہ ایسے مولوی صاحب کی اقتداء جائز ہے یا نہیں؟

۲:- عصر کی نماز کی جماعت کھڑی تھی، مولوی صاحب خود جماعت کرا رہے تھے، محلے میں شور جھگڑا ہوگیا، مولوی صاحب نماز فوراً توڑ کر مسجد سے باہر بھاگ گئے۔ ایسے مولوی صاحب کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟

جواب ۱:- جرگے کا فیصلہ کرنے کے لئے جماعت ترک کرنا جائز نہیں ہے، اِلّا یہ کہ مسئلہ ایسا ہو کہ اس وقت فیصلہ بیچ میں چھوڑ دینے سے کسی بڑے فتنے فساد کا اندیشہ ہو، لہٰذا مسئلے کا جواب اس فیصلے کی صحیح نوعیت پر موقوف ہے۔

۲:- صورتِ مسئولہ میں نماز توڑنا جائز نہیں تھا، جن امام صاحب نے ایسا کیا انہیں اپنے اس عمل پر توبہ و اِستغفار کرنا چاہئے، اور وہ ایسا کرلیں تو ان کے پیچھے نماز پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

واللہ اعلم

۱۳۹۶/۱۰/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۳۴۶/۲۷ و)

---

(۱) وفي الدر المختار ج:۱ ص:۵۶۲ (طبع ايج ايم سعيد) صلّى خلف فاسق أو مبتدع نال فضل الجماعة. وقال الشامي تحته (قوله نال فضل الجماعة) أفاد ان الصلوٰة خلفهما أولى من الانفراد .... الخ.

سیاسی اختلاف کی بناء پر امامت سے معزول کرنا

سوال:- زید اپنے باپ دادا کے وقتوں سے ایک محلے میں امام چلا آرہا ہے، اچھا عالم ہے، بچوں کو خوب قرآن پڑھاتا ہے، محلے کے دو تین افراد جو اثر و رُسوخ والے ہیں اور پیپلز پارٹی والے ہیں، امام صاحب کے مخالف ہیں، امام صاحب کے حامی عوام غریب ہیں اور ان دو تین افراد کے سامنے کچھ بول نہیں سکتے۔ بھٹو صاحب کے آخری دور میں سیاسی اختلاف کی بناء پر امام صاحب کو نکال کر دُوسرا امام لائے، اب دُوسرے امام کے پیچھے شرعاً نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- جب پہلے امام میں کوئی خرابی نہیں تھی تو ان کو محض سیاسی اختلاف کی بناء پر معزول کرنا کسی طرح دُرست نہیں تھا، لیکن اب جبکہ دُوسرے امام صاحب کا تقرّر کردیا گیا ہے تو اگر ان میں کوئی بات موجبِ کراہت نہیں ہے تو ان کے پیچھے بھی نماز جائز ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۸/۲۳ھ

(فتویٰ نمبر ۸۷۷/۲۸ ج)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو "عالم الغیب" اور "حاضر و ناظر" ماننے والے کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم

سوال:- اگر کوئی مولوی صاحب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حاضر و ناظر سمجھتا ہو یا ان کو عالم الغیب سمجھتا ہو، نیز یہ بھی کہتا ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بھی علم ہے کہ ماں کے پیٹ میں کیا ہے؟ بارش کب ہوگی؟ کوئی کب مرے گا؟ یا ان کو نور مانتا ہو تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟

جواب:- جس امام کے بارے میں یہ تحقیق ہو کہ وہ مذکورہ عقائد کا قائل ہے اس کے پیچھے نماز نہیں پڑھنی چاہئے۔[1]

واللہ اعلم بالصواب

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۱/۵/۲۵ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۶۸۶/۲۲ ب)

---

(۱) وفی الکبیری شرح المنیة ص:۵۱۴ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور) ویکره تقدیم المبتدع أیضًا لأنه فاسق من حیث الاعتقاد وهو أشد من الفسق من حیث العمل. وفی تنویر الأبصار مع شرحه ج:۱ ص:۵۵۹-۵۶۱ یکره امامة عبد .... ومبتدع أی صاحب بدعة وهی اعتقاد خلاف المعروف عن الرسول صلی الله علیه وسلم لا بمعاندة بل بنوع شبهة .... لا یکفرها، وان کفر بها فلا یصح الاقتداء به أصلًا .... الخ. وفی غنیة المتملی ص:۵۱۴ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور) وانما یجوز الاقتداء به مع الکراهة اذا لم یکن ما یعتقده یؤدی الی الکفر عند أهل السنة، اما لو کان مؤدیا الی الکفر فلا یجوز أصلًا. نیز دیکھئے: فتاویٰ دار العلوم دیوبند ۳/۱۲،۱۷۰۔

مسجد کی دُوسری منزل پر جماعت کرانے کا حکم

سوال:- دومنزلہ مسجد کی دُوسری منزل پر نماز باجماعت پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ منزلِ اوّل بالکل خالی ہو اور امام اور مقتدی سب دُوسری منزل پر نماز ادا کرتے ہوں۔

جواب:- وكره تحريما الوطئ فوقه والبول والتغوط، لأنه مسجد الى عنان السماء.
(درمختار مع شامی ج:۱ ص:۶۱۲)۔[1]

اس سے معلوم ہوا کہ مسجد آسمان تک مسجد ہی مسجد ہوتی ہے اور اُوپر کی منزل بھی مسجد ہی ہے۔ لہٰذا اس میں جماعت کرنے میں کوئی حرج نہیں[2]، البتہ بلاضرورت ایسا نہ کیا جائے، کیونکہ یہ تقلیلِ جماعت کا سبب بن سکتا ہے۔ واللہ اعلم

۱۳۸۷/۱۲/۱۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۴۵/۱۸ الف)

امام اگر سائبان کے نیچے کھڑا ہو اور مقتدی پیچھے تو کیا حکم ہے؟

سوال:- ہماری مسجد میں صحن میں سائبان پڑا ہوا ہے، اس کے بعد صحن شروع ہوجاتا ہے، امام صاحب سائبان کے نیچے کھڑے ہوتے ہیں۔ اب دریافت طلب بات یہ ہے کہ اس طرح نماز ادا کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ ایک صف امام کے ساتھ سائبان کے نیچے ہونا ضروری ہے، اگر ایسا نہیں ہوا تو نماز نہیں ہوگی، اگر ہوگی تو مکروہ ہوگی۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں نماز دُرست ہے، اور اس میں کوئی کراہت بھی منقول نہیں ملی، البتہ احتیاط اس میں ہے کہ امام سائبان سے ذرا پیچھے کھڑا ہوجائے اس طرح کہ اس کے قدم سائبان سے باہر ہوں، سجدہ خواہ سائبان کے نیچے ہوجائے، أخذ مما في الدر المختار وقيام الامام في المحراب لا سجوده فيه (أي يكره ذلك)۔[3] واللہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰/۲۸ ج)

کیا امام، امامت سے اُستاذ بن جاتا ہے؟

سوال:- چند مسائل درپیش ہیں، جن کا جواب درکار ہے۔

۱:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین و شرعِ متین دریں مسئلہ کہ کسی شخص کے پیچھے نماز پڑھنے سے

---

(۱) الدر المختار ج:۱ ص:۶۵۶ (طبع ایچ ایم سعید)۔
(۲) اس مسئلے سے متعلق مکمل تفصیل کے لئے امداد الاحکام ج:۱ ص:۵۵۹ ملاحظہ فرمائیں۔
(۳) الدر المختار ج:۱ ص:۶۴۵ (طبع ایچ ایم سعید)

وہ اُستاذ بنتا ہے یا نہیں؟ اور اگر وہ اُستاذ بن جاتا ہے تو کیا اس کا احترام بھی اسی طرح ضروری ہے جیسا کہ عام مروّجہ اُستاذوں کا احترام کیا جاتا ہے؟

۲:- عام عرف میں امام کو اُستاذ کہا جاتا ہے، کیا یہ اُستاذیت، امامت کی خصوصیت ہے یا مطلق نماز پڑھنے کی؟

۳:- ایک حافظِ قرآن دُوسرے حافظِ قرآن کی منزل سنتا ہے، کیا یہ منزل سننا تعلیم میں شمار ہوتا ہے یا کہ تذکرہ میں؟ اور یہ بھی بتائیں کہ اُستاذ کب اور کیسے بنتا ہے؟ ذرا تفصیل کے ساتھ بیان فرمائیں۔

جواب ا:- محض امامت سے اُستاذ نہیں بنتا، مگر امام کی بھی تعظیم کرنی چاہئے۔

۲:- یہ عرف صحیح نہیں ہے، ہاں! اگر امام سے کوئی دین کی بات سیکھی ہو تو وہ اُستاذ ہوگیا۔

۳:- شرعاً اس سے اُستاذ نہیں بنتا، مگر چونکہ قرآن یاد کرنے میں ایک دُوسرے کی مدد ہوئی، اس لئے ایک دُوسرے کی عزّت کرنی چاہئے۔

واللہ اعلم

۱۴۱۲/۱/۸ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۸/۵۶)

ریڈیو سننے والے کی اقتداء میں نماز پڑھنے کا حکم

سوال:- ایک شخص ایک حد تک بڑا پابندِ شریعت ہے، صرف ایک بات اس میں پائی جاتی ہے یعنی ریڈیو سنتا ہے، ریڈیو میں صرف تلاوتِ قرآن مجید اور ترجمہ اور کوئی مسائل دینی اگر نشر ہوں تو سنتا ہے اور خبریں بھی، باقی فلمی ریکارڈ وغیرہ نہیں سنتا، اور لوگوں کا امام ہے۔ نماز اس کے پیچھے جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- اگر ساز و موسیقی اور دُوسری ناجائز چیزیں سننے سے اجتناب کیا جائے تو ریڈیو سننا بالکل جائز ہے اور اس کی وجہ سے نماز میں کوئی خلل نہیں آتا، چنانچہ شخصِ مذکور کے پیچھے نماز دُرست ہے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۱/۲۸ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۳۲۲/۱۹ الف)

بلاثبوت، زنا کی تہمت لگانے والے کے پیچھے نماز کا حکم

سوال:- ایک شخص کسی پر بلاثبوت، زنا کی تہمت لگاتا ہے، ایسے شخص کا کیا حکم ہے؟ اور اس

کے پیچھے نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھنا درست ہے؟

جواب:- کسی شخص پر زنا کی جھوٹی تہمت لگانا گناہِ کبیرہ ہے،[۱] اگر ایسا کرنے والا توبہ نہ کرے تو فاسق ہے،[۲] اور اس کے پیچھے نماز مکروہ ہے، لیکن اگر نماز پڑھ لی گئی تو ادا ہو جائے گی۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۵/۶ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۵۹۶/۲۲ ب)

امام کا امامت برقرار رکھنے کے لئے چند شرائط لگانے کا حکم

سوال ۱:- ایک مولانا صاحب ہندوستان سے فارغ ہے، یہاں ایک جامع مسجد میں پیش امام ہے، اور اپنے مقتدیوں کو یوں تقریر کرتا ہے کہ اگر امامت کو برقرار رکھنا ہے تو میری نصیحت پر عمل کرو۔

۲:- تم لوگوں پر میری ماہوار تنخواہ کا جو حصہ لگایا جائے گا اس کو ہر مہینے میں دینا ہوگا۔

۳:- پورے مہینے امام کو عمدہ کھانا کھلانا ہوگا۔

۴:- مسجد کی موقوفہ زمین امام کے نام پر رجسٹری وقف کرنا ہوگی۔

۵:- میں گھر جاؤں تو کسی اور کو امام بناؤں گا۔

۶:- جو مقتدی مذکورہ شرائط پر عمل نہ کرے گا، امام اس مقتدی کے کسی دینی دُنیوی کام میں شرکت نہ کرے گا، یعنی میّت کی جنازہ وغیرہ۔

۷:- اور یہی وصیت اپنے خلیفہ کو بھی کرتا ہے۔

جواب:- امام صاحب کی لگائی ہوئی شرائط میں سے نمبر ۳، ۶ و ۷ شریعت کے مطابق نہیں، انہیں چاہئے کہ یہ شرائط عائد نہ کریں، لیکن ان شرائط کے عائد کرنے کی وجہ سے ان کے پیچھے نماز فاسد نہیں ہوتی۔

واللہ اعلم
۱۳۸۸/۱/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۰/۱۹ الف)

کشفِ قبور کے قائل کی اقتداء میں نماز کا حکم

سوال:- جو شخص کشفِ قبور کا قائل ہو اس کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟

(۱، ۲) تفصیل کے لئے دیکھئے سورۂ نور کی آیت:۴ "وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ" (الاٰیۃ) کے تحت تفسیر معارف القرآن ج:۶ ص:۳۵۳۔

جواب:- کشفِ قبور کوئی اَمرِ محال نہیں، بعض اللہ کے بندوں کو اللہ کی طرف سے یہ ملکہ دے دیا جاتا ہے، اگر کوئی اس کا قائل ہو تو مضائقہ نہیں، البتہ کشفِ قبور کے ذریعے کسی خلافِ شریعت بات پر استدلال کرنا ہرگز جائز نہیں ہے۔ جو شخص کشفِ قبور کے ذریعے کسی ناجائز بات پر استدلال کرے وہ مرتکبِ بدعت ہے، اس کو امام بنانے سے پرہیز کرنا چاہئے، لیکن اگر کوئی صحیح العقیدہ امام نہ ہو تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا تنہا نماز پڑھنے سے بہتر ہے، نماز ہو جائے گی۔ واللہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۱/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۲۱۹/۲۲ الف)

جھوٹ بولنے والے اور مسجد کا سامان اپنے گھر میں استعمال کرنے والے امام کی اقتداء کا حکم

سوال:- عرض یہ ہے کہ یہاں سعودی گورنمنٹ بلا تابعیہ مسجد بنانے نہیں دیتی، اس لئے مولوی صدیق تابعیہ والا کے نام سے ہمارے محلے کی مسجد کو تعمیر کرنا پڑا۔ مولوی موصوف چونکہ تابعیہ والا ہے اس لئے مولوی موصوف کو متولّی مسجد بنا کر ہم نے تقریباً پندرہ سولہ سال تک مسجد کو چلایا ہے، آج عرصہ تین سال سے مولوی موصوف نے ایک مولوی صاحب کو ہماری مسجد کا امام بنادیا ہے، مولوی موصوف نے امامِ مسجد کو خادم کہہ کر اقامہ بھی بنادیا ہے، مولوی موصوف خود امام کا کفیل بھی ہے، جس پاسپورٹ پر اقامہ بنادیا ہے وہ پاسپورٹ چونکہ جعلی تھا، گزشتہ سال جب جعلی پاسپورٹ والوں کی یہاں جوازات کی طرف سے پکڑ دھکڑ اور تلاش ہو رہی تھی تو امام صاحب نے اپنا پاسپورٹ چھپالیا، پھر حکومت میں پاسپورٹ گم ہونے کا اعلان کر کے درخواست دے دی، پھر سفارت خانے سے نیا پاسپورٹ حاصل کیا، اس پر پھر اقامہ بنایا۔ امام صاحب نے پاسپورٹ گم ہونے کا جو اعلان کیا ہے وہ بالکل جھوٹ اور کذب ہے، اس میں توریہ وتعریض بھی نہیں کیا، حالانکہ پہلا پاسپورٹ امام کے پاس موجود ہے۔ اس بات پر مقتدیوں نے امام سے ناراض ہو کر اس کے خلف میں اقتداء کرنا چھوڑ دیا، مقتدیوں نے دُوسری مسجد میں جاکر نماز پڑھنا شروع کردیا ہے۔ یہ تو ساری پہلی بات تھی۔

دُوسری بات یہ ہے کہ اس امام صاحب نے مسجد کا سامان گھر میں استعمال کیا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ ایک آدمی نے مسجد کے لئے پانی دیا تھا، تاکہ اس سے لوگ وضو کریں، امام صاحب نے یہ پانی بجائے مسجد کے مدرسہ میں اور مسجد کے کرایہ کے مکانوں میں خرچ کیا، جب

محلے کے لوگوں نے امام صاحب سے یہ سب باتیں پوچھیں تو امام صاحب سختی سے پیش آیا، جھگڑا فساد کیا ہے، ان کی وجہ سے محلے کے اکثر لوگوں نے ناراض ہوکر اس کی اقتداء میں نماز پڑھنا چھوڑ دیا، دُوسری مسجد میں نماز پڑھنا شروع کردیا۔ مولوی صدیق صاحب نے مذکورہ امام کو معزول کرنے کی اور دُوسرا امام رکھنے کی اجازت تو دی ہے مگر موجودہ امام متولیٔ مسجد رہے گا اور سب کا سرپرست ہوگا۔ یہ بات محلے والوں پر مشکل گزری۔ خلاصہ یہ ہے کہ اوّلاً امام صاحب نے اقامہ اور پاسپورٹ کی وجہ سے صریح جھوٹ بولا، ثانیاً مسجد کے فرش، مسجد کے ایئرکنڈیشن اور مسجد کے پانی میں ناجائز تصرف کیا، ثالثاً امام صاحب مقتدیوں سے سختی سے پیش آیا، جھگڑا فساد کیا، رابعاً امام صاحب کو معزول کرنے کی طاقت بھی مقتدیوں کو نہیں ہے، اور امام صاحب کے ساتھ اختلاط کی صورت میں فتنہ وفساد کا قوی اندیشہ ہے، شرعی حکم سے آگاہ کریں، ان وجوہ کی بناء پر جو لوگ دُوسری مسجد میں نماز پڑھتے ہیں کیا وہ لوگ غلطی پر ہیں؟

جواب:- جھوٹ بولنا اور مسجد کا سامان گھر میں استعمال کرنا حرام ہے، جو اس حرام کا مرتکب ہو جب تک وہ اس سے توبہ نہ کرے فاسق کے حکم میں ہے، اسے باختیارِ خود امام بنانا یا کسی صالح امام کے ہوتے ہوئے اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز نہیں ہے۔ تاہم جو نمازیں ان کے پیچھے پڑھی گئیں وہ ادا ہوگئیں، اعادے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن اگر یہ اُمورِ محرّمہ ان سے ثابت ہوں اور توبہ بھی نہ کریں تو منتظمینِ مسجد پر واجب ہے کہ وہ کسی صالح امام کا انتظام کریں۔ واللہ اعلم

۲۵/۷/۱۴۰۸ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۹۹/۳۹ ہ)

اپنے اُوپر عائدشدہ مختلف الزامات کے دُرست جوابات دینے والے امام کی اقتداء کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں کہ ایک امام صاحب کو مسجد کے احاطے کے اندر کونے میں ایک مکان بنا کر دیا ہوا ہے، اور تقریباً ۱۴-۱۵ سال سے وہ اس مسجد کی امامت کر رہے ہیں اور اسی کے احاطے کے اندر ایک مدرسہ ہے، اس مدرسہ کے مہتمم بھی امام صاحب ہیں، مسجد و مدرسہ دونوں کی طرف سے امام کو مبلغ ۶۰ روپے ماہانہ ملتے ہیں، مسجد و مدرسہ کی کمیٹی کے آفس عہدیداران کی طرف سے امام و مہتمم صاحب پر مندرجہ ذیل الزامات لگائے گئے ہیں، کمیٹی کے یہ الزامات اور امام صاحب کے جوابات ذیل میں درج ہیں، آپ اپنے شرعی فیصلہ سے مطلع فرماکر مشکور فرماویں۔

(کمیٹی کی طرف سے امام صاحب سے کئے گئے سوالات اور امام صاحب کے جوابات)

سوال:- آپ کو جو مکان مسجد کی طرف سے ملا ہے، اس کی چھت پر مرغیوں کے پالنے کی جگہ کس کی اجازت سے بنائی ہے؟

جواب:- (عرصہ ایک سال ہوا جب بنائی تھی)۔ صدر کمیٹی صاحب سے پوچھا تھا، بنانے سے قبل میں صدر صاحب کے گھر گیا ان سے کہا کہ جناب تنخواہ کم ہے، عیال دار ہوں، خیال ہے کہ جس مکان میں رہ رہا ہوں اس کی چھت پر کچھ مرغیوں کی جگہ اپنے خرچ سے بناؤں، آپ کی کیا رائے ہے؟ فرمانے لگے اچھا روزگار ہے، بسم اللہ کر کے شروع کریں۔ مگر اب جبکہ ایک سال کے بعد یہ مسئلہ اُٹھا تو صدر صاحب انکار کرتے ہیں کہ میں نے کوئی اجازت نہیں دی تھی۔

جناب صدر صاحب قسم کھانے کو تیار ہیں اور امام صاحب بھی قسم اُٹھانے کو تیار ہیں اور کہتے ہیں کہ صدر صاحب کو وہ اجازت یاد نہیں ہے۔

(نوٹ:- مذکورہ مرغیوں کی جگہ بمع اس کے اسباب کے، امام صاحب نے ذاتی خرچ سے کیا تھا، مسجد کے نام وقف کر دیا ہے تاکہ تمام اعتراض ختم ہو۔)

سوال:- مسجد کمیٹی نے آپ کو ذاتی مصرف کے لئے جو بجلی دے رکھی تھی وہ مرغیوں میں آپ نے کس کی اجازت سے جلائی؟

جواب:- مکان کی چھت پر ایک بلب پہلے ہی لگا ہوا تھا اور تقریباً دس گیارہ بجے رات تک ہم اپنے مصرف کی روشنی کے لئے جلاتے تھے، اس بلب سے مرغیوں کی جگہ اور باہر کا کام لیتا رہا اور ایک سال تک یہ بلب اسی طرح جلتا رہا، ذہن میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اس طرح کرنا بھی اچھا نہیں ہے، اب جبکہ اس سال تین بلب جلانے کی نوبت آئی ہے تو آپ حضرات کے اعتراض کرنے سے پہلے ہی میں حساب کروا رہا تھا کہ ایک بلب ۶۰ واٹ کا اگر روزانہ اتنا جلے تو مہینے میں کتنی بجلی خرچ ہوتی ہے تاکہ رقم، میں مسجد میں جمع کروادوں، مگر اس سے قبل کہ میں حساب کروا کر جمع کرواتا آپ حضرات کی طرف سے سوال ہوگیا، گزشتہ سال جو ایک بلب جلتا رہا کمیٹی چاہے تو چھوڑ دے اور چاہے تو اس کا سارا حساب کر کے مجھ سے رقم وصول کر لے۔

سوال:- گیس کی بچی ہوئی اینٹیں کسی صاحب نے مدرسہ کو دی تھیں، آپ نے اپنی مرغیوں کی جگہ پر کیوں لگائیں؟

جواب:- مدرسہ کے مدرّس کے لئے ایک کمرہ میری نگرانی میں بنایا گیا، جب اس کی بنیاد

کھودی تو شومیٔ قسمت سے مستری کے منہ سے نکل گیا کہ کنکر اینٹیں جو پڑی ہیں بنیادوں میں لگ جائیں تو اس کمرہ کی بنیاد مضبوط رہے، وہ کنکر اینٹیں میں نے اپنی مرغیوں کی جگہ بنانے کے لئے منگوائی تھیں، میں نے اس وقت مدرسہ کا فائدہ مدِنظر رکھ کر مستری سے کہا کہ میری اینٹوں سے یہ کنکر اینٹ بنیادوں میں لگادو اور مدرسہ کی اینٹوں کی اتنی تعداد میری اینٹوں میں ڈال دو، اس وقت مدرسہ کا فائدہ ذہن میں تھا، مسئلہ کی حقیقت ذہن میں نہیں آئی کہ میں اس طریقے سے مدرسہ کے لئے نہ اپنی اینٹیں دے سکتا ہوں اور نہ اس طرح لے سکتا ہوں، جب اعتراض اُٹھا تب یہ حقیقت کھلی کہ میں غلط قدم اُٹھاچکا ہوں مگر میرے اس طرح کرنے سے مدرسہ کو فائدہ ہوا، کچھ نقصان نہیں ہوا۔

سوال:- مدرسہ کی تعمیر کے سلسلے میں جو لوہا، ریتی، سیمنٹ وغیرہ آیا ہوا ہے اس کو آپ اپنی مرغیوں کی جگہ کے مصرف میں کیوں لائے؟ اور کس کی اجازت سے لائے؟

جواب:- اینٹیں میں نے خود اپنی رقم سے مدرسہ کے آرڈر کے ساتھ منگوائیں رسید میرے پاس ہے (جو دِکھائی گئی)، سیمنٹ اس کام کے لئے میں نے خود خریدا اس کی رسید بھی میرے پاس ہے (جو دِکھائی گئی)، البتہ میرے مزدوروں اور مستری سے ایک موقع پر یہ غلطی ہوگئی وہ یہ کہ میں گھر میں موجود نہیں تھا اور کام کرتے ہوئے سیمنٹ ختم ہوگیا تو مستری اور مزدور اپنی یومیہ مزدوری کے خوف سے مدرسہ کا سیمنٹ اُٹھا کر لے گئے کہ یہ کام بھی امام صاحب کروا رہے ہیں اور مدرسہ کا کام بھی امام صاحب ہی کروا رہے ہیں وہ ادا کردیں گے، میں شام کو جب واپس آیا تو مجھے انہوں نے بتلایا جس پر میں ان پر خفا ہوا، اس سیمنٹ کی جتنی قیمت بنتی تھی اس وقت کے نرخ کے حساب سے وہ رقم مدرسہ کے فنڈ میں جمع کرواکر رسید کاٹ دی وہ رقم کی رسید اور جن مزدوروں نے سیمنٹ اُٹھایا تھا ان کا حلفیہ بیان میرے پاس موجود ہے (جو دِکھایا گیا)۔

سریئے کے ردّی ٹکڑے جو بچتے تھے، مؤذن کو میں کہہ دیتا تھا کہ کوئی ردّی والا آئے تو اسے دے دیا کرو، ایک موقع پر تھوڑے سے مجھے ضرورت پڑے، میں نے لے لئے اور اندازے سے ان کی قیمت ادا کردی (مگر غلطی یہ ہوئی کہ تول کر نہیں لئے)۔

سوال:- مدرسہ میں جو رقم زکوٰۃ وفطرہ اور چرمِ قربانی کی وصول ہوئی وہ مدرسہ کے اکاؤنٹ میں اب نہیں ہے، وہ مدرسہ کے کس مصرف میں استعمال کی؟

جواب:- مدرسہ کی رقم بینک میں جمع تھی، میں تو تعمیری اخراجات کا بل بناکر صدر صاحب کے حوالے کردیتا تھا، صدر صاحب اس کو پاس کرتے تھے اور خازن صاحب کے پاس چیک بک تھی وہ چیک بناتے تھے، جس پر صدر صاحب اور دیگر تین آدمیوں میں سے دو کے دستخط ضروری تھے، میں ازخود

تو ایک پائی بھی بینک سے نہیں نکال سکتا تھا، یہ سوال تو ان لوگوں سے پوچھنا چاہئے۔

معلوم ہوتا ہے کہ آپ لوگوں نے خیال نہیں کیا کہ جن کی ذمہ داری تھی اور نہ میں بینک سے معلوم کرسکا اور بظاہر اب وہ رقم بھی تعمیری رقم کے ساتھ مدرسہ کی تعمیر میں خرچ ہوگئی، اس میں میرا کیا قصور ہے؟ اب مدرسہ کی تعمیر کے لئے جو رقم آئے گی اس میں سے مذکورہ رقم نکال کر اس فنڈ کو پورا کرلینا۔

مذکورہ بالا سوالات و جوابات کو ملاحظہ فرماکر شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں جواب سے مطلع فرمائیں کہ مذکورہ الزامات کے جوابات پڑھنے کے بعد امام صاحب کس قدر مجرم ہیں؟ آیا ان کو امام رکھنا چاہئے یا نہیں؟ اور ان کے پیچھے نماز صحیح ہوتی ہے یا نہیں؟

نوٹ:- چھت پر مرغیوں کے لئے جگہ بنانے کے سلسلے میں جو خرچ اُٹھا اس پر کل .....روپے امام صاحب کے خرچ ہوئے، وہ سارا تعمیری ملبہ بمع تعمیر کے امام صاحب نے مسجد و مدرسہ کو وقف کردیا ہے، اور کمیٹی نے ایک سال ہوا اس پر رضامند ہوکر متفقہ فیصلہ کرلیا تھا، مگر اب پھر فتویٰ نمبرا کے چار سوالوں کے ساتھ گزشتہ دو برس کے الزاموں کو شامل کرکے حقیقت میں مفتی صاحب کے سامنے امام صاحب کے جرموں کو سنگین شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ فقط والسلام!

جواب:- مذکورہ سوالات کے جو جواب امام صاحب نے دیئے ہیں، اگر وہ دُرست ہیں تو امام صاحب بالکل بری الذمہ ہیں اور ان پر کوئی اعتراض واقع نہیں ہوتا۔ جہاں تک پہلے دو سوال کا تعلق ہے وہ تو سوال ہی نامعقول اور غیر منصفانہ ہیں، جو مکان امام صاحب کو رہنے کے لئے دیا گیا ہے اگر وہ اس میں اپنے معاش کے لئے کوئی کام کریں تو اس میں شرعاً کوئی مضائقہ نہیں ہے، اسی طرح بجلی کا استعمال اپنی ہر ضرورت کے لئے کرسکتے ہیں، کمیٹی والوں نے اس بارے میں جواب طلبی کرکے زیادتی کی ہے، باقی سوالات تو دُرست ہیں، لیکن جوابات بھی معقول ہیں، اور اگر ان کی صحت ثابت ہوجائے تو امام صاحب پر اعتراض کسی طرح دُرست نہیں۔ واللہ اعلم

۱۳۹۹/۹/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۱۷/۱۴ ۳۰/ د)

ایک امام کی امامت سے متعلق تفصیلی استفتاء اور اس کا جواب

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرعِ متین مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں، یہ کہ ہماری مسجد میں جو امام صاحب ہیں اور جو کہ مسجد کے ملحق دارالعلوم کے مہتمم بھی ہیں، موصوف کو کمیٹی کی طرف سے دو تنخواہیں ملتی ہیں، ۲۳۵ روپے مسجد کی امامت کے اور ۱۲۵ روپے مہتمم ہونے کے، جملہ ۳۶۰ روپے تنخواہ ملتی ہے، گزشتہ مہینے انتظامیہ کی طرف سے امام صاحب کو ایک اظہارِ وجوہ کا نوٹس

ملا ہے جس کی عبارت مندرجہ ذیل ہے اور نمبروار جوابات بھی درج ہیں۔

(سوالات از کمیٹی)

۱:- گزشتہ تین ماہ سے اہلِ محلّہ کی مسلسل درخواستیں آرہی ہیں کہ آپ کسی نہ کسی نماز میں روزانہ ضرور غیر حاضر رہتے ہیں، نمازی انتظار کرتے ہیں، پھر کوئی دُوسرا نماز پڑھا دیتا ہے، اس پر آپ کو متوجہ کیا گیا، ہنوز اثر نہ ہوا۔

۲:- باوجود منع کرنے کے آپ نے مسجد کی سیڑھی کرائے پر دی اور رقم وصول کی، نوٹس ملنے پر غلط بیانی تحریر کی۔

۳:- آپ کو معلّمِ مدرسہ کی غیر موجودگی میں صرف تھوڑا وقت پڑھانے کو کہا گیا، مگر آپ نے صاف انکار کردیا۔

۴:- باوجود صدر کمیٹی کے منع کرنے کے آپ نے اپنے مکان (مسجد کی ملکیت جو امام صاحب کو ملا ہوا ہے) پر پائخانہ بنوایا۔

(جوابات از امام صاحب)

۱:- گزشتہ دو ماہ یعنی اپریل و مئی میں کچھ وقتوں کی نمازوں میں غیر حاضری کی وجہ یہ ہے کہ اپریل ۱۹۷۸ء میں دو روزہ ختمِ نبوّت کانفرنس ہوئی (چونکہ میں یہاں حیدرآباد کی مجلس ختمِ نبوّت کا ضلعی ناظم ہوں) اس کے انتظام کے سلسلے میں مجھے کافی بھاگ دوڑ کرنی پڑی، جس کی وجہ سے اکثر نمازوں میں غیر حاضر ہوجاتا تھا (مگر اپنی جگہ قائم مقام مقرّر کرجاتا تھا، اِلَّا ماشاء اللہ) مگر صدر منتظم صاحب کو میں نے زبانی کہہ دیا تھا کہ کانفرنس کے انتظامات کے سلسلے میں اکثر نمازوں میں میری غیر حاضریاں ہوں گی، میری غیر موجودگی میں مدرّسِ قرآن قاری صاحب یا مؤذِنِ مسجد صاحب نمازیں پڑھائیں گے، صدر صاحب نے فرمایا کہ اللہ مالک ہے، فکر نہ کریں۔ اور ایک دن کے لئے اپنے ایک ضروری کام کے سلسلے میں کراچی جانا پڑا، اس کی اطلاع بھی جناب صدر صاحب کو زبانی کرگیا۔ مئی کے شروع میں ایک گھریلو جھگڑے کو نمٹانے ایک دن پھر کراچی جانا پڑا، اس کی اطلاع بھی جناب صدر صاحب کو زبانی کرکے گیا اور صدر نے اجازت دی، اور پھر اس مہینے ہمارے حضرت مولانا غلام حبیب صاحب حلوائی اچانک کراچی تشریف لائے ان سے ملاقات کے لئے کراچی جانا پڑا، اور جب حضرت مولانا حیدرآباد تشریف لائے اور پھر دو روز حضرت کا قیام رہا، میں بھی ساتھ رہا، مگر صدر موصوف سے پوچھ کر گیا۔ علاوہ مذکورہ وجوہ کے، ہفتے میں یوں بھی ایک دو غیر حاضریاں ہوجاتی ہیں کہ لطیف آباد سے شہر گیا واپسی میں وقت پر آنا تو چاہتا ہوں مگر سواری نہیں ملتی یا راستے میں سواری خراب ہوجاتی ہے، کسی شادی و غمی میں جانا پڑتا ہے، بچوں کے علاج و معالجے کے لئے ڈاکٹر کے پاس ہسپتال گیا، وہاں ڈاکٹر کی

مصروفیت کی وجہ سے دیر ہوگئی، وغیرہ وغیرہ۔

اس قسم کی غیر حاضریاں کوئی جان بوجھ کر نہیں کی جاتیں، بلکہ ہر امامِ مسجد سے اس قسم کی غیر حاضریاں ہو ہی جاتی ہیں، آئندہ کے لئے وعدہ کرتا ہوں کہ عمداً کوئی غیر حاضری نہیں کروں گا، مگر مذکورہ دُوسری قسم کی غیر حاضری تو ہو ہی جاتی ہے۔

۲:- جب سے مجھے منع کیا گیا ہے میں نے خود کسی کو مدرسہ یا مسجد کی سیڑھی کرایہ پر نہیں دی اور بچوں کو بھی منع کر دیا کہ کسی کو نہ دینا، مگر اس آٹھ نو ماہ کے عرصے میں پھر بھی تین دفعہ میری عدم موجودگی میں لوگ سیڑھی لے گئے اور بچوں سے کذب بیانی کر کے لے گئے، اور یہ نکال لے جانا اور چھوڑ جانا میری غیر موجودگی میں رہا، مجھے اس کا کوئی کرایہ وغیرہ نہیں ملا، نام ان کے لکھے دیتا ہوں فلاں فلاں ہیں، ایک مرتبہ کا کرایہ میری غیر موجودگی میں ایک آدمی میرے گھر دے کر گیا، اس کو میں نے جمع کروادیا مدرسہ کی رسیدوں میں دیکھ سکتے ہیں، سیڑھی ہر وقت مسجد میں رہتی ہے کوئی لے جائے یا لے آئے، مجھے کیسے پتہ چل سکتا ہے؟ آپ لوگ ذرا ذرا سی بات پر اپنے امام پر بدگمانی کرتے ہیں اور پیچھے نمازیں بھی پڑھتے ہیں، تعجب ہے!

۳:- اس کا جواب میں نے جنرل سیکریٹری جناب ڈاکٹر صاحب کو زبانی دے دیا اور انہوں نے اس وقت میرا عذر قبول کرلیا تھا۔ وہ عذر یہ تھا کہ میرے ذمہ آٹھ دس آدمی اہلِ خانہ کی کفالت کا بوجھ ہے، اس دور میں مہنگائی میں آٹھ نو سو روپے ماہانہ خرچ ہوجاتے ہیں، جبکہ مسجد اور مدرسہ سے بحیثیت امام و مہتمم مجھے کل ۳۶۰ روپے ماہانہ ملتے ہیں، بقایا اخراجات اس طرح پورا کرتا ہوں کہ صبح ایک اسکول میں جاتا ہوں، ۲۷۵ روپے اُدھر سے ملتے ہیں، اور شام بعد نماز ظہر تھوڑا سا آرام کر کے اسکول کے بورڈنگ میں قراءت پڑھانے جاتا ہوں، ۲۰۰ روپے اُدھر سے ملتے ہیں، تو اس طرح گھر کا خرچ پورا کرتا ہوں۔

صبح کو بچوں کو پڑھاؤں تو اسکول سے چھٹی ملتی ہے، اور شام کو بورڈنگ جانا بند کروں تو یہ ٹیوشن جاتی ہے۔ آپ میرا یہ عذر قبول کرتے ہوئے مجھے معاف کریں تو احسان ہوگا۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ کچھ وقت نکال لیتے تو اچھا ہوتا، خیر کوئی بات نہیں۔ میں نے کہا ابھی کوئی عارضی مدرّس رکھ لیں۔ اصل مدرّس کی میں بھی تلاش کرتا ہوں، آپ بھی کریں، اتنی سی بات ہونے کے بعد میں مطمئن ہوگیا کہ ڈاکٹر موصوف صاحب نے میرا عذر قبول کرلیا ہے۔

۴:- مسجد کے جس مکان میں رہ رہا ہوں اس کے فرش وغیرہ کی اور چھت پر بیت الخلاء کی جس قدر مرمت وغیرہ کی گئی صدر کمیٹی سے اجازت لے کر کروائی ہے، اپنی مرضی سے ایک اینٹ بھی نہیں لگوائی۔ اس مرمت اور چھت پر بیت الخلاء وغیرہ بنانے کی جس کا بھی صدر صاحب انکار کردیں

میں اس کا ہرجانہ دینے کو تیار ہوں۔

مذکورہ سوالات و جوابات میں سے سوال نمبر ایک کے سلسلے میں صدر صاحب نے فرمایا کہ مجھ سے باقاعدہ چھٹیاں نہیں لی گئیں صرف زبانی کلامی مجھ سے کبھی کبھی پوچھ لیا جاتا رہا ہے۔

سوال ۳ کے سلسلے میں جنرل سیکریٹری صاحب نے فرمایا کہ میں بالکل مطمئن نہیں ہوا تھا بلکہ مدرسہ کا مہتمم ہوتے ہوئے اور مہتممی کی تنخواہ لیتے ہوئے مہتمم کا یہ فرض ہوتا ہے جب کوئی مدرّس غیر حاضر ہو، یا اس کو کمیٹی نکال دے تو اس کی جگہ وہ بچوں کو قرآن مجید وغیرہ پڑھائے، لہٰذا مہتمم نے اپنے فرائض میں کوتاہی کی ہے، ان کو نکال دینا چاہئے۔

سوال ۴ کے سلسلے میں صدر صاحب نے فرمایا کہ فرش کی مرمت کی میں نے اجازت دی تھی، مگر بیت الخلاء کی اجازت نہیں دی، اور کبھی کہتے ہیں کہ جب بار بار مجھے مجبور کیا گیا تو میں مجبوراً ہاں نہ کرتا تو کیا کرتا؟ جبکہ بیت الخلاء بنانے میں کل ۱۵۰ (ایک سو پچاس) روپے خرچ ہوئے۔

اب مذکورہ سوالات و جوابات غور وفکر سے پڑھ کر شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں جوابات سے جلد مشکور فرما کر عنداللہ مأجور ہوں، یعنی:-

۱:- مذکورہ امام صاحب امامت کے قابل ہیں اور ان کے پیچھے نماز ہوجاتی ہے یا نہیں؟ یا پھر غیر ذمہ دار سمجھ کر ان کو امامت سے برطرف کردینا چاہئے، (جبکہ پنج وقتہ نمازیوں نے ۹۵ فیصد اپنے دستخط سے ایک یادداشت کمیٹی کے نام بھیجی ہے کہ ہم اپنے امام صاحب پر رضامند ہیں اور ان کے خلاف فیصلہ کرنا ہمارے جذبات کو مجروح کرنا ہوگا)۔

۲:- مہتمم ہوتے ہوئے مہتمم نے بچوں کی پڑھائی سے انکار کیا، اس صورت میں ان کو مہتممی سے الگ کردینا چاہئے یا نہیں؟

۳:- صدر صاحب کے انکار پر یا کسی اور کی بات پر امام صاحب کو جھوٹا اور خائن سمجھ کر نکالنا جائز ہے؟ یا صدر صاحب کی بھول سمجھ کر امام صاحب سے کوئی تعارض نہیں کرنا چاہئے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں امام صاحب نے اپنے اُوپر عائد کردہ الزامات کا جو جواب دیا ہے، اگر وہ واقعہ کے مطابق ہے تو امام صاحب پر اس بارے میں کوئی اعتراض لازم نہیں آتا، اور ان الزامات کی بناء پر انہیں امامت یا مدرسہ کے اہتمام سے سبکدوش کرنا دُرست نہیں۔ کمیٹی کے افراد کو چاہئے کہ وہ امام صاحب کی کماحقہ عزّت کریں اور اس قسم کے الزامات عائد کرکے انہیں پریشان نہ کریں اور امام صاحب کا فرض ہے کہ وہ اپنے مفوضہ فرائض دیانت داری سے ادا کریں۔

واللہ اعلم

۱۳۹۹/۹/۲۹ھ

﴿فصل فی المسبوق واللاحق﴾

(مسبوق اور لاحق کے مسائل کا بیان)

مسبوق، سجدۂ سہو کے لئے امام کے سلام میں شرکت نہ کرے

سوال:- مسبوق، امام کے سجدۂ سہو کے لئے سلام میں شرکت کرے یا نہیں؟

جواب:- جس شخص کی کچھ رکعتیں امام کے ساتھ رہ گئی ہوں اسے سجدۂ سہو کے وقت سلام نہ کرنا چاہئے، البتہ امام کے ساتھ سجدہ کرنا ضروری ہے، کذا فی رد المحتار۔[1] واللہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۰/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۲۵/۱۸ الف)

مسبوق کی نماز کا طریقہ

سوال:- ایک آدمی نے چار رکعت والی نماز میں دُوسری یا تیسری رکعت میں امام کے ساتھ شرکت کی، باقی نماز کس طرح ادا کرے؟ ایک صاحب نے بتایا ہے کہ باقی رکعتوں میں صرف فاتحہ پر اکتفاء کرنا چاہئے۔ مغرب میں اگر ایک رکعت ہو تو باقیوں میں سورۃ ملائی جائے یا صرف فاتحہ پر اکتفا کیا جائے؟ اس نماز کے بارے میں بھی ان صاحب نے بتایا ہے کہ ایک میں تو سورۃ ملادے، باقی دُوسری رکعت میں فاتحہ پر اکتفاء کیا جائے۔

جواب:- جس شخص کی ایک یا دو رکعت چھوٹ گئی ہو اُسے مسبوق کہتے ہیں، قراءت کے بارے میں اس کا حکم یہ ہے کہ جب امام کے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنی نماز پوری کرے گا تو قراءت کے لحاظ سے یہ اس کی پہلی رکعت سمجھی جائے گی، لہٰذا اس رکعت میں وہ سورۂ فاتحہ کے ساتھ قرآنِ کریم

---

(۱) وفی بدائع الصنائع فصل فی بیان من یجب علیه سجود السهو ج:۱ ص:۱۷۶ (طبع سعید) ثم المسبوق انما یتابع الامام فی السهو (أی فی سجدة السهو بأن سجد هو) دون السلام بل ینتظر الامام حتی یسلم فیسجد فیتابعه فی سجود السهو لا فی سلامه. وفی الدر المختار ج:۲ ص:۸۲ (طبع ایچ ایم سعید) والمسبوق یسجد مع امامه مطلقاً. وفی الشامیة (قوله والمسبوق یسجد مع امامه) قید بالسجود لأنه لا یتابعه فی السلام.
وفی البحر الرائق ج:۲ ص:۱۰۰ (طبع ایچ ایم سعید) ثم المسبوق انما یتابع الامام فی السهو لا فی السلام، فیسجد معه ویتشهد .... الخ. وکذا فی الهندیة ج:۱ ص:۹۲ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه).

کی دُوسری آیات بھی پڑھے گا۔ اگر اس کی دو رکعتیں چھوٹی ہیں تو دُوسری رکعت میں بھی سورۂ فاتحہ کے بعد کوئی اور سورت پڑھنا اس کے لئے ضروری ہے، اور اگر تین یا چار رکعتیں چھوٹی ہیں تو پہلی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ کوئی اور سورت پڑھے گا مگر اس کے بعد والی رکعتوں میں نہیں پڑھے گا۔[۱]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۹ھ

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۱۴/۱۹ الف)

مسبوق اپنی نماز کس طرح پوری کرے؟

سوال:- چار رکعتوں میں جس کی ایک رکعت چھوٹ گئی ہو وہ اپنی بقیہ نماز کس طرح پوری کرے؟

جواب:- امام کی نماز ختم ہونے کے بعد اپنی چھوٹی ہوئی رکعت پوری کرلے اور اس میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ کوئی اور سورۃ پڑھنا بھی ضروری ہے۔[۲]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۴ھ

الجواب صحیح
محمد شفیع عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۴۰۰/۱۸ الف)

مسبوق کی ثناء سے متعلق شرح وقایہ کی ایک عبارت کی تحقیق

سوال:- شرح وقایہ باب صفۃ الصلوٰۃ کی عبارت یہ ہے: "ان المسبوق یقرأ ولا یثنی فیتعوذ" اس عبارت میں "ولا یثنی" کا کیا مطلب ہے؟ یا لفظ "لا" غلط ہے، کیونکہ تعوذ پڑھنا اور ثناء ترک کرنا کسی کتاب میں نظر نہیں آتا؟

جواب:- شرح وقایہ کے دستیاب نسخوں میں عبارت اسی طرح ہے[۳]، اور اس پر آپ کا اعتراض

(۱، ۲) فی الدر المختار ج:۱ ص:۵۹۶ (باب الامامة) (والمسبوق من سبقه الامام بها أو ببعضها وهو منفرد) حتى يثني ويتعوذ ويقرأ، وان قرأ مع الامام لعدم الاعتداد بها لكراهتها، مفتاح السعادة (فيما يقضيه) أى بعد متابعته لامامه فلو قبلها فالأظهر الفساد ويقضي أول صلاته في حق قراءة وآخرها في حق تشهد، فمدرك ركعة من غير فجر يأتي بركعتين بفاتحة وسورة وتشهد بينهما وبرابعة الرباعي بفاتحة فقط ولا يقعد قبلها وفي رد المحتار (قوله حتى يثني .... الخ) تفريع على قوله: منفرد فيما يقضيه بعد فراغ امامه فيأتي بالثناء والتعوذ، لأنه للقراءة، ويقرأ لأنه يقضي أول صلاته في حق القراءة كما يأتي وكذا في الفتاوى الهندية ج:۱ ص:۹۱، ۹۲ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه).
نیز دیکھئے: فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ج:۳ ص:۳۷۷، وعزیز الفتاویٰ ص:۲۲۵۔

(۳) شرح الوقاية ج:۱ ص:۱۴۴ (طبع ایچ ایم سعید) (محمد زبیر حق نواز)۔

دُرست ہے، مسئلہ یہی ہے کہ مسبوق کو ثناء پڑھنی چاہئے، تمام متونِ معتبرہ میں مسئلہ یوں ہی لکھا ہے۔

قال فی غنیة المتملّی: والمسبوق یأتی بالثناء اذا أدرک الامام حالة المخافتة ثم اذا قام الی قضاء ما سبق یأتی به أیضًا، کذا ذکرہ فی الملتقط، ووجهه أن القیام الی قضاء ما سبق کتحریمة أخری للخروج به من حکم الاقتداء الی حکم الانفراد.
(کبیری ص:۲۹۷، فصل صفة الصلوٰة)[1]

وقال فی الدر المختار: وهو (أی المسبوق) منفرد حتی یثنی ویتعوذ ویقرأ.
(شامیة ج:۱ ص:۴۰۴ أواخر باب الامامة)[2]

اس سے معلوم ہوا کہ مسبوق جب جماعت میں شامل ہو (اور امام قراءت نہ کر رہا ہو) اس وقت بھی ثناء پڑھے، اور جب اپنی نماز پوری کرنے کے لئے کھڑا ہو اس وقت بھی، البتہ پہلے موقع پر امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے قول کے مطابق تعوّذ نہیں پڑھے گا کیونکہ ان کے نزدیک تعوّذ قراءۃ کے تابع ہے، اور امام ابویوسفؒ کے نزدیک دونوں مرتبہ تعوّذ بھی پڑھے گا کیونکہ ان کے نزدیک تعوّذ ثناء کے تابع ہے، اور فتویٰ امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے قول پر ہے: لما فی رد المحتار لٰکن مختار قاضی خان والهدایة وشروحها والکافی والاختیار وأکثر الکتب هو قولهما أنه تبع للقراءة وبه نأخذ.
(شامی ج:۱ ص:۳۲۹ باب صفة الصلوٰة)[3]

بہرحال! شرح وقایہ میں ثناء کی نفی متون کے خلاف ہے، لہٰذا یا تو کتابت کی غلطی سے لفظ "لا" بڑھ گیا ہے یا مصنف شرح وقایہ سے تسامح ہوا ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۲۳؍۱؍۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۵۳/۲۵ الف)

امام کے سلام کی صورت میں مسبوق تشہد پورا کرے گا یا نہیں؟

(عالمگیری اور شامی و امداد الفتاویٰ میں تعارض کی تحقیق)

سوال:- اگر کوئی مسبوق قعدۂ اخیرہ میں شریک ہوا اور تشہد پورا کرنے سے قبل امام نے سلام پھیرا تو وہ مسبوق اپنا تشہد پورا کئے بغیر اپنی نماز ادا کرنے کے لئے کھڑا ہو سکتا ہے یا تشہد پورا کرنا ضروری ہے؟ عالمگیری سے معلوم ہوا کہ پورا کرنا ضروری نہیں ہے، اور امداد الفتاویٰ سے بحوالہ شامی

---

(۱) غنیة المتملّی ص:۳۰۴ (طبع سہیل اکیڈمی لاہور)۔
(۲) فتاویٰ شامیة ج:۱ ص:۵۹۶ (طبع ایچ ایم سعید)۔
(۳) شامیة ج:۱ ص:۴۹۰ (طبع ایچ ایم سعید)۔

معلوم ہوتا ہے کہ پورا کرنا ضروری ہے، جواب سے مطمئن فرمایا جاوے۔

جواب:۔ عالمگیری اور شامی اور امداد الفتاویٰ میں کوئی تعارض نہیں ہے، سب کا منشأ یہی ہے کہ مسبوق کے لئے تشہد کو پورا کر کے اُٹھنا افضل ہے، لیکن اگر وہ پورا کئے بغیر اُٹھ جائے تو نماز سب کے نزدیک بلاکراہت ہوجاتی ہے۔ علامہ شامیؒ اس مسئلے کو نقل کر کے لکھتے ہیں: ومقتضاه أنه يتم التشهد ثم يقوم ولم أره صريحا ثم رأيته في الذخيرة ناقلا عن أبي الليث المختار عندي أنه يتم التشهد وان لم يفعل أجزأه. ولله الحمد. (جلد اوّل باب صفة الصلوٰة بيان الركوع)۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۲۲ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(۱) فتاویٰ شامیة ج:۱ ص:۴۹۶ وفتاویٰ عالمگیرية الفصل السادس فيما يتابع الامام وفيما لا يتابعه ج:۱ ص:۹۰ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)، امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۳۳۹۔ وکذا فی امداد الأحکام ج:۱ ص:۵۵۱ وعزیز الفتاویٰ ص:۲۲۵، وفتاویٰ دار العلوم دیوبند ج:۳ ص:۳۷۹۔

﴿فصل فیما یفسد الصلوٰۃ وما یکرہ فیہا﴾

(نماز کے مفسدات اور مکروہات کا بیان)

پہلی صف میں نابالغ بچے کا کھڑا کرنا

سوال:- اگر نابالغ بچے پہلی صف میں کھڑے ہوجائیں تو نماز دُرست ہوجاتی ہے یا مکروہ؟

جواب:- نماز تو ہوجاتی ہے، مگر ایسا کرنا مکروہ ہے۔[۱] واللہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۲۰ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۲۵/۲۸ ج)

آدھی آستین والی قمیص میں نماز پڑھنا

سوال:- آدھی آستین والی قمیص پہن کر یا آدھی آستین چڑھا کر نماز پڑھنے سے نماز دُرست ہوگی یا نہیں، بغیر کسی مجبوری کے؟

جواب:- مکروہ ہے۔[۲]

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۲۱ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۳۲/۱۹ الف)

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۵۷۱ (طبع ایچ ایم سعید) (ویصف) الرجال ظاهره یعم العبید ثم الصبیان ثم الخنائی ثم النساء، وفی الشامیة تحته (قوله ظاهره یعم العبید) أشار به الی أن البلوغ مقدم علی الحریة لقوله صلی الله علیه وسلم: لیلینی منکم أولوا الأحلام والنهی. وفی الدر المختار أیضا ج:۱ ص:۶۵۶، ۶۵۷ (طبع ایچ ایم سعید) ویحرم ادخال صبیان ومجانین حیث غلب تنجیسهم والا فیکره وفی الشامیة .... والمراد بالحرمة کراهة التحریم ... والا فیکره أی تنزیها.

(۲) اس مسئلے سے متعلق تفصیل کے لئے حضرت والا دامت برکاتہم ہی کا مصدقہ، راقم مرتب کا فتویٰ ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

سوال:- اگر کوئی آدمی آستین چڑھا کر نماز پڑھے تو کیا یہ جائز ہے؟ کہنیاں کھلی ہوئی ہوں یا نہ کھلی ہوئی ہوں، دونوں صورتوں میں کیا حکم ہے؟

جواب:- اگر کہنیاں کھلی ہوئی ہوں تو اس طرح نماز پڑھنا مکروہ ہے، اور اس سے کم ہو تو اس میں اختلاف ہے، بعض کے نزدیک مکروہ نہیں، کیونکہ فقہی دلائل میں "مرفقین" "کہنیوں تک" کے الفاظ آئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے کم ہو تو مکروہ نہیں۔ وفی الدر المختار ج:۱ ص:۶۴۰ (طبع ایچ ایم سعید) وکره کفه أی رفعه ولو لتراب کمشمر کم أو ذیل وفی الشامیة وقید الکراهة فی الخلاصة والمنیة بأن یکون رافعًا کمیه الی المرفقین وظاهره أنه لا یکره الی ما دونهما.

(باقی اگلے صفحہ پر)

تصویر والے کمرے میں نماز پڑھنے کا حکم

سوال:- جس کمرے میں کسی مرد یا عورت کا فوٹو آویزاں ہو تو اس جگہ نماز ہو سکتی ہے یا نہیں؟

جواب:- جس مکان میں کسی ذی رُوح کی تصویر لگی یا لٹکی ہو اس میں نماز پڑھنا مکروہِ تحریمی ہے، اور سب سے زیادہ کراہت اس تصویر میں ہے جو نمازی کے سامنے جانبِ قبلہ میں ہو، پھر وہ جو نمازی کے سر پر معلق ہو، پھر وہ جو اس کے داہنے ہو، پھر وہ جو بائیں جانب ہو، اور سب سے کم کراہت اس میں ہے کہ نمازی کے پیچھے کسی دیوار وغیرہ میں ہو، اور اگر تصویر قدموں کے نیچے ہو تو اس وقت بھی بعض فقہاء کے نزدیک کراہت ہے اور بعض کے نزدیک نہیں ہے، لہٰذا پرہیز اس سے بھی کرنا چاہئے۔

کذا فی رد المحتار ج:۱ ص:۴۳۵، باب ما یفسد الصلوٰۃ ویکرہ فیھا۔ [۱] واللہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۲۲ھ

(فتویٰ نمبر ۲۵۹۶/۲۷ و)

محاذات کی دو صورتوں کی تفصیل اور حکم

سوال:- مرسلہ فتویٰ نمبر ۴۵/۳۵۱ محررہ مفتی محمد صابر صاحب مدظلہم بتاریخ ۱۲/۲۲/۱۳۸۷ھ میں، آنجناب نے جواب نمبر۲ میں تحریر فرمایا ہے کہ اگر بیوی اتفاقیہ میاں کے ساتھ نماز پڑھے اور مرد کے ٹخنے اور پنڈلی سے اپنے یہ اعضاء ذرا پیچھے کر کے کھڑی ہو تو کسی کی نماز فاسد نہیں ہوگی، یعنی ہو جائے

(گزشتہ سے پیوستہ)...... اور بعض حضرات کے نزدیک یہ صورت بھی مکروہ ہے، کیونکہ ان حضرات کے نزدیک آستین چڑھا کر نماز پڑھنا مطلقاً مکروہ ہے۔ وفی الشامیة وقید الکراهة فی الخلاصة والمنیة بأن یکون رافعا کمیه الی المرفقین وظاهره أنه لا یکره الی ما دونهما. قال فی البحر والظاهر الاطلاق لصدق کف الثوب علی الکل ونحوه فی الحلیة وکذا قال فی شرح المنیة الکبیر ان التقیید بالمرفقین اتفاقی قال وهذا لو شمرهما خارج الصلوٰة ثم شرع فیها کذلک وراجع أیضا خلاصة الفتاویٰ ج:۱ ص:۵۸. نیز دیکھئے: کفایت المفتی ج:۳ ص:۴۲۸ (طبع جدید دارالاشاعت) و امداد الاحکام ج:۱ ص:۵۶۱ و ۵۶۳، و امداد المفتین ص:۳۴۱، ۳۴۲۔

لہٰذا احتیاط اسی میں ہے کہ بلاضرورت آستین چڑھا کر نماز نہ پڑھی جائے اور اگر پہلے سے وضو وغیرہ کے لئے آستین چڑھائی ہوئی ہوں تو بہتر یہ ہے کہ عملِ قلیل سے نماز میں آستین نیچے کر لے، مثلاً کچھ رکوع، کچھ قومہ میں اور کچھ سجدہ میں نیچے کر لے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح	
بندہ محمد تقی عثمانی عفی عنہ	بندہ محمود اشرف غفر اللہ لہ	بندہ عبدالرؤف سکھروی	محمد زبیر حق نواز
۱۴۲۳/۷/۲۵ھ	۱۴۲۳/۷/۲۴ھ	۱۴۲۳/۷/۲۶ھ	دارالافتاء دارالعلوم کراچی ۱۴
			۱۴۲۳/۷/۲۳ھ

(۱) فی التنویر وشرحه الدر المختار ج:۱ ص:۶۴۸ و (کره) أن یکون فوق رأسه أو بین یدیه أو بحذائه یمنة أو یسرة أو محل سجوده (تمثال) .... واختلف فیما اذا کان التمثال خلفه، والأظهر الکراهة وفی الشامیة (الأظهر الکراهة) لکنها فیه أیسر، لأنه لا تعظیم فیه ولا تشبه معراج. وفی الدر المختار أیضا ج:۱ ص:۶۵۲ (لا یکره صلوٰة) علی بساط فیه تماثیل أن لم یسجد علیها) لما مرّ. وفی الشامیة تحته (قوله لما مر) علة لعدم الکراهة وهو کونها مهانة ح.

گی، لیکن بہشتی زیور میں یہ لکھا ہے کہ اگر بیوی میاں کے پیچھے نماز پڑھے تو بالکل پیچھے (ایک صف کے فاصلے پر) کھڑی ہو ورنہ اس کی نماز نہیں ہوگی اور مرد کی نماز بھی برباد ہوگی۔

دونوں صورتوں کی الگ الگ کیا نوعیت ہے کہ پہلی صورت میں عورت (ایک مقتدی کی طرح) صرف مرد کے ٹخنے اور پنڈلی سے ذرا پیچھے ہوکر نماز پڑھ سکتی ہے، اور بہشتی زیور کی رُو سے اسے کم از کم ایک صف کا فاصلہ چھوڑ کر کھڑا ہونا چاہئے؟

جواب:- محاذات کی صحیح تفسیر وہی ہے کہ عورت کا ٹخنہ اور پنڈلی مرد کے کسی عضو کے برابر ہو، لہٰذا اگر کوئی عورت مرد سے اتنے پیچھے کھڑی ہو کہ دونوں کے ٹخنے اور پنڈلی بالکل برابر میں نہیں رہتے، خواہ عورت کے پاؤں کا کوئی حصہ مرد کے پاؤں کے کسی حصے کے برابر میں ہو تو اصح قول کی بناء پر نماز فاسد نہیں ہوگی جس کی صورت یہ ہے:-...... عورت مرد

یہ صورت اصح قول کی بناء پر مفسد نہیں ہے، البتہ بعض فقہاءؒ نے ٹخنے اور پنڈلی کے بجائے پورے قدم کی محاذات کا اعتبار کیا ہے، لہٰذا ان کے نزدیک مذکورہ صورت مفسد ہے، اور جواز کی صورت ان کے نزدیک یہ ہے:-.................. مرد عورت

بہشتی زیور میں احتیاطاً اس آخری قول کو اختیار کر کے بالکل پیچھے کھڑے ہونے کا کہا گیا ہے، جس کا مطلب ایک صف پیچھے کھڑا ہونا نہیں ہے بلکہ اتنے پیچھے کھڑا ہونا ہے کہ عورت کے قدم کا کوئی حصہ مرد کے قدم کے کسی حصے کے برابر نہ ہو۔

قال الشامی عن الزیلعی: المعتبر فی المحاذات الساق والکعب فی الأصح، وبعضهم اعتبر القدم اهـ. فعلی قول البعض لو تأخرت عن الرجل ببعض القدم تفسد وان کان ساقها وکعبها متأخرًا عن ساقه وکعبه، وعلی الأصح لا تفسد وان کان بعض قدمها محاذیًا لبعض قدمه بأن کان أصابع قدمها عند کعبه مثلًا تأمل. (ثم قال بعد أسطر) .... المانع لیس محاذاة أی عضو منها لأی عضو منه، ولا محاذاة قدمه لأی عضو منها بل المانع محاذاة قدمها فقط لأی عضو منه.[1]

احتیاط بہرحال بہشتی زیور کے قول پر عمل کرنے میں ہے تاکہ باتفاق نماز دُرست ہوجائے، لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا بہشتی زیور کے قول پر عمل کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عورت ایک صف پیچھے کھڑی ہو بلکہ اس کا مطلب اتنے پیچھے کھڑا ہونا ہے کہ اس کے قدم کا کوئی حصہ مرد کے کسی عضو کے مقابل میں نہ آئے۔ **المرأة اذا صلت مع زوجها فی البیت ان کان قدمها بحذاء قدم الزوج لا**

(۱) فتاویٰ شامیة ج:۱ ص:۵۷۲، وکذا فی التاتارخانیة ج:۱ ص:۶۲۲، ۶۲۳.

تجوز صلاتها بالجماعه، وان کان قدماها خلف قدم الزوج الا أنها طويلة تقع رأس المرأة فی السجود قبل رأس الزوج جازت صلاتهما لأن العبرة للقدم۔ (شامی ج:۱ ص:۵۳۵)۔[1]

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۳۲۷/۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

برآمدے میں نماز پڑھنے میں کوئی کراہت نہیں

سوال:- بیرونِ مسجد برقی پنکھا لگا ہوا ہے، یعنی برآمدے میں گرمی کے دنوں میں امام صاحب باہر نماز پڑھاتے ہیں سوائے جمعہ کے دن کے، جمعہ محراب میں اندرون مسجد میں پڑھاتے ہیں۔ کیا اس میں کوئی کراہت ہے یا نہیں؟

جواب:- کوئی کراہت نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۶ھ
(فتویٰ نمبر ۲۰۶/۱۹ الف)

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی

بغیر سترہ کے نمازی کے آگے سے گزرنے کی تفصیل

سوال:- نمازی کے سامنے سے گزرنے کی جیسا کہ حدیث شریف میں سخت ممانعت آئی ہے، حسبِ ذیل صورتوں میں گزرنے والے کے لئے کیا حکم ہے؟

الف:- اگر نمازی بحالت قیام یا قومہ سجدہ گاہ پر نظر کئے ہوئے ہے تو ضرورت مند کتنا فاصلہ چھوڑ کر گزرے؟

ب:- اگر اس کی نظر بحالت مذکورہ سجدہ گاہ سے آگے پڑ رہی ہو؟

ج:- اگر نمازی رکوع یا سجدے میں ہے؟

د:- اس مسئلے میں چھوٹی اور بڑی مسجد کا الگ الگ کیا حکم ہے؟ اور کم از کم کتنی بڑی مسجد کو ''مسجد کبیر'' کہا جائے گا؟

جواب:- الف:- اگر مسجد چھوٹی سی ہے تو نمازی کے آگے سے بغیر سترہ کے بالکل نہیں

(۱) فتاوی شامية ج:۱ ص:۵۷۲ (طبع ایچ ایم سعید).

گزرنا چاہئے، اور اگر مسجد بڑی ہے یا

ب، ج:- کھلی جگہ میں نماز پڑھ رہا ہے تو اتنے آگے سے گزرنا جائز ہے کہ اگر نماز پڑھنے والا سجدے کی جگہ نظر رکھے تو اسے گزرنے والا نظر نہ آتا ہو، جو تقریباً سجدے کی جگہ سے دو گز کے فاصلے تک ہوتا ہے۔ رکوع، سجدہ، قیام، قومہ سب کا ایک ہی حکم ہے۔ اور قیام کی حالت میں اگر نماز پڑھنے والا سجدے کی جگہ سے آگے دیکھ رہا ہو تب بھی گزرنے کے لئے فاصلہ اتنا ہی معتبر ہوگا جو اُوپر بیان کیا گیا۔ لما فی رد المحتار: ومقابله ما صححه التمرتاشي وصاحب البدائع واختاره فخر الاسلام ورجحه في النهاية والفتح أنه قدر ما يقع بصره على المار لو صلّى بخشوع أي راميا ببصره الى موضع سجوده۔ (شامی)۔[1]

د:- تقریباً چالیس ہاتھ سے کم رقبے کی مسجد "چھوٹی" کہلائے گی، اور اس سے زائد بڑی۔

قال الشامیؒ: قوله ومسجد صغير هو أقل من ستين ذراعا، وقيل: من أربعين، وهو المختار كما أشار اليه في الجواهر. (قهستاني، شامي)۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۲۸ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

کندھوں تک بال بڑھا کر رکھنے والوں کی نماز ہوتی ہے یا نہیں؟

سوال:- جن لوگوں نے بال کندھوں تک بڑھا کر رکھے ہوئے ہیں تو کیا ان لوگوں کی نماز ہو جاتی ہے؟

جواب:- نماز تو ہو جاتی ہے، مگر ایسے بال رکھنا جس سے غیر مسلموں یا فساق سے مشابہت پیدا ہو، جائز نہیں۔[3]

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۱/۱۵ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۸/۲۸ الف)

(۱، ۲) رد المحتار باب ما يفسد الصلوٰة .... الخ. ج:۱ ص:۶۳۴ (طبع سعيد).

(۳) وفي سنن أبي داؤد، باب في لبس الشهرة ج:۲ ص:۲۰۳ (طبع ايج ايم سعيد) عن ابن عمر قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من تشبه بقوم فهو منهم. (محمد زبیر حق نواز)

﴿فصل فی القراءة و مسائل زلة القاری﴾

(نماز میں قراءت اور پڑھنے والے کی غلطیوں سے متعلق مسائل کا بیان)

سورۂ فاتحہ کے بعد "رَبّ اغفر لی" کہنا

سوال:- "وَلَا الضَّآلِّيْنَ" کے بعد "رَبِّ اغْفِرْ لِیْ" کہنا کیسا ہے؟

جواب:- "وَلَا الضَّآلِّيْنَ" کے بعد "امین"[1] کے سوا کوئی جملہ نصوص سے ثابت نہیں، اس لئے "امین" کے سوا کوئی جملہ نہ کہنا چاہئے۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۱۶ھ

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی بلند شہری

(فتویٰ نمبر ۱۴۲۷/ ۱۸ الف)

بیماری کی وجہ سے نماز میں الفاظ ادا نہ کر سکے تو کیا حکم ہے؟

سوال:- اگر کسی شخص کو ایسی بیماری یا کمزوری کی حالت ہو کہ بیٹھ کر نماز تو ادا کر سکے لیکن زبان سے الفاظ ادا کرنے سے سینے میں درد ہوتا ہو تو ایسی حالت میں وہ کس طرح الفاظ ادا کرے؟

جواب:- نماز کے لئے تو یہ ضروری ہے کہ جب تک ہونٹوں اور زبان کو حرکت دینے پر قدرت ہے، ان سے الفاظ ادا کئے جائیں خواہ معذوری کی وجہ سے اتنے آہستہ ہوں کہ خود بھی نہ سن سکے[2] اور اتنے آہستہ پڑھنے سے اُمید ہے کہ کوئی معتد بہ تکلیف بھی نہیں ہوگی، معمولی درد کو برداشت کرنا

---

(۱) وفي الصحيح للامام مسلمؒ ج:۱ ص:۱۷۶ باب التسميع والتحميد والتأمين (طبع قديمی كتب خانه) عن أبی هريرةؓ ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: اذا أمّن الامام فأمنوا فانه من وافق تأمينه تأمين الملٰئكة غفر له ما تقدم من ذنبه. قال ابن شهاب كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: امين.

(۲) وفی مجمع الأنهر ج: ص:۱۵۷ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) وأدنى المخافتة اسماع نفسه فقط وهو قول الهندوانی وعليه أكثر المشائخ (فی الصحيح) احتراز عما قيل: ان أدنى الجهر اسماع نفسه، وأدنى المخافتة تصحيح الحروف، وهو قول الكرخی، وصححه فی البدائع .... الخ. وفی الدر المختار ج:۱ ص:۵۳۴ وأدنى المخافتة اسماع نفسه، فی "الشامية" فشرط الهندوانی والفضلی لوجودها خروج صوت يصل الٰى أذنه وبه قال الشافعی، وشرط بشر المريسی وأحمد خروج الصوت من الفم وان لم يصل الى أذنه، لكن بشرط كونه مسموعا فی الجملة حتى لو أدنى أحد صماخه الٰى فيه يسمع، ولم يشترط الكرخی وأبوبكر البلخی السماع واكتفيا بتصحيح الحروف .... ثم انه اختار فی الفتح أن قول الهندوانی وبشر متحدان بناءً علٰى أن الظاهر سماعه .... (باقی اگلے صفحے پر)

چاہئے، البتہ عام ذکر واذکار دِل دِل میں بھی ادا کئے جاسکتے ہیں۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱۲/۳۰ھ
(فتویٰ نمبر ۳/۱۹ الف)

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

فاتحہ خلف الامام کا حکم

سوال:- کیا امام کے پیچھے الحمد للہ نہ پڑھنے سے نماز نہیں ہوتی؟

جواب:- حنفی مسلک میں امام کے پیچھے کسی قسم کی قراءت کرنا خواہ وہ سورۂ فاتحہ ہو یا بعد کی سورت، جائز نہیں ہے، لیکن اگر غلطی سے کوئی شخص پڑھ لے تو اس کی نماز ہوجاتی ہے، فاسد نہیں ہوتی۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۳/۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

ضؔ کا مخرج

سوال:- حرفِ ضاد بعض لوگ مشابہ بدال پڑھتے ہیں، اور بعض مشابہ بظاء، اور بعض ڈال پڑھتے ہیں، صحیح کون سا ہے؟

جواب:- ضاد، ایک مستقل حرف ہے، اس کا مخرج دال، ذال یا ظاء سب سے علیحدہ ہے،

(گزشتہ سے پیوستہ)......... بعد وجود الصوت اذا لم یکن مانع .... وذکر أن کلا من قولی الھندوانی والکرخی مصححان وان ما قالہ الھندوانی أصح وأرجح لاعتماد أکثر علمائنا علیہ وفی البحر الرائق ج:۱ ص:۳۳۶ (طبع ایچ ایم سعید) فذھب الکرخی الیٰ أن أدنی الجھر أن یسمع نفسہ وأدنی المخافتۃ تصحیح الحروف وفی البدائع ما قالہ الکرخی أقیس وأصح. نیز دیکھئے: منحۃ الخالق علیٰ ھامش البحر الرائق ج:۱ ص:۳۳۶ اور کوئی شخص امام کرخیؒ کے قول کے مطابق اگر صرف حروف کی صحیح ادائیگی کرے اگرچہ خود کو بھی سنائی نہ دے تب بھی اس کی نماز ہوجائے گی، تفصیل کے لئے دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۱۵۵۔

(۱) اس مسئلے کی مکمل تفصیل کے لئے درج ذیل کتب ملاحظہ فرمائیں:
۱:- امام الکلام فی القراءۃ خلف الامام، از علامہ لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ۔
۲:- الدلیل المحکم فی ترک القرائۃ للمؤتم، از حضرت مولانا نانوتوی قدس سرہٗ۔
۳:- ھدیۃ المعتدی فی قرائۃ المقتدی (تالیفاتِ رشیدیہ، ادارۂ اسلامیات)، از حضرت گنگوہی رحمہ اللہ۔
۴:- الدلیل القوی علیٰ ترک القرائۃ للمقتدی، از محدث احمد علی سہارنپوری قدس اللہ سرہٗ۔
۵:- فاتحۃ الکلام فی القرائۃ خلف الامام، از حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی قدس سرہٗ۔
۶:- أحسن الکلام فی ترک القرائۃ خلف الامام، از حضرت مولانا سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم۔ (محمد زبیر)

جو شخص ضاد کو اپنے اصلی مخرج سے ادا کرنے پر قادر ہو اس کے لئے اسے دال، ذال، یا ظاء پڑھنا جائز نہیں، اور جو شخص اس پر قادر نہ ہو اسے کسی ماہر قاری سے مشق کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، اور جب تک اس کوشش میں کامیاب نہ ہو اسے ظاء کے مشابہ پڑھنا دال کے مشابہ پڑھنے سے بہتر ہے، لیکن نماز دونوں صورتوں میں ہو جائے گی۔[1] واللہ سبحانہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۰/۱۲/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۱/۱۸ الف)

ضؔ کا مخرج

سوال:- "وَلَا الضَّآلِّیْنَ" جس کا مخرج زبان کا کنارہ ہے، ڈاڑھوں کے ساتھ ہے، کیا "ولا الظالین" کے مشابہ پڑھ سکتے ہیں یا "ولا الدالین" موٹا کر کے پڑھ سکتے ہیں؟

جواب:- ضاد کا مخرج، دال اور ظاء دونوں سے الگ ہے، اور وہ یہ کہ زبان کا کنارہ دائیں بائیں دونوں ڈاڑھوں کو چھولے، اس کی آواز بھی دال اور ظاء سے الگ ہے، لیکن ظاء کے ساتھ اس کی مشابہت دال کی بہ نسبت زیادہ ہے۔[2] واللہ اعلم

۱۳۹۹/۱۰/۱ھ
(فتویٰ نمبر ۳۰/۱۲۸۰ د)

"وَلَا الْمُشْرِکِیْنَ" کے بجائے "وَالْمُشْرِکِیْنَ" پڑھنے کا حکم

سوال:- زید نے نماز میں قراءت کی، اور قراءت میں آیت: "مَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِکِیْنَ" (پارہ نمبر۱، آیت نمبر۱۰۴، سورۂ بقرہ) میں زید نے "وَلَا الْمُشْرِکِیْنَ" کی جگہ "وَالْمُشْرِکِیْنَ" پڑھا، کیا اس سے نماز ادا ہوگئی یا نہیں؟

جواب:- مذکورہ صورت میں نماز ہوگئی،[3] دُہرانے کی ضرورت نہیں۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۲/۲۴ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۲۵۳ ب)

(۱، ۲) وفی الھندیۃ ج:۱ ص:۷۹ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ) وان کان لا یمکن الفصل بین الحرفین الا بمشقۃ کالظا مع الضاد .... اختلف المشائخ، قال أکثرھم لا تفسد صلاتہ، ھکذا فی فتاویٰ قاضی خان وکثیر من المشائخ افتوا بہ. نیز ضؔ کے مخرج سے متعلق تفصیل کے لئے مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ صاحب کا رسالہ "رفع التضاد عن حکم الضاد" جواہر الفقہ ج:۱ ص:۳۲۵ ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) وفی الھندیۃ ج:۱ ص:۷۹ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ) ومنھا حذف حرف، ان کان الحذف علی سبیل الایجاز والترخیم فان وجد شرائطہ .... لا تفسد صلاتہ، وان لم یکن علی وجہ الایجاز والترخیم فان کان لا یغیّر المعنی لا تفسد صلاتہ .... الخ.

تین چھوٹی آیات کے برابر آدھی آیت پڑھنے سے نماز ہوجائے گی

سوال:- نماز میں قرآن کی ایسی بڑی آدھی آیت جو چھوٹی تین آیتوں کے برابر ہو، اسے پڑھنے سے نماز ہوگئی یا نہیں؟ اگر نہیں ہوئی تو کیا اعادہ کرنا ہوگا؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں نماز ہوگئی، اعادے کی ضرورت نہیں۔ لأن نصف الآية الطويلة اذا كان يزيد علىٰ ثلاث ايات قصار يصح علىٰ قولهما، فعلىٰ قول أبي حنيفةؒ المكتفي بالآية أولىٰ، كذا في رد المحتار۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۲۶ھ

(فتویٰ نمبر ۹۹۵/۲۸ ج)

نماز میں مجہول قراءت کرنا

سوال ۱:- لورالائی کی جامع مسجد کا امام مجہول پڑھتا ہے، اس لئے کسی کی نماز نہیں ہوتی، شرعاً کیا حکم ہے؟ ۲:- ض کی جگہ ڈ پڑھتا ہے، اس کا حکم کیا ہے؟ ۳:- اور اس مسئلے میں اگر کسی امام صاحب نے غلط مسئلہ بتایا ہو تو اس کے پیچھے نماز جائز ہوگی یا نہیں؟

جواب ۱:- مجہول پڑھنا غلط ہے، اس کی اصلاح کی کوشش ضروری ہے، مگر اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی، اگر کوئی اور حافظ نہ ملتا ہو تو مجبوراً اسی کے پیچھے پڑھ لیں۔

۲:- ضاد کو صحیح مخرج سے نکالنے کی کوشش بھی واجب ہے، تاہم جس شخص سے کوشش کے باوجود صحیح مخرج سے نہ نکلے اس کی نماز صحیح قول کی بناء پر ہوجاتی ہے۔[2] جن امام صاحب نے اس کے خلاف مسئلہ بتایا انہوں نے غلط کہا، لیکن محض اس بناء پر ان کے پیچھے نماز فاسد نہیں ہوتی۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۱/۹/۱۸ھ

(فتویٰ نمبر ۹۶۹/۲۸ ج)

---

(۱) رد المحتار ج:۱ ص:۵۳۷ (طبع سعید) وفي الشامية أيضًا ج:۱ ص:۵۳۸ لو قرأ اية طويلة في الركعتين كاية الكرسي أو اية المداينة البعض في ركعة والبعض في ركعة اختلفوا فيه على قول أبي حنيفة قيل لا يجوز لأنه ما قرأ اية تامة في كل ركعة وعامتهم على أنه يجوز. وكذا في الهندية ج:۱ ص:۶۹ (طبع رشيديه كوئٹه).
نیز دیکھئے: امداد الاحکام ج:۱ ص:۵۹۰۔

(۲) وفي غنية المتملي شرح المنية ص:۴۸۲ وان لم يكن الا بمشقة كالظاء مع الضاد، والصاد مع السين، والطاء مع التاء فقد اختلفوا، فأكثرهم على عدم الفساد لعموم البلوى. وكذا في الهندية ج:۱ ص:۷۹. نیز دیکھئے: عزیز الفتاویٰ ص:۲۳۷، نیز ض کے مخرج سے متعلق تفصیل کے لئے جواہر الفقہ ج:۱ ص:۳۲۵ ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر حق نواز)

بیچ میں چھوٹی سورت چھوڑ کر قراءت کرنا

سوال:- امام صاحب وتروں میں رمضان المبارک کے اندر پہلی رکعت میں "قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ"، دُوسری میں "اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ" اور تیسری میں سورۂ اِخلاص پڑھتے ہیں، اور "تَبَّتْ یَدَا" چھوڑ دیتے ہیں، یہ کہاں تک دُرست ہے؟

جواب:- اس طرح بیچ میں کوئی سورت چھوڑ کر قراءت کرنا مکروہ ہے، بشرطیکہ قصداً ایسا کیا گیا ہو، اور سہواً ہو تو کراہت بھی نہیں ہے، اور نماز ہر صورت میں ہوگئی، نہ سجدۂ سہو واجب ہے، نہ اعادہ۔

لما فی الدر المختار: ویکرہ الفصل بسورۃ قصیرۃ.[1]

وفی رد المحتار: الفصل بالقصیرۃ انما یکرہ اذا کان عن قصد، فلو سھوًا فلا، کما فی شرح المنیۃ (شامی قبیل باب الامامۃ ج:۱ ص:۳۶۷)۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۰/۲۴ھ
(فتویٰ نمبر ۲۴۴۸/۲۷ و)

۱:- فجر کی پہلی رکعت کو دُوسری رکعت سے طویل کرنا
۲:- قراءت میں متعدّد غلطیوں کا حکم

سوال۱:- امامِ مسجد نے فجر کی جماعت میں پہلی رکعت میں سورۂ مزمل کی چھ آیات از: "یَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ" الی "فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّہٖ سَبِیْلًا" پڑھیں، دُوسری رکعت میں دُوسرا رُکوع سورۂ مذکور کا جو ایک لمبی آیت ہے پڑھ کر سجدہ کیا، کیا نماز ہوگئی؟ لوگ کہتے ہیں کہ پہلی رکعت سے دُوسری رکعت میں لمبی سورت نہیں پڑھنی چاہئے، اس کی کیا حقیقت ہے؟

۲:- امام صاحب نے پہلی رکعت میں سورۂ والعصر پڑھتے ہوئے: "وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ" کی جگہ سہواً "فَلَھُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ" پڑھا، جب خیال آیا تو "اَلَمْ تَرَ کَیْفَ" پڑھنا شروع کردیا، پھر دُوسری رکعت میں سورۂ قریش کی تلاوت کی سجدۂ سہو کرکے تمام ختم کرلی، یہ نماز دُرست ہوئی یا نہیں؟

جواب۱:- فجر کی نماز میں پہلی رکعت کو دُوسری رکعت سے زیادہ طویل کرنا مستحب ہے اور اس کے برعکس مکروہِ تنزیہی ہے، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں جو امام صاحب نے پہلی رکعت میں مختصر اور

---

(۱) الدر المختار ج:۱ ص:۵۴۶ (طبع ایچ ایم سعید)۔
(۲) شامیۃ ج:۱ ص:۵۴۷ (طبع سعید)۔

دُوسری رکعت میں اس کے مقابلے میں طویل قراءت کی اس سے مکروہِ تنزیہی کا ارتکاب ہوا، لیکن نماز صحیح ہوگئی۔

لما فی الدر المختار: (وتطال أولی الفجر علی ثانیتها) (واطالة الثانیة علی الأولیٰ یکره) تنزیها (اجماعًا ان بثلاث ایات) ان تقاربت طولا وقصرًا، والا اعتبر الحروف والکلمات، واعتبر الحلبی فحش الطول لا عدد الأیات۔ (شامی ج:۱ ص:۳۶۴)۔[۱]

۲:- نماز تو صحیح ہوگئی، لیکن امام صاحب نے چند غلطیاں کیں، ایک تو جب انہیں یاد آیا تھا تو سورۂ عصر ہی کی تکمیل کرنی چاہئے تھی انہوں نے اس کو ادھورا چھوڑ دیا، دُوسرے سورۂ عصر کے بعد سورۂ فیل شروع کردی، اور اس طرح ایک سورت یعنی سورۂ ہمزہ کو بیچ میں چھوڑ کر قراءت کی، یہ بھی مکروہ ہے۔

أما فی رکعة فیکره الجمع بین سورتین بینهما سور أو سورة۔ (شامی ج:۱ ص:۳۶۷)۔[۲]

تیسرے ان غلطیوں پر سجدۂ سہو کیا، حالانکہ ان صورتوں میں سجدۂ سہو نہیں ہے، بہرحال نماز ہوگئی۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۷۲ ج)

---

(۱) الدر المختار ج:۱ ص:۵۴۱، ۵۴۲ (طبع ایچ ایم سعید). وفی ملتقی الأبحر مع مجمع الأنهر ج:۱ ص:۱۵۹ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) وتطال الأولیٰ علی الثانیة فی الفجر فقط، وعند محمد فی الکل، وفی مجمع الأنهر تحته: بیان للسنة، وهذا یعنی اطالة القراءة فی الرکعة الأولیٰ علی الثانیة فی الفجر متفق علیه للتوارث، ولما فیه من اعانة المؤمنین علیٰ ادراک فضیلة الجماعة، لأنه وقت نوم وغفلة. وفی الهندیة ج:۱ ص:۷۸ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه) واطالة القراءة فی الرکعة الأولی علی الثانیة من الفجر مسنونة بالاجماع.

(۲) شامیة ج:۱ ص:۵۴۶ (طبع ایچ ایم سعید) وفی مراقی الفلاح ج:۱ ص:۴۷۵ و ۴۷۷ (طبع مکتبة علم الحدیث دمشق) ویکره تکرار السورة فی رکعة واحدة من الفرض .... والجمع بین سورتین بینهما سور أو سورة. وفی حاشیة الطحطاوی علی مراقی الفلاح (قوله والجمع بین سورتین .... الخ) أی فی رکعة واحدة لما فیه من شبهة التفضیل والهجر (قوله لا یکره هذا فی النوافل) یعنی القراءة منکوسا والفصل والجمع وهذا کله فی الفرائض. (ص:۲۱۲). وفی الهندیة ج:۱ ص:۷۸ (مکتبه رشیدیه، کوئٹه) واذا جمع بین سورتین بینهما سور أو سورة واحدة فی رکعة واحدة یکره .... الخ.

﴿فصل فی السنن والنوافل﴾

(سنن اور نوافل نمازوں کے بیان میں)

نمازِ اِشراق و چاشت دو، دو رکعت کر کے پڑھ سکتے ہیں

سوال:- نمازِ اِشراق و چاشت۔۔۔ دو رکعت کر کے پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب:- پڑھ سکتے ہیں، البتہ چاشت کی نماز چار رکعت پڑھنا بہتر ہے۔ واللہ اعلم

الجواب صحیح　　　احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

بندہ محمد شفیع　　　۱۳۸۸/۷/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۶۲/۷/۱۹ الف)

تحیۃ المسجد واجب ہے یا مستحب؟

سوال:- بخاری شریف کی ایک حدیث کا حوالہ دے کر تحیۃ المسجد کی دو رکعت نماز، بیٹھنے سے پہلے ادا کرنے کے لئے زور دے کر مطالبہ کیا جاتا ہے کہ نہ ادا کرنے پر سخت گناہ کا مرتکب قرار پائے گا، یعنی تقریباً واجب کا درجہ دیا جاتا ہے، اہل السنۃ والجماعت کا اس پر کیا عمل اور فتویٰ ہے؟

جواب:- ”تحیۃ المسجد“ پڑھنا مستحب ہے، اس کے چھوڑنے والے کو گنہگار نہیں کہا جاسکتا، حدیث کا مطلب صحابہ رضی اللہ عنہم سے زیادہ کون سمجھ سکتا ہے؟ اور صحابہ رضی اللہ عنہم تحیۃ المسجد کو واجب نہیں سمجھتے تھے۔ بخاری شریف کی حدیث میں اَمر اِستحباب کے لئے ہے۔ قال ابن بطال: اتفق أئمة الفتویٰ علیٰ أنه محمول علی الندب، والارشادِ مع استحبابهم الركوع لكل من دخل المسجد لما روی أن كبار أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم يدخلون المسجد ثم يخرجون ولا يصلون۔ (حاشیہ بخاری ج:۱ ص:۶۳)۔[1]　　　واللہ اعلم

الجواب صحیح　　　احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ　　　۱۳۸۸/۱/۱۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۹۵/۱۹ الف)

---

(۱) (طبع قدیمی کتب خانہ)، وفي التنوير مع شرحه باب الوتر مطلب تحية المسجد ج:۲ ص:۱۸ (طبع ایچ ایم سعید) (ويُسن تحية) رب المسجد، وهي ركعتان .... الخ. وفي الشامية .... والحاصل أن المطلوب من داخل المسجد أن يصلي فيه ليكون ذلك تحية لربه تعالىٰ .... الخ.

سنتِ مؤکدہ کا ترک

سوال:- سنت نمازوں میں سنتِ مؤکدہ کے جان بوجھ کر نہ ادا کرنے پر عذاب وسزا سے متعلق احادیث یا ان کا حوالہ لکھ دیں۔

جواب:- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس پر مداومت فرمانا، اس کے ترک کے ناجائز ہونے کی کافی دلیل ہے، اور ترکِ سنت پر جو وعیدیں حدیث میں آئی ہیں وہ سب اس کی دلیل ہیں۔[1]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۱۷ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۹۵/۱۹ الف)

جمعہ کی سنتوں کی تعداد

سوال:- ظہر اور جمعہ کی کل کتنی رکعتیں ہیں؟ کیا ان کی تعداد میں ائمہ کا اختلاف ہے؟

جواب:- جہاں تک فرض نماز کی رکعتوں کا تعلق ہے، ان کی تعداد میں کوئی اختلاف نہیں ہے، سب کے نزدیک ظہر کی چار رکعتیں اور جمعہ کی دو رکعتیں ہوتی ہیں۔ ظہر کی سنتوں کے بارے میں بھی حنفیہ کے نزدیک اتنی بات متفق علیہ ہے کہ ان کی تعداد چھ ہے، چار فرضوں سے پہلے اور دو فرضوں کے بعد۔

اب جمعہ کا معاملہ رہ جاتا ہے، امام ابوحنیفہؒ کا مشہور مذہب اس معاملے میں یہ ہے کہ جمعہ میں چار رکعتیں فرض نماز سے پہلے اور چار رکعتیں فرض نماز کے بعد سنتِ مؤکدہ ہیں۔[2] ابنِ ماجہ وغیرہ کی

---

(۱) وفی جامع الترمذی باب ما جاء فیمن صلی فی یوم ولیلة ثنتی عشرة رکعة من السنة ج:۱ ص:۹۴ (طبع ایچ ایم سعید) عن عائشة رضی اللہ عنها قالت: قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم: من ثابر علی ثنتی عشر رکعة من الفجر السنة بنی اللہ له بیتًا فی الجنة، أربع رکعات قبل الظهر ورکعتین بعدها ورکعتین بعد المغرب ورکعتین بعد العشاء ورکعتین قبل الفجر. وفی الشامیة کتاب الطهارة مطلب فی السنة وتعریفها ج:۱ ص:۱۰۴ (طبع ایچ ایم سعید) الذی یظهر من کلام أهل المذهب أن الاثم منوط بترک الواجب أو السنة المؤکدة علی الصحیح لتصریحهم بأن من ترک سنن الصلوات الخمس قیل لا یأثم والصحیح أنه یأثم. وفی البحر الرائق ج:۲ ص:۴۹ (طبع ایچ ایم سعید) رجل ترک سنن الصلوات الخمس ان لم یر السنن حقا فقد کفر لأنه ترک استخفافا وان رای حقا منهم من قال لا یأثم والصحیح انه یأثم لأنه جاء الوعید بالترک اھ. نیز دیکھئے: امداد الاحکام ج:۱ ص:۶۰۹۔

(۲) عن سهل عن أبیه عن أبی هریرة قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم: اذا صلّی أحدکم الجمعة فلیصل بعدها أربعا. رواہ مسلم ج:۱ ص:۲۸۸. وفی الجامع للامام الترمذیؒ وروی عن عبداللہ بن مسعودؓ انه کان یصلی قبل الجمعة أربعًا وبعدها أربعًا .... الخ. ج:۱ ص:۶۹. وفی الشرح الکبیر ص:۳۸۸ السنة قبل الجمعة أربع وبعدها أربع، اما الأربع بعدها فلما روی مسلم عن أبی هریرة قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم: اذا صلیتم بعد الجمعة فصلوا أربعا. وفی روایة للجماعة الا البخاری: اذا صلی أحدکم الجمعة فلیصل بعدها أربعا. وفی البحر الرائق ج:۲ ص:۴۹ باب النوافل والدلیل علی استنان الأربع قبل الجمعة ما رواہ مسلم مرفوعا........

(باقی اگلے صفحے پر)

بعض احادیث اسی کی تائید کرتی ہیں (رد المحتار ج:۱ ص:۶۳۰، استنبول)[1]۔ لیکن حنفیہ ہی کے بعض مشائخ کا یہ کہنا ہے کہ فرضوں کے بعد ظہر کی طرح صرف دو رکعتیں مسنون ہیں (فتح القدیر ج:۱ ص:۳۱۶)[2]۔

امام ابویوسفؒ جمعہ کے بعد چھ رکعتوں کو سنت قرار دیتے ہیں[3]، حضرت علیؓ سے بھی ایسا ہی منقول ہے[4]۔ اسی وجہ سے متاخرین علماء نے اس پر فتویٰ دیا ہے کہ جمعہ کے بعد چھ رکعتیں پڑھنی چاہئیں، پہلے چار، پھر دو، تاکہ تمام فقہاء کے مذہب کے مطابق سنت ادا ہوجائے، شیخ ابراہیم حلبیؒ ''شرح منیہ'' میں فرماتے ہیں: ''والأفضل أن یصلی أربعًا ثم رکعتین للخروج عن الخلاف۔''

افضل یہ ہے کہ پہلے چار رکعتیں پڑھی جائیں، پھر دو رکعتیں، تاکہ اختلاف باقی نہ رہے۔

(غنیۃ المتملی ص:۳۷۳، مجتبائی ۱۳۳۳ھ)[5]۔

واللہ سبحانہ اعلم

۲۵؍ربیع الاول ۱۳۸۷ھ[6]

(گزشتہ سے پیوستہ)...... من کان مصلیاً قبل الجمعۃ فلیصل أربعًا، مع ما رواہ ابن ماجۃ عن ابن عباسؓ قال: کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یرکع من قبل الجمعۃ أربعًا لا یفصل في شئ منھن۔ وعلی استنان الأربع بعدھا ما فی صحیح مسلم عن أبی ھریرۃ مرفوعًا: اذا صلّی أحدکم الجمعۃ فلیصل بعدھا أربعًا، وفي روایۃ: اذا صلیتم بعد الجمعۃ فصلوا أربعًا۔ وفی بدائع الصنائع ج:۱ ص:۲۸۵ (الصلوٰۃ المسنونۃ) واما السنۃ قبل الجمعۃ وبعدھا فقد ذکر فی الأصل وأربع قبل الجمعۃ وأربع بعدھا۔

(۱) فتاوی شامیۃ ج:۲ ص:۱۲، ۱۳ (طبع ایچ ایم سعید)۔ (۲) فتح القدیر ج:۱ ص:۳۸۶ (مکتبہ رشیدیہ)۔

(۳) وفی غنیۃ المتملی ص:۳۸۹ (طبع سہیل اکیڈمی لاہور) وعند أبی یوسفؒ السنۃ بعد الجمعۃ ست رکعات وھو مروی عن علیؓ۔ وفی البحر الرائق ج:۲ ص:۴۹ باب النوافل وعن أبي یوسفؒ انہ ینبغی ان یصلی أربعًا ثم رکعتین، وفی منحۃ الخالق علی ھامش البحر الرائق ج:۲ ص:۴۹ (قولہ وعن أبی یوسفؒ) قال فی الذخیرۃ وعن علی رضی اللہ عنہ یصلی ستًا، رکعتین ثم أربعًا، وعنہ روایۃ أخری انہ یصلی بعدھا ستًا أربعًا ثم رکعتین وبہ أخذ أبویوسفؒ والطحاویؒ ..... الخ۔
وفی فتح القدیر ج:۲ ص:۳۹ قبیل باب صلاۃ العیدین ..... أن السنۃ بعدھا ست وھو قول أبی یوسف ..... الخ۔

(۴) عن أبی عبدالرحمٰن عن علی رضی اللہ عنہ أنہ قال: من کان مصلیًا بعد الجمعۃ فلیصل ستًا، أخرجہ الطحاوی (کتاب الصلوٰۃ، باب التطوع بعد الجمعۃ ج:۲ ص:۲۳۳)۔ وفیہ أیضًا: وعن أبی عبدالرحمٰن قال: علّم أن یصلّوا بعد الجمعۃ أربعًا فلما جاء علی ابن أبی طالب رضی اللہ عنہ علّمھم أن یصلّوا ستًا۔ اھ۔ وفی الجامع للامام الترمذی ج:۱ ص:۴۹ وروی عن عبداللہ بن مسعود أنہ کان یصلی قبل الجمعۃ أربعًا وبعدھا أربعًا، وروی عن علی بن أبی طالب أنہ أمر أن یصلی بعد الجمعۃ رکعتین ثم أربعًا وعن أبی عبدالرحمٰن السلمی قال: قدم علینا عبداللہ رضی اللہ عنہ فکان یصلی بعد الجمعۃ أربعًا فقدم بعدہ علی رضی اللہ عنہ فکان اذا صلی الجمعۃ صلی بعدھا رکعتین وأربعًا فاعجبنا فعل علی رضی اللہ عنہ فاخترناہ، رواہ الطحاوی باب التطوع، بعد الجمعۃ ج:۱ ص:۲۳۳، وفی آثار السنن اسنادہ صحیح ص:۳۰۲۔

(۵) وفی غنیۃ المتملی ص:۳۸۹ (طبع سہیل اکیڈمی لاہور) والأفضل أن یصلی أربعًا ثم رکعتین للخروج عن الخلاف۔ وفی البحر الرائق ج:۲ ص:۴۹ باب النوافل، وفی الذخیرۃ والتجنیس وکثیر من مشائخنا علی قول أبی یوسف وفی منیۃ المصلی والأفضل عندنا أن یصلی أربعًا ثم رکعتین۔ وفی منحۃ الخالق علی ھامش البحر الرائق ج:۲ ص:۴۹ (قولہ وعن أبی یوسف) قال فی الذخیرۃ وعن علیؓ أنہ یصلی ستًا، رکعتین ثم أربعًا۔ وعنہ روایۃ أخری أنہ یصلی بعدھا ستًا، أربعًا ثم رکعتین، وبہ أخذ أبو یوسف والطحاوی وکثیر من المشائخ رحمھم اللہ تعالیٰ، وعلی ھذا قال شمس الأئمۃ الحلوانیؒ الأصل ان یصلی أربعًا ثم رکعتین فقد أشار الی أنہ مخیر بین تقدیم الأربع وبین تقدیم المثنی، ولکن الأفضل تقدیم الأربع کیلا یصیر متطوعا بعد الفرض مثلھا۔ وفی فتح القدیر ج:۲ ص:۳۹ قبیل باب صلوٰۃ العیدین ..... فھذا البحث یفید أن السنۃ بعدھا ست وھو قول أبی یوسف وقیل قولھما۔

(۶) یہ فتویٰ ''البلاغ'' کے شمارہ ربیع الثانی ۱۳۸۷ھ سے لیا گیا ہے۔ (محمد زبیر حق نواز)

۱:- جمعہ کی سنتوں کی تعداد

۲:- سنتِ غیر مؤکدہ پڑھنے کا طریقہ

سوال ۱:- جمعہ کے بعد کتنی سنتیں پڑھنی چاہئیں؟

۲:- سنتِ غیر مؤکدہ کس طرح پڑھنی چاہئے؟ اور اس میں کیا پڑھیں؟

جواب ۱:- جمعہ کے بعد چھ رکعات مسنون ہیں،(۱) پہلے چار، پھر دو پڑھیں تو بہتر ہے،(۲) اور اس کے برعکس بھی جائز ہے۔

۲:- سنتِ غیر مؤکدہ کا کوئی الگ طریقہ نہیں، نہ کوئی خاص قراءت مقرّر ہے، بلکہ اور نمازوں ہی کی طرح پڑھی جائے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۱۵۶/۲۸ الف)

صبحِ صادق اور فجر کے بعد نوافل پڑھنے کا حکم

سوال:- ایک صاحب کہتے ہیں کہ صبحِ صادق کے بعد سے فجر کی سنتیں اور فرض پڑھنے تک وقفے میں کوئی نماز نفل وغیرہ نہیں پڑھی جاسکتی۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے کہ فجر کی نماز پڑھنے کے بعد طلوعِ آفتاب تک اور عصر و مغرب کے درمیان یا سورج نکلتے وقت تک، اور نصف النہار کے وقت نماز جائز نہیں ہے، باقی اوقات میں جائز ہے۔

جواب:- ان صاحب نے دُرست کہا ہے، فجر کی نماز کے بعد تو نوافل پڑھنا ناجائز ہے، صبحِ صادق کے بعد بھی سوائے فجر کی دوسنتوں کے کوئی اور نفل پڑھنا جائز نہیں۔

کما فی الدر المختار: وکذا الحکم من کراھة نفل وواجب لغیرہ لا فرض وواجب لعینه بعد طلوع فجر سوی سنته لشغل الوقت به تقدیرا. (شامی ج:۱ ص:۲۵۱)(۳)۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۲/۲۱ھ

سنتِ مؤکدہ کو بلاعذر ترک کرنا

سوال:- عمر کہتا ہے کہ دن کی پانچ نمازوں کے فرائض پورے کرلئے جائیں تو یہی کافی

(۱، ۲) تفصیل کے لئے سابقہ فتویٰ اور اس کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) الدر المختار کتاب الصلوٰۃ ج:۱ ص:۳۷۵ (طبع ایچ ایم سعید)۔ نیز دیکھئے: کفایت المفتی ج:۳ ص:۳۲۴ (جدید ایڈیشن دارالاشاعت)۔ (مرتب عفی عنہ)

ہے، باقی سنتِ مؤکدہ وغیرہ ادا نہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیا عمر کا یہ خیال دُرست ہے؟

جواب:- عمر کا کہنا غلط ہے، سنتِ مؤکدہ کو مستقل طور پر چھوڑے رکھنا سخت گناہ ہے۔[1]

واللہ اعلم

۱۴۰۹/۱/۳۰ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲۴/۴۰ الف)

زوال سے پہلے جمعہ کی سنتیں پڑھنا

سوال:- مسئلہ مسئولہ فتویٰ نمبر ۲۶۰ جلد ۲۸ الف سے متعلق یہ عرض ہے کہ اگر حنفی مسلک والے انتہائے زوال سے قبل چار رکعت جمعہ پڑھ لیں کہ کبھی پڑھتے ہیں تو کیا ان کی سنتیں ادا ہو جائیں گی؟ دُوسری بات یہ بھی واضح کریں کہ اگر ان سنتوں کو بعد میں ادا کیا جائے تو فرضوں سے متصل ادا کیا جائے یا بقیہ نماز کی ترتیب قائم رکھتے ہوئے یہ بعد میں ادا کی جائیں؟

جواب:- زوال سے پہلے جمعہ کی سنتیں ادا نہ ہوں گی، فرض کے بعد ادا ہو جائیں گی[2]، اور اس میں بہتر یہ ہے کہ پہلے جمعہ کے بعد والی چھ سنتیں پڑھیں، اس کے بعد پہلے والی سنتیں ادا کی جائیں[3]، لیکن اگر برعکس کرلیا تو بھی جائز ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۱۲ھ

صلوٰۃ التسبیح کی جماعت کا حکم

سوال:- صلوٰۃ التسبیح شعبان کی پندرھویں کو باجماعت پڑھنے کا ہمارا ارادہ ہو رہا ہے، یہ صحیح ہے یا نہیں؟

جواب:- صلوٰۃ التسبیح نفلی نماز ہے، اور اس کی جماعت حنفیہ کے مسلک میں مکروہِ تحریمی ہے،

---

(۱) في الهندية ج:۱ ص:۱۱۲ رجل ترک سنن الصلاة ان لم ير السنن حقا فقد كفر، لأنه تركها استخفافا، وان راها حقاً فالصحيح انه يأثم، لأنه جاء الوعيد بالترک، كذا في محيط السرخسي. وفي البحر الرائق ج:۲ ص:۴۹ (طبع ایچ ایم سعید) رجل ترک سنن الصلوات الخمس ان لم ير السنن حقا فقد كفر، لأنه ترک استخفافا، وان رای حقا منهم من قال لا يأثم والصحيح انه يأثم لأنه جاء الوعيد بالترک. وكذا في الشامية ج:۱ ص:۱۰۴ (طبع ایچ ایم سعید).

(۲) في الدر المختار، باب ادراک الفريضة ج:۲ ص:۵۸ (طبع سعيد) .... بخلاف سنة الظهر، وكذا الجمعة، فانه ان خاف فوت ركعة يتركها ويقتدي، ثم يأتي بها على انها سنة في وقته، أي الظهر قبل شفعه عند محمد، وبه يفتى.

(۳) وفي الشامية، باب ادراک الفريضة ج:۲ ص:۵۹ (طبع سعيد) أقول وعليه المتون لكن رجح في الفتح تقديم الركعتين، قال في الامداد وفي فتاوى العتابي انه المختار وفي مبسوط شيخ الاسلام انه الأصح لحديث عائشة أنه عليه الصلوة والسلام كان اذا فاتته الأربع قبل الظهر يصليهن بعد الركعتين، وهو قول أبي حنيفة وكذا في جامع قاضي خان وكذا في غنية المستملي ص:۳۹۸ (طبع سهيل اكيڈمی لاهور).

لہٰذا یہ نماز تنہا پڑھنی چاہئے۔[۱]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۵/۱۰/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۱۷۰۸/۳۰ د)

تہجد کی نیت کس طرح کریں؟

سوال:- تہجد کی نیت نفل کی ہوگی یا سنت کی؟

جواب:- نمازِ تہجد میں نفل کی نیت کی جائے گی۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۷/۲ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ
۱۳۸۸/۷/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۷۶۲/۱۹ الف)

شبِ قدر کی نوافل کا طریقہ

سوال:- مؤدّبانہ گزارش ہے کہ ہم آپ سے ایک مسئلے کے بارے میں فتویٰ حاصل کرنا چاہتے ہیں، اس درخواست کے ساتھ جو پرچہ منسلک ہے اس میں لیلۃ القدر کے نوافل کے بارے میں ہماری مسجد (مسجد رحمانیہ) کے امام صاحب نے بتایا ہے کہ یہ طریقۂ نوافل غلط ہے، اور کہیں حدیث میں لیلۃ القدر کے نوافل کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ لہٰذا ہم آپ سے التماس کرتے ہیں کہ آپ ہم کو شریعت کی رُو سے صحیح طریقے سے آگاہ فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔

جواب:- منسلکہ اشتہار[۲] میں شبِ قدر کی نوافل کا جو طریقہ لکھا ہے وہ فقہ و حدیث کی مستند و معروف کتابوں میں کہیں نظر سے نہیں گزرا، اشتہار میں بھی کوئی حوالہ کسی مستند کتابِ حدیث کا نہیں دیا گیا کہ اس سے تحقیق کی جاسکتی۔ صحیح احادیث میں شبِ قدر کے بدر مطلق نوافل کی فضیلت وارد ہے، کسی خاص طریقے کی نہیں۔[۳]

واللہ اعلم
۱۴۰۰/۹/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۱۱۷۸/۳۱ د)

---

(۱) فی الدر المختار ج:۲ ص:۴۸ (قبیل باب ادراک الفریضة) ولا یصلی الوتر ولا التطوع بجماعة خارج رمضان ای یکرہ ذلک علی سبیل التداعی بأن یقتدی أربعة بواحد کما فی الدر .... الخ. وفی غنیة المتملی ص:۴۳۲ (طبع سہیل اکیڈمی لاہور) اعلم أن النفل بالجماعة علی سبیل التداعی مکروہ علی ما تقدم ما عدا التراویح. نیز دیکھئے: فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ج:۴ ص:۲۴۳۔

(۲) یہ اشتہار، ریکارڈ میں موجود نہیں ہے، بظاہر اس اشتہار میں جماعت کے ساتھ نوافل کا کوئی مخصوص طریقہ لکھا گیا تھا۔

(۳) وفی غنیة المتملی النوافل ج:۱ ص:۴۳۲ واعلم أن النفل بالجماعة علی سبیل التداعی مکروہ علی ما تقدم ما عدا التراویح وصلوٰة الکسوف والاستسقاء، فعلم أن کلا من صلوٰة الرغائب لیلة أول جمعة من رجب وصلوٰة البراءة لیلة النصف من شعبان وصلوٰة القدر لیلة السابع والعشرین من رمضان بالجماعة بدعة مکروهة. نیز دیکھئے: فتاوی دارالعلوم دیوبند ج:۴ ص:۲۲۴۔ (باقی اگلے صفحے پر)

سنن ونوافل گھر میں پڑھنی چاہئیں یا مسجد میں؟

سوال:- ملفوظاتِ کمالاتِ اشرفیہ ص:۱۵۶ ملفوظ نمبر ۶۵۹ میں ہے: ایک شخص نے دریافت کیا کہ نماز سنتِ فجر مکان میں پڑھ کر مسجد جاتا ہوں، اس وقت نماز تحیۃ المسجد پڑھ سکتا ہوں یا نہیں؟ فرمایا کہ: ''اس وقت نہ تحیۃ المسجد ہے، نہ تحیۃ الوضوء، نیز ان سنتوں کا مسجد میں پڑھنا افضل ہے، بلکہ جمیع سننِ مؤکدہ کا، تاکہ اتہام بالتشبہ باہلِ بدعت سے محفوظ رہے، جو کہ تارکینِ سنت ہیں۔'' اور ہم نے یہ سنا ہے کہ مکان میں فجر کی سنتیں پڑھنا مسنون ہے، اس کی تطبیق کیا ہے؟

جواب:- فی الدر المختار: والأفضل فی النفل غیر التراویح المنزل الا لخوف شغل عنها، والأصح أفضلیة ما کان أخشع وأخلص. وقال الشامی: وحیث کان هذا أفضل یراعی ما لم یلزم منه خوف شغل عنها لو ذهب لبیته، أو کان فی بیته ما یشغل باله ویقلل خشوعه فیصلیها حینئذ فی المسجد. (شامی ج:۱ ص:۴۵۸)۔[1]

اس سے معلوم ہوا کہ اصل مسئلہ تو یہی ہے کہ تمام سنن ونوافل کا گھر میں پڑھنا افضل ہے، لیکن کسی عارض کی بناء پر یہ افضلیت منتقل ہوسکتی ہے، اور عوارض مختلف ہوسکتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں چونکہ سنتوں کو گھر کے لئے چھوڑنے سے خطرہ یہ رہتا ہے کہ کہیں بالکل ہی رہ نہ جائیں، اس لئے متأخرین نے سننِ مؤکدہ کو مسجد میں پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ حضرت تھانویؒ کا مذکورہ فتویٰ بھی اصلاً اسی عارض پر مبنی ہے، اور اس کے ساتھ اتہام بالتشبہ باہلِ بدعت کی علت مزید شامل کردی ہے، اور حضرت تھانویؒ کا یہ فتویٰ امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۲۸۸[2] میں بھی موجود ہے۔ واللہ اعلم

۱۳۹۷/۳/۲۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۳۵۷ ب)

فجر کی سنتیں چھوٹ جائیں تو کیا حکم ہے؟

سوال:- فجر کی سنتیں چھوٹ جانے کے بعد کیا کرنا چاہئے؟ کیا اس کی قضا کی جاسکتی ہے؟

جواب:- طلوعِ آفتاب کے بعد زوال سے پہلے امام محمدؒ کے نزدیک سنتوں کی قضا کی

(گزشتہ سے پیوستہ)..........وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۵، ۲۶ (طبع ایچ ایم سعید) ومن المندوبات .... احیاء لیلة العیدین، والنصف من شعبان، والعشر الأخیر من رمضان، والأول من ذی الحجة، وفی الشامیة تحته علی الصفحة: ۲۶، وفی الامداد ویحصل القیام بالصلوٰة نفلا فرادی من غیر عدد مخصوص، وبقراءة القرآن والأحادیث .... (تتمة) أشار بقوله فرادی الی ما ذکره بعد فی متنه من قوله ویکره الاجتماع علی احیاء لیلة من هذه اللیالی فی المساجد .... وما روی من الصلوات فی هذه الأوقات یصلی فرادی غیر التراویح.

(۱) فتاویٰ شامیة باب الوتر والنوافل ج:۲ ص:۲۲ (طبع ایچ ایم سعید)

(۲) امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۳۰۸ سوال نمبر ۳۹۷ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)، نیز دیکھئے فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج:۴ ص:۲۲۶۔

جاسکتی ہے، البتہ شیخینؒ کے نزدیک تنہا سنتوں کی قضا نہیں، ہاں! اگر فرض نماز بھی قضا ہوگئی ہو تو زوال سے پہلے فرض اور سنت دونوں کی قضا کرنی چاہئے۔[1] واللہ اعلم

الجواب صحیح — احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

محمد شفیع عفی عنہ — ۱۳۸۷/۱۲/۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۰۰/۱۸ الف)

فجر کے فرض شروع ہونے کے بعد سنتیں کس وقت تک ادا کی جاسکتی ہیں؟

سوال:- فجر کے وقت جب مسجد میں داخل ہوا تو امام صاحب نماز پڑھا رہے تھے، میں سنتیں پڑھے بغیر جماعت میں شریک ہوا، بعد ازاں سورج نکلنے کے بعد سنتیں ادا کیں، تو میرا یہ عمل دُرست ہے یا نہیں؟

جواب:- فجر کی سنتوں کے بارے میں سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ گھر میں ادا کر کے مسجد جائیں۔[2] اور اگر گھر میں پڑھے بغیر مسجد پہنچ جائیں تو جب تک جماعت کی رکعت، بلکہ تشہد مل سکتا ہو، فجر کی سنتیں دُور ہٹ کر کسی مقام پر پڑھ لینا جائز ہے، خواہ جماعت شروع ہوچکی ہو، لیکن اگر کوئی شخص جماعت میں شریک ہوگیا تو پھر امام ابوحنیفہؒ اور امام ابویوسفؒ کے قول کے مطابق تنہا سنتوں کی قضا نہیں ہے، آپ نے جو سورج نکلنے کے بعد دو رکعتیں پڑھیں وہ آپ کی طرف سے نفل ہوگئیں۔

فی الدر المختار باب ادراک الفریضة واذا خاف فوت رکعتی الفجر لاشتغاله بسنتها ترکها لکون الجماعة اکمل والا بأن رجا ادراک رکعة فی ظاهر المذهب وقیل التشهد واعتمده المصنف والشرنبلالی تبعًا للبحر لٰکن ضعفه فی النهر وقال الشامی تحته لأن المدار هنا علٰی ادراک فضل الجماعة وقد اتفقوا علٰی ادراکه بادراک التشهد فیأتی بالسنة اتفاقًا کما أوضحه فی الشرنبلالیة أیضًا وأقره فی شرح المنیة وشرح نظم الکنز (شامی ج:۱ ص:۴۴۹)[3] **وفی ردّ المحتار أیضًا قوله ولا یقضیها الا بطریق التبعیة أی لا یقضی سنة الفجر الا اذا فاتت**

---

(۱) وفی رد المحتار ج:۲ ص:۵۷ (طبع سعید) اذا فاتت وحدها فلا تقضی قبل طلوع الشمس بالاجماع لکراهة النفل بعد الصبح، واما بعد طلوع الشمس فکذٰلک عندهما وقال محمد أحب الیّ ان یقضیها الی الزوال کما فی الدرر قیل هذا قریب من الاتفاق .... الخ.

(۲) وفی غنیة المتملی ص:۳۹۶ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور) ثم السنة فی سنة الفجر .... (ان یأتی بها اما فی بیته وهو الأفضل (أو عند باب المسجد) ان أمکنه ذٰلک .... الخ. نیز دیکھئے سابقہ فتویٰ ص:۴۴۰ اور اس کا حاشیہ نمبر۱۔

(۳) الدر المختار مع رد المحتار ج:۲ ص:۵۶ (طبع سعید).

مع الفجر فیقضیها تبعًا لقضائه لو قبل الزوال۔ (أیضًا ج:۱ ص:۷۵۰)۔[۱] واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۲/۲۵ھ

الجواب صحیح
محمد رفیع عثمانی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۹۳/۲۲ الف)

سننِ مؤکدہ کو بلا عذر بیٹھ کر پڑھنا

سوال:- سننِ مؤکدہ کا قیام فرض ہے یا سنت یا مستحب؟

جواب:- سننِ مؤکدہ کو کھڑے ہوکر پڑھنا افضل اور مستحب ہے، اور بیٹھ کر پڑھنا بھی جائز ہے، لما فی مراقی الفلاح (یجوز النفل) انما عبر به لیشمل السنن المؤکدة وغیرها فتصح اذا صلاها (قاعدًا مع القدرة علی القیام) وقد حکی فیه اجماع العلماء .... الخ. وقال الطحطاویؒ قوله (یجوز النفل قاعدًا) مطلقًا من غیر کراهة کما فی مجمع الأنهر. (طحطاوی علی مراقی الفلاح باب النوافل ص:۲۲۰)۔[۲]

البتہ فقہاءؒ کی ایک جماعت نے سنتِ فجر کو اس سے مستثنیٰ کیا ہے، یعنی ان کے نزدیک ان کو بلا عذر بیٹھ کر پڑھنا جائز نہیں ہے اور ان میں قیام فرض ہے (وخالفه الطحطاوی)۔[۳] اور بعض حضرات نے تراویح کا بھی یہی حکم بتایا ہے، اگرچہ تراویح کے بارے میں قاضی خانؒ اور علامہ شامیؒ وغیرہ کا رُجحان اس طرف ہے کہ وہ سننِ فجر کے حکم میں نہیں، لیکن احتیاطاً حتی الامکان انہیں بھی کھڑے ہوکر پڑھنا چاہئے۔ لما فی الدر المختار ومنها (أی فرائض الصلوٰة) القیام فی فرض وملحق به کنذر وسنة فجر فی الأصح، وقال الشامیؒ ناقلًا عن الحلیة: وسنة الفجر لا تجوز قاعدًا من غیر عذر باجماعهم کما هو روایة الحسن عن أبی حنیفة کما صرح به الخلاصة فکذا التراویح وقیل یجوز .... قال قاضی خان وهو الصحیح. (شامی باب صفة الصلوٰة ج:۱ ص:۲۹۹)[۴]، (ومثله فی شرح المنیة الکبیر ص:۲۶۷)۔[۵]

بہرحال! فجر اور تراویح کے علاوہ دُوسری سننِ مؤکدہ میں فقہائے حنفیہ کا اتفاق ہے کہ قیام

---

(۱) رد المحتار ج:۲ ص:۵۷ (طبع سعید).
(۲) (طبع قدیمی کتب خانہ).
(۳) طحطاوی علی المراقی ص:۲۲۰ (طبع مذکور).
(۴) الدر المختار مع رد المحتار ج:۱ ص:۴۴۴، ۴۴۵ (طبع سعید).
(۵) غنیة المتملی ص:۲۷۰ و ص:۲۱ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور).

فرض نہیں، مستحب ہے،[۱] البتہ چونکہ سلف کا تعامل سننِ مؤکدہ کو کھڑے ہوکر ہی پڑھنے کا رہا ہے اس لئے حتی الوسع اس تعامل کو ترک نہ کرنا چاہئے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۸/۶/۲۴ھ

(فتویٰ نمبر ۶۹۲/۲۹ ب)

توڑی ہوئی نفل نماز اور طواف و نذر کی نماز میں قیام کا حکم

سوال:- وہ نفل نماز جس کو شروع کر کے توڑ دیا ہو، اس کی قضا، نمازِ نذر اور نمازِ طواف میں قیام فرض ہے یا مستحب؟

جواب:- قیام یوں تو ہر فرض و واجب نماز میں فرض ہے، اور اس میں صلوٰۃ منذور اور صلوٰۃ بعد الطواف بھی داخل ہے۔ کما مرّ فی عبارۃ الدر المختار فی الجواب الثانی۔[۲] لیکن توڑی ہوئی نفل نماز کے بارے میں بالکل صریح جزئیہ تو نہیں ملا۔ علامہ شامیؒ نے طحطاویؒ اور رحمتیؒ کے بارے میں صرف اتنا نقل کیا ہے کہ انہوں نے اس مسئلے میں توقف کیا ہے، (ج:۱ ص:۲۹۹ صفۃ الصلوٰۃ)،[۳] اور طحطاویؒ نے مراقی کی عبارت سے وجوب مستنبط کیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں: قولہ والواجبات ظاهره شمول قضاء النفل الذی أفسده (ص:۱۲۲، طبع قدیمی کتب خانہ)، لیکن اس کے مشابہ ایک مسئلے سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ توڑی ہوئی نفل نماز کی قضاء میں قیام، صاحبینؒ کے نزدیک واجب ہوگا اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک واجب نہیں ہوگا۔

وذٰلک لما فی شرح المنیۃ: اما القعود بغیر عذر بعد الافتتاح قائمًا فیجوز عند أبی حنیفۃ لٰکن مع الکراهۃ علٰی ما اختاره صاحب الهدایۃ وبلا کراهۃ علٰی ما اختاره فخر الاسلام

---

(۱) وفی فتح باب العنایۃ بشرح النقایۃ ج:۱ ص:۳۳۷، ۳۳۸ (طبع بیروت) (ویتنفّل راکبًا .... وقاعدًا مع قدرۃ قیامه) وفیه تحته والسنن الرواتب نوافل .... وقال تحت قوله (مع قدرۃ قیامه) لما روی الجماعۃ الا مسلما عن عمران بن حصینؓ قال: سألت رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم عن صلوٰۃ الرجل قاعدًا فقال: من صلّٰی قائما فهو أفضل ومن صلّٰی قاعدًا فله نصف أجر القائم، ومن صلّٰی نائمًا أو مضطجعًا فله نصف أجر القاعد .... وهذا فی صلوٰۃ النافلۃ، لأن صلوٰۃ الفرض لا یجوز فیها القعود مع القدرۃ علی القیام بالاجماع، وفی مجمع الأنهر شرح ملتقی الأبحر ج:۱ ص:۲۰۰ (طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت) (وصح النفل قاعدًا مع القدرۃ علی القیام) بلا کراهۃ لما روی أنه علیه السلام کان یصلّی رکعتین قاعدًا بغیر عذر وفیه اشارۃ الی أنه لا تجوز المکتوبۃ والواجبۃ والمنذورۃ وسنۃ الفجر والتراویح بلا عذر والصحیح أن التراویح تجوز .... الخ. وفی المبسوط للسرخسیؒ ج:۲ ص:۱۴۷ (طبع دار المعرفۃ بیروت) (الفصل السابع فی أدائها (التراویح) قاعدًا من غیر عذر) اختلفوا فیه قال بعضهم لا ینوب عن التراویح علٰی قیاس ما روی الحسن عن أبی حنیفۃ رحمهما اللّٰه تعالٰی فی رکعتی الفجر انه لو أداهما قاعدًا من غیر عذر لم یجزه عن السنۃ وعلیه الاعتماد فکذا هذا لأنها مثله والصحیح انها تجوز والفرق ظاهر فان رکعتی الفجر اٰکد وأشهر وهذا الفرق ظاهر یوافق روایۃ أبی سلیمان عن أبی حنیفۃ وأبی یوسفؒ ومحمدؒ ومع الفرق فانه لا یستحب لما فیه من مخالفۃ السنۃ والسلف.

(۲) اس سے سابقہ فتویٰ مراد ہے۔

(۳) رد المحتار ج:۱ ص:۴۴۴ (طبع سعید).

.... وأما عندهما فلا يجوز اتمامها مع القعود بلا عذر بعد الافتتاح قائما أصلا لأن الشروع معتبر بالنذر ومن نذر صلوٰة ركعتين قائمًا لا يجوز له أن يصليهما قاعدًا من غير عذر فكذا اذا شرع فيهما ولأبي حنيفة ان اللزوم بالشروع لضرورة صيانة المؤدى عن البطلان وصيانته عنه ليست موقوفة على القيام لصحته بدونه والضرورة تتقدر بقدرها .... ولذا اتفقوا على أنه لو نذر الحج ماشيًا لزمه بصفة المشي ولو شرع فيه ماشيًا لا يلزمه. (كبيرى شرح منية ص:۲۶۸ بعد فرائض الصلوٰة)۔[1]

اس میں امام ابوحنیفہؒ کی تعلیل صورتِ مسئولہ پر بھی پوری طرح منطبق ہے، لہٰذا امام صاحبؒ کے قول کے قیاس پر صورتِ مسئولہ میں قیام واجب نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۶/۲۴ھ
(فتویٰ نمبر ۲۹۲/ ۲۹ ب)

نوافل کی جماعت میں لوگوں کی شرکت کا اہتمام کرنا

سوال:- ایک آدمی چار، پانچ سال سے یکم محرّم سے ۱۰رمحرّم تک نوافل بالجماعت کا اہتمام کرتا ہے، اوران دس راتوں میں قرآنِ کریم ختم کرتا ہے، جس میں لاؤڈ اسپیکر کا انتظام ہوتا ہے۔ کیا یہ جائز ہے یا بدعت؟ ایسے شخص کی اقتداء میں نماز پڑھنا کیسا ہے؟

جواب:- لاؤڈ اسپیکر وغیرہ کا اہتمام کرنا اورلوگوں کوشرکت کی دعوت دینا ''تداعی'' ہے، اور تداعی کے ساتھ نوافل کی جماعت مکروہِ تحریمی ہے،[2] جو شخص اسے باعثِ ثواب سمجھے وہ مرتکبِ بدعت ہے، اس کو امام بنانے سے پرہیز کرنا چاہئے، لیکن اگر کوئی صحیح العقیدہ امام نہ ہوتو اس کے پیچھے نماز پڑھنا تنہا نماز پڑھنے سے بہتر ہے، نماز ہوجائے گی۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۱/۵ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۱۹/۲۲ الف)

---

(۱) الحلبية المتملى ص:۲۷۱ (طبع سهيل اكيڈمى لاهور). وفى فتح باب العناية ج:۱ ص:۳۳۹ (طبع بيروت) (وكره التنفل قاعدًا بقاءً) بأن يحرم قائمًا ثم يقعد وقال أبو يوسفؒ ومحمدؒ لا يجوز، لأن الشروع ملزم لأن يأتى على صفة شرع فيها، أو بأكمل منها، فاشبه النذر قائمًا ولأبى حنيفة أن البقاء أسهل من الابتداء وقد جاز ترك القيام فى ابتداء النفل فيجوز فى أثنائه ..... الخ. وفى مجمع الأنهر شرح ملتقى الأبحر ج:۱ ص:۲۰۱ (ولو قعد بعد ما افتتحه قائمًا جاز) عند الامام استحسانًا لأنه أسهل من الابتداء (ويكره لو بلا عذر) عنده (وقالا لا يجوز الا بعذر) قياسًا لأن الشروع ملزم كالنذر ولو نذر أن يصلّى قائمًا لم يجز ان يصلّى قاعدًا فكذا هذا ..... الخ.

(۲) وفى الهندية ج:۱ ص:۸۳ (طبع مكتبه حقانيه) التطوع بالجماعة اذا كان على سبيل التداعى يكره.

رمضان میں نفل کی جماعت

(۱۹۵۹ء میں ایک صاحب "محمود حسن" نے رمضان المبارک میں نفل کی جماعت سے متعلق ایک استفتاء حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ارسال کیا تھا، اور استفتاء کے ساتھ اسی مسئلے سے متعلق حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا تحریرکردہ جواب بھی ارسال کیا۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ استفتاء جواب کے لئے اپنے فائق اور لائق صاحبزادے حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کے سپرد کیا، جو اس وقت دورۂ حدیث میں داخلہ لینے والے تھے، گویا کہ اس وقت ان کا ضابطے کا طالب علمانہ دور بھی ختم نہیں ہوا تھا۔ حضرت مولانا مدظلہم نے اپنے والدِ محترم کے ایماء پر اس استفتاء کا تحقیقی جواب تحریر فرمایا، جو پیشِ خدمت ہے۔ یہ تفصیلی فتویٰ پہلے "فقہی مقالات" کی جلد دوم میں بھی شائع ہو چکا ہے، اب حضرتِ والا دامت برکاتہم کے فتاویٰ کے اس مجموعے میں دیگر فتاویٰ کے ساتھ یہ فتویٰ بھی متداول نسخوں کی تخریج کے ساتھ شائع کیا جارہا ہے۔ مرتب عفی عنہ)

استفتاء

درخدمت حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

سوال:- حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک فتویٰ "الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر" میں شائع ہوا ہے، جس میں رمضان میں تہجد کی نماز تداعی کے ساتھ بھی افضل ہونا درج ہے، اور حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ نے فتاویٰ رشیدیہ میں رمضان میں تہجد کی جماعت کو اگر بالتداعی ہو، مکروہِ تحریمی بتلایا ہے، اس کو حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے قولِ مرجوح پر مبنی قرار دیا ہے۔ میں نے بہت سارے حضرات کو لکھا۔ کسی کے یہاں سے فیصلہ کن جواب موصول نہیں ہوا، بجز حضرتِ والا کے اس وقت اس کے متعلق کہیں سے مجھے اس کی توقع بھی نہیں ہے، بڑے بڑے کام کے مفتی حضرات چل بسے۔ مسئلہ زیرِ بحث بہت اہم ہے، اس کی وجہ سے ایک نیا باب بدعت کا کھل جانے کا اندیشہ ہے، خود مجھے بھی تردّد پیدا ہوگیا۔ یہاں گزشتہ رمضان میں پچاس، ساٹھ، کبھی کبھی سو سے زائد آدمی تہجد کی نماز جماعت سے ادا کرنے لگے، اس کا اہتمام ہونے لگا، میں نہ شریک ہوا، نہ کسی کو شریک ہونے کو کہا، نہ کسی کو منع کیا، البتہ اپنے احباب خود ہی دریافت کرتے تو ان سے کہہ دیتا تھا کہ فقہاء تو مطلق طور پر تداعی کو نوافل میں مکروہ ہی لکھتے ہیں۔ ہمارے اکابر میں سے کسی کا عمل بھی مجھے اس کے متعلق سننے میں نہیں آیا۔

حضرتِ والا ذرا مفصل طور پر حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے دلائل کے متعلق کچھ تحریر فرماویں۔ اگرچہ حضرتِ والا کو تکلیف ہوگی، لیکن کیا کیا جائے؟ کہیں سے اطمینان بخش جواب نہیں ملا۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا جواب منسلک ہے۔ کمترین بندہ محمود حسن عفی عنہ، کراچی

جواب از حضرت مولانا سیّد حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ

(منقول از ''شیخ الاسلام نمبر'' صفحہ:۵۴ روزنامہ الجمعیۃ، دہلی)

جواب سوال از جماعت نوافل در رمضان غیر تراویح۔ (منقول از مکتوباتِ مخطوطہ)

فتح القدیر ج:اوّل، باب الاستسقاء ص:۴۳۸ میں ہے[1]: وقد صرح الحاکم أیضًا فی باب صلٰوۃ الکسوف من الکافی بقوله "ویکره صلٰوۃ التطوع جماعة ما خلا قیام رمضان وصلٰوۃ الکسوف، وھٰذا خلاف ما ذکر شیخ الاسلام"۔

اور رد المحتار ج:۱ ص:۵۲۳ پر ہے[2]: قلت ویؤیده أیضًا ما فی البدائع من قوله أن الجماعد فی التطوع لیست بسنة الا فی قیام رمضان اھـ. وفیه والنفل بالجماعة غیر مستحب، لأنه لم تفعله الصحابة فی غیر رمضان اھـ۔

مذکورہ بالا نصوص میں قیامِ رمضان کی تصریح فرمائی گئی ہے، اس کی تخصیص تراویح کے ساتھ نہیں کی گئی، چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تیسری شب تک اور صحابہ کرامؓ سے آخری شب تک نوافل باجماعت پڑھنا منقول ہے، جیسا کہ مؤطا امام مالک میں بکثرت مروی ہے، اس لئے تمام وہ نوافل جو رمضان کی راتوں میں پڑھے جائیں، خواہ تراویح ہوں یا تہجد، اوائلِ شب میں ہوں یا اَواخرِ شب میں، جماعت کی اجازت ہوگی۔

مؤطا امام مالک صفحہ:۱۱۱ میں ہے[3]:-

قال محمد: وبھٰذا کله نأخذ لا بأس بالصلاۃ فی شهر رمضان أن یصلی الناس تطوعا بامام لأن المسلمین قد اجمعوا علٰی ذٰلک اھـ.

فتح الباری ج: رابع صفحہ:۲۱۵ باب "فضل من قام رمضان" میں ہے[4]:-

أی قیام لیالیه مصلیا، والمراد من قیام اللیل ما یحصل به مطلق القیام، کما قدمناه فی التهجد سواء (کان قلیلا أو کثیرا)، وذکر النووی أن المراد بقیام رمضان صلٰوۃ التراویح،

---

(۱) فتح القدیر ج:۲ ص:۵۹ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔
(۲) رد المحتار ج:۲ ص:۴۸، ۴۹ (طبع ایچ ایم سعید)۔
(۳) مؤطا امام مالک ص:۱۴۳ (طبع بیرون بوہڑ گیٹ ملتان)۔
(۴) فتح الباری ج:۴ ص:۲۵۱ (طبع دار نشر الکتب الاسلامیہ لاہور)۔

یعنی انه یحصل بها المطلوب من القیام، لا أن قیام رمضان لا یکون الا بها، واغرب الکرمانی فقال: اتفقوا علٰی أن المراد بقیام رمضان صلٰوۃ التراویح اھ. قلت: قال النووی: المراد بقیام رمضان صلٰوۃ التراویح، ولٰکن اتفاق من این أخذه بل المراد من قیام اللیل ما یحصل به مطلق القیام، سواء کان قلیلا أو کثیرا، اھ. وقال العینی فی الجزء الأول صفحة: ۲۸۱[1] من کتاب الایمان من عمدة القاری ما نصه، ومعنی من قام رمضان من قام بالطاعة فی لیالی رمضان ویقال یرید صلٰوۃ التراویح، وقال بعضهم: لا یختص ذٰلک بصلٰوۃ التراویح، بل فی أی وقت صلی تطوعا حصل له ذٰلک الفضل. اھ.

نصوصِ مذکورہ بالا سے مندرجہ ذیل اُمور معلوم ہوتے ہیں:-

۱:- ہر نفل نماز باجماعت مطلقاً مکروہ نہیں ہے، بلکہ اس سے کچھ مستثنیات بھی ہیں۔

۲:- مستثنیات میں لفظ قیامِ رمضان اور کسوف کو ذکر کیا ہے۔

۳:- امام محمد اور حاکم اور صاحبِ بدائع وغیرہ متقدمین (رحمہم اللہ تعالیٰ) نے فقط قیامِ رمضان ذکر فرمایا ہے، جو کہ مخصوص بالتراویح نہیں ہے۔

۴:- قیامِ رمضان کو مخصوص بالتراویح کرنا قولِ مرجوح ہے، جو کہ علامہ کرمانی اور علامہ نووی رحمہما اللہ تعالیٰ کا قول ہے، اس کے خلاف حافظ ابنِ حجر عسقلانی اور امام عینی رحمہما اللہ تعالیٰ قیامِ رمضان سے تمام نوافل مراد لے رہے ہیں، خواہ تراویح ہو یا تہجد ہو، یا دیگر نوافل۔ اور امام نوویؒ کے قول کو مؤوّل قرار دیتے ہوئے اپنے قول کی طرف لوٹاتے ہیں، اور کرمانی کے قول کو غریب اور مخدوش فرمادیتے ہیں، اور یہی اَمر مدلول مطابقی بھی ہے۔

بنابریں فتاویٰ رشیدیہ کی تصریح جلدِ ثانی صفحہ:۵۹ اور جلدِ اوّل صفحہ:۴۹ جس میں مستثنیات کو منحصر تراویح کے ساتھ کیا گیا ہے، قولِ مرجوح پر مبنی ہے۔ پس رمضان کی جملہ نوافل کی جماعت، خواہ بالتداعی ہو یا بلاتداعی، سب مأذون فیہ بلکہ مستحب ہوں گی، اور "من قام رمضان" کے تحت داخل ہوں گی، اس پر نکیر کرنا غیر صحیح ہوگا، بلکہ جملہ طاعات، طوافِ نفل یا عمرۂ نافلہ وغیرہ اسی میں محسوب اور مرغوب فیہ قرار دیئے جائیں گے، کما ذکر العینی رحمه الله تعالٰی۔

ہم نے حضرت قطب العالم حاجی امداداللہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کا عمل بھی مکہ معظمہ

---

(۱) عمدة القاری باب تطوع قیام رمضان من الایمان ج:۱ ص:۲۳۳ (طبع دار الفکر).

میں اسی پر پایا ہے، اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کا بھی یہی معمول تھا۔ اور حرمین شریفین میں قدیم سے عمل سنت عشریہ وغیرہ کا جو کہ بالخصوص شوافع، اور چالیس رکعت کا عمل جو کہ موالک کا معمول یہ تھا، اور اہلِ مکہ کا قدیمی عمل ہر ترویحہ پر اسبوع طواف کا اسی کا مؤید ہے۔

واللہ اعلم

ننگ اسلاف

حسین احمد غفرلہٗ

دارالعلوم دیوبند

۱۹؍ذی الحجہ ۱۳۷۲ھ

خط کا جواب از حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مکرم بندہ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یہ معاملہ نفسِ مسئلہ کی حیثیت سے تو کچھ اہم نہ تھا، لیکن حضرت مولانا مدنیؒ کے فتویٰ پر تنقید کی حیثیت نے اس کو اتنا مہم بنادیا کہ اس میں کافی بحث وتحقیق کے بغیر قلم اُٹھانا مشکل تھا، رمضان میں مجھ سے بالکل یہ کام نہیں ہوتا، اس لئے اپنے چھوٹے لڑکے محمد تقی سلّمہٗ کو جو اس سال دورۂ حدیث میں شریک ہونے والا ہے، یہ مسئلہ حوالے کیا، خیال یہ تھا کہ اس کو مشق ہوگی اور کتابوں کے حوالے یہ نکال کر پیش کردے گا تو پھر میں کچھ لکھوں گا، مگر ماشاء اللہ یہ لڑکا ذہین ہے، اس لئے تمام کتابوں کے حوالے بھی بغیر میری کسی امداد کے نکالے، پھر ان کے اقتباسات لے کر خود ہی ایک تحریر لکھ دی، اب جو تحریر دیکھی تو میری نظر میں بالکل کافی وافی تھی، اس لئے اسی پر تصدیق لکھ دی، وہ بھیج رہا ہوں۔ والسلام

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۴؍شوال ۱۳۷۸ھ

جواب حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

تراویح، استسقاء اور کسوف کے علاوہ دُوسری نفلوں کی جماعت اگر بالتداعی ہو تو بہرصورت مکروہِ تحریمی ہے، خواہ وہ نفلیں رمضان میں پڑھی جائیں یا غیرِ رمضان میں، یہی مسلک عام فقہاء محدثین کا ہے، اور اسی پر سلف صالحین کا فتویٰ اور تعامل رہا ہے۔

۱:- بدائع الصنائع میں ہے:-

اذا صلّوا التراویح ثم أرادوا أن یصلّوها ثانیًا یصلّون فرادی لا بجماعة، لأن الثانیة

تطوع مطلق والتطوع المطلق بجماعة مکروہ. (بدائع ج:۱ ص:۲۹۰)[1]

علامہ ابنِ نجیمؒ فرماتے ہیں:-

ولو صلّو التراويح، ثم أرادوا أن يصلّوا ثانيًا يصلّون فرادى. اھ.

(البحر الرائق ج:۲ ص:۷۴)[2]

فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے:-

ولو صلّوا التراويح ثم أرادوا أن يصلّوا ثانيًا يصلّون فرادى. كذا في التاتارخانية.

(عالمگیریہ ج:۱ ص:۱۲۳)[3]

فتاویٰ بزازیہ میں ہے:-

صلّوا بجماعة، ثم أرادوا اعادتها بالجماعة يكره، لأن النفل بجماعة على التداعي يكره الا بالنص. اھ. (بزازية على هامش الهندية ج:۴ ص:۳۱)[4]

مذکورۃ الصدر نصوص سے معلوم ہوا کہ تراویح کا اعادہ جماعت کے ساتھ جائز نہیں، اور بدائع و فتاویٰ بزازیہ میں اس کی علت کی تصریح بھی فرمادی گئی کہ دُوسری مرتبہ پڑھی جانے والی تراویح نفل مطلق (یعنی وہ نفل جس کے اندر جماعت کی نص نہیں ملتی) ہوجائے گی، اور نفل مطلق جماعت کے ساتھ مکروہ (تحریمی) ہے، تو معلوم ہوا کہ حضراتِ فقہاءؒ کے نزدیک نفل کی جماعت (علی التداعی) بہرصورت مکروہ ہے۔ خواہ رمضان میں ہو یا غیر رمضان میں، کیونکہ اگر رمضان کی نفلیں علی الاطلاق اس حکم سے مستثنیٰ ہوتیں تو تراویح کا اعادہ جماعت کے ساتھ ناجائز نہ ہوتا، کما ھو ظاھر۔

۲:- علامہ طاہر بن عبدالرشید بخاریؒ خلاصۃ الفتاویٰ میں تحریر فرماتے ہیں:-

ولو زاد على العشرين بالجماعة يكره عندنا بناء على أن صلوٰة التطوع بالجماعة مكروه. (خلاصة الفتاوىٰ ج:۱ ص:۶۳)[5]

اگر رمضان کی نفلیں جماعت کے ساتھ علی الاطلاق جائز ہوتیں تو بیس سے زیادہ رکعتیں بالجماعۃ مکروہ نہ ہوتیں۔

۳:- درمختار میں ہے:-

---

(۱) (طبع ایچ ایم سعید).

(۲) البحر الرائق ج:۲ ص:۶۸ (طبع ایچ ایم سعید).

(۳) الفتاوىٰ الهندية فصل في التراويح ج:۱ ص:۱۱۶ (طبع مکتبہ حقانیہ پشاور)

(۴) الفتاوى البزازية على هامش الهندية (الباب الثالث في التراويح) ج:۴ ص:۲۹ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ).

(۵) (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ).

ولا یصلی الوتر ولا التطوع بجماعة خارج رمضان أی یکره ذلک علی سبیل التداعی بأن یقتدی أربعة بواحد، کما فی الدرر. (۱) (شامی ج:۱ ص:۲۶۳)

علامہ ابنِ عابدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:-

والنفل بالجماعة غیر مستحب، لأنه لم تفعله الصحابة فی غیر رمضان. (۲) (رد المحتار ج:۱ ص:۲۶۴)

علامہ کاسانی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:-

الجماعة فی التطوع لیست بسنة الا فی قیام رمضان وفی الفرض واجبة أو سنة مؤکدة. (۳) (بدائع الصنائع ج:۱ ص:۲۹۸)

محقق ابنِ ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

وقد صرح الحاکم أیضًا فی باب صلوٰة الکسوف من الکافی بقوله "ویکره صلوٰة التطوع جماعة ما خلا قیام رمضان وصلوٰة الکسوف." (۴) (فتح القدیر ج:۱ ص:۴۳۸)

نصوصِ مذکورہ بالا میں صلوٰۃ النفل بالجماعۃ کی کراہت کے حکم سے قیامِ رمضان کو مستثنیٰ کیا گیا، اور تراویح کے بجائے قیامِ رمضان کا لفظ استعمال کیا ہے، جس کے عموم سے یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ یہ حکم صرف غیرِ رمضان کے لئے مخصوص ہے، لیکن درحاصل یہ قیامِ رمضان کا لفظ (عرفِ فقہاء کے اعتبار سے بالخصوص مسئلۂ جماعت میں) عام نہیں، بلکہ تراویح کے ساتھ مخصوص ہے، جیسا کہ اِن شاء اللہ ہم عنقریب بالتفصیل بیان کریں گے، واللہ الموفق۔

۴:- حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ شرحِ مؤطا میں فرماتے ہیں کہ:-

قال الزرقانی رحمه الله ظاهره (أی حدیث أفضل الصلوٰة صلوٰتکم فی بیوتکم الا المکتوبة) یشمل کل نفل، لکنه محمول علی ما لا یشرع له التجمیع کالتراویح والعیدین. اهـ. (۵) (اوجز المسالک ج:۲ ص:۷)

حضرت الشیخ مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ شرحِ ابوداؤد میں لکھتے ہیں:-

فان خیر صلاة المرء وهذا عام لجمیع النوافل والسنة الا النوافل التی من شعائر الاسلام کالعید والکسوف والاستسقاء، قلت: وهذا یدل علی أن صلوٰة التراویح فی البیت أفضل، والجواب عن الذین قالوا بأفضلیتها فی المسجد جماعة أن رسول الله صلی الله علیه وسلم قال ذلک لخوف الافتراض، فاذا زال الخوف بوفاته علیه السلام ارتفع المانع، وصار

---

(۱) الدر المختار ج:۲ ص:۴۸ (طبع ایچ ایم سعید).
(۲) رد المحتار ج:۲ ص:۴۹ (طبع ایچ ایم سعید).
(۳) (طبع ایچ ایم سعید).
(۴) فتح القدیر باب الاستسقاء ج:۲ ص:۵۹ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)
(۵) (طبع مکتبہ حقانیہ ملتان).

فعله في المسجد أفضل ....، فاشبه صلاة العيد.[۱] (بذل المجهود ج:۲ ص:۳۳۲)

ان نصوص میں لفظِ تراویح استعمال کیا گیا ہے، قیامِ رمضان نہیں کہ اس کے عموم سے عمومِ حکم کا شبہ ہو۔

۵:- عنایہ شرح ہدایہ میں ہے:-

(فصل في قيام شهر رمضان) ذكر التراويح في فصل علىٰ حدة لاختصاصها بما ليس لمطلق النوافل.[۲] (عناية على هامش الفتح ج:۱ ص:۳۳۳)

البحر الرائق میں ہے:-

(تحت قول الكنز "وسن في رمضان عشرون ركعة" .... الخ) بيان لصلوٰة التراويح، وانما لم يذكرها مع السنن المؤكدة قبل النوافل المطلقة لكثرة شعبها ولاختصاصها بحكم من بين سائر السنن والنوافل وهو الأداء بجماعة.[۳] (البحر الرائق ج:۲ ص:۷۱)

اس سے معلوم ہوا کہ تراویح کا جماعت سے ادا کیا جانا تمام سنن ونوافل کے مقابلے میں اسکی خصوصیت ہے۔

۶:- فتاویٰ قاضی خان میں ہے:-

ويستحب اداءها (أى التراويح) بالجماعة، وقال مالك والشافعي رحمهما الله تعالىٰ في القديم: الانفراد أفضل كسائر السنن. انتهىٰ. وفيه بعد ذٰلك: والصحيح ان اداءها بالجماعة في المسجد أفضل، لأن فيه تكثيرا للجماعة، وكذٰلك في المكتوبات.

[۴] (خانية على هامش الهندية ج:۱ ص:۲۱۳)

پہلی نص میں اشارہ فرمادیا گیا کہ تراویح اور چند اور منصوص سنن کے علاوہ تمام سنن میں ہم بھی شوافع وغیرہم کے قدیمی قول سے متفق ہیں کہ اس میں انفراد افضل ہے۔ دُوسری نص میں فرمایا گیا کہ تراویح اس حکم میں مکتوبات کی شریک ہے، اگر رمضان کی بقیہ نفلوں میں بھی جماعت جائز ہوتی تو تصریح کردی جاتی۔

۷:- حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز تحریر فرماتے ہیں:-

''جماعت نوافل کی سوائے ان مواقع کے جو حدیث سے ثابت ہیں، مکروہِ تحریمی ہے، فقہ میں لکھا ہے کہ اگر تداعی ہو اور مراد تداعی سے چار آدمی کا ہونا ہے، پس جماعت صلوٰۃِ کسوف، استسقاء، تراویح کی دُرست اور باقی سب مکروہ ہیں، کذا فی کتب الفقہ۔''[۵] (فتاویٰ رشیدیہ ص:۲۸۹)

حضرت حکیم الاُمت مولانا تھانوی قدس اللہ سرہٗ شبینہ کے مقاسد بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

---

(۱) (طبع معهد الخليل الاسلامي كراچي).

(۲) عناية على هامش فتح القدير ج:۱ ص:۴۰۶ (طبع مكتبه رشيديه كوئته).

(۳) البحر الرائق ج:۲ ص:۶۲ (طبع ايچ ايم سعيد).

(۴) الفتاوى الخانية على هامش الهندية باب التراويح ج:۱ ص:۲۳۳ (طبع مكتبه حقانيه پشاور)

(۵) تالیفات رشیدیہ مع فتاویٰ رشیدیہ ص:۲۹۶ (ادارۂ اسلامیات لاہور)

''مثلاً اگر تراویح کے بعد یہ عمل ہو تو نفل کی جماعت مجمع کثیر کے ساتھ ہونا جو کہ مکروہ ہے۔''
(امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۳۰۰)[1]

ان حضرات نے بالکل تصریح اور وضاحت کے ساتھ بیان فرمادیا کہ نفل کی جماعت (تراویح کے سوا) رمضان میں بھی اسی طرح ناجائز ہے جس طرح غیر رمضان میں۔

۸:- ان روایت کے علاوہ درایت بھی اسی کی مقتضی ہے کہ نفل باجماعت رمضان میں بھی جائز نہ ہو، اس لئے کہ تراویح کی جماعت خلافِ قیاس ہے، کیونکہ تراویح تطوّعات میں سے ہے اور تطوّعات میں اخفاء مطلوب ہے برخلاف فرائض کے، اسی لئے تطوّعات کو نہ صرف بلاجماعت، بلکہ گھر میں پڑھنا افضل ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا:-

"صلوٰۃ المرء فی بیته أفضل من صلوٰته فی مسجدی هذا الا المکتوبة."[2]

تو ثابت ہوا کہ تراویح کی جماعت خلافِ قیاس ہے، اور یہ اُصولِ فقہ کا مُسلّمہ قاعدہ ہے کہ ''امر خلافِ قیاس اپنے مورد پر منحصر رہتا ہے'' اس پر قیاس کرکے کسی دُوسرے مسئلے کو اسی کے حکم میں کردینا جائز نہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ نوافل میں جماعت کا مورد کیا کیا ہیں؟ نوافل میں جماعت کا مورد صلوٰۃ الکسوف، صلوٰۃ الاستسقاء اور صلوٰۃ العیدین (علی قول من عدهما من النوافل) اور صلوٰۃ التراویح ہیں، رمضان کی کسی اور نفل مثلاً تہجد وغیرہ میں کہیں کسی سے جماعت منقول نہیں۔ البتہ ایک دو روایتیں اس قسم کی ملتی ہیں، لیکن وہاں پر جماعت لاعلیٰ سبیل التداعی ہے، جو باتفاق بہرصورت جائز ہے، مثلاً حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کا وہ مشہور واقعہ جس میں وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تہجد میں مشغول تھے، تو میں آپؐ کے بائیں پہلو میں جاکر کھڑا ہوگیا تو حضورؐ نے مجھے (ایک روایت کے مطابق ہاتھ سے) پکڑ کر دائیں جانب گھمادیا۔ اس میں مقتدی صرف حضرت ابنِ عباسؓ ہیں، چنانچہ حضرت شیخ مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی تقریر ترمذی میں ہے کہ:-

وبین التّراویح والتهجد فی عهده علیه السلام لم یکن فرق فی الرّکعات بل فی الوقت والصفة أی التراویح تکون بالجماعة فی المسجد بخلاف التّهجد. (العرف الشذی ج:۱ ص:۲۳۰)

اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ تحریر فرماتے ہیں:-

''اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کو ہمیشہ منفرداً پڑھتے تھے، کبھی بہ تداعی جماعت نہیں فرمائی، اگر کوئی شخص آکھڑا ہوا تو مضائقہ نہیں جیسا کہ حضرت ابنِ عباسؓ خود ایک دفعہ آپؐ کے پیچھے جا کھڑے ہوئے تھے، بخلاف تراویح کے کہ اس کو چند بار تداعی کے ساتھ جماعت کرکے ادا کیا۔''
(فتاویٰ رشیدیہ ص:۳۰۷)

---

(۱) امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۴۲۲ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)
(۲) سنن أبی داوٗد باب صلوٰۃ الرجل التطوع فی بیته حدیث رقم:۱۰۴۴ ج:۱ ص:۲۷۴ (طبع دار الفکر).

جب یہ معلوم ہوگیا کہ نفل کی جماعت صرف تراویح، کسوف، استسقاء اور عیدین میں مشروع ہے تو بحکم مقدمہ ثانیہ دُوسری نوافل مثلاً تہجد وغیرہ میں اس حکم کو متعدی نہ کیا جائے گا کیونکہ اس میں جماعت منقول و مأثور نہیں، لہٰذا منصوصہ نوافل کے علاوہ تمام نوافل میں خواہ وہ رمضان میں ہوں یا غیر رمضان میں، جماعت بالتداعی مکروہِ تحریمی ہوگی۔

قیامِ رمضان کی تحقیق

حضرتِ شیخ مولانا سیّد حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے استدلال میں وہ نصوص پیش فرمائی ہیں جو نمبر۳ میں اُوپر گزریں، اور اس کے علاوہ مؤطا امام مالک کی ایک عبارت پیش فرمائی ہے۔ ان سب میں مستثنیات میں ''قیامِ رمضان'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے بعد علامہ عینیؒ اور علامہ عسقلانیؒ کی عبارتیں پیش کی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قیامِ رمضان سے مراد صرف تراویح نہیں، بلکہ ''ما یحصل بہ القیام'' مطلقاً مراد ہے، اور پھر نتیجہ دونوں کو ملا کر یہ نکالا ہے کہ فقہاء نے قیامِ رمضان کا لفظ استعمال کیا ہے، اور عینی وعسقلانی کی عبارتوں سے اس کا عموم معلوم ہوتا ہے، لہٰذا رمضان کی ہر نفل میں جماعت جائز ہے۔ لیکن قیامِ رمضان کا لفظ لغوی اعتبار سے تو بے شک عام ہے، مگر عرف، عام فقہاء اور عام محدثین کا یہ ہے کہ اس کو صرف تراویح میں خاص کرتے ہیں، اور تراویح کے بعد قیامِ رمضان کا لفظ استعمال کرنے کی وجہ ہدایہ کی شرح میں علامہ بابرتیؒ نے یوں نقل کی ہے:-

وترجم بقیام رمضان اتباعا للفظ الحدیث قال صلی اللہ علیہ وسلم: ان اللہ تعالٰی فرض علیکم صیامه وسننت لکم قیامه.[1] (عنایة علی ھامش الفتح ج:۱ ص:۳۳۳)

ا:- فقہاء رحمہم اللہ کے اس قول کا مطلب (کہ قیامِ رمضان کے علاوہ دُوسری نوافل کی جماعت مکروہ ہے) عمدۃ القاری اور فتح الباری سے اخذ کرنے کے بجائے بہتر اور اَنسب یہ ہے کہ خود فقہاء کی عبارتوں سے اخذ کیا جائے، جو مسئلۂ زیرِ بحث میں نص کا درجہ رکھتی ہیں، بخلاف عمدۃ القاری اور فتح الباری کے، کہ ان کے پیشِ نظر اس مقام میں جماعت کی بحث نہیں، بلکہ حدیث ''من قام رمضان ایمانًا'' کی تشریح ہے، اس لئے ہم یہاں فقہاء کی وہ چند عبارتیں پیش کرتے ہیں جو مسئلۂ جماعت میں نص ہیں، اور جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک مسئلۂ جماعت میں قیامِ رمضان سے مراد تراویح ہی ہے۔

الف:- علامہ مرغینانیؒ نے ہدایہ میں ''فصل فی التراویح'' کی جگہ ''فصل فی قیام رمضان'' کا عنوان لگا کر تراویح کے مسائل ذکر فرمائے ہیں، اور شارحینِ ہدایہ مثلاً محقق ابن الہمامؒ نے اس عنوان کے تحت قیامِ رمضان کی تشریح کرنے کے بجائے تراویح کی تفسیر شروع کردی:-

''(فصل فی قیام رمضان) التراویح جمع ترویحة''[2]

(فتح القدیر ج:۱ ص:۳۳۳)

(۱) عنایة علی ھامش فتح القدیر فصل فی قیام شھر رمضان ج:۱ ص:۴۰۶ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه).

(۲) فتح القدیر فصل فی قیام رمضان ج:۱ ص:۴۰۶ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه).

اور علامہ بابرتیؒ نے یہی عنوان لگا کر تراویح کو سنن ونوافل سے علیحدہ ذکر کرنے کی وجہ بیان کرنی شروع کردی (جیسا کہ اُوپر نمبر۵ میں گزرا)۔ (عنایہ بحوالہ مذکور)

ب:- ملک العلماء علامہ کاسانیؒ نے بدائع میں جہاں قیامِ رمضان کا لفظ استعمال کیا ہے، وہیں آگے چل کر دلالۃً اس کی تشریح فرمادی ہے، کہ مراد تراویح ہے، آپ نے فرائض ونوافل کے درمیان مابہ الفرق امتیازات کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:-

ومنها ان الجماعة فی التطوع لیست بسنة الا فی قیام رمضان، وفی الفرض واجبة أو سنة مؤکدة.

پھر دو ہی سطروں کے بعد اس فرق کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا:-

وانما عرفنا الجماعة سنة فی التراویح بفعل رسول الله صلی الله علیه وسلم واجماع الصحابة. (بدائع الصنائع ج:۱ ص:۲۹۸)[۱]

اس کے علاوہ وہ مسئلہ کہ تراویح کا اعادہ جماعت کے ساتھ ناجائز ہے، اس سے بھی ثابت یہ ہوتا ہے کہ صاحبِ بدائع نے قیامِ رمضان سے مراد تراویح لی ہے، اور وہ جماعتِ نفل کو رمضان و غیرِ رمضان دونوں میں ناجائز قرار دیتے ہیں، وھو ظاھر۔

ج:- علامہ شمس الائمہ سرخسیؒ فرماتے ہیں:-

الفصل الخامس فی کیفیة النیة واختلفوا فیها، والصحیح أن ینوی التراویح أو السنة أو قیام اللیل. (مبسوط للسرخسی ج:۲ ص:۱۴۵)[۲]

د:- فتاویٰ قاضی خان میں ہے:-

ان نوی التراویح أو سنة الوقت أو قیام اللیل فی رمضان جاز.

(خانیة علی ھامش عالمگیریة ج:۱ ص:۲۱۶)[۳]

گویا ''قیام اللیل فی رمضان'' اور ''تراویح'' دونوں ہم معنی لفظ ہیں، تراویح کی نیت کرتے وقت ''تراویح'' کا لفظ استعمال کرلو یا ''قیامِ رمضان'' کا، برابر ہے۔

(جواب نمبر۲) احادیث وآثار میں بھی جہاں ''قیامِ رمضان'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، وہاں پر اس سے ''تراویح'' ہی مرادلیا جاسکتا ہے، اس کے علاوہ نہیں، مثلاً:-

الف:- عن سلمان الفارسی رضی الله عنه قال: خطبنا رسول الله صلی الله علیه وسلم

---

(۱) (طبع ایچ ایم سعید). (۲) (طبع دار المعرفة بیروت).
(۳) الفتاوی الخانیة علی ھامش الھندیة فصل فی نیة التراویح ج:۱ ص:۲۳۶ (طبع مکتبه حقانیه پشاور).

فی آخر یوم من شعبان، فقال: یا أیها الناس! قد أظلکم شهر عظیم، شهر مبارک، شهر فیه لیلة خیر من ألف شهر، جعل الله صیامه فریضة وقیامه تطوعا. (مشکوٰۃ بحواله بیهقی ص:۱۷۳)[1]

اور سننِ نسائی کی روایت میں ہے کہ: "افترض الله علیکم صیامه سننت لکم قیامه" یہاں پر "قیام" سے مراد "تراویح" کے علاوہ کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا، کیونکہ قیام سے اگر تہجد مراد لیا جائے گا تو "قیامه تطوعا" کا یہ جملہ بیکار ہوجائے گا، اس لئے کہ تہجد کے تطوّع ہونے میں رمضان کی کیا تخصیص ہے؟ وہ تو غیرِ رمضان میں بھی تطوّع ہے۔ معلوم ہوا کہ یہاں "قیام" سے مراد تراویح ہی ہے، اور اس "قیام" سے تراویح ہی مراد لینے کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ فقہاء رحمہم اللہ اس حدیث کو تراویح کے اثبات میں نقل فرماتے ہیں:-

(کما فی الفتح ج:۱ ص:۳۳۳،[2] والبزازیة ص:۳۱،[3] ومراقی الفلاح علی هامش الطحطاوی علی المراقی ص:۲۲۴[4]).

ب:- عن السائب بن یزید الصحابی قال: کانوا یقومون علی عهد عمر رضی الله عنه بعشرین رکعة وعلی عهد عثمان وعلی رضی الله عنهما مثله.

(عمدة القاری بحواله بیهقی ج:۵ ص:۲۶۷)[5]

اس حدیث کا سیاق وسباق واضح طور پر دلالت کر رہا ہے کہ یہاں قیام سے مراد تراویح ہے، اور حنفیہ رحمہم اللہ اس حدیث کو تراویح کی بیس رکعت ہونے پر استدلال میں پیش کرتے ہیں، کما فی العمدة۔

۳:- عام طور پر شراحِ حدیث بھی "قیامِ رمضان" سے مراد "تراویح" ہی لیتے ہیں، چنانچہ:-

الف:- صحیح مسلم میں اس طرح عنوان قائم فرمایا گیا ہے، (اگرچہ وہ تراجم، امام مسلمؒ کے قائم کردہ نہیں ہیں، تاہم یہ تراجم مستند محدثین نے لگائے ہیں)۔

باب الترغیب فی قیام رمضان وهو التراویح. (صحیح مسلم ج:۱ ص:۲۵۹)[6]

ب:- حضرتِ شیخ مولانا انور شاہ کشمیری قدس اللہ سرہ العزیز تقریر ترمذی میں لکھتے ہیں:-

---

(۱) (طبع قدیمی کتب خانه).
(۲) فتح القدیر ج:۱ ص:۴۰۶ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه).
(۳) البزازیة علی هامش الهندیة ج:۴ ص:۲۹ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه).
(۴) حاشیة الطحطاوی علی مراقی الفلاح ص:۲۲۴، ۲۲۵ (طبع نور محمد کتب خانه).
(۵) عمدة القاری (طبع دار الفکر).
(۶) (طبع قدیمی کتب خانه).

باب ما جاء في قيام شهر رمضان أى التراويح. (العرف الشذى ج:۱ ص:۳۲۹)[1]

ج:- حضرت شیخ مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ تقریر ترمذی میں نص فرماتے ہیں:-

باب في قيام رمضان، هذا القيام كان عاما ثم اختص بالتراويح، فمطلقه يراد به التراويح. (الكوكب الدرى ج:۱ ص:۲۶۷)[2]

د:- مؤطا امام محمدؒ کی وہ عبارت جو حضرتِ شیخ مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے جواب میں تحریر کی گئی ہے، اس کے سیاق و سباق سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں پر جو امام محمدؒ نے ''قیام شہر رمضان'' کا لفظ استعمال کیا ہے، اس سے مراد تراویح ہی ہے، عبارت یہ ہے:-

قال محمد: وبهذا كله نأخذ، لا بأس بالصلوٰة في شهر رمضان أن يصلى الناس تطوعا بامام، لأن المسلمين قد اجمعوا على ذلك.[3]

اس مسئلہ کی جو دلیل پیش کی گئی ہے (یعنی مسلمانوں کا اجماع) وہ صرف تراویح ہی پر صادق آتی ہے، غیرِ تراویح پر نہیں، کیونکہ غیرِ تراویح میں جماعت پر اجماع تو درکنار، اس کا نفسِ ثبوت ہی منقول نہیں، اس لئے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے ادوارِ مبارکہ میں کہیں غیرِ تراویح میں بالتداعی جماعتِ نفل کا ثبوت نہیں ملتا۔

بہرکیف! ان تمام نصوص سے جو ہم نے اس سلسلے میں اب تک پیش کیں، کم از کم اتنی بات تو بہرصورت ثابت ہوجاتی ہے کہ جہاں فقہاء وغیرہ نے قیامِ رمضان کو کراہتِ جماعت سے مستثنیٰ قرار دیا ہے، وہاں پر تراویح ہی مراد لیا ہے۔ اگرچہ فی نفسہ ''قیامِ رمضان'' کا لفظ جو حدیث ''من قام رمضان .... الخ'' میں مذکور ہے، وہ ہر نماز اور فعلِ طاعت کو عام اور شامل ہے۔

مسئلہ زیرِ بحث اور علامہ عینیؒ

مندرجہ بالا عبارتیں وغیرہ تو اس بارے میں تھیں کہ ''قیام الليل في رمضان'' جس میں جماعت کو جائز قرار دیا گیا ہے، اس سے مراد تراویح ہی ہے، لیکن چند شراحِ حدیث نے قیامِ رمضان کو عام قرار دیا ہے، جیسا کہ شارحِ بخاری علامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ جن کی عبارت کا حوالہ حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے جواب میں دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک یہ ہے کہ ''قیام الليل في رمضان'' عام ہے تراویح وغیرِ تراویح سب کو، **"ما يحصل**

---

(۱) العرف الشذى على جامع الترمذى ص:۳۰۸ (طبع قديم، مكتبه رحيميه سهارنپور).

(۲) (طبع ايچ ايم سعيد).

(۳) المؤطا للامام محمد رحمه الله ص:۱۴۳ (طبع قديمى كتب خانه).

بہ القیام مطلقاً" کے تحت قیامِ رمضان میں داخل مانا جائے گا۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو وضاحت کے ساتھ یہ بات سامنے آجائے گی کہ علامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول حدیث "من قام رمضان ایمانًا واحتسابًا غفر لہٗ" کی تشریح کے تحت آیا ہے، اس لئے اس کا حاصل یہ ہے کہ قیامِ رمضان پر جو ثواب اس حدیث میں موجود ہے، وہ صرف تراویح ہی پر نہیں، بلکہ مطلق ہر نماز پر جو رمضان کی رات میں ادا کی جائے، ثواب حاصل ہوگا۔ اس جگہ اس بحث سے کوئی تعلق نہیں کہ وہ جماعت سے ادا کی جائے یا بلاجماعت، یہی وجہ ہے کہ یہاں علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے مسئلۂ جماعت کا کوئی ذکر نہیں فرمایا، بلکہ اس مسئلہ کا ذکر علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے "باب صلوٰۃ اللیل" میں کیا ہے، اس میں ان کی عبارت یہ ہے:-

(حدیث: "صلوا أیها الناس فی بیوتکم، فان أفضل الصلوٰۃ صلوٰۃ المرء فی بیته" کے تحت فرماتے ہیں:)

واستثنی من عموم الحدیث عدة من النوافل ففعلها فی غیر البیت أکمل، وهی ما تشرع فیه الجماعة، کالعیدین، والاستسقاء والکسوف.

پھر چند سطروں کے بعد فرماتے ہیں:-

قال الامام حمید الدین الضریر: نفس التراویح سنة، اما اداؤها بالجماعة فمستحب.

پھر ایک سطر کے بعد ہے:-

وفی جوامع الفقه: التراویح سنة مؤکدة، والجماعة فیها واجبة، وفی الروضة لأصحابنا ان الجماعة فضیلة، وفی الذخیرة لأصحابنا عن أکثر المشائخ أن اقامتها بالجماعة سنة علی الکفایة. (عمدۃ القاری ج:۵ ص:۲۶۷)[1]

خلاصہ یہ ہے کہ علامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ نے جہاں قیامِ رمضان کے عموم کو ذکر کیا ہے، وہاں مسئلۂ جماعت ذکر نہیں کیا، اور جہاں مسئلۂ جماعت بیان فرمایا ہے وہاں مستثنیات میں قیامِ رمضان کو ذکر نہیں کیا، بلکہ بلفظ "تراویح" ذکر فرمایا ہے، لہٰذا ان کے قول سے کہ یہ قیام شہر رمضان کا لفظ عام ہے، تراویح کے سوا دُوسری نوافلِ رمضان کی جماعت جائز ہونے پر استدلال غیر صحیح ہے۔

اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اس بحث میں درحقیقت فقہاء علیہم الرحمۃ میں کوئی اختلاف نہیں، سب کے نزدیک جماعت صرف تراویح کی جائز ہے، البتہ کلام اس میں ہے کہ حدیث "من قام رمضان ایمانًا" میں جو فضیلت موجود ہے، وہ صرف تراویح کے لئے مخصوص ہے یا مطلق صلوٰۃ

(۱) مذکورہ تمام عبارات عمدۃ القاری (طبع دار احیاء التراث بیروت) کے اسی صفحہ (ج:۵ ص:۲۶۷) پر موجود ہیں۔

پر وہ فضیلت حاصل ہوگی؟ اس میں علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے عموم کا قول اختیار فرمایا ہے، اور علامہ نووی اور علامہ کرمانی رحمہما اللہ نے دُوسرا (علی ما ذکرہ العینیؒ)۔ اس تفصیل سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ جو جماعتِ دیوبند میں ابوحنیفۂ عصر کا لقب رکھتے تھے، ان کا فتویٰ جمہور علماء وفقہاء کی تحقیق کے عین مطابق ہے، اس کو قولِ مرجوح پر عمل قرار دینا فہم عاجز سے بالاتر ہے۔ رہا حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن قدس اللہ سرہ العزیز کا عمل، تو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا عمل تو معلوم نہیں، البتہ حضرت شیخ الہندؒ کے متعلق اتنی بات یقین کے درجے میں معلوم ہے کہ آپؒ نے شروع میں تہجد کی جماعت لاعلیٰ سبیل التداعی ایک دو افراد کے ساتھ کی تھی، لیکن بعد میں جب لوگ زیادہ آنے لگے تو اسی کراہت کی وجہ سے آپؒ نے ساری رات تراویح کا معمول بنالیا تھا، عموماً آٹھ دس پارے تراویح میں جماعت سے پڑھے جاتے تھے اور تراویح ہی سحری کے وقت ختم کی جاتی تھی، جس کے شاہد دیوبند میں آج بھی سینکڑوں حضرات ہوں گے، **واللہ أعلم بحقیقۃ الحال۔**

ایک ضروری گزارش

آخر میں گزارش ہے کہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہ العزیز کی عظمتِ شان، جلالتِ قدر اور علمی تبحر کے پیشِ نظر تو اس مسئلہ پر قلم اُٹھانے کی جرأت کسی بڑے عالم کو بھی نہیں ہونی چاہئے، چہ جائیکہ مجھ جیسا طفلِ مکتب اس پر کچھ لکھے۔ لیکن الحمدللہ جماعتِ دیوبند کی خصوصیت اور انہی بزرگوں کی تعلیم وتلقین نے ہمیں یہ صراطِ مستقیم دِکھائی کہ مسائلِ شرعیہ میں آزادانہ اظہارِ رائے ترکِ ادب نہیں، بلکہ شاگردوں کا اظہارِ خیال انہی بزرگوں کا معنوی فیض ہوتا ہے۔ اس لئے بنام خداتعالیٰ جو کچھ اس میں تحقیق سے مجھے واضح ہوا وہ لکھ دیا، اور اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتا ہوں کہ بزرگوں کی شان میں ادنیٰ ترکِ ادب سے بھی مجھے محفوظ رکھیں، آمین۔

اللّٰھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ، وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ، واٰخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین.

احقر العباد
محمد تقی عثمانی عفی عنہ
متعلم دارالعلوم کراچی نمبر۱۴
۳رشوال ۱۳۷۸ھ - ۱۳؍اپریل ۱۹۵۹ء

للہ در المجیب حیث أصاب فیما أجاب وأجاد فیما أفاد، مع ملاحظۃ ادب الأکابر، وفقہ اللہ تعالیٰ لما یحب ویرضی۔

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ
صدر دارالعلوم کراچی نمبر۱۴
۸رشوال ۱۳۷۸ھ

﴿فصل فی التراویح﴾
(تراویح اور شبینہ سے متعلق مسائل)

چار تراویح کے بعد وقفے میں کیا پڑھنا چاہئے؟

سوال:- تراویح کی ہر چار رکعت کے بعد کیا آیت پڑھی جاتی ہے؟ یہ سنت ہے یا واجب یا مستحب؟ اور یہ آیات صرف امام صاحب پڑھیں یا مقتدی بھی؟ زبانی یاد نہ ہو تو دیکھ کر پڑھ سکتے ہیں؟

جواب:- تراویح میں ہر چار رکعت کے بعد عام رکعتوں کی مقدار بیٹھنا مستحب ہے، اس وقفے میں کوئی خاص ذکر واجب یا مسنون نہیں ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ اس میں چاہے کچھ تسبیحات پڑھ لے، چاہے الگ نفلیں پڑھے اور چاہے تو خاموش رہے۔[1] اور مشائخ کا معمول یہ ہے کہ اس میں یہ تسبیح پڑھتے ہیں: "سبحان ذی الملک والملکوت، سبحان ذی العزة والعظمة والقدرة والکبریاء والجبروت، سبحان الملک الحی الذی لا یموت، سبوح قدوس رب الملائکة والروح، لا الٰہ الّا اللہ نستغفر اللہ نسألک الجنة ونعوذ بک من النار" (کذا فی رد المحتار من القهستانی)۔[2] اور یہ تسبیح آہستہ پڑھنی چاہئے امام کو بھی اور مقتدی کو بھی۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۲۱ھ

تراویح پر اُجرت کا مسئلہ

سوال:- میں زیادہ تر باہر رہتا ہوں اور پاکستان میں کبھی کبھی آتا ہوں، اس سال یہاں نمازِ تراویح پڑھنے کا اتفاق ہوا، سوال یہ ہے کہ ایک نوجوان حافظ جس کی عمر ۲۵ سال کے قریب ہے، مستند حافظ ہے، قراءت بھی قابلِ اعتراض نہیں ہے، خود اپنی تجارت کرتے ہیں بلکہ خود اکثر و بیشتر مسجد کی مدد کرتے ہیں، اور مسجد سے کسی قسم کی اُجرت نہیں لیتے، لیکن کچھ لوگ اس سے خوش نہیں ہیں، اور باہر سے رمضان کے لئے حافظ لانا چاہتے ہیں، اور ان کو ختمِ قرآن پر رقم بھی دینی پڑے گی، کیا یہ جائز ہے؟

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۴۶ یجلس ندبا بین کل أربعة بقدرها .... ویخیرون بین تسبیح وقراءة وسکوت وصلوٰة فرادی.

(۲) وفی الشامیة ج:۲ ص:۴۶ (طبع ایچ ایم سعید) (قوله بین تسبیح) قال القهستانی: فیقال ثلاث مرات: "سبحان ذی الملک والملکوت .... الخ".

جواب:- اُجرت پر تراویح پڑھانے کے لئے کسی حافظ سے معاملہ کرنا قطعاً ناجائز ہے،[1] اور جب مسجد کے حافظ صاحب بلا اُجرت نماز پڑھاتے ہیں اور لوگ بھی ان سے خوش ہیں تو خواہ مخواہ باہر سے اُجرت پر حافظ بلوانا بالکل نا دُرست ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۸/۹/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۷۸ ج)

تراویح پر اُجرت لینا

سوال:- رمضان میں حافظِ قرآن کے لئے لوگ چندہ جمع کرتے ہیں، اس کو کپڑے وغیرہ دیتے ہیں، یا پہلے سے پیسے مقرّر کر کے حافظ کو لاتے ہیں، کیا یہ جائز ہے؟

جواب:- تراویح پڑھانے کے لئے اُجرت مقرّر کرنا بالکل ناجائز ہے،[2] اگر بغیر اُجرت کے حافظ نہ ملتا ہو تو "اَلَمْ تَرَ کَیْفَ .... الخ" سے تراویح پڑھی جائے۔ ہاں! اگر کسی اُجرت کے بغیر کسی حافظ نے تراویح پڑھائی اور کوئی شخص اپنی خوشی سے بطورِ ہدیہ اس کو کچھ پیش کرے تو اس کا لینا دینا جائز ہے، لیکن اوّل تو آج کل اس کا اتنا التزام کیا جاتا ہے کہ وہ بھی ایک طرح سے طے شدہ اُجرت بن جاتی ہے، ایسے التزام سے پرہیز لازم ہے۔ دُوسرے اس غرض کے لئے چندہ کرنے میں بہت سے مفاسد ہیں، اس سے پرہیز کرنا چاہئے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۲۱/۱۰/۱۴۰۱ھ
(فتویٰ نمبر ۳۲/۱۶۰۰ ج)

تراویح پر اُجرت لینے کا حکم

سوال ۱:- احقر قرآن مجید حفظ کر لینے کے بعد اپنے ملکی رواج کے مطابق تراویح میں قرآن مجید سنا کر رقم لیتا رہا، چند سالوں سے توبہ کی ہے اور رقم لینا چھوڑ دیا۔ لی ہوئی رقم حقوق العباد میں داخل تو نہیں؟ کیا صرف اللہ تعالیٰ سے توبہ کافی ہے؟ واضح رہے کہ احقر اس دوران میں صاحبِ نصاب نہ تھا، نیز ختم والی رات سے پہلے اشرافِ نفس بھی ہوتا تھا۔

۲:- امسال رمضان المبارک میں ختم والی رات رقم لینے سے انکار کر دیا، لیکن اس کے بعد کچھ

---

(۱) وفی الشامیة ج:۶ ص:۵۶ ویمنع القاری للدنیا، والآخذ والمعطی آثمان. فالحاصل ان ما شاع فی زماننا من قراءة الأجزاء بالأجرة لا یجوز، لأن فیه الأمر بالقراءة واعطاء الثواب للآمر والقراءة لأجل المال، فاذا لم یکن للقاری ثواب لعدم النیة الصحیحة فأین یصل الثواب الی المستأجر، ولو لا الأجرة ما قرأ احد لأحد فی هذا الزمان جعلوا القرآن العظیم مکسبا ووسیلة الی جمع الدنیا، اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ. نیز دیکھئے: امداد المفتین ص:۳۶۵، و فتاوی دارالعلوم دیوبند ج:۴ ص:۲۲۲ و ۲۹۸، و امداد الاحکام ج:۱ ص:۲۵۴.

(۲) دیکھئے حوالہ سابقہ۔

آدمی مخفی طور پر احقر کے پاس آئے اور کہا کہ ہم آپ کی خدمت اس لئے نہیں کرتے کہ آپ نے قرآن مجید سنایا، بلکہ طالبِ علم جان کر بطورِ ہدیہ یا صدقہ کے دیتے ہیں، تو احقر نے ان کے اصرار پر کچھ رقم قبول کی، کیونکہ اس سے پہلے احقر کو کسی قسم کا اشراف وانتظار اس رقم کا نہ تھا۔

وہ رقم میرے لئے حرام تو نہیں تھی؟ اگر حرام تھی تو اس سے خلاصی کی کیا صورت ہے؟

جواب ۱:- تراویح سنانے پر اُجرت لینا ناجائز ہے،[۱] لہٰذا یہ رقم اس کے اصل مالکوں کو واپس کرنا ضروری ہے، جن جن لوگوں تک پہنچانا وسعت میں ہو ان کو پہنچایا جائے یا ان سے معاف کرایا جائے، اور جہاں پہنچانا وسعت سے باہر ہو، اس کے لئے توبہ و استغفار کیا جائے۔

۲:- صورتِ مسئولہ میں جو رقم لے لی گئی وہ اُجرت نہیں، ہدیہ ہے جس کا وصول کرنا جائز ہے۔

واللہ اعلم
بندہ محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۱/۱ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۳۷/ ۱۸ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

شبینہ کا حکم

سوال:- ایک شخص شبینہ کا انتظام کرتا ہے، یعنی متعدد حفاظِ قرآن کو دعوت دے کر ایک ہی رات میں قرآن ختم کیا جاتا ہے، بعض نوافل میں تلاوت کرتے ہیں اور دیگر اس کی اقتداء کرتے ہیں، اور بعض بلا اقتداء تلاوت کرتے ہیں، کیا یہ جائز ہے؟

جواب:- جس قسم کے شبینہ کا ذکر سوال میں کیا گیا ہے اس کا اہتمام مکروہ ہے، کیونکہ وہ نوافل کی جماعت اور ایک رات میں قرآنِ کریم ختم کرنے پر مشتمل ہے، اور یہ دونوں مکروہ ہیں۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۹/۲/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۲۱۹/ ۱۲ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۴۶۰ اور اس کا حاشیہ نمبر۱۔

۱:- تراویح پر اُجرت کا مسئلہ
۲:- جماعت کے ساتھ فرض نہ پڑھنے والا تراویح میں امام بن سکتا ہے یا نہیں؟

سوال ۱:- تراویح کے لئے پیسے طے کرنا حرام ہے، مگر مولانا تھانویؒ و دیگر کچھ حضرات کہتے ہیں اگر طے نہ کیا جائے، لوگ خوشی سے دے دیں تب بھی جائز نہیں، جس کے بعض صحابہؓ سے دلائل دیتے ہیں، مگر وہ حافظ جو طے نہیں کرتے خوشی سے جو دیتے ہیں، لے لیتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ وہ ہدیہ ہے جو لینا سنت ہے، تو اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ آیا حافظ پیسے، جوڑا، جوتا خوشی سے دیا ہوا لے سکتا ہے یا ناجائز ہے؟ اگر ناجائز ہے تو کیوں؟

۲:- کوئی حافظ گھر سے دیر میں پہنچا، مسجد میں جماعت ہوچکی، اس نے انفرادی نماز پڑھی تو کیا تراویح یا وتر پڑھا سکتا ہے؟

جواب ۱:- تراویح پر اُجرت لینا طے کرکے بھی حرام ہے،[۱] اور اگر زبانی طور پر طے نہ کیا جائے لیکن عرف و رواج ایسا ہو کہ زبانی طے کئے بغیر بھی لینا دینا طے سمجھا جاتا ہو تو اس صورت میں بھی ناجائز ہے،[۲] البتہ اگر نہ زبانی طے کیا ہو، نہ عرفاً طے سمجھا جاتا ہو، نہ حافظ کے دِل میں تراویح پڑھانے کا محرک یہ ہو کہ کچھ ملے گا، اس کے بعد اگر مسجد والے اپنی خوشی سے کچھ دے دیں تو لینے کی گنجائش ہے۔

۲:- پڑھا سکتا ہے۔[۳]

واللہ اعلم
۱۳۹۹/۱۰/۱۰ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹۸۰/۳۰ د)

۲۳ویں رات میں سورۂ عنکبوت اور رُوم پڑھنا

سوال:- ہمارے دیار میں رمضان کی تیئیسویں رات کو تراویح کے بعد سورۂ عنکبوت اور سورۂ رُوم نمبر ۲۰، نمبر ۲۱ پڑھنے کا رواج ہے، کیا ان سوَر کے پڑھنے کا ثبوت ہے یا نہیں؟

---

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ۔

(۲) وفي الشامية ج:۳ ص:۱۳۰ (طبع سعيد) المعروف كالمشروط.

(۳) وفي الشامية، مبحث التراويح ج:۲ ص:۴۸ (طبع سعيد) لو صليت بجماعة الفرض وكان رجل قد صلّى الفرض وحده، له أن يصليها مع ذلك الامام، لأن جماعتهم مشروعة، فله الدخول فيها معهم لعدم المحذور.
وفي الهندية ج:۱ ص:۱۱۷ صلّى العشاء وحده، فله أن يصلي التراويح مع الامام .... الخ. وفي غنية المتملي ص ۴۱۰ (طبع سهيل اكيڈمي لاهور) لو صلّى العشاء وحده، فله أن يصلّي التراويح مع الامام وهو الصحيح ... الخ.
نیز دیکھئے: کفایت المفتی ج:۳ ص:۳۹۳ (جدید ایڈیشن دارالاشاعت)۔

جواب:- ہمارے علم میں اس کا کوئی ثبوت نہیں، نہ اس کی پابندی کی کوئی شرعی بنیاد ہے۔

واللہ اعلم

۱۰/۱۲/۱۳۹۷ھ

شبینہ کا حکم

سوال:- رمضان المبارک میں شبینہ سننا یا سنانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- قرآن شریف جتنا زیادہ سے زیادہ تلاوت کیا جائے اتنا ہی موجبِ ثواب و خیر و برکت ہے، خواہ نماز میں ہو یا غیرِ نماز میں، نماز میں اور زیادہ ثواب ہے، لیکن نفلی نماز کی جماعت دو تین آدمیوں سے زیادہ کی مکروہ ہے،[۱] بغیر جماعت کے تنہا، یا دو تین آدمیوں کی جماعت میں پورا قرآن شریف تین یا زیادہ راتوں میں ختم کرنا بہت بڑا ثواب کا کام ہے، لیکن جس طرح کے شبینے اب رائج ہوگئے ہیں کہ نفلی جماعت کے لئے لوگوں کو دعوت دی جاتی ہے اور جماعت بھی تین سے زیادہ آدمیوں کی ہوتی ہے، جو لوگ نماز میں شامل نہیں ہوتے وہ باتیں کرتے رہتے ہیں، یا مٹھائی وغیرہ کے انتظام میں لگے رہتے ہیں، قرآن شریف سننے کی طرف دھیان نہیں کرتے، یہ ناجائز ہے۔ واللہ اعلم

۱۰/۱۲/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۴۹/۲۸ ج)

شبینہ کا حکم

سوال ۱:- شعبان کی ۱۳، ۱۴، ۱۵ کو شبینہ کیا جاتا ہے، اس میں حفاظ پارے پڑھتے ہیں، ایسے شبینہ میں نیت باندھ کر امام کی اقتداء میں قرآن سننے کا کیا حکم ہے؟ کیا اس طرح قرآن سننا جائز ہے؟ ۲:- شبینہ میں قرآن پڑھنا اور اس میں حصہ لینا کیا حکم رکھتا ہے؟ ۳:- اس مسجد میں حاضر رہنا اور شبینہ کے کاموں میں تعاون و امداد کرنے کا کیا حکم ہے؟

جواب ۱ تا ۳:- حنفی مسلک میں نوافل کی جماعت مکروہِ تحریمی ہے۔[۲] لہٰذا مذکورہ شبینہ

---

(۱) وفی غنیة المتملی ج:۱ ص:۴۱۱ واعلم ان النفل بالجماعة علیٰ سبیل التداعی مکروہ علیٰ ما تقدم ما عدا التراویح .... الخ. وفی الدر المختار ج:۲ ص:۴۸ (قبیل باب ادراک الفریضة) ولا یصلّی الوتر ولا التطوع بجماعة خارج رمضان أی یکرہ ذٰلک علیٰ سبیل التداعی بأن یقتدی أربعة بواحد کما فی الدرر، وکذا فی فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج:۴ ص:۲۲۴ و ص:۲۴۸.

(۲) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۴۸ (طبع سعید) (قبیل باب ادراک الفریضة) ولا یصلّی الوتر ولا التطوع بجماعة خارج رمضان أی یکرہ ذٰلک علیٰ سبیل التداعی بأن یقتدی أربعة بواحد. وفی غنیة المتملی ص:۴۳۲ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور) واعلم ان النفل بالجماعة علیٰ سبیل التداعی مکروہ علیٰ ما تقدم ما عدا التراویح .... الخ.

(محمد زبیر حق نواز عفا اللہ عنہما)

جائز نہیں۔ ایسے شبینہ کا انتظام و اہتمام، اس میں امامت یا اقتداء یا اس میں لوگوں کو دعوت دینا یہ تمام باتیں شرعاً جائز نہیں۔ واللہ اعلم

۱۳۹۷/۸/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۸۸۶/۲۸ ج)

شبینہ کا حکم، جائز شبینہ کس طرح ہوسکتا ہے؟

سوال ۱:- آج کل جو رمضان شریف میں شبینہ ہوتے ہیں، اکثر حفاظ نوافل میں پڑھتے ہیں اور بعض نابالغ بچوں سے پڑھواتے ہیں جبکہ مقتدی بالغ ہوتے ہیں، اور لاؤڈ اسپیکر بھی استعمال ہوتا ہے جس سے اہلِ محلّہ کی نیندیں اُڑ جاتی ہیں، نیز سننے والے چند اشخاص ہوتے ہیں، اکثر چائے پانی میں مشغول ہوتے ہیں، اور شور وشغب کا بازار گرم رہتا ہے، نیز ان شبینوں کی سرپرستی علماء کو بھی کرتے دیکھا ہے، کیا مروّجہ شبینہ جائز ہے؟ ۲:- شبینہ کا مسنون طریقہ کیا ہے؟ ۳:- کیا جہری نماز میں لاؤڈ اسپیکر پر پڑھنا زیادہ ثواب ہے جبکہ آواز دُور دُور تک جاتی ہے؟

جواب ۱:- جس قسم کے شبینے کا آپ نے ذکر فرمایا ہے، وہ بلاشبہ مکروہِ تحریمی ہے اور اس میں ثواب کے بجائے اُلٹا گناہ ہے، اوّل تو نوافل کی جماعت مکروہِ تحریمی ہے[1]، پھر نابالغ کی اقتداء[2]، بلاضرورت لاؤڈ اسپیکر کا استعمال اور شور وشغب کے ذریعے قرآنِ کریم کی بے ادبی، یہ سب اُمور سخت منکرات ہیں اور ان سے پرہیز لازم ہے۔

۲:- جائز شبینہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ تراویح کی جماعت رات بھر جاری رہے، اس میں امام بالغ اور متشرّع ہو، تین دن سے کم میں قرآنِ کریم ختم نہ کیا جائے، تمام لوگ ذوق وشوق اور خشوع و خضوع کے ساتھ قرآنِ کریم سنتے ہوں، زائد روشنی اور چراغاں سے پرہیز کیا جائے، بلاضرورت لاؤڈ اسپیکر کا استعمال نہ ہو اور نام ونمود سے کلی اجتناب کیا جائے۔ واللہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۹ھ

(فتویٰ نمبر ۹۲۲/۲۸ ج)

شبینہ کے جواز کی شرائط

سوال:- مساجد میں رمضان المبارک میں شبینہ ہوتا ہے، بعض ناجائز کہتے ہیں، بعض جائز۔ شرعاً اس کی کیا حیثیت ہے؟ شبینہ کے جواز کی شرائط براہ کرم بتادیں۔

---

(۱) دیکھئے پچھلے صفحے کا حاشیہ نمبر۲۔

(۲) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۵۷۷، ۵۷۸ ولا یصح اقتداء رجل بامرأۃ وخنثی وصبی مطلقا ولو فی جنازۃ ونفل علی الأصح، وفی الشامیۃ تحتہ والمختار أنہ لا یجوز فی الصلوات کلھا .... الخ.

جواب:- شبینہ تراویح میں ہو، نفلوں میں نہ ہو۔ فضول خرچی، شور وشغب اور نام ونمود سے احتراز کیا جائے، اور اس کی فرائض و واجبات کی طرح پابندی نہ کی جائے تو جائز ہے، اور ان میں سے کوئی ایک شرط بھی نہ پائی گئی تو ناجائز ہے۔[۱] واللہ اعلم

۱۳۹۸/۹/۲۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۰۰۱/۲۹ ج)

تراویح میں تین بار سورۂ اِخلاص پڑھنا

سوال ۱:- کسی مسجد کے امام صاحب فرماتے ہیں کہ تراویح میں آخری پارہ میں سورۂ اِخلاص تین مرتبہ پڑھنا دُرست ہے، جبکہ زید کہتا ہے کہ سورۂ اِخلاص کا تین مرتبہ پڑھنا بدعت ہے۔ (سند بہشتی زیور جلد گیارہ)۔

۲:- امام نے تراویح کی دو رکعت کی نیت باندھی، لیکن دُوسری رکعت میں التحیات پڑھے بغیر کھڑا ہوگیا، تقریباً پانچ سیکنڈ کے بعد امام صاحب پھر بیٹھ گئے، اور حسبِ معمول دونوں رکعتیں پوری کرکے سلام پھیردیا۔ زید کا یہ اعتراض ہے کہ امام صاحب کے گھٹنے اور کمر سیدھی ہوگئی، لہٰذا چار رکعت پوری کرکے سجدۂ سہو کرکے چار پوری کرنی چاہئے تھی۔ صحیح مسئلہ کیا ہے؟

جواب ۱:- جماعت کی نماز میں کسی آیت یا سورت کو بار بار پڑھنا فقہاء نے مکروہ لکھا ہے،[۲] اور آج کل تراویح میں سورۂ اِخلاص کو تین بار پڑھنے کا جو التزام کرلیا گیا ہے کہ اسے سنت سمجھتے ہیں، اس سے اس کے بدعت ہونے کا بھی اندیشہ ہے، لہٰذا اس عمل سے پرہیز ہی کرنا چاہئے۔ بہشتی گوہر میں مسئلہ صحیح ہے اور امداد الفتاویٰ ج:اوّل ص:۳۰۴ میں بھی اسی پر فتویٰ ہے۔[۳]

۲:- امام صاحب نے جو عمل کیا وہ دُرست ہے، دو رکعت کی فرض نماز میں اور سنن ونوافل میں پوری طرح کھڑے ہونے کے بعد بھی بیٹھ سکتے ہیں۔ زید نے جو مسئلہ بیان کیا وہ چار رکعت کی فرض نماز کے قعدۂ اُولیٰ سے متعلق ہے، صورتِ مسئولہ سے اس کا تعلق نہیں۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۱۰/۹ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۲۸/۲۸ ج)

---

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۴۶۳ حاشیہ نمبر۱۔

(۲) وفی الهندية ج:۱ ص:۱۰۷ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ) اذا كرّر اٰية واحدة مرارًا ..... ان كان فی الصلوٰة المفروضة فهو مكروه فی حالة الاختيار وأما فی حالة العذر والنسيان فلا بأس. هكذا فی المحيط. وكذا فی غنية المتملی ص:۴۹۴ (طبع سهيل اكيڈمی لاهور)۔ نیز دیکھئے: امداد الاحکام ج:۱ ص:۶۶۵ (طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی)۔

(۳) امداد الفتاوی ج:۱ ص:۳۲۷، ۳۲۸ (طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی)۔

تراویح میں قرآن پڑھے جانے کے باوجود الگ سے "اَلَمْ تَرَ کَیْفَ" سے تراویح پڑھنا

سوال:- ایک مسجد میں تراویح میں باقاعدہ ختم قرآن ہوتا ہے اور بلا اُجرت، لیکن اسی مسجد میں کچھ لوگ "اَلَمْ تَرَ کَیْفَ" سے تراویح پڑھتے ہیں، یہ جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- جب مسجد میں ایک حافظ صاحب قاعدے میں تراویح میں قرآنِ کریم سنا رہے ہیں تو ان کی تراویح کی موجودگی میں "اَلَمْ تَرَ کَیْفَ .... الخ" سے الگ تراویح بلاعذر نہ پڑھنی چاہئے، ہاں! اگر کوئی عذر ہو تو اسے بالتفصیل لکھ کر مسئلہ دوبارہ معلوم کرلیں۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۱۶ھ

تراویح کو ضروری نہ سمجھنا اور بلاعذر تراویح ترک کرنا

سوال:- ایک صاحب کہتے ہیں کہ تراویح سنت ہے، پڑھے یا نہ پڑھے کوئی گناہ نہیں۔ ایسے شخص کے بارے میں شریعتِ مطہرہ میں کیا حکم ہے؟

جواب:- تراویح سنتِ مؤکدہ ہے، اور اس کے بارے میں یہ کہنا کہ پڑھے یا نہ پڑھے کچھ گناہ نہیں، بالکل غلط ہے۔ جو صاحب ایسا کہتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔[1] واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۴ھ

تراویح میں ایک مرتبہ ختمِ قرآن سنت ہے

سوال:- ایک مسجد میں دو جگہ تراویح بیک وقت ہوتی ہے، ان دونوں کی قراءتیں مختلط ہوکر سہو کی وجہ بن جاتی ہیں۔ ان دو اماموں میں سے ایک امام الٰہی ہے جو "اَلَمْ تَرَ کَیْفَ" سے اختصار کے ساتھ پڑھتا ہے، قوم کی اکثریت امام الٰہی کے ساتھ ہے، اور دُوسرا حافظِ قرآن ہے، وہ ختم کرتا ہے، اپنے عزیز و اقارب کو سمجھا کر شریک کرتا ہے، اور قوم کو یہ کہتا ہے کہ یہ مختصر تراویح نہیں ہوتی۔ امام الٰہی کہتا ہے کہ جب قوم پر ختمِ قرآن ثقیل ہو تو اس کا ترک افضل ہے۔ **الأفضل فی زماننا قدر ما لا یثقل علی القوم**۔ اور کہتا ہے کہ ختم قرآن ضرورتِ دین سے نہیں ہے، اور جب ضروریاتِ دین سے نہ ہو تو اس کو ترک کیا جاسکتا ہے۔

---

(۱) فی الهندیة ج:۱ ص:۱۱۲ رجل ترک سنن الصلوة ان لم یر السنن حقا فقد کفر. لأنه ترکها استخفافا. وان راها حقا فالصحیح انه یأثم، لأنه جاء الوعید بالترک، وفی البحر الرائق ج:۲ ص:۴۹ (طبع ایچ ایم سعید) رجل ترک سنن الصلوات الخمس ان لم یر السنن حقا فقد کفر لأنه ترک استخفافا وان رای حقا منهم من قال لا یأثم والصحیح انه یأثم، لأنه جاء الوعید بالترک اهـ. وراجع أیضا الشامیة ج:۱ ص:۱۰۳ (محمد زبیر)

جواب:- قال في الدر: والختم مرة سُنّة ومرتين فضيلة وثلاثًا أفضل، ولا يترك الختم لكسل القوم لكن في الاختيار الأفضل في زماننا قدر ما لا يثقل عليهم، وأقره المصنف وغيره، وفي المجتبى عن الامام لو قرأ ثلاثًا قصارًا أو اٰية طويلة في الفرض فقد أحسن ولم يسيئ فما ظنك بالتراويح؟ (الٰى) من لم يكن عالمًا بأهل زمانه فهو جاهل، وأقره الشامي ج:۱ ص:۴۷۵۔[1]

مذکورہ عبارت سے معلوم ہوا کہ تراویح میں ایک مرتبہ قرآنِ کریم ختم کرنا سنت ہے، اور یہ جو فقہاء نے لکھا ہے کہ جب مقتدیوں پر طویل قراءت ثقیل ہو اس وقت چھوٹی سورتوں سے تراویح پڑھنی چاہئے، یہ بالکل مجبوری کی صورت میں ہے، یہ مجبوری ہمارے زمانے میں ایسی نہیں ہے کہ اس کی بناء پر مسجدوں میں اس سنت کو ترک کردیا جائے، بلکہ تمام مساجد میں قرآنِ کریم ختم ہوتا ہے اور مقتدی ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں، لہٰذا اس سنت کو مساجد میں بغیر مجبوری کے ترک نہ کرنا چاہئے، بالخصوص جبکہ قرآنِ کریم سنانے کے لئے حافظ موجود ہے تو امام الحی کو چاہئے کہ تراویح اس سے پڑھوائے اور خود "اَلَمْ تَرَ کَیْفَ" سے پڑھنے پر اصرار نہ کرے، معاملہ دین کا ہے اس میں خواہ مخواہ انتشار پیدا کرنا دُرست نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۹/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۲۹۹۷/۲۷ ھ)

تراویح سے متعلق متعدّد مسائل

۱:- پہلے سے طے کئے بغیر تراویح کے اختتام پر کچھ دینا
۲:- بچے کو سامع بنانا
۳:- حافظ صاحب کا لقمہ قبول نہ کرنا
۴:- اختتام پر پہلی رکعت میں سورۂ ناس اور دُوسری رکعت میں سورۂ بقرہ کا ابتدائی حصہ پڑھنا

سوال ۱:- رمضان میں تراویح جو حافظ پڑھاتے ہیں، وہ رقم مقرّر کرکے پڑھتے ہیں تو کیا نماز جائز ہوگی؟ اگر رقم مقرّر نہ کی گئی ہو اور تراویح کے خاتمے پر کچھ رقم دے دی جائے تو وہ نماز جائز ہوگی یا نہیں؟

---

(۱) الدر المختار ج:۲ ص:۴۷ (طبع ایچ ایم سعید).

۲:- حافظ صاحب اپنا سامع ساتھ لائیں جو ایک بچہ ہو، اور تراویح میں سوجائے یا ایسی حرکتیں کرے جس سے نماز ٹوٹ جاتی ہے اور لقمہ بھی نہ دے، تو ان حافظ صاحب کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے؟

۳:- اگر حافظ صاحب لقمہ قبول نہ کریں اور متکبرانہ الفاظ استعمال کریں کہ میں ٹھیک پڑھتا ہوں، اگر وہ غلط بھی پڑھیں تو لقمہ نہ لیں، تو کیا یہ نماز جائز ہوگی؟

۴:- اگر سورۂ ناس پہلی رکعت میں پڑھی جائے اور سورۂ بقرہ دُوسری رکعت میں تو اس سے نماز ٹھیک ہوگی یا نہیں؟

۵:- اگر پیش امام، نماز میں لقمہ قبول نہ کرے تو اس کے پیچھے نماز جائز ہے؟ جبکہ وہ بار بار غلطیاں کرتا ہو۔

جواب ۱:- اُجرت طے کرکے تراویح سنانا بالکل ناجائز ہے[1]، اس سے بہتر ہے کہ لوگ عام امام کے پیچھے "اَلَمْ تَرَ کَیْفَ" سے تراویح پڑھ لیں۔ جو حافظ اُجرت لے کر تراویح سناتا ہو اس کے پیچھے نماز مکروہ ہے، البتہ جو نماز اس کے پیچھے پڑھ لی وہ ہوگئی، اعادہ واجب نہیں۔

پہلے سے طے کئے بغیر تراویح کے اختتام پر کچھ دے دینا جائز ہے، بشرطیکہ یہ بات اتنی معروف ومشہور نہ ہوگئی ہو کہ طے کئے بغیر بھی طے سمجھی جاتی ہو۔

۲:- بچے کو سامع بناکر پہلی صف میں کھڑا کرنے کی ضرورۃً گنجائش ہے، اس بچے سے اگر کبھی غلطی ہوجائے تو درگزر کرنا اور فہمائش کرنا چاہئے، محض اس بناء پر امام یا حافظ کے خلاف فتنہ کھڑا کرنا دُرست نہیں۔

۳:- حافظ صاحب کو صحیح لقمہ قبول کرنا چاہئے اور اس کو ذاتی عزّت و وقار کا مسئلہ نہیں بنانا چاہئے، البتہ اس سے نماز میں خلل نہیں آتا، تاوقتیکہ حافظ صاحب نے کوئی مفسدِ صلوٰۃ غلطی نہ کی ہو۔

۴:- ٹھیک ہوگی، اس میں کوئی گناہ نہیں، البتہ ختمِ قرآن کے علاوہ دُوسری نمازوں میں بہتر یہ ہے کہ پہلی رکعت میں سورۂ ناس نہ پڑھے[2]۔

۵:- نماز کا صحیح ہونا یا نہ ہونا غلطیوں کی نوعیت پر منحصر ہے، بعض غلطیوں سے نماز فاسد ہوجاتی

---

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۴۶۰ حاشیہ نمبر۱۔

(۲) وفي غنية المتملي شرح المنية ص:۴۹۴ (طبع سهيل اكيذمي لاهور) وفي الولوالجية: من يختم القران في الصلاة اذا فرغ من المعوذتين في الركعة الأولى يركع ثم يقوم في الركعة الثانية ويقرأ بفاتحة الكتاب وشئ من سورة البقرة، لأن النبي صلى الله عليه وسلم قال: خير الناس الحال المرتحل، أي الخاتم المفتتح.

ہے اور بعض سے نہیں ہوتی، لہٰذا ہر غلطی کا حکم الگ پوچھنا چاہئے، اور جو حافظ صاحب کثرت سے غلطیاں کرتے ہوں اور صحیح لقمہ بھی قبول نہ کرتے ہوں ان کے بجائے کوئی اچھے حافظ صاحب تلاش کرنے چاہئیں، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وہ بعض غلطیاں مفسدِ نماز کر جائیں۔

واللہ تعالیٰ اعلم
۹/۱۹/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۹۶۷/۲۸ ج)

داڑھی منڈانے والے کی اقتداء میں تراویح پڑھنا

سوال:- رمضان میں اکثر حافظ جو مساجد میں قرآن شریف سناتے ہیں، داڑھی نہیں رکھتے یا ان کی شرعی داڑھی نہیں ہوتی، تو کیا اس قسم کے حفاظ کے پیچھے نماز ہوسکتی ہے؟ فرض نماز اور نمازِ تراویح دونوں کے لئے از رُوئے فقہِ حنفی کیا حکم ہے؟

جواب:- جو شخص داڑھی منڈاتا ہو یا شرعی مقدار سے کم داڑھی رکھتا ہو اس کے پیچھے نماز مکروہ ہے۔[1] تراویح اور فرض نمازوں کا ایک ہی حکم ہے، البتہ جو نماز ایسے شخص کے پیچھے پڑھ لی گئی وہ ادا ہوگئی۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳/۱۰/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۲۳۸/۳۹ ہ)

کھڑے ہوکر تراویح پڑھنے کے بعد عذر کی وجہ سے بیٹھ کر پڑھنا

سوال:- سنا ہے چاہے کوئی بوڑھا ہو یا جوان اگر وہ نمازِ تراویح شروع ہی سے کھڑے ہوکر پڑھنی شروع کردے تو تمام نمازِ تراویح کھڑے کھڑے ہی ادا کرنا ہوگا، کسی بھی حالت میں بیٹھ کر پوری کرنا جائز نہیں، جبکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایسا نہیں، اگر عذر ہو تو بیٹھ سکتا ہے۔

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۵۵۹، ۵۶۰ (طبع ایچ ایم سعید) ویکرہ امامة عبد .... وفاسق، وفی الشامیة (قوله وفاسق) من الفسق وهو الخروج عن الاستقامة، ولعل المراد به من یرتکب الکبائر. وکذا فی البحر الرائق ج:۱ ص:۳۴۸. وفی الدر المختار ج:۲ ص:۴۸ واما الأخذ منها وهی دون ذلک کما یفعله بعض المغاربة ومخنثة الرجال فلم یبحه أحد، وأخذ کلها فعل یهود الهنود ومجوس الأعاجم .... الخ.

(۲) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۵۶۲ (طبع ایچ ایم سعید) صلّی خلف فاسق او مبتدع نال فضل الجماعة .... الخ.

جواب:- آپ نے ٹھیک سمجھا ہے، اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ تراویح کھڑے ہوکر شروع کرنے کے بعد کسی بھی حالت میں بیٹھ کر پوری کرنا جائز نہیں، وہ دُرست نہیں کہتے۔ واقعہ یہ ہے کہ بیٹھ کر نماز پڑھنے کی اجازت عذر پر موقوف ہے، اگر عذر شروع ہی سے ہو تو شروع ہی سے بیٹھ کر نماز پڑھے، اور اگر بیچ میں پیش آئے تو بیچ میں بیٹھ جانا بھی جائز ہے۔(۱)

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۱۸ھ

(فتویٰ نمبر ۹۷۱/۲۸ ج)

تراویح کی رکعتوں کی تعداد

سوال:- حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آٹھ تراویح پڑھی ہیں یا بیس؟ اور بیس تراویح کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب:- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تراویح کے بارے میں مختلف روایات ہیں، صحابہ کرامؓ کا اس پر اتفاق ہے کہ تراویح بیس رکعتیں پڑھی جائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کو جاننے والا صحابہؓ سے زیادہ کوئی نہیں ہوسکتا، اس لئے بیس رکعات تراویح پڑھنا چاہئے۔(۲)

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۱/۲۳ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) وفی مجمع الأنهر شرح ملتقی الأبحر ج:۱ ص:۲۲۹ (ولو مرض فی أثناء الصلوٰة بنی بما قدر) یعنی لو شرع فی الصلوٰة صحیحًا قائمًا فحدث به مرض یمنعه عن القیام صلّی ما بقی قاعدًا یرکع ویسجد، ولو افتتحها قاعدًا للعجز یرکع ویسجد فقدر علی القیام بنی قائمًا عند الشیخینؒ. وفیه أیضًا ج:۱ ص:۲۰۱ ولو قعد بعد ما افتتحه قائمًا جاز عند الامام استحسانًا لأنه أسهل من الابتداء ویکره لو بلا عذر عنده .... الخ.

(۲) وفی مصنف ابن أبی شیبة ج:۲ ص:۳۹۴ عن ابن عباسؓ أن رسول الله صلی الله علیه وسلم کان یصلّی فی رمضان عشرین رکعة. وکذا فی التعلیق الحسن ص:۵۲. وفی تلخیص الحبیر فی أحادیث الرافعی الکبیر ج:۲ ص:۵۰۹ (حدیث) أنه صلی الله علیه وسلم صلّی بالناس عشرین رکعة لیلتین، فلما کان فی اللیلة الثالثة اجتمع الناس فلم یخرج الیهم ثم قال من الغد: خشیت أن تفرض علیکم فلا تطیقوها. وفی کنز العمال: فصلّی بهم عشرین رکعة. ص:۲۸۳. وفی السنن للبیهقی ج:۲ ص:۴۹۶ عن یزید بن خصیفة عن سائب ابن یزید قال: کانوا یقومون علی عهد عمر بن الخطاب فی شهر رمضان بعشرین رکعة. وفی آثار السنن ج:۲ ص:۵۵ عن عبدالعزیز بن رفیع وفی مؤطا امام مالک ص:۴۰ عن یزید بن رومان أنه قال: کان الناس یقومون فی زمان عمر بن الخطاب بثلاث وعشرین رکعة. وفی عمدة القاری ج:۱۱ ص:۳۷ ان عبدالله بن مسعود کان یصلّی عشرین رکعة. وراجع أیضًا فتح الباری ج:۴ ص:۲۱۹، وآثار السنن ج:۱ ص:۵۵، والشامیة ج:۲ ص:۴۵ وغنیة المتملی ص:۴۰۶ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور) وغنیة الطالبین ص:۴۶۴ و الجوهر النقی ج:۲ ص:۴۹۶ والمفاتیح لأبواب التراویح، امداد الأحکام ج:۱ ص:۶۳۷. (محمد زبیر)

تراویح میں شرکت کے لئے عورتوں کا مسجد جانا

سوال:- یہاں رمضان میں عورتوں کا خیال ہے کہ مسجد میں جاکر حافظ صاحب کا تراویح میں قرآن سنیں، وہاں پردے کا انتظام ہوگا، مردوں کی صفوں کے بعد عورتوں کے لئے پردے کا انتظام ہوگا، کیا یہ جائز ہے؟

جواب:- عورتوں کا مسجد میں جاکر جماعت میں شریک ہونا مکروہِ تحریمی ہے، اور اس سے کوئی نماز مستثنیٰ نہیں، خاص طور سے مردوں کی تلاوتِ قرآن سننے کا مقصد موجودہ حالات میں زیادہ تر حسنِ صوت ہوتا ہے، جو اور زیادہ موجبِ فتنہ ہے، **وکرہ لهن حضور الجماعة الا للعجوز فی الفجر والمغرب والعشاء، والفتویٰ الیوم علی الکراهة فی کل الصلوٰة لظهور الفساد، کذا فی الکافی عالمگیریة ج:۱ ص:۹۳**[1]۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۱/۲/۱۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۴۲/۲۲ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(۱) الهندیة ج:۱ ص:۸۹ (طبع مکتبه حقانیه پشاور) وکذا فی الدر المختار ج:۱ ص:۵۲۵، ۵۲۶.

﴿فصل فی الوتر﴾
(وتر سے متعلق مسائل)

وتر کا وقت اور طریقہ

سوال:- وتر کس طرح اور کب پڑھتے ہیں؟ اس کی کتنی رکعتیں ہیں اور ان تمام باتوں کے دلائل کیا ہیں؟

جواب:- وتر کا وقت عشاء کی نماز کے فوراً بعد شروع ہوجاتا ہے، اور فجر سے پہلے کسی بھی وقت پڑھ سکتے ہیں۔[1] اس کی تین رکعتیں ہیں، دو رکعتوں پر قعدہ کرکے التحیات پڑھیں اور کھڑے ہوجائیں، پھر تیسری رکعت میں بھی سورۂ فاتحہ کے بعد کوئی سورت ملائیں،[2] اس کے بعد کانوں تک ہاتھ اُٹھاکر دُعائے قنوت پڑھیں۔[3]

اور وتر سے پہلے عشاء کی دو رکعتیں سنتِ مؤکدہ ہیں،[4] اور بعد میں دو رکعات نفل ہیں، اور جو شخص تہجد میں اُٹھنے کا عادی ہو، اس کے لئے افضل یہ ہے کہ وتر تہجد کے وقت پڑھے،[5] اور ان تمام باتوں کے دلائل مفصل کتابوں میں موجود ہیں، یہ فتویٰ میں پوچھنے کی بات نہیں۔ واللہ اعلم

(فتویٰ نمبر ۱۵۶/ ۲۸ الف)

---

(۱) وفی الدر المختار کتاب الصلوۃ ج:۱ ص:۳۶۱ (طبع سعید) (و) وقت (العشاء والوتر منه الی الصبح ولکن لا یصح ان (یقدم علیها الوتر).

(۲) وفی التنویر مع شرحه ج ۲ ص:۵ (طبع سعید) وهو ثلاث رکعات بتسلیمة ویقرأ فی کل رکعة منه فاتحة الکتاب وسورة ... الخ.

(۳) وفی آثار السنن باب رفع الیدین عند قنوت الوتر ص:۱۲۹ (مکتبه امدادیه ملتان) عن عبدالله أنه کان یقرأ فی آخر رکعة من الوتر قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ثم یرفع یدیه فیقنت قبل الرکعة. رواه البخاری. وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲ باب الوتر والنوافل (طبع ایچ ایم سعید) ویکبّر قبل رکوع ثالثة رافعًا یدیه کما مرّ .... وقنت فیه.

(۴) وفی الدر المختار باب الوتر والنوافل ج:۲ ص:۱۲، ۱۳ (طبع سعید) (وسن) مؤکدًا أربع قبل الظهر .... ورکعتان .... بعد العشاء.

(۵) (والمستحب) .... تأخیر الی آخر اللیل لواثق بالانتباه، والا فقبل النوم. الدر المختار کتاب الصلوٰۃ ج:۱ ص:۳۶۹ (طبع سعید). وفی الشامیة تحته أی یستحب تأخیره، لقوله صلی الله علیه وسلم من خاف أن لا یوتر من آخر اللیل فلیوتر أوله، ومن طمع أن یقوم آخره فلیوتر آخر اللیل فان صلوة آخر اللیل مشهودة وذلک أفضل رواه مسلم والترمذی وغیرهما، وتمامه فی الحلیة وفی الصحیحین "اجعلوا آخر صلاتکم وترا" والأمر للندب بدلیل ما قبله بحر.

شافعی امام کے پیچھے حنفی کے وتر پڑھنے کا حکم

سوال:- شافعی امام کے پیچھے وتر پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ جائز ہے تو کن شرائط کے تحت؟ براہِ کرم تفصیلی طور پر آگاہ فرمائیں۔

جواب:- شافعی کے پیچھے حنفی کی اقتداء چند شرائط کے ساتھ جائز ہے۔

۱:- حنفی کے مذہب کے مطابق شافعی کی نماز میں کوئی مفسدِ نماز فعل نہ ہو۔

۲:- حنفی مقتدی کو یقین ہو کہ شافعی امام جائز و ناجائز کے اہم مختلف فیہ مسائل میں احتیاط سے کام لیتا ہے، مثلاً بہتے ہوئے خون کے نکلنے سے وضو کرلیتا ہے، اور اگر اسے اس کا یقین ہو کہ امام احتیاط نہیں کرتا تو نماز صحیح نہ ہوگی، اور اگر اس سلسلے میں کچھ معلوم نہیں کہ احتیاط کرتا ہے یا نہیں، تو نماز مکروہ ہوگی۔

۳:- وتر میں اقتداء کرنے کے لئے ایک شرط یہ بھی ہے کہ تین رکعتوں کو دو سلاموں کے ساتھ نہ پڑھے (جیسا کہ ان کا مذہب ہے)، اوراس میں مقتدی کو اپنا قنوت "اللّٰھم انا نستعینک .... الخ" رُکوع کے بعد پڑھنا چاہئے، پہلے نہیں، کیونکہ شافعی امام بھی رُکوع کے بعد پڑھے گا، اوراس مسئلے میں اس کی متابعت کرنا ضروری ہے۔

ان تمام مسائل کے دلائل کتبِ فقہ سے حسبِ ذیل ہیں:-

۱:- درمختار میں ہے: ومخالف کشافعی (یعنی یکرہ الاقتداء به) لکن فی وتر البحر ان تیقن المراعاۃ لم یکرہ، أو عدمها لم یصح وان شک کرہ. اورعلامہ شامیؒ اس کے تحت فرماتے ہیں: ھٰذا ھو المعتمد، لأن المحققین جنحوا الیه، وقواعد المذھب شاھدۃ علیه، وقال کثیر من المشائخ: ان کان عادته مراعاۃ مواضع الخلاف جاز والا فلا، ذکرہ السندی.
(شامی ج:۱ ص:۵۲۶)[۱]

(ومثله فی شرح الکنز للعینی ج:اوّل ص:۴۶)[۲]۔

۲:- درمختار میں ہے: (وصح الاقتداء فیه) (یعنی الوتر) ففی غیرہ أولٰی ان لم یتحقق منه ما یفسدها فی اعتقادہ فی الأصح کما بسطه فی البحر (بشافعی) مثلًا (لم یفصله بسلام) لا ان فصله (علی الأصح) فیھما للاتحاد وان اختلف الاعتقاد. (رد المحتار ج:اوّل ص:۶۲۵)[۳]

---

(۱) شامی ج:۱ ص:۵۶۲، ۵۶۳ (طبع ایچ ایم سعید)۔
(۲) رمز الحقائق، شرح العینی علی کنز الدقائق، باب الوتر والنوافل ج:۱ ص:۴۵ (طبع ادارۃ القرآن کراچی)
(۳) الدر المختار باب الوتر والنوافل ج:۱ ص:۷، ۸ (طبع سعید)۔

۳:- في الدر المختار: ويأتي المأموم بقنوت الوتر ولو بشافعي يقنت بعد الركوع، لأنه مجتهد فيه، وقال الشاميؒ تحت قوله: (ولو بشافعي .... الخ) أي ويقنت بدعاء الاستعانة لا دعاء الهداية. وقال تحت قوله (لأنه مجتهد فيه .... الخ) والظاهر أن المراد من وجوب المتابعة في قنوت الوتر بعد الركوع المتابعة في القيام فيه لا في الدعاء. (شامی ج:اوّل ص:۲۲۶)[1]

تنبیہ:- جو شرط ہمارے یہاں شافعی کے پیچھے اقتداء میں ہے کہ کوئی مفسدِ نماز لازم نہ آئے، وہی شرط شافعی حضرات کے یہاں حنفی کے پیچھے نماز پڑھنے میں ہے، جیسا کہ علامہ عینیؒ نے شرح کنز میں لکھا ہے: الشافعي أيضًا يقول بمثله في حق الحنفي فيقول: لا يجوز اقتداء الشافعي الحنفي الا اذا كان يحتاط في موضع الخلاف۔

پھر چند سطروں کے بعد ہے: يجوز اقتداء الحنفي بالشافعي والشافعي بالحنفي وكذا بالمالكي والحنبلي ما لم يتحقق من امامه ما يفسد صلوته في اعتقاده. (عینی ج:۱ ص:۴۶)[2]۔

واللہ اعلم

الجواب صحیح
محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۷۹/۱۲/۲۰ھ
۱۴/جون ۱۹۶۰ء[3]

شافعی کے پیچھے حنفی کا وتر پڑھنا

سوال:- جناب مولانا تقی صاحب! ایک مسئلہ معلوم کرنا ہے، افریقہ میں اکثر شافعی مسجدیں ہیں، وہاں حنفی مسلک کے لوگ بھی نماز پڑھتے ہیں، جب وتر کا مسئلہ آتا ہے تو حنفی اگر شافعی مسلک کے امام کے پیچھے تراویح کے بغیر وتر پڑھیں تو صحیح ہے یا علیحدہ جماعت کرنا ضروری ہے؟ مہربانی فرما کر اس مسئلہ کا جواب مندرجہ ذیل پتے پر دیں۔ ٹکٹ کے پیسے لفافے کے اندر نہیں بھیجے کیونکہ یہ قانوناً جرم ہے۔

احمد رحمت اللہ
(دار السلام، تنزانیہ)

جواب:- شافعی حضرات چونکہ وتر دو سلاموں کے ساتھ پڑھتے ہیں اور حنفی مسلک میں اس

(۱) شامی ج:۲ ص:۸، ۹ (طبع سعید)۔
(۲) شرح العینی علی الکنز المسمّٰی برمز الحقائق باب الوتر والنوافل ج:۱ ص:۴۵ (طبع ادارة القرآن کراچی)۔
(۳) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم کی تمرین افتاء (درجۂ تخصص) کی کاپی سے لیا گیا ہے۔

طرح نماز نہیں ہوتی،[۱] اس لئے حنفی حضرات کو چاہئے کہ وہ وتر میں ان کے ساتھ شامل نہ ہوں، بلکہ اپنی نماز علیحدہ ادا کریں، تراویح ان ہی کے ساتھ ادا کرلیا کریں اور وتر کے وقت علیحدہ ہوجائیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۹/۹/۱۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۰۹/۳۱ ج)

مسجد میں دو جگہ تراویح ہونے کی بناء پر وتر کی دو جماعتوں کا حکم

سوال:- مسجد میں دو جگہ تراویح، اندر اور چھت پر ہوتی ہیں، سب نمازی اندر والے امام کی اقتداء میں فرض پڑھتے ہیں، البتہ وتر کی جماعتیں اندر اور چھت پر علیحدہ علیحدہ ہوتی ہیں، کیونکہ تراویح کی دونوں جماعتیں الگ الگ وقت پر ختم ہوتی ہیں، کیا اس طرح وتر کی دو جماعتیں کرانا جائز ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں الگ الگ وتر کی جماعتیں جائز ہیں۔　　واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۱/۱۰/۱۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۴۷/۳۲ ج)

وتر میں دُعائے قنوت بھول جائے تو کیا حکم ہے؟

سوال:- وتر میں دُعائے قنوت بھول جائے تو کیا حکم ہے؟

جواب:- دُعائے قنوت واجب ہے، اگر وہ بھولے سے چھوٹ جائے تو سجدۂ سہو واجب ہوگا۔[۲]

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۴ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۰۰/۱۸ الف)

الجواب صحیح
محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) فی البحر الرائق ج:۲ ص:۳۹، ۴۰ وظهر بهذا أن المذهب الصحيح صحة الاقتداء بالشافعیؒ فی الوتر ان لم يسلم على رأس الركعتين وعدمها ان سلم. والله الموفق للصواب. وفی الدر المختار ج:۲ ص:۷، ۸ وصح الاقتداء فيه بشافعی مثلًا (لم يفصله بسلام) لا أن فصله (على الأصح فيهما) للاتحاد وان اختلف الاعتقاد. وفی رد المحتار (قوله: على الأصح فيهما) أی فی جواز أصل الاقتداء فيه بشافعی، وفی اشتراط عدم فصله خلافًا لما فی الارشاد من أنه لا يجوز أصلا باجماع أصحابنا .... الخ.

(۲) وفی الدر المختار باب الوتر والنوافل ج:۲ ص:۹ (ولو نسيه) أی القنوت .... (سجد للسهو).

﴿فصل فی قضاء الفوائت﴾
(قضا نمازوں سے متعلق مسائل کا بیان)

حیض کی مخصوص صورت کی بناء پر نمازوں کی قضاء

سوال:- ایک عورت کو حیض کا خون ڈھائی دن مسلسل آتا ہے، اس کے بعد معمولی سا آنے لگتا ہے، تین دن کے بعد بالکل بند ہوجاتا ہے، پھر چوتھے دن بالکل خون نظر نہیں آتا، پانچویں دن دوپہر کو تھوڑا سا آکر بند ہوجاتا ہے۔ عورت نماز، روزہ کس طرح ادا کرے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں یہ پانچوں دن حیض شمار ہوں گے، ان کی نمازیں معاف ہیں اور روزوں کی قضا فرض ہے، اور اگر اس کی ہمیشہ عادت ایسی ہی ہے، تب تو وقتِ موقوف میں اسے نہ نماز پڑھنی چاہئے، نہ روزہ رکھنا چاہئے، اور اگر ہمیشہ عادت ایسی نہیں، پہلی بار ایسا ہوا ہے تو چونکہ اس کو یہ معلوم نہیں کہ پاکی کے بعد پھر خون آئے گا، اس لئے اگر وہ غسل کر کے روزہ رکھے گی تو گناہ نہ ہوگا، البتہ یہ روزے معتبر نہ ہوں گے، ان کی قضا لازم ہوگی۔ واللہ اعلم

۱۶/۱۰/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۶۱/۲۸ ج)

فوت شدہ نمازوں کی قضا لازم ہے

سوال:- جوانی کے عالم میں، میں دین کی طرف سے غافل رہا اور بہت ساری نمازیں قضا ہوتی رہیں، میں ہر ادا نماز کے ساتھ اسی وقت کی ''قضائے عمری'' کی نیت سے فرض (اور وتر بھی) ادا کرتا رہا ہوں کہ شاید اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاں گردن بچ جائے۔

میں حال ہی میں ایک کتاب ''مذہبی داستانیں اور ان کی حقیقت'' جو چار جلدوں پر مشتمل ہے، منگوا کر پڑھ رہا ہوں۔ مرحوم علامہ حبیب الرحمٰن کاندھلوی اس کے مؤلف ہیں، پہلی جلد کے مقدمے میں ''موضوع احادیث کی معرفت کے اُصول'' میں تحریر کیا گیا ہے کہ جس حدیث میں ''قضائے عمری'' کے بارے میں تذکرہ ہو وہ حدیث جھوٹی ہوگی، علامہ حبیب الرحمٰن صاحب نے یہ بات شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کی کتاب ''عجالۂ نافعہ'' سے نقل کی ہے۔ میں پہلی جلد کے مقدمے کے کچھ حصے کی

فوٹواسٹیٹ کاپی ارسالِ خدمت کررہا ہوں (صفحہ:۳۱، پیراگراف:۵) یہ کتاب پڑھنے کے بعد میں نے قضائے عمری پڑھنا موقوف کردیا ہے کہ کہیں یہ بدعت کے زُمرے میں نہ آجائے۔ آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔

جواب:- محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط ملا، میں سفر پر ہونے کی وجہ سے جواب قدرے تاخیر سے دے رہا ہوں، اس لئے معذرت خواہ ہوں۔

مولانا حبیب الرحمٰن صدیقی کاندھلوی صاحب مرحوم اب دُنیا میں نہیں ہیں، لہٰذا ان کے بارے میں کچھ کہنے کے لئے بہت احتیاط کی ضرورت ہے، لیکن دینی ضرورت کی وجہ سے اتنا کہے بغیر چارہ نہیں کہ وہ غیرمتوازن، انتہاپسند ذہن کے حامل تھے، جس کی بناء پر انہیں اپنے انفرادی نظریات پر اتنا اصرار تھا کہ وہ ساری اُمت کے علماء، فقہاء اور محدثین میں سے کسی کو خاطر میں لانے کے لئے تیار نہ تھے، چنانچہ انہوں نے متعدد مسائل میں جمہورِ اُمت سے الگ راستہ اختیار کیا۔

قضائے عمری کے بارے میں جو بات انہوں نے لکھی ہے، وہ بھی ایسی ہی ہے، اُمت کے جمہور فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ جو نمازیں قضا ہوگئی ہوں حتی المقدور ان کی ادائیگی لازم ہے، حدیث میں فوت شدہ نمازوں کے قضا کرنے کا حکم ہے، اور اس میں کم یا زیادہ کی کوئی تفصیل نہیں، یہ بات بھی واضح ہے کہ پچھلے گناہوں سے توبہ کا لازمی حصہ یہ ہے کہ جن غلطیوں کی تلافی ممکن ہو، ان کی تلافی کی جائے، لہٰذا آپ جو قضائے عمری پڑھتے تھے، وہ دُرست تھی، اور اسے بدعت سمجھ کر چھوڑنا دُرست نہیں ہے، آپ یہ عمل جاری رکھیں۔ (۱)

والسلام

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۲۱/۵/۲۵ھ

(فتویٰ نمبر ۴۳۴/۷۷)

قضائے عمری کی شرعی حیثیت

سوال:- ڈاکٹر فرحت ہاشمی صاحبہ درسِ قرآن دیتے ہوئے اس بات پر بہت زور دیتی ہیں کہ "قضائے عمری" کا جو مسئلہ لوگوں میں مشہور ہے کہ اگر کسی شخص نے بہت عرصے تک نمازیں نہ پڑھی ہوں، پھر وہ نماز شروع کرے تو اسے قضائے عمری کے طور پر وہ نمازیں قضا کرنی چاہئیں، قرآن وسنت میں اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے، بلکہ پچھلی زندگی میں جو نمازیں قضا ہوئی ہوں، ان کی تلافی صرف توبہ سے

(۱) قضائے عمری سے متعلق حضرت والا دامت برکاتہم کا تفصیلی فتویٰ اس کے بعد ملاحظہ فرمائیں۔

ہوجاتی ہے، اتنی ساری نمازیں پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ براہِ کرم یہ واضح فرمائیں کہ کیا شریعت میں پچھلی نمازوں کی قضا واقعی ضروری نہیں ہے؟ اور کیا ائمۂ اربعہ یا فقہائے کرام میں سے کسی کا مذہب یہ ہے کہ نمازیں زیادہ قضا ہوجائیں تو ان کی تلافی صرف توبہ سے ہوجاتی ہے، اور قضائے عمری پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے؟ اگر ان صاحب کا بتایا ہوا یہ مسئلہ صحیح نہیں ہے تو کیا ان کے درس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے؟ نیز اگر قضائے عمری ضروری ہے تو اس کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

جواب:- صحیح بخاری میں حضرت انس بن مالکؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے:-

من نسی صلاۃ فلیصل اذا ذکرھا، لا کفارۃ لھا الا ذلک.

جو شخص کوئی نماز پڑھنا بھول جائے تو اس پر لازم ہے کہ جب بھی اسے یاد آئے، وہ نماز پڑھے، اس کے سوا اس کا کوئی کفارہ نہیں۔ (صحیح بخاری، کتاب المواقیت باب نمبر ۳۷ حدیث نمبر: ۵۹۷)[1]

صحیح مسلم میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ان الفاظ میں مروی ہے:-

اذا رقد أحدکم عن الصلاۃ أو غفل عنھا فلیصلھا اذا ذکرھا فان اللہ عزّ وجلّ یقول: اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ.

جب تم میں سے کوئی شخص نماز سے سوجائے یا غفلت کی وجہ سے چھوڑ دے تو جب بھی اسے یاد آئے وہ نماز پڑھے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ: "اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ" (میری یاد آنے پر نماز قائم کرو)۔ (صحیح مسلم، آخر کتاب المساجد، حدیث نمبر: ۱۵۶۹)[2]

اور سننِ نسائیؒ میں مروی ہے:-

سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن الرجل یرقد عن الصلاۃ أو یغفل عنھا، قال: کفارتھا أن یصلّیھا اذا ذکرھا. (سنن النسائی، کتاب المواقیت، باب فیمن نام عن صلاۃ ص:۱۷۱)[3]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو نماز کے وقت سوجائے یا غفلت کی وجہ سے چھوڑ دے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اس کا کفارہ یہ ہے کہ جب بھی اسے نماز یاد آئے وہ نماز پڑھے۔

ان احادیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اُصول بیان فرمادیا کہ جب کبھی انسان کوئی نماز وقت پر نہ پڑھے تو اس کے ذمے لازم ہے کہ متنبہ ہونے پر اس کی قضا کرے، خواہ یہ نماز

(۱) ج:۱ ص:۸۴ (طبع قدیمی کتب خانہ).
(۲) ج:۱ ص:۲۴۱ (ایضاً).
(۳) ج:۱ ص:۱۰۰ (ایضاً).

بھول سے چھوٹی ہو، سو جانے کی وجہ سے یا غفلت کی وجہ سے۔ صحیح مسلم اور سنن نسائی کی روایتوں میں اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیتِ قرآن "وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ"[1] کا حوالہ دے کر یہ بھی واضح فرمادیا کہ یہ آیتِ قرآنی نماز کی قضا پڑھنے کے حکم کو بھی شامل ہے، اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب انسان کو اللہ تعالیٰ کا یہ فریضہ ادا کرنے پر تنبہ ہو، اسے نماز ادا کرنی چاہئے۔

یہ اُصول بیان کرتے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازوں کی کوئی تعداد مقرر نہیں فرمائی کہ اتنی تعداد میں نمازوں کی قضا واجب ہے، بلکہ ایک عام حکم بیان فرمادیا کہ جو نماز بھی چھوٹ جائے اس کی قضا واجب ہے۔ چنانچہ جب غزوۂ خندق کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کئی نمازیں چھوٹیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کی قضا فرمائی، جس کا واقعہ حدیث کی تمام کتابوں میں تفصیل سے آیا ہے، اس موقع پر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ اگر اس سے زیادہ نمازیں چھوٹ جائیں تو ان کی قضا واجب نہیں، یہ ایک مُسلّم اُصول ہے کہ قرآن وسنت کی طرف سے جب کوئی عام حکم آجاتا ہے تو اس کے ہر ہر جزیئے کے لئے الگ حکم نہ دیا جاسکتا ہے، نہ اس کی ضرورت ہے، مثلاً قرآنِ کریم نے رمضان کے روزوں کی فرضیت کا ذکر کرنے کے بعد یہ فرمادیا ہے کہ:-

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ۔[2]

تم میں سے جو شخص مریض ہو یا سفر پر ہو تو دُوسرے دنوں میں اتنی ہی گنتی پوری کرے۔

اس آیتِ کریمہ میں یہ عام حکم دے دیا گیا ہے کہ جب روزے بیماری یا سفر کی وجہ سے نہ رکھے جاسکے ہوں تو بعد میں ان کی قضا کرلی جائے، اس میں یہ نہیں بتایا گیا، نہ اس کے بتانے کی ضرورت تھی کہ ایک ماہ کے روزے چھوٹنے کا یہ حکم ہے یا دو رمضانوں کے روزے چھوٹنے کا، بلکہ ایک عام حکم دے دیا گیا ہے جو روزے چھوٹنے کی تمام صورتوں کو شامل ہے۔ اب اگر کسی شخص کے دو رمضان کے روزے چھوٹ گئے ہوں اور وہ اس دلیل کا مطالبہ کرے کہ دو رمضان کے روزے چھوٹنے کے لئے کوئی الگ حکم ہونا چاہئے، تو جس طرح اس کا مطالبہ غلط اور جاہلانہ مطالبہ ہوگا، اسی طرح زیادہ نمازوں کی قضا کے لئے الگ دلیل کا مطالبہ بھی اتنا ہی غلط مطالبہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی عام حکم سے استثناء کا دعویٰ کرے تو دلیل اس کے ذمے ہے کہ وہ قرآن وسنت کی کسی دلیل سے مستثنیٰ ہونا ثابت کرے، ورنہ جب تک قرآن وسنت میں کوئی استثناء مذکور نہ ہو، عام حکم اپنی جگہ قائم رہے گا۔

چنانچہ نمازیں قضا پڑھنے کا جو حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ بالا احادیث میں دیا

(۱) سورۃ طٰہٰ آیت:۱۴۔ (۲) سورۃ البقرۃ آیت:۱۸۴۔

ہے اس کی بنیاد پر تمام فقہائے اُمت نے تصریح فرمائی ہے کہ چھوٹی ہوئی نمازیں کتنی زیادہ ہوں، ان کی قضا ضروری ہے، مشہور حنفی عالم علامہ ابنِ نجیمؒ فقہِ حنفی کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:-

فالأصل فيه ان كل صلاة فاتت عن الوقت بعد ثبوت وجوبها فيه فانه يلزم قضاؤها، سواء تركها عمدًا أو سهوًا أو بسبب نوم، وسواء كانت الفوائت كثيرة أو قليلة.

(البحر الرائق ج:۲ ص:۱۴۱ طبع مكة المكرمة)[1]

اس سلسلے میں اُصول یہ ہے کہ ہر وہ نماز جو کسی وقت میں واجب ہونے کے بعد چھوٹ گئی ہو، اس کی قضا لازم ہے، چاہے انسان نے وہ جان بوجھ کر چھوڑی ہو یا بھول کر، یا نیند کی وجہ سے، اور چاہے چھوٹی ہوئی نمازیں کم ہوں یا زیادہ ہوں۔

یہ موقف صرف حنفی علماء کا نہیں ہے، بلکہ شافعی، مالکی، حنبلی تمام مکاتبِ فکر اس پر متفق ہیں، امام مالکؒ فرماتے ہیں:-

من نسي صلوات كثيرة أو ترك صلوات كثيرة فليصل على قدر طاقته، وليذهب الى حوائجه، فاذا فرغ من حوائجه صلّى أيضًا ما بقي عليه حتّى يأتي على جميع ما نسي أو ترك. (المدونة الكبرىٰ للامام مالك ج:۱ ص:۲۱۵ طبع دار الكتب العلمية بيروت)

جو شخص بہت سی نمازیں پڑھنا بھول گیا ہو، یا اس نے بہت سی نمازیں چھوڑ دی ہوں، اس پر لازم ہے کہ وہ اپنی طاقت کے مطابق وہ چھوڑی ہوئی نمازیں پڑھے، اور اپنی ضروریات کے لئے چلا جائے، لیکن جب ضروریات سے فارغ ہو تو پھر باقی نمازیں پڑھتا رہے، یہاں تک کہ وہ تمام نمازیں پوری کرلے جو وہ بھول گیا تھا یا اس نے چھوڑ دی تھیں۔

امام مالکؒ کے اس قول کی تشریح اور مزید تفصیل کرتے ہوئے مالکی عالم علامہ دسوقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:-

فيكفي أن يقضي في اليوم الواحد صلاة يومين فأكثر، ولا يكفي قضاء صلاة يوم في يوم الا اذا خشي ضياع عياله ان قضى أكثر من يوم في يوم، وفي أجوبة ابن رشد انه انما أمر بتعجيل قضاء الفوائت خوف معاجلة الموت، وحينئذ فيجوز التأخير لمدة بحيث يغلب على الظن وفاؤه بها فيها. (حاشية الدسوقي على الشرح الكبير ج:۱ ص:۲۶۴ طبع دار الفكر بيروت)

اتنا کافی ہے کہ ایک دن میں دو دن یا زیادہ کی نمازیں قضا کرلے، اور یہ کافی نہیں ہے کہ ایک دن میں صرف ایک دن کی نمازیں قضا کرے، اِلَّا یہ کہ اسے ایک دن سے زیادہ نمازیں قضا کرنے

---

(۱) باب قضاء الفوائت ج:۲ ص:۹۰ (طبع مكتبه رشيديه كوئته).

کی صورت میں اپنے عیال کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو، اور علامہ ابنِ رشدؒ کے جوابات میں یہ مذکور ہے کہ قضا پڑھنے میں جلدی کرنے کا حکم اس خطرے کی بناء پر دیا گیا ہے کہ موت نہ آجائے، لہٰذا اتنی مدّت تک مؤخر کرنا جائز ہے جس میں غالب گمان یہ ہو کہ اس میں نمازیں پوری ہو جائیں گی۔

امام احمد بن حنبلؒ کے مذہب میں بھی قریب قریب یہی بات کہی گئی ہے، علامہ مرداویؒ جو امام احمدؒ کے مذہب کے قابلِ اعتماد ترین ناقل ہیں، فرماتے ہیں:-

(ومن فاتته صلوات لزمه قضاؤها على الفور) هذا المذهب نص عليه وعليه جماهير الأصحاب وقطع به كثير منهم: قوله "لزمه قضاؤها على الفور" مقيد بما اذا لم يتضرر في بدنه أو معيشته يحتاجها، فان تضرر بسبب ذلک سقطت الفورية.

(الانصاف للمرداویؒ ج:۱ ص:۴۴۲ طبع احیاء التراث العربی بیروت)

اور جس شخص کی بہت سی نمازیں چھوٹ گئی ہوں، اس پر ان کی فی الفور قضا کرنا واجب ہے، یہی مذہب ہے جس کی تصریح کی گئی ہے، اور حنبلی اصحاب کی بھاری اکثریت کا یہی کہنا ہے (قضا نمازیں فوراً ادا کرنی ضروری ہے)۔ اور بہت سوں نے قطعی طور پر یہی کہا ہے .... البتہ فوری ادائیگی کا لازم ہونا اس شرط کے ساتھ مقید ہے کہ اس کے نتیجے میں اس کو جسم یا ضروری معیشت میں نقصان نہ ہو، اگر نقصان ہو تو فوری ادائیگی کا حکم ساقط ہو جائے گا (بلکہ تاخیر سے ادا کرنا جائز ہوگا)۔

امام شافعیؒ کے یہاں یہ تفصیل ہے کہ اگر نمازیں کسی عذر سے چھوٹی تھیں تو فوری ادائیگی کے بجائے تاخیر سے ادا کرنا جائز ہے، لیکن کسی عذر کے بغیر چھوٹی تھیں تو فوراً ادا کرنا ضروری ہے:-

(من فاته) .... (مكتوبة) فأكثر (قضى) ما فاته بعذر أو غيره، نعم غير المعذور يلزمه القضاء فورًا، ويظهر أنه يلزمه صرف جميع زمنه القضاء ما عدا ما يحتاج لصرفة فيما لا بد منه.

(فتح الجواد ج:۱ ص:۲۲۳ طبع شرکۃ مصطفیٰ البابی مصر)

جس شخص کی ایک یا زیادہ فرض نمازیں چھوٹ گئی ہوں، اس پر ضروری ہے کہ جو نمازیں چھوٹی ہیں ان کی قضا کرے، چاہے نمازیں کسی عذر سے چھوٹی ہوں یا بغیر عذر کے، ہاں! جس شخص نے بغیر کسی عذر کے نمازیں چھوڑی ہوں اس پر قضا فوری طور سے واجب ہے، اور ظاہر یہ ہے کہ اس کو اپنا پورا وقت قضا پڑھنے میں صرف کرنا چاہئے، سوائے اتنے وقت کے جو اُسے اپنی لازمی ضروریات کے لئے درکار ہو۔

علامہ ابنِ تیمیہؒ نے بھی فقہائے کرامؒ کے یہ مذاہب نقل کر کے ان سے اتفاق کیا ہے، فرماتے ہیں:-

ومن علیه فائتة فعلیه أن یبادر الی قضاءها علی الفور سواء فاتته عمدًا أو سهوًا عند جمهور العلماء کمالک وأحمد وأبی حنیفة وغیرهم، وکذلک الراجح فی مذهب الشافعی أنها اذا فاتت عمدًا کان قضاؤها واجبًا علی الفور.

(فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیة ج:۲۲ ص:۲۵۹ مطابع الریاض)

جس شخص کے ذمے کوئی چھوٹی ہوئی نماز ہو، اس پر واجب ہے کہ وہ اسے ادا کرنے میں فوری طور سے جلدی کرے، چاہے وہ نماز جان بوجھ کر چھوڑی ہو یا بھول سے، یہی جمہور علماء مثلاً امام مالکؒ، امام احمدؒ اور امام ابوحنیفہؒ کا موقف ہے، اور امام شافعیؒ کے مذہب میں بھی راجح یہی ہے کہ اگر جان بوجھ کر نماز چھوڑی ہے تو اس کو فوراً ادا کرنا واجب ہے۔

علامہ ابنِ تیمیہؒ سے پوچھا گیا کہ:-

رجل علیه صلوات کثیرة فاتته، هل یصلّیها بسننها؟ أم الفریضة وحدها؟

جس شخص کے ذمے بہت سی نمازیں قضا ہوں، وہ انہیں ادا کرتے ہوئے سنتیں بھی پڑھے؟ یا صرف فرض پڑھے؟

علامہ ابنِ تیمیہؒ نے جواب دیا:-

المسارعة الی قضاء الفوائت الکثیرة أولٰی من الاشتغال عنها بالنوافل، وأما مع قلة الفوائت فقضاء السنن معها حسن. (فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیة ج:۲۲ ص:۱۰۴)

جب چھوٹی ہوئی نمازیں بہت ساری ہوں تو ان کو قضا کرنا نفلوں میں مشغول ہونے سے بہتر ہے، البتہ اگر چھوٹی ہوئی نمازیں کم ہوں تو ان کے ساتھ سنتوں کو قضا کرنا اچھا ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ فقہائے کرامؒ کے درمیان یہ مسئلہ تو زیرِ بحث آیا ہے کہ چھوٹی ہوئی نمازوں کی قضا تنبہ ہوتے ہی فوراً واجب ہوجاتی ہے یا اس میں تاخیر کرسکتے ہیں؟ اور تاخیر کی صورت میں کتنی نمازیں روزانہ قضا کرنی ضروری ہیں؟ نیز یہ کہ صرف فرض نمازیں قضا کی جائیں یا سنتیں بھی؟ اور قضا کرتے ہوئے نمازوں میں ترتیب کا لحاظ ضروری ہے یا نہیں؟ لیکن اس مسئلے میں معروف فقہائے کرامؒ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ نمازیں خواہ کتنی زیادہ ہوں، ان کی قضا انسان کے ذمے واجب ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق قرآنِ کریم کی آیت: "وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ" کے مفہوم میں یہ بات داخل ہے کہ تنبہ ہونے پر انسان چھوٹی ہوئی نمازیں قضا کرنے کی فکر کرے، اور قرآن وسنت کی کوئی دلیل ایسی نہیں ہے جو زیادہ نمازوں کو قضا کرنے کی ضرورت نہ ہونے پر دلالت کرتی ہو، یوں بھی یہ عجیب وغریب موقف ہے کہ جو شخص کم نمازیں قضا

کرے اس پر تو ادائیگی واجب ہو، لیکن زیادہ نمازیں چھوڑنے والے پر کچھ واجب نہ ہو؟ پھر کون ہے جو کم نمازوں اور زیادہ نمازوں کی تعداد مقرّر کر کے یہ کہے کہ اتنی نمازوں کے بعد قضا واجب نہیں ہے۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ ہر انسان پر بالغ ہونے کے بعد نماز پڑھنا فرض ہو جاتا ہے، اور یہ فریضہ تمام شرعی فرائض میں سب سے زیادہ مؤکد اور اہم ہے، اور یہ بھی ایک مُسلَّم اُصول ہے کہ اگر کوئی فریضہ قطعی دلائل سے ثابت ہو تو اسے انسان کے ذمے سے ساقط کرنے کے لئے کم از کم اتنے ہی مضبوط دلائل کی ضرورت ہوتی ہے، اور یہاں قطعی دلائل تو درکنار، کوئی کمزور سے کمزور دلیل بھی ایسی نہیں ہے جس کی بنیاد پر یہ کہا جاسکے کہ جو نمازیں انسان کے ذمے فرض ہوئی تھیں، اس کی غفلت اور لاپرواہی کی وجہ سے ان کی فرضیت ختم ہوگئی ہے۔

لہٰذا یہ کہنا کہ اگر فوت شدہ نمازیں بہت زیادہ ہوگئی ہوں تو ان کی قضا لازم نہیں، قرآن وسنت کے واضح دلائل اور ان پر مبنی فقہائے اُمت کے اتفاق کے بالکل خلاف ایک گمراہانہ بات ہے، اور نماز جیسے اہم فریضے کو محض اپنی رائے کی بنیاد پر ختم کر دینے کے مرادف ہے، اور یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ فوت شدہ نمازوں کے لئے بس توبہ کرلینا کافی ہے، اس لئے کہ توبہ کی قبولیت کی لازمی شرط یہ ہے کہ انسان اپنی غلطی کی جتنی تلافی بس میں ہو، وہ تلافی بھی ساتھ ساتھ کرے۔

قضائے عمری کی موضوع احادیث

یہاں یہ واضح کر دینا بھی مناسب ہے کہ اُصولِ حدیث کی بعض کتابوں میں موضوع احادیث کی علامتیں بیان کرتے ہوئے قضائے عمری کی حدیث کی مثال دی گئی، مثلاً حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ موضوع احادیث کی پانچویں علامت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

پنجم آنکہ مخالف مقتضی عقل وشرع باشد وقواعد شرعیہ آں را تکذیب نمایند، مثل قضائے عمری۔

یعنی: پانچویں علامت یہ ہے کہ وہ حدیث عقل وشریعت کے تقاضوں کے خلاف ہو اور قواعدِ شرعیہ اس کی تکذیب کرتے ہوں، مثلاً قضائے عمری کی حدیث۔

(عجالۂ نافعہ ص:۲۴ خاتمہ، طبع نور محمد کتب خانہ کراچی)

ہوسکتا ہے کہ کسی ناواقف یا جاہل آدمی کو اس سے یہ مغالطہ ہو کہ پچھلی عمر کی نمازیں قضا کرنا بے اصل ہے، اور اس بارے میں جو احادیث آئی ہیں وہ موضوع ہیں۔ اس لئے یہ وضاحت ضروری ہے کہ بعض غیر مستند وظائف وغیرہ کی کتابوں میں کچھ ایسی موضوع حدیثیں آگئی ہیں جن میں یہ کہا گیا ہے کہ کسی خاص دن میں صرف ایک نماز قضا پڑھ لی جائے تو اس سے ستر سال کی نمازیں ادا ہو جاتی

ہیں، محدثین اس قسم کی روایات کو "قضائے عمری" کا نام دیتے ہیں، اور ان احادیث کو انہوں نے موضوع قرار دیا ہے، مُلّا علی قاریؒ "موضوعات" پر اپنی مشہور کتاب میں لکھتے ہیں:-

حدیث: "من قضی صلاۃ من الفرائض فی اٰخر جمعۃ من شھر رمضان کان ذٰلک جابرًا لکل صلاۃ فائتۃ فی عمرہ الٰی سبعین سنۃ" باطل قطعًا، لأنہ مناقض للاجماع علٰی أن شیئا من العبادات لا یقوم مقام فائتۃ سنوات.

یہ روایت کہ "جو شخص رمضان کے آخری جمعے میں ایک فرض نماز قضا پڑھ لے تو ستر سال تک اس کی عمر میں جتنی نمازیں چھوٹی ہوں، ان سب کی تلافی ہوجاتی ہے" یہ روایت قطعی طور پر باطل ہے، اس لئے کہ یہ حدیث اِجماع کے خلاف ہے، اِجماع اس پر ہے کہ کوئی بھی عبادت سالہا سال کی چھوٹی ہوئی نمازوں کے قائم مقام نہیں ہوسکتی ہے۔ (الموضوعات الکبریٰ ص:۳۵۶، طبع مکتبہ اثریہ شیخوپورہ)

اور علامہ شوکانیؒ لکھتے ہیں:-

حدیث "من صلّی فی اٰخر جمعۃ من رمضان الخمس الصلوات المفروضۃ فی الیوم واللیلۃ قضت عنہ ما أخل بہ من صلاۃ سنتہ" ھٰذا موضوع لا اشکال فیہ.

یہ حدیث کہ "جو شخص رمضان کے آخری جمعے میں دن رات کی پانچ فرض نمازیں پڑھ لے، ان سے اس کے سال بھر کی جتنی نمازوں میں خلل رہا ہو، ان سب کی قضا ہوجاتی ہے" کسی شک کے بغیر موضوع ہے۔ (الفوائد المجموعۃ للشوکانی ج:۱ ص:۵۴ نمبر۱۱۵، مطبع السنۃ المحمدیۃ قاھرۃ)

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی مذکورہ بالا عبارت میں قضائے عمری کی جن روایات کو موضوع قرار دیا گیا ہے، ان سے مراد "قضائے عمری" کے بارے میں اس قسم کی روایات ہیں، جو ایک نماز یا چند نمازوں کو عمر بھر کی نمازوں کے قائم مقام قرار دیتی ہیں، اور علاوہ اس کے کہ اس قسم کی روایات کی کوئی سند نہیں ہے، ان کے موضوع ہونے کی وجہ مُلّا علی قاریؒ نے یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ ایک یا چند نمازیں سالہا سال کی فوت شدہ نمازوں کی تلافی نہیں کرسکتیں، اور اس پر اُمت کا اجماع ہے، لہٰذا اگر کسی کو ان احادیث کو موضوع قرار دینے سے یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ "قضائے عمری" کا تصوّر ہی بے بنیاد ہے اور پچھلی نمازوں کی قضا لازم نہیں تو اس کا منشأ جہالت کے سوا کچھ نہیں۔

قضائے عمری کا صحیح طریقہ

قرآن وسنت اور فقہائے کرامؒ کے اتفاق کی روشنی میں یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ جس مسلمان نے اپنی عمر کی ابتداء میں نمازیں اپنی غفلت یا لاپرواہی کی وجہ سے نہ پڑھی ہوں اور بعد

میں اسے تنبہ اور توبہ کی توفیق ہو، اس کے ذمے یہ ضروری ہے کہ اپنی چھوٹی ہوئی نمازوں کا محتاط حساب لگا کر انہیں ادا کرنے کی فکر کرے۔ امام مالکؒ، امام احمدؒ اور امام شافعیؒ تینوں بزرگ تو اس بات پر متفق ہیں کہ اگر نمازیں کسی عذر کے بغیر چھوڑی ہیں تو تنبہ ہونے کے بعد اس کا فرض ہے کہ وہ ان نمازوں کی ادائیگی فوراً کرے، اور صرف ضروری حاجتوں کا وقت اس سے مستثنیٰ ہوگا، لیکن فقہائے حنفیہ نے کہا ہے کہ چونکہ انسان اپنی وسعت کی حد تک ہی کا مکلف ہے اس لئے قضا نماز پڑھنے میں اتنی تاخیر جائز ہے جو انسان کی معاشی اور دُوسری حاجتوں کو پورا کرنے کے لئے درکار ہو، درمختار میں ہے:-

(أو يجوز تأخير الفوائت) وان وجبت على الفور (لعذر السعي على العيال وفي الحوائج على الأصح). (ابنِ عابدین ج:۱ ص:۵۴۳)(۱)

چھوٹی ہوئی نمازوں کی قضا پڑھنے میں تاخیر جائز ہے، اگرچہ ان کا وجوب علی الفور ہوتا ہے، مگر عیال کے لئے معاش کے انتظام اور دُوسری حاجتوں کے عذر کی وجہ سے تاخیر کی جاسکتی ہے۔

چنانچہ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:-

فيسعي ويقضي ما قدر بعد فراغه ثم وثم الى أن تتم.(۲)

لہٰذا ایسا شخص اپنے کام کرتا رہے اور فارغ ہونے کے بعد جتنی نمازیں پڑھ سکے، قضا کرتا رہے، یہاں تک کہ تمام نمازیں پوری ہوجائیں۔ (ایضاً)

بعض علماء نے مزید آسانی کے لئے یہ طریقہ بتایا ہے کہ انسان روزانہ ہر فرض نماز کے ساتھ اسی وقت کی ایک قضا نماز پڑھ لیا کرے، اس طرح ایک دن میں پانچ نمازیں ادا ہوجائیں گی، البتہ جب موقع ملے اس سے زیادہ بھی پڑھتا رہے، فرماتے ہیں:-

وفوره مع كل فرض فرض، اذ لم يجب في اليوم أداء أكثر من خمس، فكذا القضاء، فان زاد أو جمع الخمس فحسن. (البحر الزخار لأحمد ابن المرتضى ج:۱ ص:۱۷۳ طبع صنعاء)

اور قضا نمازوں کی فوری ادائیگی کا طریقہ یہ ہے کہ ہر فرض کے ساتھ ایک فرض پڑھا جائے، کیونکہ ایک دن میں پانچ سے زیادہ نمازیں اداء میں ضروری نہیں تو قضاء کو بھی اس پر قیاس کرلیا جائے، لیکن اگر کوئی زیادہ نمازیں پڑھے یا پانچ نمازیں اکٹھی پڑھ لے تو اچھا ہے۔

البتہ قضا پڑھنے میں نیت کا خیال رکھا جائے، یعنی واضح طور پر قضا کی نیت کی جائے، مثلاً فجر کی قضا پڑھ رہے ہیں تو یہ نیت کرے کہ میرے ذمے فجر کی جو سب سے پہلی نماز واجب ہے اس کی قضا پڑھ رہا ہوں۔

(۱، ۲) الدر المختار مع رد المحتار باب قضاء الفوائت ج:۲ ص:۷۴.

نمازوں کا فدیہ

قرآنِ کریم میں روزوں کا فدیہ بیان فرمایا گیا ہے، یعنی جو لوگ روزے رکھنے کی بالکل طاقت نہ رکھتے ہوں، نہ آئندہ ایسی طاقت پیدا ہونے کی اُمید ہو، ان کے لئے قرآنِ کریم نے حکم دیا ہے کہ وہ ایک روزے کے عوض ایک مسکین کو کھانا کھلائیں، لیکن نماز کے لئے قرآنِ کریم یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں ایسا کوئی حکم مذکور نہیں ہے، البتہ امام محمدؒ نے فرمایا ہے کہ جس شخص کی نمازیں قضا ہوگئی ہوں اور وہ انہیں ادا نہ کر رہا ہو، اسے چاہئے کہ وہ یہ وصیت کردے کہ اگر میں یہ نمازیں ادا نہ کر پایا اور اسی حالت میں میرا انتقال ہوگیا تو میرے ترکہ سے ان نمازوں کا فدیہ ادا کردیا جائے، اور وہ فدیہ بھی روزے کے فدیہ کے حساب سے، یعنی ایک نماز کا فدیہ ایک مسکین کا کھانا (یا پونے دو سیر گندم یا اس کی قیمت کا صدقہ) ادا کیا جائے، امام محمدؒ نے یہ حکم احتیاط کے طور پر دیا ہے، اور کہا ہے کہ اگرچہ نمازوں کے فدیہ کا ذکر قرآن وسنت میں نہیں ہے مگر روزے پر قیاس کرکے یہ حکم نکالا گیا ہے، لہٰذا اُمید ہے کہ اِن شاء اللہ اس طرح انسان کی ذمہ داری پوری ہوجائے گی، (دیکھئے رد المحتار ج:۱ ص:۵۴۱)۔[1]

لیکن یاد رہے کہ یہ وصیت ترکہ کے ایک تہائی حصے تک نافذ ہوگی، یعنی اگر روزوں یا نماز کا کل فدیہ اس کے کل مال کا ایک تہائی یا اس سے کم ہو تب تو ورثاء کے ذمے واجب ہوگا کہ وہ فدیہ ادا کریں، اگر فدیہ کی مقدار ایک تہائی سے بڑھ گئی تو زائد مقدار میں وصیت پر عمل کرنا ورثاء کے ذمے لازم نہیں ہوگا۔

اسی طرح اگر کسی شخص نے روزے یا نماز کے فدیہ کی وصیت نہ کی تو ورثاء کے ذمے ضروری نہیں ہے کہ وہ یہ فدیہ ادا کریں، البتہ عاقل و بالغ ورثاء اپنے حصے میں سے رضاکارانہ طور پر فدیہ ادا کریں تو یہ ان کا احسان ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اُمید ہے کہ اِن شاء اللہ مرحوم کو معاف فرمادیں گے۔

خلاصہ

یہ ہے کہ انسان سے جو نمازیں چھوٹ گئی ہوں، ان کی قضا اس کے ذمے لازم ہے، صرف توبہ کرلینے سے وہ معاف نہیں ہوتیں، خواہ کتنی زیادہ ہوں، البتہ وہ اگر روزانہ پانچ نمازوں کی قضا کرنا شروع کردے اور جب زیادہ پڑھنے کا موقع ملے، زیادہ بھی پڑھے، اور ساتھ ہی یہ وصیت بھی کردے کہ جو نمازیں میں اپنی زندگی میں ادا نہ کرسکوں ان کا فدیہ میرے ترکہ سے ادا کیا جائے، تو اُمید ہے کہ اِن شاء اللہ اس کا یہ عمل اللہ تعالیٰ قبول فرماکر اس کی کوتاہی کو معاف فرمادیں گے، قضائے عمری کا صحیح

(۱) ج:۱ ص:۷۲،۷۳۔

طریقہ یہی ہے۔ اور یہ کہنا کہ قضائے عمری پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں، صرف توبہ کافی ہے، گمراہی کی بات ہے، اور جو شخص نماز جیسے بنیادی فریضے میں محض اپنی رائے سے کسی دلیل کے بغیر اس قسم کی گمراہانہ بات کی تلقین اور اس پر اصرار کرے، اس کے درس پر ہرگز اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔　واللہ سبحانہ اعلم

۱۳ ؍ رجب ۱۴۲۲ھ

(فتویٰ نمبر ۵۵/۵۰۰)

ایامِ حیض کی نمازوں کی قضا لازم نہیں

سوال:- عورت حیض و نفاس کی حالت میں نماز نہیں پڑھ سکتی، تو کیا ازرُوئے حدیث یا فقہ بعد غسلِ طہارت از حیض و نفاس اس عورت پر نماز کی قضا واجب ہے یا معاف ہے؟

جواب:- حیض و نفاس کی حالت میں عورت جو نمازیں چھوڑتی ہے اس کی قضا اس پر واجب نہیں بلکہ وہ نمازیں معاف ہیں، البتہ اس حالت میں جو روزے چھوٹے ہوں ان کی قضا واجب ہے۔[۱]

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۵/۸ھ

(فتویٰ نمبر ۴۵۱/۲۸ ب)

قضا نمازوں کی ادائیگی ضروری ہے

سوال:- زید نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اور جب سے بالغ ہوا ہے اس کے بعد اب اس کی عمر تقریباً چالیس پینتالیس سال ہے، اس دوران فرائض، واجبات کی ادائیگی میں کوتاہی ہوتی رہی، اس طرح کچھ حقوق العباد بھی اس کے ذمے ہیں، اب زید تلافی کرنا چاہتا ہے، کیا صورت ہے؟

جواب:- حقوق العباد کی کوتاہی کی تلافی تو صرف اس طرح ہوسکتی ہے کہ جن جن لوگوں کے حقوق تلف کئے ہیں ان کے مالی حقوق یا تو ان کو ادا کرے یا ان سے معاف کروائے، اور غیر مالی حقوق بھی معاف کروائے، اور نماز روزوں کا طریقہ یہ ہے کہ جتنے نماز روزے رہ گئے ہیں ان کا ٹھیک ٹھیک حساب کرے، اور اگر ٹھیک ٹھیک حساب ممکن نہ ہو تو محتاط اندازہ لگائے، اور اس کی قضا شروع کردے اور ساتھ ہی یہ وصیت کردے کہ اگر میں ان کی قضا نہ کرسکوں تو ان کا فدیہ میرے ترکہ سے ادا کیا جائے، پھر اگر زندگی میں ادائیگی مکمل ہوجائے تو یہ وصیت کاٹ دے،[۲] زکوٰۃ کا بھی اسی طرح حساب لگا کر اس کی ادائیگی کردے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۱۰/۱۳ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۴۸/۲۸ ج)

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۲۹۱ (ویمنع صلوٰة) مطلقًا ولو سجدة شکر (وصوما) وجماعا (وتقضیه لزوما دونها للحرج) وفی الشامیة قوله صلوة .... تسقط للحرج وقوله وتقضیه أی الصوم علی التراخی فی الأصح.

(۲) مکمل تفصیل سابقہ فتویٰ ص:۴۷۷ تا ۴۸۷ میں ملاحظہ فرمائیں۔

﴿فصل فی سجود السھو﴾
(سجدۂ سہو کے مسائل کا بیان)

سورۂ فاتحہ، سورۃ اور رکعتوں میں شک کی دوصورتوں کا حکم

سوال:- مسئلہ یہ ہے کہ ایک شخص کی عمر ۸۰ سال سے زیادہ ہے، طویل عرصے سے مختلف امراض وعوارض میں مبتلا ہے، حرکت کرنے اور چلنے پھرنے سے معذور ہے، بیٹھ کر نماز ادا کرتا ہے، اور غیرمعمولی ضعف و نقاہت کی بناء پر قویٰ بہت کمزور ہوگئے ہیں، حافظہ اور یادداشت کی قوت بھی کمزور ہوگئی، نماز میں بہت سہو ہوتا ہے اور اکثر ہوتا ہے، کبھی رکعتوں کی تعداد میں شبہ ہوتا ہے کہ ایک ہوئی یا دو یا تین ہوئی یا چار، کبھی یہ شبہ ہوتا ہے کہ سورۂ فاتحہ پڑھی ہے یا نہیں؟ اور پھر سورت ملائی ہے یا نہیں؟ رُکوع کیا ہے یا نہیں؟ سجدہ ایک کیا ہے یا دو؟ سجدۂ سہو کیا ہے یا نہیں؟ غرض اس قسم کی مختلف صورتیں پیش آتی ہیں، امکانی سعی اور احتیاط کے باوجود حدیث النفس میں ابتلا اور سہو کی صورت پیش آجاتی ہے، اس پر نہ تو وہ یہ قسم کھاسکتا ہے کہ اس قسم کی غلطی ہوئی، اور نہ یہ قسم کھاسکتا ہے کہ نہیں ہوئی، نہ یقین اور ظنِ غالب ہوتا ہے، البتہ شبہ اور احتمالِ ترک کا ضرور ہوتا ہے۔

دریافت طلب یہ ہے کہ کیا شبہ اور احتمال کی طرف سے صَرفِ نظر کرلی جائے اور مطلق التفات ہی نہ کیا جائے؟ مثلاً ظہر کی چار سنتوں میں پہلی رکعت میں شبہ ہوا کہ پہلی رکعت ہے یا دُوسری، تو پہلی رکعت میں دُوسری کے احتمال پر اور دُوسری رکعت میں دُوسری ہی کے شبہ پر اور تیسری رکعت میں چوتھی رکعت کے احتمال پر اور چوتھی رکعت میں چوتھی کے شبہ پر التحیات پڑھے؟ غرض یہ ہے کہ احتیاطاً التحیات پڑھے اور آخر میں سجدۂ سہو کرے۔ اور یہی شبہ ہونے پر کہ سورۂ فاتحہ پڑھی اور سورت ملائی ہے یا نہیں؟ احتیاطاً سورۂ فاتحہ پڑھ لے اور سورت ملالے؟ اور سجدۂ سہو کرنے کے بعد نہ کرنے کا شبہ ہو تو احتیاطاً سجدۂ سہو کرلے وغیرہ وغیرہ کیا کیا جائے؟

۲:- کیا اس قسم کی تمام صورتوں میں اقل کا اعتبار کرکے احتیاطاً دوبارہ سورۂ فاتحہ پڑھ لے اور سورۃ ملانے سے اور سجدۂ سہو کرلینے سے نماز صحیح ہوجاتی ہے؟ اور فاسد اور واجب الاداء تو نہیں ہوجاتی؟

جواب ۱:- اگر شبہ ایسا ہوتا ہے کہ دونوں احتمال ذہن میں برابر معلوم ہوتے ہیں تو ہر جگہ اقل کا اعتبار کریں[1]، اور ہر اس رکعت پر قعدہ کریں جس کے آخری رکعت ہونے کا احتمال ہو[2]، اور جس رکعت میں قعدۂ اُولیٰ ہونے کا محض احتمال ہو، اس پر بیٹھنا ضروری نہیں، مثلاً ظہر کی پہلی رکعت ہی میں شک ہوگیا کہ پہلی ہے یا دُوسری؟ تو پہلی سمجھ کر نماز جاری رکھیں، اور اس رکعت پر نہ بیٹھیں، تیسری پر بھی اس لئے بیٹھیں کہ اس کے آخری رکعت ہونے کا احتمال ہے[3]، پھر آخر میں سجدۂ سہو کریں۔

۲:- احتیاطاً دوبارہ فاتحہ پڑھنے اور سورۃ ملانے سے نماز فاسد نہیں ہوتی، البتہ سجدۂ سہو میں یہ تفصیل ہے کہ اگر آخر کی دو رکعتوں میں ایسا کیا تو سجدۂ سہو بھی واجب نہیں، اسی طرح اگر پہلی دو رکعتوں میں سورت کے بعد سورۂ فاتحہ مکرّر پڑھی تو بھی سجدۂ سہو واجب نہیں، ہاں! اگر سورت سے پہلے سورۂ فاتحہ مکرّر پڑھی تو سجدۂ سہو واجب ہوگا، اور سجدۂ سہو کے بعد نماز دُرست ہوجائے گی۔ کذا فی رد المحتار[4] والعالمگیریة (ج:۱ ص:۱۲۶)[5]۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۶/۱۱/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۸۰/ ۳۷ ہ)

قراءت میں عدمِ ترتیب سے سجدۂ سہو لازم نہیں

سوال:- نماز میں قراءت کے اندر ترتیب قائم نہ رہے تو کیا سجدۂ سہو لازم ہوگا؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں سجدۂ سہو واجب نہیں۔[6]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۵۱/ ۲۸ ج)

(۱ تا ۳) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۹۳ (طبع سعید) (وان کثر) شکه (عمل بغالب ظنه ان کان) له ظن للحرج (والا أخذ بالأقل) لتیقنه وقعد فی کل موضع توهمه موضع قعوده) ولو واجبا لئلا یصیر تارکًا فرض القعود أو واجبه وفی الشامیة (قوله والا) ای وان لم یغلب علٰی ظنه شیٔ، فلو شک انها أولی الظهر أو ثانیته یجعلها الأولیٰ ثم یقعد لاحتمال انها الثانیة ثم یصلّی رکعة ثم یقعد لما قلنا ثم یصلّی رکعة ویقعد لاحتمال انها الرابعة ثم یصلّی أخریٰ ویقعد لما قلنا .... الخ. وفی الهدایة ج:۱ ص:۴۵۲ وان لم یکن له رأی بنی علی الیقین لقوله علیه السلام من شک فی صلٰوته فلم یدر أثلاثا صلّی أم أربعا بنی علی الأقل .... الخ.

(۴) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۴۶۰، ۴۶۱ وکذا ترک تکریرها قبل سورة الأولیین، وفی الشامیة فلو قرأها فی رکعة من الأولیین مرتین وجب سجود السهو لتأخیر الواجب وهو السورة .... قال فی شرح المنیة قید بالأولیین لأن الاقتصار علٰی مرة فی الأخریین لیس بواجب حتّٰی لا یلزمه سجود السهو بتکرار الفاتحة فیهما سهوا، ولو تعمده لا یکره.

(۵) وفی الهندیة ج:۱ ص:۱۲۶ ولو کرّرها فی الأولیین یجب علیه سجود السهو بخلاف ما لو اعادها بعد السورة أو کرّرها فی الأخریین. وفی البحر الرائق ج:۲ ص:۹۴ (طبع سعید) وذکر قاضی خان وجماعة انها ان قرأها مرتین علی الولاء وجب السجود وان فصل بینهما بالسورة لا یجب وصححه الزاهدی للزوم تأخیر السورة فی الأول لا فی الثانی .... الخ. نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۳۶۷، ۳۶۸.

(۶) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۸۰ (طبع سعید) (ویجب) .... بترک واجب. وفی الشامیة قوله بترک واجب أی من واجبات الصلٰوة الأصلیة لا کل واجب اذ لو ترک ترتیب السور لا یلزمه شیٔ مع کونه واجبًا .... الخ.
وکذا فی الهندیة ج:۱ ص:۱۲۶. (محمد زبیر حق نواز)

تسمیہ کے ترک سے سجدۂ سہو لازم نہیں

سوال:- سورۂ فاتحہ پڑھنے کے بعد شک ہوجاتا ہے کہ پوری فاتحہ پڑھی ہے یا کچھ رہ گیا ہے جس کے باعث دوبارہ پڑھا کرتا ہوں جو دیر کا باعث ہوتی ہے، کیا حکم ہے؟

جواب:- ایک مرتبہ فاتحہ دھیان کے ساتھ دُہرایا کریں، بعد میں شک پیدا ہو تو اس کی پرواہ نہ کریں تاوقتیکہ غلطی کا یقینِ کامل نہ ہو، نماز ہوجائے گی۔

سوال:- نماز کی پہلی رکعت میں اکثر شبہ ہوتا ہے کہ بسم اللہ شریف الحمد سے پہلے پڑھی یا نہیں؟ کیا بسم اللہ نہ پڑھنے سے نماز فاسد ہوگی؟ اور بسم اللہ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ سجدۂ سہو تو واجب نہ ہوگا؟

جواب:- اگر بسم اللہ سہواً چھوٹ جائے تو نماز ہوجاتی ہے، سجدۂ سہو بھی واجب نہیں ہوتا۔[1]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۳ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

تاخیرِ رکن کی وہ مقدار جس سے سجدۂ سہو واجب ہوتا ہے

سوال:- ''البلاغ'' کے شمارے میں زیرِ عنوان ''اپنی نماز دُرست کیجئے'' میں ہے: مسئلہ نمبر۳:- ''اگر آپ غلطی سے پہلی یا تیسری رکعت میں بیٹھ گئے تو فوراً کھڑے ہوجائیں، اگر بیٹھ کر اتنی دیر گزر گئی کہ جس میں تین مرتبہ سبحان اللہ کہا جاسکے تو سجدۂ سہو کرنا ضروری ہے، ورنہ نہیں۔'' بحوالہ کتب محقق فرمائیں تاکہ تسلی ہو، کیونکہ کبیری میں اس کے خلاف کی تصریح ہے، یعنی تین مرتبہ سبحان اللہ کی مقدار کی تاخیر کی قید نہیں ہے۔

عبارت یہ ہے: ولو قام فی الصلٰوۃ الرباعیة الی الرکعة الخامسة أو قعد بعد رفع رأسه من السجود فی الرکعة الثالثة أو قام الی الرابعة فی المغرب، أو الثالثة فیه أو فی الفجر أو قعد بعد رفعه من الرکعة الأولی فی جمیع الصلوات یجب علیه سجود السهو بمجرد القیام فی صورة وبمجرد القعود فی صورة لتأخیر الواجب وهو التشهد أو السلام فی صورة القیام وتأخیر الرکن وهو القیام فی صورة القعود، اهـ۔[2]

---

(۱) وفی الدر مع الرد ویجب .... بترک واجب سهوًا. وفی الشامیة ج:۲ ص:۸۰ واحترز بالواجب عن السنة کالثناء والتعوذ ونحوهما. وکذا فی الهندیة ج:۱ ص:۱۲۶.

(۲) غنیة المتملی ص:۴۵۸ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور).

جواب:- اس مسئلے میں احقر کو بھی شک تھا، اس لئے ایک مرتبہ اس کی تحقیق لکھ کر والد ماجد حضرت مولانا محمد شفیع صاحب مدظلہم العالی کو دِکھا دیا تھا، موصوف نے اس کی تصدیق فرما کر اسے امداد الفتاویٰ جلد اوّل (صفحہ:۳۵۲ طبع جدید کراچی) کا جزو بنا دیا تھا۔[۱] اس تحقیق کا حاصل یہی ہے کہ مجرد قعود سے سجدۂ سہو واجب نہیں ہوتا بلکہ مقدارِ رکن تأخیر سے واجب ہوتا ہے، جس کی تعیین تین تسبیحات سے کی گئی ہے۔

علامہ طحطاویؒ مراقی الفلاح کی شرح میں تحریر فرماتے ہیں: وھو مقدر بثلاث تسبیحات ـ (ج:۱ ص:۲۵۸، طبع نور محمد کتب خانہ) ''اس کی مقدار تین بار سبحان اللہ کہنے کو مقرّر کیا گیا ہے۔'' تفصیل کے لئے تو امداد الفتاویٰ کے مذکورہ حاشیہ کی طرف رُجوع فرمائیں[۲]، یہاں علامہ شامیؒ کی ایک تصریح ذکر کر دیتا ہوں، درمختار میں ہے کہ:-

''ویکبر للنهوض علی صدور قدمیه بلا اعتماد وقعود استراحة ولو فعل لا بأس''

اس کے تحت علامہ شامیؒ لکھتے ہیں: قال شمس الأئمة الحلوانی الخلاف فی الأفضل حتّی لو فعل کما هو مذهبنا لا بأس به عند الشافعیؒ ولو فعل کما هو مذهبه لا بأس به عندنا .... ولا ینافی هذا ما قدمه الشارح فی الواجبات حیث ذکر منها ترک قعود قبل ثانیة ورابعة لأن ذاک محمول علی القعود الطویل ـ (رد المحتار ص:۴۷۳، مطبوعہ استنبول)[۳]۔ لہٰذا جتنی مقدار شوافع کے یہاں بطور جلسۂ استراحت مستحب ہے، اس سے ہمارے نزدیک سجدۂ سہو واجب نہیں ہوتا۔

والسلام

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۸۸/۲/۱۹ھ

تأخیرِ رکن کی کتنی مقدار سے سجدۂ سہو واجب ہوتا ہے؟

(ایک رکن کی مقدار تأخیر سے سجدۂ سہو لازم ہوتا ہے یا ایک تسبیح کی مقدار تأخیر سے؟ مفصل تحقیق)

عباراتِ ذیل زیرِ بحث مسئلے میں قابلِ غور ہیں:-

۱:- قال فی ملتقی الأبحر ویجب ان قرأ فی رکوع أو قعود أو قدم رکنا أو أخره أو کرّره أو غیّر واجبًا أو ترکه کرکوع قبل القراءة وتأخیر القیام الی الثالثة بزیادة علی التشهد، وقال شارحه العلامة شیخ زادةؒ واختلفوا فی قدر الزیادة فقال بعضهم بزیادة حرف وکلام

(۱، ۲) سجدۂ سہو سے متعلق حضرتِ والا دامت برکاتہم کی یہ تحقیق اسی فتویٰ کے بعد آگے ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) الدر المختار مع رد المحتار ج:۱ ص:۵۰۶ (طبع سعید).

المصنف يشير الى هذا وقال بعضهم بقدر ركن وهو الصحيح كما في أكثر الكتب.
(مجمع الأنهر ج:۱ ص:۱۴۹)[1]

۲:- وقال تحته شارحه العلامة ابن عابدينؒ بقدر ركن. (بالحوالة المسطورة)[2]

۳:- قال الامام ظهير الدين المرغينانيؒ لا يجب بقوله اللّٰهم صل على محمد وانما المعتبر مقدار ما يؤدى فيه ركنا كذا في الظهيرية. (برجندی شرح وقاية ج:۱ ص:۱۴۹)[3]

۴:- قال ابن البزاز الكردريؒ سها في صلوته انها الظهر أو العصر أو غير ذلك ان تفكر قدر ما يؤدى فيه ركن كالركوع لزم وان قليلًا فان شك في صلوة صلاها ..... الخ.
(الجامع الوجيز على هامش الهندية ج:۴ ص:۷۰)[4]

ان تمام عبارات سے مشترکہ طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تاخیرِ واجب کی مقدار اکثر فقہاءؒ نے یہ قرار دی ہے کہ اتنی دیر تاخیر ہوجائے جس میں کوئی رکنِ نماز مثلاً رُکوع یا سجدہ وغیرہ ادا ہوسکے، اور وہ تین مرتبہ ''سبحان ربی العظیم'' کہنے کے وقفے میں ہوتا ہے، به صرح الطحطاويؒ في حاشيته على المراقي حيث قال ولم يبينوا قدر الركن وعلى قياس ما تقدم ان يعتبر الركن مع سننه وهو مقدر بثلاث تسبيحات۔ (طحطاوی ج:۱ ص:۲۵۸)[5]

اس قول کے علاوہ بھی بہت سے اقوال ذکر کئے گئے ہیں جن میں سے یا تو مرجوح ہیں، یا وہ کہ جن کا مآل یہی نکلتا ہے، صاحبِ تنویر الابصار نے اس مسئلے کو دو جگہ ذکر کیا ہے اور بظاہر دونوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے، باب صفة الصلوٰة میں ان کی عبارت یہ ہے: (فان زاد عامدًا كره) فتجب الاعادة (أو ساهيا وجب عليه سجود السهو اذا قال اللّٰهم صلّ على محمد) فقط (على المذهب المفتى به لا لخصوص الصلوٰة بل لتأخير القيام. (شامی ج:۱ ص:۴۷۷)[6]۔ اس کے تحت علامہ شامیؒ نے کئی اقوال نقل کرکے بحر، زیلعی، شرح منیہ کبیری، وغیرہ سے اسی کو صحیح قرار دیا ہے، اور علامہ رملیؒ اور شرح منیہ صغیری سے "وعلى ال محمد" کی زیادتی کا مرجح ہونا ذکر کیا ہے۔

اور باب سجود السهو میں صاحبِ تنویر فرماتے ہیں: وتأخير قيام الى الثالثة بزيادة على التشهد بقدر ركن ۔صاحبِ درمختار نے لکھا: وقيل بحرف وفي الزيلعي الأصح وجوبه باللّٰهم

(۱، ۲) مجمع الأنهر شرح ملتقى الأبحر ج:۱ ص:۲۲۰ (طبع دار الكتب العلمية بيروت).
(۳) راجع شرح الوقاية ج:۱ ص:۱۸۵ (طبع ايچ ايم سعيد).
(۴) الجامع الوجيز على هامش الهندية ج:۴ ص:۲۳ (طبع مكتبه رشيديه كوئته).
(۵) (طبع نور محمد كتب خانه)
(۶) الدر المختار ج:۱ ص:۵۱۰ (طبع ايچ ايم سعيد).

صل علیٰ محمد ۔ علامہ ابنِ عابدینؒ نے اس تعارض کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: (قوله وفی الزیلعی .... الخ) جزم به المصنف فی متنه فی فصل اذا أراد الشروع وقال انه المذهب واختاره فی البحر تبعًا للخلاصة والخانية والظاهر انه لا ينافی قول المصنف هنا بقدر ركن تأمل. (شامی ج:۱ ص:۴۹۶)[1]۔ جس سے معلوم ہوا کہ "اللّٰھم صل علیٰ محمد" اور بقدرِ رکن، دونوں اقوال کا حاصل اور مآل ایک ہی نکلتا ہے، تو گویا جس جس نے "اللّٰھم صل علیٰ محمد" کو مقدارِ تاخیر قرار دیا ہے اس نے بقدرِ رکن کے قول کے منافی کوئی بات نہیں کہی، وبالعکس۔

رہی وہ عبارت جو منیة المصلی میں ہے کہ اگر کوئی شخص پہلی یا تیسری رکعت کے آخر میں بیٹھ جائے تو مطلق بیٹھ جانے ہی سے سجدۂ سہو واجب ہوجائے گا، خواہ مقدارِ رکن بیٹھا ہو یا نہیں، اسی طرح اس میں یہ بھی ہے کہ جلسۂ استراحت سے سجدۂ سہو لازم آجائے گا (کبیری ص:۴۳۲)، سو اس بارے میں تحقیق وہ ہے جو درمختار اور رد المحتار میں لکھی گئی ہے، وھو ھذا:-

۱:- قال العلامة الحصكفیؒ فی واجبات الصلوٰة: وترك قعود قبل ثانية أو رابعة وكل زيادة تتخلل بين الفرضين[2] وقال الشامیؒ وكذا القعدة فی آخر الركعة الأولیٰ أو الثالثة فيجب تركها ويلزم من فعلها أيضًا تأخير القيام الی الثانية أو الرابعة عن محله وهٰذا اذا كانت القعدة طويلة اما الجلسة الخفيفة التی استحبها الشافعیؒ فتركها غير واجب عندنا بل هو الأفضل.[3] (شامی ج:۱ ص:۴۳۸)

۲:- قال فی الدر المختار ويكبر للنهوض علیٰ صدور قدميه بلا اعتماد وقعود استراحة ولو فعل لا بأس، وقال الشامیؒ تحته، قال شمس الأئمة الحلوانیؒ الخلاف فی الأفضل حتّی لو فعل كما هو مذهبنا لا بأس به عند الشافعیؒ ولو فعل كما هو مذهبه لا بأس به عندنا كذا فی المحيط اهـ. قال فی الحلية والأشبه أنه سنة أو مستحب عند عدم العذر ويكره فعله تنزيها لمن ليس به عذر اهـ وتبعه فی البحر .... أقول ولا ينافی هٰذا ما قدمه الشارح فی الواجبات حيث ذكر منها ترك قعود قبل ثانية ورابعة لأن ذاك محمول علی القعود الطويل.[4] (رد المحتار ج:۱ ص:۴۷۳)

اس لئے ان عبارات سے معلوم ہوا کہ دو رکعتوں کے درمیان جلسۂ خفیفہ عمداً جائز ہے اور

---

(۱) الدر المختار مع رد المحتار ج:۲ ص:۸۱ (طبع ایچ ایم سعید).
(۲) الدر المختار ج:۱ ص:۴۷۰ (طبع ایچ ایم سعید).
(۳) رد المحتار ج:۱ ص:۴۶۹ (طبع ایچ ایم سعید).
(۴) الدر المختار مع رد المحتار ج:۱ ص:۵۰۶ (طبع ایچ ایم سعید).

شامیؒ کی تصریح کے مطابق ترکِ قعود جو واجب ہے، وہ قعودِ طویل ہے، قصیر نہیں، درایت کا مقتضا بھی یہی ہے کیونکہ یہ فعل عمداً جائز ہے تو سہواً بدرجہ اَولیٰ ہونا چاہئے، نیز چونکہ یہ قول ''بقدرِ رکن'' کی تقدیر کے مطابق ہے اس لئے اسی کو ترجیح ہونا چاہئے، اور جب اس درایت کے ساتھ شامیؒ کی یہ روایت مل گئی تو اس دعویٰ میں مزید قوت پیدا ہوگئی، اور خود علامہ ابراہیم حلبیؒ کی تصریح علامہ شامیؒ نے نقل فرمائی ہے کہ: عن شرح المنية انه لا ينبغي أن يعدل عن الدراية أي الدليل اذا وافقتها رواية۔

خلاصہ یہ کہ جو مقدار جلسۂ استراحت کی شوافع کے یہاں مسنون ہے، اس مقدار تک بیٹھنے سے سجدۂ سہو لازم نہ آنا چاہئے، هذا ما بدا لي۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب

الجواب صحیح	الجواب صحیح	احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
بندہ محمد شفیع عفی عنہ	بندہ رشید احمد عفی عنہ	یکم محرم الحرام ۱۳۸۰ھ
۱/۱/۱۳۸۰ھ	۴/۱/۱۳۸۰ھ	

(از حاشیہ امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۳۵۲)

بھولے سے سلام پھیر لینے کے بعد سجدۂ سہو کب تک کر سکتے ہیں؟

سوال:- نماز میں معمولی غلطی ہوئی، اور سجدۂ سہو کرنا بھول گئے، تو بعد میں نماز کس طرح ادا کریں گے؟ اور نماز کے بعد سجدۂ سہو کر سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب:- اگر غلطی ایسی تھی کہ اس کی وجہ سے سجدۂ سہو کرنا واجب تھا تو سلام پھیرنے کے بعد جب تک کوئی مفسد فعل نہ کیا ہو، سجدۂ سہو کر سکتے ہیں، اس کے بعد نماز پوری کر سکتے ہیں، اور اگر کوئی مفسدِ نماز فعل کر لیا، مثلاً کوئی بات کر لی یا سینے کا رُخ قبلے سے پھیر دیا، تو نماز کا ازسرِنو اعادہ کیا جائے۔

واللہ اعلم

الجواب صحیح	احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
بندہ محمد شفیع عفی عنہ	۲/۷/۱۳۸۸ھ

(فتویٰ نمبر ۶۲ /۷ ۱۹ الف)

چار رکعت والی نماز میں دو رکعت پر سلام پھیرنے کی صورت میں سجدۂ سہو کے وجوب سے متعلق فقہاء کی عبارات میں تضاد کی تحقیق

سوال:- حضرت تھانویؒ نے بہشتی زیور میں لکھا ہے ''چار رکعت والی نماز میں بھولے سے دو رکعت پر سلام پھیر دیا تو اب اُٹھ کر اس نماز کو پورا کرے، اخیر میں سجدۂ سہو کر لینے سے نماز ہو جائے گی'' اور بعض فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر دونوں طرف سلام پھیر دیا تو سجدۂ سہو نہ کرے بلکہ نماز کا اعادہ کرے،

کیونکہ پہلا سلام دو چیزوں یعنی نماز سے باہر ہونے اور قوم کی تحیت کے لئے ہے، اور دُوسرا سلام صرف باقی نمازیوں کی تحیت کے لئے، اس لئے یہ دُوسرا سلام کلام کی مانند ہوگا اور کلام منافیٔ نماز ہے، اس لئے سجدۂ سہو کو ساقط کرتا ہے، پس اعادہ لازم ہے۔ ان دونوں قولوں میں شدید اختلاف ہے، مفتیٰ بہ قول کون سا ہے؟

جواب:- بہشتی زیور[1] کا قول ہی مفتیٰ بہ ہے۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۶/۲۴ھ
(فتویٰ نمبر ۶۹۲/۲۹ ب)

(۱) بہشتی زیور حصہ دوم ص:۱۳۱ (طبع ادارہ تالیفات اشرفیہ)۔

(۲) وفي البحر الرائق اخر سجود السهو قبيل باب صلوة المريض ج:۲ ص:۱۱۱ (طبع مكتبه رشيديه كوئته) وان توهم مصلى الظهر انه أتمها فسلم ثم علم انه صلّى ركعتين أتمها وسجد للسهو لأنه عليه السلام فعل كذلك في حديث ذى اليدين ولأن السلام ساهيًا لا يبطل الصلوة .... وحكمه أنه ان كان في المسجد ولم يتكلم وجب عليه أن يأتي به وان انصرف عن القبلة لأن سلامه لم يخرجه عن الصلوة. وفي الدر المختار (باب ما يفسد الصلوة وما يكره فيها) ج:۱ ص:۶۱۵ (طبع سعيد) الا السلام ساهيًا للتحليل أى للخروج من الصلوة قبل اتمامها على ظن اكمالها فلا يفسد. وكذا في فتاوى دار العلوم ديوبند ج:۴ ص:۴۱۲، وكفايت المفتي ج:۳ ص:۳۷۳. (محمد زبیر حق نواز)

﴿فصل فی سجود التلاوۃ﴾
(سجدۂ تلاوت کے مسائل کا بیان)

امام کے سجدۂ تلاوت کا پتہ نہ چلنے کی بناء پر مقتدی رُکوع میں رہ کر اُٹھ گیا تو کیا حکم ہے؟

سوال:- فجر کی نماز میں امام صاحب نے پہلی رکعت میں سجدۂ تلاوت کی آیت پڑھی اور سیدھے سجدہ میں چلے گئے، میں مسجد کی چھٹی صف میں تھا جو کہ مین ہال اور برآمدہ کے باہر چھت دار صحن میں ہے، ادھر کچھ اندھیرا سا بھی تھا، میں اور میرے برابر والے کچھ نمازی رُکوع میں چلے گئے، جب امام صاحب سجدے سے فارغ ہوکر قیام میں تکبیر کہتے ہوئے آئے، اس وقت پتہ چلا کہ امام صاحب نے رُکوع نہیں کیا بلکہ سجدۂ تلاوت کیا ہے، میں بھی رُکوع سے اُٹھ گیا اور امام صاحب کی قراءت سننے لگا، سجدۂ تلاوت کے فوت ہوجانے سے نماز ہوگئی یا اعادہ کرنا ہوگا؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں آپ کی نماز ہوگئی۔

لما فی الخانیة: اذا قرأ الامام اٰیة السجدة وبعض القوم کان فی الرحبة فکبّر الامام للسجدة وحسب من کان فی الرحبة أنه کبّر للرکوع فرکعوا ثم قام الامام من السجدة وکبّر فظن القوم أنه رفع رأسه من الرکوع فکبّروا ورفعوا رؤوسهم ان لم یزیدوا علٰی ذٰلک لم تفسد صلٰوتهم لأنهم ما زادوا الا رکوعا وبزیادة الرکوع لم تفسد الصلٰوة. فتاوی قاضی خان علٰی هامش الهندیة ج:۱ ص:۱۲۰ (۱)، ومثله فی خلاصة الفتاوی ج:۱ ص:۱۸۷ (۲)، والهندیة ج:۱ ص:۱۳۴ (۳).

البتہ اگر رُکوع میں علم ہوجاتا کہ امام سجدے میں گیا ہے تو رُکوع چھوڑ کر سجدے میں چلے جانا چاہئے تھا، لما فی البحر ولو قرأ الامام السجدة فسجد فظن القوم أنه رکع فبعضهم رکع وبعضهم رکع وسجد سجدة وبعضهم رکع وسجد سجدتین فمن رکع ولم یسجد یرفض

(۱ تا ۳) (طبع مکتبه حقانیه پشاور).

رکوعه ویسجد للتلاوة. البحر الرائق ج:۲ ص:۱۲۲[1]، ومثله فی الدر المختار مع الشامی۔[2]

یہاں یہ سوال ہوسکتا ہے کہ صورتِ مسئولہ میں مقتدی کا سجدۂ تلاوت ادانہیں ہوا کیونکہ رُکوع میں نیت کے بغیر سجدۂ تلاوت ادا نہیں ہوتا، اس کا جواب یہ ہے کہ اگر امام نے سجدۂ تلاوت کے بعد تین آیات پڑھنے سے پہلے رُکوع کردیا ہو تب تو مقتدی کا سجدۂ تلاوت سجدۂ نماز میں بلانیت بھی ادا ہوجائے گا، اور اگر تین آیات یا اس سے زیادہ قراءت کر کے رُکوع کیا ہو تو غـایت ما فی الباب مقتدی کا سجدۂ تلاوت ادانہیں ہوا، لیکن اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔

لما فی الدر المختار ولو تلاها فی الصلوة سجدها فیها لا خارجها لما مرّ، وفی البدائع واذا لم یسجد اثم فتلزمه التوبة.[3]

اورصورتِ مسئولہ میں چونکہ سجدۂ تلاوت عذر کی بناء پر چھوٹا ہے، اس لئے اُمید ہے کہ اِن شاء اللہ گناہ بھی نہ ہوگا۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۱/۱۰/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۳۲/۱۶۴۷ ج)

لاؤڈ اسپیکر پر آیتِ سجدہ سننے سے سجدۂ تلاوت واجب ہوگا

سوال:- تیز آواز والی مجلس کے مائیکروفون میں سجدے کی آیات تلاوت کرنے سے مجلس سے باہر یا گھر کے لوگوں کے سننے سے ان پر سجدہ کرنا واجب ہوگا یا نہیں؟ برتقدیر اوّل وہ لوگ اگر سجدہ نہ کریں تو تیز تلاوت کرنے والے یا بانیٔ مجلس پر گناہ عائد ہوگا یا نہیں؟

جواب:- واجب ہوگا۔ اور اگر انہوں نے سجدہ نہ کیا تو اس کے ساتھ لاؤڈ اسپیکر تیز آواز میں لگانے والے بھی گناہ سے خالی نہ ہوں گے۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۴۳۸۸/۱/۱۹ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) البحر الرائق باب سجود التلاوة ج:۲ ص:۱۲۱ (طبع ایچ ایم سعید).
(۲) الدر المختار ج:۲ ص:۱۱۲ (طبع ایچ ایم سعید).
(۳) الدر المختار ج:۲ ص:۱۱۰ (طبع ایچ ایم سعید).

﴿باب صلوٰۃ المریض والمسافر﴾
(مریض اور مسافر کی نماز کا بیان)

نمازِ قصر کہاں سے شروع کرے؟
کیا اپنے شہر میں قصر کرسکتا ہے یا نہیں؟

سوال ۱:- زید کراچی سے حیدرآباد، سکھر جانے کے لئے سفر کو نکلتا ہے، زید اپنے محلے اور بلاک کی حدود سے نکل کر قصر کرے یا کراچی شہر کی ساری حدود سے نکل کر قصر کرے؟

۲:- زید کسی ایسے بڑے شہر میں رہتا ہے جس شہر کی لمبائی تقریباً ۵۰ پچاس، ۵۵ پچپن میل ہے، زید اس شہر کے کونے میں رہتا ہے، زید کو اس شہر کے دُوسرے کونے میں جانا ہے جو کہ تین دن کی مسافت پر ہے پیدل جانے کی صورت میں، لہٰذا زید قصر کرے یا پوری چار رکعت پڑھے؟

جواب ۱:- کراچی شہر کی حدود سے نکل کر قصر کرے۔(۱)

۲:- صورتِ مسئولہ میں قصر جائز نہیں، اپنا شہر خواہ کتنا ہی طویل و عریض ہو اس میں قصر جائز نہیں۔(۲)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۲/۲/۳ھ
(فتویٰ نمبر ۳۳/۳۰۴ الف)

زوجہ اور عقار کو وطنیت کا معیار بنانے پر فتح القدیر اور البحر الرائق کی عبارات کی تحقیق

سوال:- زید ایک عالمِ دین ہے، اس کے دو دینی مدارس ہیں، ۱:- ایک قدیمی دیہات میں،

(۱، ۲) وفی الدر المختار باب صلٰوۃ المسافر ج:۲ ص:۱۲۱ (من خرج من عمارۃ موضع اقامته) من جانب خروجه وان لم یجاوز من الجانب الآخر. وفی الشامیة تحته (قوله من خرج من عمارۃ موضع اقامته) أراد بالعمارۃ ما یشمل بیوت الأخبیة لأن بها عمارۃ موضعها قال فی الامداد، فیشترط مفارقتها ولو متفرقة .... وأشار الی أنه یشترط مفارقة ما کان من توابع موضع الاقامة کربض المصر وهو ما حول المدینة من بیوت ومساکن فانه فی حکم المصر وکذا القری المتصلة بالربض فی الصحیح. وکذا فی البحر الرائق باب المسافر، الموضع الذی یبتدأ فیه القصر ج:۲ ص:۱۲۸ (طبع سعید). وغنیة المتملی فصل فی صلٰوۃ المسافر ص:۵۳۶ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور).

جہاں بیس تیس سال سے قیام پذیر ہے، اس کے اہل وعیال بھی وہیں ہیں، اس کے نجی مکانات بھی ہیں، اور مدرسہ مع مالہا وما علیہا ہے۔

۲:- عرصہ تین سال سے شہر میں بھی ایک مدرسہ قائم کر رکھا ہے جس میں سلسلۂ تعلیم جاری ہے اور زید کے زیرِ اہتمام وسرپرستی چل رہا ہے، زید کا شہر میں بھی اپنا نجی مکان ہے جس میں وہ رہتا ہے اور اس کے عیال کے بعض افراد مثلاً بیٹے، بہو وغیرہ بھی یہاں پر ہیں، خود زید حسبِ ضرورت دونوں جگہ قیام کرتا ہے، مدارس کے کام کے سلسلے میں جتنے دن شہر میں رہنے کی ضرورت پڑتی ہے وہاں رہتا ہے، پھر دُوسرے مدرسہ میں جتنا نجی یا مدرسہ کا کام ہو، رہتا ہے، مگر اکثر و بیشتر سابقہ دیہاتی مکان میں قیام ہوتا ہے، یاد رہے کہ زید کی دونوں ولادت گاہیں نہیں ہیں، کیا یہ دونوں جگہیں وطنِ اصلی شمار ہوں گی؟ اور جب بھی وہاں پہنچ جائے تو مقیم شمار ہوگا۔ ۱:- لأن بعضا من عیاله هنا وبعضا منه هنا، ۲:- ولأن له عقارًا ودورًا فی کلیهما، ۳:- ولأن له توطنا بلا ترجیح وامتیاز حسب الضرورة بکلیهما، یا ان میں سے ایک وطنِ اصلی شمار ہوگا بخلاف الآخر؟ مکانات وزمین پر وطنِ اصلی کا مدار معتبر ہے یا زوجہ کی رہائش کی جگہ کو ترجیح ہے؟

فقہاء کی بعض عبارات تنقیح طلب ہیں، مثلاً شامی نے وطنِ اصلی کی تعریف میں لکھا ہے: **هو موطن ولادته أو تاهله أو توطنه (یبطل بمثله)** پھر تاہلہ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

فان ماتت زوجته فی أحدهما وبقی له فیها دور وعقار قیل لا یبقی وطنًا له اذا المعتبر الأهل دون الدار ۔ مگر آگے لکھتے ہیں: **وقیل تبقی**، پھر آگے لکھتے ہیں: **قال فی النهر ولو نقل أهله ومتاعه وله دور فی البلاد لا تبقی وطنا له**، جس سے یوں مترشح ہوتا ہے کہ اعتبار اہل وعیال کا ہے، لیکن پھر لکھ رہے ہیں: **وقیل تبقی کذا فی المحیط**، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دور وعقار کو بھی وطنیتِ اصلی میں دخل ہے۔

بہرحال مسئلہ منقح نہیں ہو رہا ہے، سوال کے ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد جو جواب ہو، مدلل اور باحوالہ ارشاد فرمائیں۔ (مولانا) حسین احمد شرودی، کوئٹہ، بلوچستان

جواب:- آپ نے ردالمحتار سے دُور اور عقار کے مسئلے میں جو عبارت نقل کی ہے، اس کے مطابق اس کے بارے میں دو قول ہیں، اور یہی دو قول عالمگیریہ[1] اور بحر[2] میں بھی نقل کئے ہیں، اور کوئی ترجیح یا تطبیق نہیں دی، البتہ امداد الفتاویٰ میں حضرت مولانا تھانوی قدس سرہ نے اس مسئلے پر جو

---

(۱) فتاویٰ عالمگیریة ج:۱ ص:۱۴۲ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔

(۲) البحر الرائق باب المسافر ج:۲ ص:۱۳۶ (طبع سعید)۔ نیز دیکھئے: غنیة المتملی ص:۵۴۴ (طبع سہیل اکیڈمی لاہور)۔

گفتگو فرمائی ہے اس سے حقیقتِ مسئلہ واضح ہوجاتی ہے، ان کی عبارت یہ ہے:-

''صورتِ مذکورہ میں دونوں قول ہیں، اور یہی دونوں قول فتح القدیر اور البحر الرائق میں بھی نقل کئے ہیں، اور بحر میں دونوں قول کی دلیلیں بھی نقل کی ہیں، اور فتح القدیر میں دونوں کی تطبیق کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، اور میرے نزدیک تطبیق ہی مختار ہے، چنانچہ اس صورت میں امام محمدؒ کا قول: هٰذا حالي وأنا أرى القصر ان نوى ترك وطنه، نقل کرکے لکھا ہے: الا ان أبا يوسف كان يتم بها لٰكنه يحمل علىٰ أنه لم ينو ترك وطنه اھ۔[1]

خلاصہ تطبیق کا یہ ہوا کہ اگر اس دُوسرے شہر میں پھر بطور وطن رہنے کا ارادہ نہیں ہے جس طرح پہلے رہتا تھا تب تو وطن نہ رہا، وہاں جاکر قصر کرے گا جب مسافتِ سفر طے کرکے آئے، اور اگر اب بھی اسی طرح رہنے کا ارادہ ہے تو وہ بھی وطن ہے، پس اس شخص کے دو وطن ہوجاویں گے۔

(امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۳۶۴، ۴۹۴)[2]

اور اس مجموعہ سے احقر کی سمجھ میں جو بات آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس مسئلے میں اصل مدار مبتلیٰ بہ کی نیت کا ہے اور زوجہ کا ہونا یا ''دور وعقار'' کا ہونا اس نیت کی علامات ہیں، اصل مدارِ مسئلہ نہیں، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر آپ نے دیہات کے توطن کو چھوڑے بغیر شہر میں بھی بطور وطن رہنے کا اس طرح ارادہ کیا ہے کہ کبھی یہاں توطن رہے گا اور کبھی وہاں تو یہ دونوں مقامات آپ کے لئے وطنِ اصلی ہیں، اور بحر کی ایک عبارت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے: هٰذا جواب واقعة ابتلينا بها وكثير من المسلمين المتوطنين في البلاد ولهم دور وعقار في القرى البعيدة، منها يصيفون بها بأهلهم ومتاعهم، فلا بد من حفظها أنهما وطنان له لا يبطل أحدهما بالأخر. (البحر الرائق ج:۲ ص:۱۴۷)۔[3]

ہاں! اگر نیت شہر کے گھر کو وطن بنانے کی نہیں ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ کام کی غرض سے وہاں جانا ہوگا اور کام ختم ہوتے ہی اپنی اصلی جگہ واپس آجایا کریں گے، تو پھر دیہات وطنِ اصلی اور شہر وطنِ اقامت ہوگا، هٰذا ما ظهر لي والعلم عند الله العليم الخبير۔　　واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۱۱/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۲۵۳۵/۲۷ د)

---

(۱) فتح القدير باب صلوٰة المسافر ج:۲ ص:۱۸ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه).
(۲) امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۴۹۳.
(۳) البحر الرائق باب المسافر ج:۲ ص:۱۳۶ (طبع ایچ ایم سعید) وكذا في فتح القدير ج:۲ ص:۱۸ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه).

وطنِ اصلی اور وطنِ اقامت کا معیار (فارسی)

سوال:- چہ می گویند اندر ایں مسئلہ کی در ایں دیار بوقت فصل خرما خوری اہالیان شہر (الف) کہ وطن اصلی ایشاں است با اہل وعیال نقل مکانی کردہ بشہر (ب) میروند و خاص غرض ومقصد ایشاں خرما خوری است وعزم ایشاں بعد از انقطاع فصل خرما کہ مدت سہ چار ماہ باشد ارتحال وکوچیدن باز بسوئی وطن اصلی خود کہ شہر (الف) ہست میباشد ولی حالا برائے خرما خوری اہل وعیال خود را در شہر (ب) میگزارند، وخود در شہر (ب) ارادہ سکونت کمتر از پانزدہ روز دارند پس اکنون قابل دریافت چند اُمور است اوّل آنکہ ایں جا شہر (ب) ہست وطن اقامت صورت بندد یا نہ؟ دوم اینکہ ایں جا در شہر (ب) نماز ہائے چارگانی قصر کنند یا اتمام؟ بینوا توجروا.

جواب:- جواب صورتِ مسئولہ نزد ایں حقیر آنست کہ اہل وعیال در شہر (ب) بحکم مقیم ہستند واتمام صلاۃ برایشان واجب، زیرا کہ نیت قیام زائد از پانزدہ روز کردہ اند، اما سرپرست آنہا کہ نیت قیام کمتر از پانزدہ روز کردہ است دراں شہر قصر خواہد کرد، پس شہر (ب) در حق اہل وعیال وطن اقامت ہست ودر حق سرپرست وطن السفر واگر سرپرست ہم نیت قیام پانزدہ روز کند او ہم اتمام خواہد کرد، وجوابے کہ منسلک بہ سوال است، اگر مراد او این است کہ ہر شہرے کہ دران اہل باشند، خواہ بہ نیت قیام عارضی، آن وطن اقامت نمی تواند شد، این جواب درست نیست کہ از و لازم می آید کہ ہر سفرے کہ دراں اہل وعیال ہمراہ باشند دراں نیت اقامت درست نہ شود، وھذا لم یقل بہ أحد وفقہاء بصراحت ایں مسئلہ نوشتہ اند کہ "والمعتبر نیۃ المتبوع لأنہ الأصل لا التابع کامرأۃ .... مع زوج." (درمختار مع الشامی ج:۱ ص:۵۳۳،۵۳۴)[1]

پس معلوم شد کہ اگر شخصے در شہرے ہمراہ زوجہ خود اقامت کند او وطن اقامت می گردد، اما قول فقہاءؒ کہ ووطن الاقامۃ ما ینوی فیہ الاقامۃ خمسۃ عشر یوما فصاعدا ولم یکن مولدہ لہ لا لہ بہ أھل کما فی الکبیری ص:۵۰۶[2] پس مراد او مجرد وجود اہل نیست، بلکہ توطن اہل است، واز اینجا است کہ بعض فقہاء در تعریف وطن اقامت "ولا لہ بہ اہل" ذکر نمی کردہ اند چنانکہ علامہ شامیؒ گویند:

وھو ما خرج الیہ بنیۃ اقامۃ نصف شھر سواء کان بینہ وبین الأصلی مسیرۃ السفر أو لا۔ (شامی ج:۱ ص:۵۳۲)[3]

---

(۱) الدر المختار باب صلوٰۃ المسافر ج:۲ ص:۱۳۳ (طبع ایچ ایم سعید).

(۲) غنیۃ المتملی ص:۵۳۶ (طبع سہیل اکیڈمی لاہور).

(۳) رد المحتار باب صلوٰۃ المسافر ج:۲ ص:۱۳۲ (طبع سعید).

پس خلاصہ ایں است کہ شہر (ب) در حق اہل و عیال وطن اقامت ہست و در حق مرد اگر نیت اقامت کمتر از پانزدہ روز است منزل سفر ہست و بیش ازاں وطن اقامت، هذا ما عندی۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۶/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۱۲/۷۲۹ ب)

وطنِ اصلی سے مکمل طور پر منتقل ہو جانے کے بعد دوبارہ وطن آنے کی صورت میں قصر کا حکم

سوال ۱:- زید علاقہ کالاباغ بستی کوٹ چاندنہ کا رہنے والا ہے اور وہ اس کا آبائی وطن ہے، کسی وجہ سے زید اپنے آبائی وطن سے نقل مکانی کر کے ریاست بھاولپور ضلع رحیم یار خان میں اپنا تاهل بنالیتا ہے، جو اس کے آبائی وطن سے تقریباً چار سو میل کے فاصلے پر واقع ہے، حسبِ ارشادِ گرامی حضور صلی اللہ علیہ وسلم: من تأهل في بلد فليصل صلوة المقيم، نماز کی قصر نہ کرے گا، لیکن اگر کبھی اپنے آبائی وطن میں اس کا آنا ہو اور وہاں چودہ دن سے کم رہنے کا ارادہ ہو تو وہاں صلوٰۃ مقیم ادا کرے گا یا قصر؟

۲:- اگر زید اپنے آبائی وطن میں آیا اور اس نے پندرہ دن وہاں قیام کرنے کا ارادہ بھی کرلیا، تو اب وہ وہاں قصر نہیں کرے گا، بلکہ صلوٰۃ مقیم ادا کرے گا، پندرہ دن کے بعد وہ قریب دو تین میل یا بارہ، تیرہ میل یعنی اڑتالیس میل کے اندر دو تین دن کے لئے سفر کا ارادہ کر کے سفر بھی کرتا ہے اور ایک دو رات کے لئے پھر وہ اپنی قیام گاہ یعنی آبائی وطن میں آنے کا ارادہ رکھتا ہے تو وہ راستے کی نمازیں اور قیام گاہ کی نمازیں قصر کرے گا؟

جواب ۱:- صورتِ مسئولہ میں اگر آپ کا ارادہ اپنے آبائی وطن (کوٹ چاندنہ) میں بطور وطن رہنے کا نہیں ہے تو اب یہ بستی آپ کی وطنِ اصلی نہیں رہی، لہٰذا آپ جب مسافتِ سفر طے کر کے یہاں آئیں تو قصر کریں گے، محض جائیداد اور مکانات ہونے کی بنا پر اس صورت میں اسے وطنِ اصلی نہیں کہا جائے گا، لما في رد المحتار ولو نقل أهله ومتاعه وله دور في البلد لا تبقى وطنًا له وقيل تبقى[1] ووجه القول الثاني في فتح القدير بأنه محمول على ما اذا عزم على ابقائه وطنًا، وهذا التوجيه اختاره الشيخ في امداد الفتاوی ج:۱ ص:۳۶۴۔[2]

(۱) رد المحتار باب صلوٰۃ المسافر ج:۲ ص:۱۳۲ (طبع ایچ ایم سعید)۔

(۲) امداد الفتاوی ج:۱ ص:۳۹۳، ۳۹۲ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)۔ وفي الهداية ج:۱ ص:۱۲۷ (طبع مکتبہ شرکت علمیہ ملتان) ومن كان له وطن فانتقل منه واستوطن غيره ثم سافر فدخل وطنه الأول قصر لأنه لم يبق وطنا له الا يرى أنه عليه السلام بعد الهجرة عد نفسه بمكة من المسافرين وهذا لأن الأصل أن الوطن الأصلي تبطل بمثله دون السفر ووطن الاقامة تبطل بمثله وبالسفر وبالأصلي .... الخ.

۲:- جب کوٹ چاندنہ آپ کا وطنِ اصلی نہیں ہے تو آپ صرف اس وقت وہاں اتمام کریں گے جب چودہ دن سے زائد قیام کی نیت کی ہو، اس کے بعد اگر آپ کہیں دُوسری بستی میں جائیں تو اگر یہ بستی وہاں سے اَڑتالیس میل دُور ہو تو آپ وہاں بھی قصر کریں گے، اور واپس کوٹ چاندنہ ایک دو رات کے لئے آئیں گے تو وہاں بھی قصر کریں گے، لیکن جس بستی میں آپ گئے ہیں اگر وہ کوٹ چاندنہ سے اَڑتالیس میل سے کم ہے تو بدستور اتمام کرتے رہیں، لأن وطن الاقامة يبطل بالسفر وقال في رد المحتار: والحاصل أن انشاء السفر يبطل وطن الاقامة اذا كان منه، أما لو أنشأه من غيره فان لم يكن فيه مرور على وطن الاقامة أو كان ولكن بعد سير ثلاثة أيام فكذلك ولو قبله لم يبطل الوطن .... الخ. ج:۱ ص:۵۳۳۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۰ھ
(فتویٰ نمبر ۹۳۷/۲۸ ج)

فوج کی پوسٹنگ کی تبدیلی کی بناء پر نمازِ قصر سے متعلق چند سوالات کے جوابات

سوال ۱:- شہر کے قریب فوجیوں کا کیمپ ہے، جب شہر میں اذانِ جمعہ ہو جاتی ہے تو وہاں اس کیمپ میں آواز سنائی دیتی ہے، مگر افسرانِ بالا کی طرف سے حکم ہے کہ کوئی فوجی شہر میں جمعہ کے لئے نہ جائے، اس صورت میں اس کیمپ میں نمازِ جمعہ دُرست ہوگی؟ یہ بات ہے کہ اس کیمپ میں مستقل کوئی مسجد نہیں ہے، پانچوں نمازیں ایک کمرے میں پڑھتے ہیں جو بوقتِ ضرورت خالی بھی کرنا پڑتا ہے، کیا ایسے کمرے میں دیگر نمازیں جمعہ کے علاوہ پڑھنا جائز ہے؟

جواب ۱:- یہ کیمپ شہر سے کتنی دُور ہے؟ کیا شہر کی عمارتوں اور اس کے کیمپ کے درمیان کچھ غیر آباد علاقہ ہے، جو شہر کا حصہ شمار نہ کیا جاتا ہو، اس کا جواب آنے پر اصل مسئلے کا جواب دیا جاسکے گا۔

سوال ۲:- جو آفیسر اپنے ماتحت یونٹوں کی دیکھ بھال کے لئے دُور جاتے ہیں، یعنی تقریباً اٹھائیس میل کی مسافت طے کرتے ہیں تو کیا یہ لوگ قصر کریں گے؟

جواب ۲:- اگر پوسٹ جس کی چیکنگ کے لئے جارہا ہے شہر کی آخری حدود سے اَڑتالیس میل دُور ہے تو قصر کرسکتا ہے۔

سوال ۳:- ایک آفیسر فوجیوں کو لے کر جب دُور دراز کے علاقوں میں جاتے ہیں، وہاں قیام کا کوئی پتہ نہیں ہوتا، جب کسی آفیسر سے دریافت کیا جاتا ہے تو بھی لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں، کیونکہ

---
(۱) رد المحتار باب صلوٰۃ المسافر ج:۲ ص:۱۳۲ (طبع ایچ ایم سعید)۔

فوج میں قانون ہے کہ قیام کی حد کا کسی کو نہیں بتایا جاتا، تو اس صورت میں قصر کیا جائے گا یا نہیں؟

جواب۳:- مذکورہ صورت میں فوجیوں کو قصر کرنا چاہئے، جب تک پندرہ دن قیام کرنے کا عزم نہ ہو قصر ہی کیا جائے گا، خواہ اس غیریقینی حالت میں کئی مہینے گزر جائیں۔[1]

سوال۴:- اگر یہ چھوٹے چھوٹے یونٹوں والے سپاہی اور نوکر وغیرہ ہیڈکوارٹر کو پندرہ دن سے کم مدّت کے لئے گئے تو کیا یہ سپاہی قصر کریں گے یا اتمام؟

جواب۴:- اگر یونٹ سے ہیڈکوارٹر کے شہر کا فاصلہ اڑتالیس میل ہے تو قصر کریں گے۔

سوال۵:- اگر ایک امام مسافر ہو اور کسی جگہ یہ جماعت پڑھاتا ہے تو مقتدی کی نیت اور امام کی نیت میں کچھ فرق ہوگا یا نہیں؟ اگر امام ہیڈکوارٹر کو جائے تو اس کو بھی معلوم نہیں ہوتا کہ میں وہاں کتنا قیام کروں گا؟ اگر وہ امام وہاں نماز پڑھائے گا تو کیسے پڑھائے گا؟

جواب۵:- مسافر امام دو رکعتوں کی نیت کرے گا، اور مقتدی چار رکعتوں کی، پھر امام جب دو رکعتوں پر سلام پھیر دے تو مقتدی کھڑے ہوکر اپنی نماز پوری کریں[2]، مگر اس میں قراءت نہ کریں، بلکہ جتنی دیر میں سورۂ فاتحہ پڑھی جاتی ہے اتنی دیر خاموش کھڑے رہ کر رُکوع میں چلے جائیں، قصر کا مسئلہ وہی ہے جو نمبر۳، نمبر۲ میں گزر گیا ہے۔

فقط واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۲۱ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفی عنہ

شرعی معذور کی نماز کا حکم

سوال:- ہماری مسجد میں ایک صاحب نماز پڑھتے ہیں، وضو کرکے نماز میں شریک ہوتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ رُکوع میں جب جاتا ہوں تو ہوا خارج ہوجاتی ہے، ہر نماز میں یہی حالت ہوتی ہے، کیا نماز پڑھنا چھوڑ دیں یا کیا صورت اختیار کی جائے؟

جواب:- اگر ان صاحب کو چار رکعتیں بھی بغیر وضو ٹوٹے پڑھنے پر قدرت نہیں ہے، تو شرعاً وہ معذور ہیں، اور ان کے لئے حکم یہ ہے کہ وہ ہر نماز کا وقت شروع ہونے پر وضو کرلیا کریں اور

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۱۳۴ (طبع سعید) (ولا بد من علم التابع بنیة المتبوع فلو نوی المتبوع الاقامة ولم یعلم التابع فهو مسافر حتی یعلم علی الأصح) وفی الفیض وبه یفتی کما فی المحیط وغیره دفعا للضرر عنه.

(۲) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۱۲۹، ۱۳۰ وصح اقتداء المقیم بالمسافر فی الوقت وبعده فاذا قام المقیم الی الإتمام لا یقرأ ولا یسجد للسهو فی الأصح، لأنه کاللاحق والقعدتان فرض علیه وقیل لا، قنیة وندب للإمام .... وفی شرح الارشاد ینبغی أن یخبرهم قبل شروعه والا فبعد سلامه (أن یقول) بعد التسلیمتین فی الأصح: أتموا صلوتکم فانی مسافر .... الخ.

اس وضو سے نماز پڑھتے رہیں، جب تک اس نماز کا وقت باقی رہے گا اس وقت تک وضو ریح خارج ہونے سے نہیں ٹوٹے گا، ہاں! جب وہ وقت ختم ہوگا اور اگلا وقت شروع ہوگا تو نیا وضو کرلیں اور اس سے نماز پڑھتے رہیں،[1] جب تک یہ عذر باقی رہے اس وقت تک ایسا کرتے رہیں، جب عذر ختم ہوجائے تو حسبِ معمول وضو کیا کریں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۱/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۶/ ۲۸ الف)

معذور کی نماز کا حکم

سوال:- کبھی کبھی ثقیل یا بادی چیز کھانے کی وجہ سے مرض کا زور ہوتا ہے، تو رفعِ حاجت کے بعد مسے زیادہ متورّم اور سخت ہوجاتے ہیں، اور چند نَفَس بیٹھنے اور دبانے کے باوجود داخل نہیں ہوتے، اس صورت میں مرہم مسوں پر لگا کر اور پھایہ مرہم کے نیچے گدی کپڑے کی رکھ کر لنگر باندھنا پڑتا ہے، رطوبت اور بعض دفعہ خون بھی جو مسوں سے خارج ہوتا ہے گدی میں جذب ہوتا رہتا ہے، بعض مرتبہ صرف ایک یا دو روز کے بعد اور بعض مرتبہ ہفتے عشرے کے بعد سابقہ حالت بحال ہوتی ہے، مجبوراً ان حالات میں نماز ادا کرنی پڑتی ہے، کیا ان حالات میں نماز کی ادائیگی میں کوئی نقص واقع ہوتا ہے؟ اگر ہے تو اس کے ازالے کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟ خصوصاً اگر یہ حالت حج کے موقع پر یا امام کو پیش آجائے تو مناسکِ حج کی ادائیگی کے لئے کیا اَحکام ہیں؟ اور کیا تدابیر اختیار کی جائیں؟

جواب:- اگر خون یا رطوبت کا اخراج اتنے تسلسل کے ساتھ ہوتا ہے کہ باوضو چار رکعت نماز کی ادائیگی اس اخراج کے بغیر نہیں ہوسکتی تب تو حکم یہ ہے کہ ہر وقت کی ابتداء میں وضو کرلیا جائے اور اس سے فرض و نفل وغیرہ ادا کرلئے جائیں، یہ وضو مذکورہ اخراج سے نہیں ٹوٹے گا، پھر جب دُوسرا وقت آئے تو نیا وضو کرلے۔[2] کپڑے کا معاملہ یہ ہے کہ اگر اس پر لگنے والی نجاست ایک گلٹ کے روپیہ کے برابر نہ ہو بلکہ اس سے کم ہو تو اس حالت میں نماز ہوجاتی ہے، اور اگر نجاست اس سے زائد ہو اور یہ اندیشہ ہو کہ اگر کپڑے کو پھر دھویا گیا تو نماز سے فارغ ہونے سے پہلے کپڑے کو پھر روپیہ سے زائد نجاست لگ جائے گی تو دھونا واجب نہیں، اس حالت میں نماز ہوجائے گی، اور اگر یہ اندیشہ نہ ہو تو

(۱، ۲) وفي التنوير وشرحه ج:۱ ص:۳۰۵، ۳۰۶ وصاحب عذر من به سلس بول لا یمکنه امساكه أو استطلاق بطن أو انفلات ریح أو استحاضة .... ان استوعب عذره تمام وقت صلوٰة مفروضة بأن لا یجد في جمیع وقتها زمنا یتوضأ ویصلي فیه خالیا عن الحدث ولو حکما .... وحکمه الوضوء لکل فرض .... ثم یصلي به فیه فرضًا أو نفلًا فاذا خرج الوقت بطل.

دھونا واجب ہے، اور اگر رطوبت یا خون کا اخراج اتنے تسلسل کے ساتھ نہیں ہوتا جس کا ذکر پہلے فقروں میں کیا گیا ہے تو ہر اخراج کے بعد نماز کے لئے وضو کرنا بھی ضروری ہے اور کپڑے دھونا بھی۔

مناسکِ حج میں طواف کے لئے وضو ضروری ہے[1]، اس لئے اس کا حکم نماز کا سا ہے، باقی ارکان بلا وضو ادا کرنے سے ادا ہو جاتے ہیں، بہتر یہ ہے کہ یہ مسائل آپ کسی عالم سے زبانی بھی سمجھ لیں۔

واللہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفی عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۳۰ھ
(فتویٰ نمبر ۴۰/۱۹ الف)

معذور کے لئے وضو کا حکم

سوال:- زید کو کافی عرصے قبض کی شکایت رہی جس کی بناء پر ڈاکٹر نے آپریشن کیا اور قضائے حاجت کے قدرتی راستے کو بند کر کے دُوسری جگہ سے قضائے حاجت کا راستہ بنا دیا، اس بناء پر زید کو ریح اور قضائے حاجت پر قابو نہیں ہے، ایک کامل نماز کے دوران کم از کم تین چار بار بے اختیاری طور پر ریح خارج ہو جاتی ہے، اور زید کو بار بار وضو کے لئے تکلیف اُٹھانی پڑتی ہے، اس بناء پر زید معذورین میں شمار ہے یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر واقعۃً ایک کامل نماز بھی بغیر خروجِ ریح کے ادا نہیں ہو سکتی تو زید شرعاً معذور ہے، اور وہ ایک وقت کے شروع میں وضو کر کے اس سے جتنی چاہے نماز پڑھ سکتا ہے، اور وقت کے دوران خروجِ ریح سے اس کا وضو نہیں ٹوٹے گا۔[2]

واللہ اعلم
۱۴۰۵/۱۲/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹۲۶/۳۶ و)

شرعی معذور کی تعریف اور عذر کا معیار

سوال:- میری عمر ۴۹ سال ہے، ۲۰ سال کی عمر میں میں نے نماز شروع کی، جن دنوں میں نے نماز شروع کی وہ میری گوناگوں امراض و بیماری کا زمانہ تھا، اس وقت مجھ کو ایک تکلیف یہ بھی تھی کہ میری ریح نہیں ٹھہرتی تھی، یعنی تکلیف کم و بیش لگی رہتی تھی، جس کے متعلق علماء حضرات سے دریافت کیا

(۱، ۲) دیکھئے سابقہ ص:۵۰۵ کا حاشیہ نمبر ۱، ۲۔

ہوگا، میرے ذہن میں ہے کہ انہوں نے فرمایا ہوگا کہ تم ریح کے معذور ہو، تم ہر وقت وضو کرو، لہٰذا میں اس طرح کرتا رہا۔

اب سے ایک ماہ پیشتر ایسے ہی کرتا رہا ہوں، اور جو میرے ذمہ چھ سالوں کی قضا نمازیں تھیں وہ بھی اس طرح ادا کرتا رہا ہوں، اور سردیوں میں موزے بھی وقت کے اندر پہن لیا کرتا تھا، ایک دن بہشتی زیور میری نظر سے گزری، تو وہاں مولانا صاحب نے تحریر فرمایا تھا کہ معذور آدمی اس وقت موزہ پہنے جب کہ طہارت کامل میں ہو تو پہنے تو پھر وہ مسح کرسکتا ہے، اور میں تو یہ سمجھتا رہا ہوں کہ وقت کے اندر میں پاک ہوں اس طرح مجھ سے غلطی ہوچکی ہے اور متواتر کئی سالوں سے ہو رہی ہے، پھر میں نے اپنے عذر ریاح کی تحقیق کی تو اس میں یہ معلوم ہوا کہ میں بہ تکلیف طہارت سے نماز ادا کرسکتا ہوں، یعنی پریشانی تو ہوتی ہے مگر جان روکنے سے نماز ادا ہو جاتی ہے، کیونکہ تقریباً ایک ماہ میں صرف دو تین دفعہ نمازوں میں دو، دو وضو کرنے پڑے، اب کتاب نور الایضاح وغیرہ جب دیکھی تو اس میں معذور کے متعلق جو حکم ہے کہ پہلی مرتبہ اس کو اتنا وقت نہ ملے کہ وہ نماز پڑھ سکے، مگر میری یہ حالت نہ تھی، تکلیف تو تھی مگر اتنی شدید نہ تھی، بہ جبر و تکلیف میں نماز ادا کرسکتا تھا..... میں معذور ہوں یا نہیں؟

جواب:- ''معذور'' ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ابتداء میں عذر کی کیفیت یہ ہو کہ ایک نماز بھی طہارت کے ساتھ نہ پڑھی جاسکے اور جتنی دیر میں وضو کرکے ایک فرض نماز پڑھی جائے اتنی دیر تک ریح نہ رُک سکے۔[1] چونکہ آپ کی یہ کیفیت نہ تھی جیسا کہ آپ نے بیان فرمایا ہے، اس لئے آپ پر معذور کے اَحکام جاری نہیں ہوسکتے، اب آپ کو چاہئے کہ گزشتہ سالوں کی نمازیں جس حد تک آپ کو قدرت ہو قضا کرتے رہیں، باقی کے لئے توبہ و استغفار بھی کریں، اور وصیت بھی لکھ دیں کہ آپ کے بعد آپ کے ترکہ سے چھوٹی ہوئی نمازوں کا فدیہ ادا کردیا جائے، تاکہ جو نمازیں بوجہ عذر قضا نہ کی جاسکیں ان کی تلافی فدیہ کے ذریعہ ہوجائے۔[2]

موزوں پر مسح کے بارے میں یہ مسئلہ یاد رکھئے کہ آپ اگر معذور ہوتے تب بھی ایک دن ایک رات تک مسح کرنا آپ کے لئے اس وقت تک جائز ہوتا جبکہ آپ نے حقیقی وضو کرکے واقعۃً باوضو ہونے کی حالت میں پہنا ہوتا، اور اگر کوئی معذور ریح خارج ہونے کے بعد موزے پہنے تو وہ صرف وقت ختم ہونے تک مسح کرسکتا ہے اس کے بعد نہیں۔ **فی الدر المختار ومعذور فانه یمسح فی**

---

(۱) حوالہ کے لئے سابقہ ص:۵۰۵ کا حاشیہ نمبر۱،۲۔

(۲) نماز کے فدیہ سے متعلق حضرتِ والا دامت برکاتہم کا تفصیلی فتویٰ سابقہ ص:۴۸۶ میں ملاحظہ فرمائیں۔

الوقت فقط، الا اذا توضأ ولبس علی الانقطاع الصحیح. (شامی ص: ۲۵۰، والتفصیل فی رد المحتار)۔[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۴/۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

قطرے کا مریض کپڑا دیکھے بغیر نماز پڑھے تو کیا حکم ہے؟

سوال:- زید قطرے کا مریض ہے، شبہ پر جب دیکھا تو بعض مرتبہ قطرہ آیا اور بعض مرتبہ نہیں آیا، ایسا مریض بغیر کپڑا دیکھے سابقہ وضو سے نماز پڑھے تو جائز ہے؟ یا تجدید وضو کرے؟

جواب:- اگر قطرہ نکلنے کا گمان غالب ہو تو چاہے قطرہ نظر آئے یا نہ آئے وضو کرنا واجب ہے، اور اگر محض شبہ یعنی کسی طرف گمان غالب نہ ہوتا ہو تو دیکھ کر اطمینان کر لینا چاہئے، اور اگر اس صورت میں قطرہ نظر نہ آئے تو نیا وضو کئے بغیر نماز پڑھنا جائز ہے، شبہ کی صورت میں اگر کسی عذر کی وجہ سے دیکھنے کا موقع نہ ملے تو بغیر دیکھے اور بغیر تجدید وضو کئے نماز پڑھ لینے سے نماز ہو جائے گی۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۵/۱ھ
(فتویٰ نمبر ۲۴/۱۹ الف)

الجواب صحیح
محمد شفیع

---

(۱) الدر المختار مع رد المحتار باب المسح علی الخفین ج: ۱ ص: ۲۷۱ (طبع سعید)

﴿فصل فی الجمعة﴾
(جمعہ کے متعلق مسائل کا بیان)

حنفیہ کے نزدیک نمازِ جمعہ کے لئے شہر کا وجود ضروری ہے

سوال:- جمعہ کی نماز کے لئے احناف کے نزدیک شہر کا وجود ضروری ہے یا نہیں؟

جواب:- حنفیہ کے نزدیک جمعہ صرف شہر، قصبے یا ایسے بڑے گاؤں میں ہوسکتا ہے جہاں ضروریاتِ زندگی عام ملتی ہوں، بازار ہو، سڑکیں ہوں، اور وہ اپنی خصوصیات کے لحاظ سے شہر کے ساتھ مشابہ ہو، چھوٹے گاؤں میں جمعہ جائز نہیں۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۱/۱۴ھ

دورانِ خطبہ تشہد کی ہیئت پر بیٹھ کر ہاتھ باندھنا

سوال:- ہمارے ہاں ملک بھر میں رواج ہے کہ جمعہ کی نماز کے خطبے میں، تشہد میں بیٹھنے کی طرح بیٹھ کر ہاتھ باندھ لیتے ہیں اور جب خطیب درمیان خطبہ کے بیٹھتا ہے تو آخری خطبے میں ہاتھ رانوں پر رکھ لیتے ہیں، کیا ایسا کرنا فرض، واجب یا سنت ہے؟ جو ایسا نہ کرے کیا وہ گنہگار ہے؟

جواب:- خطبۂ جمعہ میں اصل یہ ہے کہ اس کو دھیان سے سننا واجب ہے، اور خطبے کے دوران کوئی بات چیت یا ایسا عمل ممنوع ہے جس سے سننے میں خلل واقع ہو،[2] لیکن تشہد کی ہیئت میں بیٹھنا، ہاتھ باندھنا اور خاص وقت پر ہاتھ چھوڑ دینا سنت نہیں، ادب کے خیال سے دوزانو بیٹھنے میں کچھ

---

(۱) وفي الدر المختار ج:۲ ص:۱۳۷ ويشترط لصحتها سبعة أشياء، الأول المصر ... وظاهر المذهب انه كل موضع له أمير وقاض يقدر على اقامة الحدود. وفي الشامية عن أبي حنيفة انه بلدة كبيرة فيها سكك وأسواق ولها رساتيق وفيها وال يقدر على انصاف المظلوم من الظالم بحشمته وعلمه أو علم غيره يرجع الناس اليه فيما يقع من الحوادث وهذا هو الأصح ... الخ. وكذا في البحر الرائق ج:۲ ص:۱۵۱. نیز دیکھئے امداد الاحکام ج:۱ ص:۵۲۷۔

(۲) وفي الدر المختار ج:۲ ص:۱۵۹ (طبع ایچ ایم سعید) وكل ما حرم في الصلوٰة حرم فيها، أى في الخطبة، خلاصة وغيرها. فيحرم أكل وشرب وكلام ولو تسبيحا أو ردّ سلام أو أمرا بمعروف بل يجب عليه أن يستمع ويسكت.

حرج نہیں، بلکہ بہتر ہے،[۱] لیکن مذکورہ التزامات اگر واجب یا سنت سمجھ کر کئے جائیں تو بدعت ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۱۰ھ

(فتویٰ نمبر ۲۵۱۳/۲۷ و)

خطبے کے دوران نفل نماز پڑھنے کا حکم

سوال: - ایک شخص دورانِ خطبہ آیا اور بیٹھ گیا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا: کیا تم نے دو رکعت نماز پڑھ لی؟ اس نے کہا: نہیں! فرمایا: اُٹھ اور پہلے دو رکعت نماز پڑھ۔ یہ شاید بخاری کی حدیث ہے، اہلِ سنت والجماعت کا خطبے کے دوران عمل اس سے مختلف ہے؟

جواب: - بخاری شریف ہی کی حدیث میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبۂ جمعہ کے دوران کلام کرنے سے یہاں تک کہ دُوسرے کو خاموش کرنے سے بھی منع فرمایا، (بخاری ج:۱ ص:۱۲۷، ۱۲۸)۔[۲] نیز معجم طبرانی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ امام کے خطبہ دیتے وقت جب تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو تو نہ نماز جائز ہے نہ بات کرنا، (بحوالہ اعلاء السنن ج:۲ ص:۵۷)۔[۳] نیز حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ خطبہ شروع ہونے کے بعد نماز پڑھنے سے روکتے تھے، (عمدۃ القاری ج:۶ ص:۲۳۲)۔[۴] لہٰذا بخاری شریف میں جو واقعہ حضرت سلیک عطفانی رضی اللہ عنہ کا آیا ہے، وہ حضرت سلیکؓ کی خصوصیت تھی، چنانچہ سننِ دارقطنیؒ اور ابوبکر بن ابی شیبہؒ نے اسی واقعے میں یہ تصریح فرمائی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سلیکؓ کو نماز کا حکم فرما کر خود خاموش ہوگئے تھے اور جب تک وہ نماز سے فارغ ہوگئے آپ رُکے رہے، امسک عن الخطبة حتی فرغ من رکعتیه ثم عاد الی خطبته. (عمدۃ القاری ج:۶ ص:۲۳۲)۔[۵] یہاں تفصیل کا موقع نہیں، بعض دُوسرے دلائل کی روشنی میں بھی یہ حضرت سلیکؓ کی خصوصیت معلوم ہوتی ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۱۷ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۹۵/۱۹ الف)

---

(۱) وفی الهندیة ج:۱ ص:۱۴۸ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه) اذا شهد الرجل عند الخطبة ان شاء جلس محتبیًا أو متربعًا أو كما تيسر لأنه ليس بصلوة عملًا وحقيقةً، كذا فى المضمرات ويستحب أن يقعد فيها كما يقعد فى الصلوة كذا فى معراج الدراية.

(۲) (طبع قدیمی کتب خانه).

(۳) اعلاء السنن باب كراهة الصلوة والكلام اذا خرج الامام للخطبة يوم الجمعة لا سيما اذا شرع فيها ج:۲ ص:۶۷ (طبع ادارة القرآن كراچى).

(۴) باب اذا رأى الامام رجلًا جاء وهو يخطب أمره أن يصلّي ركعتين. (طبع دار الفكر).

(۵) دیکھئے حوالہ مذکورہ حاشیہ نمبر۴۔ (محمد زبیر حق نواز)

خطبے کے دوران خاموش رہنا واجب ہے

سوال:- خطیب صاحب دورانِ خطبہ یہ آیتِ کریمہ تلاوت کردیں: "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ" الآیۃ، تو دُرود شریف بآوازِ بلند پڑھنا چاہئے یا نہیں؟

جواب:- خطبے کے دوران بالکل خاموش رہنا واجب ہے،[1] اور یہ حدیث میں ہے کہ اگر کوئی شخص بول رہا ہو تو اسے چپ کرانے کے لئے بولنا بھی ناجائز ہے،[2] لہٰذا جب امام آیتِ کریمہ: "اِنَّ اللہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ" الآیۃ[3] پڑھے تو مقتدیوں کو دِل دِل میں دُرود شریف پڑھنا چاہئے، زبان سے پڑھنا دُرست نہیں، خطبے کے دوران نماز پڑھنا بھی ناجائز ہوجاتا ہے تو دُرود پڑھنا بدرجۂ اَولیٰ نادُرست ہوگا۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۱ھ

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۷۴/۱۹ الف)

جمعہ کی اذانِ ثانی امام اور منبر کے سامنے دینی چاہئے

سوال:- جمعہ کے خطبے کے لئے بروز جمعہ امام صاحب منبرِ رسول پر بیٹھتے ہیں تو مؤذن صاحب کو ان کے بالکل سامنے لاؤڈاسپیکر رکھ کر اذان دینی چاہئے؟ اور کیا یہ طریقہ بدعت ہے؟ یا دائیں بائیں ہٹ کر اذان دینی چاہئے؟

جواب:- خطبے کے وقت اذان امام اور منبر کے بالکل سامنے ہونی چاہئے، دائیں یا بائیں ہٹ کر نہیں، اور اذان کے اس طریقے کو بدعت قرار دینا دُرست نہیں، کما صرح بہ الفقھاء[4] وتمام دلیلہ فی امداد الفتاویٰ۔[5]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۹۸۴/۲۸ ج)

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۱۵۹ (طبع سعید) وکل ما حرم فی الصلوۃ حرم فیھا أی فی الخطبۃ خلاصۃ وغیرھا فیحرم أکل وشرب وکلام ولو تسبیحًا أو ردّ سلام أو امرًا بمعروف بل یجب علیہ أن یستمع ویسکت.
وکذا فی امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۴۵۷، ۴۵۸ (طبع دار العلوم کراچی).

(۲) وفی صحیح البخاری ج:۱ ص:۱۲۷، ۱۲۸ (طبع قدیمی کتب خانہ) ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: اذا قلت لصاحبک یوم الجمعۃ أنصت والامام یخطب فقد لغوت.

(۳) سورۃ الأحزاب: ۵۶.

(۴) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۱۶۱ ویؤذن ثانیًا (بین یدیہ) أی الخطیب، وفی الشامیۃ تحتہ (قولہ ویؤذن ثانیًا بین یدیہ) أی علی سبیل السنیۃ کما یظھر من کلامھم، رملی .... الخ. وکذا فی فتح القدیر ج:۲ ص:۳۸ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ) وفتاویٰ دار العلوم دیوبند ج:۵ ص:۱۵۸.

(۵) دیکھئے: امداد الفتاویٰ ص:۴۷۳ تا ۴۸۱ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)۔

جمعہ کے دن نماز سے قبل تقریر کرنے کا حکم

سوال:- جمعہ کے دن نماز سے قبل تقریر کرنی چاہئے یا بعد نماز؟ سنت طریقہ کون سا ہے؟ اور کیا خطبے سے پہلے وعظ کہنا بدعت ہے؟

جواب:- خطبے سے پہلے اور جمعہ کے بعد دونوں وقت وعظ کہنا جائز ہے، جس صورت میں مسلمانوں کا زیادہ فائدہ اور سہولت ہو اسے اختیار کیا جاسکتا ہے، اور خطبے سے پہلے وعظ کہنے کو بدعت قرار دینا غلط ہے، ہاں! وہ مباح ہے، خاص اس وقت کے لحاظ سے اسے مسنون یا واجب قرار دینے سے بدعت ہوجائے گا۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۲۱ھ

جمعہ کا خطبہ اور نماز الگ الگ اشخاص پڑھائیں تو کیا حکم ہے؟

سوال:- ہمارے محلّہ کی مسجد کے امام صاحب حافظ نہیں ہیں، تراویح ایک دُوسرے حافظ صاحب پڑھاتے ہیں جو قاری بھی ہیں، آخری جمعۃ الوداع کو میں نے امام صاحب سے کہا کہ آپ خطبہ پڑھادیں حافظ صاحب جمعہ پڑھادیں گے، امام صاحب نے انکار کردیا اور کہا کہ خطبہ اور جمعہ ایک ہی شخص پڑھاسکتا ہے۔ اس کی کیا حیثیت ہے؟

جواب:- امام صاحب نے ٹھیک کہا، جمعہ کا خطبہ اور نماز ایک ہی شخص کو پڑھانا چاہئے، افضل طریقہ یہی ہے اور اس کے خلاف کرنا مناسب نہیں، اِلَّا یہ کہ کوئی عذر ہو، بغیر عذر کے ایسا کرنا خلافِ اَوْلیٰ ہے۔

لما فی الدر المختار لا ینبغی أن یصلّی غیر الخطیب لأنهما کشئ واحد فان فعل بأن خطب صبی باذن السلطان وصلّی بالغ جاز. (شامی ص:۵۵۲)[2] ومثله فی امداد الفتاوىٰ ج:۱ ص:۴۴۰۔[3]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۰/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۲۴۴۸/۲۷ ہ)

---

(۱) وکذا فی فتاوىٰ دار العلوم دیوبند ج:۵ ص:۶۷ (سوال:۲۳۸۵) و امداد الأحکام ج:۱ ص:۷۷۲. نیز دیکھئے امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۴۳۸ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)۔

(۲) الدر المختار ج:۲ ص:۱۶۲ (طبع سعید).

(۳) امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۴۲۶ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)۔ نیز دیکھئے امداد الاحکام ج:۱ ص:۷۳۵ (طبع مکتبہ دار العلوم)۔

بستی میں جمعہ فرض نہ سمجھنے والے امام کے لئے کسی دُوسرے شخص سے نمازِ جمعہ پڑھوانا

سوال:- زید ایک مسجد کا خطیب ہے، بسبب عدمِ جواز جمعہ فی القریٰ نماز نہیں پڑھاتے، خود جمعہ کو تقریر کرتے ہیں اور بکر کو کہہ دیتے ہیں کہ تم نمازِ جمعہ پڑھادو، زید نفل کی نیت باندھ کر بکر کے پیچھے نماز پڑھتا ہے جمعہ نہیں پڑھتا، کیا زید کا یہ رویہ از رُوئے شرع جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- اگر وہ موضع فی الواقعہ ایسا قریہ ہے جو شہر کی تعریف میں نہیں آتا تو زید کے لئے نہ خود جمعہ کی امامت جائز ہے اور نہ کسی دُوسرے سے جمعہ کی نماز پڑھوانا دُرست ہے، شرعی حکم سب کے لئے ہوتا ہے۔[1]

فقط واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۶/۶ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۶۵۷/۱۹ الف)

قریۂ کبیرہ میں نمازِ جمعہ

سوال:- ہمارے گاؤں میں ڈاک خانہ اور یونین کونسل کا دفتر موجود ہے، اور ہمارا علاقہ ملیرسٹی سے چودہ میل دُور ہے، سرکاری اعداد مردم شماری چار ہزار ہے، روزمرّہ کی زندگی کے ساز و سامان بھی مل رہے ہیں....الخ۔ کیا جمعہ ایسی جگہ جائز ہے؟

جواب:- سوال میں بستی کے جو حالات بیان کئے گئے ہیں ان کے پیشِ نظر اس بستی میں نمازِ جمعہ دُرست ہے۔[2]

فقط واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۲۳ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع

(فتویٰ نمبر ۳۰۲/۱۹ الف)

قریۂ صغیرہ میں جمعہ کا حکم (فارسی)

سوال:- یک قریہ ہست کہ تقریباً ۷۰۰ ہفت صد نفوس مشتمل ست قاضی رسمی دارد و ضروری

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۱۶۷ صلوٰة العید فی القریٰ تکره تحریمًا أی لأنه اشتغال بما لا یصح لأن المصر شرط الصحة. وفی الشامیة تحته (قوله صلوٰة العید) ومثله الجمعة ح. وكذا فی فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج:۵ ص:۳۷.

(۲) تفصیل اور دلائل کے لئے دیکھئے: امداد الاحکام ج:۱ ص:۷۵۲ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)۔

اَحکامِ شرع نکاح، طلاق، تقسیمِ میراث وغیرہ را فیصلہ کند وضروریاتِ زندگی مہیا نمی شوند تقریباً ۳ عدد دوکان دارد کہ قبل از دو سال یکی ہم بنود ویک مسجد داد کہ پنج وقت نماز باجماعت گزاشتہ شود ودیگر یک مسجد دو موضع نخلہا وباغات موجود است کہ بقاعدہ نماز باجماعت نمی شود اکثر آدمیاں فرادیٰ نماز میخوانند، نہ امام دارد نہ مؤذّن، جامع مسجد ہم مؤذّن ندارد وتقریباً از ۲۵ سال جمعہ وعیدین قائم کردند بغیر از اذن سلطان اہلِ محلّہ قبل از ۲۵ سال جمعہ نبود ۴ رکعات احتیاطی ہم میخوانند، ودیگر در اطراف دہ جانب قبلہ فاصلہ یک میل انگریزی یک قریہ واقع است مشتمل بر ۱۵۰ ایک صد وپنجاہ نفوس وجانب مشرق فاصلہ دو میل یک قریہ مشتمل بر ۲۲۰ نفوس ویک قریہ در جانب مشتمل بر ۴۰۰ چہار صد نفوس ہم موجود۔ دریں صورت جمعہ وعیدین جائز است یا نہ؟

جواب:- احوال قریہ کہ در سوال مذکورہ شدہ اند، دلالت می کنند کہ او بحکم مصر نیست وجمعہ دراں جائز نیست زیرا کہ تعریف مصر یا قریہ بحکم مصر آنست، بلدة كبيرة فيها سكك وأسواق ولها رساتيق وفيها وال يقدر على انصاف المظلوم من الظالم .... الخ۔[1] کما حققه فی امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۳۸۸۔[2] ودر قریہ مسئول عنہا اسواق موجود نیستند وموجودگی سہ دوکانہا قریہ را عرفاً بحکم مصر نمی گرداند وباید دانست کہ در جمعہ عدد سکان مقرر نیست واصل اینست کہ اگر آں قریہ را در عرف شہر یا قصبہ می فہمیند او بحکم مصر است ورنہ بحکم قریہ ونماز جمعہ دراں جائز نیست۔ واللہ سبحانہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۵/۲۴ھ

(فتویٰ نمبر ۵۹۹/۱۹ الف)

خطبۂ جمعہ کے دوران ہاتھ میں عصا لینے کی شرعی حیثیت

سوال:- اگر کوئی امام خطبے میں عصا نہ لے اور خطبہ پڑھے تو کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکثر عصا یا کمان ہاتھ میں لے کر خطبہ دیتے تھے، اس لئے اگر کوئی شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء میں ایسا کرے تو سنت ہے، لیکن یہ خطبے کی کوئی لازمی شرط نہیں ہے، عصا لئے بغیر بھی خطبہ بلاکراہت دُرست ہے، اور اس کو خطبے کی لازمی شرط قرار دینا التزام مالا یلزم کی بنا پر بدعت ہے، بعض لوگ چونکہ اس کو خطبے کا لازمی جزء سمجھنے لگے تھے اس لئے بعض علماء نے اس کو ترک کرنے کا اہتمام کیا، بلکہ بعض نے اسے بدعت تک کہا ہے، لیکن حقیقت وہی ہے جو

(۱) رد المحتار باب الجمعة ج:۲ ص:۱۳۷ (طبع سعيد).

(۲) دیکھئے امداد الفتاویٰ ص:۴۱۵، ۴۱۶۔

اُوپر عرض کی گئی کہ یہ عمل اصلاً سنت ہے، بشرطیکہ اسے واجب نہ سمجھا جائے، واجب سمجھ کر کرنا بدعت ہوجائے گا۔

قال فی الدر المختار وفی الخلاصة ویکره أن یتکئ علٰی قوس أو عصاء وقال الشامیؒ استشکله فی الحلیة بأنه فی روایة أبی داوٗد أنه صلی الله علیه وسلم قام أی فی الخطبة متوکئًا علٰی عصاء أو قوس اهـ. ونقل القهستانی عن عبدالمحیط ان اخذ العصاء سنة کالقیام. (شامی ج:۱ ص:۵۵۳ باب الجمعة)۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۲/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸۳۹/۲۷ و)

امروٹ شریف میں نمازِ جمعہ کا حکم

سوال:- پاکستان کے دیہات میں اکثر علماء خواہ دیوبندی مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے ہوں یا بریلوی سے، قریۂ صغیرہ میں نمازِ جمعہ بلا جھجک پڑھاتے ہیں، حالانکہ حنفی مسلک میں دیہات میں جمعہ کی نماز نہیں ہوتی، مندرجہ بالا حضرات یہ جواب دیتے ہیں کہ امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک قریۂ صغیرہ میں نمازِ جمعہ جائز ہے اور ان کا مسلک قوی ہے۔

سندھ کے بڑے اکابر میں سے حضرت مولانا تاج محمود صاحب امروٹی، امروٹ شریف میں جمعہ کی نماز پڑھاتے تھے جبکہ جمعہ کی اکثر شرائط پوری نہیں ہوتیں، ان کے جانشین کا بھی یہی عمل ہے، دُوسرے حضرت مولانا حماداللہ رحمۃ اللہ علیہ ہالیجی شریف ہیں۔ اس لئے جو علماء حنفی مسلک پر کاربند ہیں وہ دیہات میں درس و تدریس اور خطابت بغیر جمعہ کے، فرائض سرانجام نہیں دے سکتے، عوام تو صرف یہ کہتے ہیں کہ یا تو اکابر کو یہ کہو کہ ناحق پر ہیں، اگر حق پر ہیں تو ان کی طرح نمازِ جمعہ تم بھی پڑھاؤ، ایک سال سے تدریسی خدمات انجام دے رہا ہوں لیکن چونکہ ہمارا گاؤں ستر، اسّی (۷۰، ۸۰) گھروں پر مشتمل ہے، چھ سات دُکانیں بھی ہیں، ڈاکٹری اور دیگر ضروریات کافی حد تک پوری ہوجاتی ہیں، شہر سے تقریباً سات آٹھ میل دُور ہے، جس بستی میں رہائش پذیر ہوں وہ ہماری برادری کی بستی ہے، اس کے اردگرد اور بھی کئی بستیاں ہیں جو مختلف مقامات سے آکر یہاں آباد ہوئی ہیں۔

اور ہماری بستی کے چیئرمین کی زیرِ نگرانی اکٹھے کئی ہزار ایکڑ زمین خریدی گئی تھی، اگر ایک جگہ گاؤں بناتے تھے تو بہت سے آدمی اپنی زمین سے بہت دُور ہوجاتے تھے، اس لئے ہر ایک نے اپنی

---

(۱) الدر المختار مع رد المحتار ج:۲ ص:۱۶۳ (طبع سعید). نیز دیکھئے امداد الاحکام ج:۱ ص:۷۳۶، ۷۵۲ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)۔

سہولت کے لئے اپنی اپنی زمینوں سے قریب گھر بنا لئے اور ان میں جو سر کردہ لوگ تھے ان کے نام سے وہ گاؤں مشہور ہوگیا، جبکہ چیئر مین سب کا ایک ہی ہے۔ حنفی مسلک کی شرائط کیا ہیں؟ اور ان کا ماخذ قرآن وسنت سے کیا ہے؟ اور حنفی مسلک کی مالکی مسلک پر وجۂ ترجیح کیا ہے؟ ہماری اس بستی میں نمازِ جمعہ ہوسکتی ہے یا نہیں؟

جواب:- عزیز محترم سلمہ اللہ تعالیٰ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا سوال غور سے پڑھا اور تمام حالات پر غور کیا، لیکن آپ نے اپنی بستی کا جو حال لکھا ہے اس کے پیشِ نظر اسے قصبہ، قریۂ کبیرہ یا شہر کہنا مشکل ہے، اور حنفیہ کی تمام کتابیں متون و شروح و فتاویٰ جمعہ کے لئے مصر یا قریۂ کبیرہ کی شرط کو ضروری قرار دیتی ہیں۔ مالکیہ اور شافعیہ کے یہاں بلاشبہ گاؤں میں بھی جمعہ ہو جاتا ہے، لیکن کسی ایک مسئلے میں مالکیہ یا شافعیہ کے قول کو لینا اور باقی نماز حنفیہ کے طریقے پر پڑھنے میں "تــلـفـیـق" کا اندیشہ ہے، جو باجماعِ فقہاء باطل ہے، اور اس سے کسی کے نزدیک نماز صحیح نہیں ہوتی، لہٰذا مالکیہ یا شافعیہ کے مسلک پر عمل کر کے جمعہ ادا کر لینا کسی طرح دُرست نہیں، حنفیہ کے نزدیک گاؤں میں جمعہ کے جواز کی صرف ایک صورت ہے وہ یہ کہ امامِ مسلمین وہاں جمعہ پڑھنے کا حکم دیدے، یہ صورت بھی ہمارے ملک میں مفقود ہے۔

اور یہ جو احقر نے عرض کیا کہ آپ کی بستی میں قریۂ کبیرہ کی تعریف صادق نہیں آتی، اس کی وجہ یہ ہے کہ قریۂ کبیرہ وہ چیز ہے جسے ہمارے عرف میں قصبہ کہتے ہیں، اس کی تعریف جامع و مانع فقہاء نے نہیں کی، بلکہ اس کا مدار عرف پر رکھا ہے کہ جس بستی کو عرفاً قصبہ کہا جاتا ہو اس میں جمعہ جائز ہے۔ اس کی علامات یہ ہیں کہ اس میں ایسا بازار ہو جس میں روز مرّہ کی ضروریات مل جاتی ہوں، آبادی اتنی ہو کہ اسے قصبہ کہا جاسکے یا جس میں سڑکیں وغیرہ ہوں اور حکومت کی طرف سے عدالت، تحصیل یا تھانہ وغیرہ ہو، آپ کی بستی میں کل ستر، اسّی (۷۰، ۸۰) گھر ہیں جن کی آبادی بہت سے بہت آٹھ سو کے قریب ہوگی، دُکانیں چھ سات ہیں، جسے بازار کہنا مشکل ہے، ڈاک خانہ، تحصیل وغیرہ نہیں ہے، اس لئے اس کو قصبہ نہیں کہہ سکتے، ہاں! اردگرد کی جن دُوسری بستیوں کا تذکرہ آپ نے کیا ہے اگر وہ ایسی ہوں کہ دیکھنے والا ان سب کو ایک سمجھتا ہو اور ان کا مجموعی نام بھی ایک ہو تو اس کی مزید تفصیل لکھ کر سوال دوبارہ پوچھ لیجئے۔ فی الحال تو وہاں جوازِ جمعہ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

اوّل تو آپ، لوگوں کو امداد الفتاویٰ، فتاویٰ دار العلوم وغیرہ فتاویٰ کی کتابیں نیز موجودہ مفتیوں کے فتاویٰ دِکھا کر مسئلہ نرمی سے سمجھائیں، اگر اس طرح بات بن جائے فبہا، ورنہ اگر فتنے کا اندیشہ ہو تو کسی اور سے جمعہ پڑھوا کر خود مقتدی بن کر نماز بہ نیت نفل پڑھ لیجئے، پھر تنہا ظہر کی نماز ادا کر لیجئے۔ رہا

یہ مسئلہ کہ حنفیہ کے اس مسلک کے قرآن و سنت سے کیا دلائل ہیں؟ سو یہ ایک طویل الذیل موضوع ہے، اوّل تو یہ بات مجتہدین کے سوچنے کی ہے، ہم مقلدوں کے سوچنے کی نہیں۔ دُوسرے اس پر مفصل رسائل حنفیہ نے لکھ دیئے ہیں، جن میں علامہ نیموی، حضرت گنگوہی، حضرت شیخ الہند رحمہم اللہ وغیرہ کے رسائل معروف و مشہور ہیں، حضرت شیخ الہندؒ کا رسالہ "اوثق العری فی تحقیق الجمعۃ فی القریٰ" سب سے زیادہ مفصل ہے۔

تیسری مختصر بات یہ ہے کہ بخاری اور ابوداؤد وغیرہ کی معروف حدیث کے مطابق مدینہ طیبہ کے بعد سب سے پہلا جمعہ "جواثی" نامی قلعے میں پڑھا گیا ہے،(۱) جو بحرین کی تجارتی منڈی تھی، حالانکہ بحرین کی فتح سے پہلے بیشمار دیہات مسلمان ہو چکے تھے، وہاں کہیں بھی جمعہ پڑھنا ثابت نہیں بلکہ جمعہ نہ پڑھنا ثابت ہے۔

نیز صحیح بخاری میں مروی ہے کہ عوالی بستیوں کے صحابہ کرامؓ باری باری جمعہ پڑھنے کے لئے مدینہ طیبہ آیا کرتے تھے،(۲) اگر وہاں جمعہ جائز ہوتا تو اس کی کوئی ضرورت نہ تھی، اس کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر عرفات میں جمعہ کے دن ظہر کی نماز پڑھائی ہے، جس پر تمام روایات متفق ہیں، یہ تمام دلائل اس قدر قوی ہیں کہ حنفیہ کے مسلک کو ضعفِ دلیل کی بنیاد پر چھوڑنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔(۳)

جہاں تک امروٹ شریف اور ہالیجی شریف کا تعلق ہے، مجھے وہاں کے حالات کا علم نہیں ہے کہ وہ کیسی بستیاں ہیں؟ بہتر ہوگا کہ آپ وہاں کے بزرگوں سے بھی اس مسئلے میں رُجوع کر کے معلوم کرلیں کہ ان کے جمعہ پڑھنے کی وجہ کیا ہے؟

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۸۶ ج)

صحتِ جمعہ کے لئے شہر یا قریۂ کبیرہ ہونا ضروری ہے

سوال:- جمعہ کی نماز کے لئے احناف کے نزدیک شہر کا وجود ضروری ہے یا نہیں؟

جواب:- حنفیہ کے نزدیک جمعہ صرف شہر، قصبے یا ایسے بڑے گاؤں میں ہوسکتا ہے جہاں ضروریاتِ زندگی عام ملتی ہوں، بازار ہوں، سڑکیں ہوں اور وہ اپنی خصوصیات کے لحاظ سے شہر کے

(۱) دیکھئے صحیح بخاری ج:۱ ص:۱۲۲ (طبع قدیمی کتب خانہ) وابوداؤد ج:۱ ص:۱۶۰ (طبع مکتبہ حقانیہ ملتان)۔
(۲) ایضاً ص:۱۲۳۔
(۳) دلائل کی تفصیل کے لئے امداد الاحکام ج:۱ ص:۶۲۷ تا ۶۳۰ و ۶۹۷ ملاحظہ فرمائیں۔

ساتھ مشابہ ہو، چھوٹے گاؤں میں جمعہ جائز نہیں۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۱/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۴۶/۲۹ الف)

گھر میں نمازِ جمعہ پڑھانے کا حکم

سوال:- ایک عالم صاحب کسی مسجد میں عرصے سے خطیب تھے، مسجد کی انتظامیہ سے اختلاف کی بدولت الگ ہوگئے، اب انہوں نے مسجد کے مقابلے میں اپنے گھر میں جمعہ کی نماز پڑھانی شروع کردی ہے، جبکہ اس گاؤں میں بھی بہت سی مسجدیں ہیں، کیا ایسی صورت میں جمعہ گھر پر جائز ہے؟

جواب:- جس جگہ لوگوں کو جمعہ کے لئے آنے کی عام اجازت ہو وہاں جمعہ ادا تو ہوجاتا ہے، لیکن مسجد کو چھوڑ کر گھر میں جمعہ قائم کرنا مکروہ اور نہایت ناپسندیدہ اقدام ہے۔ اس سے مسجد کی فضیلت بھی حاصل نہیں ہوتی اور یہ مساجد میں تقلیلِ جماعت کا سبب بھی ہے، چھوٹی چھوٹی مسجدوں میں بھی جمعہ کرنے کو علماء نے پسند نہیں کیا، گھروں میں تو بطریقۂ اَولیٰ ناپسندیدہ ہے۔

وفی الدر المختار فلو دخل امیر حصنًا أو قصره وأغلق بابه وصلّی باصحابه لم تنعقد ولو فتحه وأذن للناس بالدخول جاز وكره وقال الشامیؒ لأنه لم يقض حق المسجد الجامع. (شامی)۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۶۳/۲۸ ج)

کراچی سے اٹھائیس میل دُور قصبہ ''کاٹھور آباد'' میں جمعہ کا حکم

سوال:- کراچی سے ۲۸ میل پر ایک قصبہ بنام ''کاٹھور آباد'' ہے، جس میں ملیر کی طرح باغات ہیں اور ملحقہ قریہ جات کی بھی آبادی تقریباً چھ ہزار نفوس پر مشتمل ہے، بازار اور دُکانیں بھی ہیں، جس میں ضروریاتِ زندگی کی مکمل اشیاء میسر ہیں، اسکول، ہسپتال، بینک، پوسٹ آفس اور بجلی اور ٹیلیفون کی لائن بھی ہے، بس سروس بھی جاری ہے، صرف تھانہ موجود نہیں ہے۔

تفصیلات قریہ جات اور دُکانات حسبِ ذیل ہیں:-

	نام قریہ	تعداد مکانات	تعداد دُکانات
۱:-	سراج احمد گوٹھ	ایک سو پچیس	۳

(۱) تفصیل کے لئے امداد الاحکام ج:۱ ص:۲۶۷ تا ۳۰۷ اور ص:۳۹۷ ملاحظہ فرمائیں۔
(۲) الدر المختار مع رد المحتار ج:۱ ص:۱۵۲ (طبع سعید).

۲:-	کمال گوٹھ	۸۰ مکان	۱
۳:-	ابراہیم گوٹھ	۵۰	×
۴:-	موریا گوٹھ	۵۰	۱
۵:-	کھوسہ گوٹھ	۵۰	×
۶:-	سوفن گوٹھ	۵۰	۱
۷:-	دین محمد گوٹھ	۲۰	۱
۸:-	دریاخان گوٹھ	۲۵	۱
۹:-	ماچھی گوٹھ	۵۰	۱
۱۰:-	کاچیلو گوٹھ	۲۰	۱
۱۱:-	میانداد گوٹھ	۵	×
۱۲:-	رند گوٹھ	۶	×
۱۳:-	علو گوٹھ	۱۵	×
۱۴:-	نوازعلی گوٹھ	۲۰	×
۱۵:-	حسن لشکری گوٹھ	۲۰	×
۱۶:-	روزی گوٹھ	۲۰	×
۱۷:-	مراد گوٹھ	۲۰	×
۱۸:-	نیک محمد گوٹھ	۱۰	×
۱۹:-	فقیر گوٹھ	۱۵	×
۲۰:-	ہاشم گوٹھ	۱۰	×
۲۱:-	گبول گوٹھ	۱۰	×

دُکانوں میں راشن ہے اور حجام کی دُکان، لوہار کی دُکان اور ہوٹلیں بھی ہیں، جن کی تعداد تقریباً ۲۵ ہوتی ہے، ہسپتال تین ہیں، اور اسکول ۱۷ ہیں، کیا مذکورہ قصبے میں نمازِ جمعہ جائز ہے یا نہیں؟

جوابات اثبات میں ہوں یا نفی میں، دونوں صورتوں میں حوالہ کتب ضرور دیا جائے۔

۱:- کالونی پچاس دُکانیں، مکانات کچھ نہیں۔ ۲:- سراج احمد گوٹھ اور پہلوان گوٹھ چار فرلانگ درمیانی فاصلہ۔

(جواب از حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ)

جواب:- سوال میں کاٹھور کے جن دیہات کا ذکر ہے، ان کی صحیح صورتِ حال سمجھنے کے لئے ہم نے ان مقامات کا مفصل معائنہ کیا، اس معائنے کے نتیجے میں جو بات سامنے آئی وہ یہ ہے کہ کاٹھور کسی ایک قصبے یا بستی کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ چھوٹی چھوٹی مختلف بستیوں پر مشتمل ایک قصبہ ہے، اور سوال میں قصبے کے نام سے اس کے جو اوصاف ذکر کئے گئے، وہ کسی ایک بستی کے اوصاف نہیں ہیں، بلکہ پورے علاقے کاٹھور کے مجموعے کے اوصاف ہیں، اور صورتِ حال یہ ہے کہ:-

۱:- مختلف لوگوں نے اپنی اپنی سہولت کے مطابق چھوٹی چھوٹی بہت سی بستیاں آباد کر رکھی ہیں جو الگ الگ گوٹھوں کے نام سے موسوم ہیں، اور ہر گوٹھ سے دُوسرے گوٹھ تک آبادی متصل نہیں ہے بلکہ دونوں کے درمیان کہیں کھیتوں کا، کہیں جنگلوں کا فاصلہ ہے۔ چند گوٹھ ایسے بھی ہیں جن کے ایک سرے پر کھڑے ہوکر دُوسرے گوٹھ کا سرا نظر آتا ہے، لیکن بیشتر ایسے ہیں کہ ایک گوٹھ سے دُوسرا گوٹھ نظر نہیں آتا، اور بیچ میں دو میل سے لے کر ایک فرلانگ تک کے فاصلے پائے جاتے ہیں جو زرعی زمینوں یا جنگلوں پر مشتمل ہیں۔

۲:- ان گوٹھوں میں سے کوئی گوٹھ بھی ایسا نہیں ہے جس پر مصر یا قریۂ کبیرہ کا اطلاق دُرست ہو یا جس میں اس کی علامت پائی جائے، عام طور سے آبادیاں، جھونپڑیوں یا کچھ مکانات پر مشتمل ہیں، کچھ مکانات پکے بھی ہیں، ان گوٹھوں میں سب سے بڑا گوٹھ ''سراج احمد گوٹھ'' ہے، جو تقریباً سوا سو مکانات پر مشتمل ہے، لیکن اس میں بھی گلی، کوچے، بازار وغیرہ نہیں ہیں، البتہ تین متفرق دُکانیں اور دو ہوٹل ہیں، اور نہ مصریت کی کوئی اور علامت پائی جاتی ہے، جب سب سے بڑے گوٹھ کی حالت یہ ہے تو دُوسرے چھوٹے گوٹھوں کا معاملہ اور زیادہ واضح ہے۔

۳:- البتہ ان تمام گوٹھوں کے تقریباً وسط میں ایک بازار واقع ہے، جو کسی بھی گوٹھ کا جزو نہیں ہے، بلکہ ایک مستقل علاقہ ہے، اس کو ''کاٹھور کالونی بازار'' کہتے ہیں، اس میں سکک وسوق موجود ہیں اور ضروریاتِ زندگی ملتی ہیں، اس میں بینک، مڈل کے اسکول، ہسپتال، ڈاک خانہ وغیرہ ہے، لیکن یہاں رہائشی مکان صرف ایک ہے، مختلف گوٹھوں کے لوگ بھی یہاں دن میں دُکان داری کرتے ہیں اور رات کو اپنے اپنے گوٹھ میں چلے جاتے ہیں۔ مذکورہ بالا تنقیحات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہ تمام بستیاں مستقل الگ الگ حیثیت رکھتی ہیں، اور ان میں سے کسی میں بھی جمعہ کے جواز کی شرائط موجود نہیں ہیں، اور ان کے مجموعے کا نام کاٹھور ہونے سے اس مجموعے کا مصر یا قریۂ کبیرہ ہونا لازم نہیں آتا

کیونکہ ان بستیوں کے درمیان انفصال کافی ہے، اور جس طرح متعدد بستیوں کے مجموعے پر ضلع کے نام کا اطلاق کیا جاتا ہے، اس طرح ان بستیوں کے مجموعے کو کاٹھور کہتے ہیں۔

لہٰذا مذکورہ بستیوں میں سے کسی بستی میں بشمول ''سراج احمد گوٹھ'' جمعہ جائز نہیں، البتہ کاٹھور بازار میں جمعہ کا مسئلہ زیرِ غور ہے، اور چونکہ وہ خالص بازار ہے، رہائشی بستی نہیں ہے، اس لئے اس کی مصریت بھی محلِ نظر ہے، البتہ اگر علاقے کے حاکم یا ڈپٹی کمشنر سے جمعہ قائم کرنے کی اجازت لے لی جائے تو پھر سراج گوٹھ اور کاٹھور کالونی بازار میں جمعہ پڑھنا دُرست ہوجائے گا، اور جن بستیوں میں چالیس یا اس سے زائد مکان ہیں ان میں بھی جمعہ جائز ہوگا، لأن هذا مجتهد فيه۔

لما في رد المحتار واذا اتصل به الحكم صار مجمعًا عليه. (شامي ج:۱ ص:۵۳۷)[۱]۔

رشید احمد
دار الافتاء اشرف المدارس
ناظم آباد کراچی
۱۳۹۹/۱/۸ھ

(جواب از حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم)

ويشترط لصحتها سبعة أشياء الأول المصر .... وظاهر المذهب أنه كل موضع له أمير وقاض يقدر على اقامة الحدود. (الدر المختار مع الشامي ج:۱ ص:۵۳۶)[۲]۔

وفي رد المحتار عن أبي حنيفة أنه بلدة كبيرة فيها سكك وأسواق ولها رساتيق وفيها وال يقدر على انصاف المظلوم من الظالم بحشمته وعلمه أو علم غيره يرجع الناس اليه فيما يقع من الحوادث وهذا هو الأصح. (شامي ج:۱ ص:۵۳۶)[۳]۔

وفي البحر الرائق فقال المصر في ظاهر الرواية أن يكون فيه مفت وقاض يقيم الحدود وينفذ الأحكام وبلغت أبنيته أبنية منى. (البحر الرائق ج:۲ ص:۱۵۱)[۴]۔

مندرجہ بالا حوالوں کی روشنی میں مذکورہ بالا جواب دُرست ہے۔　واللہ اعلم

الجواب صحیح	الجواب صحیح	احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ	ولی حسن	۱۳۹۹/۱/۱۱ھ
۱۳۹۹/۱/۱۱ھ	جامعۃ العلوم الاسلامیہ کراچی	(فتویٰ نمبر ۹۴/۳۰ الف)

---

(۱) ج:۲ ص:۱۳۸ (طبع سعید).
(۲، ۳) الدر المختار مع رد المحتار باب الجمعة ج:۲ ص:۱۳۷، ۱۳۸.
(۴) البحر الرائق باب صلوٰة الجمعة ج:۲ ص:۱۴۰ (طبع سعيد).

کیا صحراء میں جمعہ فرض ہے؟

سوال:- محترم المقام حضرت مفتی صاحب!　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

باعثِ تحریر یہ ہے کہ ہمارے علاقے میں ایک شخص ہے، اس کا مسئلۂ جمعہ میں مندرجہ ذیل نظریہ ہے:-

۱:- نمازِ جمعہ ہر جگہ حتیٰ کہ صحراء میں بھی فرض ہے۔

۲:- بغیر جماعت کے اکیلے بھی اس کو پڑھنا جائز ہے۔

۳:- ائمۂ اربعہ کی شروط قرآن کے خلاف ہیں، کیونکہ قرآن میں جمعہ مطلق اور عام ہے، اس کا کوئی مقید اور مختص موجود نہیں ہے۔

۴:- جو علماء نمازِ جمعہ کو چھوٹے گاؤں اور صحراؤں میں منع کرتے ہیں وہ خطا کار اور مکروہ وحرام کے مرتکب ہیں۔

۵:- یہ شخص لوگوں کو ایسے چھوٹے چھوٹے گاؤں میں جمعہ جاری کرنے کے لئے آمادہ کرتا ہے جہاں چاروں مذاہب میں جمعہ ناجائز ہے، چنانچہ بعض جگہوں میں جاری ہو بھی گیا ہے۔

الغرض الف:- از رُوئے شرعِ محمدی اس شخص کا کیا حکم ہے؟

ب:- مسئلۂ جمعہ میں صحیح مسلکِ حنفی کیا ہے؟

ج:- علاقے کے علماء کو شخصِ مذکور کے گاؤں کے جمعوں کے متعلق کیا موقف اختیار کرنا چاہئے؟

جواب:- الف:- مذکورہ شخص کا نظریہ ائمۂ اربعہ کے خلاف ہے، چاروں ائمہ میں سے کسی کا بھی وہ مسلک نہیں ہے جو وہ بیان کرتا ہے، بالخصوص ائمۂ اربعہ اور ان کے مقلدین کو اس بارے میں مکروہ یا حرام کا مرتکب بتانا سخت گمراہی کی بات ہے، اس کی بات قابلِ شنوائی نہیں۔

ب:- حنفی مسلک میں جمعہ صرف اس بستی میں جائز ہے جسے عرفاً یا تو شہر کہا اور سمجھا جاتا ہو یا ایسا بڑا گاؤں یا قصبہ ہو جس میں گلی، کوچے اور بازار وغیرہ ہوں اور ضروریاتِ زندگی عام طور پر ملتی ہوں، چھوٹے گاؤں میں جمعہ جائز نہیں۔[1]

---

(۱) وفی الشامیة ج:۲ ص:۱۳۷ ویشترط لصحتها سبعة أشياء الأول المصر .... وظاهر المذهب انه كل موضع له امير وقاض يقدر على اقامة الحدود. وفي الشامية عن أبي حنيفة انه بلدة كبيرة فيها سكك واسواق ولها رساتيق وفيها وال يقدر على انصاف المظلوم من الظالم بحشمته وعلمه او علم غيره يرجع الناس اليه فيما يقع من الحوادث وهذا هو الأصح .... الخ. وكذا في البحر الرائق ج:۲ ص:۱۵۱. نیز دیکھئے: امداد الاحکام ج:۱ ص:۷۵۶۔

لوگوں کو حنفی مسلک پر عمل کرنا چاہئے، اور مذکورہ شخص کی بات پر عمل کرنا ہرگز جائز نہیں۔
واللہ اعلم
۱۴۰۰/۹/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۱۲۸۰/۳۱ د)

ایک قصبے میں نمازِ جمعہ کا حکم

سوال:- قصبہ شاریاں جس کو اپنے قرب و جوار میں مرکزی حیثیت حاصل ہے، تجارتی مرکز جبرنی سڑک پر واقع ہے، یونین کونسل کا سینٹر بھی ہے، جس میں ماہوار ایک دو اجلاس ہوتے ہیں، ایک مڈل اسکول، ایک ڈسپنسری، گرلز پرائمری اسکول، ڈاک خانہ وغیرہ ہونے کی وجہ سے اچھی خاصی شہرت اور رونق ہے۔ عرصہ دراز سے یہاں جمعہ ہوتا ہے، اب کچھ لوگ منع کرتے ہیں کہ یہاں جمعہ نہیں ہوتا، نمازِ جمعہ میں اچھی خاصی تعداد لوگوں کی جمع ہوجاتی ہے، اگر لوگوں کو منع نہ کیا جائے تو اچھی خاصی تعداد میں لوگ جمع ہوجائیں۔ اس میں جمعہ دُرست ہے یا نہیں؟

جواب:- جو حالات سوال میں بیان کئے گئے ہیں اگر وہ دُرست ہیں تو اس قصبے میں نمازِ جمعہ دُرست ہے،[1] ڈاک خانہ، تجارتی مرکز اور پھر یونین کونسل کا دفتر ہونا اسے قریہ کی تعریف سے نکال کر مصر کی تعریف میں داخل کرنے کے لئے کافی ہے جو لوگ منع کرتے ہیں ان کی وجہ معلوم ہوتی تو اس پر کچھ کہا جاتا۔
واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۸۸/۱/۲۳ھ

جیلوں، چھاؤنیوں اور ایئرپورٹ پر نمازِ جمعہ

(اہم وضاحت از حضرتِ والا دامت برکاتہم)

(میں نے اپنے یمن کے سفرنامے میں جو ''البلاغ'' کے ربیع الثانی ۱۴۲۲ھ شمارے میں شائع ہوا ہے، برسبیلِ تذکرہ دبئ ایئرپورٹ پر نمازِ جمعہ ادا کرنے کا ذکر کیا تھا، اور ساتھ ہی یہ لکھا تھا کہ ''اذنِ عام'' کی جو شرط فقہائے کرامؒ نے صحتِ جمعہ کے لئے ضروری قرار دی ہے، اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ جس بڑے علاقے میں نماز ادا کی جارہی ہے وہاں کے لوگوں کو جمعہ میں شرکت کی عام اجازت ہو، خواہ اس بڑے علاقے میں باہر کے لوگوں کو انتظامی یا دفاعی اسباب کی بناء پر داخلے کی عام اجازت نہ ہو۔

اس سفرنامے کے شائع ہونے کے بعد بعض حضرات نے مجھے خط میں لکھا کہ اس مسئلے کی تفصیلی وضاحت شائع ہونی چاہئے، میں نے کئی سال پہلے ایک فتویٰ اس موضوع پر لکھا تھا جو ابھی تک شائع نہیں ہوا، اس موقع پر مناسب معلوم ہوا کہ اسے شائع کردیا جائے کچھ ترمیم و اضافے کے ساتھ، چنانچہ ذیل میں وہ فتویٰ

(۱) دیکھئے ص:۵۲۲ کا حاشیہ۔

شائع کیا جارہا ہے۔ یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ اس فتوے کا اطلاق صرف ایسے ایئرپورٹ پر ہوسکتا ہے جو شہر کے اندر واقع ہو اور اتنا بڑا ایئرپورٹ ہو جس میں افراد کی ایک بڑی جماعت ہر وقت موجود رہتی ہو، دبئی کا ایئرپورٹ ایسا ہی ہے۔)

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ جیل خانوں میں قیدی نمازِ جمعہ ادا کرسکتے ہیں یا نہیں؟ اس مسئلے میں متضاد باتیں سامنے آئی ہیں، اس لئے مسئلے کی تفصیلی وضاحت مطلوب ہے، بینوا توجروا۔

جواب:- جیل میں جمعہ کے جواز اور عدمِ جواز کے بارے میں فقہائے متقدمین کی کتابوں میں کوئی صریح جزئیہ مذکور نہیں، اسی بناء پر اس مسئلے میں علمائے عصر کے فتوے بھی مختلف رہے، اصل اِشکال کی وجہ یہ ہے کہ فقہائے حنفیہ نے جمعہ کے جواز کی شرائط میں اذنِ عام کو بھی ذکر فرمایا ہے، اور چونکہ جیل میں داخلے کا اذنِ عام نہیں ہوتا اس لئے بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہاں جمعہ جائز نہیں، ہمارے زمانے میں یہ مسئلہ صرف جیل کا نہیں بلکہ ان تمام فوجی چھاؤنیوں، صنعتی آبادیوں اور ایئرپورٹوں کا بھی ہے جہاں عام لوگوں کو داخلے کی اجازت نہیں ہوتی، اس لئے یہ تحقیق ضروری ہے کہ ''اذنِ عام'' کی شرط کس درجے کی ہے؟ اور اس کا مفہوم کیا ہے؟

بعض حضرات کا خیال یہ ہے کہ ''اذنِ عام'' کی شرط اس وقت تھی جب پورے شہر میں جمعہ ایک ہی جگہ ہوتا تھا، اور اس کا مقصد یہ تھا کہ کسی کا جمعہ فوت نہ ہو، لیکن جب ایک شہر میں کئی جگہ جمعہ پڑھنے کا جواز ثابت ہوا اور عملاً متعدد جگہوں پر جمعہ ہونے لگا تو اب چونکہ اس بات کا اندیشہ نہیں رہا کہ ''اذنِ عام'' کی عدم موجودگی کی وجہ سے کسی کا جمعہ فوت ہوجائے گا، اس لئے اب یہ شرط باقی نہیں رہی، یہ حضرات دلیل میں علامہ شامیؒ کی مندرجہ ذیل عبارت پیش کرتے ہیں:-

وكذا السلطان اذا أراد أن يصلي بحشمه في داره فان فتح بابها وأذن للناس اذنًا عامًا جازت صلاته شهدتها العامة أولا وان لم يفتح أبواب الدار وأغلق الأبواب وأجلس البوابين ليمنعوا عن الدخول لم تجز لأن اشتراط السلطان للتحرز عن تفويتها على الناس وذا لا يحصل الا بالاذن العام اهـ قلت وينبغي أن يكون محل النزاع ما اذا كانت لا تقام الا في محل واحد، اما لو تعددت فلا لأنه لا يتحقق التفويت كما أفاده التعليل تأمل.

(شامی ج:۲ ص:۱۵۲، طبع سعید)

لیکن اس پر یہ اِشکال ہوتا ہے کہ اگر ''اذنِ عام'' کی شرط کی وجہ سے صرف تفویتِ جمعہ کا خوف ہو تو جس شہر میں متعدد مقامات پر جمعہ ہوتا ہو وہاں اگر کوئی شخص اپنے ذاتی گھر میں دروازہ بند

کر کے جمعہ کی جماعت کرلے تو وہ بھی جائز ہونا چاہئے، اور یہ کہ جب سے تعدّدِ جمعہ کا رواج ہوا ہے اس وقت سے ''اذنِ عام'' کی شرط کو کتبِ فقہ سے بالکل خارج ہوجانا چاہئے تھا، یا اگر یہ شرط مذکور ہوتی تو ساتھ یہ تصریح بھی ذکر کرنی چاہئے تھی کہ اب یہ شرط واجب العمل نہیں، حالانکہ فقہاء تعدّدِ جمعہ کے رواج کے باوجود اس شرط کو ذکر کرتے چلے آرہے ہیں، یہ اشکال خاصا قوی ہے لیکن کتبِ فقہ کی مراجعت کے بعد جو صورتِ حال نظر آتی ہے، وہ مندرجہ ذیل ہے:-

۱:- اذنِ عام کی شرط ظاہر الروایۃ میں موجود نہیں، چنانچہ علامہ کاسانیؒ تحریر فرماتے ہیں:-

وذكر في النوادر شرطًا اخر لم يذكره في ظاهر الرواية وهو أداء الجمعة بطريق الاشتهار حتى ان أميرًا لو جمع جيشه في الحصن وأغلق الأبواب وصلّى بهم الجمعة لا تجزئهم. (بدائع الصنائع ج:۱ ص:۲۶۹، طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

چنانچہ صاحبِ ہدایہ نے بھی اذنِ عام کو ''شرط'' کے طور پر ذکر نہیں فرمایا، اسی طرح متعدّد فقہاء نے اس شرط کو ذکر نہیں کیا، جن میں شمس الائمہ سرخسیؒ کے اُستاذ علامہ سغدیؒ بھی داخل ہیں، (ملاحظہ ہو: النتف فی الفتاویٰ ج:۱ ص:۹۰ مطبعة الارشاد بغداد)۔

۲:- نوادر کی اس روایت کے مطابق فقہائے متأخرین نے یہ شرط اپنی کتابوں میں ذکر فرمائی ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اذنِ عام کے مفہوم میں فقہائے کرام کا کچھ اختلاف رہا ہے، بعض حضرات نے تو اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ہر وہ شخص جس پر جمعہ فرض ہوا سے اس مقام پر آنے کی اجازت ضروری ہے، چنانچہ علامہ شامیؒ برجندی وغیرہ سے نقل کرتے ہیں: أی أن يأذن للناس اذنًا عامًا بأن لا يمنع أحدًا ممن تصح من الجمعة عن دخول الموضع الذی تصلّى فيه وهذا مراد من فسر الاذن العام بالاشتهار۔ (شامی ج:۲ ص:۱۵۱ طبع سعید)

دُوسری طرف بعض حضراتِ فقہاء کے کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ''اذنِ عام'' کے لئے یہ بات کافی ہے کہ جس آبادی میں جمعہ پڑھا جارہا ہے اس آبادی کے لوگوں کو وہاں آنے کی پوری اجازت ہو، خواہ باہر کے لوگوں کو آنے کی اجازت نہ ہو، چنانچہ علامہ بحر العلومؒ تحریر فرماتے ہیں:-

وفی فتح القدير ان أغلق باب المدينة لم يجز وفيه تأمل فانه لا ينافی الاذن العام لمن فی البلد وأما من فی خارج البلد فالظاهر أنهم لا يجيئون لاقامة الجمعة بل ربما يجيئون للشر والفساد. (رسائل الارکان ص:۱۱۵ طبع قدیم، مطبع یوسفی فرنگی محل لکھنؤ)

نیز درمختار میں کہا گیا ہے کہ:-

فلا يضر غلق باب القلعة لعدو أو لعادة قديمة لأن الاذن العام مقرر لأهله وغلقه لمنع

العدو لا المصلّی نعم لو لم یغلق لکان أحسن کما فی مجمع الأنهر.

(الدر المختار ج:۲ ص:۱۵۲ طبع سعید)

مجمع الانہر میں ہے:-

وما یقع فی بعض القلاع من غلق أبوابه خوفًا من الأعداء أو کانت له عادة قدیمة عند حضور الوقت فلا بأس به لأن الاذن العام مقرر لأهله ولکن لو لم یکن لکان أحسن کما فی شرح عیون المذهب وفی البحر والمنح خلافه لکن ما قررناه أولٰی لأن الاذن العام یحصل بفتح باب الجامع وعدم المنع ولا مدخل فی غلق باب القلعة وفتحه ولأن غلق بابها لمنع العدو لا لمنع غیره تدبر.

(مجمع الانہر ج:۱ ص:۲۴۶ طبع بیروت)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جن حضراتِ فقہائے کرامؒ نے ''اذنِ عام'' کی شرط کو تفویتِ جمعہ کے خوف پر مبنی قرار دیا ہے، ان کی مراد یہ ہے کہ ''اذنِ عام'' کا پہلا عام مفہوم اس علت کے ساتھ معلول تھا جو تعدّدِ جمعہ کی صورت میں باقی نہیں رہا، لیکن دُوسرا مفہوم اب بھی کافی ہے کیونکہ وہ اس علت پر مبنی نہیں تھا، بلکہ بقول صاحبِ بدائع "اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ .... الخ" کے اشارۃ النص پر مبنی تھا، چنانچہ علامہ شرنبلالیؒ تحریر فرماتے ہیں:-

قلت أطلعت علی رسالة للعلامة ابن الشحنة وقد قال فیها بعدم صحة الجمعة فی قلعة القاهرة لأنها تقفل وقت صلاة الجمعة ولیست مصرًا علٰی حدتها وأقول فی المنع نظر ظاهر لأن وجه القول بعدم صحة صلاة الامام بقفله قصره اختصاصه بها دون العامة والعلة مفقودة فی هٰذه القضیة فان القلعة وان قفلت لم یختص الحاکم فیها بالجمعة لأن عند باب القلعة عدة جوامع فی کل منها خطبة لا یفوت من منع من دخول القلعة الجمعة بل لو بقیت القلعة مفتوحة لا یرغب فی طلوعها للجمعة لوجودها فیما هو أسهل من التکلف بالصعود لها وفی کل محلة من المصر عدة من الخطب فلا وجه لمنع صحة الجمعة بالقلعة عند قفلها.

(مراقی الفلاح مع الطحطاوی ص:۲۷۸ قدیمی کتب خانہ)

اگرچہ علامہ طحطاویؒ نے اس کے تحت علامہ شرنبلالیؒ کی اس بات پر اعتراض فرمایا ہے، لیکن علامہ شرنبلالیؒ کا مقصد بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ تعدّدِ جمعہ کی صورت میں ''اذنِ عام'' کا وہ عام مفہوم لینے کی ضرورت نہیں جس کے تحت ہر وہ شخص جس پر جمعہ واجب ہو اس کو وہاں آنے کی اجازت ہو، بلکہ اگر کوئی ایسی آبادی موجود ہو جس میں گھروں کی یا رہنے والوں کی قابلِ لحاظ تعداد موجود ہو اور اس آبادی کے تمام لوگوں کو وہاں جمعہ کے لئے آنے کی اجازت ہو تو یہ بات ''اذنِ عام'' کے تحقق کے لئے کافی

ہے، بشرطیکہ اس آبادی کے باہر کے لوگوں کو آنے سے ممانعت کرنے کی وجہ نماز سے روکنا نہ ہو، بلکہ کسی دفاعی یا انتظامی وجہ سے مجرّد داخلے سے روکنا ہو۔

اگر علامہ شرنبلالیؒ کی مذکورہ بالا عبارت کا یہ مفہوم لیا جائے تو اس پر وہ اعتراض وارد نہیں ہوگا جو علامہ طحطاویؒ نے وارد فرمایا ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ تعدّدِ جمعہ کی صورت میں ''اذنِ عام'' کی شرط فقہائے حنفیہ کے نزدیک بالکلیہ ختم تو نہیں ہوئی بلکہ اس کا مفہوم یہ ہوا کہ جس آبادی میں (نہ کہ کسی انفرادی گھر میں) جمعہ پڑھا جارہا ہے اس آبادی کے لوگوں کو وہاں آنے کی اجازت ہو، اگر آبادی سے باہر کے لوگوں کو دفاع یا انتظام کے پیشِ نظر اس آبادی سے داخلے سے روکا گیا ہو تو یہ ''اذنِ عام'' کے منافی نہیں بشرطیکہ روکنے کا اصل محرک نماز سے روکنا نہ ہو بلکہ کوئی دفاعی یا انتظامی ضرورت ہو اور اس آبادی سے باہر کے لوگ اس پابندی کی بنا پر جمعہ سے محروم نہ ہوتے ہوں۔

اس پر صرف یہ اشکال باقی رہتا ہے وہ یہ کہ فقہائے کرامؒ نے یہ مسئلہ ذکر کیا ہے کہ مسجونین کے لئے جمعہ کے دن اپنی علیحدہ ظہر کی جماعت کرنا مکروہ ہے (ہدایہ مع فتح القدیر ج:۲ ص:۳۵ طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجونین کے لئے جمعہ جائز نہیں، ورنہ ان کو ظہر کی جماعت کی حاجت ہی نہ ہوتی۔

لیکن اس کا جواب یہ دیا جاسکتا ہے کہ علامہ شامی اور علامہ شرنبلالی رحمہما اللہ کی عبارتوں کی روشنی میں یہ حکم اس دور کا ہے جب جمعہ ایک ہی جگہ سلطان کی قیادت میں ہوتا تھا اور سلطان کی طرف سے دُوسری جگہ اقامتِ جمعہ کی اجازت نہیں ہوتی تھی، اس کے علاوہ قید خانے بھی مختلف نوعیتوں کے ہوتے تھے، ممکن ہے کہ اس سے مراد وہ قید خانہ ہو جو کسی ایک ہی گھر یا ایک ہی احاطے پر مشتمل ہو اور اس پر کسی مستقل آبادی کا اطلاق نہ ہوسکتا ہو۔ ایک اور اِشکال یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ''بدائع'' میں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ:-

السلطان اذا صلّى فى فهندرة والقوم مع أمراء السلطان فى المسجد الجامع قال: ان فتح باب داره وأذن للعامة بالدخول فى فهندرة جاز وتكون الصلوٰة فى موضعين ولو لم يأذن للعامة وصلّى مع جيشه لا تجوز صلوٰة السلطان وتجوز صلوٰة العامة.

(بدائع الصنائع ج:۱ ص:۲۶۹ طبع رشیدیہ کوئٹہ)

یہ مسئلہ تعدّدِ جمعہ کی صورت میں مفروض ہے اس کے باوجود سلطان کے ''اذنِ عام'' نہ دینے کی صورت میں نمازِ جمعہ کو غیر منعقد قرار دیا گیا ہے۔

لیکن بظاہر اس صورت سے مراد یہ ہے کہ سلطان اپنے محل میں صرف اپنے لشکروں اور سپاہیوں کے ساتھ نماز پڑھ لے، اور باقی لوگوں کو وہاں آنے کی اجازت نہ ہو، چنانچہ مذکورہ عبارت میں "ان فتح باب دارہ ..... الخ" کا لفظ اس پر دلالت کر رہا ہے لہٰذا یہاں ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ سلطان کا محل اس کی اپنی انفرادی جگہ ہے، اور پیچھے گزر چکا ہے کہ انفرادی مقامات پر اس وقت تک جمعہ جائز نہیں ہوتا جب تک اسے عام لوگوں کے لئے کھول نہ دیا گیا ہو، لیکن اگر کوئی ایسی آبادی ہے جس میں معتد بہ لوگ رہتے ہیں تو اس کو اس جزئیہ پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ:-

ا:- اگر کسی شہر میں جمعہ کی اجازت حاکم کی طرف سے صرف ایک جگہ پڑھنے کی ہو تو جمعہ کی صحت کے لئے ضروری ہے کہ ہر وہ شخص جس پر جمعہ ہے اس کو وہاں آکر جمعہ پڑھنے کی عام اجازت ہو، ایسی عام اجازت کے بغیر جمعہ صحیح نہیں ہوگا۔

۲:- اسی طرح اگر کسی کا کوئی انفرادی گھر، محل یا دُکان ہو تو اس میں بھی جمعہ پڑھنا اس وقت تک جائز نہ ہوگا جب تک اس گھر، محل یا دُکان میں عام لوگوں کو آنے کی اجازت نہ دے دی گئی ہو، خواہ شہر میں دُوسری جگہ بھی جمعہ ہوتا ہو۔

۳:- اگر کوئی آبادی ایسی ہے جس میں معتد بہ لوگ رہتے ہیں اور وہ شہر کے اندر بھی ہے لیکن دفاعی، انتظامی یا حفاظتی وجوہ سے اس آبادی میں ہر شخص کو آنے کی اجازت نہیں ہے، بلکہ وہاں کا داخلہ ان وجوہ کی بنا پر کچھ خاص قواعد کا پابند ہے تو اس آبادی کے کسی حصے میں ایسی جگہ جمعہ پڑھنا جائز ہے جہاں اس آبادی کے افراد کو آکر جمعہ پڑھنے کی اجازت ہو، مثلاً بڑی جیل، فوجی چھاؤنی، بڑی فیکٹریاں، ایسے بڑے ایئر پورٹ جو شہر کے اندر ہوں اور ان میں سینکڑوں لوگ ہر وقت موجود رہتے ہیں، لیکن ان میں داخلے کی اجازت مخصوص قواعد کی پابند ہے، تو ان تمام جگہوں پر جمعہ جائز ہوگا بشرطیکہ وہ شہر میں داخل ہوں اور اس جیل، چھاؤنی، بڑی فیکٹری، ایئرپورٹ یا ریلوے اسٹیشن کے تمام افراد کو نماز کی جگہ آکر نمازِ جمعہ پڑھنے کی کھلی اجازت ہو۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۴۲۲/۵/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۴۹۲/۱۷ د)

ائمہ حرمین کی اقتداء میں کھلے میدانوں میں پڑھی جانے والی جمعہ کی نمازوں کا حکم

سوال:- مسجدِ نبوی کے امام کے پیچھے پاکستان میں کئی لوگوں نے جمعۃ المبارک کی نماز پڑھی ہے، ان کی نماز ہوئی یا نہیں؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ان کے پیچھے نماز نہیں ہوتی۔

جواب:- حرمین شریفین کے اماموں کے پیچھے کھلے میدانوں میں جمعہ کی جو نمازیں پڑھی گئیں وہ بلاشبہ ہوگئیں، جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ ان کے پیچھے نمازیں نہیں ہوئیں، وہ بالکل غلط کہتے ہیں، اللہ انہیں ہدایت دے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۰/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷/۲۴۲۳ ہ)

خطبۂ جمعہ میں کسی بزرگ کا مقولہ شامل کرنا

سوال:- مسئلہ یہ ہے کہ سکھر شہر کے ایک بزرگ کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے، ان کے انتقال کے بعد ان کی مسجد کے امام صاحب نے خطبۂ جمعہ میں یہ طرز اختیار کیا ہے کہ پہلے خطبے میں تحمید، تسبیح اور چند احادیث پڑھنے کے بعد ان بزرگ کے چند ملفوظات عربی میں ترجمہ کرکے "قال شفیق الأمة" کے عنوان سے پڑھتے ہیں، اس میں خلجان یہ ہے کہ اس سے پہلے بھی ہمارے اکابرؒ کا انتقال ہوا ہے، مگر کوئی صورت، مذکورہ صورتِ حال کی طرح منظور و مسموع نہیں ہوئی۔ شاید جواز کی کوئی صورت نکل آئے، لیکن فی نفسہ مذکورہ طرزِ عمل پر قلب مضطرب ہے کہ ہوسکتا ہے کہ یہ فعل آئندہ چل کر غلو فی الدین کا ذریعہ نہ بن جائے اور کہیں یہ طریقہ سلف سے ہٹ کر کسی بدعت کا ذریعہ نہ بن جائے، اس لئے برائے کرم اس کی قابلِ اطمینان حیثیت مدلل طور پر متعین فرما کر ممنون فرمائیں، نیز یہ بھی وضاحت فرمادیں کہ یہ طرزِ عمل لائقِ اتباع و عمل ہے یا نہیں؟

جواب:- اگرچہ خطبۂ جمعہ میں کسی بزگ کا کوئی مفید مقولہ بیان کرنا شرعاً جائز ہے، لیکن ہر خطبے میں کسی ایک ہی شخص کے ملفوظات بیان کرنے کا التزام کرنے سے یقیناً غلو کا اندیشہ ہے، لہٰذا اسے حکمت اور نرمی سے روکنا چاہئے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۲۱/۴/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۶/۴۲۸)

پنج وقتہ نماز کے لئے بنائی گئی جگہ میں جمعہ کا حکم

سوال:- جن مقتدیوں کی نمازِ میّت، امام نہیں پڑھتا، ان لوگوں نے ایک الگ جگہ بنائی ہے جس میں پانچ وقتی نماز پڑھتے ہیں اور جمعہ دُوسری جگہ جاکر پڑھتے ہیں، کیا اس مسجد میں نمازِ جمعہ ان کے لئے جائز ہوگی یا نہیں؟

جواب:- ہر وہ مسجد جہاں جمعہ کی نماز شرعی شرائط کے مطابق ہوتی ہو، وہاں جمعہ کی نماز پڑھی جاسکتی ہے، لہٰذا ان حضرات کا دُوسری مسجد میں جمعہ پڑھنا دُرست ہے۔ واللہ اعلم

۱۳۸۸/۱/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۱۲۰/۱۹ الف)

ترکِ سعی کے گناہ سے بچنے کے لئے اذانِ اوّل کو تقریر سے مؤخر کرنے کا حکم

(سب سے پہلے اس موضوع سے متعلق حافظ صغیر احمد صاحب کے ایک سوال کے جواب میں دارالافتاء دارالعلوم کراچی سے درج ذیل فتویٰ جاری کیا گیا۔)

جمعہ کی اذانِ اوّل کے متعلق ایک استفتاء اور اس کا جواب

سوال:- کیا فرماتے ہیں حضراتِ علمائے دین و مفتیانِ شرعِ متین اس مسئلے کے بارے میں کہ:-

۱:- جمعہ کے دن اذانِ اوّل کے بعد فقہائے کرام کے نزدیک "سعی الی الجمعۃ" واجب ہے، جس کا مطلب سب کے نزدیک یہ ہے کہ نمازی مسجد کی طرف چل پڑے اور مسجد کی طرف چلنے میں کوئی چیز مانع نہیں ہونی چاہئے، الّا یہ کہ جمعہ کی تیاری میں مشغول ہو، یعنی غسل کر رہا ہو، کپڑے تبدیل کر رہا ہو، تیل، سرمہ یا عطر لگا رہا ہو اور پھر اس سے فارغ ہوتے ہی مسجد کی طرف چل پڑے۔

نیز اگر کبھی اذانِ اوّل سے قبل جمعہ کی مذکورہ تیاری سے فارغ نہ ہوسکا ہو یا تیاری شروع نہ کرسکا ہو تو اذانِ اوّل پر فوراً تیاری میں مشغول ہوجائے بشرطیکہ خطبے کی اذان سے اتنا قبل فارغ ہوکر مسجد میں پہنچ سکے کہ بہ سہولت سنتیں ادا کرسکے، اگر ایسا ممکن نہ ہو تو پھر جمعہ کی تیاری (غسل وغیرہ) کی سنتوں کو موقوف کرکے واجب (مسجد) کی طرف چل پڑے۔

نیز مصلّی کے لئے ضروری ہے کہ وہ جمعہ کی مذکورہ تیاری، اذانِ اوّل کے ساتھ شروع کرنے کو عادت نہ بنائے اور یہ جانے کہ تیاری کی صرف اذانِ اوّل کے بعد اجازت ہے، اور اصل یہی ہے

کہ اذانِ اوّل کے بعد سعی الی الجمعہ کے تحت فوراً مسجد کی طرف چل پڑے کہ یہ عمل واجب ہے اور تاخیر سے واجب کی ادائیگی میں تاخیر کا گناہ ہوگا۔

۲:- یہ بات بھی سب فقہائے کرام کے نزدیک متفق علیہ ہے کہ اذانِ اوّل سے قبل یا اذانِ اوّل کے ساتھ کوئی مصلی تیاری سے فارغ ہوکر بجائے مسجد میں آنے کے گھر میں ہی صلوٰۃ التسبیح، نوافل ادا کرتا ہے یا تلاوت میں مشغول ہوتا ہے یا دُرود شریف یا دیگر اوراد و وظائف میں یا مطالعے میں مشغول ہوتا ہے یا گھر کے کام میں مشغول ہوتا ہے تو یہ مشغولی ناجائز ہے۔

اب جواب طلب اَمر یہ ہے کہ اکثر مساجد میں اذانِ اوّل اور اذانِ خطبہ کے درمیان نصف گھنٹہ تا زائد از ایک گھنٹہ بھی وقفہ ہوتا ہے، جس کے دوران ہمارے بلاد اپنے اندر سننے والوں کے لئے پسند و ناپسند کی بہت سی وجوہ رکھتے ہیں، اسی وجہ سے تقاریر کے سننے اور نہ سننے میں نمازیوں کا ذوق و مزاج مختلف ہوتا ہے، اس لئے اکثر نمازی اس تقریر کئے جانے والے وقت کو دیگر اعمال میں گزارنے کو ترجیح دیتے ہیں اور بہت سے اس وقت کو خرید و فروخت کے علاوہ دیگر اپنے نجی کاموں کو پورا کرنے میں صَرف کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

آیا صورتِ مذکورہ میں اس بات کی گنجائش ہے کہ نمازی، جمعہ کی تیاری سے فارغ ہوکر گھر میں ہی تلاوت، صلوٰۃ التسبیح وغیرہ میں مشغول رہیں؟ ب:- گھر کے یا نجی کاموں میں شامل رہے اور سنتیں بھی گھر ہی میں ادا کرے اور خطبے کی اذان سے قبل یا خطبے کی اذان کے ساتھ ساتھ مسجد میں پہنچ جائے؟ اگر اس کی گنجائش نہیں تو ایسا کرنے والا کس درجے کا گناہگار ہوتا ہے؟ جواب سے جلد مطلع فرماکر ممنون فرمائیں۔

المستفتی صغیر احمد

احسان منزل امیر معاویہ روڈ راج گڑھ

چوبرجی، لاہور ۵۴۰۰۰

۱۹ ربیع الاوّل ۱۴۱۰ھ

(اس استفتاء کا دار الافتاء دار العلوم کراچی کی جانب سے یہ جواب دیا گیا جو ماہنامہ ''البلاغ'' کراچی کے شوال ۱۴۱۵ھ کے شمارے میں بھی شائع ہوا۔)

جواب:- جن لوگوں پر جمعہ کی نماز فرض ہے ان کے لئے جمعہ کے دن جمعہ کی پہلی اذان سے لے کر نمازِ جمعہ سے فارغ ہونے تک مفتیٰ بہ قول کے مطابق خرید و فروخت کرنا، سونا، کسی سے باتوں میں مشغول ہونا، یہاں تک کہ بیٹھ کر قرآن مجید کی تلاوت کرنا اور کسی کتاب وغیرہ کا مطالعہ کرنا وغیر ذالک، غرض وہ سارے کام اور مشاغل جو جمعہ کی طرف جانے کے اہتمام میں مخل ہوں سب کے

سب مکروہِ تحریمی یعنی ناجائز ہیں۔ صرف کھانے کے مسئلے میں یہ تفصیل ہے کہ اگر کھانے کی طرف رغبت اتنی غالب ہو کہ نماز کے دوران دِل اس میں لگا رہنے کا اندیشہ ہو اور نماز سے فراغت تک کھانا بے لذت ہوجانے کا خطرہ ہو تو کھانا کھایا جاسکتا ہے، بشرطیکہ خطبۂ جمعہ کے فوت ہونے کا اندیشہ نہ ہو، اس کے علاوہ جمعہ کی تیاری کے متعلق جو کام ہیں وہ کئے جاسکتے ہیں، جیسے غسل کرنا، وضو کرنا، لباس پہننا وغیرہ، لیکن قصداً ان کاموں کو اذانِ اوّل تک مؤخر نہ کرنا چاہئے۔

البتہ ایک اہم بات جو توجہ طلب ہے وہ یہ کہ احادیثِ مبارکہ میں آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم زوالِ شمس کے جلد بعد نمازِ جمعہ پڑھ لیتے تھے اور ایسا ہی حضراتِ صحابہ کرامؓ کے زمانے میں بشمول خلفائے راشدینؓ نمازِ جمعہ زوال کے بعد جلد پڑھی جاتی تھی، لہٰذا جب حضرت عثمانؓ کے زمانے میں اذانِ اوّل شروع ہوئی تو اس اذانِ اوّل اور خطبے کے درمیان زیادہ وقفہ نہیں ہوتا تھا، لیکن آج کل نمازِ جمعہ عموماً زوال کے بعد تاخیر سے ادا کی جاتی ہے اور پھر خطبۂ جمعہ سے قبل تقریر کا دستور ہوجانے کی وجہ سے خطبہ ونمازِ جمعہ میں مزید تاخیر ہوجاتی ہے اور اذانِ اوّل اور خطبے کے درمیان بہت وقفہ ہوجاتا ہے، جس کے نتیجے میں لوگوں کے اندر یہ غفلت پائی جاتی ہے کہ لوگ اذانِ اوّل کے بعد سعی الی الجمعہ کا اہتمام نہیں کرتے کہ ابھی خطبے میں بہت وقت ہے، لوگوں کے اس گناہ میں مبتلا ہونے کا ایک سبب ان کی اپنی کوتاہی اور سستی کے علاوہ مساجد کے منتظمین بھی ہیں، اس لئے منتظمین کو چاہئے کہ وہ اذانِ اوّل کے بعد جلدی جمعہ ادا کرنے کا اہتمام کریں، کیونکہ اگرچہ نمازِ جمعہ کا اصل وقت (یعنی ابتداء اور انتہاء کے اعتبار سے) ظہر والا ہی ہے، لیکن ظہر کی نماز کی طرح جمعہ میں اِبراد کرنا اَولیٰ نہیں ہے، بلکہ جمعہ میں تعجیل افضل ہے، چنانچہ فتاویٰ رشیدیہ میں ہے کہ:-

جمعہ وظہر کا وقت ایک ہے، مگر جمعہ کو ذرا پہلے پڑھنا کہ لوگ سویرے سے آئے ہیں ان کو جلد فراغت ہوجائے تو بہتر ہے، فقط۔ (فتاویٰ رشیدیہ ص:۲۵۳)

اسی طرح مفتیٔ اعظم مولانا عزیز الرحمٰن صاحب قدس اللہ سرہٗ اپنے فتاویٰ عزیز الفتاویٰ میں اس سوال کے جواب میں کہ جمعہ کو سوا بجے پڑھنے والے افضلیت پر ہیں یا ڈھائی بجے پڑھنے والے افضلیت پر ہیں؟ لکھتے ہیں کہ:-

جمعہ میں تعجیل افضل ہے، ایک بجے، سوا بجے پڑھنے والے افضلیت پر ہیں۔

(عزیز الفتاویٰ ص:۲۷۴)

اور دُوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ:-

حنفیہ کا صحیح مذہب یہ ہے کہ جمعہ میں تعجیل مستحب ہے، اِبراد یعنی تاخیر جو کہ ظہر کی نماز میں

موسمِ گرما میں مستحب ہے وہ جمعہ میں نہیں ہے، بلکہ جمعہ کو جلد ادا کرنا مستحب ہے، اور احادیث سے بھی جمعہ کی تعجیل ہی ثابت ہوتی ہے، پس زوال کے بعد مثلاً ساڑھے بارہ بجے اذانِ جمعہ ہونی چاہئے، پھر دس پندرہ منٹ بعد خطبہ اور اس کے بعد نماز ہونی چاہئے مثلاً ایک بجے تک یہ سب کام ہوجائیں یا کسی قدر کم وبیش ہو۔ (عزیز الفتاویٰ ص:۲۹۸)

لہٰذا منتظمین کو چاہئے کہ وہ زوال کے بعد جلدی جمعہ ادا کیا کریں اور نیز اذانِ اوّل اور خطبے کے درمیان زیادہ وقفہ نہ کیا کریں، اور اس کی صورت یہ ہے کہ اذانِ اوّل کے کافی دیر بعد تقریر شروع کرنے کے بجائے اذانِ اوّل کے فوراً بعد تقریر شروع ہوجائے اور مختصر تقریر کے بعد خطبے کے لئے اذان دی جائے، اور پھر خطبہ اور نماز پڑھ لی جائے یا اذانِ اوّل، تقریر کے فوراً بعد ہو، اور اس کے بعد صرف اتنا وقت ہو کہ جو لوگ ابھی مسجد میں نہیں آئے وہ مسجد میں آکر سنتیں پڑھ سکیں اور اس کے بعد اذانِ ثانی اور خطبہ ونماز ہو۔

لیکن چونکہ یہ طریقہ آج کل معروف نہیں ہے، اس لئے اس کو شروع کرنے سے پہلے لوگوں کو مسئلہ بتاکر ذہنی طور پر تیار کرلیا جائے تاکہ وقت پر لوگوں کو تشویش نہ ہو، لیکن بہرحال اذانِ اوّل کے بعد گھر کے کام کاج یا گھر میں رہ کر تلاوت یا صلوٰۃ التسبیح وغیرہ میں مشغول ہونا، جائز نہیں ہے، اور ایسا کرنے والا مکروہِ تحریمی کا مرتکب ہوگا۔

قال اللہ تعالیٰ: "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللہِ وَذَرُوا الْبَیْعَ"۔ (۱)

وفی تنویر الأبصار ج:۲ ص:۱۶۱ (طبع سعید) ووجب سعی الیھا وترک البیع بالأذان الأوّل وفی الشامیة تحت (قوله وترک البیع) أراد به کل عمل ینافی السعی وخصه اتباعًا للآیة نھر.

وفی بدائع الصنائع ج:۱ ص:۲۶۵ (طبع ایچ ایم سعید) لما روی عن عمرؓ أنه کان یخطب یوم الجمعة فدخل علیه عثمان فقال له أیة ساعة ھذه؟ فقال: ما زدت حین سمعت النداء یا أمیر المؤمنین! علیٰ أن توضأت، فقال: والوضوء أیضًا وقد علمت أن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم أمر بالاغتسال.

وفی الدر المختار ج:۲ ص:۱۶۳ (طبع سعید) سمع النداء وھو یأکل ترکه ان خاف فوت جمعة أو مکتوبة لا جماعة رستاقی. وفی الشامیة والأکل أی الذی تمیل الیه

(۱) سورة الجمعة:۹.

نفسه ويخاف ذهاب لذته عذر في ترك الجماعة كما مرّ في بابها لكن يشكل ما مرّ من وجوب السعي الى الجمعة بالأذان الأوّل وترك البيع ولو ماشيا والمراد به كل عمل ينافي السعي فتأمل.

وفي تقريرات الرافعي بتقييد ما مرّ بما هنا يندفع الإشكال وذلك لأن حضور الأكل المذكور حيث كان عذرا في سقوط واجب الجماعة لشغل بال المصلّي يكون عذرا في سقوط واجب السعي اذ لا فرق بين واجب وواجب بخلاف ما اذا خاف فوت الجمعة أو الوقت لفوات الفرض لا لواجب، انتهٰى.

وفي صحيح البخاري ج:۱ ص:۱۲۳ (طبع قديمي كتب خانه) عن أنس بن مالكؓ أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يصلّي الجمعة حين تميل الشمس، وعنه أيضًا قال: كنا نبكر بالجمعة ونقيل بعد الجمعة.

وفي مصنف لعبد الرزاق (ج:۳ ص:۱۸۵ رقم الحديث:۵۲۱۲)[1] عن عطاء قال: بلغني أن عثمان كان يجمع ثم يقيل الناس بعد الصلوٰة.

وفي مصنف لابن أبي شيبة (۲:۱:۲)[2] أخبرنا محمد بن سعد الأنصاري عن أبيه قال: كنا نجمع مع عثمان بن عفانؓ ثم نرجع فنقيل.

وفيه أيضًا (۲:۸:۱)[3] عن أبي رزين قال: كنا نصلّي مع عليؓ الجمعة فأحيانا نجد فيئًا وأحيانا لا نجده.

وفي الدر المختار (ج:۱ ص:۳۶۷)[4] (وجمعة كظهر أصلا واستحبابا) في الزمانين لأنها خلفه.

وفي الشامية (قوله أصلا) أي من جهة أصل وقت الجواز وما وقع في اٰخره من الخلاف (وقوله استحبابا في الزمانين) أي الشتاء والصيف ح، لٰكن جزم في الشباه من فن الأحكام انه لا يسن لها الابراد وفي جامع الفتاویٰ لقارئ الهداية: قيل انه مشروع لأنها تؤدى في وقت الظهر وتقوم مقامه وقال الجمهور: ليس بمشروع لأنها تقام بجمع عظيم فتأخيرها

---

(۱) مصنف عبدالرزاق باب وقت الجمعة ج:۳ ص:۱۷۵ (طبع المكتب الاسلامي بيروت).

(۲) مصنف ابن أبي شيبة باب من كان يقيل بعد الجمعة ويقول هي أول النهار رقم الحديث:۵۱۴۳ ج:۱ ص:۴۴۴ (طبع مكتبة الرشد، رياض).

(۳) مصنف ابن أبي شيبة باب من كان يقول وقتها زوال الشمس وقت الظهر رقم الحديث: ۵۱۴۴ ج:۱ ص:۴۴۵ (طبع مكتبة الرشد، رياض).

(۴) (طبع ايچ ايم سعيد).

مفض الی الحرج ولا کذٰلک الظهر وموافقة الخلف لأصله من کل وجه لیس بشرط اھ۔

واللہ اعلم بالصواب

الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح	عبیداللہ انور میرپوری
محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ	احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ	سحبان محمود	دارالافتاء دارالعلوم کراچی ۱۴
			۱۴۱۵/۶/۲۳ھ

الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح
بندہ محمود اشرف غفر اللہ لہٗ	بندہ عبدالرؤف سکھروی	محمد عبدالمنان عفی عنہ	اصغر علی ربانی

(ان ہی دنوں میں اس مسئلے سے متعلق ایک استفتاء کے جواب میں جناب مولانا ڈاکٹر عبدالواحد صاحب نے ایک فتویٰ تحریر فرمایا جو رجب ۱۴۱۵ھ کے رسالہ "انوارِ مدینہ" میں شائع ہوا، یہ فتویٰ درج ذیل ہے۔)

جمعہ کی اذانِ اوّل کے بعد بیع وشراء وغیرہ ممنوع کاموں کے ارتکاب سے لوگوں کو بچانے کے لئے کیا اذانِ اوّل کو مؤخر کرنا جائز ہے؟

سوال:- جمعہ کی اذانِ اوّل کے بعد خرید وفروخت اور نماز کے منافی ہر کام کو چھوڑ کر مسجد میں آنا واجب ہے، لیکن چونکہ لوگوں میں اس کا اہتمام بہت کم ہے کہ اذانِ اوّل کے وقت مسجد میں آجائیں اس لئے ترکِ واجب کے مرتکب ہوتے ہیں، لوگ اس معصیت سے بچ جائیں اگر یہ صورت اختیار کی جائے کہ اذانِ اوّل کو تاخیر سے کہا جائے اور دونوں اذانوں کے مابین فقط اتنا وقفہ کیا جائے کہ لوگ سنتیں پڑھ لیں، تو کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ مثلاً دُوسری اذان سوا ایک بجے ہو اور پہلی اذان ایک بجے یا ایک بج کر پانچ منٹ پر کہی جائے جبکہ زوال کا وقت سوا بارہ بجے ہو، اُردو میں تقریر اذانِ اوّل سے پہلے ہی ہوجائے اس طرح بہت زیادہ لوگ اذانِ اوّل کے وقت مسجد میں موجود ہوں گے، بعض مساجد میں اس طریقے پر عمل ہو رہا ہے۔

جواب:- جمعہ کی اذانِ اوّل کا وقت زوال کے متصل بعد ہے، اسی پر عملی توارث چلا آرہا ہے، کتبِ حدیثیہ وفقہیہ میں بھی اس کی تصریح ہے۔

۱:- المغنی لابن قدامہؒ میں ہے:-

ویبدأ وجوب السعی الیها .... وعند الحنفیة بالأذان الأول عند الزوال. (بحوالہ الفقه الاسلامی وأدلته ج:۲ ص:۲۶۲)۔[۱]

(۱) (طبع دار الفکر).

(ترجمہ:- حنفیہ کے نزدیک جمعہ کے لئے سعی کا وجوب زوال کے وقت اذانِ اوّل سے شروع ہوتا ہے۔)

۲:- معارف السنن میں مولانا یوسف بنوری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:-

وبالجملة فهٰذا الأذان كان قبل التأذين بين يدى الخطيب وكان في أول وقت الظهر متصلًا بالزوال. (ج:۳ ص:۳۹۶)۔[1]

(ترجمہ:- اذانِ اوّل خطیب کے سامنے اذان سے پیشتر ہوتی تھی اور ظہر کے اوّل وقت میں زوال کے ساتھ متصل ہوتی تھی۔)

۳:- مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر میں ہے:-

(ويجب السعي وترك البيع بالأذان الأول) عقيب الزوال. (ج:۱ ص:۱۷۱)۔[2]

(ترجمہ:- جمعہ کے لئے سعی اور ترکِ بیع، زوال کے بعد اذانِ اوّل سے واجب ہوتی ہے۔)

۴:- عمدۃ القاری میں علامہ عینی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:-

قوله زاد النداء الثالث انما سمي ثالثًا باعتبار كونه مزيدًا لأن الأول هو الأذان عند جلوس الامام على المنبر والثاني هو الاقامة للصلوٰة عند نزوله والثالث عند دخول وقت الظهر. (ج:۶ ص:۲۱۱)۔[3]

(ترجمہ:- پہلی اذان کو جو تیسری اذان کہا گیا تو اس اعتبار سے کہ اس کو زیادہ کیا گیا تھا، کیونکہ پہلی اذان وہ ہے جو امام کے سامنے ہوتی ہے جب وہ منبر پر بیٹھا ہوتا ہے، اور دُوسری سے مراد نماز کے لئے اقامت ہے جو امام کے منبر سے اُترنے پر ہوتی ہے، اور تیسری اذان وہ ہے جو ظہر کا وقت شروع ہونے پر ہوتی ہے۔)

۵:- فتح الباری میں علامہ ابنِ حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:-

وتبين بما مضى ان عثمان أحدثه لاعلام الناس بدخول وقت الصلوٰة .... الخ. (ج:۲ ص:۳۹۴)۔[4]

(ترجمہ:- سابقہ کلام سے ظاہر ہوا کہ حضرت عثمانؓ نے پہلی اذان اس لئے شروع کی کہ لوگوں کو نماز کے وقت کے شروع ہونے کی اطلاع ہوجائے۔)

---

(۱) (طبع ایچ ایم سعید).

(۲) مجمع الأنهر شرح ملتقى الأبحر ج:۱ ص:۲۵۳ (طبع دار الكتب العلمية بيروت).

(۳) (طبع دار الفكر).

(۴) (طبع دار نشر الكتب الاسلاميه لاهور).

۶:- تبیین الحقائق میں علامہ زیلعی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:-

وقال بعض العلماء یجب السعی وترک البیع بدخول الوقت لأن التوجه الی الجمعة یجب بدخول الوقت وان لم یؤذن لها أحد ولهٰذا لا یعتبر الأذان قبل الوقت. (ج:۱ ص:۲۲۳)۔[1]

(ترجمہ:- بعض علماء نے کہا ہے کہ سعی اور ترکِ بیع کا وجوب، جمعہ کا وقت شروع ہونے سے ہوتا ہے، کیونکہ جمعہ کی طرف توجہ کا وجوب، وقت شروع ہونے سے ہوتا ہے، اگرچہ کسی نے بھی اس کے لئے اذان نہ کہی ہو، اسی لئے وقت سے پیشتر اذان کا اعتبار نہیں کیا جاتا۔)

۷:- تفسیراتِ احمدیہ میں حضرت مُلّا جیون رحمہ اللہ لکھتے ہیں:-

وقال الامام الزاهد المراد بالنداء دخول الوقت اذ به یحرم البیع دون الأذان نفسه. (ص:۷۵ح)۔[2]

(ترجمہ:- امام زاہد نے کہا کہ ''نداء'' سے مراد وقت کا شروع ہونا ہے کہ اس سے بیع حرام ہوتی ہے اور عین اذان مراد نہیں ہے۔)

۸:- احکام القرآن میں مولانا ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:-

قوله تعالیٰ وَذَرُوا الْبَيْعَ اختلف السلف فی وقت النهی عن البیع فروی عن مسروق والضحاک ومسلم بن یسار أن البیع یحرم بزوال الشمس، وقال مجاهد والزهری یحرم بالنداء وقد قیل ان اعتبار الوقت فی ذٰلک أولیٰ اذا کان علیهم الحضور عند دخول الوقت فلا یسقط ذٰلک عنهم تاخیر النداء ولما یکن للنداء قبل الزوال معنی دل ذٰلک علیٰ أن النداء الذی بعد الزوال انما هو بعد ما قد وجب اتیان الصلوٰة. (ج:۵ ص:۲۳)۔[3]

(ترجمہ:- ارشادِ باری تعالیٰ: ''وَذَرُوا الْبَيْعَ'' بیع سے ممانعت کے وقت کے بارے میں سلف میں اختلاف ہوا ہے، مسروق، ضحاک اور مسلم بن یسار رحمہم اللہ سے روایت ہے کہ زوالِ آفتاب سے ہی بیع حرام ہوجاتی ہے، مجاہد اور زہری رحمہما اللہ کا قول ہے کہ اذان سے حرام ہوتی ہے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس بارے میں وقت کا اعتبار کرنا اَوْلیٰ ہے کیونکہ وقت شروع ہونے پر لوگوں کے ذمے جمعہ کے لئے حاضری واجب ہوتی ہے، للہٰذا اذان کو مؤخر کرنا ان سے اس واجب کو ساقط نہیں کرے گا.....الخ۔)

اس عبارت سے درج ذیل باتیں سامنے آئیں:-

---

(۱) (طبع مکتبه امدادیه ملتان).

(۲) تفسیرات احمدیة سورة الجمعة ص:۷۰۵، ۷۰۶ (مطبع الکریمی، بمبئی).

(۳) (طبع ادارة القرآن کراچی).

الف:- جمعہ کی اذانِ اوّل کا وقت زوال سے متصل بعد کا ہے۔

ب:- بعض علماء کے نزدیک بیع وشراء وغیرہ کی حرمت کا تعلق وقتِ زوال سے ہے، تنہا اذان سے نہیں، اگر زوال کے وقت ہی اذان ہو تب تو وقت اور اذان دونوں کے ساتھ حکمِ ممانعت کا تعلق ہوا، اور اگر اذانِ اوّل کو تأخیر سے کہا گیا تو حکمِ ممانعت کا تعلق وقتِ زوال کے ساتھ ثابت ہوگا، اذان کہے جانے تک مؤخر نہیں ہوگا، ان دونوں باتوں کو پیشِ نظر رکھیں تو یہ سمجھنا دُشوار نہیں ہوگا کہ اصلاحِ احوال کے لئے جس صورت کا ذکر سوال میں کیا گیا ہے انتہائی غیر مناسب ہے کہ اس میں ترکِ واجب کے ارتکاب سے بچاؤ تو کیا ہوتا اُلٹا عملی توارث اور ایک حکم کی خلاف ورزی ہو رہی ہے، یعنی اذانِ اوّل کی اس کے اصل وقت سے تأخیر۔

جن مساجد میں اذانِ اوّل کو مؤخر کرنے کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے، ضروری ہے کہ وہاں اس طریقے کو ختم کردیا جائے۔

اصلاحِ احوال کی متبادل صورت یہ ہوسکتی ہے کہ اذانِ اوّل کو اپنے وقت پر رکھتے ہوئے اذانِ ثانی کو جہاں تک ہوسکے مقدم کرلیا جائے، لیکن اس میں بھی اتنا وقفہ ضرور رکھا جائے کہ لوگ اذانِ اوّل کو سن کر مسجد میں جمع ہوجائیں اور فرضوں سے پہلے سنتیں پڑھ سکیں، کیونکہ ایک روایت میں ہے:-

فأحدث عثمان التأذينة الثالثة على الزوراء ليجتمع الناس. (عمدۃ القاری ج:۶ ص:۲۱۱)۔[1]

(حضرت عثمانؓ نے زوراء پر تیسری اذان شروع کرائی تاکہ لوگ اکٹھے ہوجائیں۔)

اور ایک اور روایت میں ہے: فأذن بالزوراء قبل خروجه ليعلم الناس ان الجمعة قد حضرت. (فتح الباری ج:۲ ص:۳۹۴)۔[2]

(اپنے نکلنے سے پیشتر زوراء پر اذان دِلوائی تاکہ لوگوں کو علم ہوجائے کہ جمعہ کا وقت ہوگیا ہے۔)

موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے ہماری رائے میں یہ وقفہ آدھ گھنٹہ کا تو ضرور ہونا چاہئے، یعنی اذانِ اوّل تو زوال ہوتے ہی کہہ دی جائے اور آدھ گھنٹے بعد اذانِ ثانی کہہ دی جائے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

الجواب صحیح	الجواب صحیح	عبدالواحد غفرلہٗ
محمد قاسم	عبدالحمید	جامعہ مدنیہ لاہور

(۱) (طبع دار الفكر). (۲) (طبع دار نشر الكتب الاسلاميه لاهور).

(اس فتویٰ کی اشاعت کے بعد حافظ صغیر احمد صاحب کی طرف سے جناب ڈاکٹر عبدالواحد صاحب کو درج ذیل تحریر بھیجی گئی۔)

محترم ومکرم حضرت مولانا مفتی عبدالواحد صاحب زید مجدہٗ! سلامِ مسنون

عرض یہ ہے کہ جناب کے علم میں ہے کہ بندہ ایک کوشش میں مشغول ہے کہ نمازِ جمعہ ادا کرنے والے مسلمان (بالعموم) اذانِ اوّل اور اذانِ ثانی کے درمیانی وقفے پر سعی الی الجمعہ کے منافی اُمور میں مشغول رہتے ہیں، جس کی وجہ سے ترکِ واجب کے گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں، اسی سلسلے میں ایک استفتاء مرتب کر کے پاکستان کے اہم اہم مدارس سے جواب بھی منگایا، اور جناب کے ہاں سے بھی جواب موصول ہوا تھا، مگر ''انوارِ مدینہ'' کے جلد:۳ شمارہ:۳۱ ماہ رجب المرجب ۱۴۱۵ (دسمبر ۱۹۹۴ء) میں اسی ذیل میں ایک مضمون (استفتاء اور اس کا جواب) دیکھا جسے دیکھ کر خیال ہوا کہ حضراتِ مفتیانِ کرام کی خدمت میں اس کو روانہ کر کے رہنمائی چاہوں اور اس کی تیاری بھی کر لی (تیاری کا ایک صفحہ بھی لف ہے) مگر ایک مشفق ومحبِ عالم نے یہ رہنمائی فرمائی کہ اپنے اشکال کے حل کے لئے جناب کی خدمت میں پہلے عرض کر دوں، خدا کرے جناب ہی توجہ فرما کر حل فرماویں، اشکال یہ ہے کہ:-

یہ بات تو متفق علیہ ہے کہ زوال سے نمازِ جمعہ کا وقت شروع ہو جاتا ہے، اور فضیلت بھی اسی میں ہے کہ اس سے یعنی زوال سے بھی قبل یا زوال پر تیاری شروع کرے، مگر فتویٰ کس پر ہے کہ وجوب سعی الی الجمعہ کا اطلاق زوال کے فوراً بعد ہوگا یا جہاں (جس مسجد میں) جس نمازی نے نماز پڑھی ہے وجوب کا اطلاق اس نمازی پر اس مسجد کی پہلی اذان سے ہوگا؟ اگر وجوب کا اطلاق زوال سے ہوگا تو پھر سارے عالم کے مسلمانوں کو اس گناہِ کبیرہ سے بچانے کی سعی کیا ہو؟

اُمید ہے جنابِ والا مفتیٰ بہ قول کی روشنی میں رہنمائی فرما کر ممنون فرمائیں گے، جزاکم اللہ تعالیٰ۔ (صغیر احمد)

جواب:- (از مفتی عبدالواحد صاحب)

جناب کی جانب سے پہلے جو سوال نامہ آیا تھا اس کا اور جواب کا حاصل یہ تھا کہ اذانِ اوّل کے بعد سعی الی الجمعہ واجب اور دُنیوی کاموں میں لگنا یا ایسے شغل میں مشغول ہونا جس سے سعی الی الجمعہ میں خلل آتا ہو، ناجائز ہے۔

لیکن ایک بات قابلِ غور تھی، اور وہ یہ کہ اذانِ اوّل کا وقت کیا ہے؟ کیا زوال ہوتے ہی کہی جائے یا جب مناسب خیال کیا جائے کہی جائے؟ خواہ زوال کے پندرہ منٹ بعد یا ایک گھنٹے بعد یا اس سے بھی زیادہ تأخیر سے۔

اس بات سے نہ تو جناب کے سوال نامے میں کچھ تعرض تھا اور نہ ہی اس کے جواب میں اس سے کچھ بحث کی گئی تھی، ''انوارِ مدینہ'' میں اسی بات کے بارے میں تحقیق پیش کی گئی تھی۔

حوالہ جات سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ اذانِ اوّل کا وقت زوال ہوتے ہی ہے (لہٰذا اذانِ اوّل کے وقت کے بارے میں یہی مفتیٰ بہ قول ہے) فتح الباری کے حوالے سے معلوم ہوا کہ حضرت عثمانؓ نے پہلی اذان اس لئے شروع کی تاکہ لوگوں کو نماز کے وقت کے شروع ہونے کی اطلاع ہوجائے، معارف السنن کے حوالے سے معلوم ہوا کہ دورِ سلف میں اسی وقت اذان ہوتی تھی اور اسی پر توارثِ عملی چلا آرہا ہے۔

ایک متوارث عمل کو تبدیل کرنا جبکہ:-

۱:- اذانِ اوّل اس لئے شروع ہوئی کہ لوگوں کو جمعہ کے وقت کے شروع ہونے کا علم ہوجائے۔

۲:- اذانِ اوّل کا وقت زوال ہوتے ہی ہے۔

۳:- بعض حضرات کے نزدیک بیع وغیرہ کی حرمت زوالِ شمس سے ہے (اور اس قول کے قوی ہونے کا علم اس سے ہوتا ہے کہ علامہ زیلعی رحمہ اللہ نے تبیین[1] میں اور مولانا ادریس کاندھلویؒ نے اَحکام القرآن[2] میں یہ قول نقل کرکے نہ تو اس کی تضعیف کی اور نہ ہی اس کے خلاف کیا)۔

۴:- جو مصلحت جناب کے پیشِ نظر ہے، اس کی تفصیل کا متبادل طریقہ موجود ہے، جو کہ ''انوارِ مدینہ'' ہی میں ذکر کیا گیا ہے۔

ایک غیر مناسب اور قابلِ ترک بلکہ واجب الترک اور واجب الاحتراز طریقہ ہے۔

یہ تو ایک اتفاقیہ بات (Accidental) ہوگی کہ اذانِ اوّل زوال ہوتے ہی نہ کہی گئی بلکہ کچھ تأخیر سے کہی گئی ہو اس وقت یہ اختلاف سامنے آتا ہے کہ وجوبِ سعی زوال سے ہو یا اذان سے، لیکن اس اتفاقیہ بات کو ہم عملی معمول نہیں بناسکتے، عملی معمول وہی ہوگا جو حوالہ جات سے ثابت ہوا کہ زوال ہوتے ہی اذانِ اوّل کہی جائے اور اس طرح عملاً (Practically) وجوبِ سعی، زوال اور اذانِ اوّل دونوں ہی کے ساتھ مقترن ہو۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

عبدالواحد غفرلہٗ

۲۰ رشعبان ۱۴۱۵ھ

---

(۱) تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق ج:۱ ص:۲۲۳ (طبع مکتبہ امدادیہ ملتان)۔

(۲) احکام القرآن، المسئلۃ السابعۃ ج:۵ ص:۲۳ (طبع ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ کراچی)۔

(اس کے بعد ماہنامہ ''البلاغ'' اور ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' میں شائع ہونے والی تحریرات ایک سوال کے ساتھ حضرت مولانا مفتی عبدالشکور ترمذی صاحبؒ کی خدمت میں پیش کی گئیں تو حضرتِ موصوفؒ نے اس کا درج ذیل جواب تحریر فرمایا۔)

جواب:- (از حضرت مولانا مفتی عبدالشکور ترمذی رحمہ اللہ)

جمعہ کے خطبے سے پہلے تقریر کا متعدد صحابہ کرامؓ سے ثبوت ملتا ہے، جیسا کہ مستدرک حاکم میں ہے کہ حضرت ابوہریرۃؓ جمعہ کے دن خطبے سے پہلے اپنی تقریر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث بیان کیا کرتے تھے، جب امام خطبے کے لئے آتے تو وہ اپنی تقریر موقوف کردیا کرتے تھے۔ (مستدرک حاکم ج:۱ ص:۱۰۸ و ج:۳ ص:۵۱۲)۔[۱]

قال الحاکم والذھبی صحیح۔[۲] (از راہِ سنت مولانا محمد سرفراز خان صاحب)۔[۳]

اسی طرح اس مستدرک میں حضرت عبداللہ بن بسرؓ کا جمعہ کے دن خطبے سے قبل وعظ کہنا منقول ہے،[۴] اور اصابہ فی تذکرۃ الصحابہ ج:۱ ص:۱۸۴[۵] میں ہے کہ حضرت تمیم داریؓ کے اصرار پر حضرت عمرؓ نے ان کو اجازت دے دی تھی کہ جمعہ کے دن اس سے قبل کہ میں خطبہ کے لئے آؤں، تقریر کرسکتے ہو۔

مستدرک حاکم اور اصابہ میں ذکر کردہ ان واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ بعض صحابہ کرامؓ کا معمول خطبۂ جمعہ سے پہلے تقریر و وعظ کہنے کا تھا۔

اور یہ بھی صحیح احادیث مبارکہ سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زوالِ شمس کے بعد جلد نمازِ جمعہ ادا کرلیتے تھے اور یہی طریقہ خلفائے راشدینؓ کا تھا کہ نمازِ جمعہ زوال کے بعد جلد پڑھی جاتی تھی۔

صحیح بخاری میں ہے: عن أنس بن مالکؓ أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یصلی

---

(۱) وفی المستدرک علی الصحیحین، کتاب معرفۃ الصحابۃ ج:۳ ص:۵۸۲ (طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت) عن عاصم بن محمد عن أبیہ قال: رأیت أبا ھریرۃ یخرج یوم الجمعۃ فیقبض علی رمانتی المنبر قائمًا ویقول: حدثنا أبو القاسم رسول اللہ الصادق المصدوق صلی اللہ علیہ وسلم فلا یزال یحدث حتی اذا سمع فتح باب المقصورۃ لخروج الامام للصلوۃ جلس، ھذا حدیث صحیح الاسناد .... الخ.

(۲) دیکھئے حاشیہ نمبر۱۔

(۳) راہِ سنت ص:۳۰۱ (طبع نصرۃ العلوم گوجرانوالہ)۔

(۴) دیکھئے مستدرک حاکم، کتاب الجمعۃ ج:۱ ص:۴۲۴، ۴۲۵ (طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت).

(۵) ان روایات کے حوالہ وتفصیل کے لئے راہِ سنت ص:۳۰۱ (طبع نصرۃ العلوم گوجرانوالہ) مؤلفہ حضرت مولانا سرفراز صفدر صاحب دامت برکاتہم ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر)

الجمعة حين الشمس وعنه أيضًا قال: نبكر بالجمعة ونقيل بعد الجمعة. (ج:۱ ص:۱۲۳)[۱] وفي مصنف لعبد الرزاق (ج:۳ ص:۱۸۵)[۲] عن عطاء قال: بلغني أن عثمان كان يجمع ثم يقيل الناس بعد الصلوٰة. وفي مصنف لابن أبي شيبة (ج:۲ ص:۱۰۶)[۳] أخبرنا محمد بن سعد الأنصاري عن أبيه قال: كنا نجمع مع عثمان بن عفان ثم نرجع فنقيل. وفيه أيضًا (ج:۲ ص:۱۰۸)[۴] عن أبي رزين قال: كنا نصلي مع عليؓ الجمعة فأحيانًا نجد فيئًا وأحيانًا لا نجده.

اور فقہائے کرام کی عبارات سے بھی راجح یہی معلوم ہوتا ہے۔

وفي الشامية لٰكن جزم في الاشباه من فن الأحكام أنه لا يسن لها الابراد وفي جامع الفتاویٰ لقارئ الهداية قيل انه مشروع لأنها تؤدى في وقت الظهر وتقوم مقامه وقال الجمهور ليس بمشروع لأنها تقام بجمع عظيم فتأخيرها مفض الى الحرج ولا كذٰلك الظهر وموافقة الخلف لأصله من كل وجه ليس بشرط. (ج:۱ ص:۳۶۷)[۵]۔

اب یہ تو ظاہر ہے کہ جب تک اذانِ اوّل جس کی ابتداء حضرت عثمانؓ کے زمانے میں ہوئی ہے، اس وقت تک تو یہ تقریر اور وعظ یقیناً اذان اور خطبے سے پہلے ہی ہوتی تھی کیونکہ اذانِ ثانی اور خطبے کے درمیان تقریر و وعظ کی نفی صراحۃً اُوپر کی روایات سے ہو رہی ہے، ان میں تصریح ہے کہ جب امام خطبے کے لئے آتا تھا تو یہ تقریر و وعظ موقوف کردیا جاتا تھا، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس زمانے میں جمعہ میں تبکیر کا لحاظ بھی بہت تھا، اکثر لوگ جمعہ میں تبکیر کی فضیلت حاصل کرنے کے لئے صبح سے ہی مسجد میں آجاتے تھے، تو ان کے لئے وعظ و تقریر اذان سے پہلے ہی مناسب تھی، لیکن جب لوگوں میں سستی ہوئی تو اذانِ اوّل، زوال کے وقت لوگوں کو وقتِ جمعہ بتلانے کے لئے شروع کی گئی تو اَب کہ جب زوال کے وقت اذانِ اوّل کی ابتداء زوراء پر ہوئی اور اذانِ ثانی عند المنبر خطبے سے قبل ہونے لگی تو معلوم نہیں اس وقت یہ تقریر و وعظ اذان علی الزوراء سے پہلے ہوتی تھی یا بعد میں؟

لوگوں کے تکاسل اور سستی پر نظر کرتے ہوئے تو بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ تقریر و وعظ اذان علی الزوراء کے بعد ہوتی ہوگی کہ اب تبکیر کی فضیلت کی تحصیل پر لوگ اتنے حریص نہیں رہے تھے

---

(۱) (طبع قديمى كتب خانه).

(۲) مصنف عبدالرزاق باب وقت الجمعة ج:۳ ص:۱۷۵ (طبع المكتب الاسلامي بيروت).

(۳) مصنف ابن أبي شيبة باب من كان يقيل بعد الجمعة ويقول هي أول النهار رقم الحديث: ۵۱۲۳ ج:۱ ص:۴۴۴ (طبع مكتبة الرشد، رياض).

(۴) مصنف ابن أبي شيبة باب من كان يقول وقتها زوال الشمس وقت الظهر رقم الحديث: ۵۱۴۴ ج:۱ ص:۴۴۵ (طبع مكتبة الرشد، رياض).

(۵) (طبع ايچ ايم سعيد).

کہ اذان سے پہلے خود بخود جمع ہوجاتے ہوں، اس لئے ان کو جمع کرنے اور وقتِ جمعہ کے ایذان کے لئے ہی تو یہ اذان علی الزوراء مشروع ہوئی۔

جب لوگوں کا اجتماع اذان کے بعد ہی ہوتا ہو تو پھر اجتماع سے پہلے تقریر و وعظ کا کوئی فائدہ متصوّر نہیں ہے اور اذان سے پہلے اجتماع کا معمول جب زمان خیرالقرون میں کم ہوگیا تھا تو اَب اس کے لئے لوگوں کو تیار کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہوگا۔

اس لئے ''البلاغ'' کی یہی تجویز متعین اور سلف کے عمل کے موافق ہے کہ ''اذانِ اوّل کے فوراً بعد تقریر شروع ہوجائے اور مختصر تقریر کے بعد خطبے کے لئے اذان دی جائے اور پھر خطبہ اور نماز پڑھ لی جائے۔'' (۵۳)

دُوسری تجویز کہ ''اذانِ اوّل تقریر کے فوراً بعد ہو اور اس کے بعد صرف اتنا وقت ہو کہ جو لوگ ابھی مسجد میں نہیں آئے وہ مسجد میں آکر سنتیں پڑھ سکیں، اور اس کے بعد اذانِ ثانی اور خطبہ و نماز ہو''، یہ طریقہ علاوہ اس کے کہ معروف نہیں اور اس پر ہر جگہ اور ہر مسجد کے لوگوں کو جمع کیا جانا مشکل ہے، اذانِ اوّل سے پہلے لوگوں کا مسجد میں آنا اس حرص اور دُنیا میں انہماک کے زمانے میں ازبس دُشوار ہے، سلف کے معمول کے بھی خلاف معلوم ہوتا ہے، اور اذانِ اوّل کی مشروعیت سے جو ایذان اور جمعہ کی دعوت تھی اس کے بھی خلاف ہے۔

جمعہ کے لئے اصل داعی اذان ہی ہے، اور ''اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ'' پر ہی ''فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللہِ'' مرتب ہے، اس تجویزِ ثانی میں اصل داعی وعظ و تقریر ہوگی، لوگ اس کے لئے جمع ہوں گے پھر اس صورت میں تقریر و وعظ کا اذانِ اوّل کے ساتھ اتصال ہوگا، جو معمولِ سلف کے خلاف ہے، ان کا معمول تقریر و وعظ کا اذانِ خطبہ سے پہلے اور اس کے ساتھ اتصال کا تھا، پھر اس صورت میں اذان کا اپنے اصل وقت سے مؤخر کرنا ہے کیونکہ اس کا اصل وقت ''عند الزوال'' ہے، اس تجویز میں پہلے تقریر ہوگی اس کے بعد اذانِ اوّل ہوگی، اذانِ اوّل کو اپنے وقت زوال پر ہی کہنا چاہئے، اس کو اپنی جگہ سے ہٹانا نہیں چاہئے، جمعہ کی اذانِ اوّل کا وقت زوال سے متصل بعد ہے، اسی پر عملی توارث چلا آرہا ہے، کتبِ حدیثیہ و فقہیہ میں بھی اس کی صریح موجود ہے۔

المغنی لابن قدامہ میں ہے:-

۱:-ویبدأ وجوب السعی الیھا .... عند الحنفیة بالأذان الأوّل عند الزوال۔ (بحوالہ الفقہ الاسلامی وأدلّتہ ج:۲ ص:۲۶۲)۔[1]

---

(۱) (طبع دار الفکر).

حنفیہ کے نزدیک جمعہ کے لئے سعی کا وجوب زوال کے وقت اذانِ اوّل سے شروع ہوتا ہے۔

۲:- مجمع الأنہر شرح ملتقی الأبحر میں ہے: (ویجب السعی وترک البیع بالأذان الأوّل) عقیب الزوال. (ج:۱ ص:۱۷۱)۔[۱]

جمعہ کے لئے سعی اور ترکِ بیع، زوال کے بعد اذانِ اوّل سے واجب ہوتی ہے۔

۳:- فتح الباری میں علامہ ابنِ حجرؒ فرماتے ہیں:-

وتبین بما مضیٰ أن عثمان أحدثہ لاعلام الناس بدخول وقت الصلوٰۃ. (ج:۲ ص:۳۹۴)۔[۲]

سابقہ کلام سے ظاہر ہوا کہ حضرت عثمانؓ نے پہلی اذان اس لئے شروع کی کہ لوگوں کو نماز کے وقت کے شروع ہونے کی اطلاع ہوجائے۔

۴:- معارف السنن میں مولانا محمد یوسف بنوریؒ لکھتے ہیں:-

وبالجملۃ فھٰذا الأذان کان قبل التأذین بین یدی الخطیب وکان فی أول وقت الظھر متصلًا بالزوال. (ج:۴ ص:۳۹۶)۔[۳]

اذانِ اوّل خطیب کے سامنے اذان سے پیشتر اور ظہر کے اوّل وقت میں زوال کے ساتھ متصل ہوتی تھی۔ (از ''انوارِ مدینہ'' لاہور)

مذکورہ بالا حوالہ جات میں فتح الباری کی عبارت سے واضح ہے کہ اذانِ اوّل کی مشروعیت کی غرض ہی یہ بتلائی گئی ہے کہ لوگوں کو نمازِ جمعہ کے داخل ہونے کی اطلاع ہوجائے، اور دُوسرے حوالوں میں بھی اس اذان کو ''عند الزوال''، ''عقب الزوال'' کے ساتھ مقید کیا گیا ہے، جس سے واضح ہو رہا ہے کہ اس اذان کا اصل وقت زوال کے فوراً بعد متصل ہی ہے، کیونکہ عرف میں ''عند'' اور ''عقب'' کو گھنٹے کے بعد کے لئے استعمال نہیں کیا جاتا، اور علامہ بنوریؒ نے تو ''فی أوّل وقت الظھر متصلًا بالزوال'' لکھ کر کسی دُوسرے احتمال کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔

اس لئے جن مساجد میں اذانِ اوّل کو اس کے اصل وقت سے مؤخر کر کے کہنے کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے، اس کو ختم کردینا ضروری ہے، کیونکہ یہ عمل توارث اور تصریحاتِ سلف کے خلاف ہونے کے ساتھ اس اذان کی غرضِ مشروعیت کے بھی خلاف ہے، کما مرّ۔

اس لئے پہلی تجویز پر عمل کرنا چاہئے، اذانِ اوّل ظہر کے وقت شروع ہوتے ہی کہہ دی جایا

---

(۱) مجمع الأنہر ج:۱ ص:۱۵۳ (طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت).
(۲) (طبع دار نشر الکتب الاسلامیہ لاہور).
(۳) (طبع ایچ ایم سعید).

کرے اور پندرہ بیس منٹ کا وقفہ نمازیوں کے مسجد میں آنے اور وضو وغیرہ کے لئے مختص کردینے کا اعلان کردیا جائے، اس کے بعد آدھا گھنٹہ مختصر ضروری وقتی مسائل پر مشتمل وعظ ہوجایا کرے، پھر اذانِ ثانی، خطبہ اور نماز ہوجایا کرے، لمبی چوڑی تقریروں اور بے ضرورت مضامین بیان کرنے کا جو رواج ہوگیا ہے اس کی اصلاح کرنے کی طرف توجہ کرنے اور توجہ دِلانے کی ضرورت ہے، نہ یہ کہ اصل وعظ و تقریر ہی کو بند کردیا جائے یا عملِ توارثِ سلف سے ہٹ کر نیا طریقہ جاری کیا جائے۔

آج کل تعلیم یافتہ طبقہ اور مغربی تہذیب کا دِلدادہ گروہ چاہتا ہے کہ ہر ہفتے جو کلمۂ خیر تمام مسلمانوں کے کانوں میں خطبۂ جمعہ سے پہلے پڑ جاتا ہے اس کا موقع نہ رہے، حالانکہ ان مواعظ سے بہت بڑے طبقے کی اصلاح ہو رہی ہے اور بکثرت مسلمان اس سے استفادہ کرکے اپنے عقائد و اعمال کی اصلاح کرتے ہیں اور یہ بھی ہفتہ وار تبلیغ عام اور عوامی اصلاح کا پروگرام ہے، مگر ہر چیز میں حدودِ شریعت کی پابندی اور اعتدال کا لحاظ رکھنا ضروری ہے اور غلو سے احتیاط کرنا لازم ہے، خطباء اور مبلغین و واعظین کو اپنے منصب کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

اگر حدودِ شریعت میں رہتے ہوئے ہمارے خطباء اس پر عمل کریں تو یہ "یتخولنا بالموعظة" پر امتثال کا ذریعہ ہوسکتا ہے، آزاد طبقہ اس کو ختم کرنا چاہتا ہے اور کئی قسم کے اعتراضات سے اس عملِ خیر پر قدغن لگانا چاہتا ہے، اصل یہ ہے کہ وہ علمائے کرام اور خطبائے عظام کی بات سننا گوارا نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ فہمِ سلیم عطا فرمائیں اور ہمیں اپنی اور اصلاح کی توفیق نصیب فرمائیں۔ واللہ اعلم

سیّد عبدالشکور ترمذی عفی عنہ
جامعہ حقانیہ ساہیوال سرگودھا
۱۶رشوال ۱۴۱۵ھ

(یہ تمام تحریرات حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم کی خدمت میں پیش کی گئیں، حضرت دامت برکاتہم نے ان سب تحریرات کے مطالعے کے بعد درج ذیل جواب تحریر فرمایا جس پر شیخ الحدیث حضرت مولانا سحبان محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے بھی تائیدی دستخط فرمائے۔)

جواب:- (از حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم)

الحمدللہ و کفٰی وسلام علی عبادہ الذین اصطفٰی، أما بعد:

احقر نے اس موضوع پر مرسلہ تمام تحریروں کا مطالعہ کیا، ان تمام تحریروں میں احقر اس تحریر سے حرف بہ حرف متفق ہے جو دارالافتاء دارالعلوم کراچی سے جاری ہوئی اور "البلاغ" میں شائع ہوئی۔

خرابی یہاں سے پیدا ہوئی ہے کہ جمعہ کو اس کے وقتِ مستحب (تعجیل) سے بہت مؤخر کردیا گیا ہے، اوّلاً اس بات کی ترغیب کی ضرورت ہے کہ تعجیلِ جمعہ کی سنت کو زندہ کیا جائے۔

دُوسرے اذانِ اوّل اور اذانِ ثانی کے درمیان طویل فصل نہ ہو، جس کی صورت یا تو یہ ہے کہ تقریر زوال سے پہلے کی جائے اور زوال کے متصل بعد اذانِ اوّل اور دس پندرہ منٹ کے بعد اذانِ ثانی ہو، یا پھر تقریر اذانین کے درمیان ہو تو وہ پندرہ، بیس منٹ سے زائد نہ ہو، اور مفصل تقریر جمعہ کے بعد یا زوال سے پہلے ہو، اذانِ اوّل سے پہلے اُردو تقریر کے بارے میں یہ اندیشہ کہ لوگ تقریر سننے نہیں آئیں گے، تجربے سے دُرست ثابت نہیں ہوا۔

جو لوگ تقریر سننا چاہتے ہیں وہ پہلے بھی آجاتے ہیں، اور جو سننا نہیں چاہتے وہ محض اذانِ اوّل کی وجہ سے عموماً نہیں آتے بلکہ اذانِ ثانی کا انتظار کرتے رہتے ہیں اور گنہگار ہوتے ہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۴۱۵/۱۲/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۴۳/۱۷۸ الف)

مذکورہ بالا تحریر ناچیز کی رائے میں دُرست ہے اور دارالعلوم کراچی کے دارالافتاء سے جو فتویٰ جاری ہوا اور "البلاغ" میں شائع ہوا ہے وہ بھی دُرست ہے، البتہ احقر کے نزدیک اذانین کے درمیان وقفہ اگر نصف گھنٹے کا بھی ہوجائے تو مضائقہ نہیں، جس میں بیس پچیس منٹ تقریر اور ۵ منٹ سنتوں کے لئے مل سکتے ہیں، اور لوگوں کے لئے اس میں ان شاء اللہ دُشواری بھی نہیں ہوگی، اور جو گناہ سے بچنا چاہے گا وہ دُشواری کے بغیر بچ سکے گا۔

سحبان محمود　　واللہ اعلم
ناچیز محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ
۱۴۱۵/۱۲/۲۳ھ

﴿فصل فی العیدین﴾
(عیدین کے متعلق مسائل کا بیان)

نمازِ عید کے بعد دُعا مانگی جائے یا خطبے کے بعد؟

سوال:- نمازِ عید کے متصل اگر دُعا نہ مانگی جائے تاکہ ایک ہی دُعا تاخیر سے خطبے کے بعد مانگی جائے تو کیا یہ جائز ہے؟ بعد خطبے کے کچھ وعظ کرکے بعد میں دُعا مانگی جائے تو کوئی قباحت تو نہ ہوگی؟

جواب:- دُعا، نماز کے متصل بعد ہی مسنون ہے، خطبے کے بعد اجتماعی طور سے دُعا مانگنا کہیں سے ثابت نہیں۔[1]

فقط واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۸۷/۱۲/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۵۷/۱۸ الف)

تکبیراتِ تشریق کے بارے میں امامِ اعظمؒ اور صاحبینؒ میں اختلاف کی تحقیق

سوال:- مسئلہ یہ ہے کہ سوال تکبیراتِ تشریق کے بارے میں امام صاحبؒ اور صاحبینؒ کے درمیان اختلاف ہے، اس مسئلے میں مفتیٰ بہ قول امام صاحبؒ کا ہے یا صاحبینؒ کا؟

جواب:- دراصل تکبیرِ تشریق کے سلسلے میں حضرت امام ابوحنیفہؒ اور صاحبینؒ کے درمیان دو مسئلوں میں اختلاف ہے۔ پہلا مسئلہ یہ ہے کہ تکبیرِ تشریق کب تک جاری رہے گی؟ اس میں امام صاحبؒ کا مسلک یہ ہے کہ یومِ عرفہ کی فجر سے یوم النحر کی عصر تک جاری رہے گی۔ اور صاحبینؒ ایامِ تشریق کے آخری دن (یعنی ۱۳؍ ذی الحجہ) کی عصر تک واجب کہتے ہیں۔ اس مسئلے میں تو فقہائے حنفیہ

(۱) دلائل اور تفصیل کے لئے اسی فصل میں صفحہ نمبر ۵۵۲ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر ۳ ملاحظہ فرمائیں۔

کی بھاری اکثریت نے صاحبینؒ ہی کے قول پر فتویٰ دیا ہے۔[۱] اور شاید علامہ ابنِ ہمامؒ[۲] اور صاحبِ بدائع[۳] کے سوا معروف فقہائے حنفیہ میں سے کسی نے بھی اس مسئلے میں امام صاحبؒ کے قول پر فتویٰ نہیں دیا۔ اور خود حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ بھی اس مسئلے میں جمہور فقہائے حنفیہ کے مطابق اسی کے قائل ہیں کہ اس مسئلے میں فتویٰ صاحبینؒ کے قول پر ہے۔[۴] اور چونکہ اُمت کا متوارث عمل بھی اسی پر چلا آتا ہے، اور ائمۂ ثلاثہ بھی اسی کے قائل ہیں اس لئے اس مسئلے میں عمل صاحبینؒ ہی کے قول پر کرنا چاہئے۔

البتہ دُوسرا مسئلہ یہ ہے کہ تکبیرِ تشریق کن لوگوں پر واجب ہوتی ہے؟ اس میں صاحبینؒ کا قول یہ ہے کہ تکبیر ہر اس شخص پر واجب ہے جس پر نماز فرض ہے، لہٰذا منفرد، مرد، عورت، مسافر اور گاؤں والوں سب پر تکبیر واجب ہے۔ لیکن امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ صرف مقیم اہلِ شہر پر جماعتِ مستحبہ میں واجب ہے، لہٰذا منفرد، مرد عورت پر، عورتوں کی جماعت پر، مسافروں پر (جبکہ ان کے ساتھ کوئی مقیم نہ ہو) اور گاؤں والوں پر تکبیر واجب نہیں ہے۔ اس مسئلے میں فقہائے حنفیہ کی ترجیحات مختلف ہیں، بعض فقہاء مثلاً صاحبِ بحر، صاحبِ سراج وہاج اور صاحبِ جوہرہ نے اس مسئلے میں بھی صاحبینؒ کے قول پر فتویٰ دیا ہے۔ (البحر الرائق ج:۲ ص:۱۶۶) اور بعض نے اس مسئلے میں امام صاحبؒ کے قول کو اختیار کیا ہے، اور بعض فقہاء کی عبارتیں دونوں کو محتمل ہیں۔ اس معاملے میں حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ کی تحقیق یہ ہے کہ فتویٰ امام صاحب کے قول پر ہے،[۵] کیونکہ وہ روایۃً و درایۃً اَقویٰ ہے، بہشتی گوہر میں بھی اس کو اختیار کیا ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ اگر مسافر اور عورت بھی کہہ لے تو بہتر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت مولانا عثمانیؒ کے دلائل قوی ہیں بالخصوص حضرت علیؓ کی حدیث: "لا جمعة و لا تشریق و لا صلٰوة الفطر و الأضحی الا فی مصر جامع"۔[۶] سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ دُوسری جانب بھی دلائل ہیں، اور بعض فقہاء نے اس کو ترجیح دی ہے، اس لئے اگر کوئی اس پر عمل کرے

---

(۱) وفی الدر المختار قبیل باب الکسوف ج:۲ ص:۱۸۰ .... الی عصر الیوم الخامس آخر أیام التشریق وعلیه الاعتماد. وفی الشامیة (قوله وعلیه الاعتماد) هذا بناء علی أنه اذا اختلف الامام وصاحباه فالعبرة لقوة الدلیل وهو الأصح .... وبه اندفع ما فی الفتح من ترجیح قوله هنا ورد فتوی المشائخ بقولهما بحر.

(۲) دیکھئے: فتح القدیر ج:۲ ص:۴۸، ۴۹۔

(۳) دیکھئے: بدائع الصنائع ج:۱ ص:۱۹۵، ۱۹۶ (طبع ایچ ایم سعید)۔

(۴) دیکھئے: اعلاء السنن ج:۸ ص:۱۲۴، ۱۲۵ (طبع ادارة القرآن کراچی)۔

(۵) راجع اعلاء السنن أبواب العیدین، باب تکبیرات التشریق وانها لا تجب الا علی أهل المصر ج:۸ ص:۱۲۸، ۱۲۹ (طبع ادارة القرآن کراچی)۔

(۶) اعلاء السنن ج:۸ ص:۱۲۷ (طبع ادارة القرآن کراچی)۔ (محمد زبیر حق نواز)

تو اس پر بھی نکیر دُرست نہیں، بالخصوص جبکہ بہشتی گوہر نے عدمِ وجوب کی تقدیر پر بھی اسے بہتر کہا ہے۔

واللہ اعلم

۱۴۰۶/۱۱/۳۰ھ

(فتویٰ نمبر ۱۷۲۲/۳۷ د)

۱:- عرب امارات میں عید پڑھ کر آنے والے کے لئے پاکستان میں دوبارہ نمازِ عید پڑھنے کا حکم
۲:- اور ایسا شخص شوال کے نفلی روزے کب سے شروع کرے؟

سوال:- جناب گرامی قدر.......................السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مشکور ہوں گا اگر مندرجہ ذیل سوالات کا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جواب دیں، جوابی لفافہ شامل ہذا ہے۔

۱:- سائل، ماہِ رمضان میں عرب امارات گیا تھا، وہاں عید کا چاند ایک دن پہلے نظر آیا (یا عید ایک دن پہلے کی گئی)، عید کی نماز پڑھ کر رات کو کراچی (بذریعہ ہوائی جہاز) پہنچا، کراچی میں اگلے دن عید تھی۔ پوچھنا یہ ہے کہ آیا سائل کو یہاں بھی عید کی نماز پڑھنی ضروری تھی یا نہیں؟

۲:- دُوسری بات یہ ہے کہ کہا جاتا ہے کہ رمضان ختم ہونے کے بعد چھ روزے رکھے جائیں تو اس کا بہت ثواب ہے، اور پورے سال روزے رکھنے کا ثواب ملتا ہے۔ پوچھنا یہ ہے کہ سائل نے عید کی نماز امارات میں ادا کی تھی، اب کراچی میں اسے یہ چھ دن کے روزے کراچی میں عید کے دن سے رکھنے چاہئیں یا کراچی میں عید کا دن گزار کر ابتداء کرے؟ کہا جاتا ہے کہ عید کے دن صرف شیطان روزہ سے ہوتا ہے۔

جواب ۱:- صورتِ مسئولہ میں سائل کو کراچی پہنچ کر بھی عید کی نماز میں شامل ہونا چاہئے، اور نمازِ عید ہی کی نیت کرنی چاہئے، کیونکہ اس صورت کا کوئی صریح حکم تو فقہ کی کتب میں نہیں ملا، لیکن اُصول یہ ہے کہ آدمی جس ملک یا شہر میں ہو اسی کے اَحکام کا اعتبار ہوتا ہے۔ لہٰذا کراچی پہنچنے کے بعد اس کے لئے یہ عید ہی کا دن ہے، اس بات کا لحاظ کیا جائے تو عید کی نماز اس کے لئے ضروری ہے۔ لیکن دُوسری طرف وہ ایک مرتبہ عید کی نماز پڑھ چکا ہے، اس کا لحاظ کیا جائے تو ضروری نہیں۔ دونوں احتمالات پر عمل کی محتاط شکل یہی ہے کہ وہ عید کی نماز میں بہ نیتِ عید شامل ہوجائے، تاکہ واجب ہونے کی صورت میں واجب ادا ہوجائے، ورنہ وہ نفل بن جائے گی۔

۲:- شش عید کے روزوں کا متصل ہونا ضروری نہیں[۱]، لہٰذا وہ روزے کراچی کے لحاظ سے ۲ رشوال سے شروع کرے، اس میں کوئی شبہ نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۲۲/۴/۴ھ
(فتویٰ نمبر ۷۲/۴۸۳)

حنفیوں کا غیر مقلد کی اقتداء میں نمازِ عید پڑھنے کا حکم

سوال:- ایک میدان میں پہلے سے مغربی جانب اہلِ حدیث نمازِ عید پڑھتے ہیں، اب حنفی بھی ایک مشرقی جانب پڑھنے لگے ہیں، اب حنفی کہتے ہیں کہ ہمارے پیچھے پڑھو، اور وہ کہتے ہیں کہ چونکہ ہمارے ہاں بارہ تکبیریں پڑھی جاتی ہیں اور تمہارے ہاں چھ تکبیریں ہوتی ہیں، لہٰذا تمہارے پیچھے نماز نہیں ہوتی۔ کیا حنفی ان کے پیچھے نماز پڑھ سکتے ہیں؟ جبکہ باہمی جھگڑے ختم بھی نہ ہوسکیں۔

جواب:- نمازِ عید میں جس تعارض کا ذکر کیا گیا ہے وہ واقعۃً مناسب نہیں، چونکہ اہلِ حدیث حضرات عرصے سے وہاں نماز پڑھتے چلے آرہے ہیں اس لئے حنفی حضرات کو چاہئے کہ وہ کسی دُوسری جگہ نماز پڑھیں یا کچھ وقفہ دے کر اسی میدان کے کسی دُوسرے حصے میں نماز ادا کرلیں، اور اگر یہ صورت ممکن نہ ہو تو باہمی نزاع سے بچنے کے لئے بارہ تکبیروں کے ساتھ نمازِ عید ادا کریں، اگرچہ حنفیہ کے نزدیک خلافِ اَولیٰ ہے۔

ولو زاد تابعه الى ستة عشر لأنه مأثور، وقال الشامي في اخر "مطلب تجب طاعة الامام فيما ليس بمعصية" وذكر في البحر ان الخلاف في الأولولية ونحوه في الحلية. (الدر المختار)[۲]۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۱۷ھ

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی بلندشہری

(فتویٰ نمبر ۱۴۳۳/۱۸ الف)

ایک ہی مقام پر عید کی دو جماعتیں کرانے کی دوصورتوں کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلے میں کہ ہم لوگ پاکستان

---

(۱) وفي البحر الرائق كتاب الصوم ج:۲ ص:۲۵۸ (طبع سعيد) ومنه أيضًا صوم ستة من شوال عند ابي حنيفة متفرقًا كان او متتابعًا وعن ابي يوسف كراهته متتابعًا لا متفرقًا، لكن عامة المتاخرين لم يروا به بأسًا .... الخ.

(۲) الدر المختار مع رد المحتار ج ۲ ص:۱۷۲، ۱۷۳ (طبع سعيد) وفي الهندية الباب السابع عشر في صلوٰة العيدين ج:۱ ص:۱۵۱ (طبع رشيديه كوئته) قال محمد رحمه الله في الجامع اذا دخل الرجل مع الامام في صلوٰة العيد وهذا الرجل يرى تكبير ابن مسعود رضي الله عنهما فكبر الامام غير ذلك اتبع الامام الا اذا كبر الامام تكبيرا لم يكبره احد من الفقهاء فحينئذ لا يتابعه كذا في المحيط. (محمد زبیر حق نواز)

اسٹیل ملز کراچی لیبر شفٹ میں کام کرتے ہیں، اور ایک شفٹ کی ڈیوٹی سے فراغت کے نصف گھنٹے بعد دُوسری شفٹ ڈیوٹی پر حاضر ہوتی ہے، اس مناسبت سے ہمارے ہاں عیدین کی نمازیں بھی دو مرتبہ ایک ہی جگہ ادا کی جاتی ہیں، جس کی صورت مندرجہ ذیل ہے:-

۱:- ایک ہی جگہ میں ایک مسجد میں دو مرتبہ صلوٰۃِ عید نصف، نصف گھنٹے اور وقفے کے بعد ایک امام کی اقتداء میں ادا کی جاتی ہے، جبکہ امام ایک ہے اور مقتدی پہلی صلوٰۃ میں ایک شفٹ کے لوگ ہوتے ہیں اور دُوسری مرتبہ اقتداء کرنے والے دُوسری شفٹ کے لوگ ہوتے ہیں۔

۲:- ایک ہی جگہ اور ایک مسجد میں دو مرتبہ جماعتِ عیدین اس طرح ہوتی ہے کہ اوّل مرتبہ پہلی شفٹ ایک امام کی اقتداء میں اور دُوسری شفٹ دُوسرے امام کی اقتداء میں ادا کرتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ایک جگہ اور ایک مقام میں صلوٰۃِ عیدین کی جماعتِ اوّل اور جماعتِ ثانیہ ایک ہی امام کی اقتداء میں جائز ہے یا ناجائز؟ جبکہ پہلی صورت میں مقتدی تبدیل ہوگئے لیکن امام ایک ہی ہے، اور دُوسری صورت میں امام بھی مختلف اور مقتدی بھی مختلف ہیں، لیکن عیدگاہ و جائے نماز ایک ہے، تو کیا ایک عیدگاہ میں جماعتِ ثانیہ سے صلوٰۃِ عیدین جائز ہوگی یا نہیں؟ اور ان دونوں میں سے کون سی نماز صحیح ہوگی؟

جواب:- مسئولہ دو صورتوں میں پہلی صورت یعنی ایک ہی امام کے پیچھے دو الگ الگ جماعتیں بالکل جائز نہیں اور اس صورت میں دُوسری جماعت کے لوگوں کی نماز بھی نہیں ہوگی[۱]، اور دُوسری صورت بھی بغیر شدید اور ناگزیر مجبوری کے اختیار کرنی دُرست نہیں[۲]، لہٰذا یا تو ایک ہی امام کے پیچھے تمام افراد کے بیک وقت نماز ادا کرنے کا انتظام کیا جائے یا اگر دو جماعتیں کسی وجہ سے ناگزیر ہوں تو دو الگ الگ مسجدوں یا عیدگاہوں میں دو الگ الگ اماموں کے پیچھے ادا کی جائیں۔

واللہ اعلم

۱۴۰۶/۱۳/۱۲ھ

(فتویٰ نمبر ۳۷/۱۷۸۷ د)

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۵۷۹، ۵۸۰ (ولا یصح اقتداء) .... مفترض بمتنفل .... الخ.
نیز دیکھئے: فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ج:۵ ص:۲۲۴ (سوال نمبر ۲۶۸۷/۱)۔

(۲) کیونکہ ایک ہی جگہ میں تعدّدِ صلوٰۃِ عید دُرست نہیں۔ وفی البحر الرائق باب العیدین ج:۲ ص:۱۶۲ فاذا فاتت مع امام وامکنه أن یذهب الٰی امام اخر فانه یذهب الیه لأنه یجوز تعددها فی مصر واحد فی موضعین وأکثر اتفاقًا.
نیز دیکھئے: امداد الاحکام ج:۱ ص:۷۴۳۔ (محمد زبیر حق نواز)

جگہ کی تنگی کی بناء پر ایک ہی جگہ عید کی دو جماعتوں کا حکم

سوال:- ایک مسجد میں عیدین کے موقع پر جگہ کی تنگی کی وجہ سے اور مستقل الگ جگہ نہ ہونے کی وجہ سے یا نہ کر سکنے کی وجہ سے عید کی نماز اسی مسجد میں جہاں پہلی جماعت ہوتی ہے، دُوسری جماعت مذکورہ شکایات کی بناء پر جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- جگہ کی تنگی کی بناء پر اگر ایک ہی جگہ عید کی دو جماعتیں کرلی جائیں تو عدمِ جواز کی کوئی وجہ نہیں، حضرت مولانا عبدالحی لکھنویؒ ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں: ''ظاہر عبارات فقہیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تعددِ نمازِ عید مطلقاً جائز ہے، ایک موضع میں ہو یا دو موضع میں، جیسا کہ طحطاویؒ حواشی مراقی الفلاح میں لکھتے ہیں: ولو قدر بعد الفوات مع الامام علی ادراکھا مع غیرہ فعل، للاتفاق علی جواز تعددھا''۔[1] (مجموعۃ الفتاویٰ ج:۱ ص:۳۴۹)۔[2]

واللہ اعلم
۱۴۰۶/۵/۶ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷۰/۳۷ ب)

نمازِ عید کے بعد دُعا ہو یا خطبے کے بعد؟

سوال:- عید الفطر کے دن ایک امام صاحب نے جو کہ عالم بھی ہیں، اثناءِ تقریر میں کہا کہ عیدین کی نمازوں کے سلام پھیرتے ہی دُعا مانگنا سنت ہے، اس بات کی تحقیق میں علم الفقہ دیکھی، اس میں یہ عبارت درج تھی: ''بعد نماز عیدین کے یا بعد خطبے کے دُعا مانگنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب سے منقول نہیں، اگر ان حضرات نے کبھی دُعا مانگی ہوتی تو ضروری نقل کی جاتی، لہٰذا بغرضِ اتباع نہ مانگنا بہتر ہے۔'' (ص:۲۹۰) یہ عبارت مولوی صاحب کی تغلیط کے لئے کافی ہے۔ بہشتی زیور میں اس کے برعکس عبارت مذکور ہے، یعنی ''صحابہ و تابعین سے منقول نہیں، مگر چونکہ ہر نماز کے بعد دُعا مسنون ہے اس لئے عیدین میں بھی دُعا مانگنا مسنون ہوگا'' اس کی وضاحت فرمادیں تاکہ اطمینان ہو۔

جواب:- ان مولوی صاحب نے جو بات کہی ہے وہ صحیح ہے، عیدین میں نماز کے بعد دُعا اجتماعی مسنون ہے، خطبے کے بعد مسنون نہیں، حقیقت وہی ہے جو بہشتی زیور میں لکھی ہے کہ اگرچہ خاص عیدین میں نماز کے بعد دُعا مانگنا روایات سے ثابت نہیں،[3] لیکن چونکہ ہر نماز کے بعد دُعا کرنا ثابت

---

(۱) حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح ص:۲۹۲ (طبع نور محمد کتب خانہ)۔

(۲) مجموعہ فتاویٰ عبدالحی ج:۱ ص:۳۲۷ (طبع ایچ ایم سعید)۔

(۳) عید کے اجتماع میں دُعا کا ذکر بخاری شریف ج:۱ ص:۱۳۴ کی اس روایت میں ملتا ہے۔ قالت أم عطیۃ أمرنا أن نخرج فیخرج الحیض والعواتق وذوات الخدور فیشھدن جماعۃ المسلمین ودعوتھم ویعتزلن مصلاھم ۔لیکن نماز یا خطبے کے بعد کی کوئی تعیین روایات میں نہیں ملتی، لہٰذا دیگر نمازوں پر قیاس کرتے ہوئے نمازِ عید کے بعد ہی دُعا کا موقع معلوم ہوتا ہے جیسا کہ دیگر حضرات اکابرؒ نے بھی یہی لکھا ہے۔ دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۴۰۵ تا ۴۰۷، و امداد المفتیین ص:۴۰۸ (طبع دار الاشاعت) وفتاویٰ دار العلوم ج:۸ ص:۲۳۱، و ج:۵ ص:۲۳۱۔

ہے اس لئے اس میں عیدین بھی شامل ہیں، اور خطبے کے بعد دُعا کرنے کا ثبوت کہیں نہیں ہے اور اکابرِ دیوبند کا معمول بھی یہی رہا ہے، اور بہشتی زیور فقہی اعتبار سے "علم الفقہ" کے مقابلے میں زیادہ مستند اور معتبر کتاب ہے۔ واللہ اعلم

۱۳۹۷/۳/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۳۵۷/۲۸ ب)

نمازِ عید میں تکبیرات چھوڑ کر امام سورۂ فاتحہ شروع کردے تو کیا حکم ہے؟

سوال:- عید الفطر کی نماز میں امام صاحب نے نیت باندھ کر ثناء پڑھ کر الحمد شریف پڑھنا شروع کردیا، اس کے بعد پیچھے سے کسی نے لقمہ دیا، لقمہ ملنے پر امام صاحب نے الحمد شریف کو روک کر دو زائد تکبیریں کہہ کر پھر سے الحمد شریف شروع کی، ایک تکبیر پھر بھی رہ گئی، کیا اس صورت میں نماز ہوئی یا نہیں؟

جواب:- عید کی تکبیراتِ زوائد واجب ہیں، اگر امام بھول جائے اور انہیں چھوڑ کر سورۂ فاتحہ شروع کردے تو جب تک قراءت مکمل نہ ہوئی ہو یاد آنے یا کسی کے لقمہ دینے پر تکبیریں کہنی چاہئیں اور تکبیروں کے بعد قراءت ازسرِنو کرنی چاہئے، لہٰذا امام صاحب نے یہ کام تو صحیح کیا کہ سورۂ فاتحہ روک کر تکبیریں کہیں، لیکن ایک تکبیر چھوڑ دی، قاعدے سے اس پر سجدۂ سہو لازم ہونا چاہئے تھا، لیکن عیدین میں سجدۂ سہو لازم نہیں ہوتا، اس لئے مذکورہ نماز ہوگئی۔

فی رد المحتار: ان بدأ الامام بالقراءة سهوًا فتذكر بعد الفاتحة والسورة يمضى فى صلاته، وان لم يقرأ الا الفاتحة كبّر وأعاد القراءة لزومًا۔ (۱)

وفيه أيضًا: ان العود الى التكبير قبل اتمام القراءة ليس لأجل المستحب الذى هو الموالاة، بل لأجل استدراك الواجب الذى هو التكبير (شامى باب العيدين)۔ (۲)

وفى الدر المختار (والسهو فى صلوٰة العيد والجمعة والمكتوبة والتطوع سواء) والمختار عند المتأخرين عدمه فى الأولين لدفع الفتنة كما فى جمعة البحر واقره المصنف وبه جزم فى الدر (شامى باب سجود السهو)۔ (۳) واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۰/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۲۳۵۳/۲۷ و)

(۱، ۲) رد المحتار ج:۲ ص:۱۷۳ (طبع سعيد).
(۳) رد المحتار ج:۲ ص:۹۲ (طبع سعيد). (محمد زبیر حق نواز عفا اللہ عنہما)

﴿فصل فی المسائل الجدیدۃ والمتفرقۃ المتعلقۃ بالصلوٰۃ﴾
(نماز سے متعلق جدید اور متفرق مسائل کا بیان)

نماز میں اسپیکر کا استعمال

سوال:- احقر کی مسجد میں جمعہ کے دن قریبی خطیب سے شدید آواز تقریر کی سخت مشوش ہے، احبابِ خصوصی کی رائے ہے کہ اگر صرف اندرونِ مسجد کا ہارن استعمال کیا جائے تو تمام نمازیوں کی نماز سکون سے ادا ہوگی۔ ورنہ تمام نمازی خطیب صاحب کی تقریر سے پریشان رہتے ہیں، بعض بزرگانِ دین نماز اور خطبے میں اندرونِ مسجد کا ہارن استعمال کرنا بھی پسند نہیں کرتے، اس لئے احقر بھی نماز اور خطبے میں یہاں آلۂ مکبر الصوت کا استعمال نہ کرتا تھا، لیکن تمام نمازیوں کے اضطراب اور تشویش کے پیشِ نظر آپ سے مراجعت ہے کہ اندرونِ مسجد کے ہارن سے اگر خطبہ اور نمازِ جمعہ ادا کی جائے تو کیا کوئی شرعی قباحت ہے؟ جبکہ احتیاطاً مکبرین کا انتظام بھی رکھا جائے کہ اگر خدانخواستہ بجلی فیل ہو تو نماز میں خلل نہ ہو، اور آلۂ مکبر الصوت وہ ہے جو بٹن کے پاس لگالیتے ہیں۔ والسلام

(المستفتی: مولانا) حکیم محمد اختر (صاحب مدظلہم)
خانقاہِ امدادیہ اشرفیہ، گلشن اقبال کراچی

جواب:- نماز میں آلۂ مکبر الصوت کا استعمال جائز ہے، اور اس سے نماز فاسد بھی نہیں ہوتی، تاہم اگر کوئی بعض علماء کے اختلاف کی بناء پر احتیاط کرے تو اچھا ہے، لیکن استعمال کرنے والوں پر نکیر نہ کرنی چاہئے، بشرطیکہ وہ حدود کے اندر استعمال کرتے ہوں۔ مسئلے کی علمی تحقیق حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ کی کتاب ''آلاتِ جدیدہ'' میں موجود ہے۔[1]

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اندر کا مکبر الصوت کھولنے میں شرعی قباحت نہیں ہے۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی
۱۴۰۵/۵/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۳۸/۸۰۹ ج)

---

(۱) اور خود حضرت والا دامت برکاتہم کا تفصیلی فتویٰ آگے آرہا ہے۔ (مرتب عفی عنہ)

کیا لاؤڈ اسپیکر پر نماز ہوجاتی ہے؟

سوال:- آلۂ مکبّر الصوت (لاؤڈ اسپیکر) پر فرض نماز جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو کیوں؟ کریم آباد بلاک نمبر۴ کی مسجد میں یہ مسئلہ انتہائی نزاعی صورت اختیار کرگیا ہے، دو گرہوں میں شدید کشیدگی ہے۔

جواب:- لاؤڈ اسپیکر پر نماز فرض جائز ہے اور بلاکراہت ہوجاتی ہے، البتہ بہتر یہ ہے کہ ضرورت کے بغیر لاؤڈ اسپیکر استعمال نہ کیا جائے، اس مسئلے کے تفصیلی دلائل مفتیٔ اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے رسالے ''آلۂ مکبّر الصوت'' میں موجود ہیں، یہ رسالہ ''آلاتِ جدیدہ'' میں طبع ہوا ہے، تفصیل کے لئے اس کو دیکھ لیا جائے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۰/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۴۲۱/۲۷ ہ)

کیا لاؤڈ اسپیکر پر نماز پڑھنے میں زیادہ ثواب ہے؟

سوال:- کیا جہری نمازیں لاؤڈ اسپیکر پر پڑھنا زیادہ ثواب ہے جبکہ آواز دُور دُور تک جاتی ہے؟

جواب:- جب تک ضرورت نہ ہو نماز بغیر لاؤڈ اسپیکر کے پڑھنی چاہئے، لاؤڈ اسپیکر پر نماز کا جواز تو ضرورت کے حالات میں ہے، بلاوجہ لاؤڈ اسپیکر کا استعمال پسندیدہ نہیں، بالخصوص جبکہ اس سے دُور دُور آواز جاتی ہو جہاں لوگ نیند یا دُوسرے کاموں میں مشغول ہوں، تو اس کے استعمال کی کراہت اور بڑھ جاتی ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۹/۹ھ
(فتویٰ نمبر ۹۲۲/۲۸ ج)

مسجد میں خانۂ کعبہ و مسجدِ نبوی کی تصاویر آویزاں ہوں تو ایسی صورت میں نماز کا حکم

سوال:- اکثر مسجدوں میں کعبہ شریف اور مدینہ منورہ کی تصویریں آویزاں ہوتی ہیں، اس حالت میں نماز میں کوئی نقص تو نہیں ہوگا؟

جواب:- نماز تو ہوجاتی ہے، لیکن اس کی تصویریں نمازی کے سامنے ہونا کچھ بہتر نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۶ھ

---

(۱) اور خود حضرتِ والا دامت برکاتہم کا تفصیلی فتویٰ آگے آرہا ہے۔ (مرتب عفی عنہ)

مساجد میں لاؤڈ اسپیکر کے شرعی اَحکام

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین کہ آلۂ مکبّر الصوت (لاؤڈ اسپیکر) تراویح کے لئے اس قدر تیز استعمال ہوتا ہے کہ پورے محلے میں اس کی آواز پہنچ جاتی ہے، جس میں حسبِ ذیل قباحتیں معلوم ہوتی ہیں:-

۱:- محلے کی خواتین کو نماز ادا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

۲:- محلے کے مریض اور ضعفاء جن کو علاجاً جلد سونا ضروری ہو، نہیں سو سکتے۔

۳:- تلاوت کو ادب سے سماعت کا اہتمام محلّہ والوں سے نہیں ہوتا۔

۴:- سجدۂ تلاوت کا اگر وجوب لاؤڈ اسپیکر سے ہوتا ہے تو اہلِ محلّہ کے ضعفاء اور خواتین پر سجدۂ تلاوت واجب کرنا اور ان کی طرف سے اس کی ادائیگی کے اہتمام کا فقدان یا مشکل ہونا۔

اس سلسلے میں شریعت کے اَحکام سے ازراہِ کرم مطلع فرمائیے، بینوا توٴجروا۔

العارض

(مولانا) حکیم محمد اختر عفا اللہ عنہ

مدرسہ اشرف المدارس، گلشن اقبال کراچی

جواب:- تراویح میں لاؤڈ اسپیکر اس قدر اُونچی آواز سے استعمال کرنا کہ جس سے سوال میں مذکورہ قباحتیں لازم آتی ہوں، جائز نہیں۔ چنانچہ فقہائے کرامؒ نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ ذکر اللہ اتنی آواز سے کرنا کہ جس سے کسی کی عبادت یا نیند میں خلل آتا ہو صحیح نہیں، نیز مشکوٰۃ شریف میں حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات باہر تشریف لائے تو دیکھا کہ حضرت عمرؓ نماز میں ہیں اور بہت **بلند آواز سے تلاوت فرما رہے** ہیں، پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ وہ بھی نماز میں ہیں اور **آہستہ** آواز سے تلاوت فرما رہے ہیں، پھر جب دونوں حضرات حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے فرمایا کہ: میں تمہارے پاس سے گزرا تو تم نماز میں تھے اور آہستہ تلاوت کر رہے تھے، حضرت ابوبکر صدیقؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! (صلی اللہ علیہ وسلم) میں نے اس ذات کو سنا دیا ہے جس سے میں سرگوشی کر رہا تھا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ: میں تمہارے پاس سے گزرا تو تم نماز میں تھے اور زور سے تلاوت کر رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ: میں اونگھنے والوں کو بیدار کر رہا تھا اور شیطان کو دھتکار رہا تھا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابوبکرؓ! تم اپنی آواز (کچھ) بلند کرو۔ اور حضرت

عمرؓ سے فرمایا: اپنی آواز کچھ پست کرو۔ (مشکوٰۃ شریف ج:۱ ص:۱۰۷، باب ما یقول اذا قام اللیل)۔[1]

اس حدیث شریف سے بھی معلوم ہوگیا کہ اتنی بلند آواز سے تلاوت کرنا کہ جس سے بیماروں کے آرام اور خواتین کی نمازوں میں خلل ہوتا ہو صحیح نہیں، اس سے اجتناب کرنا ضروری ہے، اور لاؤڈ اسپیکر کا استعمال بوقتِ ضرورت اور بقدرِ ضرورت کرنا چاہئے۔

قال الشامی: وفی حاشیة الحموی عن الامام الشعرانی أجمع العلماء سلفًا وخلفًا علی استحباب ذکر الجماعة فی المساجد وغیرها الا أن یشوش جهرهم علی نائم أو مصل أو قارئ. اھ (ج:۱ ص:۴۴۴)۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی
۲۱ر ذی الحجہ ۱۴۰۷ھ[3]

نماز میں (آلۂ مکبّر الصوت) اسپیکر کے استعمال کی شرعی حیثیت

سوال:- نومبر ۱۹۹۰ء کے رائے ونڈ کے تبلیغی اجتماع میں شرکت کی، ایک چیز نے مجھ کو بڑا مکدّر کیا، وہ تھا نماز کے دوران لاؤڈ اسپیکر کا عدمِ استعمال۔ اس سے اتنی خرابیاں پیدا ہوئیں کہ لاکھوں نہیں تو ہزاروں لوگوں کی نمازیں خراب ہوئیں، تین دن تک اکثر لوگوں کے سامنے زیادہ تر ایک ہی موضوع زیرِ بحث رہا کہ بھائی میں سجدے میں تھا، اور میں رُکوع میں تھا، اور پتہ نہیں کہ امام صاحب اس وقت کس حالت میں تھے؟ کافی لوگوں نے کئی کئی اوقات کی نمازیں لوٹائیں، مزید یہ کہ خشوع جو نماز کی جان ہے سرے سے مکبّر کی آواز نہ پہنچنے کی وجہ سے مفقود ہوجاتا تھا، میرے سمیت اکثر حضرات سجدہ اور رُکوع میں کان لگائے رہتے کہ تکبیر سن سکیں۔ اکثر حضرات کو امام سے پہلے سر اُٹھا کر دیکھتے بھی دیکھا گیا، وہ یہ دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ اگلی صف کا کیا حال ہے؟ اتنے بڑے اجتماع میں لاؤڈ اسپیکر اگر دورانِ نماز استعمال کرلیا جائے تو کیا نماز زیادہ بہتر طریقے پر ادا نہیں ہوگی؟ کیا کچھ شرعی رُخصت اس سلسلے میں نہیں ہے؟ اگر ہے تو اس سے اجتناب کیوں؟

جواب:- نماز میں لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کے مسئلے پر مفتیٔ اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ کا مستقل رسالہ ''آلۂ مکبّر الصوت کے شرعی احکام'' شائع ہوچکا ہے،[4] جس میں حضرت

---

(۱) (طبع قدیمی کتب خانه).
(۲) رد المحتار فی رفع الصوت بالذکر ج:۱ ص:۶۶۰ (طبع سعید).
(۳) یہ فتویٰ ''البلاغ'' کے شمارہ محرم الحرام ۱۴۰۷ھ سے لیا گیا ہے۔ (از مرتب)
(۴) ''آلاتِ جدیدہ کے شرعی احکام''۔

قدس سرہ نے یہ تحقیق فرمائی ہے کہ آلۂ مکبّر الصوت پر نماز پڑھانے سے نماز بلا کراہت ہوجاتی ہے، اور پاکستان و ہندوستان کے دُوسرے جلیل القدر علماء نے جن میں حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ وغیرہ بھی داخل ہیں، اسی فتویٰ کی تصدیق فرمائی ہے۔ البتہ ساتھ ہی حضرت مفتیٔ اعظم قدس سرہٗ نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ نماز جتنی سادگی سے ادا کی جائے اور اس میں خارجی آلات کا استعمال جتنا کم سے کم کیا جائے، اور بندے کا براہِ راست تعلق اپنے اللہ سے جتنا بلاواسطہ ہو اتنا ہی بہتر ہے، نیز آلۂ مکبّر الصوت کے استعمال سے لاؤڈ اسپیکر کے خراب ہوجانے وغیرہ کی صورت میں بعض مفاسد بھی سامنے آئے تھے، اس لئے مذکورہ رسالے میں مشورہ یہی دیا گیا تھا کہ جہاں تک ہوسکے اس کے بغیر نماز پڑھنی چاہئے، تاہم اگر نماز پڑھ لی جائے تو نماز ہوجائے گی۔ بعض دُوسرے اہلِ فتویٰ مثلاً حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی قدس سرہ نے اپنی تحریر میں اور زیادہ توسع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ: ''جبکہ امام کی آواز سامعین کو نہ پہنچتی ہو تو ان کو آواز پہنچادینا غلو نہیں، بلکہ تحصیلِ مقصود ہے، بالخصوص جبکہ تحصیلِ مقصود بآسانی ہو، دُشواری سے نہ ہو، اور ظاہر ہے کہ آلۂ مکبّر الصوت سے آواز کا بلند ہونا اور دُور دُور تک پہنچنا، بناءِ محراب و بناءِ گنبد سے زیادہ آسان ہے، اور بناءِ محراب و بناءِ گنبد بلانکیر مدتِ مدیدہ سے رائج ہے، اور اس سے بھی رفعِ صوتِ امام مقصود ہے ..... مگر نماز میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال دو شرطوں سے جائز ہے، ایک یہ کہ لاؤڈ اسپیکر اعلیٰ قسم کا ہو کہ امام کو اس کی طرف منہ کرنے کی ضرورت نہ ہو کہ توجہ الیٰ غیر اللہ مقصودِ صلوٰۃ کے منافی ہے، دُوسرے مکبّرین کا انتظام مکمل ہو، تاکہ میکروفون فیل ہوجائے تو نماز میں گڑبڑ نہ ہو'' (آلاتِ جدیدہ ص:۷)

اس تشریح سے واضح ہوا کہ آلۂ مکبّر الصوت کا استعمال نماز میں ان شرطوں کے ساتھ جائز ہے، البتہ جہاں مکبّرین سے کسی انتشار کے بغیر کام چلا سکتا ہو، وہاں زیادہ بہتر اور مناسب یہی ہے کہ لاؤڈ اسپیکر استعمال نہ کیا جائے، تاکہ علماء کے قول پر کسی ادنیٰ کراہت کے بغیر نماز ہوجائے۔ لیکن جو صورت آپ نے سوال میں لکھی ہے، اگر وہ صحیح ہے کہ مجمع کی کثرت کی وجہ سے لاؤڈ اسپیکر کے بغیر زیادہ انتشار پیدا ہوا، تو جہاں ایسا اندیشہ ہو، وہاں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال یقیناً زیادہ مناسب اور بہتر ہوگا اور اس کے ساتھ نماز کے بلاکراہت دُرست ہوجانے میں کوئی شبہ نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۸/۷/۱۴۱۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰/۷/۱۴۱۱ھ)

الجواب صحیح

محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ

تراویح میں لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کا حکم اور اسپیکر میں تراویح کے دوران آیتِ سجدہ آنے والی ہو تو کیا کیا جائے؟

سوال:- میں جس مسجد میں قرآن سنا رہا ہوں وہ مسجد چھوٹی ہے، اور امام کی آواز مقتدیوں تک بآسانی پہنچ جاتی ہے، اس کے باوجود آٹھ سال سے اس مسجد میں لاؤڈ اسپیکر پر تراویح ہو رہی ہے اور اکثریت کی رائے بھی یہی ہے کہ لاؤڈ اسپیکر پر حسبِ سابق تراویح ہوتی رہے لیکن ایک دو آدمی اس کے مخالف ہیں، اور وہ بغیر لاؤڈ اسپیکر کے تراویح پڑھانے پر زور دیتے ہیں۔

اسی اثناء میں ایک دو روز لاؤڈ اسپیکر خراب رہا تو متصل کی دُکانوں اور ہوٹل سے ریکارڈنگ کی آوازیں اس قدر آتی رہیں کہ تراویح پڑھنا دُشوار ہوگیا، منع کرنے کے بعد بھی وہ نہ مانے، اس کے علاوہ اگر لاؤڈ اسپیکر پر نماز نہ پڑھی جائے تو قریب کی مسجد کی آوازیں بھی خلل انداز ہوتی ہیں، جن کی وجہ سے پریشانی ہوتی ہے، اگر ہم اپنی مسجد میں حسبِ سابق لاؤڈ اسپیکر پر تراویح پڑھتے رہیں، تو ان خللوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں، لیکن ایک دو آدمی جھگڑا کرتے ہیں کہ بغیر لاؤڈ اسپیکر کے تراویح پڑھو، کل رات تو اس پر جھگڑے کی نوبت زیادہ آگئی تھی، ان حالات میں شرعاً کیا حکم ہے؟

۲:- آیتِ سجدہ اگر تراویح کی رکعتوں میں آجائے تو کیا لاؤڈ اسپیکر بند کرکے پڑھنی ہوگی یا حسبِ سابق دُوسری رکعتوں کے، یہ بھی لاؤڈ اسپیکر پر پڑھی جاتی رہے؟

جواب ا:- سوال میں آپ نے جو حالات لکھے ہیں ان کے پیشِ نظر لاؤڈ اسپیکر پر تراویح پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں،[1] البتہ بہتر یہ ہے کہ لاؤڈ اسپیکر کی آواز اتنی پست رکھی جائے کہ مسجد سے باہر دُور تک آواز نہ جائے۔

۲:- اگر مسجد کے باہر آواز نہ جاتی ہو یا بہت ہلکی جاتی ہو تب تو آیتِ سجدہ بھی لاؤڈ اسپیکر پر پڑھ لیں، ورنہ آیتِ سجدہ پڑھتے ہوئے امام اپنی آواز نسبۃً پست کردے، اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو جن دو رکعتوں میں آیتِ سجدہ آنے والی ہو لاؤڈ اسپیکر بند کردیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۹۹۱/۲۸ ج)

ریل میں دورانِ سفر نماز کیسے پڑھی جائے؟

سوال:- ریل میں دورانِ سفر نماز کیسے پڑھی جائے، بیٹھ کر یا کھڑے ہوکر؟ نیز یہ بتایئے کہ

(۱) تفصیل سابقہ فتویٰ میں ملاحظہ فرمائیں۔

دورانِ سفر اگر قبلے کی طرف رُخ صحیح نہ ہو تو کیا نماز ہو جائے گی؟

جواب:- کھڑے ہوکر ہی پڑھنا واجب ہے،(۱) اور قبلے کی طرف رُخ کرنا فرض ہے، اس کے بغیر نماز نہ ہوگی۔ اگر رُخ معلوم نہ ہو تو معلوم کرنے کے لئے اپنی سی پوری کوشش کریں، اور جس طرف گمان غالب ہو، ادھر رُخ کر کے نماز پڑھ لیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۲۱/۱/۸ھ

(فتویٰ نمبر ۵۸/۶۵)

ہوائی جہاز میں نماز ادا کرنا جائز ہے

سوال:- ہوائی جہاز میں سفر کے دوران نماز پڑھی جاسکتی ہے یا نہیں؟ جہاز میں نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- جائز ہے۔(۲)

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۱۲/۱/۸ھ

(فتویٰ نمبر ۵۸/۶۵)

بے نمازی کا حکم

سوال:- بے نمازی کا کیا حکم ہے؟ سنا ہے بے نمازی کتے سے بھی بدتر ہے؟ کیا اس کا جھوٹا جائز ہے؟

جواب:- بے نمازی فاسق ہے، لیکن کسی مسلمان کو کتے سے بدتر کہنا دُرست نہیں۔(۳)

فقط واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۱۱ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

***

(۱) وفي تنوير الأبصار ج:۱ ص:۴۴۴، ۴۴۵ (طبع سعيد) من فرائضها .... ومنها القيام في فرض لقادر عليه.

(۲) تفصیل کے لئے امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۳۹۴ تا ۳۹۶ ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) وفي مشكوة المصابيح، باب حفظ اللسان والغيبة والشتم ج:۲ ص:۴۱۱ (طبع قديمي كتب خانه) سباب المسلم فسوق وقتاله كفر.

کتاب الجنائز

(نمازِ جنازہ اور تجہیز و تکفین کے مسائل)

۱:- نمازِ جنازہ پڑھانے میں کس امام کو مقدم کیا جائے گا؟
۲:- مرد نہ ہونے کی صورت میں کیا عورت پر نمازِ جنازہ پڑھنا لازم ہے؟

سوال:- هل امام الجمعة مقدم علىٰ امام مصلى العيد لصلوٰة الجنازة أم امام مصلى العيد مقدم علىٰ امام الجمعة؟ مع الحوالة.

جواب:- لم أر من صرح بهذا والذى ينبغى أن يقدم امام الجمعة لان الرضاء به أتم وأكثر من امام مصلى العيد وهو العلة فى التقديم فى صلوٰة الجنازة، والله اعلم.

سوال:- اذا نقل الميت من موضعه الىٰ موضعة أخرىٰ لضرورة فأيها أحق بالامامة؟ امام موضعة الميت أم امام موضعة الذى نقل فيها الميت؟

جواب:- امام الحىّ الذى كان يسكنه الميت أولىٰ من امام الحىّ الذى انتقل اليه لأن علة تقدم امام الحىّ ان الميت رضى بالصلوٰة خلفه حال حياته فينبغى أن يصلى عليه بعد وفاته كما صرح به الشامىؒ فى رد المحتار[1] والحلبىؒ فى شرح المنية (ص: ۵۴۱)[2] وهٰذه العلة انما توجد فى امام الحىّ الذى كان الميت يسكنه دون الحىّ الذى انتقل فيه.

سوال:- اذا مات الرجل فى نساء ليس فيها أحد من الرجال فعلى المرأة صلوٰة الجنازة أم لا؟

جواب:- نعم لا مانع من وجوب صلوٰة الجنازة على النساء اذا لم يكن فى الحىّ رجل غير أنه لا يجوز لهن غسله وانما عليهن التيمم، لما فى الدر المختار ماتت بين رجال أو هو بين نساء يممه المحرم فان لم يكن فالأجنبى بخرقة. (شامى).[3]

والله اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۵/۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۶۱۳/۱۹ الف)

الجواب صحیح
محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) وفى الدر المختار ج:۲ ص:۲۲۰ (طبع ايج ايم سعيد) امام الحىّ وفى الشامية تحته .... وانّما كان أولىٰ، لأن الميت رضى بالصّلوٰة خلفه فى حال حياته فينبغى أن يصلّى عليه بعد وفاته .... الخ.

(۲) غنية المتملى ص:۵۸۵ (طبع سهيل اكيڈمى لاهور).

(۳) الدر المختار ج:۲ ص:۲۰۱ (طبع سعيد).

جنازہ لے جاتے وقت چالیس قدم گن کر میّت کو ایصالِ ثواب کرنے کا حکم

سوال:- میّت کا جنازہ اُٹھاتے وقت ہمارے ہاں عوام میں یہ مروّج ہے کہ چالیس قدم تک گنے جاتے ہیں اور میت کو اس کا ثواب پہنچایا جاتا ہے، کیا شرعی طور پر اس کا کوئی جواز ہے؟

جواب:- اس طرح قدم گننے اور ان کا ثواب پہنچانے کا شرعاً کوئی ثبوت نہیں، یہ رسم واجب الترک ہے۔

واللہ اعلم

۱۴۰۱/۱۰/۲۲ھ

(فتویٰ نمبر ۳۲/۱۰۹۶ ج)

مردے کو دو مرتبہ غسل دینے کی رسم

سوال:- ہمارے یہاں رواج ہے کہ مردے کو دو مرتبہ غسل دیا جاتا ہے، ایک غسل انتقال کے وقت فوراً قرآن پڑھنے کے لئے دیا جاتا ہے، اور دُوسرا غسل جنازہ ادا کرتے وقت اگر اوّل غسل ٹھیک ہوا بھی ہو، کوئی نجاست وغیرہ ظاہر نہ بھی ہو، تب بھی دُوسرا غسل ضرور دیتے ہیں، شرعاً کیا حکم ہے؟

جواب:- مردے کو صرف ایک مرتبہ غسل دینا مشروع ہے اور یہ کام وفات کے بعد جلد از جلد ہونا چاہئے،[۱] دو مرتبہ غسل دینے کا کوئی ثبوت شریعت میں نہیں ہے، یہ طریقہ واجب الترک ہے۔

واللہ اعلم

۱۳۹۸/۹/۱۲ھ

(فتویٰ نمبر ۲۹/۵۹۱ ب)

بیوی کے انتقال کے بعد شوہر کے لئے اس کا چہرہ دیکھنا کیسا ہے؟

سوال:- ایک شخص کی بیوی کا انتقال ہوجائے تو کیا اس کا خاوند بعد از وصال اس کا چہرہ دیکھ سکتا ہے یا نہیں؟ اور جنازہ بھی اُٹھا سکتا ہے یا نہیں؟ اسی طرح عورت اپنے خاوند کے چہرے کو دیکھ سکتی ہے یا نہیں؟

جواب:- شوہر کے لئے اپنی بیوی کا چہرہ مرنے کے بعد دیکھنا بالاتفاق جائز ہے، البتہ اسے چھونے یا غسل دینے سے فقہائے حنفیہ نے منع کیا ہے، اور بیوی اپنے شوہر کے مرنے کے بعد اسے

---

(۱) وفي الدر المختار ج:۲ ص:۲۳۹ (طبع ایچ ایم سعید) يندب دفنه في جهة موته وتعجيله وفي الشامية تحته (قوله وتعجيله) أي تعجيل جهازه عقب تحقق موته ..... الخ.

دیکھ بھی سکتی ہے اور غسل بھی دے سکتی ہے۔

لما في الدر المختار: ویمنع زوجها من غسلها ومسها لا من النظر الیها علی الأصح، وهی لا تمنع من ذٰلک. (شامی)۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۷/۲/۱۳۹۸ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۷/ ۲۹ الف)

مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنے کا حکم

سوال:- آدم جی نگر کی مکہ مسجد کو تعمیر ہوئے ۱۵ سال تقریباً ہوگئے، تب سے جنازے کی نماز مسجد کے میدان میں ہوا کرتی تھی، امام صاحب کی امامت کے آخری ایام میں محراب کے بیچ میں کھڑکی توڑ کر دروازہ بنا دیا گیا اور محراب کے باہر چار فٹ اُونچا چبوترہ بنایا گیا، اب چبوترے پر جنازہ رکھ دیا جاتا ہے اور محراب کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے، جنازہ کی نماز مسجد میں پڑھی جاتی ہے، نئے امام صاحب نے جنازے کی نماز کا یہ طریقہ بند کر دیا ہے اور پہلے کی طرح نماز کھلے میدان میں ہونے لگی ہے، مولانا مفتی محمد اسماعیل صاحب نے گجراتی کتاب میں جو فتویٰ کی کتاب ہے، لکھا ہے کہ جنازے کی نماز کسی حالت میں مسجد میں پڑھنا مذہبِ حنفی میں مکروہِ تحریمی ہے۔ اب کون سا طریقہ دُرست تھا؟ بہشتی گوہر میں مسئلہ کیا لکھا ہے؟ اور کہا جاتا ہے کہ حرمین میں مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھی جاتی ہے، آپ واضح فرمائیں کیا حکم ہے؟

جواب:- میت کو محراب سے باہر رکھ کر اگر نمازِ جنازہ مسجد کے اندر پڑھی جائے تو راجح قول کے مطابق یہ صورت بھی مکروہ ہے، البتہ آس پاس نمازِ جنازہ پڑھنے کے لئے کوئی اور جگہ نہ ہو تو مجبوراً فقہاء نے اس کی اجازت دی ہے، لیکن چونکہ صورتِ مسئولہ میں مسجد کے ساتھ مسجد ہی کا کھلا میدان موجود ہے اس لئے جس مسجد کے بارے میں سوال ہے وہاں مسجد کے اندر بلاعذر نماز پڑھنا مکروہ ہے، نئے امام صاحب کا طریقہ دُرست ہے جو نمازِ جنازہ کھلے میدان میں پڑھاتے ہیں، ایسا ہی کرنا چاہئے، لما في الدر المختار: واختلف في الخارجة عن المسجد وحده أو مع بعض القوم والمختار الکراهة مطلقًا خلاصة .... وهو الموافق لاطلاق حدیث أبي داوٗد من صلّی علی میّت في المسجد فلا صلوٰة له، (وقال الشاميؒ انما تکره في المسجد بلا عذر فان کان فلا، شامي)۔[2]

بہشتی گوہر،[3] امداد الفتاویٰ[4] وغیرہ سب میں مسئلہ اسی طرح ہے، اور جب مسجد کے ساتھ کھلی جگہ

(۱) الدر المختار ج:۲ ص:۱۹۸ (طبع ایچ ایم سعید)۔
(۲) الدر المختار مع رد المحتار ج:۲ ص:۲۲۵، ۲۲۶ (طبع سعید)۔
(۳) بہشتی گوہر ص:۹۳ مسئلہ نمبر ۱۷ (طبع میر محمد کتب خانہ)۔ (۴) امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۵۳۳، ۵۳۴۔

موجود ہے تو مکروہِ تحریمی، مکروہِ تنزیہی کی بحث میں نہیں پڑنا چاہئے، باہر ہی نماز پڑھنی چاہئے۔ حرمین شریفین کے امام صاحب، مذہب میں حنبلی ہیں، اور حنبلی مذہب کے اندر مسجد میں نمازِ جنازہ جائز ہے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۲۰ھ
(فتویٰ نمبر ۶۲۳/۲۸ ب)

مسجد میں نمازِ جنازہ کا حکم (فارسی)

سوال:- در صحن مسجد پنج وقتی یا در صحن جامع مسجد بصورت غیر معتاد نمازِ جنازہ جائز بلا کراہت است یا نہ؟

جواب:- نمازِ جنازہ در مسجد جائز نیست کذا فی کتب الفقہ۔[2]

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۲۸ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۳۲۶/۱۹ الف)

لحد گر جانے کی وجہ سے دوبارہ قبر بنانے کا حکم

سوال:- میّت کو دفن کر کے لحد میں رکھ دیا، اور لحد میّت کے اُوپر گر گئی، اب اکثر لوگ چاہتے ہیں کہ لحد صاف کر دیں یا کوئی اور قبر کھود کر دفن کریں، اس میّت کے بارے میں غسل اور دوبارہ کفن کا کیا حکم ہے؟

جواب:- غسل تو دوبارہ نہیں دیا جائے گا، لیکن لحد گر جانے کی وجہ سے دوبارہ قبر بنانے میں یہ تفصیل ہے کہ اگر قبر پر مٹی نہیں ڈالی گئی تھی تب تو مردے کو نکال کر دوبارہ قبر بنانے کی اجازت ہے۔

لأنه ليس بنبش كما في البدائع، ولو وضع لغير القبلة فان كان قبل اهالة التراب عليه وقد سردوا اللبن ازالوا ذلك لأنه ليس بنبش وان اهيل عليه التراب ترك ذلك لأن النبش حرام. (بدائع ج:۱ ص:۳۱۹)۔[3]

اور اگر مٹی ڈال دی گئی تھی تو مردے کو منتقل نہ کیا جائے بلکہ اس کو وہیں باقی رکھتے ہوئے لحد کی مرمت کر دی جائے۔

---

(۱) وفي المغني لابن قدامة مع الشرح الكبير ج:۲ ص:۳۵۸ (طبع دار الكتاب العربي بيروت) ولا بأس بالصلوة على الميّت في المسجد اذا لم يخف تلويثه .... الخ.

(۲) حوالے کے لئے دیکھئے پچھلے صفحے کا حاشیہ نمبر ۲ تا ۴، وامداد المفتین ص:۴۴۵۔ (محمد زبیر)

(۳) (طبع ایچ ایم سعید).

لما في الدر المختار ولا يخرج منه بعد اهالة التراب الا لحق ادمي۔[1]

وفي ردّ المحتار وأما نقله بعد دفنه فلا مطلقًا. (شامی ج:۱ ص:۲۰۲)۔[2]

اور مرمت کے لئے قبر کو کچھ کھودنا پڑے تو اس کی اجازت ہے، لما في تنقيح الحامدية:-

سئل فيما اذا قرر القاضي زيدا المعماري في حفر قبور الموتیٰ وتعميرها واصلاحها للاحتياج لذلک لأهلتيه واتقانه، ويريد بعض الحفارين منعه من ذلک بلا وجه شرعي فهل يمنع المعارض (الجواب) نعم يمنع. (تنقيح الحامدية ج:۱ ص:۸)۔[3]

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۱/۲۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۵۶/۲۸ الف)

میّت کو غسل دینے کے بعد جسم سے خون نکلنے کی صورت میں شرعی حکم

سوال:- میّت کو غسل دینے کے بعد اگر کان سے خون نکل آئے تو رُوئی کا فوس کان میں خون کے بند ہونے کے لئے رکھنا جائز ہے؟ اسی طرح بدن کے دُوسرے اجزاء میں بھی؟

جواب:- غسل دینے کے بعد اگر جسم کے کسی حصے سے خون وغیرہ نکلے تو چونکہ غسل کا لوٹانا واجب نہیں ہے،[4] اس لئے اسے محض صاف کردینا کافی ہے، تاہم اگر کان وغیرہ میں رُوئی رکھ دی جائے تو کچھ حرج نہیں۔ ولا بأس بجعل القطن علیٰ وجهه وفي مخارقه كدبر وقبل وأذن وفم. (الدر المختار علیٰ هامش الشامي ج:۱ ص:۸۵۳)۔[5]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۱/۲۹ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی بلندشہری

(فتویٰ نمبر ۱۷۳/۱۹ الف)

میّت کو ایک جگہ سے دُوسری جگہ منتقل کرنے کا حکم

سوال:- بہت ساری دُشواریوں اور مشکلات کے پیشِ نظر ہر علاقے سے تعلق رکھنے والوں نے اپنی انجمنیں اور رفاہی سوسائٹیاں بنالیں اور انجمن یا سوسائٹی کے ہر رکن پر باقاعدگی سے ماہوار

---

(۱) الدر المختار ج:۲ ص:۲۳۷، ۲۳۸ (طبع سعيد).

(۲) شامی ج:۲ ص:۲۳۹ (طبع ایچ ایم سعید).

(۳) (طبع المكتبة الحبيبية كوئٹه). وفي التاتارخانية ج:۲ ص:۱۷۰ اذا خربت القبور فلا بأس بتطيينها لما روى أن النبي صلى الله عليه وسلم مر بقبر ابنه ابراهيم فرأى فيه حجرا سقط منه فسدده واصلحه ثم قال: من عمل عملًا فليتقنه. وفي حاشية اعلاء السنن ج:۸ ص:۲۲۶ (طبع ادارة القرآن) نقلًا عن المغني لابن قدامة عن ابن عمرؓ أنه كان يتعاهد قبر عاصم ابن عمر، قال نافع توفي ابن له، وهو غائب فقدم فسألنا عنه فدللناه عليه فكان يتعاهد القبر، ويأمر باصلاحه.

(۴) وفي الدر المختار ج:۲ ص:۱۹۷ (طبع ایچ ایم سعید) ولا يعاد غسله ولا وضوءه بالخارج منه.

(۵) الدر المختار ج:۲ ص:۱۹۸ (طبع مذكور).

چندہ مقرّر کر دیا جو باقاعدگی سے دیا اور لیا جاتا ہے، اور ہر انجمن کے سالانہ انتخابات ہوتے ہیں جس میں انتظامیہ کے ممبر چنے جاتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

اب تمام گاؤں کی سوسائٹیوں اور انجمنوں کو ملا کر پورے علاقے کے نام سے یہاں کراچی میں ایک فیڈریشن بنائی گئی ہے، جس کا نام "یونائیٹڈ ستّی ویلفیئر فیڈریشن" ہے، فیڈریشن کو چلانے کے لئے ہر ایک سوسائٹی سے ممبران لئے جاتے ہیں جن کا باقاعدہ کوٹہ مقرّر ہے، اور ہر سوسائٹی فیڈریشن کو مقرّرہ چندہ ماہانہ دیتی ہے اور اس طرح فیڈریشن کا نظام بہ طریقہ احسن چلتا ہے، بعض اوقات فیڈریشن متعلقہ سوسائٹیوں سے ہنگامی چندہ یا رُقوم بھی وصول کرتی ہے۔

اب مندرجہ ذیل دو مسئلے اس کی روشنی میں عنایت فرمادیں۔

ا:- ہماری فیڈریشن کی زیرِ نگرانی اور اخراجات پر اگر خدانخواستہ ہمارے علاقے کا کوئی شخص یہاں کراچی میں حادثاتی یا طبعی موت مرا ہو اور فیڈریشن میں شامل کسی بھی سوسائٹی کا باقاعدہ ممبر اور رکن ہو اور متعلقہ سوسائٹی اس کی تصدیق کرے تو ایسے شخص کی لاش کو ہماری فیڈریشن پورے کفن اور ضروری چیزوں کے ساتھ اہتمام سے بذریعہ ہوائی جہاز گھر پہنچانے کا انتظام کرتی ہے، اور اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی لاش کی دیکھ بھال اور گھر پہنچانے کے لئے بھیجا جاتا ہے تاکہ لاش اس کے لواحقین کے پاس بحفاظت پہنچائی جائے، یاد رہے کہ ہمارے علاقے کا یہاں سے فاصلہ کم از کم ایک ہزار میل ہے، مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے:-

الف:- کیا یہاں کراچی سے اتنی دُور متوفی کے آبائی گاؤں میں اس کے لواحقین کے پاس لاش کو پہنچانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

ب:- اگر ہے تو شرعاً اس کی کیا حیثیت ہے؟

ج:- اگر نہیں ہے تو بھی شرعاً اس کی حیثیت کیا ہے؟

جواب دیتے وقت لاش بھیجنے کی اہمیت اور اس کی ضرورت کو مدِنظر رکھا جائے، چونکہ بعض اوقات جب علاقے اور قوم کا کوئی شخص یہاں طبعی یا حادثاتی موت کا شکار ہو جاتا تھا تو اپنے کسی شخص یا علاقے کے آدمی سے کوئی رابطہ نہ ہونے کی بنا پر وہ متوفی لاوارث قرار پاتا اور لاوارث سمجھ کر یہاں ہی دفن کر دیا جاتا اور اس کے لواحقین کو کچھ خبر بھی نہ ہوتی۔

نیز علاقے سے متعلق کئی نئے حضرات بسلسلۂ روزگار یہاں کراچی آتے ہیں، لیکن تعلق کا کوئی آدمی نہ ملا یا ملازمت نہ ملی تو بہت پریشانی ہوتی ہے، اپنا آدمی یا کوئی رفاہی ادارہ نہ ہونے کی وجہ سے ایسے لوگوں کو بہت تکلیف ہوتی ہے، دریافت طلب یہ ہے کہ اتنے دُور اپنے علاقے میں اپنے گاؤں

کے نادار اور غریب لوگوں کی مدد اس طریقے سے شرعاً جائز ہے؟

جواب:- مردے کو دفن سے پہلے موت کی جگہ سے اُٹھا کر دُوسرے شہر لے جانا مکروہ ہے، البتہ بعض فقہاء نے اس کو جائز بھی کہا ہے، لہٰذا اس عمل کو عام معمول بنالینا دُرست نہیں کہ فتویٰ کراہت ہی پر ہے، البتہ کسی خاص واقعے میں کوئی شدید ضرورت داعی ہو تو بعض دُوسرے فقہاء کے قول پر عمل کر کے میّت کو منتقل کرنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ قال فی شرح المنیة: ویستحب فی القتیل والمیت دفنه فی المکان الذی مات فیه فی مقابر أولئک القوم وان نقل قبل الدفن قدر میل أو میلین فلا بأس به، قیل هذا التقدیر من محمد یدل علی أن نقله من بلد الی بلد لا یجوز أو مکروه ولأن مقابر بعض البلدان ربما بلغت هذه المسافة ففیه ضرورة ولا ضرورة فی النقل الی بلد اٰخر وقیل یجوز ذٰلک ما دون السفر .... ولا یکره فی مدة السفر أیضًا. (کبیری جنائز متفرقات)[۱]. وقال الشامی (قوله ولا بأس بنقله قبل دفنه) قیل مطلقًا وقیل الی ما دون مدة السفر وقیده محمد بقدر میل أو میلین، لأن مقابر البلد ربما بلغت هذه المسافة فیکره فیما زاد، قال فی النهر عن عقد الفرائد وهو الظاهر. (شامی)[۲]۔ واللہ اعلم

۱۳۸۹/۸/۹ھ

(فتویٰ نمبر ۹۱۷/۲۸ ج)

نمازِ جنازہ شروع کرنے سے پہلے امام کا نیت وغیرہ بتانا

(دار الافتاء دار العلوم کراچی کے ایک صاحب کے فتویٰ پر مستفتی کا اِشکال اور اس کا جواب)

سوال:- آپ کا فتویٰ ۱۴/ذی قعدہ ۱۳۹۶ھ کو ملا جس میں یہ لکھا تھا کہ:-

''اس فعل کو اگر سنت سمجھ کر کیا جائے تو واقعۃً بدعت ہے، اس لئے کہ خیر القرون میں اس کا ثبوت نہیں ملا، لیکن اس زمانے میں دین کی طرف رغبت بالکل نہیں ہے، لوگوں کو نمازِ جنازہ اور عیدین وغیرہ کی نیت تک نہیں آتی، اس لئے انہیں بتادینے میں کوئی حرج نہیں۔'' اگر کسی کو مسئلہ بتلانے کے لئے تیمم کر کے دِکھلایا لیکن دِل میں اپنے تیمم کرنے کی نیت نہیں ہے بلکہ اس کو دِکھانا مقصود ہے اس کا تیمم نہ ہوگا، کیونکہ تیمم ہونے میں تیمم کرنے کا ارادہ ہونا ضروری ہے، جب ارادہ نہ ہو صرف بتلانا اور دُوسرے کو دِکھلانا مقصود ہو تو تیمم نہ ہوگا، سائل نے لکھا تھا کہ امام کا نیتِ نمازِ عیدین و جنازہ بتلادینا تلقین من الخارج ہے، اس لئے نماز فاسد ہوتی ہے، اور نیت نماز شروع کرنے سے پہلے بتلائی جاتی

(۱) غنیة المتملی ص:۶۰۷ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور).

(۲) فتاوی شامیة ج:۲ ص:۲۳۹ (طبع ایچ ایم سعید). میت کو ایک جگہ سے دُوسری جگہ منتقل کرنے سے متعلق حضرتِ والا دامت برکاتہم کا مفصل و مدلل فتویٰ آگے ص:۵۷۱ پر ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر حق نواز)

ہے، اگر نیت بتلانا جہالت کی وجہ سے کوئی حرج نہیں رکھتا تو پانچ وقت کی نمازوں میں بھی بتلانا چاہئے، جبکہ خیر القرون اور صحابہؓ سے اس کا ثبوت نہیں کہ عیدین و جنازہ کی نماز میں مسلمانوں کو امام نے نیت جہراً اور بلند آواز سے پڑھ کر سنائی ہو، بلکہ نیت کے الفاظ حدیث سے ثابت نہیں ہیں، مجھے آپ کا جواب تسلی بخش نظر نہ آیا۔ (خلاصہ از سوال و جواب مستفتی)

جواب:- آپ کی تحریر غور سے بہ نیتِ قبول پڑھی لیکن گزشتہ فتویٰ میں جو بات لکھی تھی اس میں تبدیلی نہیں ہوئی، جہاں تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ سے ثابت ہونے کا تعلق ہے، ثابت تو زبان سے نیت کے الفاظ ادا کرنا بھی نہیں ہے، اس کے باوجود فقہاءؒ نے تلفظ بالنیۃ کو نہ صرف جائز بلکہ بہتر قرار دیا ہے۔

في الدر المختار[1] والتلفظ بها مستحب هو المختار وقيل سنة يعني أحبه السلف أو سنة علمائنا اذ لم ينقل عن المصطفى ولا الصحابة ولا التابعين بل قيل بدعة۔

اس کے ماتحت علامہ شامیؒ لکھتے ہیں: وقد استفاض ظهور العمل به في كثير من الاعصار في عامة الأمصار فلا جرم انه ذهب في المبسوط والهداية والكافي الى انه ان فعله ليجمع عزيمة قلبه فحسن فيندفع ما قيل انه يكره. (شامی ج:۱ ص:۴۷۸)[2]۔ اور جب تلفظ بالنیۃ کو بہتر کہا گیا تو اگر امام مقتدیوں کو نیت بتادے تو اس میں شرعاً کوئی امر مانع نہیں، اِلّا یہ کہ اس کو سنتِ نبویہ یا واجب و لازم سمجھ لیا جائے تو وہ بدعت ہو جائے گا، لیکن محض اس خیال سے کہ لوگوں کو الفاظِ نیت معلوم ہو جائیں اگر امام بتادے تو کچھ حرج نہیں، اور امام جب نیت کے الفاظ بتا رہا ہو ان الفاظ سے امام کی نیت متحقق نہ ہوگی، بلکہ نماز کے وقت اسے باقاعدہ نیت کرنی پڑے گی، لہٰذا تیمم کی جو مثال آپ نے دی ہے، وہ اس صورت میں صادق نہیں آتی، هذا ما عندي۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۲/۱۰ھ

(فتویٰ نمبر ۲۶۳/۲۸ الف)

میّت کو ایک جگہ سے دُوسری جگہ منتقل کرنے کا حکم

سوال:- اگر کسی شخص کا کراچی میں انتقال ہو تو میت کو پنجاب بھیجنا جائز ہے؟

---

(۱) ج:۱ ص:۴۱۵، ۴۱۶ (طبع ایچ ایم سعید)۔

(۲) شامي بحث النية ج:۱ ص:۴۱۶ (طبع سعيد)۔ وفي اعلاء السنن ج:۲ ص:۱۴۹ (طبع ادارة القرآن كراچي) واباحه بعض لما فيه من تحقيق عمل القلب وقطع الوسوسة وما روى عن عمر انه ادب من فعله فهو محمول على انه انما زجر من جهر به فاما المحافتة به فلا بأس بها فمن قال من مشائخنا ان التلفظ بالنية سنة لم يرد بها سنة النبي صلى الله عليه وسلم بل سنة المشائخ لاختلاف الزمان وكثرة الشواغل على القلوب. وفي الهندية ج:۱ ص:۶۵ ولا عبرة للذكر باللسان فان فعله لتجتمع عزيمة قلبه فهو حسن كذا في الكافي.

جواب:- دفن سے پہلے میت کو ایک شہر سے دُوسرے شہر منتقل کرنے کے بارے میں فقہائے حنفیہ میں اختلاف ہے، بعض حضرات اسے جائز کہتے ہیں اور بعض مکروہِ تحریمی بتاتے ہیں، لہٰذا شدید ضرورت کے بغیر ایسا کرنے سے پرہیز کرنا چاہئے۔

قال فی شرح المنیة: ویستحب فی القتیل والمیّت دفنه فی المکان الذی مات فیه فی مقابر أولئک القوم وان نقل قبل الدفن قدر میل أو میلین فلا بأس به قیل هذا التقدیر من محمد یدل علی أنّ نقله من بلد الٰی بلد لا یجوز أو مکروه ولأن مقابر بعض البلدان ربما بلغت هٰذه المسافة ففیه ضرورة ولا ضرورة فی النقل الٰی بلد اٰخر وقیل یجوز ذٰلک ما دون السفر لما روی أن سعد بن أبی وقاص مات فی قریة علی أربعة فراسخ من المدینة فحمل علی اعناق الرجال الیها وقیل لا یکره فی مدة السفر أیضًا. (کبیری ص:۵۶۳، مسائل متفرقة من الجنائز)[1]۔

واللہ اعلم
۱۳۸۹/۷/۵ھ

میّت کو ایک شہر سے دُوسرے شہر منتقل کرنے کا حکم
اور مجتہد فیہ اُمور میں نکیر کے درجات
(حضرت مولانا صدیق احمد باندویؒ کی تدفین سے متعلق تفصیلی فتویٰ)

باسمه سبحانه وتعالٰی

بقیۃ السلف عارف باللہ محی السنۃ برکۃ العصر محترم المقام واجب الاحترام حضرت والا ہردوئی دامت برکاتہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

بعدہٗ معروض خدمتِ اقدس میں نہایت عاجزانہ اور پُرخلوص گزارش یہ ہے کہ حضرت ہر انسان کا مقدر دُنیا میں آنے سے قبل لکھا جاچکا ہے، یہاں تک کہ اہلِ علم حضرات سے بارہا سنا رُوح قبض ہونے کا وقت و مقام اور جہاں انسان کو دفن ہونا ہے وہاں کی مٹی بھی مقرّر ہے، چاہے انسان دُنیا کے کسی بھی کونے میں ہو، اس کی موت وہاں اس کو کھینچ کر لے جائے گی جہاں دفن ہونا ہے اور وہاں کی مٹی اس کو وہاں کھینچ لے جائے گی۔ اس کی تائید و تصدیق حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد باندویؒ کے وصال سے ہوتی ہے، حضرت کو باندھا (باندہ) سے جب لکھنؤ لے جانے کا فیصلہ ہوا تو حضرت نے انکار فرمایا اور فرمایا: یہ موت کی تکلیف ہے، آگے یہ فرمایا: میرا سلام سب ملنے والوں کو کہہ دینا اور سب

(۱) غنیة المتملی ص:۶۰۷ (طبع سہیل اکیڈمی لاہور) تفصیل کے لئے اگلا مفصل فتویٰ ملاحظہ فرمائیں۔

مل کر مدرسہ کا خیال رکھنا۔ اتنا فرما کر ذکر میں مشغول ہوگئے یہاں تک کہ آپ کو لکھنؤ لے جایا گیا، وہاں تھوڑی ہی دیر کے بعد رُوح کو اپنے پیدا کرنے والے کے سپرد کردیا، (اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّـآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ) پھر وہاں سے حضرتِ والا کو ہتھورہ لانے کی تیاری ہونے لگی، اس موقع پر حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی صاحب ندوی دامت برکاتہم نے انکار فرمایا کہ حضرت کو یہیں دفن کردیا جاوے، اور حضرتِ والا نے بھی اس بات پر اصرار فرمایا ہے کہ حضرت کو ہتھورہ نہ لے جایا جائے، ہزار کوششوں کے باوجود ایسا نہیں ہوسکا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ موت اور مٹی کو اپنے مقام پر کھینچنے میں دخل ہے، ان تمام باتوں پر یقین کے باوجود پھر کوئی انسان اس ضد پر اَڑ جائے کہ جہاں رُوح قبض ہوئی ہے وہیں دفن کیا جائے گا تو میں جنازہ میں شریک ہوں گا ورنہ نہیں، اور اس بات پر قسم کھالینا کہ میں اس مقام پر کبھی نہیں جاؤں گا جہاں س کو دفن کیا ہے، اس ضد پر اَڑے رہنا کیا یہ صحیح ہوگا؟ حضرتِ والا سے مؤدّبانہ، عاجزانہ التماس ہے کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں ہم لوگوں کی رہبری فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔ خدا حافظ گستاخی معاف

محتاجِ دُعا عبدالخالق
جامع مسجد ریلی کرود بھوپال

مدرسہ اشرف المدارس ہردوئی کی طرف سے جواب

جواب:- ہر مسلمان کے لئے جیسے تقدیری اُمور پر ایمان لانا ضروری ہے، اسی طرح تشریعی اُمور پر بھی ایمان لانا ضروری ہے، البتہ بندوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے ذریعہ صرف تشریعی اُمور کا مکلّف بنایا ہے، تکوینی اُمور کا مکلّف نہیں بنایا ہے، ”لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا“[1]، لہٰذا کسی مسلمان کی موت کہاں ہوئی یا کہاں ہونی چاہئے؟ مسلمان اس کا مکلّف نہیں ہے، البتہ موت واقع ہوجانے کے بعد میّت کے ساتھ کیا معاملہ ہونا چاہئے؟ اس کو علمائے کرام سے معلوم کرنے کے بعد اس کے موافق معاملہ کرنا چاہئے۔ چنانچہ فتاویٰ محمودیہ ج:۲ ص:۴۰۳ (طبع کتب خانہ مظہری) یعنی فتاویٰ حضرت فقیہ الأمت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی علیہ الرحمۃ میں ہے: اصل یہ ہے کہ آدمی کا جس بستی میں انتقال ہوا اسی بستی میں اس کو دفن کیا جاوے، اگر اس نے وصیت کی ہو کہ مجھ کو فلاں جگہ دفن کرنا تو اس وصیت پر عمل کرنا لازم نہیں، یہ وصیت باطل ہے۔ یندب دفنه في جهة موته أي في مقابر أهل المكان الذي مات فيه أو قتل (شامی ج:۱ ص:۶۰۲)۔[2]

حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کو انتقال کے بعد دُوسرے مقام پر لے جاکر دفن کیا گیا، جہاں

---

(۱) سورة البقرة:۲۸۶.

(۲) فتاوی شامية مطلب في دفن الميت ج:۲ ص:۲۳۹ (طبع سعيد).

انتقال ہوا وہاں دفن نہیں کیا گیا تو حضرت عائشہؓ ایک سفر میں جاتے ہوئے جب ان کی قبر پر گزریں تو فرمانے لگیں: اگر میرا بس چلتا تو تم یہاں دفن نہ کئے جاتے، بلکہ جہاں انتقال ہوا تھا وہیں دفن ہوتے۔

تاہم اس مسئلے میں اتنی تنگی نہیں ہے، امام محمد علیہ الرحمۃ نے میل دو میل کو مقامِ وفات سے حسبِ مصالح دُور لے جا کر دفن کرنے کی بھی گنجائش بتائی ہے، **ولا بأس بنقله قبل دفنه قيل مطلقًا وقيل الى ما دون مدة السفر وقيده محمد بقدر ميل أو ميلين لأن مقابر البلد ربما بلغت هذه المسافة فيكره فيما زاد قال في النهر عن عقد الفرائد وهو الظاهر.** (فتاویٰ شامی ج:۱ ص:۲۰۲)۔[1]

نیز فتاویٰ دار العلوم میں حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب مفتیٔ اعظم علیہ الرحمۃ نے اس سوال کے جواب میں کہ نقلِ میت کیا حرام ہے یا مکروہِ تحریمی یا تنزیہی ہے؟ عباراتِ فقہاء نقل کر کے لکھا ہے کہ: ان عبارات سے واضح ہے کہ قبل دفن نقلِ میت میں اختلاف ہے، بعض جائز کہتے ہیں، اور بعض ناجائز اور مکروہ، اور ظاہراً مکروہ سے مراد ان کی مکروہِ تحریمی ہے، اور صاحبِ نہر کا اس کو **هو الظاهر** کہنا اس کی ترجیح کو مقتضی ہے (فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج:۵ ص:۳۸۰ طبع دار الاشاعت کراچی)۔

اور احسن الفتاویٰ یعنی فتاویٰ فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب کراچی میں تصریح ہے کہ نقلِ میت مکروہِ تحریمی ہے، نیز آگے کچھ ارشاد ہے: **وقال شمس الأئمة السرخسيؒ وقول محمد في الكتاب لا بأس أن ينقل الميّت قدر ميل أو ميلين بيان ان النقل من بلد الى بلد مكروه،[2] قاله قاضي خان وقال العلامة الطحطاوي رحمة الله عليه مكروه اى تحريما[3] وقد جزم في التاجية بالكراهة وفي التجنيس وذكر أنه اذا مات في بلدة يكره نقله الى أخرىٰ لأنه اشتغال بما لا يفيد وفيه تأخير دفنه وكفى بذلك كراهة.** البحر الرائق ج:۲ ص:۱۹۵۔[4]

نقلِ میت میں تاخیرِ تدفین وخطرۂ فسادِ میت کے علاوہ آج کل مزید مندرجہ ذیل مفاسد پیدا ہوگئے ہیں:-

۱:- اس کا التزام ہونے لگا ہے۔ ۲:- مصارفِ کثیرہ و مشقتِ شدیدہ کا تحمل۔ ۳:- آبائی قبرستان میں دفن کرنے کا التزام اور اس پر اصرار سے یہ عقیدہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک مقام میں دفن ہونے والی اموات کی آپس میں ملاقات ہوتی ہے، حالانکہ یہ عقیدہ غلط ہے۔ ۴:- جنازے کو منتقل کرنا عموماً نمازِ جنازہ کے تکرار کا سبب بنتا ہے جو ناجائز ہے۔ (احسن الفتاویٰ ج:۴ ص:۲۱۸)۔[5]

---

(۱) فتاوى شامية مطلب في دفن الميت ج:۲ ص:۲۳۹ (طبع سعيد).
(۲) شرح السير الكبير رقم: ۳۰۴ ج:۱ ص:۲۳۶ (طابع مولانا نصر الله منصور).
(۳) حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح ص:۳۳۷ (طبع نور محمد كتب خانه).
(۴) منحة الخالق على هامش البحر الرائق ج:۲ ص:۱۹۵ (طبع ايچ ايم سعيد).
(۵) احسن الفتاوى باب الجنائز ج:۴ ص:۲۰۸، ۲۰۹ (طبع ايچ ايم سعيد).

اور بہشتی زیور میں مذکور ہے کہ قبل دفن کے نعش کا ایک مقام سے دُوسرے مقام میں دفن کرنے کے لئے لے جانا خلافِ اَولیٰ ہے، جبکہ دُوسرا مقام ایک دو میل سے زیادہ نہ ہو، اور اگر اس سے زیادہ ہو تو جائز نہیں، اور بعد دفن نے نعش کھود کر لے جانا تو ہر حال میں ناجائز ہے (بہشتی زیور ج:۱۱ ص:۱۰۲)۔

نیز مشکوٰۃ شریف میں ہے: **عن جابرؓ قال: لما كان يوم أحد جاءت عمتي بأبي لتدفنه في مقابرنا فنادى منادى رسول الله صلى الله عليه وسلم ردوا القتلىٰ الىٰ مضاجعهم۔**[1]

اور اسی طرح سننِ ابوداؤد شریف میں ج:۲ ص:۱۰۲ پر ہے۔[2]

(وقال في شرح هٰذا الحديث) وكذا من مات في موضع لا ينقل الىٰ بلد اٰخر قاله بعض علمائنا وقال في الأزهار الأمر في قوله صلى الله عليه وسلم ردوا القتلىٰ للوجوب۔ مرقات شرح مشکوٰۃ شریف ج:۲ ص:۳۷۴،[3] **وبذل المجهود** ج:۴ ص:۱۹۷۔[4]

ان مذکورہ بالا کتابوں سے واضح ہوا کہ ایک جگہ سے دُوسری جگہ میّت کو منتقل کرنا ناجائز اور منکرِ شرعی ہے، اس کی اصلاح کی سعی ہر ایک کے ذمہ بشرطِ قدرت ہے، جس کی توضیح بھی حضراتِ فقہاء نے فرمائی ہے، اگر عامی شخص ہے تو بشرطِ قدرت کرے اور صبر کرے، اگر مقتداء ہے تو نکیر کے ساتھ علیحدگی اختیار کرے، اصلاح کی خاطر ترکِ کلام اور ترکِ تعلق بھی کرسکتا ہے اور اس پر قسم بھی کھا سکتا ہے۔ **وفي الهداية فان قدر على المنع منعهم وان لم يقدر يصبر وهٰذا اذا لم يكن مقتدىٰ فان كان ولم يقدر علىٰ منعهم يخرج ولا يقعد لأن في ذٰلك شين الدين وفتح باب المعصية على المسلمين .... الىٰ لقوله تعالىٰ: فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ، وهٰذا كله بعد الحضور ولو علم قبل الحضور لا يحضر. هداية** ج:۴ ص:۴۵۵ (طبع مکتبہ شرکت علمیہ ملتان)۔

اور حضرت مولانا عبدالحی فرنگی علیہ الرحمۃ اس کے حاشیہ میں لکھتے ہیں: **قوله في ذٰلك شين الدين لأن المقتدىٰ امام في الدين وفعل امام الدين علىٰ خلاف الدين استخفاف بالدين في نظر الناظرين. هامش الهداية** ج:۴ ص:۴۵۵ (طبع مذکور)۔

بخاری شریف میں ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواجِ مطہراتؓ سے ان کی

---

(۱) مشكوٰة المصابيح باب دفن الميّت الفصل الثاني ج:۱ ص:۱۴۸ (طبع قديمي كتب خانه).
(۲) سنن أبي داوٗد ج:۲ ص:۹۵ (طبع مكتبه حقانيه ملتان).
(۳) مرقاة المفاتيح شرح مشكوٰة المصابيح رقم الحديث: ۱۷۰۴ ج:۴ ص:۱۸۳ (طبع مكتبه حبيبيه كوئته).
(۴) بذل المجهود كتاب الجنائز ج:۱۴ ص:۱۳۲ (طبع دار الريان للتراث قاهرة).

اصلاح کی خاطر ایک دفعہ ایک ماہ تک ترکِ تعلق رکھا[۱]، اور ابوداؤد شریف جلد دوم ص:۶۳۳[۲] میں ہے کہ حضرت زینبؓ کے حضرت صفیہؓ کو ایک سخت جملہ کہہ دینے کی وجہ سے ان کی اصلاح کی خاطر دو ماہ سے بھی زائد ترکِ تعلق رکھا، اور بخاری شریف جلد دوم ص:۸۹۷[۳] میں ہے کہ: حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے ایک جملہ کہہ دینے کی وجہ سے حضرت عائشہؓ نے زندگی بھر کلام نہ کرنے کی قسم کھالی تھی، اور پھر حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے ان کی بہت خوشامد کی اور دُوسرے حضرات سے سفارش کرائی تب حضرت عائشہؓ نے ان کو معاف کیا اور قسم کے خلاف کرنے کی وجہ سے چالیس غلام آزاد کئے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنے بیٹے سے ایک جملے کی وجہ سے جس سے حدیث کی مخالفت کا وہم ہوتا تھا، ترکِ تعلق کرلیا، پھر تاحیات ان سے کلام نہیں فرمایا، مشکوۃ شریف ج:۱ ص:۹۷[۴]۔ پس کسی پر شرعی نکیر کرنا اور ان سے ترکِ تعلق کرنا یا اس کی قسم کھالینا جبکہ وہ اس کے عقد میں بھی ہو اور اُمید ہو کہ وہ اپنی اصلاح کریں گے، بلاشبہ دُرست ہے بلکہ بعض صورتوں میں ضروری اور لازم ہے، کما لا یخفی، اور قسم کھاکر پھر مصالح کی بنا پر اس کے توڑنے اور اس کے کفارہ ادا کرنے کا بھی اختیار حاصل ہے، اور یہ حدیثِ مذکور سے ثابت ہے۔

تنبیہ:- ضد کہتے ہیں ناحق پر اَڑنے کو، اور کسی دینی مسئلے پر اَڑنا ضد نہیں بلکہ عین اتباعِ شریعت ہے۔

واللہ اعلم بالصواب
العبد شفقت اللہ
۷؍شعبان ۱۴۱۸ھ

الجواب صحیح
منظور احمد المظاہری
مفتی مدرسہ جامع العلوم کانپور

الجواب صحیح
ابرار الحق
۸؍شعبان ۱۴۱۸ھ

صح الجواب بلا ارتیاب
محمد حنیف غفرلہٗ

الجواب صحیح
محمد انعام اللہ
مفتی مدرسہ امدادیہ مرادآباد

الجواب صحیح
سہیل احمد غفرلہٗ

الجواب صحیح
فہیم احمد نگینوی
نائب مفتی مدرسہ اشرف المدارس

الجواب صحیح
محمد فاروق غفرلہٗ
مفتی دار العلوم میرٹھ

واصاب المجیب فیما اجاب
الجواب صواب
محمد عبداللہ پھولپوری

احقر کو اس جواب سے حرف بحرف اتفاق ہے، فقط واللہ اعلم
العبد نظام الدین مفتی دار العلوم دیوبند

بندہ کو اس جواب کے ہر ہر جز سے اتفاق ہے
مقصود احمد انبیٹھوی مظاہر العلوم سہارنپوری

---

(۱) الصحیح للبخاری باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا رأیتم الھلال فصوموا ... الخ. رقم الحدیث: ۱۸۱۱ و ۱۸۱۲ ج:۲ ص:۶۷۵ (طبع دار ابن کثیر یمامۃ بیروت).
(۲) أبو داؤد باب ترک السلام علی أھل الأھواء ج:۴ ص:۱۹۹ (طبع دار الفکر).
(۳) صحیح بخاری شریف باب الھجرۃ ج:۲ ص:۸۹۷ (طبع قدیمی کتب خانہ).
(۴) مشکوۃ المصابیح قبیل باب تسویۃ الصفوف ج:۱ ص:۹۷ (طبع مذکور).

جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کا فتویٰ

حامداً و مصلیاً و مسلماً، اما بعد! یہ کہ جوابِ استفتاء اَمرِ منکر پر نکیر کرنے کی حد تک مدلل اور اقرب الی التحقیق ہے، البتہ میت کے دفنانے کے بعد اس مقام پر نہ جانے کا حلف اُٹھانا محتاجِ دلیل ہے، اس لئے کہ منکر کا سبب میت نہیں، میت کی تدفین کے بعد مقامِ دفن پر نہ جانے کی قسم سے ضد کا شائبہ ہوسکتا ہے۔

کتبہ

محمد عبدالمجید دین پوری عفی عنہ
دار الافتاء، جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی
۲۶/۱۱/۱۴۱۸ھ

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ

دار الافتاء والارشاد ناظم آباد کا فتویٰ

الجواب باسم ملہم الصواب، ہردوئی سے لکھا ہوا جواب صحیح ہے، بنوری ٹاؤن کے جواب میں جو ضد کے شائبہ کو ظاہر کیا گیا ہے وہ صحیح معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ حالف کا مقصد میت سے دُشمنی اور اس کے مدفن سے ضد نہیں بلکہ اہلِ میت کو اس منکر کے ارتکاب پر تنبیہ کرنا اور اس کے غم میں شریک نہ ہونے کا اظہار ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

عبدالواحد
دار الافتاء والارشاد ناظم آباد
۳/ ذوالحجہ ۱۴۱۸ھ

الجواب صحیح
موسیٰ

الجواب صحیح
احمد

فتویٰ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

(دار الافتاء جامعہ دار العلوم کراچی)

(مذکورہ بالا تمام فتاویٰ اُستاذِ محترم حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کی خدمت میں پیش کئے گئے، حضرتِ والا دامت برکاتہم نے اس کا جو جواب لکھا وہ درج ذیل ہے۔) (مرتب)

جواب:- سب سے پہلے تو یہ سمجھنا چاہئے کہ ہم بحیثیت مسلمان تکوینی اُمور کے مکلّف نہیں، بلکہ اَحکامِ شریعت کے مکلّف ہیں، لہٰذا اگر کسی شخص کے بارے میں یہ مقدر ہو کہ وہ فلاں جگہ پر دفن ہوگا تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس جگہ دفن کرنا شرعاً جائز یا مناسب تھا، لہٰذا صورتِ مسئلہ میں یہ استدلال دُرست نہیں ہے کہ چونکہ حضرت مولانا صدیق احمد باندویؒ کو اس شہر میں دفن نہیں کیا گیا جہاں ان کی وفات ہوئی بلکہ دُوسرے شہر لے جایا گیا، لہٰذا شرعاً بھی ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔ البتہ اصل دار و مدار اس

بات پر ہے کہ شرعاً میّت کو ایک شہر سے دُوسرے شہر لے جاکر دفن کرنا کیا حیثیت رکھتا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ اس مسئلے میں فقہائے کرام کا اختلاف ہے، خود فقہائے حنفیہ کے بھی اس میں مختلف اقوال ہیں، بعض حضرات اس کو جائز کہتے ہیں اور بعض مکروہ، جن میں سے بعض نے اس کے مکروہِ تحریمی ہونے کی بھی تصریح کی ہے، لہٰذا یہ بات واضح ہے کہ میت کو اسی شہر کے قبرستان میں دفن کرنا چاہئے جہاں اس کا انتقال ہوا ہو، اور بلاعذر دُوسرے شہر کی طرف منتقل نہیں کرنا چاہئے، لہٰذا اگر کسی بزرگ نے اس شرعی مسئلے پر عمل کے لئے میّت کو دُوسرے شہر لے جانے سے منع کیا، جبکہ ہمارے زمانے میں اس نقل مکانی پر دُوسرے متعدّد مفاسد بھی مرتب ہونے لگے ہیں تو اس کو موردِ طعن بنانا ہرگز دُرست نہیں، بالخصوص جبکہ اس بزرگ کی حیثیت ایک مقتدا کی ہو اور وہ لوگوں کی اصلاح اور تربیت کی خاطر ایسا کرے، یہ اور بات ہے کہ شریعت میں نکیر کے بھی مختلف درجات ہوتے ہیں اور کسی غلط بات پر نکیر اس کی نکارت اور مفاسد کے بقدر ہی ہونی چاہئے۔

صورتِ مسئولہ میں نکیر کے لئے جو نمازِ جنازہ پڑھنے سے انکار اور میّت کی قبر پر نہ جانے کی قسم کھانا مذکور ہے، اس میں کوئی بات شرعاً ناجائز نہیں، کیونکہ نمازِ جنازہ فرضِ کفایہ ہے، اس لئے کسی کی نمازِ جنازہ میں شرکت نہ کرنے کو جبکہ دُوسرے لوگوں نے اس کی نماز پڑھی ہو، ناجائز نہیں کہا جاسکتا ہے۔ اسی طرح کسی قبر پر جانا کوئی واجب نہیں ہے، اس لئے وہاں نہ جانے کا عزم ظاہر کرنا یا اس پر قسم کھانا ایسا اَمر ہے کہ اس کو ناجائز نہیں کہا جاسکتا۔ رہی یہ بات کہ اس مسئلے میں نکیر جس درجے کی کی گئی وہ زیادہ مناسب تھی یا اس سے کم درجے کی نکیر بھی کافی ہوسکتی تھی؟ تو اس میں آراء مختلف ہوسکتی ہیں، اور مختلف حالات میں اس کا جواب مختلف ہوسکتا ہے، لہٰذا جس درجے کی نسبتاً سخت نکیر سوال کے پہلے جواب میں مذکور ہے اس کو بھی شرعاً ناجائز نہیں کہا جاسکتا، اور اس سے نرم درجے کی نکیر بھی اُصولاً جائز اور کافی ہے، جیسا کہ درج ذیل دلائل سے واضح ہے۔

ایک شہر سے دُوسرے شہر لے جانے کا شرعی حکم
اور مجتہد فیہ مسائل میں نکیر کے درجات

ورأينا هذا مبني على ما يأتي:-

ا:- ان المسئلة فيها أقوال مختلفة للفقهاء الحنفية فضلا عن غيرهم من المالكية والحنابلة كما هو ظاهر من العبارات الملحقة.

۲:- من ذهب الى الكراهة فالظاهر من عبارات القوم أنه أراد التنزيهية ولم يصرح

بسكونها تحريمية الا الطحطاوى فى حاشيته علىٰ مراقى الفلاح ولعله أخذ ذٰلك باطلاق الكراهة وقد صرح من هو أقدم منه بكونه خلاف المستحب كما يظهر من العبارات الملحقة.

۳:- ولئن سلم أن الكراهة تحريمية ولا شك أن العمل به أحوط فلا اقل من أن المسئلة محل خلاف بين الفقهاء الحنفية ومثل هٰذه الأمور المجتهد فيها لا تستحق التشدد فى الانكار كما تستحقه المحرمات القطعية.

۴:- الانكار ينبغى أن يكون علىٰ من يرتكب المنكر وينبغى أن يتوجه التأديب اليه ولا شك أن فى الصورة المسئولة انما نقل الميت أهله فلا انكار على الميت فترك الصلوٰة عليه أو الحلف علىٰ عدم الذهاب الىٰ قبره متوجه الى الميت الذى هو برئ عن عهدة نقله ولا سيما اذا كان عالمًا ورعًا يقتدى به الناس ومن المعروف أن الحلف لا يصار اليه الا عند الضرورة قال فى المحيط الأفضل فى اليمين باللّٰه تعالىٰ تقليلها وفى تكثير اليمين المضافة الى المستقبل تعريض اسم اللّٰه تعالىٰ للهتك.

(طحطاوى على الدر ج:۲ ص:۳۲۴، طبع مكتبة عربيه كوئٹه، وبهشتى زيور ج:۳ ص:۲۶۷)

۵:- وقد أنكرت عائشةؓ علىٰ نقل أخيها عبدالرحمٰن بن أبى بكرؓ الىٰ غير المكان الذى توفى فيه لٰكنها زارت قبره ولم تترك الزيارة لأجل نقله الىٰ ذٰلك المكان.

واللہ سبحانہ اعلم

الجواب صحیح	الجواب صحیح	احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ	سحبان محمود	۱۴۱۹/۲/۵ھ
		(فتویٰ نمبر ۲۳/۳۰۹)

اختلاف العلماء فى جواز نقل الميّت

المالكية والحنابلة صرحوا بجواز نقل الميت من بلد الىٰ اٰخر قال الدردير فى شرحه لمختصر خليل الشرح الصغير "وجاز نقله أى الميت من مكان الىٰ اٰخر وان من بلد لأخر قبل دفنه أو بعده لمصلحة كان يخاف عليه أن يأكله البحر أو السبع وكرجاء بركته للمكان المنقول اليه أو زيارة أهله أو لدفنه بين أهله ونحو ذٰلك (ان لم تنتهك حرمته) بانفجاره أو نتانته. (ج:۱ ص:۵۲۶، طبع دار المعارف مصر)

وقال ابن قدامة فى المغنى:-

وقال أحمد ما أعلم بنقل الرجل يموت فى بلده الىٰ بلد اٰخر بأساً، وسئل الزهرى

عن ذلک فقال قد حمل سعد بن أبی وقاص وسعید بن زید من العقیق الی المدینة وقال ابن عیینة مات ابن عمر هنا فأوصی أنه لا یدفن ههنا وأن یدفن بسرف. (ج:۲ ص:۳۹۰)[1].

وأما مذهب الشافعیة فما جاء فی شرح الاقناع:-

ویحرم نقل المیت قبل دفنه من محل موته الی محل أبعد من مقبرة محل موته لیدفن فیه الا أن یکون بقرب مکة أو المدینة أو بیت المقدس.

وفی حاشیته:-

المراد بالقرب مسافة لا یتغیر المیت فیها قبل وصوله والمراد بمکة جمیع الحرم ولا ینبغی التخصیص بالثلاثة بل لو کان بقرب مقابر أهل الصلاح والخیر فالحکم کذٰلک لأن الشخص یقصد الجار الحسن. (أوجز المسالک ج:۳ ص:۲۵۳ طبع ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان) ومثله فی تحفة المحتاج لابن حجر هیتمی. (ج:۳ ص:۲۰۲، ۲۰۳)

اختلاف الأقوال فیما بین الحنفیة:

قال فی الدر المختار:-

ولا بأس بنقله قبل دفنه.

وقال ابن عابدین تحته:-

(قوله ولا بأس بنقله قبل دفنه) قیل مطلقًا وقیل الی ما دون مدة السفر وقیده محمد بقدر میل أو میلین لأن مقابر البلد ربما بلغت هذه المسافة فیکره فیما زاد قال فی النهر عن عقد الفرائد وهو الظاهر. (ج:۲ ص:۲۳۹ طبع سعید)

تحقیق کراهة النقل:

قد مرّ عن رد المحتار أنه یکره نقل المیت قبل الدفن وذکر الطحطاوی فی حاشیته علی مراقی الفلاح (ص:۳۳۷ طبع نور محمد کتب خانه) أنها تحریمیة ولکن الظاهر أنه فهم التحریم من اطلاق لفظ الکراهة ولکن یظهر من کتب الفقهاء الحنفیة أنهم انما أرادوا الکراهة التی هی ضد المستحب ویظهر ذلک من العبارات الآتیة.

قال العلامة بحر العلوم رحمه الله فی رسائل الأرکان:-

النقل بعد نبش القبر کما هو المتعارف الیوم مکروه تحریمًا أشد الکراهة لأن نبش القبر واخراج المیت لا یجوز لأنه قد سلم الی الله تعالیٰ وأما قبل النبش فمکروه والأفضل أن

(۱) المغنی لابن قدامة ج:۳ ص:۴۴۳ (طبع دار عالم الکتب، ریاض).

لا ینقل. (رسائل الأرکان ص: ۱۵۹ طبع قدیم مطبع یوسفی فرنگی محل لکهنؤ)

فصرح العلامة رحمه الله بأن النقل بعد الدفن مکروه تحریمًا ثم ذکر مسألة النقل قبل الدفن فأطلق الکراهة ولم یقیدها بالتحریم فظهر أنه أراد به ما هو دون الکراهة التحریمیة ولذلک أعقبه بقوله: "الأفضل أن لا ینقل".

وانما ذکروه من انه حیث أطلق الکراهة فالمراد به التحریمیة لیست بکلیة قال ابن عابدینؒ نقلا عن البحر:-

المکروه فی هذا الباب نوعان أحدهما ما کره تحریمًا وهو المحمل عند اطلاقهم الکراهة .... ثانیهما المکروه تنزیهًا ومرجعه الی ما ترکه أولی وکثیرًا ما یطلقونه کما فی شرح المنیة فحینئذ اذا ذکروا مکروهًا فلا بد من النظر فی دلیله فان کان نهیاً ظنیاً یحکم بکراهة التحریم الا لصارف للنهی عن التحریم الی الندب فان لم یکن الدلیل نهیًا بل کان مفیدًا للترک الغیر الجازم فهی تنزیهیة.

(رد المحتار ج:۱ ص:۱۳۲ طبع سعید، قبیل مطلب فی الاسراف فی الوضوء)

وانما استدل علی کراهة النقل أولا بما روی عن رسول الله صلی الله علیه وسلم أنه قال فی شهداء أحد: "ردوا القتلی الی مضاجعهم". (رواه أحمد والترمذی وأبوداؤد والنسائی)

ولکن قال الامام السرخسی رحمه الله فی شرح هذا الحدیث:-

وهذا حسن لیس بواجب وانما صنع هذا رسول الله صلی الله علیه وسلم لأنه کره المشقة علیهم بالنقل مع ما أصابهم من القرح. (شرح السیر الکبیر ج:۱ ص:۲۲۳ فقره نمبر ۳۰۱)

والدلیل الثانی للکراهة هو حدیث عائشةؓ حیث قالت عند زیارة قبر أخیها عبدالرحمن ابن أبی بکرؓ الذی نقل من الحبش الی مکة: "والله لو حضرتک ما دفنت الا حیث مت" وقد علق علیه الامام السرخسیؒ بقوله:-

وفیه دلیل أن الأولی أن یدفن القتیل والمیت فی المکان الذی مات فیه فی مقابر أولئک القوم. (شرح السیر الکبیر ج:۱ ص:۲۲۶ رقم:۳۰۳)

واستدل الامام السرخسیؒ بحدیث عائشةؓ علی أن الأولی عدم النقل والنقل خلافه فهو مکروه تنزیهًا.

وانما أخذ الفقهاء الحنفیة الکراهة من قول الامام محمدؒ فی السیر الکبیر ولو نقل میلًا أو میلین أو نحو ذلک فلا بأس به فاستنبطوا من هذا القول أن النقل الی ما زاد مکروه

ولذلک قال السرخسی رحمه الله:-

وفی هذا بیان أن النقل من بلد الی بلد مکروه لأنه قدر المسافة التی لا یکره النقل فیها بمیل أو میلین وهذا لأنه اشتغال بما لا یفید فالأرض کلها کفات للمیت قال الله تعالیٰ: اَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ كِفَاتًا أَحْيَآءً وَّأَمْوَاتًا. إلا أن الحی ینتقل من موضع الی موضع لغرض له فی ذلک وذلک لا یوجد فی حق المیت ولو لم یکن فی نقله الا تأخیر دفنه أیا ما کان کافیا فی الکراهة. (شرح السیر الکبیر ج:۱ ص:۲۳۶، ۲۳۷ فقره نمبر ۳۰۴)

وقد سبق أن الامام السرخسیؒ جعل عدم النقل أولی فظاهر أن مراده من الکراهة هنا التنزیهیة وما یدل علی کون الکراهة تنزیهیة أن کثیرًا من الفقهاء صرحوا بعدم الإثم فی النقل ومن مقدمتهم صاحب الهدایة کما ذکره ابن الهمامؒ عنه فقال:-

قال المصنف فی التجنیس: فی النقل من بلد الی بلد لا اثم، ثم ذکر عن صاحب الهدایة نفسه أنه قال:-

اذا مات فی بلدة یکره نقله الی أخریٰ لأنه اشتغال بما لا یفید.

(فتح القدیر ج:۲ ص:۱۰۱، ۱۰۲ طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه)

فظهر بهٰذا أن المراد بالکراهة ما یجتمع مع عدم الاثم وهو الکراهة التنزیهیة لذٰلک ذکر کثیر من الفقهاء عدم الإثم بدون التصریح بالکراهة وانما ذکروا أن المستحب أن یدفن فی المکان الذی مات فیه.

قال ابن نجیمؒ:-

ولم یتکلم المصنف علی نقل المیت من مکان الی اٰخر قبل دفنه قال فی الواقعات والتجنیس: القتیل أو المیت یستحب لهما أن یدفنا فی المکان الذی قتل أو مات فیه فی مقابر أولٰئک القوم لما روی عن عائشة رضی الله عنها أنها زارت قبر أخیها عبدالرحمٰن بن أبی بکرؓ وکان مات بالشام وحمل من هناک فقالت: لو کان الأمر فیک بیدی ما نقلتک ولدفنتک حیث مت. لٰکن مع هٰذا اذا نقل میلًا أو میلین أو نحو ذٰلک فلا بأس وان نقل من بلد الی بلد فلا إثم فیه. (البحر الرائق ج:۲ ص:۱۹۵ طبع رشیدیه کوئٹه)

وقال العلامة الأفندی فی مجمع الأنهر:-

ویستحب فی القتیل والمیت دفنه فی المکان الذی مات فی مقابر أولٰئک المسلمین وإن نقل قبل الدفن إلی قدر میل أو میلین فلا بأس به وکذا لو مات فی غیر بلده

یستحب ترکه فان نقل الی مصر اخر فلا بأس به. (مجمع الأنهر ج:۱ ص:۱۸۷).[۱]

وراجع أیضًا فتاویٰ تاتارخانیة ج:۲ ص:۱۷۵ (طبع ادارة القرآن) وتعلیق الشیخ أبی الوفاء الأفغانی علی کتاب الآثار ج:۲ ص:۲۰۴.[۲]

ولقد أطال الشیخ علیّ القاری رحمه الله وأحسن فی التوفیق بین العبارات بعبارة نوردها بتمامها:-

أما اذا أرادوا نقله قبل الدفن أو تسویة اللبن فلا بأس بنقله نحو میل أو میلین قال فی التجنیس لأن المسافة الی المقابر قد تبلغ هذا المقدار وقال السرخسیّ قول محمد بن سلمة ذلک دلیل علی أن نقله من بلد الی بلد مکروه والمستحب أن یدفن کل فی مقبرة البلدة التی مات بها، ونقل عن عائشة أنها قالت حین زارت قبر أخیها عبدالرحمٰن وکان مات بالشام وحمل منها: ولو کان الأمر فیک الیّ ما نقلتک ولدفنتک حیث مت. ثم قال فی التجنیس فی النقل من بلد الی بلد لا إثم لما نقل أن یعقوب علیه الصلوٰة والسلام مات بمصر ونقل عنه الی الشام وموسی علیه الصلوٰة والسلام نقل تابوت یوسف علیه الصلوٰة والسلام بعد ما أتی علیه زمان من مصر الی الشام لیکون مع ابائه ولا یخفی أن هذا شرع من قبلنا ولم تتوفر فیه شروط کونه شرعًا لنا إلا انه نقل عن سعد بن أبی وقاص أنه مات فی ضیعة علی أربعة فراسخ من المدینة فحمل علی أعناق الرجال الیها وفیه أنه نقل حین موته لا بعد دفنه فلا دخل له فی القضیة ویمکن أن یحمل نقل یعقوب ویوسف عن عذر وأیضًا فلا تنافی بین الإثم والکراهة اذا الکراهة محمولة علی التنزیه وهو خلاف الأولیٰ الا لعارض قال صاحب الهدایة وذکر أن من مات فی بلدة یکره نقله الی أخریٰ لأنه اشتغال بما لا یفید بما فیه تأخیر دفنه وکفی بذلک کراهة قلت فاذا کان یترتب علیه فائدة من نقله الی أحد الحرمین أو الی قرب قبر أحد من الأنبیاء أو الأولیاء أو لیزوره أقاربه من ذلک البلد وغیر ذلک فلا کراهة إلا ما نص علیه من شهداء أحد أو من فی معناهم من مطلق الشهداء والله اعلم. (مرقات ج:۳ ص:۷۳).[۳]

مسئلة النکیر علی الأمور المجتهد فیها

قد صرح غیر واحد من الفقهاء والمحدثین بأنه لا ینبغی التشدد فی النکیر علی الأمور التی اختلف فیها الفقهاء. فی الأحکام السلطانیة للماوردی ص:۳۱۵:-[۴]

---

(۱) مجمع الأنهر شرح ملتقی الأبحر ج:۱ ص ۲۷۲ (طبع دار الکتب العلمیه، بیروت).

(۲) (طبع مذکور).

(۳) مرقاة شرح مشکوة ج:۴ ص:۱۸۳، ۱۸۴ (طبع مکتبه حقانیه پشاور).

(۴) ص:۲۵۳ (طبع دفتر تبلیغات اسلامی حوزه علمیه قم).

أما المعاملات المنكرة كالزنا والبيوع الفاسدة وما منع الشرع منه مع تراضى المتعاقدين به اذا كان متفقًا علىٰ حظره فعلى والى الحسبة انكاره والمنع منه والزجر عليه وأمره فى التأديب مختلف بحسب الأحوال وشدة الحظر وأما ما اختلف الفقهاء فى حظره واباحته فلا مدخل له فى إنكاره إلا أن يكون مما ضعف الخلاف فيه وكان ذريعة إلىٰ محظور متفق عليه كربا النقد فالخلاف فيه ضعيف وهو ذريعة إلى ربا النساء المتفق علىٰ تحريمه فهل يدخل فى انكاره بحكم ولايته أو لا؟ علىٰ ما قدمناه من الوجهين وفى معنى المعاملات وان لم تكن منها عقود المناكح المحرمة ينكرها ان اتفق العلماء علىٰ حظرها ولا يتعرض لإنكارها ان اختلف الفقهاء فيها الا أن يكون مما ضعف الخلاف فيه وكان ذريعة إلىٰ محظور متفق عليه كالمتعة فربما صارت ذريعة إلىٰ استباحة الزنا.

وفى المرقاة ج:۸ ص:۸۶۳ (طبع مكتبه حقانيه پشاور): وما يتعلق بالاجتهاد لم يكن للعوام مدخل فيه لأن انكاره علىٰ ذٰلك للعلماء ثم العلماء انما ينكرون ما أجمع عليه الأئمة وأما المختلف فيه فلا انكار فيه لأن علىٰ أحد المذهبين كل مجتهد مصيب وينبغى للآمر والناهى أن يرفق ليكون أقرب الى تحصيل المطلوب.

وفى شرح مسلم للنوويؒ ج:۱ ص:۵۱ (طبع قديمى كتب خانه): ثم انه انما يأمر وينهىٰ من كان عالمًا بما يأمر به وينهىٰ عنه وذٰلك يختلف باختلاف الشئ فان كان من الواجبات الظاهرة والمحرمات المشهورة كالصلوٰة والصيام والزنا والخمر ونحوها فكل المسلمين علماء بها وان كان من دقائق الأفعال والأقوال ومما يتعلق بالاجتهاد ولم يكن للعوام مدخل فيه ولا لهم انكاره بل ذٰلك للعلماء ثم العلماء انما ينكرون ما أجمع عليه أما المختلف فيه فلا انكار فيه لأن علىٰ أحد المذهبين كل مجتهد مصيب وهٰذا هو المختار عند كثير من المحققين أو أكثرهم وعلى المذهب الآخر المصيب واحد والمخطئ غير متعين لنا والإثم مرفوع عنه لٰكن ان مذهبه علىٰ جهة النصيحة إلى الخروج من الخلاف فهو حسن محبوب مندوب إلىٰ فعله برفق فان العلماء متفقون على الحث على الخروج من الخلاف اذا لم يلزم منه اخلال بسنة أو وقوع فى خلاف آخر وذكر أقضى القضاة أبو الحسن الماوردى البصرى الشافعى فى كتابه الأحكام السلطانية خلافا بين العلماء فى أن من قلده السلطان الحسبة هل له أن يحمل الناس علىٰ مذهبه فيما اختلف فيه الفقهاء اذا كان المحتسب من أهل الإجتهاد أم لا يغير ما كان علىٰ مذهب غيره والأصح أنه لا يغير لما ذكرناه ولم يزل الخلاف

فی الفروع بین الصحابة والتابعین فمن بعدهم رضی الله عنهم أجمعین ولا ینکر محتسب ولا غیره علیٰ غیره وکذلک قالوا لیس للمفتی ولا للقاضی أن یعترض علیٰ من خالفه اذا لم یخالف نصًا أو إجماعاً أو قیاساً جلیاً، والله تعالیٰ أعلم.

وفی إکمال إکمال المعلم ج:۱ ص:۱۵۴ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت): ثم ما اشتهر حکمه کالصلوٰة وحرمة الزنا یستوی فی القیام به العلماء وغیرهم وما دق من الأفعال والأقوال فانما یقوم به العلماء ثم العلماء لا یغیرون الا ما اتفق علیه ولا یغیرون فی مسائل الخلاف لأنه ان کان کل مجتهد مصیبًا فواضحٌ وکذلک علی أن المصیب واحد لأن المخطئ غیر اثم نعم یندب إلی الخروج من الخلاف للاتفاق علیٰ رجحان الخروج منه.

وفی أصول الفقه الاسلامی للزحیلی ج:۲ ص:۱۰۹۲ (طبع دار احسان دمشق): قد أجمع الصحابة علیٰ ترک النکیر علیٰ من خالف منهم فی المسائل الفقهیة کإرث الجد مع الإخوة ومسألة العول ونحوها من مسائل الفرائض وغیرها فکانوا یتشاورون وینفرقون مختلفین ولا یعترض بعضهم علی بعض ولا یمنع أحدهم الأخر من افتاء العامة ولا یمنع العامة من تقلیده ولا یمنعه من الحکم باجتهاده وهذا کما قال الغزالی: متواتر تواترًا لا شک فیه مع انهم کانوا فیما قام علیه الدلیل القاطع یبالغون فی التأثیم والتشدید کما فعلوا فی تخطئة الخوارج.

وفی الهندیة ج:۵ ص:۳۵۳ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه): ویقال الأمر بالمعروف بالید علی الأمراء وباللسان علی العلماء وبالقلب لعوام الناس وهو اختیار الزندویسی کذا فی الظهیریة: الأمر بالمعروف یحتاج الی خمسة أشیاء، أوّلها العلم لأن الجاهل لا یحسن الأمر بالمعروف، والثانی أن یقصد وجه الله تعالیٰ واعلاء کلمته العلیا، والثالث الشفقة علی المأمور فیأمر باللین والشفقة، والرابع أن یکون صبورًا حلیما، والخامس أن یکون عاملا بما یأمره کیلا یدخل تحت قوله تعالی: لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ، ولا یجوز للرجل من العوام أن یأمر بالمعروف للقاضی والمفتی والعالم الذی اشتهر لأنه اساءة فی الأدب ولأنه ربما کان به ضرره فی ذٰلک والعامی لا یفهم ذٰلک کذا فی الغرائب.

اسی طرح منکر میں وہ تمام بُرائیاں اور مفاسد داخل ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ناجائز قرار دینا معلوم ومعروف ہے، اس مقام پر واجبات اور معاصی کے بجائے معروف و منکر کا عنوان اختیار کرنے میں شاید یہ حکمت بھی ہو کہ روکنے ٹوکنے کا معاملہ صرف ان مسائل میں ہوگا جو

اُمت میں مشہور و معروف ہیں اور سب کے نزدیک متفق علیہ ہیں، اجتہادی مسائل جن میں اُصولِ شرعیہ کے ماتحت مختلف رائیں ہوسکتی ہیں، ان میں یہ روک ٹوک کا سلسلہ نہ ہونا چاہئے، افسوس ہے کہ عام طور پر اس حکیمانہ تعلیم سے غفلت برتی جاتی ہے اور اجتہادی مسائل کو جدال کا میدان بنا کر مسلمانوں کی جماعت کو ٹکرایا جاتا ہے، اور اس کو سب سے بڑی نیکی قرار دیا جاتا ہے، اور اس کے بالمقابل متفق علیہ معاصی اور گناہوں سے روکنے کی طرف توجہ بہت کم دی جاتی ہے۔ (از معارف القرآن ج:۲ ص:۱۴۱)

واللہ سبحانہ اعلم

پیدائش کے فوراً بعد مرنے والے بچے کے نام رکھنے، نمازِ جنازہ اور تجہیز و تکفین کے اَحکام

سوال ۱:- ایک عورت کا پانچ ماہ کا حمل ساقط ہوگیا، پیدائش کے بعد دائی بتاتی ہے کہ بچے نے سانس لیا اور فوراً ہی فوت ہوگیا، بچے کے اعضاء دُرست تھے، جس سے مذکر و مؤنث کی شناخت ہوتی تھی، مگر بہت ہی کمزور و ناتواں تھا۔ زید کہتا ہے کہ اس بچے نے دُنیا میں آکر سانس لیا ہے لہٰذا اس کے سب کام انجام دیئے جائیں، مثلاً غسل، کفن، نمازِ جنازہ اور قبر بھی بنائی جائے۔

۲:- جب غسل کے لئے آدمی آیا تو اس نے اپنے تجربے کی بناء پر کہا کہ اس نے سانس ہرگز نہیں لیا، اس کی ہیئت اور حالت ایسی نہیں کہ اس میں جان پڑی ہو، اگر اس کے سب کام کئے تو آپ گنہگار ہوں گے، لہٰذا اس بچے کو بغیر غسل اور بغیر نماز کے قبرستان کے ایک گوشے میں گڑھا کرکے دبادیا جائے۔

۳:- اگر یہ سب کام ضروری تھے تو اَب چونکہ اس کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی گئی تو کیا اس کی غائبانہ نماز پڑھی جائے جبکہ نمازِ جنازہ میں میت کا سامنے ہونا شرط ہے؟ اور سنتے ہیں کہ بڑے لوگوں کی نمازِ جنازہ غائبانہ پڑھی جاتی ہے، اور اس سلسلے کی ایک بات یہ ہے کہ ایسے بچوں کا نام رکھنا ضروری ہے؟ بکر کہتا ہے کہ نام رکھنا بہت ضروری ہے کیونکہ حشر میں نام سے پکارا جائے گا، خواہ ولادت مردہ ہو یا زندہ، نام رکھنا ضروری ہے۔ آپ ان سب باتوں کے بارے میں اَحکام بیان فرمائیں۔

جواب ۱:- بچے نے سانس لیا ہو یا نہ لیا ہو، جب اس کے تمام اعضاء بن چکے تھے تو اسے غسل تو ہر حالت میں دینا چاہئے تھا اور اس کا نام بھی رکھنا چاہئے تھا، البتہ سانس نہ لینے کی صورت میں نماز ضروری نہیں تھی، لیکن جب قابلِ اعتماد دائی گواہی دے رہی ہے کہ بچے نے سانس لیا ہے تو اس کی گواہی معتبر ہے، اور اس کے بعد اس کو غسل دینا، نام رکھنا، کفن دینا، نمازِ جنازہ پڑھنا سب ضروری تھا

اور قبر بھی ہر حالت میں ضرور بنانی چاہئے تھی، کما فی رد المحتار، ولو شهدت القابلة أو الأم علی الاستهلال تقبل فی حق الغسل والصلٰوة علیه لأن خبر الواحد فی الدیانات مقبول اذا کان عدلا. (شامی ج:۱ ص:۵۹۴) وفی الدر المختار ومن ولد فمات یغسل ویصلّی علیه۔[1]

۲:- دائی اگر قابلِ اعتماد تھی تو اس کے مقابلے میں غسل دینے والے کا قول معتبر نہیں تھا۔

۳:- اگر دفن کئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا اور تجربہ کار لوگ یہ بتاتے ہیں کہ غالب گمان یہ ہے کہ میّت پھولی پھٹی نہ ہوگی تو اس کی قبر پر نمازِ جنازہ پڑھنا واجب ہے، قبر پر جاکر اس طرح نماز پڑھ لیں جس طرح میّت کو سامنے رکھ کر نماز پڑھی جاتی ہے، اور اگر زیادہ عرصہ گزر چکا ہے اور غالب گمان یہ ہے کہ میّت پھٹ گئی ہوگی تو پھر نماز نہ پڑھیں۔

لما فی الدر المختار (وان دفن) واهیل علیه التراب (بغیر صلٰوة) أو بها بلا غسل أو ممن لا ولایة له (صلّی علٰی قبره) استحسانًا ما لم یغلب علی الظن تفسخه من غیر تقدیر هو الأصح.[2] وفی رد المحتار (قوله صلّی علٰی قبره) أی افتراضًا فی الأولیین وجوازًا فی الثالثة۔

۴:- جی ہاں! نام رکھنا ضروری ہے جیسا کہ نمبر ۱ میں گزرا۔ واللہ اعلم

۱۳۹۸/۲/۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۵۹ ۲۹ الف)

دار الحرب میں مرنے والے مسلمان پر شرعی اَحکام جاری ہوں گے

سوال:- ایک آدمی نے دار الحرب میں اسلام قبول کیا، مگر وہ وہاں کوئی ایسے آدمی کو نہیں پاتا کہ جو اسے قرآن پڑھائے اور فرائض اور واجبات سکھائے، اسی حالت میں چھ ماہ گزرنے کے بعد وہ شخص مرجاتا ہے، آیا اس پر دین کے اَحکام جاری ہوں گے یا نہیں؟ اور اگر جاری ہوں گے تو اس کو کس طرح ادا کیا جائے؟

جواب:- اس صورت میں اس شخص کو چاہئے تھا کہ وہ دار الحرب سے ہجرت کرکے ایسی جگہ اقامت اختیار کرنے کی کوشش کرتا جہاں دینی معلومات حاصل ہوسکتی ہوں، بہرحال وہ مسلمان ہے اور اسلامی اَحکام اس پر جاری ہوں گے، اب جبکہ اس نومسلم کا انتقال ہوچکا ہے اس سے ہمدردی رکھنے

---

(۱) الدر المختار مع رد المحتار ج:۲ ص:۲۲۷، ۲۲۸ (طبع ایچ ایم سعید).

(۲) الدر المختار مع رد المحتار ج:۲ ص:۲۲۴، وفی الهندیة ج:۱ ص:۱۶۵ (طبع مکتبه ماجدیه) الفصل الخامس کتاب الجنائز، ولو دفن المیت قبل الصلوة أو قبل الغسل فانه یصلّی علی قبره إلی ثلاثة أیام والصحیح أن هذا لیس بتقدیر لازم بل یصلّی علیه ما لم یعلم انه قد تمزق .... الخ. (مرتب)

والوں کو چاہئے کہ بس قدر ہو سکے اسے ایصالِ ثواب کریں۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۴/۴ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع

(فتویٰ نمبر ۴۶۷/۲۲ الف)

دفن کے وقت کفن کی گرہ کھولنے کی حکمت میں حاشیہ شرح وقایہ اور دیگر فقہاءؒ کی عبارات میں تضاد کی تحقیق

سوال:- شرح وقایہ کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ کفن کی گرہ کھولنے میں فائدہ یہ ہوتا ہے کہ سوال و جواب کے وقت آسانی سے مردہ بیٹھ سکے، درایۃً اور روایۃً یہ کہاں تک صحیح ہے؟ لحد ہو یا شق، حقیقی طور پر بیٹھنا تو اس میں ممکن ہی نہیں، آپ واضح فرمائیں۔

جواب:- حاشیہ شرح وقایہ[1] کے اس بیان کا مأخذ معلوم نہیں ہو سکا، تمام فقہائے کرامؒ اس حکم کی وجہ یہ لکھتے ہیں کہ گرہ باندھنا انتشار کے خوف سے تھا، اور اب یہ خوف نہیں رہا، اس لئے کھول دی جائے، کذا فی شرح الوقایۃ[2] والھدایۃ[3] والدر المختار[4]۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۱۹ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۴۳/۱۹ الف)

---

(۱) وفی حاشیۃ شرح الوقایۃ ج:۱ ص:۲۱۰ (طبع ایچ ایم سعید) ویحل للاستغناء فانہ انما عقد خیفۃ انتشار الکفن لیسھل علیہ الجلوس فی القبر عند سؤال الملکین۔

(۲) وفی شرح الوقایۃ ج:۱ ص:۲۱۰ (طبع سعید) ویحل العقدۃ ای العقدۃ التی علی الکفن خیفۃ الانتشار۔

(۳) وفی الھدایۃ فصل فی الدفن ج:۱ ص:۱۸۲ (طبع مکتبہ شرکت علمیہ) (ویحل العقدۃ) لوقوع الأمن من الانتشار۔

(۴) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۳۶ (طبع سعید) وتحل العقدۃ للاستغناء عنھا وفی الشامیۃ (قولہ للاستغناء عنھا) لأنھا تعقد لخوف الانتشار عند الحمل۔

﴿فصل فی إیصال الثواب﴾
(ایصالِ ثواب سے متعلق مسائل کا بیان)

سوال:- جو لوگ گھروں پر قرآن خوانی کراتے ہیں ان کو قرآن کا ثواب ملے گا یا نہیں؟ پھر اس مردے کے لئے جس کے لئے قرآن خوانی کرائی ہے اسے ثواب ملے گا یا نہیں؟

اگر اللہ کے نام پر کپڑا یا پیسہ دیا جائے، ہماری نیت اس مردے کی رُوح کو ثواب پہنچانے کی ہو تو کیا اسے ثواب ملے گا یا نہیں؟ ہم روزانہ تلاوتِ قرآنِ پاک یا دُرود شریف، کلمۂ طیبہ پڑھ کر حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر تمام انبیاء تک اور تمام مسلمانوں کو جو رحلت کر چکے ہیں ان کو ایصالِ ثواب کریں تو کیا ان کو ثواب ملے گا یا نہیں؟

۲:- اگر کسی شخص کا ذاتی کاروبار یا مکان کا کرایہ آتا ہو، وہ اسے چھوڑ کر انتقال کر جائے تو اس شخص کے لئے یہ اثاثہ جو اس کی اولاد استعمال کرتے ہیں، کیا یہ صدقۂ جاریہ ہوگا یا نہیں؟

جواب ا:- نفلی عبادات، خواہ وہ تلاوتِ قرآن ہو یا نفلی نماز ہو یا صدقہ ہو، اس کا ثواب کسی مردے کو پہنچایا جاسکتا ہے اور اس کو ثواب پہنچتا بھی ہے،[1] اور خود ایصالِ ثواب کرنے والے کو بھی ثواب ملتا ہے،[2] لیکن اس کے لئے طریقہ ایسا اختیار کرنا چاہئے جس میں نام و نمود اور دِکھاوا وغیرہ نہ ہو۔ آج کل گھروں پر باقاعدہ لوگوں کو جمع کر کے جو قرآن خوانی کی جاتی ہے اس میں اکثر نام و نمود ہوتا ہے اور ناجائز رسمیں ہوتی ہیں، اس لئے اس سے پرہیز کر کے میت کو ثواب پہنچادیں، روزانہ جو تلاوت یا تسبیح وغیرہ پڑھتے ہیں اس کا ثواب تمام وفات شدہ مسلمانوں کو پہنچایا جاسکتا ہے،[3] اس میں کوئی حرج نہیں،

(۱ تا ۳) ایصالِ ثواب کے ثبوت کے لئے چند قرآنی آیات یہ ہیں:- فاعلم انہ لآ الٰہ الا اللّٰہ واستغفر لذنبک وللمؤمنین والمؤمنات. (سورۃ محمد: ۱۹)، وفی سورۃ الحشر: ۱۰ والذین جآءوا من بعدھم یقولون ربنا اغفر لنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین اٰمنوا ربنا انک رءوف رحیم. وفی سورۃ نوح: ۲۸ رب اغفر لی ولوالدی ولمن دخل بیتی مؤمنا وللمؤمنین والمؤمنات.

کتبِ تفسیر میں درج ذیل کتب ملاحظہ فرمائیں:- روح المعانی ج:۲۷ ص ۶۲، ۶۹ (طبع مکتبہ رشیدیہ لاہور)، معارف القرآن ج:۷ ص: ۲۱۹، وفی صفۃ التفاسیر ج:۳ ص ۳۲۳ (طبع مکتبہ فاروقیہ پشاور): رب اغفر لی، بدأ بنفسہ ثم بأبویہ ثم عمم لجمیع المؤمنین والمؤمنات لیکون ذلک أبلغ وأجمع. وفی کشف الخفاء ومزیل الالباس ج:۲ ص: ۳۷۱ رقم: ۲۶۳۰ (طبع مؤسسۃ الرسالۃ بیروت) من مر بالمقابر فقرأ احدی عشرۃ مرۃ قل ھو اللّٰہ احد ثم وھب أجرہ الأموات أعطی من الأجر بعدد الأموات. الخ.

(باقی اگلے صفحہ پر)

بلکہ ان شاء اللہ موجبِ ثواب ہوگا۔

(گزشتہ سے پیوستہ)............اور چند احادیثِ مبارکہ یہ ہیں:-

وفی الصحیح للبخاریؒ باب اذا قال داری صدقة .... الخ رقم: ۲۷۰۵ ج:۳ ص:۱۰۱۳ (طبع دار ابن کثیر یمامة بیروت) عن ابن عباسؓ أن سعد بن عبادةؓ توفیت أمّه وهو غائب عنها فقال: یا رسول الله! ان أمّی توفیت وأنا غائب عنها أینفعها شئ ان تصدقت به عنها؟ قال: نعم! قال: فانی أشهدک ان حائطی المخراف صدقة علیها.

وفی مشکوٰة المصابیح ج:۱ ص:۱۴۱ (طبع قدیمی کتب خانه) عن معقل بن یسار قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: اقرؤا سورة یٰسین علی موتاکم. رواه أحمد وأبوداؤد. وفی شرح الصدور للسیوطیؒ ص:۱۳۵ (مطابع الرشید مدینة المنورة) أخرج أبو القاسم سعد بن علی الزنجانی فی فوائده عن أبی هریرةؓ قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من دخل المقابر ثم قرأ فاتحة الکتاب و قُلْ هُوَ اللهُ اَحَدٌ و اَلْهٰکُمُ التَّکَاثُرُ ثم قال: اللّٰهم انی قد جلعت ثواب ما قرأت من کلامک لأهل المقابر من المؤمنین والمؤمنات کانوا شفعاءَ له الی الله تعالیٰ. وفیه أیضًا ص:۱۳۵ عن أنسؓ أن رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: من دخل المقابر فقرأ سورة یٰسین خفف الله عنهم وکان له بعدد من فیها حسنات. وفیه أیضًا ص:۱۳۲ أخرج الطبرانی فی الأوسط والبیهقی فی سننه عن أبی هریرةؓ قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: ان الله لیرفع الدرجة للعبد الصالح فی الجنة فیقول: یا ربّ أنّی لی هٰذه؟ فیقول: باستغفار ولدک لک. ولفظ البیهقی: دُعاء ولدک لک. وأخرجه البخاری فی الأدب عن أبی هریرةؓ موقوفًا. وفیه أیضًا ص:۱۳۵ عن أحمد بن حنبلؒ قال: اذا دخلتم المقابر فاقرؤا بفاتحة الکتاب والمعوذتین و قُلْ هُوَ اللهُ اَحَدٌ واجعلوا ذٰلک لأهل المقابر فانه یصل الیهم.

وفی الصحیح للامام مسلمؒ باب ما یلحق الانسان من الثواب بعد وفاته رقم: ۱۶۳۱ ج:۳ ص:۱۲۵۵ (طبع دار احیاء التراث العربی بیروت) عن أبی هریرةؓ أن رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: ثم اذا مات الانسان انقطع عنه عمله الا من ثلاثة الّا من صدقة جاریة أو علم ینتفع بها أو ولد صالح یدعو له. وراجع أیضًا مرقاة المفاتیح ج:۴ ص:۸۲ (طبع مکتبه امدادیه ملتان).

وفی شرح العقائد ص:۱۷۲ (طبع قدیمی کتب خانه) وفی دعاء الأحیاء للأموات وصدقتهم أی صدقة الأحیاء عنهم أی عن الأموات نفع لهم أی للأموات خلافًا للمعتزلة.

ان آیاتِ قرآنیہ اور احادیث وکتبِ عقائد کی عبارات کی بناء پر حضرات فقہائے کرامؒ نے اس عقیدۂ ایصالِ ثواب کو دُرست قرار دیا ہے، اور نہ صرف اس کا اثبات فرمایا بلکہ اسے مستحسن قرار دیا، چنانچہ کتبِ فقہ میں ہے:-

وفی الهدایة، باب الحج عن الغیر ج:۱ ص:۲۹۶ (طبع مکتبه شرکت علمیه) ان الانسان له أن یجعل ثواب عمله لغیره صلوٰة أو صومًا أو صدقة أو غیرها عند أهل السنة والجماعة.

وفی الشامیة ج:۲ ص:۲۴۳ مطلب فی القراءة للمیت واهداء ثوابها له، صرح علمائنا فی باب الحج عن الغیر بأن للانسان أن یجعل ثواب عمله لغیره صلوٰة أو صومًا أو صدقة أو غیرها کذا فی الهدایة .... الأفضل لمن یتصدق نفلًا أن ینوی لجمیع المؤمنین والمؤمنات لأنها تصل الیهم ولا ینقص من أجره شئ هو مذهب أهل السنة والجماعة (وفیه بعد أسطر) وفی البحر: من صام أو صلّی أو تصدق وجعل ثوابه لغیره من الأموات والأحیاء جاز، ویصل ثوابها الیهم عند أهل السنة والجماعة، کذا فی البدائع.

وفی معارف السنن ج:۵ ص:۲۸۶ (طبع ایچ ایم سعید) وقد تعرض فی الهدایة الی مسألة الاثابة واهداء الثواب فقال الأصل فی هٰذا الباب أن الانسان له أن یجعل ثواب عمله لغیره صلوٰة أو صومًا أو صدقة وغیرها عند أهل السنة والجماعة. وفیه أیضًا ج:۵ ص:۲۹۱ ثم ان الشافعیؒ لا یجوز اهداء ثواب تلاوة القران ولا یصح عنده الاثابة فیما عدا الدعاء والصدقة ولٰکن الشافعیة أفتوا بایصال ثواب التلاوة ویجوز عندنا اهداء ثواب کل شئ .... وتبین أن مذهب أبی حنیفة فی هذا الصدد أوسط المذاهب .... الخ. (محمد زبیر حق نواز عفا اللہ عنہما)

۲:- اگر کسی شخص نے اس نیت سے کمایا ہو کہ یہ میرے بچوں یا عزیزوں کے کام آئے تو اِن شاء اللہ اس پر صدقۂ جاریہ کا ثواب ملنے کی اُمید ہے۔ واللہ اعلم

۱۴۰۱/۱۰/۲۲ھ

(فتویٰ نمبر ۳۲/۱۶۰۳ ج)

ایصالِ ثواب کے لئے صدقۂ جاریہ میں کون سی چیز بہتر ہے؟

سوال ۱:- صدقۂ جاریہ کے لئے مندرجہ ذیل چیزوں میں سے کون سی بہتر ہے؟

الف:- مسجد کی تعمیر میں حصہ لینا، ب:- دینی مدرسہ کی امداد کرنا، ت:- کنواں تعمیر کرنا، ج:- یا اور کوئی کام جس سے مرحوم کو ثواب دارین حاصل ہو۔

۲:- لوگ کہتے ہیں کہ انسان سے گناہِ کبیرہ اور صغیرہ سرزد ہوں تو ۹۰ ہزار مرتبہ کلمہ شریف یعنی "لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ" پڑھ کر مرحوم کو اس کا ثواب دے دیں یا بخش دیں تو اس کے سارے گناہ اللہ معاف کر دیتا ہے، اور اسے عذابِ دوزخ سے نجات دیتا ہے، کیا یہ صحیح ہے؟

۳:- ثواب سے کیا مراد ہے؟ قرآن پڑھ کر ثواب مرحوم یا مرحومہ کو پہنچا دینے سے عذاب ختم ہو جاتا ہے؟

۴:- مجھے پڑھنے کے لئے ایسی چیز بتا دیں کہ اس کو پڑھوں اور عذابِ قبر سے محفوظ رہوں۔

۵:- کلامِ پاک یا تیس پارے مسجد میں رکھوا دیں تو کیا مرحومہ کو ثواب ہوگا؟

۶:- میری اہلیہ ہارٹ فیل ہونے سے اللہ کو پیاری ہوگئی، نمازِ تہجد ادا کرنے کے بعد نمازِ فجر کے وقت نماز کے انتظار میں بیٹھی تھی کہ اس کا انتقال ہوگیا، ایسی عورت کے متعلق کیا حکم ہے؟

جواب ۱:- یہ تمام اُمورِ خیر ہی خیر ہیں، اور صدقۂ جاریہ کے لئے ایسے کام کا انتخاب کرنا بہتر ہے جس کی ضرورت بھی زیادہ ہو اور جس کا فائدہ عرصے تک لوگ اُٹھاتے رہیں، اپنے حالات کے لحاظ سے اس کا فیصلہ ہر شخص کو خود کرنا چاہئے۔

۲:- سارے کے سارے گناہ معاف ہونے کی تو کوئی ضمانت نہیں، لیکن کلمۂ طیبہ یا قرآن شریف پڑھ کر جتنا زیادہ سے زیادہ ثواب میت کو پہنچا سکتے ہوں، بہتر ہے۔[۱]

۳:- اس کا جواب بھی وہی ہے، تلاوتِ قرآن کا ایصالِ ثواب کیا جائے تو ہر حرف پر دس نیکیاں میت کو ملتی ہیں، لہٰذا جتنا زیادہ سے زیادہ ایصالِ ثواب کیا جائے گا میت کے نامۂ اعمال میں اضافہ ہوگا،[۲] اور عذاب میں کمی ہوتی چلی جائے گی، لیکن عذاب سے رہائی کی مکمل ضمانت کوئی نہیں دے سکتا۔

(۱،۲) دلائل اور حوالے کے لئے سابقہ فتویٰ اور اس کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر حق نواز)

۴:- قرآن مجید کی تلاوت جتنی زیادہ ممکن ہو، کریں، خاص طور سے سورۂ ملک (یعنی "تَبَارَکَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْکُ") روزانہ پڑھا کریں، حدیث میں ہے کہ یہ سورت عذابِ قبر سے انسان کو محفوظ رکھنے میں مددگار ہوتی ہے، نیز "سُبْحَانَ اللهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَاللهُ اَکْبَرُ" اور استغفار کثرت سے کیا کریں، اس سے گناہ معاف ہوتے ہیں۔

۵:- دونوں سے ثواب حاصل ہوگا۔[1]

۶:- آپ کی اہلیہ کی وفات جس انداز سے ہوئی وہ قابلِ رشک ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے یہی اُمید رکھنی چاہئے کہ ان شاء اللہ وہ جنتی ہیں، لیکن ساتھ ہی ایصالِ ثواب میں کوتاہی نہیں کرنی چاہئے۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۱/۹ھ
(فتویٰ نمبر ۲۹/۶۱ الف)

عقیدۂ ایصالِ ثواب

سوال:- قرآن میں اس بات کی وضاحت ہے کہ ہر انسان کے نیک عمل کا جو ثواب ہوگا اس کا صرف کرنے والا حق دار ہے، وہ دُوسرے کو نہیں دیا جاسکتا، لیکن مسلمان دھڑلے سے ایصالِ ثواب کر رہے ہیں، یہاں تک کہ حج بدل بھی کرتے یا کرا لیتے ہیں، کیا ایصالِ ثواب کیا جاسکتا ہے؟

جواب:- قرآنِ کریم نے یہ فرمایا ہے کہ: ''انسان کو بطور حق صرف اسی عمل کا اَجر ملے گا جو اس نے خود کیا ہو''۔[2] لیکن اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس کے استحقاق سے زائد کوئی اَجر اپنی رحمت سے دے دیں تو یہ اس کے خلاف نہیں،[3] چنانچہ احادیث میں جو ایصالِ ثواب کا ثبوت ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی اسی رحمت کی بنیاد پر ہے، احادیث چونکہ قرآنِ کریم کی تفسیر ہیں اور قرآنِ کریم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کا معلّم بناکر بھیجنے کا ذکر فرمایا ہے، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ تفسیر مستند ترین تفسیر ہے۔

واللہ اعلم
۱۴۲۲/۸/۴ھ
(فتویٰ نمبر ۵۰۵/۱۰)

---

(۱) صفحہ نمبر ۵۸۸ اور اس کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) "وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی" (سورة النجم: ۳۹).

(۳) وفی شرح الصدور للسیوطیؒ باب فی قراءة القران للمیت أو علی القبر ص:۱۳۴ (طبع مطابع الرشید مدینة المنورة) لیس للانسان الا ما سعی، من طریق العدل فأما من باب الفضل فجائز أن یزیده الله تعالٰی ما شاء قاله الحسین بن الفضل، وکذا فی مرقاة المفاتیح ج:۴ ص:۸۲ (طبع مکتبه امدادیه ملتان). نیز ایصالِ ثواب سے متعلق مزید تفصیل اور خاص طور پر آیت مذکورہ کے مفہوم کے لئے مذکورہ کتاب شرح الصدور للسیوطیؒ باب فی قراءة القران للمیت أو علی القبر ص:۱۳۴ اور سابقہ فتویٰ اور حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر حق نواز)